

شعلاور کا سفر



خان آصف

جب غوری فرمانرواؤں اور ان کے پروردہ غلاموں نے ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو خلیجوں کے گروہ کے گروہ ہندوستان آکر شاہی ملازمتیں اختیار کرنے لگے۔ ان خلیجیوں میں سے بعض افراد نے اس قدر رسوخ حاصل کئے کہ وہ شاہی امراء کی صفوں میں داخل ہو گئے۔ انہی امراء میں سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلیجی اور سلطان محمود خلیجی کے باپ بھی شامل تھے۔ ایک مورخ کا خیال ہے کہ قانع خان کی نسبت سے ان امراء کو ”قالجی“ کہا جاتا تھا پھر کثرت استعمال سے یہ لفظ بگڑتے بگڑتے خلیجی بن گیا۔

دوسرے مورخ کا خیال ہے کہ ترک بن یافت کے گیارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام خلیج تھا۔ اسی کی اولاد کو خلیجی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، جلال الدین خلیجی کے لئے طالع آزمائی کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے امراء دہلی کو اس طرح اسیر کر لیا تھا کہ وہ سب کے سب ذہنی طور پر اس کے غلام نظر آنے لگے تھے۔

اس دوران تاریخ ہند کا ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ غیاث الدین بلبن کا بیٹا معز الدین کی قیادت میں گردش وقت سے بے خبر عوام کے ساتھ اس طرح کھیل رہا تھا جیسے وہ انسان نہ ہوں، لکڑی کے کھلونے ہوں۔ اسی عاقبت نا اندیشی نے کی قیادت کو اس کے انجام سے قریب تر کر دیا تھا۔

جلال الدین خلیجی نے زیر زمین ایسے دام بچھائے تھے کہ کی قیادت جیسا عیش پرست حکمران اس دام کے حلقوں کو اپنی خمار آلود آنکھوں سے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر وقت کی گردش نے جلال الدین خلیجی کے لئے وہ موقع فراہم کر دیا جو اس کی ذات کو تاریخ ساز بنادینے کے لئے کافی تھا۔

جلال الدین خلیجی نے بہت سوچ سمجھ کر بساط سیاست پر ایک فیصلہ کن چال چلی۔ جلال الدین نے ان ترک نوجوانوں کو آگے بڑھایا جن کے باپ کی قیادت کے ہاتھ تہ تیغ کئے جا چکے تھے۔ اس وقت کی قیادت کی جسمانی حالت یہ تھی کہ قانع کی وجہ سے وہ پہلے ہی یتیم مردہ ہو چکا تھا۔ بس ایک سانس کا رشتہ باقی تھا۔ اگر اس رشتے کو توڑ دیا جاتا تو فرشتہ اجل کی قیادت پر غالب آ جاتا اور جلال الدین کی آنکھوں میں پوشیدہ خوابوں کی تعبیر ہندوستان کے نقشے پر واضح نظر آنے لگتی۔

ترک نوجوان جوش انتقام میں آگے بڑھے۔ کی قیادت بستر علالت پر اس طرح یرا تھا کہ اس کے قریب نہ

کوئی مسیحا تھا..... اور نہ کوئی غمگسار۔ آنے والوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلطان معز الدین کی قیباد نے آنکھیں کھولیں اور نحیف و زار لہجے میں بولا۔

”مجھ شکستہ انسان سے تمہیں کیا شکایت ہے؟“

”بس ایک ہی شکایت ہے کہ تو اب تک زندہ کیوں ہے؟“ ایک ترک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ خنجر قضا اس کے ہاتھ میں پوری آب و تاب کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

”میں خود موت کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ تم میرے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگیں کر رہے ہو؟“ معز الدین کی قیباد کی آواز لرز رہی تھی اور آج اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ موت کتنے دے پاؤں داخل ہوتی ہے کہ آہٹ تک سنائی نہیں دیتی اور جب ہزاروں سگی اور آہنی دیواریں توڑ کر موت داخل ہو جاتی ہے تو اس سے زیادہ لرزہ خیز منظر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ آنکھ کی پتلیاں شدت خوف سے کانپنے لگتی ہیں اور خون رگوں میں جم جاتا ہے۔ قیباد کی بھی یہی حالت زار تھی جو اسے ہیک مانگنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”اے ہمارے ترک زادو! مجھے معاف کر دو۔“ قیباد کالجہ گداگرانہ تھا۔ ”میں تمہارے دامن پر خون کی کسی چینٹ کا نشان چھوڑے بغیر خود ہی دنیا سے گزر جاؤں گا۔“

”تجھے انجام کار دنیا سے جانا ہے۔ تیرے آخری سفر کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر اس وقت تیرے وفادار و نمک خوار بھی تیری گردن پر اپنی گردنیں رکھ دیں تو شمشیر قضا کا عمل رک نہیں سکتا۔ وہ یہاں تک اترے گی کہ زندگی بخشنے والی ایک ایک شریان کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دے گی۔“

دوسرا ترک زادہ اپنی دلی نفرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تم لوگ مجھے بس ہیک کی چند سانسیں دے دو کہ میں سکون سے مر سکوں۔“ معز الدین کی قیباد کالجہ مزید عاجزانہ ہو گیا تھا۔

”ہیک میں زندگی تو دی جاسکتی ہے لیکن اقتدار نہیں دیا جاسکتا۔“ تیسرے ترک زادہ نے غضبناک آواز میں کہا۔

”میں تم سے اقتدار نہیں مانگتا۔ بس اپنی تھکی ہوئی زندگی کا سوال کرتا ہوں۔“ قیباد آخری لمحے تک دشمنوں کو اپنے لاغر جسم سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ تیری تھکی ہوئی زندگی ہی سب سے بڑا فتنہ ہے؟“ ایک اور ترک زادے کی قہر آلود آواز بلند ہوئی۔

”مرہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو مگر بساط پر اس کی موجودگی خطرناک ہوتی ہے۔ شاطر دی ہے جو مرے کو مکمل طور پر ہٹا دے۔ بیشک! آج تیری حالت کمزور ترین مرے کی سی ہے لیکن بساط پر تیرا زندہ رہنا ایک خوفناک حقیقت ہے۔ پتہ نہیں کب تیرے دوسرے غلام مرے ہم پر یلغار کر دیں اور اچانک بساط الٹ جائے۔ ہم جاہل شاطروں کی طرح اتنی کمزور بازی کھیلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تیرے جوتے چاٹنے والے سپاہیوں کو جلد از جلد معلوم ہو جانا چاہئے کہ ان کا شاہ اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا کہ وہ میدان جنگ سے فرار ہونے میں نجات کا مظاہرہ کریں..... اور وہ ایسا ہی کریں گے کہ تیری حکومت نا انصافیوں کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

تیسرے اقتدار کا کوئی مقصد نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت، شراب اور عورتیں۔ یہ کوئی مقصد نہیں تھا اور بے مقصد حکومتیں زیادہ دیر تک زمین پر قائم نہیں رہ سکتیں۔“

معز الدین کی قیباد نے مزید گریہ و زاری کی مگر زندگی کی ساعتیں شمار کی جا چکی تھیں۔ اچانک ایک ترک زادہ شمشیر بے نیام لے کر آگے بڑھا کہ قیباد کے گاندھوں سے اس کے سر کا بوجھ ہٹا کر دیا جائے۔ جیسے ہی وہ بے دست و پا سلطان کے قریب پہنچا دوسرے ترک زادے نے جھج جھج کر کہا۔

”اس مردے کے جسم پر مشق ستم کر کے شمشیر کی کاٹ کو بے آبرو نہ کرو۔“

پھر چند ترک زادوں نے معز الدین کی قیباد کے ناتواں اور بیمار جسم کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور پھر دو چار ربات میں اس کا کام تمام کر دیا۔

سانس کا رشتہ ٹوٹنے ہی ترک زادوں نے معز الدین کی قیباد کے بے حس و حرکت جسم کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور قیباد کی لاش دریائے جہنم کے حوالے کر دی گئی۔

☆.....☆.....☆

ایک قتل کے بعد بظاہر جلال الدین خلجی اقتدار میں آچکا تھا لیکن ابھی اس کے راستے میں دوسری رکاوٹ موجود تھی۔ وہ اسے بھی صبر و تحمل کے ساتھ دور کرنا چاہتا تھا۔ جب قیباد کے مردہ جسم کو دریا برد کیا گیا تو اس کا تین سالہ بیٹا کیومرث حکومت کے وارث کی حیثیت سے موجود تھا۔ جلال الدین خلجی نے بساط سیاست پر ایک اور انجھی ہوئی چال چلی۔ ایسی پیچیدہ چال جسے اس کے عیار مخالف بھی سمجھنے سے عاجز تھے۔

جلال الدین خلجی نے غیاث الدین بلبن کے خاندان سے اس زور و شور کے ساتھ اظہار وفاداری کیا کہ سننے والے حیران رہ گئے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ معز الدین کی قیباد کو بیدردی سے قتل کرنے والا اس کے بیٹے کو اپنا فرماؤ تسلیم کر لے گا۔

اور پھر جلد ہی وہ لمحہ آگیا جب جلال الدین خلجی نے کیومرث کو سلطان شمس الدین کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر بٹھا کر خود اس کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہر طرف جلال الدین خلجی کے عہد وفا کی گونج تھی۔ کہنے والے کہتے تھے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو اس طرح اپنے مرحوم سلطان کی نشانی کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں مگر جاننے والے جانتے تھے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

اور پھر ایک دن یہ پردہ بھی چاک ہو گیا۔ سلطان شمس الدین کی نام نہاد حکومت کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ معصوم فرماؤ قتل کر دیا گیا۔ اس بار بھی جلال الدین خلجی قاتل کے لباس میں نمودار ہوا تھا لیکن بظاہر اس کے دامن پر سلطان شمس الدین کے خون کا کوئی داغ نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ”میرے ہاتھ صاف ہیں۔“

پھر جب ۶۸۸ھ میں جلال الدین خلجی کو تاج پہنایا گیا تو اس کی عمر ستر سال تھی۔ ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ محبت کی طرح سیاست کے جذبات بھی بڑھاپے میں زیادہ بھڑکتے ہیں۔ جلال الدین خلجی کے قدم قبر کی طرف رواں تھے مگر اس نے جاتے جاتے بھی اپنے دو آقاؤں کے خون سے رنگ بوتا جہنم لینا۔

پھر اقتدار کے یہ کیف آدور نشاۃ انگیز لمحات بھی ختم ہو گئے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے نفس نے سرکشی اختیار کی اور اپنے بزرگ و محسن کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ۷۷۷ھ سالہ بوڑھا حکمران جلال الدین خلجی جھج رہا تھا۔

”بے وفا بھتیجے! میں نے تجھے اپنے سینے پر سلا یا اور تو نے میری پشت میں خنجر آنا دیا۔“

جب سلطان جلال الدین خلجی زخمی ہو کر کشتی میں گر پڑا تو اس کے حلق سے دردناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

”عہد شکنم علاء الدین! میں نے اپنی آبرو تیرے حوالے کر دی مگر تو نے خون اور ناموس کے ایک ایک رشتے کو پامال کر ڈالا۔“

سلطان جلال الدین خلجی کے زخموں سے لہو جاری تھا..... اور علاء الدین خلجی کشتی کے گوشے میں اس طرح خاموش کھڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حرص و ہوس کے خون رنگ سائے لہرا رہے تھے اور ہونٹوں پر ایک ایسا نیم نمایاں تھا جو کسی منصوبہ ساز کے لبوں پر اس وقت ابھرتا ہے جب دشمن عالم نزع میں گرفتار ہو اور اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔

علاء الدین خون کا سمندر عبور کر کے ساحل مراد تک پہنچ چکا تھا اور سلطان جلال الدین خلجی کا سفینہ حیات گرداب فنا میں الجھا ہوا تھا۔ بہتا ہوا خون، ابھرتی ہوئی دردناک چیخیں اور ڈمگاتی ہوئی کشتی اقتدار..... بڑا عبرت خیز منظر تھا۔

اچانک علاء الدین خلجی کی آنکھوں میں اس کے خونی ارادوں کا عکس ابھرنے لگا۔ کشتی میں موجود اختیار الدین نے علاء الدین کی آنکھوں کی زبان سمجھنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس وقت جلال الدین خلجی تڑپے تڑپے اوندھا ہو گیا تھا۔ اختیار الدین نے بڑے سفاکانہ انداز میں تاجدار ہند کو سیدھا کیا اور دوسرے ہی لمحے سلطان جلال الدین خلجی کا سر اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

اقتدار فطرنا یک بے وفا چیز ہے۔ جلال الدین سے بھی اس نے بیوفائی کی مگر اس قدر سنگین انداز میں کہ اس کے نمک خوار نیروں پر اپنے آقا کا بریدہ سر لے ہوئے گلی گلی، کوپے کوپے پھرتے رہے اور پکار پکار کر کہتے رہے۔

”یہ اس شخص کی سزا ہے جو بے وفائی پر عاشق تھا۔“

اس کے بعد علاء الدین خلجی کے زر خرید غلاموں نے سلطان جلال الدین کے کئے ہوئے سر کو ایک نیزے پر لٹا کر کڑا کر آواز مٹا کر پورے ملک میں اس کی تشیر کی۔ پھر یہی لوگ جلال الدین کا سر لے کر اودھ پہنچے۔ تاجدار ہند کی جس قدر رسوائی ممکن تھی وہ ہو کر رہی اس نے جو فصل بوئی تھی وہ کاٹ لی۔ اب علاء الدین خلجی ہندوستان کا مطلق العنان حکمران تھا۔

۶۹۵ھ کے آخر میں علاء الدین خلجی بڑی ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ دہلی میں داخل ہو کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اور اسی دن دہلی کو اپنا دار الحکومت قرار دیا۔

علاء الدین ایک ذہین اور شاطر انسان تھا۔ لوگوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر ان کی آنکھیں علاء الدین کے دامن پر تھیں ہوتی تھیں وہ دامن جو سلطان جلال الدین خلجی کے خون سے رنگین تھا۔ علاء الدین نے ان آنکھوں کی زبان سمجھ لی اور پھر خون کے گہرے داغوں کو دھونے کے لئے اس نے جشن کی فضا کا اہتمام کیا۔

دہلی کے ہر گلی کوپے میں شراب کی سبیلیں اس طرح کھول دی گئیں جیسے وہ نشہ آور سیال نہ ہو، شمشدیا دودھ ہو۔ ترے ہوئے لوگ کیف و مستی کے ان ذخیروں پر ٹوٹ پڑے۔ جب لذیذ غذاؤں اور خمار آلود پانی کی کثرت سے اہل شہر کے اعصاب بوجھل ہو گئے تو انہیں سلطان جلال الدین کے قتل کو بھی فراموش کرنا پڑا۔

عوام کے ضمیر اور احساس کو دیوریں سے سلانے کے بعد علاء الدین خلجی امرائے دربار کی طرف متوجہ ہوا۔ انہیں بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا یہاں تک کہ علاء الدین کا جرم اقتدار کے سنہری غبار میں گم ہو گیا۔

علاء الدین خلجی ایک شجاع اور حوصلہ مند انسان ہونے کے ساتھ فطرتاً حسن پرست تھا۔ یہ اس کی عیش کو شہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے عام لوگوں کے لئے شراب پر پابندی لگادی تھی مگر خود اپنی خلوتوں میں شغل سے نوشی جاری رکھتا تھا۔

اپنے اس عیب کو چھپانے اور ہندوستانی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے علاء الدین نے محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیا کی پاکیزہ شخصیت کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیا وہ مرد قلندر تھے کہ کسی سلطان یا امیر کا سایہ تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے کئی بار محبوب الہی سے ملنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اس درویش خداست نے فرمانروائے ہند سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب علاء الدین کا تمام جاہ و جلال اس مرد فقیر کے پیروں کی خاک سے بھی کمتر ٹھہرا تو خلجی کے حکمران نے خود نظام الدین اولیا کے نام ایک خط تحریر کیا۔ خط کیا تھا ایک گداگر کی التجا تھی، علاء الدین خلجی نے لکھا تھا۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہوگی کہ میں ایک بار آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤں؟“

جواب میں حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے خادم کو حکم دیا۔

”علاء الدین کو لکھ دو کہ اس درویش کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ اگر تو ایک دروازے سے داخل ہو گا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے تنگ کرے گا تو میں تیرا ملک ہی چھوڑ دوں گا کہ خدا کی زمین تیرے اندازے سے بھی زیادہ وسیع ہے۔“

حضرت نظام الدین اولیا کی اس بے نیازی کے بعد علاء الدین کا شاہی وقار بھج کر رہ گیا اب اسے خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ اگر اس کے بعد بھی ضد کی گئی تو محبوب الہی یقیناً ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور وہ ایک مرد خدا کے قیام کی برکتوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے مجبوراً علاء الدین نے اپنے درباری شاعر حضرت امیر خسروؒ کا سارا لیا۔

حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیا کے محبوب ترین مرید تھے۔ بالآخر ایک دن علاء الدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ کو تختائی میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

”خسرو! میں تو حضرت شیخ کو مناتے مناتے تھک گیا۔ میرے دربار میں آنا تو کجا، وہ اس کے لئے بھی آمادہ نہیں کہ میں خود حاضر ہو کر ایک بار ان کی قدم بوسی کے اعزاز سے شرفیاب ہو جاؤں اب تم ہی میرا آخری سہارا ہو۔ میری خاطر کم سے کم اپنے شیخ کے حضور اتنی سفارش تو کر دو کہ میں ان کی دعاؤں میں شامل ہو جاؤں۔“

پھر جب حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیا سے عرض کیا تو محبوب الہی نے فرمایا۔

”ہاں! میں اس کے لئے دعا کرتا رہوں گا مگر وہی شرط اب بھی برقرار ہے کہ وہ کبھی میرے سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

جب حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاء الدین خلجی کو اطلاع دی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ حضرت محبوب الہی کی دعاؤں میں اس کا نام شامل ہو جائی اتنی بڑی سعادت تھی کہ جس کے بارے میں علاء الدین سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”خسرو! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے میری عافیت کے لئے ایک مضبوط سائبان فراہم کر دیا۔“

علاء الدین نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔
 اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب بھی علاء الدین کو کوئی سخت معرکہ پیش آتا تھا وہ اپنے قاصدوں کو حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں بھیج کر دعاؤں کا طالب ہوتا تھا۔ جواب میں محبوب الہی فرما دیتے تھے۔
 ”خدا تجھے سرخرو کرے گا۔“ ایک مرد بزرگ کی زبان سے ادا ہونے والے یہ چند الفاظ سلطان علاء الدین خلیجی کے لئے جنگی اسلحے کا سب سے بڑا ذخیرہ ثابت ہوتے تھے۔ کئی خوفناک مواقع پر جب شکست سلطان کی فوجوں کا مقدر بن گئی تھی، اس وقت حضرت محبوب الہی کی دعائیں کام آئیں اور علاء الدین خلیجی ناکامی و ناامدادی کے اندھیروں میں ڈوب کر ابھر آیا۔
 چوڑی مہم بھی ایک ایسی ہی مہم تھی جس نے علاء الدین خلیجی کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اس بار بھی سلطان ”امیر خسرو“ کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیا سے اپنے حق میں دعا کرانا چاہتا تھا۔ مگر خسرو نے صاف انکار کر دیا۔

”میں شامی ملازمت چھوڑ کر آپ کے عتاب کا شکار ہو سکتا ہوں“ حضرت امیر خسرو نے فرمایا: ”مجھے یہ گوارہ ہے کہ میں آپ کی ناراضگی مول لے کے اپنی دنیا خراب کر لوں لیکن یہ گوارہ نہیں کہ پیر و مرشد مجھ سے غما ہو جائیں اور پھر میری آخرت برباد ہو جائے۔ سلطان! یہ بڑے خسارے کی تجارت ہے۔ مجھے اس قدر سنگین آزمائش میں نہ ڈالیں۔ وہ جنگ جو ایک عورت کے حصول کیلئے لڑی جا رہی ہے، میں اس کا تذکرہ پیر و مرشد سے کس طرح کر سکتا ہوں؟ مجھ پر قیامت نازل نہیں ہو جائے گی۔“
 ”خسرو! بیشک! اس جنگ کی محرک ایک عورت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ سرکش راجپوت بھی ہمارا نشانہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بہانے ایک جنگجو قوم کے اٹھے ہوئے سروں کو پائے شامی پر جھکا دیں۔ یہ ایک بڑی سیاسی فتح ہوگی۔“ سلطان علاء الدین خلیجی نے امیر خسرو کو عیارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا: ”تم تو پیر و مرشد کے حضور صرف اتنا عرض کرو گے کہ علاء الدین چوڑے کے مقابلے بغیر قلعے کی طرف جا رہا ہے اور محبوب الہی کی دعاؤں کا طلب گار ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ ایک عورت کے ذکر کو درمیان میں لاؤ۔ پیر و مرشد کو کیا خبر ہوگی کہ اس جنگ کا نیاودی سبب کیا ہے؟“
 حضرت امیر خسرو سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس لئے بے اختیار فرما دیا۔ ”سلطان! اگر نظام الدین اولیا کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کس ارادے سے میدان کارزار کی جانب جا رہے ہیں تو پھر وہ پیر و روشن ضمیر کس طرح قرار پائیں گے۔ اور جب شیخ کو یہ بھی خبر نہیں کہ دعاؤں کا طالب اپنے دل میں کیا مقصد لے کر آیا ہے تو پھر دعا کس طرح قبول ہوگی؟ اگر رسم دعا تعین ہی ارازا ہے تو پھر جس کا جی چاہے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دے۔ آپ کو محبوب الہی کی دعاؤں کی کیا ضرورت ہے؟“ احترام شامی کے باوجود حضرت امیر خسرو کے لہجے میں ناخوشگوار کاری کا رنگ جھلکے لگا تھا پھر آپ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔
 ”سلطان! مجھے اس حکم کی تعمیل سے معذور سمجھا جائے اور اگر میرا یہ عمل مزاج شامی پر گراں ہے تو مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔“

”نہیں خسرو! میں ضد نہیں کر رہا ہوں۔“ علاء الدین خلیجی نے گہرا کر کہا۔ ”تمہاری ملازمت کی یہ شرط نہیں کہ تم میری ناجائز درخواستوں کو بھی نظام الدین اولیا کے حضور پیش کرو۔ یہ تو ایک التجائی جو تمہاری وضاحت کے بعد نامناسب معلوم ہوتی ہے۔“
 امیر خسرو جاتے جاتے ٹھہر گئے اور پھر علاء الدین خلیجی سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے ”اگر آپ کو تسخیر چوڑے کا شوق ہے تو بے دریغ چلے جائیے۔ جب پیر و مرشد ایک بار فرما چکے کہ آپ ان کی دعاؤں کے

زیر سایہ رہیں گے تو پھر یہ اندیشے کیوں؟ شمشیر کو بے نیام کیجئے اور چوڑے کے کوزہ ساروں میں اپنے حوصلوں کو آزمائیجئے۔“ اتنا کہہ کر امیر خسرو دربار سے چلے گئے اور علاء الدین خلیجی نے اپنی محفل تنہائی کو سامان کیف و نشاط سے آراستہ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

اب وہ عالم بے خودی میں ایک فاتح کے بجائے دل شکستہ عاشق نظر آ رہا تھا۔ جب علاء الدین خلیجی کا اضطراب حد سے گزر گیا تو اس نے اپنے ایک معتمد خاص علی عامر کو خلوت میں طلب کیا۔
 علی عامر جب اجازت لے کر سلطان کے تشراف میں داخل ہوا تو فرمانروائے ہند سرسیتی کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ادھر ادھر ٹھل رہا تھا۔ عامر کے آتے ہی علاء الدین خلیجی نے اپنے غیر متوازن قدموں کو سنبھالا اور دھندلی نظروں سے علی عامر کی طرف دیکھنے لگا۔
 علی عامر پنجانوں کے مشہور قبیلہ آفریدی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مورث اعلیٰ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور پھر محمود غزنوی کے دور حکومت میں قلعہ ہانسی کی فتح کے بعد ان لوگوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس کے بعد ہندوستانی سیاست کا نقشہ بہت تیزی سے بدلتا رہا۔ شہاب الدین غوری کی فتوحات سے لے کر خلجیوں کے اقتدار تک علی عامر کے خاندان نے اسلامی حکومت کے قیام میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اب علی عامر سلطان علاء الدین کے دربار سے اس طرح وابستہ تھا کہ اس نے کئی خونریز معرکوں میں حصہ لے کر اپنی بے پناہ جنگی صلاحیتوں کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا تھا اور پھر اس طویل آزمائش کے راستے سے گزر کر وہ علاء الدین خلیجی کے مصاحبین خاص کے حلقے تک پہنچ گیا تھا۔

علی عامر آفریدی، علاء الدین خلیجی کا مصاحب ضرور تھا مگر خوشامدی نہیں کہ سلطان کی زبان سے کوئی لفظ ادا ہوا اور وہ غلاموں کی طرح سر جھکا دے۔ علی عامر ان جاں نثار مصاحبوں میں سے تھا جو بادشاہ کے قریب محض اس لئے رہتے ہیں کہ گردش کے وقت اپنے فرمانروا کو بچانے کیلئے زندگی تک قربان کر ڈالیں۔ سلطان علاء الدین خلیجی بھی اس حقیقت سے باخبر تھا کہ علی عامر آزمائش کے لمحات میں پشت دکھانے والا نوجوان نہیں۔ سلطان کے خیال میں اس کے بیٹے منہ موڑ سکتے ہیں مگر علی عامر اس وقت تک ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک جسم اور جان میں سانس کا رشتہ باقی رہتا ہی اعتبار نے علی عامر کو سلطان کے بہت قریب کر دیا تھا۔

آج جب علاء الدین خلیجی دل کے زخموں سے بے قرار ہو کر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا تو اسے علی عامر کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور پھر ایک ہی جنبش لب نے علی عامر کو سلطان کے سامنے حاضر کر دیا تھا۔
 ”میرے قریب آؤ آفریدی!“ سلطان نے اپنے نوجوان سپہ سالار اور معتمد خاص کو پکارا۔

علی عامر باوقار و مگر وفادارانہ رفتار کے ساتھ چلتا ہوا علاء الدین خلیجی کے قریب پہنچا اور احتراماً سر کو قدر سے خم کرتے ہوئے بولا۔ ”سلطان معظم! یہ جاں نثار سایہ جسم کی طرح آپ کے قریب ہے۔“
 علاء الدین خلیجی کے قدموں نے اس کے بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے وہ قریب ہی پڑی ہوئی ایک آہستہ کر سی پر بیٹھ گیا۔

ایک تو کمرے کی تنہائی دوسرے سلطان کا جاہ و جلال، فضا میں عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ علی عامر بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔

”آفریدی!“ سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”آج ہم ایسی اذیت میں مبتلا ہیں کہ جسے دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“

”سلطان معظم! مجھے بھی غیر سمجھ کر اس راز کو اپنے سینے ہی میں پرورش کرتے رہے۔ غلام نہیں چاہتا کہ شاہ والا کے ہونٹ کانپیں اور چند الفاظ اس طرح تاریخ کے اوراق پر جم کر رہ جائیں کہ پھر مستقبل کا ہاتھ بھی ان کو کھرپنے سے قاصر رہے۔“ علی عامر آفریدی بڑے مدبرانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

”آفرین ہے تم پر آفریدی! سوار آفرین! ہم تمہیں اسی لئے پسند کرتے ہیں کہ تم صرف اندھے جاں نثاری نہیں، عقل و ہوش بھی رکھتے ہو، لیکن دل کے درد کو کیا کریں جو مسلسل کئی ماہ سے اٹھ رہا ہے۔ ایسا درد جسے کوئی طبیب سمجھ سکتا ہے اور نہ دو افرام کر سکتا ہے۔“

”تو پھر غلام کے رویہ و بیان کو دیکھتے کہ شاید اس طرح کچھ مداوا ہو جائے۔“ علی عامر نے آہستہ سے کہا اور نظریں نگلی فرش پر جھکا دیں۔

”چوڑی رانی پدمنی نے ہماری راتوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔“ بالآخر علاء الدین اپنے راز کو راز نہ رکھ سکا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حسن جہاں سونے بے شمار دلوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ لوگوں کا دعویٰ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ اس کے شعلہ رخسار کی پیش سے تمہارا سلطان بھی محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔“

”شاہ والا! آپ کے دل اور عام انسانوں کے دلوں میں بڑا فرق ہے ان لوگوں کے دل جلیں گے تو وہ شعلے صرف چند گھنٹوں کو جلا میں گئے، مگر آپ کے دل میں آگ لگنے کا مطلب ہے کہ پورا ہندوستان اس آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ خدا کے لئے آپ ان شعلوں کو اسی کمرے میں بچھا دیجئے۔ ورنہ خاندان خلجی کا جادہ و جلال ایک معمولی عورت کی نذر ہو جائے گا۔“ علی عامر، سلطان کی کیفیت دیکھ کر خود بھی اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی اور آنکھوں کے گوشوں سے ہلکا ہلکا پانی ابھرتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں! آفریدی نہیں، آگ لگے ہوئے بہت دیر ہو چکی اب ان شعلوں کا سفر دل سے روح کی طرف ہے۔ یہ شعلے اسی وقت بجھیں گے جب رانی پدمنی ہمارے شہستان محبت میں جلوہ آراء ہوگی۔“ نیکانک سلطان علاء الدین خلجی کا سوز و گداز، شدید قہر و نفرت میں بدل گیا تھا۔

علی عامر آفریدی، بادشاہ کی حالت جنوں دیکھ کر سہم گیا تھا۔

”آفریدی! کیا سوچ رہے ہو؟“ سلطان نے علی عامر کو خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

”سلطان معظم! اگر اس غلام کی رائے کو گستاخی و بے ادبی کے دائرے میں شامل نہ کیا جائے تو اس قدر وسیع و عریض ہندوستان میں رانی پدمنی کی کیا حیثیت ہے؟ اس سے زیادہ دلکش عورتیں بادشاہ کے حرم کو اس طرح آراستہ کر سکتی ہیں کہ نہ رعایا کے مکانات جلیں گے نہ میدان انسانی خون سے سرخ ہوں گے اور نہ سلطان کے دامن جلال پر تہمت و الزام کا کوئی داغ ابھرے گا۔ مذہب آپ کو جائز ارا دونوں سے باز نہیں رکھتا حکم کی دیر ہے، پھر اپنے خدام کی کارگزاری ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے کو ان کے گھوڑوں کے سم پناہ کر ڈالیں گے اور پھر ایک ایسی دوشیزہ آپ کے نکاح میں داخل ہو جائے گی جس کے رخ تابناک کے آگے پدمنی کا حسن ایک مہمل اور بے رنگ افسانہ بن کر رہ جائے گا۔ خاندان خلجی کے عظمت و جلال کی قسم! چوڑی رانی پدمنی اتنی باکمال عورت نہیں کہ سلطان اس کے لئے سب کچھ فراموش کر دیں۔“

”یہ عورت کے حسن یا کمال کی بات نہیں، ایک مطلق العنان فرمانروا کی شاہانہ ضد کا سوال ہے۔“ علاء الدین خلجی کا لہجہ بدستور قہر ناک تھا۔ ”بے شک! اقتدار کا یہ مزاج ہے کہ وہ ہمیشہ سودی طرف دیکھتا

ہے مگر کبھی بھی دل چاہتا ہے کہ زیاں کی طرف بھی ہاتھ بڑھائے۔ آفریدی! تم نہیں جانتے کہ جذبہ خود پسندی کتنی عجیب چیز ہے۔ کبھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شہنم میں نمائے اور کبھی اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ قصد ابھرنے لگی ہوئی آگ کے شعلوں میں جل جائے۔ رانی پدمنی بھی ہماری ذات کے لئے ایک ایسا ہی آتشیں مسئلہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے قلعہ چوڑی تختی ہمارے فطری ضرورت ہے۔ اگر ہم بیک وقت دونوں بازیاں جیت گئے تو اقتدار کے ساتھ دل کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور یہ ایک مثالی فتح ہوگی۔“ یہ کہہ کر سلطان کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ علی عامر آفریدی کے چہرے پر اپنی گفتگو کا رد عمل دیکھتا چاہتا تھا۔

علی عامر مزید کیا کہتا؟ اسے اپنی حدود میں رہ کر جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ فرمانرواؤں کی سرکش ضدوں کے آگے مشوروں کی دیواریں کھڑی نہیں کی جاسکتیں۔ مجبوراً علی عامر نے بھی اپنے حسن پرست فرمانروا کے سامنے سر جھکا دیا۔

پھر سیاست و محبت کے ایک خاص منصوبے کے مطابق یہ بات طے پا گئی کہ چوڑی تختی ابتدائی مہم میں علی عامر آفریدی، سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر کے فرائض انجام دے گا۔ آفریدی اس وقت ایک ایسا سفیر تھا جو اپنے سینے میں فرمانروائے ہند کا بہت نازک راز چھپائے ہوئے تھا۔ یہ راز اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ رانی پدمنی سلطان علاء الدین خلجی کی محبت و اطاعت قبول کر کے ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے حرم میں داخل ہو جائے اور سلطان کے دل کے ساتھ ساتھ عظیم ہندوستان پر بھی حکومت کرے اور اگر اسے یہ پیشکش منظور نہ ہو تو اپنی آنکھوں سے چوڑی تختی ویرانی کا خون رنگ تماشا دیکھے۔

اگرچہ سلطان علاء الدین خلجی کے اس راز پر بہت سے گہرے پردے ڈالے گئے تھے مگر علی عامر کے علاوہ بھی ایک اور شخص تھا جو اس راز سے باخبر تھا۔ اس شخص کو تاریخ ہند ملک کافور کے نام سے خوب جانتی ہے۔ گجرات کی ایک خونریز جنگ کے بعد دو ایسی چیزیں سلطان کے ہاتھ آئیں جن کی وجہ سے علاء الدین خلجی کی سلطنت بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ گجرات کی اس جنگ میں راجہ کرن اس قدر بدحواسی میں فرار ہوا کہ اپنی بیوی کملا دیوی اور خزانے کو بھی ہمراہ نہ لے جاسکا۔ نتیجتاً کملا دیوی کے ساتھ سم و زر کا یہ انبار بھی علاء الدین کے ہاتھ لگا۔ دہلی پہنچ کر کملا دیوی نے اس شرط پر اسلام قبول کر لیا کہ اسے ”بانوئے سلطنت“ اور ”ملکہ جہاں“ بنادیا جائے۔ سلطان نے کملا دیوی کی یہ شرط قبول کر لی اور اسے اپنی جائز بیوی کا درجہ دیا۔

علاء الدین خلجی کے دربار میں ملک نائب نامی ایک غلام نے اس قدر ترقی کی کہ سلطان کے دل پر حکومت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ملک کافور کو ”ملک نائب“ کا خطاب دیدیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی خلعت، فاخرہ اور سرخ شامیانے کی بھی اجازت دیدی گئی جسے سلطان کے سوا حکومت کا کوئی دوسرا اہمیدار استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

آج اسی ملک نائب کو جب سلطان کے نئے عشق کا راز معلوم ہوا تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

ملک کافور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی اس کی محبت کے حصار سے نکل کر ایک سادی شدہ راجپوت عورت کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جائے گا۔ یہ ایک خوفناک جذباتی حادثہ تھا۔ ملک کافور ساری ساری رات جاگ کر شراب پیتا اور مسلسل غور کر رہا تھا کہ سلطان کو رانی پدمنی کے ہفتے سے کس طرح محفوظ رکھے؟ اس کی یہ بے چینی صرف اپنی ذات تک محدود تھی۔ وہ نہ سلطان کی ہمدردی میں

شب بیداری کر رہا تھا اور نہ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی کہ چوڑ پر فوج کشی کے سیاسی اثرات کیا ہوں گے؟ وہ تو بس ایک ہی آگ میں جل رہا تھا کہ رانی پد منی کی نادیہ شخصیت نے سلطان کے سر سے اس کی محبت کا جادو کیوں اتار دیا تھا؟ ملک کا نور نے ہر زاویہ سے سوچا مگر اس کا محدود ذہن ہر گز رہے ہوئے لمحے کے ساتھ ناکارہ ہوتا جا رہا تھا۔ ملک کا نور ایک جاہل نوجوان تھا۔ اس نے وقتی ضرورت کے مطابق شمشیر زنی کے کچھ انداز سیکھ لئے تھے ورنہ اس میں سازشی منصوبے بنانے کے سوا کوئی صلاحیت موجود نہیں تھی اور یہ سازشیں بھی محض اس بنیاد پر کامیاب ہو جاتی تھیں کہ علاء الدین خلجی کی رنگین مزاجی اس کی پشت پناہی کرتی تھی، مگر آج ملک کا نور کی زندگی کا نازک ترین موڑ آ گیا تھا۔ سلطان کی جس نگاہ کرم کے باعث ایک غلام معزز و محترم ٹھہرا تھا، وہی نگاہ اب چوڑ کے ظلم کے پرم کوڑ تھی۔

ملک ایک قریب المرگ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ اس سنگین مسئلے پر کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تمام اہل شر اور سارے درباری اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس موقع پر ملک کا نور کو ساہو کار مندرال بہت یاد آ رہا تھا۔ وہی مندرال جس کی غلامی میں اس نے اپنے لڑکپن کے کئی سال گزارے تھے۔ ملک کا نور کے تصور میں مندرال کا چہرہ ابھرا تو اسے اپنا ماضی بھی یاد آ گیا۔

یہ چند سال پہلے کا واقعہ تھا۔ جب سلطان علاء الدین خلجی کے بھائی الف خان اور ملک نصرت خان گجرات کے حاکم راجہ کرن کو شکست دے کر کمبایت کے علاقے کی طرف بڑھے تو انہیں ساہو کاروں کی ایک جماعت نظر آئی۔ یہ سود خور ہندو بہت زیادہ مالدار تھے۔ ملک نصرت خان نے ان تمام ساہو کاروں سے بے شمار روپیہ خراج کے طور پر وصول کیا۔ کمبایت کے ان ہی سود خوروں میں سے ایک ساہو کار مندرال بھی تھا۔ ملک نصرت خان نے مندرال کے یہاں سونے اور چاندی کا ذخیرہ بھی دیکھا مگر جس چیز نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ایک ہندو لڑکا تھا، بے پناہ حسن رکھنے والا۔ ملک نصرت خان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر جب نصرت خان نے مندرال سے لڑکے کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کون ہے تو ساہو کار نے بتایا کہ وہ اس کا غلام ہے۔

مندرال ایک سیاہ فام اور بد صورت انسان تھا۔ ملک نصرت خان اس کا جواب سن کر غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا۔

ایک کرہیبہ النظر شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اتنا خوبصورت غلام رکھ سکے۔ اس پر ی زاد کو تو صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کسی شہنشاہ یا سلطان کی خدمت کرے۔ ” اتنا کہہ کر ملک نصرت خان نے اس لڑکے کو مندرال سے جبراً چھین لیا۔ مندرال شامی افواج کے سامنے بے دست و پا ہوا مگر پھر بھی اس نے ملک نصرت خان سے بڑے گداگرانہ انداز میں التجائی۔

”میں سلطان کی خواہشات کا احترام کرتا ہوں مگر اس لڑکے سے مجھے بے پناہ محبت ہے میں نے اپنی ذات پر ساری دنیا کے عیش حرام کر کے اس کی پرورش کی ہے۔ اب مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوگی۔ ” مندرال ملک نصرت خان کے سامنے زار و قطار رو رہا تھا۔

”اگر تو روتے روتے ہلاک بھی ہو جائے تو میں اس لڑکے کو تیرے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ تو نے ایک لڑکے کو بیٹے کی طرح نہیں ایک بدترین غلام کی طرح پالا ہے اور وہ بھی ایسا غلام کہ جسے مردانگی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تم لوگ ازلی سود خور ہو اور تم نے انسانی رشتے قائم کرنے میں بھی اسی سود خوری سے کام لیا ہے۔ اس خوبصورت لڑکے سے اس کی مردانہ پہچان چھین کر تم نے اس سفلی کا مظاہرہ کیا ہے جس کے متحمل جانور بھی نہیں ہو سکتے۔ ” ملک نصرت خان کو جس قدر بھی برے الفاظ یاد تھے وہ سب کے سب اس

نے ساہو کار مندرال کے لئے استعمال کر ڈالے تھے مگر وہ پھر بھی سلطان علاء الدین خلجی کے نمائندے کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا اور لڑکے کی بھیک اس طرح مانگ رہا تھا کہ اس کے بدلے میں اپنی ساری دولت دینے کے لئے آمادہ تھا۔

ملک نصرت خان اس کی مسلسل گریہ و زاری کے بعد اس حد تک متاثر ہوا تھا کہ وہ مندرال کو لڑکے کے ساتھ سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ ”اب تیرا فیصلہ سلطان ہی کر سکیں گے۔ ”

کرہیبہ النظر بوڑھا، اس شرط پر بھی دہلی جانے کیلئے تیار تھا۔ پھر الف خان اور ملک نصرت خان نے دربار سلطانی میں پہنچ کر اپنے جنگی کارناموں کی تفصیلات پیش کیں تو علاء الدین خلجی جوش جذبات میں کھڑا ہو گیا وہ اپنے فاتح سپاہیوں کو اسی طرح خوش آمدید کہتا تھا پھر سلطان یہ کہتا ہوا اپنے تخت زر نگار پر بیٹھ گیا۔ ”بے شک! سلطنت خلجی کے وفاداروں نے اپنے عہد نبھادیئے اور ایفائے عہد کرنے والے بڑے مقام کے مالک ہیں۔ ”

پھر اس نے سیم دوز کے ذخائر دیکھے جو اکثر حکمرانوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ علاء الدین خلجی کی عتابی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں۔ سرزمین گجرات سے لایا ہوا یہ سنہری شکار اس کے پنجوں میں تھا۔ ”اور وہ بزدل راجہ کرن کہاں ہے جس نے ہمیں خراج دینے سے انکار کر دیا تھا؟“ علاء الدین خلجی کی پر جلال آواز گونجی۔

”وہ سلطان معظم کے غلاموں کی ہیبت دیکھ کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ “ ملک نصرت خان نے اظہار وفاداری میں اپنے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے کہا۔

علاء الدین خلجی فاتحانہ انداز میں تہقہ زن ہوا اور پھر اس نے وزیر اعظم کی طرف دیکھ کر ایک مخصوص اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ کسی سیم تن رقاصہ کی پازیب کھٹکتی، علاء الدین خلجی کی آواز دوبارہ گونجی۔

”اس بزم طرب کی تمام سرمستی اور اس مجلس کیف و نشاط کی تمام بے خودی، آگ اور خون کے دریا سے گزر کر آنے والوں کے نام۔ ”

جیسے ہی سلطان کے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی، شامی دربار میں ہنگامہ رقص و سرود شروع ہو گیا پھر جب نغموں کی لے اپنی انتہائی بلندیوں کو پہنچ گئی اور شاخ گل جیسی لپکنے والی راقصاؤں کا فتنہ تمام ہوتا نظر آنے لگا تو ملک نصرت خان نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ علاء الدین خلجی دربار میں اس طرح بیٹھا کہ تھا کہ اگر کوئی شخص آنکھوں ہی آنکھوں میں بھی اشارہ کرتا تو سلطان کو اس جنبش چشم کی خبر ہو جاتی۔ اس نے دربار کے ہر گوشے میں بے داغ آئینے اس طرح ترتیب دیئے تھے کہ ایک ایک فرد کا چہرہ سلطان کی نگاہوں کی حدود میں رہتا تھا۔ جیسے ہی ملک نصرت خان نے سپاہیوں کو اشارہ کیا، سلطان علاء الدین خلجی چونک کر اپنے سر سالار کی طرف دیکھنے لگا۔

ملک نصرت خان، سلطان کے بائیں ہاتھ پر وزیر اعظم کی نشست کے بعد بیٹھا تھا۔ سلطان کو حیرت زدہ پا کر نصرت خان آگے کی طرف جھکا اور سرگوشی کے انداز میں علاء الدین خلجی سے کہنے لگا۔

”ابھی گجرات کی داستان مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی اس کا ایک لالہ رنگ باب پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد ہی سلطان معظم اس بے مثال تحریر کا مطالعہ کریں گے۔ پھر شاہ و لا کو اندازہ ہو گا کہ غلاموں کی وفاداریاں کس منزل میں ہیں؟“ یہ کہہ کر ملک نصرت خان اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا اور ان سپاہیوں کو

دیکھنے لگا جو دبے پاؤں دربار سے نکل کر لمحہ کرے کی طرف جا رہے تھے۔ پھر جب اس ہندو لڑکے کو دربار میں لایا گیا تو ہر آنکھ حیرت سے کشادہ ہو گئی۔ وہ یونانی دیوتاؤں جیسا حسن رکھنے والا، ایک سترہ اٹھارہ سالہ ہندو لڑکا گوپی رام تھا۔ اس کے دربار میں داخل ہوتے ہی ایک زلزلہ سا آگیا۔ ساز خاموش ہو گئے اور رقص ختم کیا۔ سلطان علاء الدین خلجی آنے والے اجنبی لڑکے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے ایسا ہی تھا کہ انسانی نظریں اس کے نقش و نگار پر جم کر رہ جائیں۔ اہل دربار کی نگاہیں بھی گوپی رام کے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اس نوخیز لڑکے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی پتھر کے بت میں جان پڑ گئی ہے۔

علاء الدین خلجی نے گھبرا کر ملک نصرت خان کی طرف دیکھا جو اپنی نشست پر کھڑا ہو چکا تھا۔ سلطان ذی قہم الفتح سبھرات کے افسانے کا ہی وہ آخری ورق ہے جو ایک غلیظ ساہوکار کے گندے ہاتھوں سے میلا ہو رہا تھا۔ یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے پوری تفصیل سلطان کے گوش گزار کر دی اور اس کے ساتھ ہی والی ہند کو یہ بھی بتا دیا کہ سوہر مندلال دربار سے باہر موجود ہے اور شرف باریابی چاہتا ہے۔

سلطان نے چند لمحوں کیلئے سوچا اور پھر ہاتھ کے ایک اشارے سے محفل رقص و سرود کو دہم برہم کر دیا پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”مندلال کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔“

پھر مندلال دو سپاہیوں کے درمیان گھرا ہوا دربار میں داخل ہوا تو حاضرین اسی طرح حیرت زدہ رہ گئے جس طرح وہ گوپی رام کی آمد پر حیران ہوئے تھے۔ آج سلطان کے درباریوں نے تانیاک سورج اور سیاہ رات کو بیک وقت طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ مندلال اپنے کرہیم اور مضحکہ خیز چہرے کی وجہ سے دلچسپ عجوبہ بن کر رہ گیا تھا۔ ابھی اہل دربار اس کی بے ہنگم شخصیت کا مکمل جائزہ لینے بھی نہیں پائے تھے کہ مندلال تیزی سے آگے بڑھا اور تخت شاہی کے نیچے پہنچ کر سجدہ ریز ہو گیا۔ سلطان علاء الدین خلجی دم بخود تھا۔ جب مندلال کا سجدہ طویل ہوا تو سلطان کی بارعب آواز گونجی۔

”اٹھو کہ ہم نے تمہاری حاضری قبول کر لی۔“

مندلال علاء الدین خلجی کے دربار کو کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے انتہائی دردناک لہجے میں گریہ و زاری شروع کر دی۔ ”پرہو (آقا) اس لڑکے کو مجھ سے جدا نہ کیجئے کہ میں گوپی رام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ میں نے اس پر بے دریغ دولت لٹائی ہے۔“ مندلال بچکیوں سے رو رہا تھا۔

”شاہی خزانہ تیرے تمام اخراجات ادا کر دے گا اور تجھ پر مزید دولت کی بارش کر دی جائے گی۔“ علاء الدین خلجی نے اپنی اداۓ شہانہ کا مظاہرہ کیا۔ ”یہ تیرا بیٹا نہیں، غلام ہے اور غلام انہی بازاروں کا رخ کرتے ہیں جہاں بڑے خریدار موجود ہوتے ہیں۔ آج ہندوستان کے کسی گوشے میں ہم سے بڑا خریدار کوئی دوسرا نہیں۔“

مالک! اگر میں اپنے اس غلام کو فروخت نہ کرنا چاہوں؟ ”مندلال نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تو ہم تجھ پر جبر نہیں کریں گے۔“ علاء الدین خلجی کی آواز پر سکون تھی۔ ”مگر اس غلام سے ضرور پوچھیں گے کہ اسے کوئی غلام گاہ پسند ہے۔“ یہ کہہ کر سلطان نے گوپی رام کے رخ روشن پر ایک گہری نگاہ کی۔

گوپی رام نے بڑے احترام کے ساتھ سر جھکا دیا۔ اچانک اہل دربار نے دیکھا کہ ساہوکار مندلال کے بستے ہوئے آنسو ٹھم گئے مگر اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مسخ نظر آنے لگا۔ گوپی رام کی خاموشی نے کئی سال پرانے رشتے کا ایک ایک تار توڑ دیا تھا۔

”گوپی! یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ تو مجھے اس طرح چھوڑ کر چلا جائے گا۔“ اب مندلال اپنے اس غلام سے مخاطب تھا۔ جس نے کئی برس کی رفاقتوں کو بھول کر شاہی محل کا انتخاب کر لیا تھا۔ ”دنیا اسی کا نام ہے، جو فادنا، ناپائدار اور منافع دنیا۔ تو بھی اسی دنیا کی قاتل ادا کا شکار ہو گیا۔ میرے دل میں تیرے خلاف شکایتوں کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے مگر میں تیری خوشی کی خاطر کوئی گلہ نہیں کروں گا۔“ مندلال کے سینے کی پیش سے الفاظ جل اٹھے تھے۔ دھواں پھیلاتا تو ہرے کی سیاہی کچھ اور بڑھ گئی پھر وہ ہندو سود خور مڑا اور سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا لگا۔

”سمرات (شہنشاہ) آپ جیت گئے اور مندلال ہار گیا۔ آپ کو جیتنا ہی چاہئے تھا کہ آپ کے ماتھے کی ریکھائیں بے جوڑ ہیں۔ اب میں اپنی مرضی سے گوپی رام کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مگر میرے حال پر اتنا کرم کیجئے کہ اگر میں سال میں ایک دو بار اس سے ملنا چاہوں تو.....“

مندلال نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی اور رحم طلب نظروں سے علاء الدین خلجی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”اجازت دی جاتی ہے کہ تو سال میں ایک بار گوپی رام سے ملاقات کر سکتا ہے۔“ علاء الدین خلجی آداب شاہی سے مجبور ہو کر زیر لب مسکرایا اور نہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک انسان نما جانور کی اس خواہش پر سرور بار قہقہے لگائے۔

جیسے ہی علاء الدین خلجی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ساہوکار مندلال دوبارہ سجدے میں چلا گیا۔ سلطان کو مسکراتا دیکھ کر تمام درباریوں کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم ابھر آیا تھا۔ وہ مندلال کی وحشت آمیز حرکتوں سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

پھر جب مندلال رسم سجدہ ادا کر چکا تو سلطان نے ملک نصرت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تو راج میں وصول کی جانے والی اس کی تمام رقم کو چار گنا کر کے واپس لوٹا دو۔ یہ اضافی رقم گوپی رام کی ذات پر کئے جانے والے اخراجات میں شامل ہے۔“

”نہیں مالک! اب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“ مندلال نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”شہنشاہ جب کسی سے کوئی چیز پھینکنا چاہتے ہیں تو اپنی طاقت کا لحاظ رکھتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو اپنے ظرف کے مطابق دیتے ہیں۔ اس دولت کے ساتھ ہم تجھے اپنی سلطنت میں امان بھی بخشتے ہیں کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کر۔“

علاء الدین خلجی نے ایک کم حیثیت سود خور کی نفی کر دی تھی۔

”ملک اسے دو چار دن ہمارے مہمان خانے میں رکھو۔“ علاء الدین خلجی دوبارہ نصرت خان سے مخاطب ہوا۔ ”پھر اسے یہ بھی بتاؤ کہ ایک ساہوکار اور شہنشاہ میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

سلطان کے اس حکم کے ساتھ ہی دربار پر خاست ہو گیا۔

مندلال کوئی ایک ہفتے تک محلات شاہی کی سیر کرتا رہا اور اسی دوران گوپی رام اپنی مرضی سے اپنا آبائی مذہب بدل کر مسلمان ہو چکا تھا۔ خود سلطان علاء الدین خلجی نے اس کا نام ملک کا فور تجویر کیا تھا۔ تبدیلی مذہب کی اس تقریب میں مندلال بھی شریک تھا۔ اسے گوپی رام کے ملک کا فور ہو جانے پر مت دکھ ہوا تھا مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا رہا تھا۔

پھر ملک کافور گجرات کی سابقہ رانی کملادیوی کی طرف متوجہ ہوا جس کے ناز واداکي فتنہ انگیزیاں برقرار تھیں اور جو ”ملکہ جہاں“ بن کر پورے ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی کچھ دن بعد ملک کافور نے ”ملکہ جہاں“ کا ظلم بھی پارہ پارہ کر دیا۔

کملادیوی بنی تھی ”ملکہ جہاں“ بنی تھی اس لئے وہ سلطان کی بے نیازی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اس نے ایک دن اپنی فطرت کے خلاف سلطان کی تمام بیگمات کو جمع کیا اور انتہائی سرکش لہجے میں کہا۔

”ہمارے حقوق کی حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ملک کافور کو ہمیشہ کیلئے راستے سے ہٹا دیا جائے۔“

کملادیوی (ملکہ جہاں) نے اس خفیہ نشست میں ایک خوفناک تجویز پیش کی۔ سلطان کی دوسری بیگمات نے بھی بڑے جذباتی انداز میں اس کی تائید کی۔ پھر ملکہ جہاں نے بڑی رازداری کے ساتھ ملک کافور کے قتل کے لئے چند معتد سپاہیوں کو مقرر کیا مگر وہ سلطان کے اس محبوب کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ علاء الدین خلجی ملک کافور کے سلسلے میں بیگمات کے حسد سے آگاہ تھا اس لئے اس نے بہت پہلے بہترین شمشیرزنوں کا ایک دستہ ملک کافور کی حفاظت کیلئے مقرر کر دیا تھا۔ یہ فوجی ہر وقت سائے کی طرح ملک کافور کے ہمراہ رہتے تھے اور ملک کافور برق رفتاری کے ساتھ کامیابی کے راستوں پر دوڑ رہا تھا۔

مگر بھاگتے بھاگتے آج اسے ایسی ٹھوکر لگی تھی کہ وہ ماضی کے خوابوں سے باہر نکل آیا تھا اور حقیقت حال یہ تھی کہ سلطان علاء الدین خلجی ملک کافور سے بے نیاز ہو کر مسلسل چوڑو کے اس تخت کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر رانی پدمنی جلوہ افروز تھی۔ بات اگر تخت کی ہوتی تو سلطان کا تخت اتنا وسیع تھا کہ چوڑو جیسے کئی تخت اس کے ایک گوشے میں سما جاتے مگر سلطان کو تخت سے زیادہ ”تخت نشین“ کا خیال تھا۔ اور پھر اس خیال نے وحشت و جنوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کافور سلطان کے اس جنوں کو کبھی برداشت کر لیتا مگر اس بات کی ضمانت دینے والا کو نہ تھا کہ رانی پدمنی کی موجودگی میں اس کی موجودہ حیثیت برقرار رہے گی۔ اسی اندیشے نے ملک کافور کی نیند حرام کر دی تھی۔

آج پوری سلطنت میں نہ اس کا کوئی ہمدرد تھا اور نہ کوئی ننگسار وہ کس سے اپنے دل کا درد بیان کرتا؟ ساہوکار نندال ہر سال اس سے ملنے آتا اور اس کی مسلسل فتوحات پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا۔ سلطان کو رام کرنے کے نئے طریقے بتاتا اور رخصت ہوتے وقت سرگوشیوں میں ایک ہی بات دہراتا۔ ”گوپنی رام تو گوپنی رام ہی رہے گا“ ملک کافور نہیں ہو سکتا۔ تو ایک ہندو ہے، صرف ایک ہندو۔ ملک کافور نے نندال کی گفتگو کے ایک ایک رمز کو سمجھ لیا تھا مگر ابھی اس کی منزل بہت دور تھی۔ اچانک راستے میں پدمنی کے حسن کا سنگ گراں آ آیا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ آج اسے کسی شاطر اور جہانگیرہ شخص کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ سہارا نندال کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ مگر ملک کافور کی اس بدنصیبی کو کیا کہا جائے کہ چند ماہ پہلے ہی نندال گردوں کی بولناک تیاری کے سبب ایزیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا۔ مرنے سے پہلے نندال نے اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ ملک کافور کو ایک خط بھیجا تھا جسے پہلے سلطان علاء الدین خلجی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور بعد میں وہی خط ملک کافور کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ نندال کے خط میں یہ مختصر سی عبارت درج تھی۔

”گوپنی رام! میں دنیا سے جا رہا ہوں میرے لئے دعا کرتے رہنا ورنہ یہ بے چین آتما کی جہنم تک بھٹکتی رہے گی۔“

نندال کے اس خط میں کوئی خاص بات تحریر نہیں کی گئی تھی لیکن ملک کافور جانتا تھا کہ ”گوپنی رام“ کا لفظ کس طرف اشارہ کرتا تھا اور دعا سے مرنے والے کی کیا مراد تھی۔ نندال کی موت کے بعد کچھ عرصے تک

”پچھرنے والا جب پچھڑ گیا تو وہ اپنا دل بدلے یا مذہب تبدیل کر ڈالے۔“

نندال نے بھی اپنی زندگی کے اس جذباتی حادثے کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا تھا۔

اور پھر وقت رخصت قریب آ گیا۔ نندال شاہی مہمان نوازی سے لذت آشنا ہو کر اپنے شہر کمبایت واپس جا رہا تھا۔ الوداعی لمحات میں تنہائی کی چند ساعتیں ملتے ہی اس نے سرگوشیوں میں اپنے سابقہ محبوب غلام سے کہا تھا۔

”گوپنی رام تو آخری سانس تک گوپنی رام ہی رہے گا“ ملک کافور نہیں ہو سکتا تو ایک ہندو ہے صرف ایک ہندو۔ تجھے اس وقت تک اسلام کی قربانی پٹنی ہوگی جب تک گردش وقت تیرا اصلی لباس واپس نہیں کر دیتی۔ میں نے علاء الدین کو خوب پہچان لیا ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہے اور خوشامد پسند بھی۔ جب تیرے غمزہ واد کے حربے ناکارہ ہو جائیں تو اس کے پیروں پر اپنا سر رکھ دینا بالآخر وہ کھل جائے گا۔ اب میں تجھے دیوتاؤں کے حوالے کرتا ہوں۔ دیوتا ہی تجھے شہنشاہی دیں گے اور دیوتا ہی ہماری مہمان بھوی کو حملہ آوروں سے پاک کریں گے۔ یہ کتنے وقت نندال کے چہرے پر دنیا کی تمام کالک ابھر آئی تھی اور آنکھوں میں راون جیسی شیطنت کا عکس نمایاں تھا۔

مگر جب وہ گوپنی رام سے اپنے دل کی بات کہہ کر کمبایت جانے لگا تو سپاہیوں نے اسے زار و قطار روٹے دیکھا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”گوپنی! تجھ سے پچھرنے کا یہ پہلا دن ہے۔ ابھی سے دل کی حالت غیر ہوتی جاتی ہے تو پھر آنے والے ماہ و سال کیسے گزریں گے؟ گوپنی! میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔“ نندال محل سے باہر آتے ہی نوحہ خوانی کرنے لگا تھا۔ لیکن سپاہیوں کی سرد نگاہیں دیکھ کر وہ خود بھی ہولی کی آگ کی طرح ٹھنڈا ہو گیا اور پھر سلطان علاء الدین خلجی کو بے شمار دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

دہلی کے اکثر باشندوں نے نندال اور گوپنی رام کے پچھرنے کے اس رقت انگیز منظر کو دیکھا اور بہت سے لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر ان میں سے ایک شخص بھی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ نندال دہلی کیوں آیا تھا؟ اور اس کی گریہ و زاری کا حقیقی سبب کیا تھا۔ دہلی کے عام باشندوں نے تو ایک منظر فراق دیکھا اور اپنے حساس دلوں پر اس کے اثرات محسوس کرنے لگے لیکن اس وصال اور جدائی کے پس منظر میں کیا تھا، کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

پھر جب سپاہیوں نے سلطان کو اس واقعے کی اطلاع دی تو وہ کسی تاثر کے بغیر کہنے لگا۔ ”کاروبار حیات اسی کا نام ہے۔ بڑے تاجر اپنی پسندیدہ چیز خرید لیتے ہیں۔ چھوٹے سوداگر بازار سے مایوس لوٹ جاتے ہیں“

نندال بھی ایک حقیر سا سوداگر تھا۔ اپنی ہی چیز سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ”یہ کہہ کر سلطان علاء الدین خلجی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔ وہ قہقہہ جو حکمرانوں کے شایان شان ہوتا ہے۔ جب اس فاتحانہ قہقہے کی بازگشت ختم ہوئی تو سلطان نے ملک کافور کی طرف دیکھا جو سرخ لباس میں ایسا نظر آ رہا تھا جیسے ایران کے آتش کدے کا کوئی دہکتا ہوا نگارہ دہلی کے دربار میں پہنچ گیا ہو۔

اس کے بعد ملک کافور کی محبوبیت کا سفر شروع ہو گیا۔ سلطان کی بیگمات کے شہستان آتش حسد سے جل اٹھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ علاء الدین خلجی کے سامنے لب کشائی کر سکے۔ سلطان کی پہلی بیوی جو اس کی چچا زاد تھی، پہلے ہی اپنے شوہر کی توجہ سے محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی سلطان کے دل میں جلال الدین خلجی کی بیٹی کیلئے جو نرم گوشہ موجود تھا اسے دوسری نو مسلم بیویوں نے اپنے حسن کی کرشمہ ساز یوں سے پہلے ہی پتھر دیا تھا اور اس رشتے کے درمیان جو ایک کچا دھاکا باقی رہ گیا تھا اسے ملک کافور نے توڑ دیا تھا۔ یہ اس خوبصورت غلام کی پہلی فتح تھی۔

ہوتے ہیں ان کے سروں کو ہمارے قدم چھونے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔“
”سلطان معظم! یہ غلام اس حقیقت سے باخبر ہے۔“ ملک کافور کے آنسو تھم گئے تھے مگر آواز سے پھر بھی رقت جھلک رہی تھی۔

”اب پتا چھڑ گیا گزری ہے؟“ علاء الدین خلجی نے ملک کافور سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے جس نے تیری خوابناک آنکھوں میں آنسو بھر دیئے؟“ سلطان کا لہجہ پر جلال تھا مگر آواز میں لرزش سی تھی۔ ”تیری آنکھیں اشک ریزی کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں یہ تو سلطان کے لئے قرار جاں ہیں۔“
”کوئی نہیں سلطان معظم! کوئی نہیں۔“ ملک کافور کی ہچکیاں دوبارہ جاری ہو گئی تھیں۔ ”اس عظیم الشان سلطنت میں کس کی جرات ہے کہ وہ آپ کے غلام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔“
آپ کی عنایت خسروانہ نے تو زمین کو عرش اور ایک غلام کو شاہ بنا دیا ہے۔“
”پھر تیری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں جن کی کمی ہمیں اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی ہے۔“
سلطان کے لہجے میں خلش درد بھی تھی اور قہر شاہی کی تپش بھی۔

”کل تک یہ غلام جس چشم کرم کے سارے زندہ تھا آج وہی مہربان آنکھ رانی پدمنی کے نادیہ نقش و نگار میں گم ہے۔“ آخر جوش رقابت میں ملک کافور کی زبان لڑکھڑا گئی۔
”ملک! سلطان علاء الدین اس طرح پچھا کہ عشرت کدے کے درو دیوار گونج اٹھے۔“ غلام اگر درجہ محبوبیت تک بھی پہنچ جائے تو مزاج شاہ میں دغل اندازی کا اختیار نہیں رکھتا۔ پھر یہ ہمارا دل کا مسئلہ ہے۔ سمندر اپنی مرضی سے موجزن ہوتا ہے دریاؤں کو اس کا لحاظ رہنا چاہئے۔“ شدت غضب سے سلطان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
”سلطان والا! میں بھی آپ کے دل کا مسئلہ ہوں۔“ ملک کافور نے ایک بار پھر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا۔

”انسانی زندگی کے مسائل کا کوئی شمار نہیں۔“ علاء الدین خلجی نے جھنجھلا کر اپنے پاؤں کھینچ لئے اور ملک کافور کا سر فرش سے ٹکرا گیا۔ ”شہنشاہوں کے دل کسی ایک دائرے میں قید نہیں رہتے اگر وہ اس بندش کو قبول کر لیں تو پھر انہیں شاہ کون کے گا؟ بے شک! تجھے بھی قربت کا فخر حاصل ہے لیکن اس وقت رانی پدمنی ہمارے قریب تر ہے کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ عورت بھی ہے، حسین بھی اور سرکش حکمران بھی ہے۔ ہم اس سے یہ تینوں اعزاز چھین لیں گے۔ اگر اس کا کوئی اعزاز یا غرور برقرار رہا تو یہ ہمارا عطیہ ہو گا۔ ہماری بخشش خاص ہوگی اور ایسا نہ ہو سکا تو ہندوستان کے نقشے پر دو ناموں میں سے صرف ایک نام اپنا وجود باقی رکھ سکے گا۔ عظیم غلیبوں کا عظیم وارث علاء الدین یارانی پدمنی؟“ سلطان کے جسم میں تحلیل ہو جانے والی شراب کی آگ اب اس کے چہرے پر بھی روشن ہو چکی تھی۔

ملک کافور کو نندلال کا تجویز کردہ نسخہ یاد آگیا مگر آج اس کا استعمال بھی بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ ملک کافور نے ہواؤں کا رخ پچان لیا تھا اس لئے چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا ابھی وہ علاء الدین خلجی کے عشرت کدے کے دروازے تک پہنچا تھا کہ ایک بار پھر سلطان کی آواز گونجی۔

”جس طرح شہنشاہ کی مملکت میں لاکھوں انسان بستے ہیں اسی طرح اس کے دل میں بیک وقت ہزاروں محبوب بھی قیام کر سکتے ہیں۔ رعایا کے کسی فرد کو شہنشاہ کی اس فراخ دلی پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ شہنشاہ خود ہی ستر جانتا ہے کہ کسے اس کے دل کے قریب رہنا ہے اور کسے زندگی سے دور ہو جانا ہے۔“

ملک کافور سلطان کی نشاط گاہ سے باہر نکل چکا تھا اور اب طویل راہ داری سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف

ملک کافور اداس رہا اور پھر اس کی زندگی سیاست کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔ مگر آج ملک کافور کے دل میں نندلال کی یادوں کا درد پوری شدت سے اٹھا تھا۔ اس وقت اگر وہ بوڑھا سا ہو کار زندہ ہوتا تو ملک کافور کے جلتے ہوئے زخموں پر اپنے برف جیسے مشوروں کا ہم ضرور رکھتا لیکن جانے والا بہت دور جا چکا تھا۔
ملک کافور نے ایک اور جام سرخ لبریز کیا اور غیر متوازن قدموں سے اپنے آراستہ کمرے میں ٹٹلنے لگا۔ اس کی دھندلی آنکھوں کے سامنے بار بار نندلال کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ پھر یکایک ملک کافور کے ڈوبتے ہوئے ذہن میں برق سی لہرائی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ باری ہوئی بازی جیت گیا ہو اور رانی پدمنی اس کے قدموں پر جھکی ہوئی اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔

ملک کافور کو نندلال کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو سیاست کی کتاب میں ایک قیمتی اضافہ تھے۔ نندلال نے پہلی بار دہلی سے کمبایت رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔
”میں نے علاء الدین کو پچان لیا ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہے اور خوشامد پسند بھی۔ جب تیرے غمزدادوں کے تمام حربے ناکارہ ہو جائیں تو اس کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیتا۔ بالآخر وہ پکھل جائے گا۔“
نندلال کے الفاظ یاد آتے ہی ملک کافور کو قرار سا آگیا۔

☆.....☆.....☆

پھر اسی رات ملک کافور سلطان علاء الدین خلجی کے عشرت کدے میں داخل ہوا۔
”سلطان معظم!“ ملک کافور نے داخل ہوتے ہی بڑے دردناک لہجے میں اپنے فرمانروا کو صدادی۔
”کیا بات ہے ملک؟“ علاء الدین خلجی نے چونک کر اپنے محبوب غلام کی طرف دیکھا۔ سلطان اس وقت عالم سرمستی میں تھا۔ یہ شاہ کے وہ محلات ہوتے تھے جن میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کی جاتی تھی مگر ملک کافور کو ہماں آنے کے لئے بھی کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں تھی۔
وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

کثرتِ خمار کے باعث سلطان کچھ دیر تک تو صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا مگر جب ملک کافور کے گرم آنسوؤں نے اس کے پیروں کو جھگونا شروع کیا تو علاء الدین خلجی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔
”ملک! یہ کیا حرکت ہے؟“ اچانک سلطان کے لہجے سے غصے کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ”ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تو اس قدر ناشائستہ اور غیر منذب ہو جائے گا۔ کیا تجھے ہمارے مزاج کا اندازہ نہیں اور کیا تو شاہی خلوتوں کے آداب کو فراموش کر چکا ہے؟“

اگر ملک کافور کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو سلطان کے یہ الفاظ سن کر سمجھ لیتا کہ یا تو وہ ہمیشہ کیلئے معتب ہو چکا ہے یا پھر اس کی زندگی کے دن گئے جا چکے ہیں مگر وہ ملک کافور تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کا محبوب غلام اور اسی محبوبیت کے غرور و ناز سے فرمانروائے ہند کے جلال کو جھٹلا دیا تھا۔

”سلطان والا حشم، مجھ سے زیادہ شاہی خلوتوں کے راز سے کون واقف ہو گا؟“ ملک کافور کا سر علاء الدین خلجی کے قدموں پر تھا لیکن اس کی آواز میں وہی کاث تھی جو حسن پرست شہنشاہوں کے قلب کو دو نیم کر دیتی ہے۔

اگرچہ اس وقت سلطان کے اعصاب نشے سے مغلوب ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ سنہل کر بولا۔ ”اس میں کیا شک ہے؟“ یہ کہتے ہوئے علاء الدین قدرے خم ہوا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ملک کافور کو اٹھایا پھر جب وہ سلطان کے سامنے مودب کھڑا ہوا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”ملک! اگر تو ہمارے جنڈوں کا راز دار نہیں ہوتا تو پھر ہم تجھے یہ شرف بھی نہ بخشتے۔“ جو ہم سے دور

جابر تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس کا ذہن بے شمار دوسو سوں سے بھر ہوا تھا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

پھر جب ملک کا نور اپنے آراستہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے اعصاب شکستہ ہو چکے تھے اور جب وہ اپنے بستر پر دراز ہوا تو اسے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ سلطان کے تحقیر آمیز سلوک نے ملک کا نور کی اداؤں کے اس بت کو پاش پاش کر دیا تھا جس کے ذریعہ وہ خدائی کا خواب دیکھ رہا تھا پھر یہ خواب بکھرا تو ملک کا نور کی آنکھوں کے سامنے دربار شاہی کے وہ مناظر ابھر آئے جو اس کی ذلت و رسوائی کی شرمناک داستان بنا رہے تھے۔

ملک کا نور جانتا تھا کہ جب وہ دربار میں سلطان کے قریب ایک مخصوص اعزاز کے ساتھ بیٹھتا ہے تو امرائے وقت اور شہر کے دیگر معززین کی آنکھوں میں کیسے کیسے افسانے تحریر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ افسانے جن کی کوئی زبان نہیں ہوتی مگر پڑھنے والے پھر بھی انہیں بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ جلال شاہی کے خوف سے لوگ کچھ کہتے نہیں تھے مگر ان کے دماغوں میں کا نور کی بے حیاء تصویر محفوظ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے تمام سروں کی ہڈیاں توڑ کر ان میں پیوستہ تمام دماغ باہر نکال دے اور پھر انہیں اپنے پیروں سے مسل ڈالے لیکن ملک کا نور اتنا با اختیار نہیں تھا اور آج سلطان کی جارحانہ روش نے اس کی بے اختیاری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ملک کا نور گہرا کر بستر سے اٹھا اور کمرے کی تمام قد ملیں روشن کر دیں اس کا کمرہ کیا تھا ایک ہفت رنگ آئینہ خانہ تھا۔ ہر طرف شیشے ہی شیشے تھے ملک کا نور ان شیشوں کے درمیان ایک وحشت زدہ انسان کی طرح کھڑا تھا۔ پھر اس نے سامنے والے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ سرخ و سفید چہرے پر اذیت و کرب کی ہلکی ہلکی سیانی پھیل گئی تھی۔

یہ ایک آئینہ بولنے لگا ”دنیا میں اقتدار حاصل کرنے کیلئے کم سے کم ایک بڑی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے۔ کچھ لوگ اپنی جانوں کی نذر پیش کر کے اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اس اقتدار کے اثرات صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ناتواں اور بے گناہ انسانوں کے قتل عام کے بعد منہ اقتدار تک پہنچتے ہیں اور پھر ایک روز ہی منہ ان کی قبر بن جاتی ہے یہاں تک کہ اس قبر میں آماری جانے والی لاش کو حشرات الارض اپنی خوراک بنالیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ قبریں دوبارہ کھودی جاتی ہیں اور لاشوں کو باہر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ مخلوق خدا ان کے بے گورو کفن ہونے کا تماشا دیکھ سکے۔ کوئی ضمیر فروخت کر کے اپنے بدن پر قبائے اقتدار سجاتا ہے اور کوئی اپنی آبرو و نیلام کر کے کوچہ اقتدار میں داخل ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر آئینہ خاموش ہو گیا۔

ملک کا نور کسی پتھر کے مجسمے کی مانند آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور حیرت و سکوت کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ ”کیا آئینے بھی بولتے ہیں؟“

ابھی اس کی حیرانی برقرار تھی کہ آئینہ دوبارہ بول اٹھا۔ ”ملک کا نور تو نے کیا کیا؟ وقار کتنے میں رہن رکھا، ضمیر کتنے میں چھڑا؟“

”میں نے اقتدار کیلئے اپنی غیرت و مردانگی کی قربانی پیش کی ہے۔“ ملک کا نور نے سحر زدہ مریض کے انداز میں کہا۔

”تاریخ تجھے بھی یاد رکھے گی مگر بڑے عجیب نام سے۔“ آئینے سے ابھرنے والی صدا آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔

پھر یکایک ایک چہرے کے عقب سے کئی چہرے ابھرنے لگے۔ یہ ملک کا نور ہی کے چہرے کے مختلف عکس

تھے غلامی کی سطح سے گزر کر دربار شاہی میں ایک خاص مقام تک پہنچنے والے چہرے۔ تمام چہروں کے نقش و نگار یکساں تھے مگر کردار کی غلاظتوں نے ہر چہرے کو نیا رنگ دیدیا تھا۔

بے حیائی اور خوشامد ملک کا نور کا پیشہ تھا لیکن آج سلطان کی کج ادائی نے اسے انتہائی بلندیوں پر پہنچا کر ایسی پستیوں میں پھینک دیا تھا کہ اگر علاء الدین خلجی اس کی طرف دوبارہ توجہ نہ کرنا تو ملک کا نور کی وہ رسوائی ہوتی کہ گلی گلی ہیک مانگنے والے بھی اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ خوش نصیب سمجھتے۔

یہ خیال بڑا اذیت ناک تھا۔ ملک کا نور اپنے ہی چہرے کے ہزار رنگ زاویوں سے ڈر گیا پھر شدید حالت غضب میں اس کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے نادر و نایاب آئینوں پر مشق ستم شروع کر دی۔ رات کے سنائے میں شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بڑی عجیب گھنٹیں شاید مفلسوں کے دل بھی ایسے ہی ٹوٹتے ہوں گے۔ ابھی نازک ترین آئینوں پر ملک کا نور کی تیشہ زنی جاری تھی کہ ایک خوبصورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

لڑکی ہر طرف شیشوں کے ٹکڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ لڑکی ملک کا نور کی ایک شوخ و شریب کنیز تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے خوبصورت ترین کنیزوں کو اپنے محبوب غلام کا دل بہلانے کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ یہ کنیزیں رقص کی بھی ماہر تھیں اور نغمہ سرائی میں بھی بے مثال تھیں۔ روزانہ یہ کنیزیں رات کا اندھیرا پھیلتے ہی راگ اور رنگ کی تحفیں آراستہ کرتیں۔ ملک کا نور جب ایک رقصہ یا مطربہ کے فن کی نمائش سے استہاجاتا تو دوسری کنیز محفل کا رنگ بدلنے کے لئے بازیب کی جھنکار کے ساتھ خلوت کدے میں داخل ہو جاتی۔ ملک کا نور شاہانہ انداز میں نصف شب تک بزم کیف و طرب سے لطف اندوز ہوتا رہتا اور پھر کنیزوں کو رخصتی اشارہ کر کے اپنے بستر پر دراز ہو جاتا۔ فانوس اور قد ملیں بجھادی جاتیں۔ پھر ایک کنیز ستار اٹھاتی تھی اور کوئی خوابناک دھن چھیڑ دیتی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ کمرے کی فضا بوجھل ہو جاتی اور ملک کا نور نیند کی وادیوں میں گم ہو جاتا۔

مگر آج ملک کا نور کے معمولات میں فرق آچکا تھا۔ اس سے پہلے کہ آنے والی کنیز کوئی راگ چھیڑتی ملک کا نور نے خود ہی آئینہ شگن غزل چھیڑ دی تھی۔

”نصیب دشمنان! حضور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ رقصہ ناہید رباب نے رسمی آداب بجالاتے ہوئے ملک کا نور کی مزاح پر سی کی۔

کمرے میں ایک شناسا کھکتی ہوئی آواز گونجی تو ملک کا نور کا دست ستم رک گیا اور چند آئینے ایک رقصہ کی مداخلت سے اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

”میں بہت اداں ہوں ناہید!“ ملک کا نور پلٹا اور رقصہ کے قریب آتے ہوئے بولا ”آج اس رنگین دنیا میں میرے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی ہے۔“

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟“ ناہید رباب اس طرح ہنسی جیسے کسی مطرب کی انگلی نے ستار کے شوخ تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔

”ہاں! یہ میں کہہ رہا ہوں، ملک کا نور بساط خلجی کا سب سے طاقتور مرہ۔“ اس کی باتوں سے مہر یایوسی کے بادخود اقتدار کا غرور جھلک رہا تھا۔

”اس ادا سی کا سبب؟ اس نفرت و بیزاری کی وجہ؟“ رقصہ، ملک کا نور سے مصنوعی اظہار ہمدردی کر رہی تھی۔ ورنہ وہ دلی طور پر اس خواجہ سرا سے شدید نفرت کرتی تھی۔ ملک کا نور ہی کی وجہ سے ناہید رباب کے اعلیٰ خاندان پر یہ بد نما داغ لگا تھا۔

ناہید کے ایرانی النسل باپ اسفندیار کا بس اتنا تصور تھا کہ اس نے دھلتی ہوئی جوانی کے باوجود شہسوار کی ایک مقابلے میں شرکت کی تھی۔ ہر سال تیز اندازی، شمشیر زنی اور شہسوار کی ان مقابلوں کا ہتھام ہوتا تھا پھر جو سپاہی یا غیر فوجی امیدوار فاتح قرار پاتا اسے سلطان علاء الدین خلجی کی طرف سے ایک تقریب خاص میں گرفتار انعام دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے شہسوار کی اس مقابلے میں ملک کا نور بھی شامل ہوا تھا۔ اگرچہ ملک کا نور ایک عام شہسوار تھا لیکن سلطان کی قربتوں کے سبب مقابلے میں شریک ہونے والے تمام شہسوار سسے ہوئے نظر آ رہے تھے پھر جب یہ دوڑ شروع ہوئی تو وہ لوگ قصداً پیچھے رہ گئے جن پر فن شہسوار کی ناز کرتا تھا۔ ان لوگوں کو انعام حاصل کرنے سے زیادہ اپنی آبرو اور زندگی عزیز تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا گھوڑا آگے نکل جائے اور پھر ان کی ذات ملک کا نور کے انتقام کا نشانہ بنے۔ مقابلے میں علاء الدین کے غلام سے پیچھے رہ جانے والے زمانہ شناس تھے۔ اس لئے ہوشیاری کے ساتھ بازی ہار گئے۔ مگر اسفندیار کی رگوں میں فوشیروان عادل کا شہابی خون دوڑ رہا تھا وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا اور کچھ دیر بعد ہی اس کا گھوڑا ملک کا نور کے گھوڑے سے بہت آگے نکل گیا۔ اسفندیار نے مقابلہ جیت لیا اور دستور کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی نے اسے بہترین شہسوار کے اعزاز سے نوازا۔

تقریب انعامات میں ملک کا نور، سلطان کے قریب بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا۔ اس نے مقابلہ شہسوار کی ایرانی فاتح کو بہت غور سے دیکھا اور زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ پھر چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ مسلح چوروں کے ایک گروہ نے اسفندیار اور اس کی بیوی کو قتل کر کے سارا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ ہلاکت دہر بادی کے اس کھیل میں اسفندیار کی سترہ اٹھارہ سالہ حسین لڑکی ناہید رباب حیرت انگیز طور پر محفوظ رہی تھی۔ بھری دنیا میں تیار جانے کے بعد ناہید نے عدالت کے دروازے پر گریہ و زاری کی مگر جھوٹی شہادتوں کے ذریعے انصاف کو پہلے ہی گمراہ کر دیا گیا تھا نتیجہً اسفندیار اور اس کی بیوی کا قتل ایک حادثہ قرار پایا۔

قانون سے مایوس ہو جانے کے بعد ناہید نے ایران واپس جانے کی کوشش کی کہ اس کے سارے رشتہ دار وہاں موجود تھے مگر ایک معصوم دوشیزہ پر سلامتی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ پھر کچھ دن بعد ناہید پر یہ خوفناک راز بھی فاش ہو گیا کہ اس کے ماں باپ کو ایک سازش کے تحت ذبح کیا گیا تھا اور اب وہ صرف ملک کا نور کی کنیز بن کر ہی زندہ رہ سکتی تھی۔ ناہید رباب نے کئی بار سوچا کہ خود کشی کر کے جسم اور سانسوں کے درمیان باقی رہ جانے والے رشتے کو توڑ دے لیکن اسے انتقام کے ایک سرکش جذبے نے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ناہید اس طرح دنیا سے جانا چاہتی تھی کہ ملک کا نور اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا ہو اور وہ اس کی دریدہ لاش پر قہقہہ زن ہو۔ مگر یہ ایک خواب تھا، ایک حسرت ناکام تھی جس کے سارے ناہید کے زخمی شب و روز گزر رہے تھے۔

پھر بھی آج جب اس نے ملک کا نور کو پاگل پن کی منزل کے قریب دیکھا تو خوشی کی ایک تیز لہر ناہید کے دل میں اٹھی اور پھر وہ مزید شوقیوں پر اتر آئی۔

”سلطان کے دل پر حکومت کرنے والا زندگی سے اس قدر مایوس ہو گیا ہے کہ اس نے اپنے شہستان کے تمام آئینے تک توڑ دیئے ہیں۔“ ناہید رباب نے ملک کا نور کے سگتے ہوئے زخموں کو ہوا دینے کی کوشش کی۔

”ہاں! میں ایسے تمام آئینوں کو توڑ دوں گا جو مجھے میرے مستقبل کا عکس دکھانا چاہتے ہیں۔“

ملک کا نور کالجہ نفرتوں اور تلخیوں سے بھر گیا تھا۔

تھا۔

”میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں“ ملک کا نور پر شدید حالت اضطراب طاری تھی۔ ”کچھ آئینے میری بے پروائی کی وجہ سے سرکش اور گستاخ ہو گئے ہیں۔“ یہ کہتے کہتے ملک کا نور اس صراحت کی طرف بڑھ گیا جو انکوروں کے ریش سیال سے لبریز تھی۔ ”اے میرے حلق میں انڈیل دے کہ قیامت کی پیاس ہے۔ بے آب صحرائیں بھٹکنے والا کوئی مسافر بھی اتنا پیاس نہیں ہوگا۔“

ناہید رباب نے اسی منافقانہ ادا کے ساتھ رسم ساقی گری ادا کی اور جب ملک کا نور کا جلتا ہوا دماغ کچھ پرسکون ہوا تو وہ دوبارہ قصہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”ناہید! انسانی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے ایک حصہ اس کی اپنی ذات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ زندگی کے اس حصے میں وہ صرف اپنے لئے جیتا اور مرتا ہے۔ پھر جب حیات کے افق پر دوسرا حصہ طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی نسل کیلئے زندہ رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک دن مکمل اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر کس کیلئے؟ میرا ایک حصہ تکمیل پا جائے گا لیکن میں اپنی زندگی کے دوسرے حصے کو کہاں تلاش کروں گا؟ میری کوئی بیوی نہیں، میرا کوئی بیٹا نہیں۔ میں برسوں سے ان دونوں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں اس دنیا کے جہنم میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔“

ناہید، ملک کا نور کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک ”خواجہ سرا“ بھی اپنے سینے میں اولاد کی تمنا کو پروان چڑھا سکتا ہے۔

ابھی ناہید اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ دوبارہ ملک کا نور کی آواز ابھری۔ ”طلب کی اس منزل میں تو ہمارا ساتھ دے گی۔ پھر ہم دونوں مل کر اپنے گمشدہ فرزند کی جستجو کریں گے۔“ ملک کا نور نے آج عجیب غریب خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔

ناہید، ملک کا نور کی بات کا کیا جواب دیتی؟ وہ کچھ دیر تک سنانے کے عالم میں بیٹھی رہی پھر اسے اپنے ماں باپ کے قاتل کی بے کسی دیکھ کر ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا اور اسی احساس نے ناہید کے ہونٹوں کو فاتحانہ مسکراہٹ سے سجایا۔

”تو خاموش کیوں ہے ناہید؟“ غصے اور نشے کی گہری کیفیت نے ملک کا نور کے ہوش و حواس چھین لئے تھے اور وہ ایک ایسی شے کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا تھا جس کا دنیا میں وجود تو تھا مگر وہ شے اس کیلئے قطعاً حرام تھی۔

”حضور! میں بہت دیر سے مسلسل یہی سوچ رہی ہوں کہ آپ اس فرزند کو کس طرح تلاش کریں گے؟“ ناہید کے ایک لفظ میں طنز و دشنام کا زہر بھر اہوا تھا۔

”یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں کہ میں اس فرزند تک کس طرح پہنچوں گا؟“ اچانک ملک کا نور کا غرور اقتدار جاگ اٹھا تھا اور وہ سرمستی کے باوجود غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔ ”اپنے بیٹے کو میں خود ڈھونڈوں گا کہ آخر اس کی ذات سے ہندوستان کا اقتدار وابستہ ہے۔“

پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ناہید نے حیران ہو کر پوچھا ملک کا نور کی ہر بات اس کے ذہن سے بالاتر تھی۔ ”مجھے ہم سے شادی کرنی ہوگی۔“ ملک کا نور کی آواز میں ایک لچک سی پیدا ہو گئی تھی۔ ”اس شادی کے بعد ہماری ذات مکمل ہو جائے گی اور پھر ہم اپنے فرزند کو آسانی سے تلاش کر لیں گے۔“

ناہید رباب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ ملک کا نور کے اس مطالبے کا کیا جواب دیتی؟ مگر اسے بولنے کے لئے مجبور ہو جانا پڑا تھا۔

”میں تو ایک ادنیٰ خاندان کی لڑکی ہوں اور وہ بھی سرد بار تاجپنے والی ایک راقصہ۔ میرے ساتھ آپ کی شادی اس قدر بے جوڑ ہوگی کہ تاریخ آپ کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔“ یہ کہہ کر ناہیدرباب چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں انسان کو ذلیل کر دینے والی شرارت رقصاں تھی اور ہونٹوں پر ایک خاص تبسم ابھرنے ہی والا تھا کہ ملک کا نور نے ناہید کو خاموش پا کر غبار آلود آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ناہید نے فوراً بولنا شروع کر دیا۔ ”آنے والا زمانہ آپ کے بچوں پر یہ کہہ کر انگشت نمائی کرے گا کہ اس خاندان میں عیب ہے، چونکہ لگا یا گیا ہے۔ ایک وفادار کنیز کی حیثیت سے میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ آپ کی ”ذات محترم“ تاریخ ہندوستان میں ایک مستقل الزام بن کر رہ جائے۔“ ناہید کے دل میں جس قدر زہر پوشیدہ تھا وہ سب کاسب الفاظ کے ذریعہ باہر آ رہا تھا مگر ملک کا نور کو نشے کی زیادتی اور شدید احساس محرومی نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکے یا کسی کی بات سمجھ سکے۔

”میں کسی خاندان کو اہمیت نہیں دیتا۔ میں خود اعلیٰ نسب ہوں اس لئے مجھے کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔“ تاریخ جس اتنا یاد رکھے گی کہ ملک کا نور آیا اور ہندوستان کے ایک ایک گوشے پر چھا گیا۔ تمہارے بارے میں کون پوچھے گا کہ تم کہاں سے آئی ہو اور کیا کیا کرتی رہی ہو؟ میری بیوی ہو جانے کے بعد لوگ تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈریں گے۔ ان کی سانسیں تک آواب شامی کی پابند ہو جائیں گی۔ نگاہیں سجدہ پر ریز ہیں گی اور دل ہمیشہ اطاعت میں جھکے رہیں گے۔“ یہ کہہ کر ملک کا نور، ناہید کے قریب آیا اور محبت آمیز لہجے میں بولنے لگا۔

”ویسے تو تمہارا دل، تمہارا دماغ، تمہاری ایک ایک سوچ اور تمہارا ایک ایک جذبہ ہمارے حکم کا پابند ہے مگر پھر بھی شریک حیات کی حیثیت سے ہم تمہاری مرضی کو زیادہ اہمیت دیں گے۔“

اب ناہید کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ذہانت اور حکمت عملی کے ساتھ ملک کا نور کی اس دیوانگی کو قابو میں رکھے اور اپنی ذات کو مزید تماشائے بے پناہ سے بچائے۔

پھر وہ لمحہ آ گیا جب ناہید کے ہونٹ بے اختیار ہوس گئے۔ ”حضور! یہ کنیز آپ کی نوازشات کا شکریہ کس طرح ادا کرے کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے مگر پھر بھی میں اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ شادی کس طرح ہوگی؟ ایک میں ہی نہیں، تمام اہل دربار، تمام اہل شر اور پورا ہندوستان آپ کی اس مجبوری کو جانتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

ابھی ملک کا نور کے زور نگار کمرے میں ایک راقصہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اس کے ہاتھ سے ساغ شراب چھوٹ کر اس قیمتی قالین پر گر گیا جو کسی مفتوح حکمران نے علاء الدین خلجی کو بطور نذر پیش کی تھی اور پھر سلطان نے وہی نادر و نایاب تحفہ اپنے غلام کے حوالے کر دیا تھا۔

ملک کا نور کچھ دیر تک سکتے عالم میں کھڑا رہا پھر جھپٹ کر اس نے اپنے بستر کے قریب سے ایک چمکدار زہر آلود خنجر اٹھالیا۔ ناہیدرباب کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے تمام احتیاطوں کے باوجود ملک کا نور کو ذہنی غلیظ ترین گالی دے ڈالی تھی الفاظ کمان سے نکلے ہوئے تھے انہیں واپس نہیں لایا جاسکتا تھا۔ ناہید اپنا

زندگی کے انجام کو قریب تر دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ملک کا نور کے قدموں پر سر رکھ کر سانسوں کی ہیکہ مانگ سکتی تھی مگر اب یہ بھی ممکن نہیں تھا دنیا میں وہی لوگ معاف کرتے ہیں جن کے دل کشادہ ہوتے ہیں۔ معانی اعلیٰ ظرفی کا رد عمل ہوتی ہے اور ملک کا نور کا ظرف علاء الدین خلجی کے دربار میں اتنی بار غلام ہونے

تھا کہ اب نہ اس کو کوئی قیمت تھی اور نہ وجود باقی رہا تھا اس لئے ناہید نے ملک کا نور سے رحم کی ہیکہ نہیں مانگی۔

س وہ عجیب نظروں سے ملک کا نور کے اس ہاتھ کو دیکھتی رہی جس میں زہر آلود خنجر چمک رہا تھا۔ ملک کا نور کسی غضب ناک بھینچنے کی طرح آگے بڑھتا رہا اور ناہیدرباب بند دروازے کی جانب پیچھے ہٹتی رہی یہاں تک کہ کمرے کا درمیانی فاصلہ ختم ہو گیا اور ناہید کی پشت اس دیوار سے جا لگی جس کے قریب صندل کی لکڑی کا مکمل ہوا دروازہ تھا اور دروازے کے باہر وہ زندگی تھی جس کی تلاش میں بے شمار انسان دن رات سرگرداں رہتے ہیں۔

ناہیدرباب کی نظریں ملک کا نور کے چہرے پر مرکوز تھیں اور ملک کا نور کے انداز غضب میں وہ تمام خاکیاں شامل تھیں جو پیشہ ور قاتلوں کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

”ہمک حرام راقصہ! آخر تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟“ ملک کا نور اس اعلیٰ نسب و شہینہ کو نہایت غلیظ لہجے میں بار رہا تھا۔ جسے گردش وقت نے علاء الدین خلجی کے ایک حقیر غلام کے سامنے تاجپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر چرب مجبوریاں حد سے گزر گئیں تو ناہید نے اپنے چہرے سے مصلحت کی نقاب اٹار چھینکی اور منافقت باز نظروں میں جکڑے ہوئے الفاظ کو ان کی حقیقی آزادی بخش دی۔ کئی برسوں سے سینے میں دبکتی ہوئی آگ نے ناہید کے ہونٹوں کو جلا ڈالا۔ ”تو وہ ہے جس نے نسل آدم کی دو جنسوں کو سرسازار ر سوا کیا ہے۔“ ناہیدرباب کی آواز ابھری تو ملک کا نور کے کمرے میں ہر طرف انگارے بکھر گئے۔ ”مجھ لاوارث

در کمزور عورت پر اپنی مردانگی کیوں آزماتا ہے؟ سلطان علاء الدین کے جیسے! ہمارا افواج کے سپہ سالار! لڑتے ہیں ہمت ہے تو اہل دربار سے سوال کر کہ تو کون ہے؟ خلجی حکمران سے پوچھ کہ وہ تجھے کیا سمجھتا ہے؟“

ملک کا نور کی ایک ادنیٰ کنیز نے آج اسے وہ آئینہ دکھایا تھا کہ جس کے سامنے تمام آئینے دھندلے پڑ گئے تھے۔ ملک کا نور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ ایک لمحے کیلئے ملک کا نور نے سوچا کہ قاصد اپنی جان بچانے کیلئے جیجی کی یا حراحت کرے گی مگر ناہید نے اس کے دونوں اندازوں کو جھٹلادیا تھا۔

ہید کمرے کے صندلی دروازے سے ٹیک لگائے اس طرح دست قائل کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کے نبوب کا ہاتھ ہو جس میں زہر آلود خنجر کے بجائے منکلتے ہوئے پھولوں کا گجر ہو اور جو سماعت کیف و نشاط میں اس کے گلے کا پار بننے والا ہو۔

ملک کا نور کا ہاتھ بار بار فضا میں بلند ہو رہا تھا کہ شاداب جسم کو مشق ستم بنا کر علاء الدین خلجی کے نظور نظر کا ہوا ناہید کے سینے پر شفق رنگ نشان چھوڑا جا رہا تھا اور وہ تبسم تن راقصہ اس طرح زخم کھاری

ی جیسے کوئی مرد شجاع میدان میں اس خوف سے پیٹھ نہیں موڑتا کہ تاریخ میں اس کے نام کے ساتھ سوائیاں رقم ہو جائیں گی۔ ناہیدرباب نے بھی اس طرح زخم کھائے کہ جب وہ تبسم جاں ہو کر فرش پر گری تو

ارے زخم سینے پر روشن تھے پشت پر ملک کا نور کے خنجر کا ایک نشان بھی نہیں تھا۔

”تو نے اپنی گستاخی کا انجام دیکھ لیا۔“ ملک کا نور نے خون میں نہائی ہوئی راقصہ کو مخاطب کرتے ہوئے

ما۔ ”ایک کیڑا اس وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک وہ اپنے آقا کے سامنے سے دور دور چلتا رہے۔

لہرانوں کی قدم بوسی حشرات الارض کیلئے موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ ہماری عظمتوں کی قبا کو داغدار نے والوں کے ساتھ فرشتہ اجل یہی سلوک کرتا ہے۔“ ملک کا نور کے لہجے میں خدائی کے دعویداروں

بساغور سمٹ آیا تھا۔

ناہید نے بمشکل اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور لرزتے ہوئے لہجے میں آخری الفاظ ادا کیے۔

”ملک کا نور! میں جا رہی ہوں کہ اس دنیا کی ہر شے جانے ہی کے لئے آئی ہے مجھے معلوم ہے کہ تجھ سے

میرے خون ناحق کا حساب طلب کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر یاد رکھنا کہ اس زمین پر حشر سے پہلے ایک اور حشر برپا ہو گا جہاں میرا المومرا ہے تو بھی اسی جگہ اپنی قبر کھودے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین تیرا جسم قبول کرنے سے منکر ہو جائے۔“

اس کے ساتھ ہی سازتھم گئے، رقص زندگی ختم ہو گیا اور پازیب ٹوٹ کر بکھر گئی۔

نہ مدعی نہ عدالت، حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

کچھ دیر بعد ملک کافور کے معتمد پرے دار سپاہی رقاہ نہایدرباب کی لاش اٹھا کر لے گئے اور کسی ویران قبرستان میں وہ دو شیزہ دفن کر دی گئی جس کا نہ کوئی وارث تھا اور نہ جس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

اگرچہ ملک کافور سے اس خون کا حساب مانگنے والا کوئی نہیں تھا لیکن شدید وحشت واضطراب نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا۔ رقاہ سے قتل نے اس کی آنکھوں سے نیند نہیں چھینی تھی یہ تو سیاست کا پرانا مشغلہ تھا کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں۔ ملک کافور کی یہ کرناک بے چینی محض اس لئے تھی کہ آج اسے پہلی بار اپنی حیثیت کا اندازہ ہوا تھا۔ ملک کافور کا خیال تھا کہ جلال شای نے رعایا سے ان کی زبانیں چھین لی ہیں اور وہ گونگوں کی ہستی پر قابض ہے مگر آج اس خوش فہمی کا پردہ بھی چاک ہو گیا تھا اور ملک کافور اس راز کو جان چکا تھا کہ ہر منہ میں زبان موجود ہے جب ایک رقاہ اسے فحش ترین گالی دے سکتی ہے تو پھر امرائے دربار؟ ملک کافور اس سے آگے نہ سوچ سکا چند ساعتوں کے لئے ملک کافور کے دل میں سلطان علاء الدین خلجی کے خلاف نفرتوں کا طوفان اٹھا مگر اس طوفان کی حقیقت پانی کے ایک بلبلے سے زیادہ نہیں تھی۔ سطح آب پر نفرت کا وہ جاب فوراً ہی ابھر کر ڈوب گیا اور ملک کافور کا پورا جسم اس خوف سے کانپنے لگا کہ کسی دیوار یا قندیل و فانوس نے اس کے خیالات کو نہ پڑھ لیا ہو اور پھر یہ راز سلطان تک منتقل نہ کر دیا جائے اسی قسم کے اندیشوں نے ملک کافور کی پشت بستر سے نہ لگنے دی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

دربار کے آرامتہ ہونے سے پہلے ہی ملک کافور نے علاء الدین خلجی سے خلوت میں حاضر ہونے کا اجازت مانگی پھر جب سلطان نے اسے شرف حضور کی بخشا تو وہ گریہ و زاری کرتا ہوا فرمانروائے ہند کے قدموں سے پلٹ گیا۔ اشک ریزی کے دوران رقاہ کے قتل کا پس منظر بیان کیا اور پھر ایک ادائے خاص کے ساتھ علاء الدین خلجی سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

”سلطان معظم! اس نے مجھے آپ کے حوالے سے دنیا کی غلیظ ترین گالی دی تھی اس لئے غلام یہ سہ کچھ برداشت نہ کر سکا۔“

علاء الدین خلجی نے ملک کافور کے اس جابرانہ فعل کی روداد خاموشی سے سنی اور پھر نہایت تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

”ملک! ہم نے تجھے یہ اختیارات نہیں دیے ہیں کہ تو لوگوں کی زندگی سے موت کا کھیل کھیلے حرکتوں سے خوشامد ہو اور حاشیہ بردازوں کا کیا بکڑے گا؟ رسوائی تو ہماری ہوگی لوگوں کی زبانیں چڑھیں گی تو دل چچ اٹھیں گے کہ ان کا سلطان خواب غفلت میں سو گیا ہے۔ ہمارے نامہ اعمال میں اس ہمتیں تحریر نہ کر کہ ہمارا قہر بیدار ہو جائے اور پھر تیری محبوبیت بھی ہمارے جبر کے اس سیلاب کو نہ رو سکے۔ تجھے ہر قدم پر اس کا لحاظ رہنا چاہئے کہ رعایا کی جان و آبرو کی حفاظت سلطان کا فرض اولین ہے۔“

کہہ کر علاء الدین خلجی نے منہ پھیر لیا اور ملک کافور سر جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

نہایدرباب کی حقیقت بیانی اور رانی پد منی کی شعلہ سامانی نے ملک کافور کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ مسلسل اس حادثے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ابھی رونما نہیں ہوا تھا اگر وہ حادثہ پیش آجاتا تو ملک کافور کے خیال میں دربار شای زیر وزیر ہو کر رہ جاتا ایک طرف رانی پد منی اس کی محبوبیت پر شب خون مارتی اور دوسری طرف علی عامر آفریدی ایک قزاق کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کا اقتدار لوٹ لیتا۔ اس طرح رانی پد منی اور آفریدی بیک وقت اس کے رقیب بن کر رہ گئے تھے۔

”رانی پد منی میری پہنچ سے دور ہے۔“ ملک کافور نے ایک وحشت زدہ انسان کی طرح خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آفریدی نے ابھی وہلی کی حدود سے باہر قدم نہیں نکالا ہے ابھی وقت میری گرفت میں ہے اگر یہ گرفت کمزور ہو گئی تو پھر وقت کی رفتار کو اپنے حق میں نہیں موزا جاسکے گا۔“

اس خیال کے آتے ہی ملک کافور کی ساری توجہ علی عامر آفریدی کی ذات پر مرکوز ہو گئی۔ دربار پر خاست ہونے کے بعد ملک کافور، علی عامر آفریدی سے تنہائی میں ملا۔

”آفریدی! تمہیں یہ کامیابیاں اور سلطان کی یہ قربتیں مبارک ہوں۔“ ملک کافور کا لہجہ بظاہر عامیانا تھا مگر اس کے ایک ایک لفظ میں نفرت و حقارت پوشیدہ تھی۔

علی عامر چند لمحوں تک سلطان علاء الدین خلجی کے محبوب غلام کو بخور دیکھتا ہوا پھر آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگا۔ ”میری یہ کامیابیاں کوئی نئی بات نہیں تاریخ نگاہ ہے کہ جو انمردوں اور سرفروشن کو خدائے عزیز و جلیل نے اسی طرح سرفراز کیا ہے۔“

”جو انمرد و سرفروش؟“ ملک کافور کا تہقہ بلند ہوا۔ آفریدی کی جو توہین الفاظ کے ذریعے نہیں ہو سکتی تھی اس کی تکمیل ملک کافور کے تہقہ نے کر دی تھی۔ ”آج معلوم ہوا کہ تم جو انمرد بھی ہو اور سرفروشن بھی۔“ ملک کافور نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ آج وہ ہر عنوان آفریدی کی تبدیل کرے گا۔ ”تم اپنے موجودہ اعزاز کو ذاتی کوششوں کا نتیجہ سمجھتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ سلطان کی بے جا خوشامد نے تمہیں اس درجے تک پہنچایا ہے۔“ ملک کافور نے بڑی عیاری کے ساتھ ایک غیرت مند افغان کی رگ احساس پر مکمل ضرب لگادی تھی۔

اس نازک موقع پر علی عامر اپنی قبائلی صفات کی وجہ سے قہر و غضب کا آتش فشاں بن سکتا تھا مگر فطرتاً وہ نہایت متحمل مزاج جو جوان تھا اس لئے ملک کافور کی بات سن کر کچھ دیر تک مسکراتا ہوا پھر بڑے معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ ”خیر! مجھے تو خوشامد نے اس منصب تک پہنچایا ہے مگر تم اپنے بارے میں سوچو کتنی ہے تم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔“ اتنا کہہ کر علی عامر آفریدی اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر جاتے جاتے چانک ٹھہر کر بولا تھا۔

”ملک کافور! خدا کسی کسی انسان کو یہ توفیق دیتا ہے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ سکے کاش! تمہیں بھی یہ سعادت حاصل ہو جائے کہ تم آئینے میں ایک بار ہی اپنا چہرہ دیکھ لو۔ پھر کسی کی غیرت و مردانگی کا اس طرح مذاق نہیں اداؤ گے۔“ علی عامر آفریدی نے مذہب لہجے میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔

مگر بے حیا لوگ شائستگی اور تہذیب کی زبان نہیں سمجھتے۔ پتھر کے دل پر کسی گلاب کی پنکھڑی کے مگرے کا کیا اثر ہو گا؟ سوائے اس کے کہ وہ گلاب کی پنکھڑی بکھر کر خود اپنا ہی وجود کھو بیٹھے۔

علی عامر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا ملک کافور کے دل میں اس کی طرف سے حد کا غلیظ رنگ جذبہ بہت دن سے پرورش پا رہا تھا آج وہ ایک لمحے میں اپنی تمام تر کشتافوں کے ساتھ جوان ہو گیا تھا۔

علی عامر ایک بلند حوصلہ اور شجاع انسان تھا اس لئے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ملک کافور کے چہرے پر خباثتوں کے کتنے رنگ ابھر آئے ہیں۔

زندگی کا یہی وہ موڑ تھا جہاں پہنچ کر علی عامر آفریدی جیسا فرض شناس نوجوان ملک کافور کی دشمنی اور اذیت رسانی کا مستقل نشانہ بن گیا تھا۔ اگر آفریدی ایک لمحے کے لئے ٹھہر جاتا تو وہ ملک کافور کی زبان سے ادا ہونے والے وہ الفاظ سن لیتا جو ہر دور کے سازش کرنے والوں نے ہزار پروں میں چھپ کر کئے

تھے۔ ملک کافور کہہ رہا تھا۔ ”آفریدی! یہ مت سوچ کہ دنیا مجھے کیا کہتی ہے؟ یہ دیکھ کہ آنے والا زمانہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔“

اس کے بعد ملک کافور کینہ پروری کی آگ میں سلگتا ہوا محل واپس چلا گیا اور اس کے پرانگندہ ذہن میں علی عامر کے خلاف مختلف تصورات ابھرنے لگے۔

پھر اسی رات ملک کافور نے دربار شاہی کی ایک اور راقصہ زہرہ جمال کو طلب کیا۔ یہ ایک ایسی راقصہ تھی جو دوسری لڑکیوں کے ہجوم میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے سلطان علاء الدین خلجی اور دوسرے امراء سلطنت کا دل بسلا یا کرتی تھی۔ اگرچہ وہ فن رقص سے بخوبی واقف تھی لیکن ملک کافور کی سفارش حاصل نہ ہونے کے سبب دربار شاہی میں زہرہ جمال کافور بھجھا نظر آتا تھا۔ اس نے ملک کافور سے دبے لہجے میں کئی بار اس ناقد رنی فن کی شکایت بھی کی تھی مگر ملک کافور ہمیشہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

”تمام راقصائیں یہی لگہ کرتی ہیں مگر انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ چشم خریدار میں رہنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔“

اس دل شکنی کے بعد زہرہ جمال اپنے روشن مستقبل سے مایوس ہو گئی تھی اور اب اس کی زندگی محض ایک ایسا اھلوتا تھی کہ جس کی طرف سلطان یا دوسرے درباری دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اور شاہی مجلس کیف و نشاط میں اس کا داخلہ عام خدمت گاروں کی نظر کرم کامرہوں منت ہو کر رہ گیا تھا مگر آج جب ملک کافور نے اسے تنہائی میں طلب کیا تھا تو وہ چند لمحوں کے لئے چونک اٹھی تھی۔ زہرہ جمال کا خیال تھا کہ شاید اس کے مقدر کے سنورنے کی گھڑی آگئی ہے ورنہ سلطان کا سب سے منہ چڑھا مصاحب اسے اس طرح طلب نہ کرتا۔

اپنے بے شمارنا آسودہ جذبات اور منتشر خیالات میں گھری ہوئی زہرہ جمال ملک کافور کی عشرت گاہ میں داخل ہوئی۔ چند لمحوں تک وہ عالم حیرت میں کھڑی اس کمرے کی آرائش کو دیکھتی رہی جس پر دنیا پرستوں کے بقول جنت ”ارضی“ کا گمان ہوتا تھا۔ زہرہ جمال یہاں آکر کھوس گئی تھی ایسا لگتا تھا کہ دنیاوی آسائشوں سے محروم راقصہ کچھ دیر اس زمینی جنت میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

ابھی زہرہ جمال اپنے پیاسے خوابوں کے جزیرے میں مبسوت کھڑی تھی کہ ملک کافور نے گرجدار آواز میں اسے پکارا۔ ”کیا سوچ رہی ہے لڑکی؟“

”کچھ نہیں حضور۔“ زہرہ جمال خوابوں کے اجنبی کو پے سے نکل آئی تھی اور اب اس کے چہرے پر سراپسیگی اور ندامت کا گہرا عکس نظر آ رہا تھا۔

”ہم تیرے دل سے واقف ہیں کہ وہاں کیسی کیسی حسرتیں کروٹیں لے رہی ہیں۔“ ملک کافور کا ہوج ٹھہرا ہوا تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی کا یہ خبیث فطرت مہرہ زندگی کی بساط پر کیسی خونخاک چال چلنے والا ہے۔

”نہیں حضور! ہم اس ہستی کے رہنے والے ہیں جہاں کے لوگ خواب نہیں دیکھ سکتے۔“ زہرہ جمال کی آواز سے روح کا کرب جھلک رہا تھا۔ ”بس کچھ دیر کیلئے اپنے اطراف پر یہ بے قرار نظریں ٹھہر جاتی ہیں۔“

روں کے بہنے کو خواب کون کہہ سکتا ہے؟ خواب تو وہ ہوتے ہیں جن میں انسان کھو کر رہ جاتا ہے۔ وقت بے کھونے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ اگر جبرائیل وادیوں میں کھونے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ سنگدل گھنگھرو نکال دیتے ہیں اور یہ بے رحم پائل جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے۔ ”زہرہ جمال کے دل کا درد خون ہو کر اس کے نٹوں سے بہہ رہا تھا۔

”لڑکی! تو ٹھیک کہتی ہے۔“ ملک کافور کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”یقیناً تجھے اب دیکھنے کا حق حاصل نہیں مگر دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی شخص کو ہر رنگ کے خواب لہانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر تو میرے حکم پر عمل کرے گی تو میں تجھے تیری زندگی کا سب سے سنہری اب دکھاؤں گا۔“

راقصہ کسی بچے کی طرح محل اٹھی۔ ”سرکار! یہ کینز تو پیدا اسی لئے ہوئی ہے کہ آپ کی ایک جنبش چشم پر بان ہو جائے۔“

”تو علی عامر آفریدی کو پہچانتی ہے؟“ اچانک ملک کافور نے زہرہ جمال سے ایک غیر متوقع سوال ڈالا۔

”وہی سردار آفریدی، جنہیں کئی جنگوں میں فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور جو آج کل سلطان کے بہت پیب نظر آتے ہیں۔“ زہرہ جمال نے علی عامر سے شناسائی کا اس طرح اعتراف کیا جیسے وہ ن افغان زادے کے حالات سے بہت زیادہ باخبر ہو۔

”سردار آفریدی نہیں! صرف علی عامر آفریدی۔“ یکایک ملک کافور غضب ناک ہو گیا تھا، اس نے نام مان کو سرداری کے مرتبے تک میں نے پہنچایا ہے۔ میری نگاہ کرم سے پہلے اسے یہاں کون جانتا تھا؟

ن کی تمام فتوحات بھی میری جنگی حکمت عملی کا صدقہ ہیں۔“ بات اچانک بگڑ گئی تھی اس لئے زہرہ جمال نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”حضور! آپ کو ان احسانات کے شمار کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ آفریدی آپ کا ممنون کرم ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ ملک کافور کا غصہ بظاہر کم ہو گیا تھا مگر لہجے کی رعوت اب بھی برقرار تھی۔ ”جس روح ہم نے آفریدی کو پستی سے اٹھا کر منزل عروج تک پہنچایا ہے، اسی طرح ہم تیرے خوابوں کو بھی زندہ تعبیر کریں گے۔“ ملک کافور کی گفتگو میں ابہام تھا۔

”مجھے حکم دیجئے۔“ جوش جذبات سے زہرہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں تو حضور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کی پابند ہوں۔“

راقصہ کو اس بے قراری کے ساتھ آمادہ پاکر ملک کافور نے اپنا وہ غلیظ منصوبہ پیش کر دیا۔ ”تم آج ہی آفریدی کے مکان پر جا کر اس کی ماں اور بہن کے سامنے اس راز کو فاش کر دو گی کہ علی عامر نے محبت کے جھوٹے خواب دکھا کر تمہیں برباد کیا اور اب شادی سے انکار کر رہا ہے۔“ یہ کہتے کہتے ملک کافور کے چہرے پر انسانی فطرت کی تمام سیاہیاں ابھر آئی تھیں۔

”حضور! یہ کیسے ممکن ہے؟“ زہرہ جمال کی آواز بجھتے ہوئے چراغ کی مانند تھر تھرا رہی تھی۔ ”دربار کے نام لوگ سردار آفریدی کو پہچانتے ہیں کہ انہیں کیف و نشاط کے ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اقتدار کے باوجود کسی نے ان کے قدموں کو لٹکھڑاتے نہیں دیکھا پھر میں یہ کس طرح کہہ سکوں گی کہ ان کے ہنکے سے قدم میرے مکان تک آئے اور مجھے برباد کر کے چلے گئے۔ میں نے تو کبھی ان کی نظروں کو بھی بہکتے

ہوئے نہیں دیکھا پھر میں کیسے ان کے نام کے ساتھ یہ سنگین تہمت منسوب کر سکوں گی۔
 ”تو پھر یہ تہمت خود تجھ پر لگ جائے گی۔“ ملک کافور بے قابو شعلے کی طرح بھڑک اٹھا ”جسم فروشی کی تہمت نہیں کہ یہ تو تیری زندگی ہے۔ ہم تجھ پر موت کی تہمت لگائیں گے وہ موت جو ہمارے حکم سے آتی ہے تو پھر ملتی نہیں۔“

زہرہ جمال سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک کافور اس کی ترسی ہوئی آنکھوں کو اس قدر لرزہ خیز خواب دکھائے گا۔ رقصہ کے دل نہ دھڑکنیں پہلے ہی بے ترتیب ہو چکی تھیں، اب آنکھوں کے سامنے تباہیوں کا دھواں بھی پھیلنے لگا تھا۔ پھر وہ اپنے قدموں کا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ملک کافور کے سامنے ہی سنگ مرمر کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے ہی لمحے ملک کافور نے اسی قبیلے کی چند جوان عورتوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کسی مخصوص خوشبو کے استعمال سے زہرہ جمال ہوش میں آگئی۔ ملک کافور کی آنکھ کے دوسرے اشارے نے ایک بار پھر کمرے کو دوسری عورتوں کے وجود سے خالی کر دیا۔

ملک کافور دوبارہ زہرہ سے مخاطب ہوا: ”بس اب تو اپنے گھر جا اور ہمارے حکم پر عمل کر۔“ آفریدی دو چار دن میں چوڑو روانہ ہونے والا ہے اس سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ وہ دہلی کے ہر گلی کوچے میں رسوا ہو جائے اور پھر ہم تجھے تیرا حق دلانے کیلئے اس خوشامدی پٹھان زادے کو سلطان معظم کی عدالت عالیہ میں کھینچ لائیں۔“ منصوبے کی وضاحت ہو چکی تھی اس لئے رقصہ زہرہ جمال لرزے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی جہاں ایک اندھی ماں اور معصوم بہن بھائی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

گھر پہنچتے ہی زہرہ جمال اس طرح بستر پر گر گئی جیسے آندھی کے تیز جھونکے نے نئی دن کے باسی پھول کو شاخ سے الگ کر دیا ہو اندھی ماں ٹھوکر میں کھاتی ہوئی بیٹی کے بستر تک آئی اور اس لڑکی کی مزاج پر سی کر نے لگی جس کی شاہی ملازمت پر ایک غریب گھرانے کی زندگی کا انحصار تھا۔

نایاباں، بیٹی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کیا دیکھتی؟ پھر بھی زہرہ جمال نے اپنے لبوں پر جبری تبسم سماایا اور شگفتہ لہجے میں ماں کو بتانے لگی کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے مگر درباری مصروفیات نے جسم کو تھکا ڈالا ہے خوش فہمی کے سہارے زندہ رہنے والی ماں مطمئن ہو کر چلی گئی اور زہرہ جمال کا ذہن منتشر خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک تصور ڈوبنے بھی نہیں پاتا تھا کہ دوسرا ابھر آتا تھا۔

یہ ایک راز تھا کہ رقصہ زہرہ جمال، علی عامر آفریدی کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھی وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتی تو دل میں ایک عجیب سی خواہش موجزن ہو جاتی۔ وہ آفریدی سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس نے یہ خواب ہمیشہ دیکھے تھے کہ کاش علی عامر جیسا کوئی نوجوان اس کا ہم سفر ہو۔ زہرہ نے بہت پہلے دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ جب بھی آفریدی کی طرح کوئی مرد اسے زندگی کے ناموار راستوں پر نظر آئے گا وہ اسے پکارے گی اور اپنا دل داغ داغ اس کے قدموں میں رکھ کر کہے گی۔

”مسافر! میں نہ جانے کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی میری طرف دیکھ کہ ان آنکھوں میں کیسے چراغ روشن ہیں اور دل پر نظر ڈال کہ وہاں آرزوؤں کے کتنے سمندر قید ہیں۔“

پھر وہ اسے اپنے شیشہ جسم و جان کے ٹوٹنے کا ایک ایک راز بتا دے گی۔ اگر اس نے شیشے کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی اعلیٰ طرفی کے دامن میں سمیٹ لیا تو وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت سمجھ گی اور اگر وہ نظر پھیر کر چلا گیا تو اسی طرح سردر بار تابی رہے گی یہاں تک کہ اس کے پاؤں شل ہو جائیں گے

اور جھگھرہ وٹوٹ کر اہل زر کے قدموں میں بکھر جائیں گے۔
 زہرہ جلتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ آج اس کی زندگی میں وہ دن آیا بھی تھا تو کس انداز سے آیا تھا۔ علی عامر آفریدی جو اس کے خیالی محبوب کا ہم رنگ تھا اسی کے ہاتھوں ایک خوفناک سازش کا شکار ہوا جا رہا تھا۔

اچانک زہرہ جمال کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور پھر یہی برق اس کے دل پر چکی پھر اسے اپنی روح میں ایسی پیش محسوس ہوئی کہ وہ بستر پر دراز نہ رہ سکی۔ ماضی کی بربادی، حال کی ساری شکستگی اور مستقبل کے تمام خوابوں کو فراموش کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زہرہ کے دل و دماغ ایسے زلزلے کی زد پر تھے جو اسے تباہیوں کے مدفن کی طرف پکار رہا تھا۔ رقصہ نے گھر اگر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

زہرہ جمال، ملک کافور کی سازشی ہواؤں کو اندر نہیں آنے دینا چاہتی تھی مگر وہ اقتدار کی ہوائیں تھیں۔ ایک بے سارا اور کمزور رقصہ کے مکان کے روزنوں سے گزر آئیں دروازے پر کاٹ بنے تو گرا دیئے گئے۔ درپچوں نے مزاحمت کی تو توڑ دیئے گئے۔ ہواؤں کو آنا تھا، وہ اندر آ گئیں۔ زہرہ جمال ضرب اقتدار سے ٹوٹ کر بکھرے ہی والی تھی کہ اس کے معصوم جذبوں نے اسے سمیٹ لیا وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل زمین پوس ہونے لگی تھی لیکن ایک آرزوئے خوں گشت نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا اور پھر اس شکستہ عورت نے ایک نئے جذبے کو حقیق کیا۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑی عجیب رات تھی کہ جب درباری رقصہ زہرہ جمال گہری تاریکی میں علی عامر آفریدی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی آخر مسلسل کئی دستکوں کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والا خود علی عامر تھا وہ اندھروں کی قابیں لیے ہوئے ایک انسانی ہولے کو دیکھ کر جھجکا پھر نہایت سخت لہجے میں کہنے لگا۔

”تم کون ہو جو نصف شب کے قریب میرے مکان تک آئے ہو؟ آخر تم کس مصیبت کا شکار ہو؟ جلدی بتاؤ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“

”میں زہرہ جمال ہوں، آنے والے نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور علی عامر حیرت سے چونک اٹھا رات کے سنائے میں ایک نسوانی لہجے کی گونج نے اسے عجیب سی ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ آفریدی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آدھی رات کے قریب کوئی اجنبی عورت بھی اس کے گھر تک آ سکتی ہے۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے چند لمحوں میں اپنی تمام رشتے دار خواتین کے بارے میں سوچ ڈالا انکراس نام کی کسی عورت سے آفریدی کا کوئی خاندانی تعلق نہیں تھا۔

”میں زہرہ جمال کو نہیں جانتا۔“ بالآخر علی عامر آفریدی نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو بڑی سبر فہمی کے ساتھ پہچاننے سے انکار کر دیا۔

”مجھے اندر آنے دیجئے۔“ زہرہ کے لہجے میں التجا تھی۔ ”میں اندر آ کر سب کچھ بتا دوں گی پھر آپ مجھے پہچان جائیں گے۔“

اگرچہ ایک لمحے کے لئے آفریدی کی غیر معمولی ذہانت نے حالات کے اس زاویے پر بھی سوچا تھا کہ ایک اجنبی عورت کی آمد اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو لیکن وہ فطرتاً شجاع تھا اس لئے ان معمولی واقعات سے گھبرانا اس کی سرشت نہیں تھی۔ ”خاتون! تم اندر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر علی عامر نے راستہ چھوڑ دیا اور زہرہ جمال رات کی تاریکی میں اس پٹھان زادے کے مکان میں داخل ہو گئی جو چند روز بعد سلطان علاء الدین

خلجی کا-غیر بن کر سرکش راجپوتوں کے دربار میں جانے والا تھا۔
آفریدی اور زہرہ جمال کی گفتگو سن کر اس مکان کی بوڑھی مالکہ بھی بیدار ہو چکی تھی جسے پٹھانوں کی تاریخ شائستہ بیگم کے نام سے جانتی ہے اور جو رشتے میں علی عامر آفریدی کی ماں تھی۔ شائستہ بیگم کے ساتھ اس کی بیٹی عالیہ آفریدی بھی جاگ گئی تھی۔ جب ماں اور بیٹی نے آفریدی کے ساتھ ایک اجنبی عورت کو مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ چونک اٹھیں ان کی پوری زندگی میں بڑی انسانی بات ظاہر ہوئی تھی۔ جیسے ہی زہرہ جمال مکان کے طویل آنگن سے صحن میں آئی اور اس کے دلکش چہرے پر قندیل کی روشنی پڑی تو شائستہ بیگم بے اختیار کہہ اٹھیں۔

”آفریدی! یہ کون لڑکی ہے؟“ ماں کے لمحے میں کڑھکی بھی تھی اور دہی دہی نفرت بھی۔ پٹھانوں کی مخصوص رسمیں کسی اجنبی عورت کو شب کے اندھیرے میں ایک اجنبی مرد کے ساتھ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھیں۔

”یہ مجھے نہیں جانتے مگر ایک معزز سردار ہونے کے سبب میں ان سے بخوبی واقف ہوں۔“ رقاہ زہرہ جمال بہت آہستہ لمحے میں بول رہی تھی۔ ”میں نے بہت سوچا کہ میں اس معاملے میں وہی کردار ادا کروں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے مگر میری خاندانی غیرت نے گوارہ نہیں کیا کہ سردار آفریدی کے دامن پر میری وجہ سے بدنامی کا کوئی داغ ابھر آئے۔“ زہرہ جمال کالج بہت پر سوز تھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے ابھر رہا تھا۔

رقاہ کی بات سن کر شائستہ بیگم کی جہانگیرہ نظروں میں کئی سوالات ابھرنے لگے تھے۔
”کیا سردار بار پانے والی عورتیں بھی غیرت کا مفہوم سمجھتی ہیں؟“ شائستہ بیگم نے بڑے جارحانہ انداز میں زہرہ جمال کے احساس پر نشتر زنی کی تھی۔

”ہاں مادر محترم! ایک رقاہ بھی اپنے سرایہ غیرت کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ شہنشاہوں کے دربار میں جسم بقیہ پامال ہو جاتے ہیں لیکن جذبات نہیں خریدے جاسکتے۔ انسانی جذبات تو اتنے پاگل اور سرکش ہوتے ہیں کہ وہ جبراً کسی کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے۔ میں خاندانی رقاہ نہیں ہوں میرا باپ بھی ایک غیرت مند قبیلہ کا سپاہی تھا جسے جنگ کے عفریت نے نگل لیا پھر وقت نے وہ ستم کئے کہ قبیلہ قبیلہ نہیں رہا اور خاندان خاندان نہیں رہا۔“ یہ کہتے کہتے زہرہ جمال کی پلکیں جھپکنے لگیں مگر وہ عجیب آہنی اعصاب کی عورت تھی اس نے خود ہی یادوں کے نشتر سے اپنے دل کے زخموں کو کھرچا اور پھر بہتے ہوئے خون سے اس طرح نظر چرائی کہ جیسے ان جراثیموں کو کوئی وجود ہی نہ ہو۔

”مادر محترم! وقت بہت کم ہے میری غیرت اور بے حیائی کو موضوع بحث نہ بنائیے۔“ اتنا کہہ کر رقاہ زہرہ جمال کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور پھر اس نے علی عامر کے سامنے ملک کافور کا منصوبہ ظاہر کر دیا۔

جب زہرہ جمال ملک کافور کے منصوبے کی تفصیلات بتا کر خاموش ہوئی تو علی عامر کے مکان میں ہر طرف درد انگیز سناٹا پھیل گیا۔ بوڑھی شائستہ بیگم، نوخیز عالیہ اور علی عامر آفریدی اس طرح خاموش ہو گئے جیسے موت دے قدموں ان کے گھر میں داخل ہو گئی ہو اور وہ رقاہ کا چہرہ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں کہ ایک ناپنے والی بھی بچ بول سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ علی عامر، زہرہ کی باتوں کا جواب دیتا وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر شائستہ بیگم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”مادر محترم! اس ناوقت تکلیف دہی کے لئے معافی کی خواست گار ہوں اور اس جذباتی

اذیت رسانی کیلئے بھی معذرت طلب کرتی ہوں کہ ایک بے وقار رقاہ آپ کے ذہنی سکون میں خلل انداز ہوئی۔“ یہ کہہ کر زہرہ جمال آہستہ قدموں سے باہر جانے لگی۔
علی عامر آفریدی بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا تھا۔ ”زہرہ! اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں یہاں سے تمہارے مکان تک بہت اندھیرا ہے۔“

”نہیں سردار! آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔“ تنہائی پاکر زہرہ جمال کے دل کا درد اس کے ہونٹوں تک آ گیا تھا۔ ”اندھیرے کے مسافر کو تاریکیوں سے ڈر نہیں لگتا میں تو پیدای اندھیروں میں ہوئی تھی کہ دنیا میں میری آمد سے تین ماہ پہلے ہی والد محترم کا انتقال ہو چکا تھا اب میرا تعلق قبیلہ شب سے ہے، پھر میں اندھیروں سے کیوں گھبراؤں؟“ زہرہ جمال آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

علی عامر بھی اس کے دوش بہ دوش چل رہا تھا۔ اچانک اس نے رقاہ سے سوال کیا۔ ”آخر تم نے اپنا منصوبہ تکمیل تک کیوں نہیں پہنچایا۔ تم مجھے بدنام کئے بغیر واپس کیوں جا رہی ہو؟“

”بس اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں آپ کے چہرے اور مستقبل دونوں کو تباہ کر دیکھنا چاہتی ہوں۔“ زہرہ کی آواز کی لرزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”آخر کیوں؟ تم بے میرا کیا رشتہ ہے؟“ علی عامر جیسی چٹان بھی ایک رقاہ کا نیاروپ دیکھ کر کھٹکنے لگی تھی۔

”کوئی رشتہ نہیں اگر ہے بھی تو وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا اور پھر یہ ہوشمند دنیا سے تسلیم بھی نہیں کرے گی۔“ لیک زہرہ جمال کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ ”سردار! آپ واپس چلے جائیں اور صرف ملک کافور کے بارے میں سوچیں جو آپ کے اندازے سے بھی زیادہ بے ضمیر اور کینہ پرور ہے بس! سردار بار پانے والی عورت کی بی آخری التجا ہے کہ آپ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی ذات کی طرف سے غافل نہ رہنے لگے۔“ یہ کہہ کر زہرہ جمال تیزی سے آگے بڑھی اور پھر اندھیروں نے اس کے مرمریں پیکر کو اپنی تاریکی قابض چھایا۔

زہرہ جا بگی تھی مگر علی عامر آفریدی اپنے مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی تھڑکی مانند ساکت کھڑا اس رقاہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بڑے ہنگامہ خیز انداز سے آئی تھی اور بڑے پرسکون انداز میں واپس چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رقاہ کے جانے کے بعد علی عامر آفریدی اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ کے ساتھ ساری رات جاگتا رہا۔ اب اسے محلاتی سازشوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کس طرح وقار پرست اور بارگزار انسانوں کے خلاف منصوبہ سازی کی جاتی ہے اور کس طرح بے ضمیر افراد اپنے حاصل کردہ اقتدار کو بچانے کے لئے گھناؤنی سازشیں کرتے ہیں۔

بہت غور و فکر کے بعد آفریدی نے اپنی والدہ کے سامنے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”مادر گرامی! میں سمجھتا تھا کہ ملک کافور اس تحفہ گفتگو کو فراموش کر دے گا جو اس کے اور میرے درمیان ہوئی تھی مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ وہ مجھے کسی بھی طرح معاف نہیں کرے گا۔“

”آپ چوتھو جانے سے انکار کیوں نہیں کر دیتے؟“ اچانک عالیہ درمیان میں بول اٹھی۔

”میرے باپ کی معصوم نشانی! تمہیں نہیں معلوم کہ شاہوں کے قانون میں انکار کا کوئی لفظ موجود نہیں۔“ علی عامر نے چھوٹی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بڑے لوگ صرف اقرار سننے کے عادی ہوتے

ہیں اب اس میں کسی کی زندگی محفوظ رہے یا وہ جان سے گزر جائے۔“
عالیہ اپنے بھائی سے مزید بحث کرنا چاہتی تھی کہ شائستہ بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور دوبارہ آفریدی سے مخاطب ہوئیں۔ ”تم کس معافی کا ذکر کر رہے تھے؟“
”میں عرض کر رہا تھا کہ ملک کا نور مجھے معاف نہیں کرے گا۔“ آفریدی اپنی والدہ کے سامنے بہت آہستہ لہجے میں بولتا تھا۔

پڑے گا جب تک آسمان سے کوئی فیصلہ نازل نہ ہو جائے اس لئے میری واپسی میں تاخیر کا امکان بھی موجود ہے۔“
”میں تو صرف تیری ضد کی وجہ سے دہلی چھوڑ رہی ہوں ورنہ گردشِ وقت کیلئے سارے فاصلے یکساں ہیں آفات و مصائب کی نگاہ میں کیا دہلی اور کیلائی؟ انسان کو ہر حال میں خدائی رحمت پر نظر رکھنی چاہئے کہ وہی محافظِ اعلیٰ ہے۔ باقی سارے تو کاغذ کے ساہبان ہیں جو ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے گر جاتے ہیں۔“ شائستہ بیگم نے اپنے بیٹے کو محبت آمیز لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف اپنی منزل کی طرف دیکھو کہ جہاں خدا نے تمہیں پہنچا دیا ہے وہ ایک مشکل مقام ہے۔ اسے بس ایک ہی صورت میں برقرار رکھا جاسکتا ہے کہ تم سلطان کے اعتماد پر پورے اترنے کی کوشش کرو۔ باقی وزیر و امیر کیا کہتے ہیں ان کے بارے میں سوچ کر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو برباد نہ کرو۔ جاؤ! فرزندِ جاؤ! خدا تمہارے حوالے سے تمہارے بزرگوں کی روایتوں کو زندہ رکھے۔“

جانے والے چلے گئے اور فضاؤں میں بہت دیر تک شائستہ بیگم کے دعائیہ کلمات کی گونج سنائی دیتی رہی۔ والدہ اور بہن کو رخصت کرنے کے بعد آفریدی کسی حد تک مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن زہرہ جمال کے واقعے نے اس کے سینے میں بیک وقت کئی حشر اٹھا دیئے تھے۔

☆ ☆ ☆
دوسرے دن علی عامر آفریدی علاء الدین خلجی کے دربار میں حاضر ہوا تو ہر شے معمول پر نظر آرہی تھی لیکن ملک کا چہرہ خلاف معمول بہت زیادہ بجا بجا محسوس ہوتا تھا۔ جب بھی آفریدی اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا تو فوراً ہی نگاہیں چرالیا کرتا تھا، یا تو یہ ملک کا نور کی مجرمانہ وحشت تھی یا پھر اسے اپنے منصوبے کی ناکامی کا صدمہ تھا جس نے ملک کا نور سے وہ اطمینان و غور چھین لیا تھا جس کی بنیاد پر وہ دوسرے اہل دربار کو تسخیر آمیز نظروں سے دیکھتا تھا۔ آفریدی نے کچھ دیر تک ملک کا نور کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی مگر پھر جلد ہی اس نے ایک بے ضمیر اور بے غیرت انسان کو اپنی نگاہ کے دائرے سے نکال پھینکا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ تیسرے دن سلطان علاء الدین خلجی نے آفریدی کو ایک بار پھر اپنی خلوت میں طلب کیا۔ آفریدی باوقار انداز میں چلتا ہوا سلطان کے روبرو حاضر ہوا۔ شاہی آداب بجالایا اور خاموشی سے اپنے فرمانروا کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

”آفریدی! آخر وہ وقت آچنچا۔“ یکایک سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”کل تم ہمارے جذباتی سفیر کی حیثیت سے چوتڑ روانہ ہو رہے ہو۔ ہم نے آج تک کسی دوسرے شخص کو یہ منصب عظیم نہیں بخشا کہ وہ ہمارے دل کے معاملات اس ذات کے روبرو بیان کرے جو ہمارا نایاب محبوب ہے۔“ سلطان علاء الدین خلجی کے لہجے سے شاہی جلال نمایاں تھا لیکن پھر بھی جاننے والے جانتے تھے کہ اس تمام حیرت جروت کے باوجود وہ اپنی ہندوستان کی آواز سے خلش دل بھی جھلکتی تھی۔

”سلطان معظم! میں اپنی اس خوش نصیبی کا اعتراف کرتا ہوں۔“ علی عامر آفریدی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ایک شہنشاہ کے جذباتی طوفان کو خاموشی سے گزر جانے دے۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک تم وفاداری کے ایک ایک امتحان میں سرخو رہے۔ لیکن آفریدی! یہ بڑی آزمائش ہے بہمن اہلجات کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکتے جب تم رانی پدمی کے سامنے ہمارے دل کی دکالت کر رہے ہو مگر دہلی میں بیٹھ کر یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تم نے کیا کہا اور سننے والے نے کیا

”کیسی معافی؟“ شائستہ بیگم نے پریشان لہجے میں بیٹے سے سوال کیا۔
آفریدی چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنی چھوٹی بہن عالیہ کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ آفریدی اپنی زندگی کا اس قدر خوفناک راز ایک معصوم بچی کے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتا تھا عالیہ جب اپنے چہرے پر شدید ناگواری کے اثرات لئے ہوئے کمرے سے اٹھ کر چلی گئی تو علی عامر نے ملک کا نور سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں اپنی والدہ کو سب کچھ بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

”میں کل یارپرسوں چوتڑ روانہ ہو رہا ہوں کون جانے میرے پیچھے ملک کا نور کا عیار ذہن کیا سوچتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ آپ کل صبح سویرے ہی ہانسی تشریف لے جائیں۔“ ہانسی دہلی سے کوئی ساٹھ میل دور ایک چھوٹا سا شہر یا قصبہ ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہانسی میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بارہ سال قیام فرمایا تھا اور ایسی مبارک سرزمین پر چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ جمال الدین ہانسیؒ کا مزار آج بھی اہل دل کے لئے مرکزِ نظر ہے۔

”ہانسی جانے سے کیا ہو گا؟“ شائستہ بیگم نے حیران ہو کر بیٹے سے پوچھا۔
”وہاں ہمارے کچھ رشتے دار موجود ہیں کم سے کم اپنے لوگوں کے درمیان آپ کو نعمانی اور عدم تحفظ کا احساس تو نہیں ہو گا۔“

شائستہ بیگم نے بڑے تحمل سے آفریدی کی بات سنی اور پھر نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں یہ اندیشے تو پریشان نہیں کر رہے ہیں کہ تمہاری غیر موجودگی میں ملک کا نور ہمیں ستانے کی کوشش کرے گا؟“

”اندیشے نہیں مادر محترم! کچھ یقینی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے ابھر رہی ہیں۔ اب میں کسی حال میں بھی اس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ علی عامر بہت زیادہ مضطرب نظر آنے لگا تھا۔

شائستہ بیگم نے بیٹے کو سمجھانا چاہا کہ انسانی مقدرات اٹل ہوتے ہیں۔ وہ مکان یا شہر کے تبدیل کرنے سے نالے نہیں جاسکتے مگر آفریدی اپنی اسی منطق پر اصرار کرتا رہا کہ جب کسی جگہ آگ بھڑک اٹھے تو انسان لازم ہے کہ وہاں سے ہٹ جائے ورنہ شعلوں کی لپٹ اسے بھی متاثر کر دے گی۔ بالآخر ایک طویل بحث بعد شائستہ بیگم اس بات پر آمادہ ہو گئیں کہ کل صبح وہ اپنی بیٹی عالیہ کے ہمراہ دہلی سے ہانسی روانہ ہو جائیں گی۔ والدہ کے اس فیصلے سے آفریدی کی بے چینیوں میں کسی حد تک کمی آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆
پھر جب سورج طلوع ہوا تو علی عامر نے اپنی ماں اور بہن کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونو میری چوتڑ روانگی کو ایک عام سفر سے تعبیر نہ کریں میں جانتا ہوں کہ سلطان کے تیور بہت نازک ہیں اگرچہ سے کوئی مثبت جواب نہیں آیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے اگر بساطِ اقتدار پر جنگ کی ایک چنگاری بھی رقصاں آئی تو پھر ایک بہت بڑا علاقہ خوفناک آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ نتیجہ مجھے بھی اس وقت تک برسرِ یکار

سنا؟ حسن کی عدالت میں ہمارا مقدمہ صرف تسماری ذہانت اور وفاداری کے رحم و کرم پر ہوگا۔“

آفریدی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ عشق کیا چیز ہے؟ اس نے چند ساعتوں کے دوران ایک با اختیار حکمران کو موم کی طرح کھینچنے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا منظر ابھر آیا تھا۔ جیسے چوڑی گلیاں اس کے مقابل روشن ہو گئی ہوں اور ایک نامعلوم گوشے سے رانی پدمنی کا تانناک و ضیا پر چہرہ طلوع ہوا ہو اور سلطان علاء الدین خلجی نے گڑ گڑاتے ہوئے اپنا کاٹہ گدائی رانی پدمنی کے سامنے پھیلا دیا ہو اور وہ تاریخی حسن رکھنے والی عورت ایک خاص انداز پر نیاز کی کے ساتھ سلطان کی جلتی ہوئی آرزو کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گئی ہو اور سلطان نے شدید عالم طیش میں اپنا کاٹہ زمین پر مار دیا ہو۔ پھر اس کے ریزے بکھر کر ہوا میں شامل ہو گئے ہوں اور ناگماں وہ ہوا سرخ آندھی میں تبدیل ہو گئی ہو۔ منظر اس قدر لرزہ خیز تھا کہ آفریدی جیسے مضبوط اعصاب کا نوجوان بھی اپنے جسم میں ہلکا ہلکا ارتعاش محسوس کرنے لگا۔

علی عامر کے ہونٹوں پر ہر مسکوت دیکھ کر سلطان نے تیز آواز میں پکارا ”آفریدی! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم ذہنی طور پر ہمارے روبرو نہیں ہو۔“ علاء الدین خلجی نے ایک ہی لمحے میں علی عامر آفریدی کی غائب دماغی کو محسوس کر لیا تھا۔

”نہیں سلطان۔ ذی شتم! میں اپنے پورے وجود کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔“ آفریدی نے اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرتے ہوئے کہا ”میں کیا اور میری وکالت کی حقیقت کیا چوڑے کے دربار میں جو کچھ بھی ہو گا وہ جلالِ سلطانی کے زیر اثر ہو گا۔ مجھے بھی تو سلطان ہی کی نظر کرم نے وکالت کے منصب پر فائز کیا ہے اگر ایک ساعت کے لئے بھی مجھے غائب دماغی نے گھیر لیا تو میں اعتبار اور وکالت کے درجے سے گرجاؤں گا اور پھر آفریدی، آفریدی نہیں رہے گا۔“

سلطان نے اپنے نوجوان سفیر کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر نہایت پر شکوہ لہجے میں کہنے لگا۔

”آفریدی! ہم تسماری ذہانت اور وفاداری پر شبہ نہیں کرتے مگر چاہتے ہیں کہ تم اپنے سلطان کی زبان سمجھ لو اگر تم عظیم خلیجوں کے وارث کی زبان سمجھنے سے عاجز رہے تو پھر اپنے حکمران کا مقدمہ کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کر سکو گے۔ کہنے والوں نے ہم سے کہا ہے کہ راجہ رتن سنگھ بڑھاپے کی سرحدوں پر کھڑا ہے اور اس کی پیوئوں میں رانی پدمنی سب سے کم عمر ہے۔ نوجوانی کی آرزوئیں بڑھاپے کی تمناؤں سے مختلف ہوتی ہیں۔ رانی پدمنی بھی زیادہ آزاد اور رنگین فضاؤں میں محو خرام ہونا چاہتی ہے تسماری کامیابی یہ ہوگی کہ رانی پدمنی رتن سنگھ کے سرد بازوؤں کو جھٹک دے اور پھر وہ ہمارے حرم میں داخل ہونے کے لئے بے قرار نظر آنے لگے۔ اگر ہمارے اقتدار کی ہمہ گیری اور ہمارے جذبوں کی آشفٹ سری کا فسانہ سن کر پدمنی کے چہرے پر حرص اور اضطراب کی کوئی علامت نہیں ابھری تو ہم سمجھ لیں گے کہ آفریدی ناکام ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آفریدی کے سلطان کو بھی شکست ہو گئی۔“ یکایک علاء الدین خلجی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اب صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ایک عاشق کے آمادہ فغاں لب ”ایک جابر حکمران کے آتش بار ہونٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔“

”اور آفریدی! تم خوب جانتے ہو کہ ول کے محاذ پر ہماری یہ شکست بڑی خونریز ہوگی۔ ابھی ہمیں نہیں معلوم کہ ایک حرفِ انکار کے بعد کتنا خون بہے گا، قتل سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر شکست دھندلا ساقی امکان موجود ہو تو قتل و غارت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ صرف پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ موت کے دہانے کھل جائیں گے، سبزہ زار جل انھیں گے اور دریاؤں کا پانی سرخ ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر سلطان علاء الدین خلجی نے ایک سر بھر لافانہ علی عامر کی طرف بڑھایا۔

آفریدی! ہماری دعائیں تم پر بھی سایہ نگین ہیں اور رانی پدمنی پر بھی۔ خدا سر زمین چوڑے کو ہمارے قبر و جلال سے محفوظ رکھے۔“

آفریدی سلطان کی خلوت گاہ سے نکل کر شاہی اصطبل میں آیا اور ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر چوڑی جانب روانہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

آفریدی کے روانہ ہوتے ہی ملک کافور نے بیس مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اپنی تمنائی میں طلب کیا۔ جیسے ہی مسلح سپاہی ملک کافور کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئے، سلطان علاء الدین خلجی کے محبوب غلام نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جس طرح سلطان کی نظر میں آج آفریدی کی وفاداریوں کا امتحان ہے اسی طرح میری بارگاہ میں تسماری جاں نثاریوں کی آزمائش ہے۔“

ملک کافور کی بات سن کر مسلح دستے نے کوئی جواب نہیں دیا بس اطاعت و فرمانبرداری کے طور پر تمام سپاہیوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔

”تم نہایت رازداری اور احتیاط کے ساتھ آفریدی کا تعاقب کرو گے۔ پھر جب وہ چوڑے کی سرحد کے قریب پہنچ جائے تو تم اچانک عقب سے اس پر حملہ کر دو گے ایسا حملہ جو مکمل اور کارگر ہو کسی عنوان بھی آفریدی کو زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ اگر وہ پہنچ گیا اور اس نے تم میں سے کسی کو پہچان لیا تو پھر تم لوگوں کے ساتھ تمہارے خاندان بھی زندہ دفن کر دیئے جائیں گے۔“

”حضور! یہ ممکن نہیں کہ ہماری شمشیریں آپ کے دشمنوں کے خون سے پیاس بجھائے بغیر اپنی نیاموں میں واپس چلی جائیں۔“

ملک کافور نے اس سپاہی کی لاف زنی پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے نسب کی ایک ایک کڑی کو مضبوط سے مضبوط تر بنادینا چاہتا تھا۔

”بہتر یہ ہے کہ آفریدی پر حملے کے لئے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا جائے وہ بھی اس طرح کہ علی عامر چوڑے کے قریب پہنچ چکا ہو اور کائنات کا ایک ایک ذرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہو۔ چوڑے کی حدود کی قربت اور شبِ سیاہ میں اچانک حملے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ بے خبری کے عالم میں راجپوت سرحدی محافظوں نے آفریدی کو قتل کر دیا۔“ اتنا کہہ کر ملک کافور نے مسلح سپاہیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے کا واضح مطلب تھا کہ وہ علی عامر آفریدی کا تعاقب شروع کر دیں۔

سپاہیوں کے جاتے ہی ملک کافور کے چہرے پر سکون و اطمینان کی ایک تیز لہر دوڑ گئی وہ خود کلامی کے انداز میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”آفریدی کی سفارت ناکام ہوتے ہی سلطان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے اور پھر شاہی فوجیں چوڑے کو اسی طرح پامال کر ڈالیں گی کہ رانی پدمنی کے دل میں نفرتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا اور پھر یہ طوفان میرے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہوا کر لے جائے گا۔“ آج بہت دن بعد ملک کافور کو ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

ملک کافور بہت خوش تھا مگر اس کی یہ خوشی ریت کی دیوار ثابت ہوئی شاطر و عیار ذہن میں ایک خیال نے سر ابھار اور پھر ملک کافور کی نظروں میں درباری رقصہ زہرہ جمال کا سراپا گھوم گیا۔ اس کے منصوبے کے مطابق اب تک نگامہ برپا ہونا چاہئے تھا مگر آفریدی تو کسی الزام کے بغیر چوڑے روانہ ہو چکا تھا۔ ملک کافور

شدید عالم اضطراب میں اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا پھر اس کا ذہن سلگ اٹھا وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ اس نے آفریدی کو چھوڑ جانے سے روکنے کے لئے زہرہ کے ذریعے سازش کا نیا جال بچھا یا تھا۔ پھر اس جال کے پھندے کس نے کاٹ دیئے اور نئے منصوبے پر عملدرآمد کیوں نہ ہو سکا حالانکہ ملک کافور کے جاسوسوں نے اسے خبر دی تھی کہ رات کے اندھیرے میں زہرہ جمال، علی عامر آفریدی کے گھر تک گئی تھی اور کچھ دیر بعد اس کی واپس بھی ہو گئی تھی لیکن پھر وہ اپنا مقدمہ لے کر دربار میں کیوں نہیں آئی تھی؟ سلطان کے سامنے اس نے آفریدی کے دامن کو داندرا کیوں نہیں کیا تھا؟ ایسے کئی سوالات تھے جو بیک وقت ملک کافور کے ذہن پر حملہ آور ہوئے تھے۔

”کیا زہرہ جمال، آفریدی سے خوفزدہ ہو گئی اور پھر وہ منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے بغیر اس کے مکان سے واپس چلی آئی؟“

”کیا وہ راقصہ اس خوبصورت افغان زادے کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھی؟“

”اور اگر ایسا ہو چکا ہے تو کس زہرہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آفریدی کے سامنے یہ بھیاں تک راز فاش نہ کر دیا ہو؟“

یہ خیال آتے ہی ملک کافور ایک لمحے کے لئے لرز اٹھا اور پھر اس نے گہرا کراہ اور اُدھر دیکھا مگر تنہا کمرے میں اس کی وحشتوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

”شاید میں یہ بازی ہار چکا ہوں۔“ ملک کافور نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ذلیل راقصہ اب تک علی عامر تمہارے لگا چکی ہوتی اور وہ افغان زادہ، سلطان کے سفیر کی حیثیت سے چھوڑ جانے کے بجائے زلت و رسوائی کا طوق پہن کر پس دیوار زنداں چاچکا ہوتا۔ یقیناً راقصہ نے خود میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔“ یہ کہتے کہتے ملک کافور اپنی زر نگار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ان عورتوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا جو دولتِ اقتدار کے آگے اپنے جان و تن ہار چکی تھیں اور اب نہایت رکیک انداز میں ملک کافور کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ملک کافور کا کمرہ ان عورتوں سے بھر گیا تھا جو غیر اخلاقی خدمت پر مامور تھیں۔

”شمیم! کیا وہ راقصہ زہرہ جمال آج دربار میں حاضر ہوئی تھی؟“ ملک کافور نے اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو دربار سے تعلق رکھنے والی تمام راقصاؤں کی نگرانی کرتی تھی۔

”نہیں حضور! شمیم ملک کافور کے سامنے اس طرح جھک گئی جیسے وہ ہندوستانی حکمران کو سجدہ کر رہی ہو۔“ سرکار! اس کینز نے سنا ہے کہ وہ کئی روز سے بیمار ہے اس لئے اس نے دربار میں حاضر ہونے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔“

”بیمار؟“ ملک کافور کی زبان سے یہ لفظ اس طرح ادا ہوا جیسے وہ اس لفظ کے مفہوم سے قطعاً آشنا ہو۔

پھر ایک ایک اس کے لمحے سے آگ بے رنگی۔ ”میں نہیں جانتا کہ زہرہ کے جسم پر بیماری کس حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ اگر وہ نزع کے عالم میں بھی گرفتار ہوتا تو میرے دربار پر حاضری نہ کرتی۔“

بڑا قہرناک غم تھا۔ شمیم اور دوسری ارباب نشاط اپنی رفتار بھول گئی تھیں جب وہ ملک کافور کے کمرے سے برآمد ہوئیں تو ان میں سے ہر ایک کے چہرے پر وہی زردی نمایاں تھی جسے موت کے رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شمیم اور دوسری عورتوں کو ملک کافور کے غصے کا سبب تو معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا اندازہ کر سکتی تھیں کہ ملک کافور کی بارگاہ سے راقصہ زہرہ کا رزق بند ہو چکا ہے۔

پھر جب زہرہ جمال، ملک کافور کے دربار پر حاضری گئی تو اس کے چہرے پر دور دور تک بیماری کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ شاداب چہرہ اس گلاب کی طرح مرجھا گیا تھا جسے بادِ مصر کا کوئی گرم جھوٹکا چھو کر گزر گیا ہو۔

زہرہ! تو نے بیماری کا یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے؟ ملک کافور کی زہریلی آواز گونجی۔ ”کیا تو بھول گئی کہ ہمارے حضور فریب کاری کی سزا کتنی دردناک ہوتی ہے؟“

زہرہ جمال نے کئی مناسب بہانے تراشے مگر ملک کافور یہی کہتا رہا۔

”ابھی تیرے جسم میں اتنی توانائی اور کشش باقی ہے کہ تو اہل دربار کی نظروں کو آسودہ کر سکتی ہے۔“ اور ابھی تیرے پیروں میں بھی اتنی حرارت باقی ہے کہ پازیب کی آواز ابھر سکتی ہے اور گھٹھریوں کی جھنکار اہل ذوق کی سماعتوں پر خوشگوار اثر چھوڑ سکتی ہے پھر ہمارے دربار سے تیری غیر حاضری کا کیا مطلب تھا؟“

زہرہ جمال نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنی چاہی مگر ملک کافور نے اس کے ہر عذر کو جھٹلادیا اور اب وہ براہِ راست اس موضوع پر آگیا جو زہرہ کے لئے کسی بھی لمحے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔

”علی عامر آج چھوڑ دانا ہو گیا اور اس طرح کہ اس کے دامن پر تیری لگانگی ہوئی تھی تمہارے کانکس تک نہیں تھا۔“ ملک کافور کی آواز میں سارے زمانے کی نفرتیں اور غصہ سمٹ آیا تھا۔ ”ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ اس کی پوری شخصیت کو داندرا بنادے لیکن ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ دہلی سے رخصت ہوتے وقت علی عامر کے ماتھے پر فلور پشانی کی ایک لکیر تک نہ تھی اور اس کے دامن پر سیاہی کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا آخر اس کا کیا سبب ہے؟ ہماری نافرمانی کی یہ گناہ گار رسم کیوں روا رکھی گئی؟“ ملک کافور کے لہجے سے مسلسل قہر و نفرت کی آگ برس رہی تھی۔

زہرہ جمال نے ایک اور جھوٹ کا سارا لینے کی کوشش کی۔ ”حضور! میں اپنی بیماری کے سبب آفریدی سے بروقت رابطہ قائم نہ کر سکی۔ پھر جب میری طبیعت کچھ بحال ہوئی اور میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو وہ چھوڑ چاچکا تھا۔ میں اپنی اس کوتاہی پر بہت شرمندہ ہوں آج میں خود ہی حضور کو اس ناخوشگوار واقعے کی اطلاع دینے والی تھی کہ آپ نے کینز کو طلب کر لیا۔“

زہرہ جمال نے اپنی دانست میں ایک معقول بہانہ تراشا تھا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ طاقتور بھیڑیے اپنی زندگی گزارنے کیلئے بڑے برا سرا ر تو امن رکھتے ہیں۔

”ہمارے مجبوروں نے ہمیں اسی رات اطلاع دیدی تھی کہ تو نصف شب کے قریب آفریدی کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور پھر اندرون خانہ ایک طویل وقفہ گزارنے کے بعد تو نے اپنے مکان کا رخ اختیار کیا تھا۔“ اس بار خلاف معمول ملک کافور کی آواز سرد تھی، ایسی سرد جیسے کوئی اڑدھا اپنے شکار کو قریب پا کر لذتِ آسودگی کی سانسیں لے رہا ہو۔

اس انکشاف کے بعد زہرہ جمال اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکی۔ کچھ دیر کیلئے اسے ملک کافور اور اقتدار کے ہاتھوں کی درازی کا اندازہ نہیں رہا تھا بازی یقیناً مات ہو چکی تھی مگر درباری راقصہ پھر بھی اس امید پر ملک کافور کے سامنے کھڑی تھی کہ شاید پتھر سے نجات کا کوئی پہلو نکل آئے لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ ذہین شاطر مروجہ کس کس کو کبھی معاف نہیں کرتے۔

زہرہ جمال نے پتھرانی ہوئی آنکھوں سے ملک کافور کی طرف دیکھا پھر اس کی تمام خوش فہمیاں فنا ہو گئیں۔ ملک کافور کی آنکھوں میں وہی درنگی لوٹ آئی تھی۔

”یہ تیرا تیرا جھوٹ ہے۔“ ملک کانور کالجہ اچانک آتشیں ہو گیا تھا۔ ”اصولاً ایک ہی جھوٹ پر انسان کو اس کی قوت گویائی سے محروم کر دینا چاہئے مگر ہم نے ایک کمزور عورت ہونے کی وجہ سے تجھے تین مواقع فراہم کئے۔ پھر بھی تیری فریب کاری کا یہ کمال ہے کہ تو ہمارے زاویے سے جھوٹ بولتی رہی اب تجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ تو اپنے منہ میں اتنی گندی زبان رکھ کر آزادانہ گھوم سکے۔ ہم نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اگر کہیں بھی زبان لٹکھڑائی تو پھر تیری سانسوں کا توازن برقرار نہ رہ سکے گا۔ ہمیں شک نہیں، یقین ہے کہ تو علی عامر کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اور تو نے ہمارا منصوبہ اس پر ظاہر کر دیا ہے۔ زہرہ! تیری اس نادانی نے بڑی زہرناک فصل بوئی ہے جسے تو خود کاٹنے لگی اور تیرا محبوب بھی۔“

”حضور! میرے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کر سکتے ہیں مگر میری زبان حکومت کے کسی راز کو افاش کرنے کی مجرم نہیں ہے۔“ زہرہ کے لہجے میں وہی اعتماد تھا جو انسان کو خوف مرگ سے یکسر آزاد کر دیتا ہے۔

”ہم ابھی تیرے سچ اور جھوٹ کو پرکھ لیتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی ملک کانور نے ان شکر جلاوٹوں کو طلب کر لیا جو تشدد کے ذریعے جھوٹ اور سچ کی پہچان کراتے تھے۔

زہرہ جمال کو پتھر کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا پھر اس کے شیشہ جسم پر مسلسل تازیانے برسائے گئے مگر زہرہ جمال کی زبان پر ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔

”میری علی عامر آفریدی سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور میں نے کوئی سرکاری راز افاش نہیں کیا ہے۔“

پھر جب زہرہ کا پورا جسم گنار ہو گیا اور وہ بے ہوشی کے قریب پہنچ گئی تو ملک کانور نے ہاتھ کے اشارے سے جلاوٹوں کو روک دیا۔ صیاد کے لئے ایک بے بال و پر چڑیا کا گلا گھونٹ دینا بہت آسان تھا مگر ملک کانور کچھ اور ہی سوچ رہا تھا صرف راقصہ کی موت سے اسے تسکین حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ ملک کانور نے شاہ دربار میں زہرہ جمال کی زندگی سے بہت سود کما لیا تھا اور اب وہ اس کی لاش سے بھی ایک بڑا نفع وصول کرنا چاہتا تھا۔

زہرہ کو آزاد کیا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہ سکی تھی ملک کانور نے خفیہ طور پر ایک شاہی طبیب کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ انسانوں کو شفاء بخشنے والا وہ شخص کچھ دیر تک اس خوبصورت لڑکی کو دیکھتا رہا جس کی سحر کار آنکھیں کسی جھجھتے ہوئے چراغ کی مانند نظر آرہی تھیں۔ میحاکا دل میں ایک درد اٹھا مگر سر جھکا رہا کہ کہیں ملک کانور چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ نہ کر لے۔ شاہی طبیب زہرہ کے جسم سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگا پھر کہیں شام کے قریب وہ اپنی کوششوں میں اسے تک کامیاب ہو سکا کہ راقصہ آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کی جاہلانہ فضا کو دیکھ سکے اور اگر اس سے کچھ بات کی جائے تو وہ رک رک کر خنیف آواز میں جواب دے سکے۔

پھر جب رات کی تاریکی گہری ہو گئی تو ملک کانور نے زہرہ جمال کو بڑے رازدارانہ طریقے سے ایک باغ میں ڈال کر اس کے گھر بھجوا دیا۔ زہرہ اس حالت میں گھر پہنچی تو وہاں ایک کمرام سا بڑا ہو گیا۔ اندھا ماں اور چھوٹے بہن بھائی زہرہ کی بے کسی کا ماتم کرنا چاہتے تھے مگر زہرہ نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ ”ظلم کے گنبد میں انسانی سچ گونج تو سکتی ہے مگر باہر نہیں جاسکتی یہاں تک کہ وہ آواز خود ہی اپنا گھونٹ لیتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں تمہاری آوازیں گم ہو جائیں۔ خود غرضی اور ہوس میل سے پاک ان آوازوں کو سننے کیلئے میں نے وقت کی غلیظ ترین گالیاں سنی ہیں۔ ابھی تو میں جاگ رہی ہوں ابھی غلوں و وفا کے ان نغموں کو نوحہ خوانی سے بچائے رکھو جب میرا سوجاؤں تو.....“ زہرہ بھا

اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

”پھر بھی میری بیٹی! کچھ تو بتا کہ یہ کیا ہوا ہے؟“ اندھی ماں نے اپنی چیخوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے مگر زبان نہیں کاٹی جاسکتی تھی۔

”کچھ نہیں ماں!“ زہرہ جمال نے چھوٹے بہن بھائی کے نازک دلوں کو صدمات کے شعلوں سے بچانے کیلئے مطمئن لہجے میں کہا ”طوفان ضرور آیا تھا لیکن کسی تباہی کے بغیر گزر گیا۔“

ماں، بیٹی کے اشارے کو سمجھ گئی اس لئے وہ بچوں کی موجودگی میں زہرہ سے مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ پھر جب رات گئے دونوں بچے سو گئے تو ماں نے اس راگ کو پھر کر دیا جس میں نہ جانے کتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔

زہرہ نے ماں کے سامنے ایک اور بہانہ تراش لیا۔ ”وہ لوگ مجھے ایک ایسے امیر کی محفل میں رقص پر آمادہ کرنا چاہتے تھے جسے میں سخت ناپسند کرتی ہوں میں راقصہ ہوں طواف نہیں۔ بس میرے اس انکار پر ملک کانور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور پھر میرے پورے جسم کو زخموں سے سجاد کیا گیا۔“

”تو نے سلطان سے اس درد نے کی شکایت نہیں کی؟“ ماں، اپنی بیٹی کے زخموں کا احساس کر کے تڑپ اٹھی۔

”آہستہ بولے! فرشتوں کو درد نہ کہنا ناقابل معافی جرم ہے۔“ زہرہ جمال کی آواز لرز رہی تھی۔

”پھر بھی سلطان سے کچھ تو کہنا ہوتا۔“ زہرہ کی قہقہہ کے بعد ماں کالجہ ہم ہو گیا تھا۔

”سلطان سے کس طرح شکایت کرتی کہ وہ تو آج کل آسمان پر رہتے ہیں کبھی زمین پر اترتے ہیں تو صرف ملک کانور کے لئے ایسے میں میری کون سنتا۔“ یہ کہتے کہتے زہرہ کے دونوں ہونٹ آپس میں پیوست ہو گئے اور چہرے پر اس تشخ کے آثار ابھر آئے جو انتہائی برداشت کے نتیجے میں نمایاں ہوتا ہے۔

”بیٹی! یہ نا انصافی کب تک ہوتی رہے گی؟“ ماں کی بے نور آنکھیں بیٹی کی حالت زار پر آنسو بہا رہی تھیں۔

”جب تک قیامت نازل نہیں ہو جاتی۔“ زہرہ کے ہونٹوں سے دھویں کی ایک لکیر الفاظ کی شکل میں برآمد ہوئی۔

”قیامت تو ابھی دور ہے۔“ بوڑھی ماں کی آواز اتنی پست تھی جیسے اس کی گردن ظلم کے ناویدہ ہاتھوں کی گرفت میں ہو اور وہ ضعف کی باقی ماندہ قوتوں کو جمع کر کے بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”تو پھر آپ کی بیٹی کے ساتھ ہونے والا انصاف بھی دور ہے۔ قیامت نازل ہونے کی دعا کرتی رہیں کہ ہمارا انصاف بھی اس دن سے وابستہ ہے۔“

”اس سے پہلے؟“ اندھی ماں کی مایوسی ناقابل بیان تھی۔

”اس سے پہلے وہی کاروبار نشاط کہ پاؤں ٹھہرے تو کاٹ دیئے گئے، ساز تھے تو توڑ دیئے گئے، جسموں کے گداز ختم ہوئے تو غلاموں کے حوالے کر دیئے گئے، آنکھوں میں عکس شکایت ابھرا تو بھجادی گئیں، ہونٹوں پر حرف انکار آیا تو جلا دیئے گئے، متاع کو چوبازار کی حیثیت ہی کیا؟ خریداروں کی مرضی پر ہے ہمیں شہستان، کبھی قبرستان۔“ اب زہرہ جمال کے جذبات کا لاوا ابھی آنکھوں کے راستے بہنے لگا تھا۔

”بس اب سوجاؤں ماں! شاید نیند ہم پر مہربان ہو جائے بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آیا۔“

بوڑھی عورت زہرہ لب کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔

داغ داغ جسم کے بادو زہرہ جمال کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی اس نے ملک کانور

سے زخم خرید کر آفریدی کی زندگی بچائی تھی اور خود بھی کسی نہ کسی طرح سازش کے آہنی حصار سے باہر نکل آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

زہرہ جمال کی خوش گمانی تھی کہ ہلاکت و بادی کا طوفان گزر چکا ہے ابھی مشکل سے ایک ہفتہ بھی نہ گزر ہو گا کہ ایک رات اس کے مکان پر دستک ہوئی گھر کے تمام افراد جاگ چکے تھے مگر ایک نامعلوم سی دہشت کے سبب کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی اٹھ کر دروازہ کھول دیتا یا دستک دینے والے سے پوچھ لیجاتا وہ کون ہے اور کس کام سے آیا ہے۔ دونوں بچے تو اسی راز سے ہر آہٹ پر لرز جاتے تھے جس دن انہوں نے اپنی بڑی بہن کو خون میں نہائے ہوئے دیکھا تھا۔ اندھی اور بوڑھی ماں ایک بلند حوصلہ عورت تھی مگر بیٹی کے زخم دیکھ کر وہ بھی اس قدر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اسے ہوا کی سنسانٹ پر بھی فرشتہ اجل پروں کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔

دستک دوبارہ ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک گر جدار آواز سنائی دی۔ ”ہم کوئی تراق یار بزن نہیں ہیں دربار سلطانی سے راقصہ زہرہ جمال کے لئے ایک حکم ہے جس پر فوری عملدرآمد چاہتے ہیں۔“ اس آواز کے ساتھ ہی زخموں سے شکستہ زہرہ جمال کراہتی ہوئی اٹھی اور پھر اس نے کانپتے ہاتھوں دروازہ کھول دیا۔

”میں حاضر ہوں۔“ ایک لڑکی اپنی متاثرہ مجبور یوں کے ساتھ بول رہی تھی۔

”ہمیں اندر آنے دو یہ ایک راز دارانہ حکم ہے جسے ہم دیواروں سے بھی چھپانا چاہتے ہیں۔“ دو آواز ابھری جس کے خواب میں زہرہ نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

پہلے ایک انجینی شخص اندر داخل ہوا اور پھر اس کے پیچھے کیے بعد دیگرے کئی ناشائسا لوگ درباری رقا کے مکان میں چلے آئے۔ مومی شمعوں کی روشنی جب آنے والوں کے چروں پر پڑی تو زہرہ کو اندازہ کہ وہ شامی فوج کے سپاہی تھے اور مکمل طور پر مسلح نظر آ رہے تھے۔ ”میرے لئے کیا حکم ہے؟“ زہرہ کی جان سلب ہوئی جاری تھی اس لئے وہ دروازے کے قریب کھڑے کھڑے سپاہیوں سے کہنے لگی۔

راقصہ کے سوال کے جواب میں کسی سپاہی نے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی وہ فوجی جو سب سے پہلے اندر داخل ہوا تھا اس نے پلٹ کر اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور عقبی حصے کی جانب آنکھ سے اشارہ دوسرے ہی لمحے وہ سپاہی پلٹا اور اس نے دروازہ بند کر دیا اس دوران زہرہ کی اندھی ماں ٹھوکریں کھاتی سپاہیوں کے قریب آگئی۔ چھوٹی بہن اور بھائی بھی بستروں سے اٹھ گئے تھے مگر سسے ہوئے دور کھٹے تھے۔

”زہرہ! یہ کیا حکم ہے جس کی تعمیل کے لئے دن کی روشنی کا بھی انتظار نہیں کیا گیا۔“ بینائی سے ماں نے شدید عالم وحشت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اوڑھ کر حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ درباری سپاہی ہیں سلطان معظم کی طرف سے رقص کی کسی تقریب میں شرکت کا حکم دینے ہیں۔“

”مگر کس طرح رقص کرے گی بیٹی؟“ ماں نے زہرہ جمال سے کہا۔ ”تو زخمی ہے جسم کی ایک سے سارے زخم پھر خون دے انھیں گے۔“ بوڑھی عورت کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ”آپ کا منہ نہ ہوں میں ٹھیک ہوں۔“ زہرہ جمال نے ماں کو مطمئن کرتے ہوئے کہا مگر

سپاہی کی تندہ آواز نے گھر کے ہر فرد کا اطمینان غارت کر دیا۔ وہ سفائی کے بدترین لمحے میں بول رہا تھا۔ ”اگر جسم کی ایک ایک شریان سے بھی خون کا دریا جاری ہو جائے تو حکم شامی مل نہیں سکتا۔ تیری بیٹی رقص کرے گی لیکن رقص نہ۔“

”کیسی تقریب، کیسا رقص اور کیسی موت؟“ نیکلیک زہرہ جمال کی ماں کا لہجہ ہڈیانی ہو گیا تھا۔ ”تم لوگ میری بیٹی کو کہاں لئے جا رہے ہو؟ اس یتیم بچی نے اپنے فن سے کئی سال تک تمہارے سلطان اور اس کے درباریوں کے جذلوں کو آسودہ کیا، ان کی آنکھوں کو کیف و نشاط کے خوش رنگ مناظر فراہم کئے اور اب تم اس سے رقص فنا کرنا چاہتے ہو؟ آخر کیوں میری بیٹی کی خدمات کا اس قدر وحشیانہ صلہ؟ اس نے کیا گناہ کیا ہے؟“ ایک جوان بیٹی کی مجبور و ناہیماں گریہ و زاری کر رہی تھی۔

”اپنی آواز کو سینے میں گھونٹ دے کہ ایسی فریادیں مزاج شامی پر بہت گراں گزرتی ہیں۔“ ایک سپاہی نے چیختے ہوئے کہا۔ ”تیری بیٹی ایک شامی راز کو فاش کرنے کی مجرم ہے اور آئین سلطانی میں ایسے لوگ زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے۔“

”کیسا راز؟ کیسا جرم؟“ بوڑھی عورت بھی خوف و دہشت سے چیختے لگی مگر دوسرے ہی لمحے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ ”اگر تیری آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتی تو پھر ہم تیری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔“

بوڑھی عورت لرزتی رہی اٹک بکتے رہے، بے نور آنکھیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی رہیں مگر ہونٹوں کو جنبش نہ ہو سکی۔

جب کمرے کا سناٹا گہرا ہو گیا تو دوسرے سپاہی کی آواز ابھری وہ زہرہ جمال سے مخاطب تھا۔ ”جو کچھ تجھ سے کہا جا رہا ہے اسے حرف بہ حرف اس کاغذ پر تحریر کر دے۔“ یہ کہہ کر سپاہی نے زہرہ جمال کی طرف ایک سادہ کاغذ، قلم اور دوات بڑھا دیئے۔

صورت حال اس قدر حیران کن تھی کہ زہرہ جمال کا ذہن مفلوج سا ہو گیا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک پتھر بن گئی تھی۔ جب ایک سپاہی نے اس پتھر پر ٹھوکر ماری تو زہرہ جمال کو ہوش آیا۔ سپاہی کے ہاتھ کی ضرب نے اسے مکان کے فرش پر گرادیا۔ ”جلدی کر کہ ہمارا وقت بہت زیادہ قیمتی ہے۔“ زہرہ جمال زخمی کہنیوں کے سہارے سیدھی ہوئی اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ لے لیا اور موت کے نقیبوں کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس پر یہ تحریر لکھ دے کہ علی عامر آفریدی نے میری بے آبروئی کی میں اس کی جارحیت کی داستان سنا کر سلطان معظم سے انصاف چاہتی تھی مگر وہ اتنا با اثر تھا کہ شاہ والا تک میری رسائی نہ ہو سکی ایک عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن بے عزت ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آفریدی مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرے کہ جائز حقوق دیدے مگر وہ ایک سنگدل اور بے کردار انسان ہے۔ آخر تمام راستے بند پا کر میں اور میرے گھروالے اس راہ پر جا رہے ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد میں، میری اندھی ماں، چھوٹی بہن اور بھائی زہرہ کی کر خالوں کی اس بستی سے دور چلے جائیں گے۔ پھر میرے محشر میرے ہاتھ میں سلطان معظم کا گربان ہو گا وہاں میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی۔ میرا خدا ان سب لوگوں سے جو اس ظلم میں شریک رہے ہیں، ایک ایک ذرے کا حساب لے لے گا۔“ سلطان علاء الدین خلجی کے دربار کی ادنیٰ راقصہ۔ زہرہ جمال۔

پورے کمرے پر سکوت مرگ طاری تھا اگرچہ زہرہ جمال کے لئے زندگی ایک غلیظ تہمت تھی لیکن وہ پھر

بھی اندھی ماں اور معصوم بہن بھائی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جمع کر کے زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زہرہ کو زندگی کے محاذ پر شکست فاش ہوئی تھی مگر وہ سرور بارناپنے کو بھی ایک جنگ سمجھتی تھی اور یہ جنگ ان معصوم بچوں کے لئے لڑی جا رہی تھی جو مستقبل کے امین تھے۔ زہرہ نے زندگی کے کٹیف اندھیروں میں بھی عمد کیا تھا کہ وہ چھوٹے بہن بھائی کے لئے ہر قیمت پر روشنی خریدے گی پھر وہ زندگی کے دونوں کسن مسافروں کو اس منزل کا پتا دے گی جو ان کے بزرگوں کی منزل تھی مگر ملک کا نور نے اس کی آنکھوں سے یہ خواب بھی چھین لئے تھے۔

جب سپاہی کی زبان سے آخری لفظ ادا ہوا تو بڑھی ماں اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے دل پکڑ کر زمین پر گر گئی۔ دونوں بچے اپنی ماں کی یہ حالت زار دیکھ کر رونے لگے مگر سپاہیوں کی شعلہ بار آنکھوں نے ان کی چیخوں کو بھی ان کے سینوں ہی میں قتل کر دیا۔ اب وہ زرد چروں اور پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کبھی اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی اس ضعیف ماں کی طرف جو دل کے درد سے ترپ رہی تھی۔ جب ان کی پھرائی ہوئی آنکھیں ان دونوں نقطوں سے ہٹ کر درباری سپاہیوں کی جانب اٹھیں تو وہ ماں اور بہن کی تکلیف بھول جاتے اور بے نیام شمشیروں کی طرف دیکھنے لگتے جن کی آب و تاب میں خون کی موجیں اور موت کے اندھیرے پوشیدہ تھے۔

بالآخر شدید ذہنی اذیت کے بعد زہرہ جمال نے ہارے کاغذ پر تحریر منتقل کر دی جسے ملک کا نور کے عیار ذہن نے تخلیق کیا تھا۔

جب درباری راقصہ اپنے اور اہل خانہ کے قتل نامے پر دستخط کر چکی تو ایک سپاہی نے فوجی پیر بہن کی جیب سے زہر کی شیشی نکالی پھر حکم کے دوسرے غلام نے چار برتنوں میں پانی بھرا اور ان میں زہر کے چند قطرے شامل کر دیئے۔ سپاہی زہر آلود پانی کی ابتداء زہرہ جمال کے چھوٹے بہن بھائی سے کرنا چاہتے تھے مگر راقصہ کی دردناک آواز نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔

”یہ دونوں میرے بچوں کی طرح ہیں اور ایک محبت کرنے والی ماں اپنی سانسوں کی موجودگی میں بچوں کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی، پہلے یہ زہر مجھے دو میں کھلی آنکھوں سے اپنے بہن بھائی کے رگ و پے میں؛ قاتل سیال اترتے ہوئے کس طرح دیکھ سکوں گی۔ جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا کم سے کم مرتے وقت مجھے اذیت تو نہ دو کہ میری وجہ سے تین بے گناہ ہستیاں نذر اجل ہو گئیں۔“ شاید ملک کا نور کے سپاہیوں کے نزدیک یہ رحم کی بڑی علامت تھی کہ انہوں نے زہرہ جمال کی درخواست قبول کر لی۔ پھر شاہی دربار میں ناچنے والی ایک خوبصورت لڑکی اپنے ہاتھوں سے زہر پینے پر مجب ہو گئی۔ زہرہ جمال نے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ”اپنی ماں اور بہن بھائی پر الوداعی نگاہیں اور سے اس طرح چلی گئی کہ زمین و آسمان اس کی آرزوؤں کے خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ زہرہ کی آنکھیں ہوتے ہی اس گھر کے تین افراد نے بھی زہر آلود پانی سے اپنے ہونٹ اور حلق تر کر لئے۔ انجام آئیاں بہ مختصر تھا۔ برقی اجل چند لمحوں کے لئے لہرائی اور چھوٹے سے گلشن میں ہر طرف ہلاکت کا گمراہ حواں بچا گیا۔

ملک کا نور کا مسلخ دستہ اس محاذ سے کامیاب و کامران لوٹا جہاں مزاحمت کرنے والی نہ بے دست و پا عورتیں تھیں اور ایک دس گیارہ سالہ معصوم لڑکا۔ جب سپاہیوں نے زہرہ جمال کی تحریر ملک کا نور کے حوالے کی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی شکست خوردہ شہنشاہ نے اپنی تمام جاگیروں کی دستا اس کے سپرد کر دی ہو۔

سلطان علاء الدین خلجی کے محبوب غلام نے درباری راقصہ کی تحریر پڑھی اور مسموم قلعہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ پھر ملک کا نور کی نفرتوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”بد نصیب آفریدی! تو کہاں تک بھاگے گا؟ میں تیرے تعاقب میں آ رہا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

علی عامر تیز رفتاری کے ساتھ چوڑی طرف بڑھ رہا تھا۔ ذاتی طور پر اس سفارت سے خوش نہیں تھا کہ اس سفارت نے سازشوں اور ہنگاموں کے سلسلے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ تمام راستے اپنی ماں، بہن کے ساتھ قاصد زہرہ جمال کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اسے راقصہ کے کردار نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا مگر اسی تاثر کے ثقب سے ملک کا نور کی خباثتیں بھی ابھر رہی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آفریدی سفر کے دوران پریشان سا لہر رہا تھا۔ وہ اپنی والدہ شائستہ بیگم اور بہن عالیہ آفریدی کی طرف سے تو مطمئن ہو چکا تھا مگر اسے زہرہ جمال کی طرف سے شدید فکر لاحق ہو گئی تھی۔

”خدا جانے اپنے منصوبے کو ناکام دیکھ کر ملک کا نور پر کیا گزری ہوگی اور پھر اس نے زہرہ جمال کے ہاتھ کیسا سلوک کیا ہوگا؟“ آفریدی کے ذہن میں بے شمار اندیشے ابھر رہے تھے اور وہ گھوڑے کی پشت پر ان زہرہ کے بارے میں مسلسل دعائیں مانگ رہا تھا۔

”خدا یا! اس مجبور لڑکی کی حفاظت کر، جو تیرے گناہ گار بندے آفریدی کی غم گسار ہے۔ اگر وہ ابھی تو شاہی اعزاز کے ساتھ سیمور کا ذخیرہ قبول کر لیتی اور میرے چہرے پر ایسی سیاسی مل دیتی جسے اس نیامیں کوئی صاف کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے میرے لباس کو بے داغ رکھا تو بھی اسے ملک کا نور کی ست درازوں سے محفوظ رکھ دو میری خاطر جلائے جا رہے ہیں۔ انہیں آتش انتقام سے بچا دو جو میرے لئے اپنے سینے میں درد رکھتے ہیں ان کی مشکوں کو آسان کر دے تیرے سوا آفریدی کا لون ہے۔ وہ تو پچانا ماتیرے کرم سے جاتا ہے۔“ آفریدی راقصہ زہرہ جمال کے لئے دل کی گمراہیوں سے دعائیں کر رہا تھا، یہ وہ بد نصیب راقصہ اپنے گھروالوں کے ساتھ قبر میں اتاری جا چکی تھی۔ درباری ضمیر فروشوں کی نظر میں ہر اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکی تھی اور کسی کو یہ خبر تک نہ ہو سکی کہ ایک ناچنے والی نے اپنی جان دے کر مہلت خلجی کے ایک وفارست سپہ سالار کو زلت و رسوائی کے تاریک غار سے باہر کھینچ لیا تھا اور وہی سپہ سالار اب علاء الدین خلجی کی زندگی کے نازک ترین مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے چوڑی طرف امزن تھا۔

آفریدی کے ذہن میں مختلف وسوسے اور اندیشے پرورش پارہے تھے مگر یہ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ زہرہ جمال دردناک موت سے دوچار ہو چکی ہے اور اب وہی موت اپنے خونے خچے کھولے ہوئے اس کی رف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

بے عیب قوادریوں اور داغدار سازشوں کا سفر جاری رہا۔

ابھی رات بہت زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی پھر بھی فضا میں اس قدر دھندلی ہو چلی تھی کہ قریب کی چیزوں بھی ان کے اصلی نقش و نگار کے ساتھ پہچانا دشوار ہو گیا تھا۔ آفریدی گھوڑے کی پشت سے اتر کر رات بسر کرنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے عقب میں بیک وقت کئی گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔

آفریدی نے اچانک منہ اس طرف پھیر لیا جہاں سے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں پشت سے کسی دشمن کا نمودار ہونا ایک خوفناک علامت ہوتی ہے اس لئے آفریدی نے دشمنوں کو اپنی نگاہوں

کے سامنے رکھا اور اگلے قدموں پیچھے ہٹنے لگا یہاں تک کہ برگد کے ایک بوڑھے درخت کی زمین پر لٹک ہوئی شاخیں اس کے جسم کو چھونے لگیں آفریدی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اس کے لئے یہ بوڑھا برگد ایک محفوظ خندق ثابت ہو رہا تھا۔

انتظار ختم ہوا اور دیر تک سناٹا دینے والی آوازیں آفریدی کے قریب آکر گم ہو گئیں۔ افغان زادوں نے آنے والوں کو دیکھا وہ پندرہ بیس کے قریب مسلح شہسوار تھے مگر سب کے چہرے نقابوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔

”تم لوگ کون ہو؟“ آفریدی کی آوازیں زلزلے کی سی دھمک تھیں۔ ”یہاں کیوں آئے ہو اور تم سے کیا چاہتے ہو؟“ آفریدی نے آنے والوں سے پوچھا اور آہستہ آہستہ برگد کے گھٹے درخت کے قریب ہوتا چلا گیا۔

”ہم ان بھیاں جنگلوں کے حکمران ہیں۔ رات کی تاریکیوں پر ہماری حکومت ہے اور ہم ادھر آنا جانے والوں سے ان کے جان و مال کا خراج وصول کرتے ہیں۔“ ایک نقاب پوش شہسوار نے ہماری بے میں کہا۔ اس کے بولنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آواز لگا کر مصنوعی لہجے میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آفریدی ایک لمحے کے لئے چونک اٹھا بولنے والے کا لہجہ ضرور بگڑا ہوا تھا مگر اس کی گفتگو میں وہ روانی تھی قزاقوں اور رہزनों کے معیار کلام سے بہت بلند تھی۔ یہ مقامی لوگوں کی زبان نہیں تھی اس خیال نے آفریدی کو حیرت میں ڈال دیا تھا مگر صورت حال کی سنگینی نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ ”اسرا مطلب ہے کہ تم لیبرے ہو۔“ علی عامر آفریدی کسی جھجک اور گھبراہٹ کے بغیر آنے والوں سے مخاطب تھا۔

”لیبرے نہیں۔“ دوسرے نقاب پوش کی آواز نفرتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”ہم فرمانروائے شب ہیں اندھیروں کے شہنشاہ۔“

پھر جیسے ہی اس شخص کے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی تمام نقاب پوش اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے ان سب کی شمشیریں بے نیام تھیں وہ تعداد میں اپنے دشمن سے زیادہ تھے اس لئے بڑے غرور و تکبر کے مار آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ علی عامر آفریدی بھی اپنی جنگی حکمت عملی کے مطابق پیچھے ہٹتا رہا اور پھر وہ بڑا کی پھیلی ہوئی شاخوں کے درمیان سے گزر کر بوڑھے درخت کے تنے سے جا لگا برگد کا تانا اس نے طویل و عریض تھا کہ اس کی آڑ میں آٹھ دس آدمی اطمینان سے چھپ سکتے تھے۔

پھر جب ملک کافر کے سپاہی بیک وقت آفریدی پر حملہ آور ہوئے تو ان کی شمشیریں درخت کی شاخوں سے الجھ گئیں۔ آفریدی نے اس رعایت سے فائدہ اٹھا یا اور دیکھتے ہی دیکھتے تین چار سپاہیوں کو قتل کر دیا آفریدی، سلطان علاء الدین خلجی کے ماہر شمشیرزنوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا اس نے بار بار مناظر پیش کئے تھے کہ اس کی تلوار دشمن کے جسم سے گزر گئی اور دشمن قتل ہونے کے باوجود اپنے پیروں کھڑا رہا۔ دوسرے سپاہی سمجھے کہ وہ زندہ ہے مگر جب اسے ہاتھ لگا گیا تو مقتول کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ زمین پر گر گیا۔ چوڑے گھٹے جنگل میں بھی آفریدی نے اپنے اسی فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ دشمنوں کی تلوار درخت کی شاخوں میں الجھ گئیں اور آفریدی کی شمشیر اس طرح ان کا کام تمام کر گئی کہ دوسرے لیبرو پتہ بھی نہیں چلا کہ ان کے کئی ساتھی زندگی کے قافلے سے ہمیشہ کیلئے پھڑکے ہیں۔

ملک کافر کے سپاہیوں نے دوسری یلغار کی۔ آفریدی برق رفتاری کے انداز میں اپنے دائیں جانب پیچھے کی طرف ہٹ گیا دشمنوں کی بیشتر تلواریں برگد کے درخت میں پھنس گئیں۔ آفریدی فوراً ہی درخت کی اوٹ سے نکلا اور اس بار بھی اس کی شمشیر نے تین چار دشمنوں کے سر قلم کر دیئے۔ مخالفین کی تقریباً نصف قوت تباہ ہو چکی تھی مگر اس دوران حملہ آور آفریدی کے منصوبے کو سمجھ چکے تھے اس لئے ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

”درخت کو چاروں طرف سے گھیر لو اگر ایسا نہیں کیا تو تم سب کے سب مارے جاؤ گے۔“ دشمنوں کا یہ ایک بہتر منصوبہ تھا مگر آفریدی ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا اس نے اپنی پشت برگد کے درخت سے لگادی اور حملہ آوروں کے سامنے آنے کا انتظار کرنے لگا ملک کافر کے سپاہی درخت کو گھیرے میں لینے کے لئے آگے بڑھے مگر اس کا تانا چوڑا تھا کہ آفریدی کی پشت پر وار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نتیجہ گھیراؤ لے والے سارے سپاہی ایک ایک کر کے سامنے آگے پھرنا گماں گیارہ بارہ تلواریں فضا میں بلند ہوئیں اس سے پہلے کہ وہ تلواریں اپنے شکار پر چھٹیں آفریدی کا وہی مخصوص ہنر کام آیا۔ دو سپاہی اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور آفریدی کی تلوار ان کے جسموں سے گزر کر فضا میں لہرائے گئی۔ اب صورت حال بدل گئی تھی تمام دشمن ایک ہی وقت میں حملہ کر کے آفریدی کا قصہ پاک کر دینا چاہتے تھے اس لئے ساری تلواریں اس تنہا شخص کی طرف لپکنے لگیں جو اپنی پشت کی جانب درخت کو ڈھال بنائے ہوئے ایک محدود دائرے میں جنگ کر رہا تھا۔ یہ حکمت عملی آفریدی کے لئے مفید بھی تھی اور نقصان دہ بھی۔ مفید اس لئے کہ درخت کی آڑ لے کر وہ عقبی حملے سے محفوظ ہو چکا تھا مگر اس طریق کار میں نقصان کا پہلو یہ تھا کہ آفریدی چند گز کے ایک حلقے میں سٹ کر رہ گیا تھا۔ حملہ آور کثرت تعداد کے سبب پھیلے ہوئے تھے۔ آفریدی سامنے کے وار کو اپنی سپر پر روک رہا تھا لیکن دائیں اور بائیں ہاتھ کے حملوں کو روکنا اتنا آسان نہیں تھا اس کے دونوں ہاتھ برق کی مانند گردش کر رہے تھے مگر پھر بھی دشمنوں کی کوئی نہ کوئی تلوار اس کے جسم کو چھو لیتی اور زخم کا منہ کھل جاتا۔ یہ لڑائی دیر تک جاری رہی اس دوران آفریدی نے زخمی ہوتے ہوئے بھی مزید چار پانچ سپاہیوں کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا لیکن ابھی اتنے ہی دشمن اور باقی تھے جو آفریدی پر غالب آتے جا رہے تھے۔

زخمی سپاہیوں کی چیخوں اور شمشیروں کی جھنکار نے رات کے سنانے کا جگر چاک کر کے فضا میں عجیب سا شور پیدا کر دیا تھا۔ اسی شور کے سبب درختوں پر سوئے ہوئے پرندے بیدار ہو گئے تھے پھر جب پرندے اپنے آشیانوں سے چپٹے ہوئے اڑے تو جنگل کی فضا اور بھی ہبت ناک ہو گئی جس درخت کے نیچے جنگ ہو رہی تھی وہ بے شمار گدھوں کا مسکن تھا۔ گدھوں کے پروں کی تیز سرسراہٹ اور پر ہول آوازوں نے مزید ہشت پھیلا دی تھی اس اچانک افادے حملہ آوروں کے گھوڑے بھی فرار ہو گئے اور ملک کافر کے سپاہیوں کی کسوٹی بھی متاثر ہوئی۔ ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ چند لمحوں کے لئے رک گئے تھے کچھ ساعتوں کی اس مہلت نے آفریدی کو بھی اپنے دفاع کے لئے ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ دشمن ذرا ہچکچا تو آفریدی کی تلوار نے دو سپاہیوں کی زندگی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب مخالفین کی تعداد تین تک محدود ہو گئی تھی۔ آفریدی کے لئے انہیں ٹھکانے لگانا زیادہ آسان تھا مگر شدید زخمی ہونے اور بہت دیر تک مصروف جنگ رہنے کی وجہ سے اس کے بازو شل ہوئے جا رہے تھے اور فضا دشمنوں کے حق میں سازگار نظر آنے لگی تھی۔

خود آفریدی کو بھی یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب دشمن اس کے جسم پر غالب آجائیں گے لیکن اچانک بساط الٹ

زیادہ خون بہہ جانے سے قہامت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ آفریدی کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گھوڑے کی پشت سے گر کر مرید زخمی نہ ہو جائے اس لئے لگام پر آفریدی کے ہاتھوں کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

یہی وہ لمحات تھے جب علی عامر نے دل ہی دل میں اپنے خدا کو پکارا تھا۔ ”اے بے پناہ اور لازوال قدرت والے! اپنے عاجز و ناتواں بندے آفریدی کو اتنی ہمت دے کہ وہ چوڑ پینچ کر سفارت کی پہاڑ جیسی ذمہ داریوں سے بسکدوش ہو سکے۔“

آفریدی کی دعا قبول ہوئی مگر اس طرح کہ جب وہ تاریک جنگل کی حدود سے باہر نکلا تو صبح ہو چکی تھی اور سامنے چوڑی سرحدوں کے محافظ دستے ادھر ادھر گردش کرتے نظر آ رہے تھے۔

علی عامر نے گھوڑے کو بڑی سبک رفتار گھوڑا آگے بڑھا لیکن اس کے ساتھ ہی آفریدی کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس نے بت کو شش کی کہ پلکیں اور کچھ دیر کھلی رہیں مگر کثرت سے خون بہہ جانے کے باعث اب کمزوری آفریدی پر مکمل غلبہ پا چکی تھی۔ آفریدی کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھوٹ گئی اور وہ لہرا کر زمین پر گر پڑا یہ بھی ایک خوفناک حادثہ تھا مگر ٹل گیا۔ آفریدی کے پاؤں رکابوں میں الجھے ہوئے نہیں رہ گئے تھے ورنہ برق رفتار گھوڑا نادانستہگی میں اسے کھینچتا ہوا دور تک لے جاتا پھر جب گھوڑے نے پشت پر اپنے آقا کا وزن محسوس نہیں کیا تو وہ کچھ دور جاکر ٹھہرا اور پھر آفریدی کی جانب پلٹ پڑا۔

چوڑے کے سرحدی محافظوں نے بھی ایک اجنبی شہسوار کو گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لئے بیک وقت کئی راجپوت سپاہی آفریدی کی طرف دوڑ پڑے۔

”اجنبی! تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ ایک راجپوت سپاہی آفریدی پر جھکا ہوا کرخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”آفریدی نے اس کی آواز سنی۔ ابھی کچھ ہوش باقی تھا وہ آنکھیں تو نہیں کھول سکا مگر اس کے ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔

”میں..... سلطان علاء الدین..... خلجی کا..... سفیر..... ہوں۔“ علی عامر آفریدی رک رک کر بول رہا تھا۔

”مجھے..... رانی پدمنی..... کے حضور..... لے چلو.....“ اتنا کہہ کر آفریدی بے ہوش گیا۔

☆ ☆ ☆
پھر جب آفریدی کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرامتہ کمرے میں نرم اور ریشمی بستر پر دراز تھا۔ آفریدی نے حیرت سے کمرے کی فضا کو دیکھا اور فوری اندازہ کر لیا کہ اسے قلعہ چوڑ کے کسی آرام دہ گوشے میں پہنچا دیا گیا ہے، اس نے اپنے زخمی جسم پر نظر ڈالی۔ پورا جسم سفید بیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس علامت کا واضح مفہوم تھا کہ دشمن ریاست کے حاکموں نے کسی تاخیر کے بغیر رسم میحائی ادا کی ہے۔ اب وہ اپنے زخموں کی خارش میں کمی محسوس کر رہا تھا اور نسبتاً اس کی طبیعت میں بہتری کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

”آفریدی کی نگاہیں کمرے کے ماحول کا جائزہ لینے لگیں، عجیب سی فضا تھی۔ کمرے کا سامان بہت زیادہ قیمتی تھا اور ہر چیز سے شائبہ و قار کا اظہار ہو رہا تھا۔ تمام دیواریں بڑی تصویروں سے سجائی گئی تھیں۔ یہ تصویریں راجپوتوں کی خاص فطرت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ آفریدی کے بالکل مقابل والی دیوار پر جو

گئی۔ آفریدی کا ذہن اور وفادار گھوڑا جو قریب ہی کھڑا اس کشمکش کو دیکھ رہا تھا موقع ملتے ہی عقب سے دشمنوں پر جھپٹ پڑا اور اس کی اگلی دونوں ٹاپیں ایک دشمن کے سر پر پڑیں تو وہ غیر متوازن ہو کر سامنے کی جانب گرنا چلا گیا۔ آفریدی نے اس تائید غیبی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شمشیر دشمن سپاہی کے شکم میں اتار دی۔ یہ آفریدی کی اضطرابی غلطی تھی وہ اپنی تلوار کھینچنے بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرے دشمن نے وار کیا۔ آفریدی نے حیرت انگیز عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈھال آگے بڑھائی مگر تلوار پھسلتی ہوئی آفریدی کے سر تک پہنچ گئی اگرچہ ڈھال نے واری کا طاق کو کمزور بنا دیا تھا لیکن پھر بھی آفریدی کے سر پر گہرا زخم آیا۔ چند لمحوں کیلئے افغان زادے کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا مگر گھوڑے کی بروقت مداخلت نے اس دشمن سپاہی کو بھی زمین بوس ہو جانے پر مجبور کر دیا اتنی دیر میں آفریدی سنبھل چکا تھا اب اس کا صرف ایک مد مقابل باقی تھا۔ آفریدی اپنی تمام قوت ارادی کو سمیٹ کر آگے بڑھا۔ زمین پر گرے ہوئے سپاہی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن آفریدی کا گھوڑا پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے دو ٹھوکروں میں سپاہی کا سر کھنکھل دیا اور وہ پھر آخری دشمن کی طرف پلٹا اب کی بار دشمن کا سینہ گھوڑے کی ٹاپوں کا ہدف تھا۔ ملک کا فور کا آخری غلام پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ آفریدی اسے ختم کرنے کیلئے اپنی شمشیر کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن گھوڑے نے اپنے زخمی آقا کو اس زحمت سے بچایا اور دشمن کو اس طرح روند ڈالا کہ اس کے سینے کی ہڈیاں تک پہنچنے لگیں۔

معرکہ آفریدی کے سر رہا تھا۔ اس نے نمناک آنکھوں کے ساتھ اس جانور کی گردن پر اپنا سر رکھ دیا جو عزیزوں سے بڑھ کر غم گسار اور انسانوں سے زیادہ وفادار تھا۔ ابھی آفریدی سر ٹیکے کھڑا تھا کہ اسے کچھ فاصلے سے ایک گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی آفریدی نے گھبرا کر دیکھا ایک انسانی ہیولا گھوڑے پر سوار بھاگا چلا جا رہا تھا۔

”کم نسل“ بے اعتباروں کی اولاد، غلام زادہ اپنی جان سلامت لے گیا۔ ”علی عامر آفریدی اس قدر زور سے چیخا کہ دور تک جنگل کی ساکت فضا گونج اٹھی۔ اس نے اپنا سارا غصہ فرار ہونے والے سپاہی پر اتار دیا تھا اور سینے میں دبی ہوئی تمام نفرتیں خاموش درختوں کو منتقل کر دی تھیں۔ یہ وہی سپاہی تھا جو پہلا زخم کھانے کے اپنے ساتھیوں کی صف سے الگ ہو گیا تھا اور دور دور کھڑا ہوا اس خونریز ہنگامے کو دیکھ رہا تھا پھر جب تقدیر نے آفریدی کے حق میں فیصلہ دے دیا تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔

آفریدی نے پلٹ کر ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جن میں سے بیشتر موت کی خوراک بن چکے تھے۔ باقی سکر رہے تھے اور دو چار گھڑی کے مہمان تھے۔ آفریدی نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب کوئی دشمن اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں ہے اپنے زخموں کی طرف دیکھا ویسے تو پورے جسم پر ہی ہلکے ہلکے زخموں کی لالہ کاری تھی مگر سر کا زخم زیادہ گہرا تھا جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ آفریدی نے خون روکنے کے لئے اپنی دستار کھولی اور اسے دوبارہ اپنے زخم کے گرد لپیٹ لیا پھر کچھ دیر تک وہ ذہنی کشمکش کا شکار رہا اجنبی علاقے میں رات کا سفر مشکل ترین کام تھا مگر کسی درخت کے سائے میں ٹھہر جانا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ آفریدی سوچنے لگا کہ اگر ساری رات خون اسی طرح بہتا رہا تو وہ صبح تک جنبش کرنے کے بھی قابل نہیں رہے گا۔ اس خیال نے افغان زادے کو سفر جاری رکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔

پھر کسی نہ کسی طرح وہ لحد بھی آگیا جب آفریدی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اسے درختوں کی اوٹ سے مشرقی افق پر ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی تھی اور صبح کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ آفریدی نے گھوڑے کی رفتار کی قدر تیز کر دی۔ اب گزرنے والی ہر ساعت اس کے لئے خطرے کا پیغام لے کر آ رہی تھی۔

تصویر بنائی گئی تھی چوڑی حکمران قوم کے جنڈوں کی عکاسی کرتی تھی۔ تصویر میں ایک دراز قامت شیر دکھایا گیا تھا جس کی زبان باہر تھی اور اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شیر فضا میں معلق تھا اور مصو نے اس کے پیروں کے نیچے کچھ جنگلی جانور زمین پر پڑے ہوئے دکھائے تھے اور بہت سے دہشت زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ شیر پر ایک شمشیر زن سوار تھا وہ اپنی شکل و صورت اور لباس سے کوہِ راجپوت نظر آ رہا تھا۔ آفریدی بہت دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا جو اقتدار اور جبر و تشدد کا بھیاں تک نقشہ پیش کر رہی تھی۔

آفریدی کی نظرس اپنی دائیں جانب اس تصویر پر بھی پڑی جس میں جانوروں کی جگہ انسانوں کے چہرے استعمال کئے گئے تھے۔ اس تصویر کے خم نے بھی طویل و عریض دیوار کو گھیر لیا تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مصور نے رنگوں کی عجیب گل کاریاں کی تھیں۔ مصور کے فن کا کمال یہ تھا کہ ہر شے متحرک اور چہرہ بولتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تصویر میں ایک دراز قامت راجپوت کو شمشیر بکف دکھایا گیا تھا۔ وہ تائب جیسی رنگت رکھنے والا راجپوت اپنی گھنی مونچھوں کے ساتھ جارحانہ انداز میں ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس ایک ہاتھ میں تلوار تھی جس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں کئے ہوئے انسانی ہاتھ تھے۔ پھر جب آفریدی کی نظرس تصویر کے نچلے حصے کی طرف گئیں تو وہاں کچھ اور ہی حشر پرا تھا۔ بے شمار انسان اس راجپوت کے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان آدم زادوں کی یہ حالت تھی کہ جیسوں کیڑے تک نہ تھے۔ چہرے سیاہ قام تھے اور بدن اتنے لاغر کہ جیسے فاتحہ نشی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ چوڑ اور دیگر راجپوت ریاستوں میں بسنے والے اچھوت تھے۔ جن کی پسماندگی اور غلامی کو تصویر دار کے ذریعے ظاہر کیا گیا تھا۔ محل کی دیواروں پر ان تصویروں کے آئیناں کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس ملک میں راجپوتوں کے سوا حکمرانی کا حق کسی اور قوم کو حاصل نہیں برہمنوں کے علاوہ جتنی قوم اقوام ہیں وہ راجپوتوں کے نزدیک ازلی غلام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علی عامر آفریدی نے چند لمحوں میں انداز کر لیا کہ چوڑ کا حکمران طبقہ غرور و تکبر کے نشے میں انتہائی حدوں تک پہنچ چکا ہے اور یہی غرور انہیں ایک دراز خاک میں ملا کر سلطان علاء الدین خلجی کے لئے راستہ ہموار کر دے گا۔

ابھی آفریدی اپنے خیالات میں گم تھا کہ اس کے سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت شخص اندر داخل ہوا وہ بھی راجپوت تھا۔ آنے والے کی عمر جوانی کی حدوں سے گزر چکی تھی مگر اس کی صحت و جسامت قابل رشک تھی۔ اس کا قیمتی لباس ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ریاست کا کوئی اہم شخص ہے۔ آفریدی آداب سیاست سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لئے زخمی ہوتے ہوئے بھی اپنے بستر پر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آئے والے شخص نے جب آفریدی کو ذہنی کشش کا شکار دیکھا تو فوراً ہی پکار کر کہنے لگا۔

”مہمان! تمہیں اپنے زخموں کی شدت کا اندازہ نہیں اس لئے آرام سے لیٹے رہو، میں تمہاری اہم شائستگی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔“ ادھیڑ عمر راجپوت باوقار انداز میں چلتا ہوا علی عامر آفریدی کے قریب آگیا تھا۔

”میں ریاست چوڑ کا مہمانی و کرم سنگھ ہوں۔“ آنے والے نے اپنا مختصر تعارف کرایا مگر اس کا آواز میں نخوت و غرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ”مجھے راجہ رتن سین (رتن سنگھ) اور مہارانی پدمی شامی سفیر کی مزاج چرسی کے لئے بھیجا ہے۔ ہمیں سرحدی محافظوں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ بے ہوش ہوئے وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ میں سلطان علاء الدین خلجی کا سفیر ہوں اور مجھے جلد از جلد رانی پدمی کے حضور لے چلو۔“ مہمانی و کرم سنگھ کا لہجہ تہذیب و شائستگی کا آئینہ دار تھا۔ اس کے بولنے کا یہ انداز

یا تو فطری تھا یا پھر سلطان علاء الدین خلجی جیسے باجبروت حکمران کا سفیر ہونے کے سبب و کرم سنگھ کے الفاظ میں پلک اور نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ یہ جنابو قوم اپنی محبوباؤں سے محبت کا اظہار کرتے وقت اس طرح بولتی تھی جیسے زبان سے موتی جھڑنے کے بجائے انگارے گر رہے ہوں۔ اس تلخ کلامی میں راجپوتوں کا کوئی قصور نہیں تھا وہ تھے ہی فطرتاً کھڑ، تند مزاج اور غصیلے۔ وہ پیار کی بات بھی اس طرح کرتے تھے کہ جیسے کسی آہنی ہتھیار سے پتھر توڑ رہے ہوں۔ مگر و کرم سنگھ کے لہجے نے اپنی نرم کلامی سے راجپوتوں کی اس روایت کو بدل ڈالا تھا۔

علی عامر آفریدی نے مہمانی و کرم سنگھ کی طرف غور سے دیکھا ابھی وہ جواب میں اپنے ہونٹوں کو جنبش بھی دینے نہیں پایا تھا کہ مہمانی و کرم سنگھ دوبارہ بول اٹھا۔ ”ہمارے محافظ فوجیوں کے بقول آپ شدید زخمی تھے اور زبان سے چند الفاظ ادا کرنے کے بعد بے ہوش ہو گئے تھے۔ پھر آپ کو ہمارے سپاہی راج محل میں لے آئے۔ راجنید (شامی طبیب) نے آپ کے زخموں کا علاج کیا۔ بھگوان کی کرپا سے آپ بہت جلد ہوش میں آ گئے۔ مجھے بتائیے کہ اب آپ کی محسوس کر رہے ہیں؟ کہیں کوئی ایسی تکلیف تو نہیں ہے جسے راجنید نہ سمجھ سکے ہوں۔“

علی عامر آفریدی کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار سائبم ابھر آیا اور پھر وہ آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”میں مہارانی پدمی اور مہمانی و کرم سنگھ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آج اپنے گرد پائی جانے والی سہولتیں دیکھ کر راجپوتوں کی مہمان نوازی کا قائل ہو گیا ہوں۔“

علی عامر کے اس اعتراف کے بعد و کرم سنگھ کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے پھر اس نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں اب تک اپنے معزز مہمان کے نام سے واقف نہیں ہو سکا ہوں۔“

”مجھے علی عامر آفریدی کہتے ہیں۔“ علاء الدین خلجی کے سفیر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میں مہارانی کے لئے سلطان کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔“

آفریدی کی بات سن کر و کرم سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اصولی طور پر سلطان کا پیغام راجہ رتن سنگھ کے نام ہونا چاہئے تھا۔ رانی پدمی نے سلطان کے پیغام کا کیا حلق؟ و کرم سنگھ، علی عامر آفریدی کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ غم پھر بھی وہ خاموش رہا اور بدستور نرم لہجے میں کہنے لگا۔ ”آپ مزید چند روز آرام کر لیں۔ پھر جب سارے زخم بھر جائیں گے تو مہارانی آپ کو ورنہ دے دیں گی۔“ اب و کرم سنگھ کی باتوں میں گرجوئی نہیں تھی اور لہجہ کھوکھلا محسوس ہو رہا تھا چند لمحوں کے لئے کمرے میں سکوت طاری رہا۔ پھر وہ علی عامر آفریدی سے کہنے لگا۔ ”یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ چوڑ کی سرحدوں تک زخمی حالت میں کس طرح پہنچے؟“ بالآخر و کرم سنگھ نے وہ نازک سوال پوچھ ہی لیا جس کا آفریدی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

علی عامر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر فکر انگیز لہجے میں بولا۔ ”میں حملہ آوروں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ جیسے ہی میں سر شام چوڑ کے جنگلی علاقے میں داخل ہوا، وہ اچانک کسی طرف سے نکل آئے اور ان لوگوں نے یہ کہہ کر مجھ پر یلغار کر دی کہ وہ جنگل کے شمشاہ ہیں۔ میں نے خدا کے بھروسے پر تھان لوگوں کا مقابلہ کیا اور تمام لیروں کو تہ تیغ کر دیا۔ پھر بھی ان قزاقوں میں سے ایک لیڈر معمولی زخمی ہونے کے سبب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

و کرم سنگھ، سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

رہ گئی تھیں۔ ہم نے ان مردہ جسموں کو جنگل سے اٹھوا کر تہ خانوں میں پہنچا دیا ہے، یہ کہہ کر وکرم سنگھ خاموش ہو گیا اور بہت غور سے علی عامر آفریدی کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

آفریدی، وکرم سنگھ کا بیان سن کر چونک اٹھا تھا۔ اندیشے تو پہلے ہی اس کے ذہن میں سرابھارنے تھے مگر اب واقعات کے موجودہ رخ نے ان اندیشوں کو ایک بھیاں حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ مرنے والے ڈاکو نہیں، تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ اس انکشاف کے بعد علی عامر آفریدی کی بے چین نگاہوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان واضح ہو گیا تھا کہ اگر وہ سپاہی تھے تو ان کا تعلق کس حکمران کی فوج سے تھا۔ رانی پد منی کے لشکر سے یا پھر چٹوڑ کے کسی حریف راجہ کی فوج سے؟ بڑے نازک لمحات تھے۔ علی عامر آفریدی اپنے پریشان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک مہمانتزی کی تیز آواز نے کمرے کے سکوت میں گرا گشت ڈال دیا۔

”آفریدی! تمہیں تعجب ہو گا کہ مرنے والے فوجی لباس میں نہیں تھے مگر ان کا تعلق یقینی طور پر کسی فوج سے تھا۔“ وکرم سنگھ رک رک کر بول رہا تھا اور اس کی نظریں آفریدی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”آپ کے خیال میں مرنے والوں کا تعلق کس فوج سے ہو سکتا ہے؟“ علی عامر آفریدی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ بے داغ کردار کا مالک تھا اس لئے دیار و دشمنوں میں بھی اپنی روایتی بے باکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”مرنے والوں کا تعلق کسی مسلمان حکمران کی فوج سے ہے۔“ وکرم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور آفریدی کے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کا مشاہدہ کرنے لگا۔

”مسلمان فوج!“ آفریدی زخمی ہونے کے باوجود بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کنکشن میں شاہی سفیر کے کئی زخموں سے خون رسنے لگا۔ مگر اس وقت وہ جسم کی تمام اذیتوں سے بے نیاز تھا۔ ”میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔“ آفریدی نے اپنے منتشر لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی تھی ”آپ کے قرب وجوار میں بھی کوئی اسلامی ریاست موجود نہیں ہے۔“ آفریدی نے وکرم سنگھ سے ایک منطقی سوال کیا تھا ”پھر مرنے والے قزاقوں کا تعلق کسی مسلمان لشکر سے کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”ہمارے مہمان کا یہ سوال حقیقت پسندانہ ہے۔“ اچانک وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم ابھر آیا جو کسی خاص بات کی غمازی کر رہا تھا ”ہمارے ماہر جاسوسوں نے مرنے والوں کے چہرے اور ان کی تلواریں دیکھ کر اپنا شک ظاہر کیا ہے کہ وہ سلطان علاء الدین خلجی کی فوج سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ظاہری نشانیوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کے سب مسلمان تھے۔“

وکرم سنگھ کے الفاظ کیا تھے، ”ایک زلزلہ تھا جس کے اثر سے آفریدی کے دل و دماغ کی ساکت زمین لرز اٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھا، وکرم سنگھ کو دیکھتا رہا۔“

پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”اگر مہمانتزی مناسب سمجھیں تو مرنے والوں کی لاشیں مجھے دکھادیں تاکہ میں خود بھی کسی نتیجے پر پہنچ سکوں اور یہ اندازہ کر سکوں کہ سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر پر حملہ کرنے کی یہ گستاخانہ جرأت کس نے کی تھی اور حملہ آور کس علاقے سے تعلق رکھتے تھے؟“ یہ کہتے کہ علی عامر آفریدی کی رگوں میں بے نہ والا افغانی خون جلنے لگا تھا اور علاء الدین خلجی جیسے باجرو ت حکمران کی نسبت نے اس کے لہجے کو مزید بار بار تار بنا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
پھر جرب مہمانتزی وکرم سنگھ کے حکم پر ایک ایک کر کے وہ تینوں لاشیں علی عامر آفریدی کے سامنے لائی

”نہیں! میرے معزز مہمان! ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ مہمانتزی وکرم سنگھ نے آفریدی کی زبان سے پورا واقعہ سننے کے بعد کہا۔ ”چٹوڑ کے مضافاتی علاقے سے ملحقہ یہ جنگل تاریک ضرور ہے مگر یہاں لٹیرے قیام نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دیہات کی جوان لڑکیاں آبرو مندانہ زندگی کس طرح بسر کرتیں؟ وہ روزانہ دریا پر پانی بھرنے جاتی ہیں، کھیتوں سے چارہ لاکر اپنے مویشیوں کی پرورش کرتی ہیں اگر جنگل میں قزاقوں کا ڈیرہ ہوتا تو پھر چٹوڑ کے دیہاتی باشندوں پر زندگی حرام ہو جاتی۔“ مہمانتزی اپنے مضافاتی علاقے کی صورت حال وضاحت سے بیان کر رہا تھا اور علی عامر کی پیشانی پر ابھرنے والی دھندلی لکیریں آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

”ہاں! چند سال پہلے ڈاکوؤں کی ایک جماعت کسی ریاست سے بچ کر یہاں بسنے لگے تھے مگر جیسے ہی ہمیں خبر ملی، ہم نے پوری توانائی کے ساتھ ان پر حملہ کیا اور ایک ہی دن میں قزاقوں کی اکثریت کو ہلاک کر ڈالا اور کچھ بچ گئے تو وہ آج تک ہمارے قید خانوں میں بدترین زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں بردھان منترزی کی حیثیت سے اپنے مہمان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ قزاق ہمارے علاقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ یقیناً یہ کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔“

سازش کے لفظ پر علی عامر چونک اٹھا اور پھر اس کے ذہن میں گزری ہوئی رات کی کئی پرچھائیاں لرزنے لگیں پھر جب سکوت کا یہ وقفہ طویل ہوا تو مہمانتزی وکرم سنگھ نے آفریدی کو پکارا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ جب وہ چٹوڑ کے جنگل کے پناہ گیر ڈاکو نہیں تھے تو پھر وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور میری جان کے درپے کیوں نظر آرہے تھے؟“

”اسی سوال پر میرا ذہن بھی الجھ جاتا ہے۔“ وکرم سنگھ بھی پریشان نظر آرہا تھا۔

علی عامر آفریدی بھی مسلسل پیچیدہ صورت حال کے بارے میں غور کر رہا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اس کی سوچ کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر شدید ذہنی اضطراب کے بعد وہ ایک نتیجہ خیز مصلحے پر پہنچ گیا۔

آفریدی نے مہمانتزی وکرم سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ابھی اس واقعے کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے میرے خیال میں تقریباً تمام ڈاکو لقمہ اجل بن چکے ہیں ان کی لاشیں ابھی تک وہیں موجود ہوں گی۔ اگر آپ ان لاشوں کا معائنہ کرالیں تو یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ پیشہ ور رہزن تھے یا کسی سازشی منصوبے کا ایک حصہ بن کر یہاں تک پہنچے تھے۔“

وکرم سنگھ کو علی عامر آفریدی کی یہ تجویز پسند آئی تھی اور وہ سلطان علاء الدین خلجی کے نو جوان سفیر کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔

دوسرے دن وکرم سنگھ نے آفریدی کو یہ ناقابل یقین اطلاع دی کہ مرنے والوں کی تعداد اٹھ تھی اور وہ سب کے سب اپنے ظاہری جیلے سے قزاق معلوم نہیں ہوتے تھے۔ پھر وکرم سنگھ نے قتل ہونے والوں کی تفصیل سنائی تو آفریدی کو معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا انجام لرزہ خیز بھی تھا اور عبرتناک بھی۔ مہمانتزی وکرم سنگھ نے آفریدی کو بتایا۔

”اگر ہمارے سپاہی وہاں پہنچنے میں کچھ تاخیر سے کام لیتے تو ساری لاشیں گدھوں کی خوراک بن چکی ہوتیں۔ سولہ لاشیں اس حالت میں پائی گئیں کہ ان کے جسموں پر کسی کسی جگہ گوشت باقی رہ گیا تھا وہ سب کے سب ہڈیوں کا بچہ بن چکے تھے۔ بس تین لاشیں ایسی تھیں جو گدھوں کی تیز چونچوں سے محفوظ

گئیں تو وہ ان مردہ انسانوں کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ تمام مرنے والے دہلی کے لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ تینوں مقتول سپاہیوں کو دیکھ کر آفریدی کو احساس ہوا تھا جیسے وہ تینوں چہرے اس کے شناسا ہوں لیکن آفریدی ان کے ناموں سے واقف نہیں تھا۔ اگر انسانی آنکھ کے دھوکا کھا جائے تو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ مقتول سپاہیوں کی تلواروں پر پائے جانے والے مخصوص نشانات بھی سلطانی افواج کی نشاندہی کر رہے تھے۔ آفریدی کے دل و دماغ قابو میں نہیں تھے مگر پھر بھی اس نے غیر معمولی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے چہرے سے بدخواہی کی کسی علامت کو ظاہر نہیں ہونے دیا جب وہ ایک ایک لاش کو بغور دیکھ چکا تو اس نے ریاست چوڑ کے مہماننزی و کرم سنگھ کے سامنے کسی جھجک کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

”آپ کے ماہر جاسوسوں کا شبہ محض ایک شبہ ہے۔ اسے اعتبار اور یقین کا درجہ حاصل نہیں۔“ آفریدی نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے وکرم سنگھ کے دعوے کو یکسر جھٹلادیا تھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔“ اچانک وکرم سنگھ کا لہجہ بھی تبدیل ہو گیا تھا اور زبان کی نرمی و فطرت سختی میں بدل گئی تھی۔ ”میں نے شک کی بات کسی احتیاط کے پیش نظر نہ کی تھی ورنہ مجھے یقین تو اسی وقت آگیا تھا جب پہلی لاش جنگل سے اٹھا کر میرے سامنے لائی گئی تھی۔ مرنے والوں کا مسلمان ہونا تعجب کی بات ضرور ہے لیکن یہ امر میرے لئے زیادہ حیرتناک ہے کہ ان کی تلواریں سلطان علاء الدین خلجی سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رکھتی ہیں۔“

علی عامر مکمل طور پر مستعد اور ہوشیار تھا۔ جیسے ہی وکرم سنگھ خاموش ہوا آفریدی کہنے لگا۔ ”ریاست چوڑ کے پردھان منتری اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ شمشیریں شاہی اسلحہ خانے سے چرائی بھی جاسکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جنگ میں سلطان کے سپاہی شہید کر دیے گئے ہوں اور پھر ان کی تلواریں کسی عیار و دشمن نے کسی خاص مقصد کیلئے استعمال کی ہوں۔ وہ اس طرح مجھ پر حملہ کر کے چوڑ کے حکمران کو میری طرف سے بدگمان بھی کر سکتا ہے۔ اگر مرنے والوں کا تعلق سلطانی لشکر سے ہوتا تو پھر وہ اپنے ہی سفیر کی جان کے دشمن کیوں ہو جاتے؟“ علی عامر آفریدی نے انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے وکرم سنگھ کے سامنے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی۔

جب فوری طور پر چوڑ کے مہماننزی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو آفریدی نے ایک اور نفسیاتی ضرب لگا دی۔ ”اس صورت میں تو آپ کی گفتگو سے یہی مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میں سلطان کا مصنوعی سفیر ہوں۔ دارالحکومت سے فرار ہو کر آیا ہوں اور سلطان کو میری خفیہ روائی کی خبر ہو گئی ہے پھر میرے سفر کو روکنے کے لئے خود سلطان ہی نے مجھ پر حملہ کر لیا ہو۔“ علی عامر آفریدی سوالیہ نظروں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آفریدی کے دلائل کے سامنے وکرم سنگھ کا جواب سا نظر آرہا تھا۔

”آپ کو میرے سفیر ہونے پر تو شک نہیں؟“ علی عامر نے الفاظ بدل کر اپنے نفسیاتی حربے کو دوبارہ استعمال کیا۔

”نہیں۔“ مہماننزی وکرم سنگھ کی آواز بھیجی بھیجی تھی۔

”بے ہوش ہو جانے کے بعد یقیناً آپ کو میرے پیر بن سے کچھ کانڈات ملے ہوں گے۔“ آفریدی نے وکرم سنگھ کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی گتہنگ جاری رکھی۔ ”وہی کانڈات میری شناخت ہیں۔ ان سے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ میں سلطان کا حقیقی سفیر ہوں یا کوئی مفروضہ مجرم؟“

وکرم سنگھ کے چہرے پر ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ ”نہیں! ہم اپنے معزز مہمان کی ذات پر نہیں کر سکتے۔“

”پھر مجھے ہلاک کرنے کی کوششوں کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟“ آفریدی نے غجالت کا شکار ہو جانے لے وکرم سنگھ سے پوچھا۔

”آپ مطمئن رہیں۔“ وکرم سنگھ نے گہرا کر کہا۔ ”ہم بہت جلد اس واقعے کی تحقیق کرائیں گے کہ یہ اپنا منصوبہ کس نے ترتیب دیا تھا؟“

”یہ منصوبہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مجھے رات کے اندھیرے میں رانی پد منی کے دربار تک پہنچنے سے ہلاک کر دیا جائے اور پھر ہمارا چوتھوں کی تاریخ پر یہ بد نماواغ ہمیشہ کیلئے نقش ہو کر رہ جائے۔“

وکرم سنگھ زیادہ دیر تک آفریدی کے پاس نہ بیٹھ سکا اور مختلف خیالات میں الجھا ہوا واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

وکرم سنگھ کے جاتے ہی علی عامر آفریدی کے ذہن میں اندیشوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لاشوں کیلئے لینے کے بعد آفریدی کو یقین آگیا تھا کہ وہ تمام مقتول سپاہی شاہی افواج سے تعلق رکھتے تھے۔ آفریدی تدبیر تک سوچتا رہا کہ آخر پس پردہ کون شخص ہے جو اس کی اور رانی پد منی کی ملاقات کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ کون خفیہ دشمن ہے جو اسے اس قدر نازک فرض کی ادائیگی کے وقت قتل کرنا چاہتا تھا؟ ذہن کے ایک گوشے کی تلاشی لینے کے بعد آفریدی کو اپنے لاشعور کے نقاب میں چھپا ہوا ایک ہی آدم زاد نظر آیا۔ اس کا نام ملک کافور تھا۔ اسی نے سلطان کی بخشی ہوئی اس سفارت پر طعنہ زنی کی تھی۔ آفریدی کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے مناظر کا ایک ایک عکس ابھر آیا۔ خیالات کے اس ہجوم سے نکل کر درباری راقصہ وہ جمال بھی چند لمحوں کیلئے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور پھر یادوں کا یہ سلسلہ شہر ہانسی تک جا پہنچا۔ اس کی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ مقیم تھیں۔ آفریدی لرز کر رہ گیا۔ اگر وہ اس سلسلے میں مارا اتواس کی بیوہ ماں اور معصوم بہن پر کیا گزرتی؟ افغان زادے کے آہنی اعصاب اس پتھر کی طرح چٹختے نہ جس پر اچانک کسی کے دست جفا کار نے مشق ستم شروع کر دی ہو۔

ناگماں ایک اور جان لیوا اندیشے نے آفریدی کے دل کی دنیا تھوہلا کر رکھ دی۔ وہ بستر پر بیٹھے بے سوچنے لگا۔ ”جب ملک کافور سلطان کے اہم ترین سفیر پر حملہ کرانے کی جرأت کر سکتا ہے تو پھر میرے ماخانہ کا کیا ہو گا جو دہلی سے دور ہانسی میں بظاہر ایک محفوظ زندگی گزار رہے ہوں گے مگر پھر بھی ملک کافور کی ترس سے دور نہیں ہوں گے۔“ اس خیال کے ساتھ ہی آفریدی کا زخمی جسم لرز اٹھا اور اس کے ہونٹوں پر آہ سرد نکل گئی۔

”خدا یا! مجھ پر جو گزرتی ہے گزر جائے مگر ان خواتین کی حفاظت فرما جو میرا ناموس ہیں، میری آبرو کو بے ضمیر انسان کے حواس نہ کر جس کی غیرت و حیا سرور بار نیلام ہو چکی ہے۔“ آفریدی بہت دیر تک مایہ دل میں دعائیں کرتا رہا پھر انہی دعاؤں کے دوران اسے راقصہ زہرہ جمال کا خیال آیا اور آفریدی پر بار پھر وحشت طاری ہونے لگی۔ ”مالک و دوحاں!! اس عورت کی بھی حفاظت کر جسے اہل شرع آبرو دینے میں مگر جو اپنے سینے میں ایک درد مند اور پاکیزہ دل رکھتی ہے۔“

پھر آفریدی کی دعاؤں کا سلسلہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ ذہن و وسوسوں اور اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ اپنے ذہن کو پرسکون رکھنا چاہتا تھا مگر پریشان خیالات کی بیخاں نے اسے دن بھر چین سے نہیں رہنے مایاں تک کہ شام ہو گئی۔

شام کے وقت مہمانی و کرم سنگھ دوبارہ علی عامر آفریدی کی مزاج پرسی کے لئے آیا اور گفتگو مکرر کر کے ساتھ کئے لگا۔ ”ہمارے مہمان کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

آفریدی نے جواباً کہا کہ وہ بہادر راجپوتوں اور خصوصاً مہمانی کی مہمان نوازی کا تہ دل سے شکرگزار ہے۔

پھر جیسے ہی شام کا اندھیرا گرا ہوا، آفریدی کے لئے کھانا آگیا اگرچہ راجپوت گوشت کھاتے تھے لیکن آفریدی نے پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ گوشت استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک ایک کافر کے ہاتھوں ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں تھا۔ اس لئے آفریدی کو سبزیوں، والوں اور چاول پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد دیکھ کر بعد آفریدی نے ایک خوبصورت لڑکی کو شیشے کے کچھ برتن اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ آفریدی نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا جو ایسے لباس میں ملبوس تھی جس سے اس کے رقصہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

آفریدی نے غور سے ان شیشے کے برتنوں کو دیکھا جن سے شراب نوشی کے پر تکلف اہتمام کی فراہم ہو رہی تھی۔ آفریدی نے قدرے ناگوار لہجے میں لڑکی سے پوچھا: ”یہ سب کیا ہے؟“

لڑکی نے ایک نگاہ غلط انداز سے آفریدی کی طرف دیکھا اور جواب دے بغیر یاد صبا کے کسی ایک جھوٹے کی طرح لہرائی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آفریدی کو لڑکی کے خاموش رویے پر حیرت بھی گزرا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اس کی خاطر ودارات کیلئے ایک حرام شے پیش کی گئی تھی۔ آفریدی بڑے انداز سے اس منقش صراحی کو دیکھنے لگا جس سے سرخ پانی بھلک رہا تھا۔ یہ وہی سرخ پانی تھا جس کی لذتوں بڑے بڑے دیو قامت انسان کسی حقیر کٹرے کی طرح ڈوب گئے تھے اور تاریخ کا رخ موز دینے والے عظیم الشان سلطنتیں اس طرح غرق ہو گئی تھیں جیسے بلوریں جام میں کثیف تھلٹ نظر آتی ہو۔ آفریدی چہرہ عداوت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں بھی کبھی ایسے مظاہر دیکھے تھے اور وہ ہمیشہ شرم و خجالت کے پسینے میں نہا جاتا تھا۔ یکبارگی آفریدی کے دل میں آیا کہ وہ ان شیشے کے برتنوں کو توڑ دے اور انگوروں کے اس رس سے کمرے میں بچھی ہوئی قالین کو داغدار بنادے مگر یہ سوچا اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے کہ ایک شاہی سفیر کو دشمن ملک میں کسی بھی جذباتی حرکت سے باز

چاہئے۔ ابھی آفریدی کے دل و دماغ میں یہ کشمکش جاری تھی کہ وہ لڑکی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اب کی بار وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک خوش رنگ رباب موجود تھا جس پر جگہ جگہ زرد رنگ بکھرا جڑے ہوئے تھے۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ آفریدی طرف دیکھا اور پھر رباب کو ایک گوشے میں رکھتے ہوئے پلٹ کر کہنے لگی۔

”ہمارے مہمان اب تک خاموش ہی بیٹھے ہیں۔“ لڑکی کی باتوں سے دلربائی کا انداز بھلک رہا۔ ”شیشہ صراحی سے چھیر چھاڑنے کا نامزدگی کی تو ہیں ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب تک یہ تمام برتن خالی ٹوٹ چکے ہوں گے۔“ لڑکی کی شوخیوں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھیں۔

اب آفریدی کی قلبی کیفیت دگرگوں ہوئے لگی۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟“ انہوں نے کالجیہ تہذیبی تھا اور حاکمانہ بھی۔

”عجب ہے آپ اے نہیں پہچانتے۔“ لڑکی مسلسل شرارت پر آمادہ تھی۔ ”میں تو بچپن سے ہی آئی ہوں کہ اس پانی کے بغیر بڑے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ پھر ایک آٹا۔“

”یہ وہ پانی کیوں؟“

”میں شراب نہیں پیتا۔“ آفریدی کے لہجے میں بیزار تھی۔ ”مہمان نوازی کے ان لوازمات کو اٹھاؤ اور کمرے سے باہر جا کر ایک ایک شیشے۔۔۔ بڑے بڑے کر دو۔“

”آپ شراب نہیں پیتے؟“ آخر کیوں؟“ اب لڑکی کی زبان بات کرتے ہوئے لڑکھڑانے لگی تھی۔

”مجھ سے تو کیا گیا تھا کہ مسلمان بڑے نفیس مزاج کے مالک ہوتے ہیں اور شراب کے سلسلے میں وہ ”قدیم وجدید“ کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔“ لڑکی کی شوخی و شرارت رخصت ہو چکی تھی اور اب وہ بڑے سنجیدہ اور پراعتماد لہجے میں بول رہی تھی۔ ”مسلمانوں کی اسی عادت کے پیش نظر مہمانی نے شراب کے تمام ذخیروں میں سے اس پانچ سو سالہ پرانی شراب کا انتخاب کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ شراب صرف چوڑے آنے والے اہم راجہ اور مہاراجہ کو پیش کی جاتی ہے۔ تم ایک سفیر ہو مگر علاء الدین خلجی کے سفیر۔ اگر کسی دوسری ریاست کا سفیر یہاں آتا تو اسے ایک عام سے کمرے میں ٹھہرایا جاتا اور اس کی مہمان نوازی کیلئے معمولی سی شراب پیش کی جاتی۔“

”تم نے جو کچھ سنا ہے وہ جھوٹ ہے اور تمہیں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں پر ایک شرمناک تہمت ہے۔“ آفریدی کا ہوا چہرہ جھٹمٹا لگا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سکوت توڑا: ”لیکن اس میں ہمارا بی کیا قصور ہے کہ لوگ کسی ایک انسان کی لغزش کو اس کی پوری قوم سے منسوب کر دیتے ہیں۔ پھر بھی میں میں بتانا ہوں کہ مسلمان شغل سے نوشی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہ اس زمین پر صرف ہدایت اور انصاف لے کر آئے ہیں۔ بادہ خانے تو کبھی کے اجاڑ دیئے گئے ہیں اور شراب تو بہت پہلے مٹی میں ملادی گئی۔ تم یہ بی جس حرام یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔ تمہارے مہمانی نے میری بڑی دل آزاری کی ہے۔ میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ آداب میزبانی کا خیال رکھتے رکھتے چاکناک بن جائیں گے۔“ علی عامر تہ زیادہ مذاہن ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وکرم سنگھ نے جو کچھ کیا ہے، وہ ایک سیاسی سلوک ہے اور وحشیانہ دور کی تواضع ایک انداز ہے مگر آفریدی کو یہ انداز گراں گزرتا تھا۔

علی عامر کی باتیں سن کر لڑکی ایک بے جان تصویر کی مانند نظر آنے لگی تھی وہ پلکیں جھپکائے بغیر آفریدی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو جو آکاش کی بلندیوں سے چوڑکی دھڑکی پر اتر آئی۔

”شاید تم نے نہیں سنا؟“ آفریدی کی آواز بلند تھی۔

لڑکی گھبرا کر اٹھی اور سسے ہوئے انداز میں تمام سامان کیف و نشاۃ لے کر باہر نکل گئی۔ لڑکی کے جاتے ہی فریدی کو احساس ہوا کہ انفرادی غلطیاں کس طرح پوری قوم کو ”کوئے ملامت“ میں لے جا کر ہمیشہ کیلئے نام کر دیتی ہیں۔ راجپوتوں کی بدستی میں بھی مسلمانوں کے متعلق کچھ ایسے ہی رسوا کن اور حقیر کر آمیز سائے مشہور تھے۔ آفریدی کو ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا پھر اس نے طے کر لیا کہ وہ کل اسی فی حالت میں رانی پد منی کے سامنے چلا جائے گا اور چوڑکی حکمران کو سلطان کا پیغام دے کر دہلی روانہ جائے گا۔

آفریدی کی اذیتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا کہ وہی لڑکی تیسری بار کمرے میں داخل ہوئی اسے دیکھتے آفریدی بول اٹھا۔

”اب تم کیوں آئی ہو؟ تمہارا یہاں کیا کام ہے؟“ آفریدی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

”میں شرفائے زمانہ کی ایک حقیر سی کنیز اور معززین وقت کی ایک ادنیٰ سی خدمت گار ہوں۔ رات کے

سنانوں کی شریک، ایک مطرہ، ایک رقاہ، اوس دلوں کا قرار اور منتشر ذہنوں کا سکون۔ ”لو ہونٹوں پر گھٹکتے مسکراہٹ بھی مگر آواز میں ایک، خلش، ایک درد بھی پھٹاں تھا۔“

”میں تمہاری خدمت معاف کرتا ہوں۔“ اب آفریدی کے لئے لڑکی کی آمد کوئی راز نہیں رہا سمجھ رہا تھا کہ وکرم سنگھ نے اسے کس مقصد کیلئے بھیجا ہے؟ یہ تماشا دہلی کے بعض مسلمان امراء بھی شوق سے دیکھتے تھے اور چوتڑ میں بھی یہی کھیل جاری تھا۔ آفریدی کو اقتدار کی ان دلچسپیوں سے نفرت اس لئے جیسے ہی ہندو لڑکی نے اپنے فرائض کی تفصیل بیان کی، وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا: ”آج کی شب نہیں ہو۔ مجھے بھی چین سے سونے دو اور خود بھی ایک رات کے لئے سارے غموں کو فراموش کر۔“

نیند سو جاؤ۔ پتہ نہیں تم کب سے جاگ رہی ہو۔ تصورات کی محفل آراستہ کرو اور روشنی کے خواب میں نہیں جانتا کہ تمہاری آنے والی رات کس کے نام وقف ہوگی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ میں تمہیں صراحت کی آزادی دے سکوں۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری تمام راتوں کی زنجیریں کاڑ جاؤ! بس اب چلی جاؤ۔ اگر کبھی تمہیں فرصت ملے تو اپنی قوم کے لوگوں کو بتا دینا کہ تمہارے دیس مسلمان آیا تھا جسے شراب سے کوئی رغبت نہیں تھی اور جو مجبور لڑکیوں کی نیندیں حرام نہیں کرتا آفریدی نے سو گوار لہجے میں کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

شاہی سفیر کی گفتگو سن کر بت پرستوں کی مملکت میں رہنے والی خود بھی ایک بت بن گئی۔ چہ کیلئے راج محل کے کمرے پر قبرستان جیسی مسیب خاموشی چھا گئی پھر وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور آفریدے سے اسے آکر کھڑی ہو گئی۔

”کیا تم مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ علی عامر نے لڑکی سے پوچھا جس کی ساری شوخیاں ہو گئی تھیں اور وہ سر سے پانک ایک مکمل پیکر دروہن کر رہ گئی تھی۔

”ہاں!“ لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی یہ ”میں ایک گیت سنانے آئی تھی۔“

آفریدی کچھ دیر تک لڑکی کی اس عجیب سی خواہش کے بارے میں سوچتا رہا پھر بے دلی کے انداز میں ”ایسا لگتا ہے جیسے اس دنیا میں رہنے والے ہر شخص کی زبان کو اس کے ہونٹوں کے درمیان قید ہے۔ کوئی تقریر کی آرزو رکھتا ہے اور وہی فقرہ خوانی کی مقصد تو ایک ہی ہے کہ الفاظ بند شوں سے چاہتے ہیں۔ تم بھی اپنا گیت سنانا لو کیا خبر کہ آنے والے لمحات مجھ سے میری سماعت چھین لیتے ہیں تمہاری آواز۔“

لڑکی کی بھتی ہوئی آنکھوں میں خوشی کا ایک شعلہ سا بھڑکا اور پھر وہ رباب اٹھا کر آفریدی کے گئی۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کی مخروطی انگلیاں کسی تار کو چھیریں وہ آفریدی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ”میرا نام کاہتا ہے۔ مہمانداری نے آپ کو خوش کرنے کی ذمہ داری میری ایک ساتھی لڑکی کو سونپی تھی مگر میں نے انہیں کسی نہ کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا کہ شگفتہ کی جگہ خود آپ میں پیش ہو جاؤں۔ میں نے مسلمانوں کے متعلق یہ بھی سنا تھا کہ ان کے یہاں نسل اور ذات نہیں ہوتا۔ جبکہ اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں تو راجا اور پر جا کے بیچ کوئی تفریق باقی نہیں رہتا عقل اس ”انسانی“ کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں جو پر ماتما کی دھڑکی پر ایک قطار میں کاندھے سے کاندھا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا، میں کسی مسلمان کو دیکھوں۔ آج تمہیں دیکھا تو یہی آرزو سیراب ہو گئی۔ اب اپنے پیدا کرنے کوئی شکوہ نہیں رہا۔“ یہ کہتے کہتے لڑکی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے فوراً ہی سر جھکا لیا اور پھر وہ

لہجے رباب کے تار جھنکاٹھے۔ کاہتا پر سوز لہجے میں گارہی تھی۔

”ہم دھرتی کی کوکھ سے پھوٹنے والی وہ فصل ہیں جسے پکنے سے پہلے گرم ہواؤں نے جلا ڈالا

ہمیں ماؤں کی گود سے اس وقت جدا کر دیا گیا جب ہمارے لوریاں سننے کے دن تھے

ہمارے ریشم جیسے سپنوں کو کانٹوں پر ڈال کر کھینچا گیا

ہمارے کول تن پتھروں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے

پھر وہ دیوتا بن گئے اور ان دیوتاؤں نے ہماری پوجا کو ٹھکرا دیا کہ ہمارے ہاتھ ناپاک تھے

اور ہم آدم کی نہیں، حیوانوں کی اولاد تھے۔“

جیسے ہی کاہتا نے اپنے گیت کے آخری بول ادا کئے کمرے میں چار مسلح سپاہی داخل ہوئے۔ آفریدی موت محال کھینچنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک سپاہی نے کاہتا کے ہاتھ سے رباب چھین کر دیوار پر مار دیا اور دوسرے سپاہی نے لڑکی کے بال پکڑ لئے پھر وہ اسے ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح کھینچتے ہوئے کمرے سے لے جانے لگے۔

”تم کون لوگ ہو اور اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟“ آفریدی شدید زخمی ہونے کے باوجود بستر سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا تھا۔ سپاہی اسے قراؤد نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ آفریدی چند قدم آگے بڑھا تو دروازے پر کھڑے ہوئے دونوں محافظوں نے اپنے ہاتھ آگے کر دیئے اور شاہی سفیر سے سخت لہجے میں کہا۔

”تمہیں اس کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

آفریدی اس غیر متوقع حادثے پر حیران ہو رہا تھا اور طویل راہ داری میں کانٹا کی چھین گونج رہی تھیں۔

”مہمان! جب تم دہلی واپس جاؤ تو اپنے سلطان کو بھی میرا یہ گیت سنانا اور ان سے کہہ دینا کہ وہ جلد از بلد چوتڑ آئیں۔ اگر سلطان نے آنے میں تاخیر کی تو ان گت آوازیں سینوں میں گھٹ کر رہ جائیں گی اور بے شمار نفی پتھروں سے ٹکرا کر دم توڑ دیں گے۔“

بمست دیر تک کانٹا کی چھین گونجتی رہی۔ علی عامر آفریدی کو کمرے میں محصور کر دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ نہیں دیکھ سکا کہ مسلح سپاہی کاہتا کو طویل راہ داری سے گزار کر کس طرف لے گئے؟ کسی زندان میں یا قتل بڑھا۔ شدید زخمی حالت میں اس کا یہ عمل اپنی ذات کے لئے بڑا جارحانہ تھا جس کے نتیجے میں زخموں کے نہ کھل گئے تھے اور آفریدی کا جسم ایک بار پھر رنگین ہو گیا تھا۔ جیسے ہی علی عامر اپنے بستر پر پہنچا، دونوں محافظ بھی اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔

آفریدی نے منتشر ذہن کے ساتھ کاہتا کے بارے میں سوچا اور پھر اس کی دھندلی آنکھیں شکستہ

رباب کو دیکھنے لگیں جس کے سینے سے کچھ دیر پہلے ایک المناک نغمہ پھوٹ رہا تھا۔ اور اب اس کے تار طرح بکھر گئے تھے کہ انہیں دوبارہ جوڑنا ناممکن نہیں رہا تھا۔ کانتا کی زندگی بھی ایک رباب تھی جس کا انجام معلوم نہیں تھا مگر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہو رہی ہوگی یا پھر کسی ششیر کا تار کے گلے سے لٹکی کا سلسلہ منقطع کر دیا ہوگا۔

آفریدی بہت دیر تک خیالات میں گم رہا۔ کانتا کے گائے ہوئے گیت نے ریاست چوٹ کی تہذیب پر بڑے ایک ایک نقاب کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی اس سنگناخ زمین پر ہی اگ تھی۔ لوگوں کے بدن بھی جل رہے تھے اور ذہن بھی۔ دور دور تک انصاف و کرم کے کوئی چشمہ یا آبشار نہیں تھا جس سے یہاں بسنے والے نچلے طبقے کے اقتدار گزیدہ لوگ اپنی روجوں کی بجھا سکتے۔ خدا جانے کانتا پیاس کی کس منزل پر پہنچ گئی تھی کہ اس نے ایک قطرہ آب کو ترسے ہوئے پتھر کے اس پیالے پر رکھ دیئے جس میں قافل زہر بھرا ہوا تھا۔ کانتا کو یاد کر کے آفریدی کی آنکھوں میں بڑی عجیب لڑی تھی کہ دوسروں کی نفسی کا احساس دلانے کے لئے خود فنا کے شعلہ زار!

اہل قفس نے جشن بہاراں کے نام پر وہ داستان سنائی کہ دامن بھگو دیئے

کانتا کا فسادہ غم سن کر پہلے آفریدی کے رخسار تر ہوئے پھر یہ فی دامن دل تک پہنچ گئی۔ اہم بت پرست عورت کے لئے علی عامر کی یہ اشک ریزی جاری تھی کہ دھوئیں کی ایک تیز لہر آئی اور پورا کمر کی خوشبو سے بھر گیا۔ آفریدی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خوشبو کی اور آدمی رات کے وقت محل کے لوگوں کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ ابھی وہ خوشبو کے بار سوچ ہی رہا تھا کہ ناگماں ایک انسانی آواز گونجنے لگی۔ آواز اتنے قریب سے سنائی دی تھی کہ جیسے کوئی آفریدی سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا ہو کر چنچا ہو۔ آفریدی یکبارگی اچھل سا گیا۔ ملک کافور کی ساز حملہ آوروں کے تشدد، کانتا کی نغمہ سرائی اور لوبان کی خوشبو نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اتفاقاً ایک خاص تسلسل تھا۔ اس لئے آفریدی کو ہر بات پر حیرت ہونے لگی تھی اور ہر گزرنے والا لمحہ ایک نئی کر آ رہا تھا۔ اب یہ کرمیہہ سی آواز اس کے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ آواز میں اس قدر تھی کہ آفریدی کو ناگواری کا احساس ہونے لگا۔ کوئی ناویدہ شخص ایسی زبان میں کچھ مخصوص کلمات کر رہا تھا جو آفریدی کیلئے قطعاً جہنی تھی۔ نامانوس الفاظ کی گردان کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا آواز لفظ بہ لفظ ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی لوبان کا دھواں بھی کمرے میں بھرتا جا رہا تھا۔ آفریدی اس حقیقت سمجھ گیا تھا کہ لوبان کی خوشبو ہندوؤں کی پتہ پتہ خوشبو ہے مگر اس کے کمرے میں خوشبو کا گزر کوئی رکھتا تھا۔ اگر اس حرکت کا کوئی مفہوم تھا بھی تو وہ آفریدی کی عقل سے بالاتر تھا۔

جب علی عامر کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی تو اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ کو پکارا۔ آفریدی کی آواز سننے ہی ایک مسلح سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور شاہی سفیر کے سامنے پہنچ کر میں پوچھنے لگا ”کیا بات ہے؟“

آفریدی نے محافظ کے لمبے کی تلخی کو فوراً محسوس کر لیا مگر وہ اس کی ناشائستگی پر کوئی احتجاج نہ کر سکا دھواں ہے جو میرے کمرے میں بھرتا ہی چلا جا رہا ہے؟“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہئے کہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے اور اس کی

ہے؟“ سپاہی کا لہجہ بدستور ناخوشگوار تھا اور اس کے چہرے پر آفریدی کیلئے ناپسندیدگی کے آثار صاف نظر رہے تھے۔

”میں اس دھوئیں کی حقیقت نہیں پوچھ رہا ہوں۔“ آفریدی نے ایک بار پھر راجپوت محافظ کی تلخ کلامی نظر انداز کر دیا تھا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ دھواں بند ہو جائے اور مجھے آج کی رات سکون کے نیند محبت میرا آسے۔ اگر دھواں اسی رفتار سے میرے کمرے میں داخل ہوتا رہا تو کچھ دیر بعد میری سانس بند جائے گی اور پھر شاید میں ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو جاؤں گا۔“ اب آفریدی کے لمبے سے تلخی جھلکنے لگی تھی ”مہاشی کو میرے آرام کا بہت خیال ہے۔ شاید وہ اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ یہاں کسی قسم کی کیف کا احساس تک نہیں ہوگا۔ اب مجھے وکرم سنگھ کی اعلیٰ مہمان نوازی کا اعتبار آ گیا۔“ یہ کہہ کر ن عامر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور راجپوت سپاہی کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ بیزار کی عالم میں اہی سفیر کے ردور کھڑا تھا۔ یہ جبر کی ایک کیفیت تھی۔ اگر مہاشی کی حکم نہ ہوتا تو وہ آفریدی کو اسی زخمی حالت میں چھوڑ کر بھی کا جا چکا ہوتا۔

”میں مہاشی سے صبح خود بات کر لوں گا اور ان کی اس بہترین تواضع کا شکریہ بھی ادا کر دوں گا مگر تم اہل حال اس دھوئیں کو بند کر دو جس کے اثر سے اب میری سانسیں متاثر ہو چکی ہیں اور اس آواز کو بھی روک دو جو مجھ سے میری نیند چھین لینا چاہتی ہے۔“ علی عامر نے راجپوت محافظ سے کہا اور اس کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔

محافظ سپاہی نے جواباً جو کچھ کہا تھا وہ حیرت انگیز بھی تھا اور ناقابل برداشت بھی۔ ”تمہاری سانسیں بند رہتی ہیں مگر یہ دھواں بند نہیں ہو سکتا۔“ راجپوت سپاہی کی تلخ گوئی اب بد کلامی کے دائرے میں داخل ہو گئی تھی۔

”کیا تمہاری ریاست میں مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے؟“ آفریدی ایک معمولی سپاہی سے غٹا نہیں چاہتا مگر اس کی پر اسرار باتوں نے علی عامر کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ یہاں کے حالات جاننے کے لئے اس قسم کا رویہ اختیار کرے۔

”ہم اپنے مہمانوں کے لئے جان بھی دے سکتے ہیں مگر اس دھوئیں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سن لیتے۔“ راجپوت محافظ کے لمبے میں وہی ناگواری تھی اور چہرے پر وہی ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ ”اس دھوئیں کو تو راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی بھی نہیں روک سکتے۔“

راج محل کی پر اسراریت نے نیارنگ اختیار کر لیا تھا۔ آفریدی، راجپوت محافظ کی زبانی چوٹ کے مزید آلات جاننا چاہتا تھا اس لئے وہ گفتگو کا زاویہ بدل کر بولا۔

”راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی اس دھوئیں کو برداشت کر سکتے ہیں، یہ ان کا ذاتی فعل ہے مگر اب شاہی سفیر کو اس طرح پریشان نہیں کیا جاتا کہ وہ رات کی نیند سے بھی محروم ہو جائے۔“ اب علی عامر کے الفاظ میں بھی غیر سفرانی رنگ شامل ہو گیا تھا۔

”وہ باہر سے آنے والا کوئی مہمان ہو یا راجپوتانے کا کوئی باشندہ، ہر شخص اس دھوئیں کو برداشت کرنے کے لئے مجبور ہے۔“ اب محافظ سپاہی پوری طرح جذباتی ہو گیا تھا یہ مقدس دھواں صدیوں سے ہے اور مہمانوں تک نسل در نسل جاری رہے گا۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ”یہ کہتے کہتے راجپوت سپاہی کی نگاہوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی تھی اور آواز سے نہ ہی جوش نمایاں ہونے لگا تھا۔

”مقدس دھواں؟“ علی عامر آفریدی کو شدید حیرت ہو رہی تھی۔

”ہاں! مقدس دھواں۔“ راجپوت سپاہی نے جب پوچش ہوتا جا رہا تھا۔ ”میں وہ دھواں ہے چوڑی فضاؤں پر ٹیکڑوں سال سے سایہ فگن ہے۔ اس دھواں نے راجپوتوں کو عظیم بنایا ہے اور ان دھرتی کو دشمنوں کی تخریب کاری سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ دھواں اپنے پرستاروں کو نئی زندگی بخشتا ہے انکار کرنے والوں کو بلاکت میں ڈال دیتا ہے۔“

محافظ راجپوت کی باتیں سن کر آفریدی سمجھ چکا تھا کہ یہ دھواں چوڑی میں کسی مخصوص مذہبی رسم کی جڑ رکھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ سنبھل گیا اور پھر بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس راجپوت سپاہی سے پوچھنے لگا۔ ”م کل رات بھی اسی کمرے میں موجود تھا مگر دھواں کے کوئی آثار نہیں تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں ہے؟ کیا مہمانتری نہیں چاہتے کہ میں چین سے سو سکوں؟“ آفریدی نے نہایت محتاط انداز میں سپاہی کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی تھی۔

راجپوت محافظ، علی عامر آفریدی کے اس انداز گفتگو پر بڑ گیا۔ ”کل رات تم بے ہوش تھے اس لیے خبر ہے۔ دھواں کی خوشبو سونگے بغیر اہل چوڑی کوئی رات نہیں گزرتی۔ اگر کسی ایک رات بھی اٹ روشن نہ ہو اور مقدس دھواں راج محل کے دروہاں پر نہ پھیلے تو اہل چوڑی نامعلوم مصائب کا شکار ہو جائیگا ان کے لئے آسمان سے نئی نئی بلاؤں کی بارش ہونے لگے۔“

آفریدی چوڑی کے باشندوں کی توہم پرستی کا راز جان چکا تھا، اس لئے اب وہ ناقابل برداشت دھواں چھپا چھڑانا چاہتا تھا۔ ”تم اس مقدس دھواں کی خوشبو سے نئی زندگی حاصل کرتے رہو مگر میں اس سے نجات چاہتا ہوں۔ میرے کمرے کا دروازہ بند کر دو اور اس شخص کو بھی خاموش کر دو جو لوگوں کی نیند میں خلل ڈالنے کیلئے نصف شب کے سناٹے میں بیچ رہا ہے۔“

آفریدی کی بات سن کر راجپوت محافظ غصے سے بے قابو ہو گیا۔ ”تم کس شخص کو خاموش کرنے کہہ رہے ہو؟“

”کیا تمہیں یہ آواز سنائی نہیں دے رہی ہے؟“ آفریدی نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک نیا سوال کر دیا تھا۔

”یہ آواز مہاراج رام دیو کی ہے۔“ راجپوت محافظ غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا ”تم اس مہاراج بے ادبی سے لے رہے ہو جو پورے راجپوتانے کا پالنہا ہے، چوڑی کا رکشک ہے، ہندو دھرم کا سے بڑا سیوک ہے اور دیوتاؤں کی آنکھ کا دیک ہے۔ اگر مہاراج رام دیو راتوں کو جاگ کر یہ کھنکھ نہ کریں تو ہمارے شہر چوڑی دھرتی کورن بھوی (میدان جنگ) بنا ڈالیں اور ہم سب کا یہ کھنکھ ناش کی آگنی میں جل کر بھسم ہو جائے۔“ یہ کہتے کہتے راجپوت محافظ کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ اور اس کے منہ سے کف اڑنے لگا تھا۔

آفریدی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نادانستگی میں ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جس نے راجپوت محافظ کے مذہبی جذبات مجروح کر دیئے تھے۔ ”میں تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے مہاراج رام دیو کی ہے۔“ آفریدی ندامت آمیز لہجے میں اپنی معذرت پیش کر رہا تھا۔

”اگر تم غیر ملکی سفیر نہ ہوتے تو آج تمہارے یہ چوڑے کاندھے سر کے بوجھ سے ہلکے ہو جاتے راجپوت محافظ نے اضطرابی حالت کے زیر اثر اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ سبھی بغیر ہمارے دیوتاؤں کی شان میں کوئی بات نہ کہنا۔ یہ پہلی اور آخری تنبیہ ہے۔ ہم لوگ دوسری معاف کرنے کے عادی نہیں ہیں۔“ محافظ سپاہی کو آفریدی کی پشیمانی کا کوئی احساس نہیں تھا وہ اپنی طاقت

مظاہرہ کرتا ہوا چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ کواڑوں کو پوری طاقت کے ساتھ کھینچا گیا تھا جس سے محافظ کے غصے اور مشتعل جذبات کی بھرپور نمائش ہوتی تھی۔

علی عامر آفریدی واقعتاً اپنی غلطی پر شرمسار تھا۔ اس نے انجانے میں مہاراج رام دیو کو ایک عام انسان سمجھ لیا تھا وہ نہ حقیقت تو یہ تھی کہ بے خبری کے باوجود اس کی زبان سے راجپوتوں کے مذہبی پیشوا کیلئے کوئی ناشائستہ لفظ ادا نہیں ہوا تھا پھر بھی محافظ سپاہی نے اس کی بڑی دل آزاری کی تھی۔ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا جس سے آفریدی کو بڑے صبر و ضبط کے ساتھ گزرنا پڑا۔

دروازہ بند ہو جانے سے دھواں کا مسلسل داخلہ ختم ہو گیا تھا مگر ابھی تک کمرے میں لوبان کی خوشبو کے اثرات موجود تھے۔ پھر بھی کچھ دیر بعد جب یہ کھنکھ ختم ہو گئی تو علی عامر آفریدی نے مہاراج رام دیو کے بارے میں سوچا۔

”کیا یہ راجپوت محض ایک رام دیو اور اس کے پھیلائے ہوئے مقدس دھواں کی طاقت پر زندہ ہیں؟“ آفریدی چوڑی کی سیاسی حالت پر غور کر رہا تھا۔ راجپوت معاشرے میں اونچ نیچ، رقص، شراب، عیش پرستی عام ہو چکی ہے۔ مقامی آبادی اپنی طاقت پر اعتبار کرنے کے بجائے توہمات میں ابھی ہوئی ہے۔ یہاں صرف ایک شخص رام دیو جاگ رہا ہے اور باقی لوگ لوبان کے دھواں کے اثرات میں بدست پڑے ہیں۔ ایسی بے خبر قوم کو نہایت آسانی سے غلام بنایا جاسکتا ہے۔ آفریدی کی سوچ وسیع ہوتی جا رہی تھی اور وہ خود کلامی کے انداز میں زیر لب بول رہا تھا۔

”مجھے سلطان کے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آ رہی ہے۔ بے جان دیوتاؤں کی محبت کی افیم کھا کر یہ قوم زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے سلطان کے ہاتھوں اپنی آزادی فروخت کرنا ہی ہوگی۔“

آفریدی زخمی ہونے کے باوجود بہت خوش تھا وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کو ایک نیک فال سمجھ رہا تھا۔ بڑے بڑے پراسرار چرے کھل کر سامنے آ رہے تھے اور حالات کے رخ پر پڑے ہوئے پردے عجیب انداز میں خود بخود ہٹتے جا رہے تھے۔ یہ فحشی علامت تھی مگر جب آفریدی کو کائنات کی یاد آئی تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کہیں نہ کہیں شکست کھا گیا ہے اور اس کے سینے میں کوئی نہ کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ آفریدی رات بھر جاگتا رہا۔ جسم کے زخموں نے اور دل کی جراحتوں نے اسے ایک لمحے کیلئے بھی چین سے سونے نہیں دیا۔



صبح ہوتے ہی حسب معمول مہمانتری و کرم سنگھ، آفریدی کی خبر گیری کے لئے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ آفریدی نے آداب حکمرانی کے زیر اثر اپنے بستر اٹھنے کی کوشش کی مگر وکرم سنگھ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت زیادہ زخمی ہو چکے ہو اور ایک زخمی شخص اپنی ناتوانی کے باعث بعض رکیم ادا کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ آرام سے لیٹے رہو۔“ وکرم سنگھ کا عجیب بظاہر نرم محسوس ہو رہا تھا مگر مرکز شدہ دنوں کی طرح اس کے انداز گفتگو میں ٹھنکسی نہیں تھی۔ ایک قسم کی بیگانگی اور بے تعلقی تھی جسے آفریدی نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔

”آپ کے راج دید میرے زخموں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟“ آفریدی نے وکرم سنگھ کی بدلی ہوئی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے خیال میں مجھے کب تک اس معذوری سے نجات مل جائے گی۔“

وکرم سنگھ نے آفریدی کے سوال کا فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحوں کے لئے سوچتا ہوا اور پھر بڑی

بے دلی کے ساتھ کہنے لگا ”راج وید تمہاری صحت کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ جلد از جلد صحت یاب ہونا چاہتے ہو یا.....“ ”وکر م سنگھ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میں مہمانتری کی باکمل گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ ”آفریدی“ وکر م سنگھ کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر وہ مہمانتری کی طرح خود بھی مصلحت سے کام لے رہا تھا۔

”ایک سفیر کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہئے۔“ مہمانتری وکر م سنگھ نے یکسر بدلے ہوئے لہجے میں کہا ”بے شک! یہ میزان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مہمان کی خاطر داری کا لحاظ رکھے مگر مہمان بھی کچھ اخلاقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے اگر یہ پابندی مجروح ہونے لگے تو مہمان اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ پھر وہ مہمان نہیں رہتا۔ ایک بار گرا ہوا بن جاتا ہے۔“ ”وکر م سنگھ آہستہ آہستہ ٹھل رہا تھا۔

”کیا مہمانتری پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنی سفارتی ذمے داریوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔“ ”آفریدی سمجھ چکا تھا کہ وکر م سنگھ درپردہ کیا کہنا چاہتا ہے، اس لئے وہ بھی مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے حقیقت کی طرف پلٹ آیا تھا۔

”ہاں! تم اپنا سفارتی منصب بھلا چکے ہو۔“ اب کی بار وکر م سنگھ کی آواز قدرے تیز تھی۔ ”تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم راجپوتوں کے دیوتاؤں کی پرائیگی اٹھاؤ یا ان کی شان میں کوئی حقیر لفظ استعمال کرو۔“ صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ رام دیو کے بارے میں محافظ سپاہیوں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے وکر م سنگھ کو درغلانی کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں مہمانتری کاروبار بدل گیا تھا۔

”آپ کو غلط اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔“ ”آفریدی نے انتہائی جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”اچانک کمرے میں دھواں بھر جانے سے مجھے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا، اس لئے میں نے محافظ سپاہیوں سے دروازہ بند کر کے کہنا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”تم نے مہاراج رام دیو کی توہین بھی کی تھی۔“ ”وکر م سنگھ کے لہجے میں بدستور ناگواری کی آمیزش تھی۔

”جس شخص کو میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا اور جس سے میرا کوئی تعارف نہیں، میں اس کی تحقیر کر طرح کر سکتا ہوں؟“ ”آفریدی نے اپنی صفائی کیلئے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی۔“ ”میں نے صرف اتنا کہ تھا کہ اس آواز کو بھی خاموش کرادو کہ اس سے لوگوں کی نیندوں میں خلل پڑتا ہے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ وہ آواز مہاراج رام دیو کی ہے جسے کسی صورت بھی بند نہیں کرایا جاسکتا تو میں نے محافظ سپاہی سے یہ کہہ کر معذرت طلب کر لی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا نادانستگی میں ہوا میری اس سچائی کو جھوٹ کا لباس پہنا کر جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ مناسب نہیں۔ میرے نزدیک یہ انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے کہ کسی شخص کی آواز دن بھر کے تھکے ماندے لوگوں سے ان کے خواب چھین لے مگر جب مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اس آواز کا گو گتے بہ اہل چوڑے کے لئے مذہبی رسم کی حیثیت رکھتا ہے تو میں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے اس آواز سے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اب ذکر چھڑی گیا ہے تو براہ کرم مجھے اس جگہ منتقل کر دیجئے جہاں وہ آواز میری سماعت کا تعاقب نہ کرے۔ میزان کو اپنی رسمیں اپنی ذات تک محدود رکھنی چاہئیں ورنہ یہ میزان نہیں، دل آزاری ہے۔“ ”آفریدی نے بھی اپنے دل کی بات اس طرح کہہ ڈالی کہ مہمانتری وکر م سنگھ شاہی سفیر کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

کچھ دیر تک وکر م سنگھ سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر مختلف رنگ ڈوب ڈوب کر ابھر رہے

تھے۔ یہ رنگ توفرت کے رنگ تھے۔ آفریدی کا جواب سن کر وکر م سنگھ کا ذہن جل اٹھا تھا مگر وہ ایک باہوش سیاستدان تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پا یا اور بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ ”تمہارا ایک جرم یہ ہے کہ تم نے درباری رقاہے کا ناکہ اپنے دلکش چہرے اور منافقانہ باتوں سے یہاں تک اُکسا یا کہ اس نے چوڑے کئی راز فاش کر دیئے اور سلطان علاء الدین خلجی کو ریاست پر حملے کی دعوت دیدی۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے آفریدی! اسے نہ میں معاف کر سکتا ہوں، نہ راجہ رتن سنگھ اور نہ مہارانی پدمی۔“ ضبط احتیاط کے باوجود وکر م سنگھ کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔

ایک اور جھوٹ بڑی شدت کے ساتھ بولا گیا تھا۔ آفریدی اس صمت کو برداشت نہ کر سکا۔ ”مہمانتری! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ راجپوت اپنے معیار حیات پر قائم نہیں رہے یا پھر ان کی شجاعت کے افسانے غلط مشہور ہو گئے ہیں۔ یہ کیسی مردانگی ہے کہ مسلسل میری ذات سے جھوٹ اور جلیبازی کو منسوب کیا جا رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان تمام باتوں سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ میں نے کب یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ آپ میرے لئے عورت و شراب کا اہتمام کریں۔ یہ میری توہین تھی مگر میں کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی دل آزاریوں کا ذکر کرتا، مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ میں نے راجپوتوں کے دیوتاؤں کی تذلیل کی ہے اور ایک درباری رقاہے کو فریب دے کر سلطان علاء الدین خلجی کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ میں ان محافظ سپاہیوں کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے آپ کو یہ من گھڑت کمائیاں بنا کر مجھے منصب سفارت سے گرانے کی ذلت آمیز کوشش کی ہے۔ اگر یہی نقب زنی اور عیاری چوڑی سیاست کا مشغلہ ہے تو مجھے اسی زخمی حالت میں رانی پدمی کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ اور اگر مہمانتری کو یہ بھی پسند نہیں تو مجھے میرے گھوڑے کی پشت پر ڈال کر رخصت کر دیا جائے۔ میں دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میرے کسی گوشہ تصور میں بھی نہیں تھا کہ شاہی سفیر کے ساتھ اس قدر بدسلوکی کی جائے گی۔ میں کچھ دیر پہلے تک آپ کی مہمان نوازی اور تواضع کا بہت قدر دان تھا مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں راجپوتوں کی کسی خراج گزار ریاست کا حقیر سا نمائندہ ہوں، سلطان علاء الدین خلجی کا باوقار سفیر نہیں۔“ علی عامر آفریدی جوش اضطراب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

مہمانتری ایک بار پھر حیرت و سکوت کا شکار ہو گیا۔ اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ موت کے زنجیر میں گھر جانے کے بعد بھی شاہی سفیر آبرو مندانہ زندگی کا ثبوت فراہم کرے گا۔ وکر م سنگھ کا خیال تھا کہ آفریدی اپنی کوتاہی کا احساس کر کے شرمندہ ہو جائے گا اور پھر جب اس کے جرائم کی بات کی جائے گی تو وہ اپنے دل پر راجپوتوں کی بہت محسوس کرے گا۔ مگر علی عامر کی جرأت گفتار نے مہمانتری کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا اور اب وکر م سنگھ اس زخمی نوجوان کی طرف پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا جس کے تیوروں میں بجلی سے زیادہ چمک اور تھوڑے سے زیادہ کاٹ تھی۔

”میں رقاہے کا ناکہ بھی آپ کے سامنے ملنا چاہتا ہوں تاکہ میرے کردار پر لگایا ہوا یہ داغ دھل سکے وہ خود اقرار کرے گی کہ جرم کس سے سرزد ہوا ہے اور گناہ گار کون ہے؟“ ”آفریدی نے وکر م سنگھ کو خاموش پا کر اپنے دل کا غبار کم کرنا چاہا۔

”اب اس کی گواہی کسی کے کام نہیں آئے گی۔“ ”وکر م سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”وہ تل کر دی گئی۔“

یہ لڑخیز انکشاف سن کر آفریدی سناٹے میں آگیا۔ اس رقاہے کے سزا یاب ہونے کا یقین تو اسی وقت

آگیا تھا جب راجہ رتن سنگھ کے جاسوس سپاہی کانٹا کو بے دردی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے مگر آفریدی کو اس سنگدلی کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ راقصہ کو قید میں ڈال دیا جائے گا پھر اس کے تاج سے جسم پر تشدد کے کچھ نشانات ابھر آئیں گے۔ لیکن وکرم سنگھ جو کچھ بتا رہا تھا وہ تو آفریدی کے قیاس و گمان کی حدود سے بھی باہر تھا۔ ایک اس کی آنکھوں کے سامنے رات کا وہ منظر ابھر آیا جب کانٹا پر سوز آواز میں رہی تھی۔

”ہمیں اس وقت ماؤں کی گود سے جدا کر دیا گیا جب ہمارے لوریاں سننے کے دن تھے۔“

پھر آفریدی کو کانٹا کے آخری الفاظ یاد آگئے جب وہ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”مہمان! تم دہلی واپس جاؤ میرا یہ گیت اپنے سلطان کو بھی سنا دینا۔“

اپنے تصورات کا عکس دیکھ کر آفریدی لرز اٹھا۔ ابھی اس نے سلطان کو ایک انہنی مطربہ کا گیت سنایا بھی نہیں تھا کہ موسیقی کا آبشار خشک ہو گیا اور وہ نغمہ گر قتل کر دی گئی۔

پھر آفریدی کے خیالات کی رو محرائے عرب کی طرف بھٹک گئی جہاں عہد جاہلیت میں معصوم لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں جو رستم کی اسی تاریخ نے پھر نئے انداز سے کروٹ لی تھی۔

آفریدی کے چہرے پر کرب و اذیت کا رنگ نمایاں دیکھ کر مہامنتزی مسکرائے گا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“ وکرم سنگھ کے لہجے میں گہرا طنز پوشیدہ تھا۔

آفریدی خیالات کے حصار سے نکل آیا اور مہامنتزی کی طرف کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ایسا لگتا ہے کہ تمہیں کانٹا کی موت سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔“ وکرم سنگھ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”ہاں! بہت زیادہ، آپ کے انداز سے بھی کہیں زیادہ۔“ آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”مہامنتزی نے ہنستے ہوئے آفریدی کے زخموں پر نشتر زنی کی۔“

”تمہیں کانٹا کی موت کا دکھ نہیں، اس بات کا غم ہے کہ وہ راقصہ موت کی نیند سلا دی گئی۔ اگر تمہارے کمرے میں اس کی کچھ اور راتیں جاگتے ہوئے گزر جائیں تو شاید چوڑ کے کچھ اور راز بے نقاب ہو جائے مگر موت نے کانٹا کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنے وطن کے بارے میں مزید معلومات تمہارے ہاتھ فروخت کر سکتی۔ تمہیں اسی رشتے کے اچانک ٹوٹ جانے کا افسوس ہے۔“

آفریدی نے فوری طور پر وکرم سنگھ کے الزامات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس نظروں سے مہامنتزی کو دیکھتا رہا پھر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”مہامنتزی! آپ نے مجھے اتنی دیر میں سیاسی شیب و فراز کی کئی داستانیں سنا ڈالیں مگر میں اپنی کتاب مقدس کی صرف ایک آیت سنانا چاہتا ہوں۔ میں کانٹا کی موت کے ساتھ خدا کے اس کلام پر بھی غور کر رہا تھا جب صحرائے عرب میں انسانی خون مسلسل جذب ہوتا جا رہا تھا، اس وقت میرے رسولؐ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

”وہ دن جب ان بے گناہ لڑکیوں سے پوچھا جائے گا کہ آخر تمہیں کس جرم میں زندہ دفن کیا گیا تھا۔“

”کانٹا کے قتل کی خبر سن کر مجھے یہ آیت یاد آگئی تھی اور میں راجہ پوتانے (راجستھان) کے ریگستان سے نکل کر کئی صدی پہلے کے صحرائے عرب میں چلا گیا تھا۔ اب دوبارہ چوڑ کی طرف لوٹا ہوں۔“

کانٹا کے قتل کی خبر سن کر مجھے یہ آیت یاد آگئی تھی اور میں راجہ پوتانے (راجستھان) کے ریگستان سے نکل کر کئی صدی پہلے کے صحرائے عرب میں چلا گیا تھا۔ اب دوبارہ چوڑ کی طرف لوٹا ہوں۔

کانٹا سوال کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ”آخر کس جرم میں قتل کیا گیا ہے؟ میں اسے کیا جواب دوں؟ وہ تو مجھ سے بہت دور چلی گئی اگر آپ کے جنگجو اور شجاع سپاہی کانٹا کو میرے سامنے قتل کرتے تو میں بے دریغ کہہ دیتا کہ تجھے جج بولنے کے گناہ پر ذبح کیا گیا۔“ آفریدی کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔

”وہ غدار وطن تھی، اس لئے قتل کر دی گئی۔“ وکرم سنگھ کے لہجے میں ایک بار پھر قہر و نفرت کا رنگ شامل ہو گیا تھا۔ ”اس نے اپنی مٹی سے بے وفائی کی تھی۔ وہ اپنی دھرتی کو ان مسلمانوں کے ہاتھ بیچنا چاہتی تھی جنہیں ہم غاصب اور گمراہ سمجھتے ہیں۔“

”میں مہامنتزی! وہ غدار نہیں تھی وہ ازل سے ترسی ہوئی ایک محکوم اور پسماندہ قوم کی لڑکی تھی جس کا آئینہ جسم ٹوٹ گیا تھا اور روح دریدہ ہو چکی تھی۔ وہ حسن سلوک کی بھوکی اور مساوات کی پیاسی تھی۔ میری نظر میں وہ راجپوت لڑکیوں سے بھی زیادہ بہادر تھی کہ اپنی ہم جنسوں کی آبرورق پرمان ہو گئی۔ مجھے حرف بہ حرف اس کا گیت یاد ہے۔ میں کانٹا کی آخری خواہش ضروری پوری کروں گا۔ سلطان معظم بھی یہ گیت سنیں گے۔ پھر انہیں اندازہ ہو گا کہ نفنگی کی قبائس کس طرح چاک کی گئی ہے۔“ آفریدی بہت دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ ”مہامنتزی! مجھے آپ کی تمذیب نے بہت باؤس کیا ہے۔“

آفریدی کی بات سن کر وکرم سنگھ پھر بھڑک اٹھا۔ ”میں شاہی سفیر کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔“ مہامنتزی کا لہجہ برہم تھا اور اس کی آنکھوں میں آفریدی کیلئے نفرت کا ایک طوفان موجزن تھا۔

”مداخلت خود بخود نہیں ہوتی۔ صدیوں تک زمین کی تہ پر انسانی خون جمتا رہا ہے، جوانیاں پیر، بہن کو ترسے لگتی ہیں، خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتیں چند ہاتھوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور یہی چند آدمیوں کا گروہ خدائی کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ پھر انسان کی یہی محرومیاں غیروں کو مداخلت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس دعوت پر سلطان نہیں آئے گا کوئی دوسری طاقت آئے گی تاکہ زمین کی ناہمواریاں دور ہو جائیں۔“ آفریدی کے الفاظ کیا تھے، آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا تھا۔

مہامنتزی کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ شدید عالم طیش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے واپس جانے کے لئے تیزی سے قدم بڑھائے مگر اچانک پلٹ آیا۔ ”سفارت کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ تم نے ہمارے مذہب، ہماری سیاست اور ہمارے معاشرے کی اس طرح توہین کی ہے کہ ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ اب ہم تمہارے جرائم کے ثبوت پیش کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ خود تمہاری زبان ہی کھلی ہوئی مجرم ہے اور یہی زبان ایک دن رنگ لا کر رہے گی۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ آفریدی کے کمرے سے نکلا اور اس خلوت خاص میں چلا گیا جہاں راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی راجہ رتن سنگھ بول اٹھا۔ ”اب سلطان کے سفیر کا کیا حال ہے؟“

”حالت پہلے سے بہتر ہوئی جا رہی تھی مگر کل رات اس نے راقصہ کو بچانے کے لئے دوبارہ اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔“ وکرم سنگھ سر جھکائے وضاحت کر رہا تھا۔

”کیا تم نے اسے کانٹا کے قتل کی خبر سنا دی؟“ راجہ رتن سنگھ نے دریافت کیا۔

”میں نے بہت لڑنے خیر انداز میں اسے اطلاع بہم پہنچائی تھی مگر وہ اس خوں خیز کھیل سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ کہہ رہا تھا کہ یہی ظلم بڑی طاقتوں کو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی دعوت دیتا ہے۔“

وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی راجہ رتن سنگھ بول اٹھا۔ ”اب سلطان کے سفیر کا کیا حال ہے؟“

”حالت پہلے سے بہتر ہوئی جا رہی تھی مگر کل رات اس نے راقصہ کو بچانے کے لئے دوبارہ اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔“ وکرم سنگھ سر جھکائے وضاحت کر رہا تھا۔

”کیا تم نے اسے کانٹا کے قتل کی خبر سنا دی؟“ راجہ رتن سنگھ نے دریافت کیا۔

”میں نے بہت لڑنے خیر انداز میں اسے اطلاع بہم پہنچائی تھی مگر وہ اس خوں خیز کھیل سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ کہہ رہا تھا کہ یہی ظلم بڑی طاقتوں کو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی دعوت دیتا ہے۔“

وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی راجہ رتن سنگھ بول اٹھا۔ ”اب سلطان کے سفیر کا کیا حال ہے؟“

”حالت پہلے سے بہتر ہوئی جا رہی تھی مگر کل رات اس نے راقصہ کو بچانے کے لئے دوبارہ اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔“ وکرم سنگھ سر جھکائے وضاحت کر رہا تھا۔

”اسے یہ جرات کیونکر ہوئی۔“ اب کی بار رانی پدمنی وکرم سنگھ سے مخاطب ہوئی تھی اور اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

”وہ ایک ذہین، تعلیم یافتہ اور بے باک سفیر ہے۔ حالات کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ کانٹکی زبان کی ایک لغزش نے اس پر یہ راز فاش کر دیا ہے کہ ریاست نا انصافیوں کی آگ میں جل رہی ہے اور سلطان علاء الدین خلجی اسی آگ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔“

”پھر اسے خاموشی کے ساتھ قتل کر دو۔“ رانی پدمنی کی غور و ناز میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”اس واقعے کے بعد آفریدی کا دہلی واپس جانا یا وہ خطرناک ہو گا۔“ رانی پدمنی بزم خود سیاست کے ایک مسئلے کو سلجھا رہی تھی مگر اس کی رائے سراسر احمقانہ تھی۔

”مہارانی! کسی بڑی طاقت کے سفیر کا قتل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اگر ہم شدت جذبات میں ایسا کر بیٹھیں تو سلطان کا غصہ وحشت و درندگی کا رنگ اختیار کر لے گا۔ اگر کسی بستی میں ایک تنکا بھی اس کے خلاف سرکشی اختیار کرے تو وہ پوری بستی کو ڈوبنے کے لئے ہلاکت و بربادی کا سیلاب لے آتا ہے۔“

”کیا راجپوت سورا کوئی لغز تریں کہ سلطان کی خوراک بن جائیں۔“ رانی پدمنی اپنے حسن کے نئے میں وہی طفلانہ باتیں کر رہی تھی۔

وکرم سنگھ کچھ دیر کیلئے گہری سوچ میں غرق ہو گیا پھر اس نے سر اٹھایا اور مؤدب لہجے میں رانی پدمنی سے کہنے لگا۔

”اب تک شاہی سفیر کی ایک ہی کمزوری میرے ہاتھ آسکی ہے۔“

”وہ کیا؟“ رانی پدمنی نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

”وہ مہاراج رام دیو کی سلگانی ہوئی خوشبو کے دھوئیں اور ہیبت ناک آواز میں پڑھے جانے والے منترؤں سے سخت بیزار ہے۔ کل رات وہ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سو سکا۔ اگر مہاراج رام دیو اپنے سارے ظلمات آفریدی کے سامنے ظاہر کر دیں اور اپنی تمام ساحرانہ قوتوں کو استعمال میں لے آئیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ دہشت زدہ ہو جائے گا۔ اور پھر خوف کی یہ کیفیت جب اس کے اعصاب پر مسلط ہو جائے گی تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ دہلی جا کر سلطان کے سامنے سارے حالات بیان کرے گا اور اس طرح تسلیم کر لیا جائے گا کہ چوڑ صدیوں کی طرح آج بھی ناقابل تسخیر ہے۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ ہم علاء الدین خلجی کے قہر و غضب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔“

☆ ☆ ☆

ماضی کے پس منظر میں مہمانتری وکرم سنگھ کا مشورہ معقول تھا۔ مہاراج رام دیو نے اپنی ساحرانہ قوتوں کے ذریعے کئی دشمن ریاستوں پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ دشمن سپاہیوں پر کبھی آگ برسی تھی اور کبھی ژالہ باری ہوئی تھی۔ کبھی آندھی کا ایسا گرد و غبار اٹھا تھا کہ حریفوں کے خیمے تک اکھڑ گئے تھے۔ ان مسلسل واقعات کے بعد پھر کسی ہندو ریاست کے حکمران نے چوڑ کارخ نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مہاراج رام دیو راجپوتانے (راجستھان) کا ”ساحرا عظم“ مان لیا گیا تھا۔

مہاراج رام دیو شادی دیو کے بھائی کی نسل میں سب سے بڑا جادوگر تھا۔ شادی دیو وہ ساحر تھا جس سے سارے ہند کے بت پرست ناز کرتے تھے۔ شادی دیو نے اس ہلاکت خیز علم کو اس قدر عروج پر پہنچایا تھا کہ طویل و عریض ہندوستان میں اس کی مہارت فن کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی تھی۔ ہندوؤں کی بعض کتابوں میں بڑے فخر سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ حضرت موٹی کے دور میں جو حیثیت سامری کی تھی، پرتھوی راج چوہان کے عہد حکومت میں وہی درجہ شادی دیو کا تھا۔ پھر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجیہ

تشریف لائے تو پرتھوی راج نے آپ کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کیلئے شادی دیو کی شعیبہ بازوں کا سہارا لیا۔ ہندوستان کا وہ پورا دور ظلمات اور جادو کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ شادی دیو نے اس مرد مسلمان کے سامنے اپنے آبائی ہنر کے کئی بھر پور مظاہرے کئے مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ پر شادی دیو کے سحر کا ذرہ برابر اثر بھی نہیں ہوا پھر جب شادی دیو آخری معرکے کے لئے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مقابل آیا تو اپنے بزرگوں کا کھایا ہوا سارا جادو بھول گیا اور پھر اس نے عاجز آکر سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پائے اقدس پر اپنا سر رکھ دیا اور ایک نگاہ کرم کی بھیک مانگنے لگا۔ حضرت خواجہؒ نے شادی دیو کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ایمان کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد شادی دیو نے اپنے چھوٹے بھائی کام دیو کو بھی اسلام کی دعوت دی مگر اس کا قلب مکمل طور پر سیاہ ہو چکا تھا۔ شاہاب الدین غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد کام دیو اجیر سے فرار ہو کر چوڑ میں مقیم ہو گیا یا اس نے اس سے بے پناہ ترقی کی اور شادی دیو کی جگہ ”ساحرا عظم“ کا خطاب پایا۔ پھر کام دیو دنیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے سارا سیاہ علم اپنے بیٹے رام دیو کو منتقل کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی کچھ اور تھی۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق دیگر علاقوں پر لشکر کشی کر رہے تھے۔

چوڑ اور راجپوتوں کے دیگر علاقوں سے یہ بے تعلقی دیکھ کر رام دیو نے مشہور کر دیا کہ اب مسلمان کبھی ادھر کارخ نہیں کریں گے اور یہ جو کچھ ہو گا اس کے جادو کے زیر اثر ہو گا۔ مگر جب سلطان علاء الدین خلجی نے چوڑ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا اور ابتدائی مرحلے میں اپنے سفیر علی عامر آفریدی کو بھیجا تو یساں کے حکمرانوں کی رائیں بے خواب ہو گئیں۔

علی عامر کی شجاعت و بہادری نے راجپوتوں کے حکمران طبقے پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اب کی بار سرزمین چوڑ بھی سلطان کے قدموں کو بوسہ دینے بغیر محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ رتن سنگھ اور مہارانی پدمنی علی عامر آفریدی کو رام دیو کی ساحرانہ قوتوں سے دہشت زدہ کرنا چاہتے تھے۔

پھر طویل غور و فکر کے بعد یہ طے پا گیا کہ جب تک علی عامر آفریدی کے زخم اچھے نہیں ہو جاتے، اس وقت تک روزانہ اس کے کمرے میں ایک خوبصورت جام بکف عورت بھیجی جائے اور مہاراج رام دیو اپنا خوفناک جادوئی عمل جاری رکھیں تاکہ دیوتاؤں کی قوت کے مظاہرے دیکھ کر آفریدی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

پھر جب نغماؤں کے دوش پر رات کی زلفیں کھڑ گئیں تو علی عامر آفریدی کے خیالات سیلاب کے سرکش پانی کی طرح بننے لگے۔ پھر ایسا تک کسی نے تصورات کی موجوں کے سامنے کوئی دیواری کھڑی کر دی۔ آفریدی کی سوچ کا ظلم ٹوٹ گیا اور اس ظلم کو توڑنے والی وہ لڑکی تھی جو سونے کے طشت میں سامانِ کیند و نشاط لئے علی عامر کے سامنے کھڑی تھی۔

”ایک اور کاتنا؟“ آفریدی لرز سا گیا۔ پھر آفریدی نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ ”نہیں یہ کاتنا نہیں ہے۔“ سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کے چہرہ پر نہ وہ معصومیت تھی، نہ وہ زخم خوردہ مسکراہٹ اور نہ روشن آنکھوں کے گوشوں سے ابھرتا ہوا وہ غم آلود دھواں۔ پھر یہ کون تھی؟ یقیناً مہمانتری کی آلہ کار ہوگی۔ پھر وہی بومامہمانتری نے ریاست کی خوبصورت ترین لڑکی کو اس لئے بھیجا تھا کہ علی عامر آفریدی اپنی توبہ توڑ دے اور وہ بھی دوسرے شاہی سفیروں کی طرح بن جائے کہ..... ریاست کی حدود میں داخل ہوئے، حکمران طبقے کو غلامانہ سلام پیش کیا، چند روز کیلئے خوبصورت لڑکیوں کو اپنا ہم سفر بنایا، شرابیں پیں، حلال و حرام کھائے، کھائے اور حوالی بیغام لے کر رخصت ہو گئے۔

علی عامر آفریدی اب مکمل طور پر خیالات کے حصار سے نکل آیا تھا اور اس لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا جس کے مرمریں پیکر میں جہاں سوزی کے تمام رنگ شامل تھے اور خشم فشاں کی دھندلی سی بھی کوئی ادا موجود نہیں تھی۔

”لڑکی! تم کیوں آئی ہو؟“ بالآخر آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”مہمانتری و کرم سنگھ نے مجھے شاہی مہمان کو خوش کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔“ لڑکی نے بڑے شوخ لہجے میں کہا۔

”تمہارا نام۔“ آفریدی بے سبب اس سے گفتگو کر رہا تھا۔

”رجنی۔“ لڑکی نے کہا اور شام گل کی طرح لہرائی۔ اس کی ادا فروشی کا ایک ایک زاویہ یہ بتا رہا تھا کہ اس نے چوڑے حکمرانوں کی جنبش چشم پر قفس کرنے کے تمام آداب سیکھ لئے ہیں۔

”رجنی۔ کسے کہتے ہیں؟“ آفریدی نے دوسرا سوال کیا۔

”رجنی کا مطلب ہوتا ہے رات۔“ لڑکی آفریدی کی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے حسن کی سیاست کے ان حربوں کو بھی استعمال کر رہی تھی جن سے مسلح کر کے اسے آفریدی کے کمرے میں بھیجا گیا تھا۔

”بے شک! تم گہری سیاہ رات ہو۔ کسی نے تمہارے نام کا صحیح انتخاب کیا ہے۔“ آفریدی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

”میں کالی رات نہیں ہوں۔ میری روح کی گہرائیوں میں دیکھو، وہاں اجالا ہی اجالا ہے۔“ رجنی اچانک اداس ہو گئی تھی۔

”میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔“ آفریدی کی بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ ”یہ شیشے اور سونے کے برتن ہاں لے جا کر پھینک دو میں نے مہمانتری سے کہہ دیا تھا کہ یہ ساری چیزیں میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ رجنی کی وہ عارضی کیفیت ختم ہو چکی تھی اور اب اس کے چہرے پر شوخی و شرارت کی گہرا کن قدیمیں روشن تھیں۔ وہ رات کے تنگ اندھیروں کو دون کی تپتی ہوئی دھوپ میں بدلنا چاہتی تھی۔

”مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں شاہی سفیر کو کیف و طرب کے وہ رنگین لمحات فراہم کروں کہ انہیں آخری سانسوں تک راجپوتوں کی مہمان نوازی یاد رہے۔“ یہ کہہ کر رجنی نے وہ سونے کا طشت اور نقش شیشہ و صراحی ایک طرف رکھ دیئے۔

اس دوران آفریدی نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی دل آزاد کے لئے کیا جا رہا ہے۔ آفریدی چاہتا تو رجنی کے ساتھ بھی کتنا جیسا سلوک کر سکتا تھا مگر اس خیال نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھا کہ کہیں رجنی صبح بھی ہوتے ہوتے کانتا کی طرح قتل نہ کر دی جائے۔ اس لئے اس نے گروٹ بدل لی تھی۔

”اب میں کیا کروں؟“ رجنی نے شاہی سفیر کی اس حرکت کو بڑے تعجب سے دیکھا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھی تو پورا کمرہ باز یب کی جھنکار سے گونج اٹھا۔ ”آخر میرے لئے کیا حکم ہے؟“ رجنی آفریداً کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”اب میں کیا کروں؟“ رجنی نے شاہی سفیر کی اس حرکت کو بڑے تعجب سے دیکھا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھی تو پورا کمرہ باز یب کی جھنکار سے گونج اٹھا۔ ”آخر میرے لئے کیا حکم ہے؟“ رجنی آفریداً کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”صراچی میں جمع شدہ ایک ایک قطرہ اپنے حلق میں انڈیل لو پھر بد مست ہو کر باہر چلی جاؤ ایسی کمرے۔“ کسی گوشے میں چپ چاپ پڑی رہا اس طرح تم پر بھی نا فرمانی کا الزام نہیں آئے گا اور میری رات بھی سکوا سے گزر جائے گی۔“ آفریدی کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور وہ شدید ناگواری کے انداز میں بول رہا تھا۔

”میں تو شراب نہیں پیتی۔“ رجنی نے حیرت سے کہا۔

”تو پھر اپنے مہمانتری کو پلا دو وہی تمہیں اس کے ذائقے کی داد بھی دے سکے گا۔ ہم پانی پینے والے اپنی بساط سے زیادہ کی خواہش نہیں کرتے۔“ آفریدی نے اپنی گفتگو کو نیا رنگ دیدیا تھا۔ جس سے اسے رجنی حیرت میں ڈوب گئی تھی۔

اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی نوجوان کو اس قدر بے حسی کا شکار دیکھا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کسی مجتھے مانند کھڑی رہی پھر آفریدی کے پیروں کی جانب فرش پر بیٹھ کر رباب کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔

آفریدی کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ کل رات کانتا نے بھی اسی طرح رباب چھیڑا تھا اور پھر اس کے نٹوں سے جو نغمہ چھوٹا تھا اسی نغمے نے اس کی جان لے لی تھی۔ آفریدی نے چاہا کہ رجنی کو گیت گانے سے

ل دے اور اسے بتا دے کہ یہی گیت اس کی موت کا پیغام بھی بن سکتا ہے۔ مگر آفریدی چپ چاپ لیٹا رہا یہی ساعت کی تمام قوتیں رباب کی آواز پر مرکوز تھیں اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ رجنی کے ہونٹوں کو کس طرح

ش ہوئی ہے اور ہونٹوں سے ابھرنے والے بول دل کے کس زخم کا پتا دیتے ہیں؟

رجنی کے گیت سے بھی خون بہہ رہا تھا مگر یہ خون ایک عام سی لڑلے کے جذبوں کا خون تھا جسے اس کا رب و تاج چھو کر کسی دور و راز کی بستی میں جا بسا تھا اور اب وہی لڑکی رہا کی دہلی دہلی آگ میں کسی گیلی لکڑی کی

رجسنگ رہی تھی۔ رجنی کی آواز بھی دلکش تھی اور گانگی کا انداز بھی موسیقی کے اصولوں پر پرور اترتا تھا۔

ریدی انہماک سے اس کے گیت سنتا رہا۔ ہجر و فراق کی بات چلی تو علی عامر کو اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی ن عالیہ یاد آ گئیں۔ ناں اور بہن کا تصور ابھرتا ملک کانور کا غلیظ چہرہ بھی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ان

م یادوں میں اذیتوں کی مختلف چنگاریاں دہلی ہوئی تھیں۔ آفریدی کے دل و دماغ پر جلتا ہوا غبار اٹنے لگا۔

”کوئی خوشی کا رگ چھیڑو۔“ آفریدی نے کرناک یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ ”کوئی بھجن نہ تاکہ چوڑے دیوتا تم سے خوش رہیں، پتھروں کے گھر میں جواک بار پتھر گیسو پتھر گیا۔ جانے والوں کو نہ کرو کہ وہ موت بے رحم ہوتے ہیں۔“

رجنی کو آفریدی کی اس فرمائش پر بڑی حیرت ہوئی تھی وہ شاہی سفیر کے الفاظ میں چپے ہوئے طنز کو محسوس نہ کر سکتی تھی۔

”برج میں ہولی کھیلنا نندالال۔“

اس بھجن میں کرشن جی کو اس سر زمین پر گویوں کے ساتھ ہولی کھیلنے ہوئے دکھایا گیا تھا جہاں رنگ و نور بارش ہوئی تھی۔ اور قاصدہ رجنی اسی گیت کو راجپوتوں کی اس بستی میں گاری تھی جہاں یہ سرکش قوم رہنمائی کے ساتھ مل کر انسانی خون سے ہولی کھیتی تھی۔ کیسا بھجن تھا اور کیسے اس کے ماننے والے

نے؟ کیسے لپکتے، لہراتے، نرم الفاظ تھے اور کیسا زہریلا اور جان لیوا ان کا مغموم تھا۔ آفریدی خاموشی سے

نی کا گیت سن رہا تھا وہ دم سڑوں کے ساتھ من موہ لینے والے انداز میں گاری تھی۔ آفریدی کو اس کی

منگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف رجنی کو موت کے دروازہ تھوڑے سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ رجنی

نے ہجرت حاصل کرنے کے باوجود رجنی بھی اپنے دل کے درد کو پوشیدہ نہیں رکھ سکی تھی۔ غیر ارادی طور پر

نی بھی اپنی اس سبراہروی کے سبب فنا کے گھاٹ نہ اتار دی جائے اس لئے وہ رجنی سے فسانہ دل سننے کے

بجائے بچن سن رہا تھا۔ اور نادان لڑکی سمجھ رہی تھی کہ شاہی سفیر کو ہولی کے رنگوں میں نہائی ہوئی سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔

ابھی رجتی کا گیت جاری تھا کہ یکایک لوبان کی خوشبو کمرے میں بھری گئی اور چاروں طرف وہی پھیلنے لگا جسے چوڑے کاشتندے ”مقدس دھواں“ کہتے تھے۔ آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کے نزدیک بڑا چارخانہ عمل تھا۔

پھر کچھ دیر بعد وہی کمریہ آواز ابھری جس نے کل رات آفریدی کی سماعت کو مجروح کر دیا تھا سپاہیوں کے بقول وہ مہاراج رام دیو کی آواز تھی۔ آفریدی نے محسوس کیا جیسے وہ آواز بہت قریب رہی ہے۔ علی عامر نے اپنی ساری توجہ اس آواز کے سننے پر مرکوز کر دی۔ رام دیوان ہی کلمات کی کر رہا تھا جن کے مفہوم سے آفریدی قطعاً آشنا تھا۔

”تمہارے مہاراج رام دیو جو کچھ پڑھتے ہیں، تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟“ آفریدی نے ہو کر رجتی سے پوچھا۔

رقاصہ نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی آفریدی اپنی غلطی پر شرمسار نظر آنے لگا۔ وہ رجتی کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر خواہش ضرور تھی کہ وہ رام دیو کے اس عمل کی حقیقت کو جان لے جو روزانہ آدھی رات کے وقت جاتا تھا اور جس کی تاثیر اہل چوڑو کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھتی تھی۔

یکایک اسے دروازے کے قریب بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر محسوس ہوا جیسے کوئی دوا زمین پر گری ہو آفریدی سنبھل گیا۔ اب وہ کسی نئے حادثے کا منتظر تھا۔ اس کیفیت میں چند ما گزری تھیں کہ علی عامر کا یہ جتس بھی ختم ہو گیا۔ آنے والا کمرے میں داخل ہو چکا تھا وہ ایک دروازہ سیاہ فام، سرخ آنکھوں والا صحت مند شخص تھا جسے دیکھتے ہی رقصہ رجتی سجدے کی حالت میں چلی آفریدی نے آنے والے کو سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا۔ وہ انتہائی بد شکل انسان تھا۔ داڑھی اور حد سے بڑھی ہوئی مونچھوں نے اس کی صورت کو مکروہ بنانے میں نمایاں کردار ادا آفریدی کی نگاہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر ٹھہر گئی جہاں ایک مالا بھول رہی تھی اور جس میں بے جگہ گارہ تھے۔ آفریدی نے ایک نظر میں سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی سادھو یا جوگی نہیں ہو سکتا۔ دنیا کو ترک والے سادھو نیلم یا فیروزہ جیسے سرد مزاج پتھر پستے ہیں۔ انہیں خون کی حرارت بڑھانے والے ضرورت نہیں ہوتی۔ آفریدی کراہیت کے اس زندہ جتسے کے بارے میں ابھی رائے قائم کرنے نہ کہ وہ خود ہی بول اٹھا۔

”یہ اجڑی ہوئی گیاریاں، یہ ٹھکرانی ہوئی تاریاں تجھے کیا بتائیں گی کہ ہم کیا پڑھتے ہیں؟ والے نے انتہائی نخوت و غرور کے ساتھ اپنا تعارف کروا دیا تھا۔ وہ مہاراج رام دیو تھا جس کی میت چوڑو سے ہوئے رہتے تھے۔

”ستارے مجھے آسمانوں کی خبر دیتے ہیں اور میں زمین پر اپنا حکم نافذ کرتا ہوں۔ کسی صدی کے میرے علم کو نہیں پہنچتا۔ ان کی رو میں آج بھی میرے آگے جھکی رہتی ہیں اور اعتراف کرتی ہیں ان کے چھوڑے ہوئے علم کو آگے بڑھا دیا۔ وہ میرے پیشرو تھے۔ مگر گیان میں ان کا درجہ شاگرد سے زیادہ نہیں۔“ رام دیو غرور کی آخری منزل سے گزر چکا تھا اور فرضی کامیابیوں اپنے بزرگ ساحروں کی شخصیت کو بھی حقارت سے جھٹلا رہا تھا۔

”ستارے ہمیں آسمانوں کی کیا خبر دیں گے وہ تو خود افلاک کی وسعتوں میں حیران و پریشان پھر رہے۔ ان کی چالیں تو انہی جاپھیں۔ وہ کسی کے کیا کام آئیں گے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ جس جادو کی قوت پر تم میں ہو وہ تو صدیوں پہلے فنا ہو چکا ہے۔ حضرت موسیٰ کا عصا جگہ (اڑھا) بن کر بے شمار طلسمی ایں کو کھانچا اور تمہارے پیشوا سامری کی روح جنم کی آگ میں جل رہی ہے۔ میں اس وقت بھی سامری و ناک چھین سن رہا ہوں۔ کیا تمہیں اپنے گرد دیو کی وہ چھین سنائی نہیں دیتیں؟ کیسے بچا رہو کہ دیوتا حال زار کی خبر تک نہیں۔ ایک بار ماضی کے پردوں میں جھانک کر تو دیکھو کہ سامری پر کیا گزری ہے اور سزا کا لیم میں مبتلا ہے۔“ اتنا کہہ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور رام دیو کے چہرے کا لینے لگا۔ رام دیو کی جلتی ہوئی آنکھوں میں تو کوئی نرمی کی لہر پیدا نہیں ہوئی تھی مگر چہرے پر حیرت کا کلاکاسا بھی ابھر آ رہا تھا۔

علی عامر آفریدی نے رام دیو کے جادوئی بت پر ایک اور ضرب لگائی۔ ”مجھے تمہاری زبان سے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ جادو ابھی تک زندہ ہے حالانکہ یہ غارت گر علم اسی روز تباہ ہو چکا تھا جب یہودی لبید بن م کی لڑکیوں نے پیغمبر اسلام کے جسم اطہر پر اپنی سحرانہ قوتیں آزمائی تھیں اور وہ اپنی ان کوششوں میں طرح ناکام رہی تھیں۔ کیا تمہیں لبید بن اعصم کا حشر بھی یاد نہیں۔ مہاراج! دوزخ کے لامحدود کدے کی جانب ایک نظر تو دیکھو، وہ یہودی سحر اپنی مدد کیلئے کس کس کو پکار رہا ہے۔ کوئی اس کی پکار سنتا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ یہ کیسی سنگدل ہے اور کیسی بے حس ہے؟ تم تو سامری کے علم کے ہو۔ پھر کیوں اس کی مدد نہیں کرتے؟“ آفریدی نے ایک بار پھر سکوت اختیار کیا اور رام دیو کے کو غور سے دیکھنے لگا۔

ماہر اعظم کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور چہرے پر نمایاں ہونے والے حیر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں عجیب سی دھندلاہٹ جھلکنے لگی تھی۔

”تم کہتے ہو کہ جادو کی قوتیں لازوال ہیں۔“ آفریدی نے ایک نئے انداز سے رام دیو کو مخاطب کیا تھا۔ اس اپنے قبیلے کا وہ شخص یاد نہیں جسے شہاب سحر کہتے تھے اور جو قصبہ اجودھن (پاک پٹن) کا جادوگر تھا۔ تم نے اس کی قبر کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا کہ حشرات الارض نے اس کی ہڈیاں تک لی ہیں اور پوری ہڈیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہیں شہاب سحر کے بیٹے کا بھی حشر یاد نہیں کہ اس حضرت بابا فرید کے جسم مبارک پر اپنی جادوئی طاقتوں کو آزمانے کی کوشش کی تھی اس نے آٹے کا ایک پتھر اور اس میں سوئیاں چسوکے پتے کو اپنے باپ کی قبر کے سرہانے دفن کر دیا تھا پھر وہ مطمئن ہو گیا تھا معالیٰ سوئیاں حضرت بابا فرید کو بلا کر ڈالیں گی۔ تمہیں تو اپنے اس پیشوا کا انجام بھی یاد نہیں ہو گا دھن کے حاکم نے اسے گرفتار کر کے حضرت بابا فرید کے سامنے پیش کر دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ہمارے قتل کا حکم جاری فرمادیں۔ اگر تمہاری آنکھیں اتنی ہی روشن ہیں تو گزرے زمانے کی طرف ردیکھو۔ تمہیں شہاب سحر کا بیٹا ایک مرد مومن سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہوا نظر آجائے گا۔ اور نہایت ہی اتنی ہی طاقتور ہے تو تمہیں یہ منظر بھی دکھائی دے گا کہ حضرت بابا فرید نے اپنے بدترین وال کیوں ہوا؟ اس کا بیٹا ذلت و رسوائی کے غبار میں کماں گم ہو گیا؟ یہ کیسی جادوگری تھی جو اس وقت ان کے کام نہ آ سکی۔“ علی عامر آفریدی نے رام دیو کے سامنے کتاب زندگی کا ایک اور مٹ دیا تھا جس پر دنیا کے مشہور ساحروں کی شکست و نامرادی کی عبرتناک داستان تحریر کی گئی تھی۔

رام دیو نے آفریدی کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بس وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سے سائے لرزاں تھے۔

”مہاراج! یہ کیسی بے خبری ہے کہ تم اپنے مرحوم دادا شادی دیو کو بھی فراموش کر بیٹھے۔“ علی عابد نے آفریدی کے جواب پر ایک اور بھولا ہوا قصہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ قصہ جو رام دیو کے اپنے ایک بزرگ کی گمراہی اور ہدایت کا قصہ تھا۔ ”مگر تم اپنے دادا کو کس طرح یاد رکھو گے کہ اس نے تمہارا خاندانی رایتوں سے بغاوت کر کے حضرت خواجہ کی غلامی اختیار کر لی تھی۔ وہ ایک ہدایت یاز خوش نصیب انسان تھا۔ اسے جادو کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی اس لئے اپنے گناہوں سے تائب ہو کر تیار پا گیا اور شادی دیو سے خدا کا بندہ (عبداللہ) بن گیا۔ تم نے.....“ آفریدی نے قصداً اپنی بارے نامکمل چھوڑ دی۔

”میں ایک مکمل ساحر ہوں۔“ علی عابد کے خاموش ہوتے ہی رام دیو گر بنے لگا۔ اس کی رعوت پر طرح بیدار ہو گئی تھی۔ ”وہ سب نامکمل تھے، اس لئے شکست کھا کر ذلیل و خوار ہو گئے۔ میری تپا گیان تکمیل کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ مجھے کبھی زوال نہیں ہو گا اور میرے ماننے والوں کو محرومی و ناکامی کے ہاتھ کبھی نہیں چھو سکیں گے۔“ یہ کہہ کر رام دیو نے سجدے میں پڑی ہوئی راقصہ کے ایک زوردار ٹھوکر ماری۔

آفریدی نے دیکھا دفعۃً رجنی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی پھر راقصہ کی دردناک چیخیں کمرے کو بچنے لگیں۔ چند منسلک سپاہی کمرے میں داخل ہوئے اور راقصہ کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ آفریدی خاموشی سے رام دیو کی سفالی کا متناشا دیکھتا رہا۔ شاہی سفیر کو معلوم تھا کہ رجنی بھی کائنات کی طرح کر دی جائے گی یا پھر بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں اس کا کوئل تن جل کر راکھ ہو جائے گا۔ شنگردوں بہتی تھی، وہاں ظلم کے سوا کوئی دوسرا تماشا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

جب رجنی کی چیخیں راہداری میں گونجنے لگیں تو رام دیو نے تفتیک آمیز نظروں سے آفریدی کی طرا دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی شرارت ناچ رہی تھی۔ پھر ایک رام دیو نے پوری طاقت سے کمرے کے فرش پر اپنا پاؤں مارا۔ آفریدی اس کے جسم کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہا تھا۔ رام دیو کا پاؤں پڑتے ہی آفریدی کو ایک تیز گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کہیں قریب ہی بادل گرے ہوں۔ دوسرے ہی آفریدی کو محسوس ہوا کہ زمین لرز رہی ہے۔ رام دیو اپنی جادوئی قوت سے زلزلہ لے آیا تھا۔ کچھ دیر کمرے کی زمین کا تپتی رہی اور پھر ایک گوشے میں دھماکا سا ہوا۔ پتھر پھٹ گئے تھے اور کمرے میں ایک شگاف نمایاں ہو گیا تھا۔ شگاف کے ظاہر ہوتے ہی ایک اور عجیب و غریب سانحہ پیش آیا ناگماں کے انسانوں کی چیخوں کا شور اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

رام دیو نے ایک بار پھر آفریدی کی کواہرات کی نگاہ سے دیکھا اور پیر پختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ آخر کچھ دیر تک گمرے سانے کی کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور ان چیخوں غور سے سننے لگا جو کمرے کے چوڑے شگاف سے برآمد ہو رہی تھیں۔ ان چیخوں میں اس قدر دردناک تئیں کہ آخر انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کمرے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے اور تہہ خانے میں نہایت سنگدلی کے ساتھ انسانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ آفریدی بے دست و پا تھا۔ وہ مظلوم کی فریاد سننے کے بعد اس کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب نا دیدہ انسانوں کی چیخوں کا شور زیادہ ہونے لگا تو آفریدی بہت احتیاط کے ساتھ اپنے بستر سے نیچے اترا۔ زخموں نے ایک بار پھر اس کا راستہ

کوشش کی تھی مگر آفریدی اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے سہارے آگے بڑھا اور اس شگاف کے قریب پہنچا۔

رام دیو کے طلسمانی عمل کے نتیجے میں ظاہر ہو گیا تھا۔ آفریدی نے جھانک کر ان مظلوم انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ چیخیں سنیں ابھی بلند ہو رہی تھیں۔ آفریدی نے جھانک کر ان مظلوم انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ ی طرح چونک اٹھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں پیدا ہوا جانے والا شگاف بھی غائب تھا اور انسانی چیخیں مابند ہو گئی تھیں۔ آفریدی چند لمحوں تک حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا جب کوئی چیخ نہیں ابھری تو اس نے اپنے ایک پاؤں کو زمین پر ادھر ادھر گردش دی زمین کی سطح ہموار تھی۔ وہاں کسی چوڑے شگاف کا وجود تو تیار، کوئی ہلکی سی دراڑ بھی نہیں تھی۔ آفریدی مسکرانے لگا اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بستر تک پہنچا۔

پھر جیسے ہی آفریدی اپنے بستر پر دراز ہوا، وہی انسانی چیخیں اسی شدت کے ساتھ ابھرے لگیں۔ آفریدی کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر رے کے شگاف اور انسانی چیخوں کا کوئی حقیقی وجود ہے تو پھر اس کے وہاں پہنچنے کے بعد وہ شگاف بند کیوں لیا تھا۔ اور پھر چیخیں بیکام معدوم کیوں ہو گئی تھیں؟“ یہ ایک عجیب و غریب معمہ تھا جسے آفریدی کی معمولی ذہانت بھی حل کرنے سے قاصر تھی۔ ابھی آفریدی رام دیو کے جادوئی عمل کے متعلق سوچ ہی تھا کہ وہ چیخیں بلند ہوئی چلی گئیں اور کمرے کے گوشے میں وہی شگاف دوبارہ نظر آنے لگا۔ آفریدی نے بار بار ہمت کر کے اس طلسم کی حقیقت جاننے کی کوشش کی مگر جیسے ہی وہ اس شگاف کے قریب پہنچا زمین سطح دوبارہ ہموار ہو گئی اور تیز چیخیں اس طرح دم توڑ گئیں جیسے بھی ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ آفریدی کو رید حیرت کا شکار ہو کر دوبارہ اپنے بستر کی طرف لوٹ جانا پڑا۔

چیخوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ اب آفریدی پوری سنجیدگی کے ساتھ رام دیو کی ساحرانہ قوتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ جادو ایک نفسیاتی حربے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے اثر آجائے تو پھر وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اسے اپنی قوتِ ارادی یا طاقتِ ایمانی سے جھٹلا دے تو جادو اس ایک شعبہ بازی اور نظر بندی بن کر رہ جاتا ہے۔

آفریدی نے دہلی کے علماء سے جادو کے بارے میں یہی معلومات حاصل کی تھیں اور آج ان ہی معلومات کے سہارے وہ رام دیو کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ساری رات اس کے کمرے میں خوشبو دار دواں بھرا رہا اور ایک گوشے سے نا دیدہ انسانوں کی دردناک چیخیں ابھرتی رہیں۔ آفریدی نے اپنے منتشر لات کو یکجا کر کے سونے کی بہت کوشش کی مگر کمرے کی فضا اتنی پرسراور پر ہول تھی کہ وہ ایک لمحے کیلئے نہیں سو سکا۔

پھر سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر قبل راجپوتوں کا مقدس دھواں بھی فضا میں تحلیل ہو کر کہیں غائب لیا اور وہ دردناک چیخیں بھی بند ہو گئیں۔ آفریدی کو مہمانتزی و کرم سنگھ کی اس ناشائستگی اور غیر سیاسی لٹ پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

محکم اور بے خوفی نے جلد ہی آفریدی کو نیند کی آغوش میں کھینچ لیا۔ پھر وہ اتنی گہری نیند سو گیا کہ دوپہر کا اناجی نہ کھا سکا اور شام کے قریب اس کی آنکھ کھلی، جاگنے کے بعد محافظوں نے آفریدی کو کھانا پیش کیا تو مانے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ مہمانتزی سے ملے بغیر راج محل کی کوئی چیز استعمال نہیں کرے۔ محافظوں نے مہمانتزی تک یہ خبر پہنچائی تو وکرم سنگھ کچھ دیر بعد ہی آفریدی سے ملنے کے لئے اس کے رے میں آیا۔

”سلطانی سفیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وکرم سنگھ کے لہجے میں ہلکا ہلکا طنز پوشیدہ تھا۔
 ”میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہے مگر آپ کی مہمان نوازی اب دل آزاری میں تبدیل ہو گئی
 آفریدی کا لہجہ سخت تھا۔

”یہ دل آزاری نہیں“ راجپوتوں کی رواداری ہے۔“ وکرم سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ایک لفظ آفریدی کی مجبور یوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔
 ”یہ رواداری ہے کہ میرے سر پر عجیب عجیب بلائیں مسلط کر دی گئی ہیں۔“ علی عامر آفریدی
 بھی تیز ہو گئی تھی۔

”مہمان سفیر شاید یہ بھول گئے کہ وہ انتہائی مشکوک حالت میں چوڑی کی حدود تک پہنچے تھے۔“
 مہمانسز وکرم سنگھ کھڑا ہو گیا۔ ”جب تک تمہارے زخم ٹھیک نہیں ہو جاتے تمہیں چوڑے کے
 سیاست کو قبول کرنا ہو گا۔“ وکرم سنگھ نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اور یہ ثابت ہو
 آفریدی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ وکرم سنگھ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

آفریدی نے غور سے مہمانسز کو دیکھا پھر تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ ”کل ایک اور کانٹا آگ کے
 جلادی گئی۔“ آفریدی کی آواز میں دل کا کرب شامل تھا۔

”تمہیں زندگی کا تماشا دکھانے کے لئے ابھی تو بے شمار جسم جلیں گے۔“ وکرم سنگھ کا رد
 تھا۔ ”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ کون جل رہا ہے اور کون بچ رہا ہے؟ یہ
 معاملات ہیں۔ ہم ایسے امور میں غیروں کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ جب تک تم راجہ
 مہمانی پد منی کے مہمان ہو، تمہیں سب کچھ دیکھنا ہو گا۔ پھر جب دہلی جاؤ تو شوق سے کانٹا کا
 سلطان کو سناؤ۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ کمرے سے جانے لگا مگر دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک
 مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اپنی غذا کا خاص خیال رکھو ورنہ کئی سال بھی صحت مند نہ ہو سکو گے
 کے بعد وکرم سنگھ تین قدموں سے چلا گیا۔

اب آفریدی چوڑے کے حکمرانوں کی ایک ایک چال کو سمجھ گیا تھا۔ وہ وکرم سنگھ ہو یا ساحر رام دیو
 با اختیار فرد اس کی ذہنی قوتوں کو مفلوج کر کے کوئی خاص فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی غور و فکر
 آفریدی کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا تھا وہ یہ کہ چوڑے کے فرمانروا طبقے نے اسے ایک مشتہر
 تھا اس لئے اب اس کی دہلی واپسی بھی مشکوک نظر آرہی تھی۔ آفریدی کی اس سوچ نے اسے
 اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ والدہ اور چھوٹی بہن سے جدائی اور سلطان کے دربار سے غیر حاضری بڑی
 صورت حال تھی۔ آفریدی بہت دیر تک اپنے خیالات میں الجھتا رہا اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسلیاں
 تانے لگی اس کے ساتھ ہے۔ خدا جو بھی کرے گا بہتر کرے گا۔ اس تصور کے ساتھ ہی آفریدی
 سا گیا اور وہ آنے والی رات کے متوقع حادثوں کو برداشت کرنے کے لئے اپنی اعصابی قوتوں کو سینے

☆ ☆ ☆

پھر جب رات کے اندھیرے گہرے ہو گئے تو وہی رسم دہرائی گئی کھانے کے بعد ایک اور خوب
 ساغریف آفریدی کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ علی عامر اس لڑکی کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس
 صراحی اور بلوری جام ایک طرف رکھے اور شاہی سفیر کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں آفریدی
 بھری ہوئی تھی۔

”کیا مسلمان بھی راجپوتوں کی طرح ہوس کے اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں؟“ لڑکی، آ

ن طرح مخاطب ہوئی کہ وہ سناٹے میں آگیا۔
 ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ آفریدی جیسے شجاع نوجوان کی زبان میں صاف کلفت محسوس ہو رہی
 ”تم کون ہو اور مجھ سے اس قدر ناگوار لہجے میں کیوں مخاطب ہو؟“

”میرا نام سادرتی ہے۔ میرے ماں باپ نے ہندوؤں کی ایک عظیم اور شوہر پرست عورت کا نام چرا کر
 ہ نام مجھے بخش دیا تھا۔ ایک سچ خاندان کو یہ نام راس نہیں آیا۔ میری ذات برہمنوں اور راجپوتوں کی
 ات سے کم تھی۔ ہماری ذات کے لوگ زندہ تو رہ سکتے ہیں مگر انہیں آبرو مند نہ زندگی گزارنے کا کوئی حق
 حاصل نہیں۔ ہم راستے کی وہ دھول ہیں جو ہر گزرنے والے مسافر کے قدم چھونے کیلئے مجبور ہے۔ ہماری
 اور میں شادیاں ہوتی ہیں مگر ہر لڑکی کو اپنے شوہر کے گھر جانے سے پہلے کسی راجپوت کی دہن بننا پڑتا ہے
 ب گھر میں میرے رشتے کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے ماں باپ سے صاف کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں
 ا۔ اہل چوڑے کے نزدیک یہ بڑا باغیانہ عمل تھا۔ میرے انکار سے دیوتا ناراض ہو کر اس دھرتی پر قربان
 رکھتے تھے۔ برادری والوں نے میرے خلاف فیصلہ دے دیا کہ کوئی لڑکی راجپوتوں کے بنائے ہوئے قانون
 نہیں توڑ سکتی۔ جب میری قوم کے مردوں نے بھی بے غیری کا لباس پہن لیا تو اس شادی کو کون روک سکتا
 نا۔ پھر میں دہن بن گئی اور جب ایک راجپوت سردار کے یہاں سہاگ رات گزار کر شوہر کے گھر پہنچی تو اس
 نے مجھے اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا۔ برادری اس شخص کا کچھ نہ لگاؤ سکی کیوں کہ وہ بھی ایک مرد تھا اور
 رد ہی تمام قانون بنایا کرتے تھے۔ لوگوں نے میرے شوہر کو ایک غیرت مند انسان سمجھا حالانکہ اس کی کئی
 نیں بھی شادی شدہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ اس شخص کی غیرت اس وقت
 ماں سو گئی تھی جب اس کی اپنی بیٹی راجپوت سرداروں کے یہاں سہاگ رات گزار رہی تھیں اور وہ چین کی
 بند سو رہا تھا۔“ یہ کہتے کہتے سادرتی کے سرخ و سفید چہرے پر آگ سی برسنے لگی تھی۔

آفریدی اس مظلوم لڑکی کی لرزہ خیز داستان سن کر لرز اٹھا تھا۔ ”بس! خاموش ہو جاؤ اگر سانسوں سے
 ارے تو اپنے ہونٹوں کو قابو میں رکھو۔“ آفریدی، سادرتی کو خاموش کر دینا چاہتا تھا کہ اس کی غم آلود
 شخصیت تیسری کا کتا کو قتل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

”تم اس عورت کو موت سے ڈراتے ہو جو روزانہ سورج غروب ہوتے ہی مرجاتی ہے۔“ اچانک
 سادرتی کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ابھری جس میں موت سے بے خوفی اور زندگی سے شدید نفرت
 پوشیدہ تھی۔ ”اس سے پہلے کہ میں بھی کانٹا کے پھلوں جاکر سو جاؤں میری کہانی سن لو تم بھی مرد ہو اور اسی
 نیا سے تعلق رکھتے ہو۔“

سادرتی نے علی عامر آفریدی کو جھنجھوڑ کر دکھ دیا تھا۔ وہ بڑے بے ہیاک لہجے میں بول رہی تھی۔ ”میں اس
 روح کوئی گئی کہ کچھ بھی باقی نہ بچا شوہر کی ٹھوکریں کھا کر ماں باپ کے گھر پہنچی تو وہ دروازہ بھی بند ہو گیا اور اپنی
 بے ضمیر برادری سے مدد مانگی تو کہا گیا اس بوجھ کو کوئی نہیں اٹھا سکتا مجبوراً اسی راجپوت سردار کے ہاں چلی گئی
 س نے میری قوم کی لڑکیوں کیلئے وحشیانہ قانون بنایا ہے۔ پھر جب اس کی محفل کیف و نشاط بھی مجھ سے بیزار
 آگئے۔ مہمانسز وکرم سنگھ نے مجھے اپنے گھر میں بٹا دیا۔ میری ذلت و رسوائی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ تم
 ست رنگین حراج ہے۔ اگر وہ میرے رقص اور ساقی گری کی اداسے خوش ہو گیا تو انسانوں کی ہستی سے نکالی
 رہا اور آفریدی کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے انسانی تہذیب کے بچے ہوئے بازار میں دہلی سے آنے والا ایک

بہت بڑا سوداگر حوا کی بیٹیوں کی بولی لگا رہا ہو۔

ساوتری کی الزام تراشی نے چند لمحوں کے لئے آفریدی کے دل و دماغ کو پتھر کا بنا دیا تھا۔ وہ سکتے میں اس رقصہ کو دیکھ رہا تھا جو کانٹا اور رجنی سے بہت زیادہ مختلف تھی۔

”مہمان سمرات کے مہمان راج دوت (سفیر) میں تمہیں خوش کردوں گی مگر مجھے اتنا بتا دو کہ کیوں کیا؟ تم تو عرب کے اس دیوتا کے ماننے والے ہو جو پتھر کا نہیں تھا جس نے صدیوں سے جلنے والا کو ایمان کے نرک سے نکال کر سرکش اور مانتیا (تحفظ و احترام) کا سورگ بخشا تھا۔ یہ بھوی تمہارا انتظار کر رہی تھی لیکن تم آئے بھی تو کس طرح آئے۔ سنسار کو بھیڑیوں سے مکتی دلانے والا۔ مایا کے مومہ میں ڈوب گئے۔ برہم! یہ کیسا اپنا چار (ظلم) ہے؟ اس دھرتی کو الٹ کیوں نہیں دیتا؟ کتے ساوتری کی آواز لرزے لگی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

آفریدی کو بھی ہوش آچکا تھا جیسے ہی ساوتری کی زبان سے آخری الفاظ ادا ہوئے وہ چیخ اٹھا۔ مہمانتزی جھوٹ بولتا ہے وہ مسلسل میرے گرد وفاق دریا کاری کا حصار کھینچتا جا رہا ہے اور میں غام سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ مگر آج کے بعد میں چپ نہیں رہوں گا۔ وہ خود کو بہت بڑا سیاستدان مگر اسے معلوم نہیں کہ میں کس شہشاہ کا سفیر ہوں ابھی اسے سلطان کی تند خوئی کا اندازہ نہیں۔ کے قلعے میں محصور ہو سکتا ہوں لیکن علاء الدین خلجی مجبور نہیں وہ آزاد ہے اور اپنی آزادی میں تمہیں بھی آزاد کرتا ہے۔ یہ کمرہ کسی اواباش سفیر کا کمرہ نہیں۔ یہ ایک مسلمان کی عارضی قیام اپنی بناوٹ میں تمہارے ماں باپ کی چار دیواری سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔“

ابھی فضا میں آفریدی کی صدائے بازگشت کے اثرات موجود تھے کہ دروازے پر بھاری قدموں سنائی دی۔ علی عامر اور ساوتری نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں رام دیو کوئی مسلح سپاہیوں اندر داخل ہو چکا تھا۔

”جیسے ہم آزادی نہیں دیتے وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔“ رام دیو کا مکر وہ قہقہہ گونجا اور وہ شعل سے آفریدی کو دیکھنے لگا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تیری ایک ایک حرکت پر سو سو پیرے لگے ہوں تیرے دل میں کبھی کوئی خیال بھی گزرے گا تو ہم اس سے باخبر ہو جائیں گے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ شدت جذبات سے آفریدی کا لہجہ جل اٹھا۔ ”میں نے بھی یہ بات حکمرانوں کو سنائی ہی کیلئے کہی ہیں۔ مہمانتزی و کرم سنگھ کہاں ہے؟“ آفریدی نے رام دیو کو مخاطب ہوئے کمایا سلطان کے سفیر نے پہلی بار اپنے لیوں سے نرمی کی تمہ کھرچ دی تھی اور اب اس سنگد آہن کے ہونٹ نظر آرہے تھے۔

”میری موجودگی میں مہمانتزی کی ضرورت باقی نہیں رہتی،“ رام دیو کی کمرہ بہہ آواز ابھڑ کبر و غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔

”و کرم سنگھ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ حکومت کے نازک ترین معاملات جادو گروں کو دیئے۔“ جواہر آفریدی کی آواز بھی تیر ہو گئی تھی۔ ”سیاسی مسائل کو سیاست ہی سے حل کرنا جو گیوں اور پیر گیوں کے متروں نے تو سب کچھ الجھا کر رکھ دیا۔ اب شاید کچھ نہیں ہو سکتا ہو سکتا۔“ آفریدی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سب کچھ ہو گا اور ہماری مرضی کے عین مطابق ہو گا۔“ رام دیو کا غصہ عروق پر تھا وہ اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں سے چیخ کر کہنے لگا۔ ”لڑکی کو اسی کمرے میں زندگی کی قہ

دو۔“ رام دیو کی سنگدلی اور جارحیت نے اب ایک نیا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ وہ علی عامر آفریدی کو ہانداز سے اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔

”رام دیو، بس بہت ہو چکا۔“ علی عامر آفریدی جادو گر کی ہیمنہ حرکت پر اس قدر زور سے چیخا تھا کہ ب کے سنائے میں اس کی آواز دور تک گونجی چلی گئی تھی۔ ”اب میں اس خوں میں تماشے کی اجازت نہیں دے سکتا تم پورے چوڑی لڑکیوں کو قتل کر ڈالو مگر میرے نام پر یہ کاروبار نہیں ہو گا۔ تمہارا مہمانتزی اور تم دونوں سے ان بے گناہ لڑکیوں کے ساتھ ایک بھیانک کھیل کھیل رہے ہو۔ لیکن آج یہ کھیل ختم ہو گا۔“

رام دیو نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ ”تو نے اپنے وطن میں آزادی کے بے شمار مظاہرے دیکھے ہ گے مگر آج یہ منظر بھی دیکھ کہ ہم لوگوں کو کس قدر لالہ رنگ آزادی دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر رام دیو نے ان سپاہیوں کی طرف دوبارہ دیکھا جو اپنی ششیریں بے نیام کر چکے تھے۔ ”اس لڑکی کو قسطنطنیہ آزادی دو۔“

سپاہی جرت سے رام دیو کا منہ نہ کھلے گا۔ مہاراج کے اس حکم کا مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ”لڑکی کو ٹھہر ٹھہر کر قتل کرو۔“ رام دیو اس سفاک قاتل کے انداز میں ہنسا جو انسانی خون بہاتے بہاتے رکھا جاتا ہے۔ ”لڑکی کے ایک ایک عضو کو رک رک کر کاٹو پھر ہم دیکھیں گے کہ ہمارے اور سلطان کے بادشاہ میں کیا فرق ہے؟“

”رام دیو! اگر یہ لڑکی اور اس جیسی دوسری لڑکیاں تیرے معاشرے پر بوجھ ہیں تو انہیں میرے ساتھ لے دے۔ میں انہیں لے کر چوڑی حدود سے نکل جاؤں گا۔ میرے سلطان کی حکومت بہت وسیع ہے۔ زنت و آبرو کے ساتھ یہ کہیں بھی ساجائیں گی۔ تو نے ان پر ہر وہ شے بند کر دی جس کی یہ حق دار تھیں۔ خدا یلے اب ان پر سانسوں کے دروازے بند نہ کر۔ میں تجھے آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ اگر ان معصوم لڑکیوں زندگی کے دروازے بند ہوئے تو پھر تیرے لئے اور تیری پوری قوم کیلئے جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔“

”تیری آنکھیں ابھی دیکھ لیں گی کہ نرک کے دروازے کس پر کھلتے ہیں؟“ رام دیو چیخا۔ ”اپنے یونٹوں کا ایمان کرنے والی اس نرمی (رقاصہ) کا ایک ایک انگ شریر سے الگ کر دو۔ اسے ایسی سزا دے کہ مہمان راجپوتوں کے بچے دشمن بھی کانپ اٹھیں۔“

”رام دیو! تو میرے الفاظ کو ایک زخمی سفیر کی التجا نہ سمجھ۔“ سپاہیوں کو ساوتری کی طرف بڑھتا دیکھ کر آفریدی غضب ناک آواز میں بولا۔ ”یہ ایک طاقتور اور مطلق العنان فرمانروا کا حکم ہے جو سر زمین چوڑی پر بسنے والے ایک ایک شکر گونایا جا رہا ہے۔ اگر تو نے جوش اقتدار یا اپنے ظلم و جادو کی بد مستی میں نافرمانی کی تو اپنے توں کی ہستی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی بھیانک آگ بھڑک اٹھے گی کہ پھر راکھ کے ٹکڑے باقی نہیں بچے گا۔ ہوش سے کام لے اور اس بے گناہ کو اس عذاب سے دوچار نہ کر جو کسی حیوان کیلئے ہی جائز نہیں۔“

”اس دھرتی کے مالک ہم ہیں۔ ہمارے کانوں نے آج تک ایسے شبہ نہیں سنے جن سے بھتی اور ہیمنہ (غور) کی بو آتی ہو اس دور و بی (باغی) لڑکی کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دجیسے میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔“ شدت غضب سے رام دیو کا چہرہ اور مسخ ہو گیا تھا۔

سپاہی رقصہ ساوتری کی طرف بڑھے۔ موت بڑی خوفناک شے ہوتی ہے جب وہ بے نقاب ہو کر لڑکی

کے سامنے آئی تو بغاوت اور بے خوفی کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوجود سادری لڑا بھی اور پھر اس کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قاتلوں کے ہاتھ بہت دراز تھے ایک ہی وار میں سادری کے دو دھڑ پاؤں کٹ گئے اور وہ اوندھے منہ کمرے کے فرش پر گر پڑی دونوں پیروں کے گھٹکھونچا گئے۔ ان بچنے کا وہی انداز تھا مگر کمرے کے اندر موجود تمام افراد جانتے تھے کہ یہ رقص طرب نہیں، رقص فتاہ سادری کے کئے ہوئے پیروں سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا اور رام دیو کو خون کی اس پھوار پر جلتھک کا گلا ہو رہا تھا۔ وہ عالم مرستی میں جھونے لگا اور سادری کی دردناک چیخیں گونجنے لگیں۔ ظالموں کے نزدیک مغنیہ کی ایک نئی تان تھی، گیت کا ایک نیا مرقع تھا۔

آفریدی جوش اضطراب میں اپنے بستر سے اتر آیا اس نے آگے بڑھ کر رقصہ کو بچانے کی ایک کوٹم تاکام بھی کی مگر بیک وقت کئی راجپوت سپاہیوں نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ داغ داغ رکھنے والا ایک مجبور سالانہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ علی عامر آفریدی تڑپ کر رہ گیا۔ بد دست و پادھات کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے تو اس کی آنکھوں میں دل کا خون اتر آیا۔ زبان پر بھی کوا بندش نہیں تھی اس نے آفریدی چیخنے لگا۔

”مظلوم انسانیت کے بے رحم شکاریو! اس خدا کے غضب و قہر سے ڈرو جس کے تم نے لاکھوں شرمک تراش لئے ہیں۔ ہمارے یہاں تو پاگل کتے کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ اسے شمشیر کے ایک ہی وار میں ہلا کر کر دو۔ مگر تم بے گناہ لڑکی کے جسم کے ٹکڑے کر رہے ہو۔ اپنے اس جابرانہ عمل کی طرف دیکھو خدا کی بے کسی قصاب کی دکان نہیں ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ جو رو جفا کے ان لمبے ہاتھوں کو روک لو اور اہم گھناؤنے کردار پر ایک نظر ڈال کر شرمندہ ہو جاؤ۔ شاید اس طرح عذاب آسانی کچھ دن کیلئے تمہارے سروں سے ٹل جائے ابھی وقت ہے اس وقت کو اپنی ظالمانہ رسموں کی بھیئت نہ چڑھاؤ۔“

آفریدی چیختا ہوا مگر رام دیو کی ساعتوں پر گمراہی کے قفل لگ چکے تھے۔ وہ ہدایت کا ایک لفظ بھی نہ سن اور اس کے سپہانہ حکم پر رقصہ کے جسم کے ٹکڑے کئے جاتے رہے پھر گل بندی کا سارا فسون ختم ہو گیا دلکش اور رنگین زندگی کے عناصر اس طرح بے ترتیب ہو گئے تھے کہ سادری کی بکھری ہوئی لاش دیکھ آفریدی جیسے بے خوف نوجوان کو بھی وہشت کا احساس ہونے لگا تھا۔

ہندوؤں میں ایک سادری وہ تھی جس کے شوہر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جب موت کا دیوتا ہم را اس نوجوان کی روح نکال کر آسمانوں کی طرف جانے لگا تو سادری کے پریم اور تپسیا نے ہم راج کا رستہ رو لیا پھر موت کا دیوتا ایک عورت کی شوہر پرستی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے سادری کے بچے کے پان دھان اس کے شریر میں پرویش (داخل) کر دیئے۔ نوجوان زندہ ہو گیا اور پھر اس واقعہ کی اتنی دھوم مچی سادری اپنی شوہر پرستی اور موت کے دیوتا کو شکست دینے کے سبب ہندوؤں کی مذہبی تاریخ میں امر ہو گئی۔ اور دوسری سادری وہ تھی جس کے سیکڑوں شوہر تھے وہ بھی ایک شوہر کی پرستش کرنا چاہتی تھی مگر سماج راجپوت ٹھیکیداروں نے اس سے یہ حق چھین لیا اور وہ کسی دوسرے مرد کی جان بچانے کے بجائے خود زندگی سے محروم ہو گئی۔

علی عامر آفریدی خیالات میں اس طرح گم تھا جیسے اس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ سادری کے لرزہ خیز نے اسے راجستھان کی سرحدوں سے نکال کر کہیں دور پہنچا دیا تھا۔

پھر جب بہت دیر بعد آفریدی کو ہوش آیا تو ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی علی عامر نے گھبرا کر سادری کی لاش کے ٹکڑے اسی طرح فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور کمرے کا دروازہ بند تھا۔ آفریدی

حساس ہوا کہ جیسے رام دیو اور اس کے سپاہی قصد اسادری کی لاش کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر جا چکے ہیں اور اپنے ظلم و تشدد میں مزید رنگ بھرنے کے لئے دروازہ بھی بند کر گئے ہیں۔ آفریدی کا یہ احساس جلد ہی زندہ حقیقت میں تبدیل ہو گیا اس نے محافظ راجپوتوں کو مسلسل آوازیں دیں مگر باہر سے کوئی جواب نہیں آیا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک خاص منصوبے کے تحت مسلح نگہبانوں نے جواب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

”اس عورت کی لاش کی اور بے رحمی نہ کرو۔ اسے لے جا کر آگ میں چھونک ڈالو اور میرے کمرے سے خون کے نشانات صاف کر دو میں شہابی سفیر ہوں۔ اس کے مرتبے کو پہچاننے کی کوشش کرو یہ جاوگر رام دیو جس کی تم کسی دیوتا سے بھی زیادہ پوجا کر رہے ہو، تمہیں کہیں کانہ چھوڑے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ عقربہ تم پر ہلاکت و بادی کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ تمہارے راج محل کی بلند و مضبوط دیواریں سلطان کے قہر و جلال سے پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گی۔ ظلم کی بنیادوں پر کوئی پناہ گاہ قائم نہیں رہ سکتی۔ دروازہ کھولو اور اس مظلوم لڑکی کی آخری رسمیں ادا کر دو۔“ علی عامر آفریدی پوری طاقت سے چیخا رہا مگر اس کی دردناک صدائیں پھر کے اس مقبرے میں گونجتی رہیں جہاں ایک رقصہ کی دریدہ لاش کو ابھی تک زمین نے قبول نہیں کیا تھا۔

وہ سنا کر ہاتھ کا شاہوں کو مہاراجوں کو رقص بھل بہت پسند تھا آج آفریدی نے بھی اپنی آنکھوں سے وہی رقص بھل دیکھ لیا تھا۔ بڑے لوگوں کے کیسے کیسے عجیب مشغلے تھے؟ آفریدی ایک بار پھر لرز اٹھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور خیالات کی سوزش دل و دماغ کو چھونکے دے رہی تھی۔

اچانک اسے لیوان کی ہلکی ہلکی خوشبو کا احساس ہوا آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”مقدس دھویں“ کا سفر نیم شب جاری ہو گیا تھا کمرے کے کواڑ بند تھے اس نے رام دیو کی عظمتوں کا نشانہ وہ خوشبودار دھواں اندر داخل نہ ہو سکا مگر اپنی شدت کے سبب اتنا احساس ضرور دلاتا رہا کہ اہل چٹوڑ سور ہے ہیں اور شکر و سفاک ساحر جاگ رہا ہے۔

پھر رام دیو کی کمرہ بہرہ آواز بھرنے لگی۔

”آگ امر ہے اور ہم اسی آگ کے بجاری ہیں۔ یہ وہ آگ ہے جو انکار کرنے والوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور اپنے سامنے والوں کو نئی شہتی دے کر خود انہیں بھی امر بنا دیتی ہے۔ ہم نے آکاش کی جوالا کو اس قدر پوجا ہے کہ اب ہم خود بھی جوالا کی (آتش فشاں) بن گئے ہیں۔ اب ہمیں کوئی آگ نہیں جلا سکتی۔ اب ہم یزک ہیں اور ہم ہی سورگ۔ عرب سے آنے والے لمبے (ناپاک) سارے سنسار کو ترک کی گئی سے ڈرا کر انہیں ان کے دھرم سے بھٹکا سکتے ہیں مگر ہم تو اپنے آپ ہی آگنی کا ایک سمندر ہیں۔ ہمیں کون جلا سکتا ہے؟ ہم بڑی بے چینی سے سلطان کی پریشکشا (انتظار) کر رہے ہیں وہ چٹوڑ آئے اور ہمارے دیوتاؤں کی آگ کا ایندھن بن جائے۔ دلی کے شامک (حکمران) کو نہیں معلوم کہ ہمارے گیان کی آگنی کتنی بھوک ہے جب تک اسے ملچھوں کے شریر کا بھوجن نہیں ملے گا یہ اس سے تک بھڑکتی ہی رہے گی۔“

آفریدی آج پہلی بار رام دیو کے منتر کی زبان سمجھ سکا تھا۔

کچھ دیر بعد رام دیو کی آواز دوبارہ گونجنے لگی اب کی بار وہ اسی نامائوس زبان میں منتظر پڑھ رہا تھا آفریدی چند لمحوں تک حیران و پریشان رہا پھر اس پر یہ راز فاش ہو گیا کہ رام دیو نے جان بوجھ کر آسان زبان استعمال کی تھی وہ کوئی منتر نہیں تھا بلکہ ایک دھمکی تھی جسے رام دیو، آفریدی کو منتقل کرنا چاہتا تھا۔ رام دیو کی یہ حکمت عملی۔ اسی منصوبے کا ایک حصہ تھی کہ علی عامر آفریدی راجپوتوں کی سیاسی قوت اور جاوگر وں کی ساحتانہ

طاقت سے متاثر ہو کر اپنے سلطان کو چوڑی طرف آنے سے باز رکھے اور واضح الفاظ میں علاء الدین خلیج کو بتادے کہ وہ اوھر کا رخ نہ کرے۔ راجپوتوں کا پورا علاقہ رام دیو کے ظلم کے زیر اثر ہے، اس نے ناقابل تخیر ہے۔

رام دیو کی عیاریوں کے مسلسل مظاہرے دیکھ کر آفریدی کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی ابھر آئی لیکن سختی بھی برسات کی اسی دھوپ کی طرح عارضی تھی جسے دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ بادل نکل لیتے ہیں۔

آفریدی نے رام دیو کی آواز سے پیچھا چھڑایا تو ساوتری کا تن داغ داغ منتظر تھا کوئی آنے اور اس کی منتظر جوانی کا مرثیہ پڑھے۔ آفریدی کے سوار قاصد ساوتری کی موت پر نوحہ خوانی کرنے والا کون تھا؟ علی عامر نے ساوتری کے کئے ہوئے سرو کو دیکھا اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں خمش انتظار کا عکس تھم کر رہا تھا۔ آفریدی نے میدان جنگ سے لے کر شاہی قتل تک بے شمار لوگوں کو زندگی سے محروم ہوتے دیکھا تھا مگر ساوتری کے تو سرے کی اداسی انوکھی تھی۔

کانتا نے بھی آفریدی کو لرایا تھا لیکن ساوتری تو زندگی بھر کے لئے اس کے دل میں ایک رستا ہوا غم چھوڑ گئی تھی۔ ”کوئی اس طرح بھی موت کو گلے لگاتا ہے؟“ علی عامر آفریدی خود کھائی کے انداز میں اس طرح بول رہا تھا جیسے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو۔ ”برباد پھولوں کو زمین پر گرنا ہی تھا تو میرے آنے سے پہلے گر گئے ہوتے میری آنکھوں کے سامنے شاخ سے یہ رشتہ کیوں توڑا گیا؟ گرم ہواؤں کی بیدارگری کے فسانے مجھے کیوں سنائے؟ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں پھر جانے والوں نے اپنا یہ زہر میری ساعوتوں میں کیوں اتار دیا؟ میں کوئی میچا تو نہیں کہ ایک ایک زخم پر مہم رکھ دیتا مجھے رقص زنجیر کیوں دکھایا کہ میرے ناتواں ہاتھ ننگی کے پیروں کی بیڑیاں نہیں کاٹ سکتے میں تو نامعلوم منزلوں کا مسافر ہوں اور اس لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ راستوں میں صدیوں سے پڑے ہوئے سنگریزوں کی فریادیں سنتا ہوں اور جاؤں۔ کس کی چیخ پر ٹھہروں کہ یہاں تو چیخیں ہی چیخیں ہیں۔ موسم کی ختیوں سے بے رنگ ہو جانے والے کس پتھر کی داستان سنوں کہ ہر پتھر کا سینہ اندر سے گرم موم کی طرح ہے۔“ آفریدی بہت دیر تک اپنی مجبوریوں کا ماتم کرتا رہا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اتار پڑا کہہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ ساوتری کے پسینے والے لمونے اتنی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی کہ کوئی شخص اپنے قدموں کو آلودہ کئے بغیر یہاں سے گزر جاتا۔ آفریدی کے تلوے بھی ساوتری کے خون سے تر ہو گئے۔ راجپوتوں کی نظر میں یہ ایک بچ لڑکی کا خون تھا وہ غیرت کی حرارت سے محروم ہوتا ہے۔ مگر جب اسی خون نے آفریدی کے پیروں کو چھوا تو شاہی سفیر کے دل و دماغ جل اٹھے۔ علی عامر کو محسوس ہوا کہ ساوتری کے خون میں اعلیٰ نسل راجپوتوں کے خون سے زیادہ گرمی تھی۔

آفریدی نے بے پناہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرتا ہوا بالآخر قاصد ساوتری کے پیروں تک پہنچ گیا جہاں باندھے جانے والے سنہری گھنگھر و خون آلود نظر آرہے تھے۔ آفریدی چند لمحوں تک ان پیروں کو دیکھتا رہا جن کی گردش سے کبھی اہل ہوس کے دل کی دنیا زور و زبر ہو جاتی تھی اور اب وہی پائے ستانی کسی خاردار شاخ کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ اہل ہوس کا یہ کاروبار بھی کس قدر سنگدلانہ تھا۔ جسم و جان کے ناجرات کے اندھروں میں گھنگھر وؤں سے ان کی جھٹکار کا سود وصول کرتے اور صبح ہوتے ہوتے انہیں اس لئے توڑ دیتے کہ آئندہ شب میں کوئی دوسری خونریز یا زیب ان کی سوداگری کا نشانہ بننے کی منتظر ہوتی تھی۔ آفریدی جھکا کر لرزے ہاتھوں سے گھنگھر وؤں کو کھولے لگا۔ ”مرنے کے بعد سہی مگر میں نے کچھ ہوس پرستوں کی پستانی ہوئی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ کل تیرے جسم کے ٹکڑوں کو نذر آتش کر دیا جانے

چمک اس طرح کہ تیرے پاؤں میں مجبوری و غلامی کی کوئی لعنت زدہ نشانی نہیں ہوگی پھر میں تیری اس نشانی کو دہلیے جاؤں گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو دوبارہ چوڑاؤں گا اور تیری قوم کی ایک ایک لڑکی کے پیروں سے گھنگھر و کھل دوں گا۔ میں تیری غیم باز آنکھیں دیکھ رہا ہوں تو آنے والوں کا انتظار کر رہی ہے۔ راکھ ہو جانے کے بعد اپنی شبیمیں آنکھوں کو کھلا رکھنا آنے والے ایک دن ضرور آئیں گے۔ انہیں جادوگر رام پور روک سکتا ہے اور نہ یہ اعلیٰ نسل ہوس کے بچاری بس ساوتری! وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ میری ساعوتی میں ان کی آب دار شمشیروں اور گھوڑوں کی برق رفتاری کا شور گونج رہا ہے۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن ٹھوڑے ہیں۔“

ساوتری کی لاش کو مخاطب کر کے آفریدی اپنے بستر کی طرف پلٹا اور اس نے رقصہ کے گھنگھر و اپنے پیرہن کی جیب میں رکھ لئے۔ ”یہ ان مظلوم لڑکیوں کی امانت ہیں جنہیں میں آنے والے وقت کی بارگاہ میں پیش کروں گا جو بہت مہربان اور انصاف کرنے والا ہے۔“

پھر آفریدی بستر پر لیٹ گیا۔ ساوتری کے خون ناحق کے دھبے اس بے داغ چادر تک پہنچے جو شاہی سفیر کے لئے بچھائی گئی تھی۔ آفریدی نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے تصور میں خون کا ایک سمندر موجزن ہو گیا۔ سمندر کی ہر موج کے دوش پر ایک لہو لہان لڑکی کا مردہ جسم تھا اور وہ تمام لڑکیاں ریاست چوڑے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار آفریدی کو محسوس ہوا کہ وہ راج محل کے کمرے کے بجائے کسی قتل میں لیٹا ہے اور اس کا ریشمی بستر پتھر کی ایک قبر بن گیا ہے۔

سوئے والوں کو سولی پر بھی بند آجاتی ہے مگر تمام رات آفریدی کی پلک بھی نہ جھپک سکی یہاں تک کہ صبح ہو گئی پھر آفریدی اس وقت چونک اٹھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور چوڑی لہنے والی چیخ قوم کے کچھ لوگ ساوتری کی لاش اٹھانے کے لئے اندر داخل ہوئے رام دیو کی سفالی اور مسلسل کئی راتوں کی بے خوابی کے سبب آفریدی کا دماغ کسی پھوڑے کی طرح پک رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ کمرے کی صفائی کرنے والوں پر اپنی تمام نفرتیں نازل کر دے مگر یہ ایک کاربے بود تھا۔ وہ تو خود زمانے بھر کے ٹھکرانے ہوئے ستم رسیدہ انسان تھے۔ آفریدی بڑی قوت برداشت کے ساتھ وہ منظر دیکھتا رہا قانون کے محافظوں نے ایک رقصہ کو قتل کر دیا تھا اور اب اس کی لاش کو جلانے کیلئے لے جایا جا رہا تھا۔ عدالتیں بھی قائم تھیں گواہ بھی موجود تھے مگر ساوتری کے خون کا کوئی حساب لینے والا نہیں تھا۔

آفریدی کے ہاتھ بھی دھوئے گئے جو ساوتری کے گھنگھر و کھولنے کی وجہ سے رنگین ہو گئے تھے اور اس چادر کو بھی صاف کر دیا گیا جس پر آفریدی کے خون آلود پیروں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ بڑی مہارت سے رقصہ کے خون کا عکس تک مٹا دیا گیا تھا مگر صفائی کرنے والوں کو یہ راز نہیں معلوم تھا کہ خون آفریدی کے پیرہن کی جیب تک پہنچ گیا ہے۔

جب کہو آئینے کی طرح شفاف ہو گیا تو مہمانسز و کرم سنگھ اس کی عبادت کیلئے آیا آفریدی نے بہت غور سے ریاست چوڑے کے اس عظیم سیاستدان کو دیکھا۔ وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ آفریدی نے بھی اپنا انداز فکر بدل ڈالا اس سے پہلے کہ وکرم سنگھ اس کی مزاح پر سی کرتا، آفریدی خود ہی بول اٹھا۔

”مہمانسز کو یہ مسلسل فتوحات مبارک ہوں۔“ آفریدی کے ہونٹوں پر بھی ایک زہر آلود تبسم رقصاں تھا۔ ”ابھی چوڑ میں اور کتنی مظلوم لڑکیاں باقی ہیں جو شاہی سفیر کے ملاحظے کے لئے پیش کی جائیں گی۔“

”جب تک تمہیں اور تمہارے سلطان کو راجپوتوں کی لازوال قوت کا اندازہ نہیں ہو جاتا۔“ وکرم سنگھ، آفریدی کے قریب ہی بیٹھتا ہوا بولا۔

”طاقتور لوگ اپنی شمشیروں کا استعمال گلاب اور چنبیلی کی چکتی ڈالیوں پر نہیں کرتے۔“ آفریدی نے وکرم سنگھ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”فلاذ صفت حریفوں کے جسم ہی جتا سکتے ہیں کہ اہل چوڑکی کی تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں یا ابھی ان میں کچھ آب باقی ہے۔“

”وقت آنے دو، سر بلند راجپوت تمہیں یہ ثبوت بھی فراہم کر دیں گے۔“ کمرے میں مہمانسزایا قہقہہ بلند ہوا وکرم سنگھ کی یہ روش انتہائی تحقیر آمیز تھی۔

”نہیں مہمانسزی! ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔“ آفریدی، وکرم سنگھ کے دعوؤں کو مسلسل جھٹلاتا ہوا ”مجبور و بے کس عوام پر ناروا و جبر و تشدد نے راجپوتوں کے وقار کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جھوٹے غرور کی دیکھ آپ کی پوری تہذیب کو چاٹ چکی ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔“ آفریدی کی طعنہ زنی میں شرتوں جیسی کاٹ تھی۔

وکرم سنگھ تڑپ اٹھا۔ ”آفریدی! تم اندھے ہو۔ کیا تمہیں اب تک مہاراج رام دیو کی سحرانہ قوتوں کا اندازہ نہیں ہوا؟“

”میں نے رام دیو سے کہہ دیا تھا کہ چوڑ کے حکمرانوں نے سیاسی مسائل کو جاودہ گروں کے حوالے کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ میں آپ سے ایک بار پھر درخواست کروں! کہ مجھے خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کے بجائے رانی پد منی کے حضور پیش کر دیا جائے میری پیغام رسانی میں جس قدر تاخیر ہوئی جائے گی مسائل اتنے ہی الجھتے چلے جائیں گے۔ ساعت انتظار زیادہ طویل ہو گئی تو پھر سلطان کے قہر و غضب کے آگے معذرت کی کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جاسکے گی۔“ آفریدی نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہم نے تمہارے سلطان سے نسبی سفارتی تعلق کی درخواست نہیں کی تھی اور نہ تمہارے بلائے ہوئے مہمان ہو تم نے یہ سفر اپنی غرض سے اختیار کیا ہے اس لئے تمہیں ہر حال میں رانی پد منی کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ میں نے ان سے بات کی تھی لیکن ابھی وہ وقت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، دیے تمہارے زخم بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ انہیں بھرتو جانے دو۔“ وکرم سنگھ نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”میرے زخم بھرنے تک تو براہِ گامہ رہا ہو جائے گا۔ میرے زخموں کی طرف نہ دیکھیں سلطان کی اس بلند اقبال پیشانی کو تصور میں لانے کی کوشش کریں جس پر اب تک بے شمار شکنیں نمایاں ہو چکی ہوں گی۔“

”آفریدی! اپنی زبان کو احتیاط سے جنبش دو۔ تم کسی خراج گزار حکمران سے نہیں ایک آزاد فرمانروا کے مہمانسزی سے مخاطب ہو۔“

”مہمانسزی! میں نے بہت احتیاط سے کام لیا، صبر کی آخری منزل سے بھی گزر کر دیکھ لیا مگر آپ کے تیور سمجھ میں نہیں آتے۔“ آفریدی کے لہجے سے جھنجھلاہٹ آشکار تھی۔ ”اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

”ہم بھی تمہیں کشمکش انتظار سے بچانا چاہتے ہیں۔“ وکرم سنگھ دوبارہ سرد مزاج نظر آنے لگا تھا۔ ”اگر تم اپنے مقصد کی تکمیل چاہتے ہو تو میرے ایک سوال کا جواب دو پھر تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”پوچھئے۔“ آفریدی نے بیزار سی سے جواب دیا۔

”تمہاری شمشیر سے ہلاک ہونے والے وہ مسلمان سپاہی چوڑکی سرحدوں تک کیوں آئے تھے؟“

وکرم سنگھ نے پوچھا۔ اور آفریدی کے جواب دینے سے پہلے ہی اپنے سوال کو آگے بڑھا دیا۔ ”ہم اس راز سے واقف ہو چکے ہیں کہ مقتول سپاہی بھی سلطانی افواج سے تعلق رکھتے تھے پھر یہ مصنوعی جنگ کیوں کی گئی اور تمہی زخمی ہو کر مٹھوک حالت میں ہمارے سرحدی محافظوں تک کیوں پہنچے؟“

”مہمانسزی! آپ اپنا اور میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔“ جب آفریدی نے گریز اختیار کیا تو وکرم سنگھ نے نئی چال چلی۔

”آخر تم ہمارا پی پد منی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”مہمانسزی! جیش یاد رکھو کہ شاہوں کے راز جاننے کی سزا بڑی دردناک ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم بھی کچھ دن زندہ رہو اور مجھے بھی زندہ رہنے دو۔“

کچھ دیر تک کمرے پر سناٹا طاری رہا پھر وکرم سنگھ بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ ”تم میرے کسی سوال کا بھی جواب نہ دے سکے اس لئے تمہیں رانی پد منی کی حضوری کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے وکرم سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے۔“ آفریدی نے بھی اپنی نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر لیا۔ ”اگر رانی پد منی کے پاس سلطان علاء الدین خلجی کا پیغام سننے کے لئے وقت نہیں ہے تو پھر میں بھی چوڑکی سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مدت انتظار ختم ہونے کے بعد دہلی سے کوئی دوسرا سفیر چوڑکی جانب آئے گا تو اپنے ان گمراہ کن خیالات سے فوراً پیچھا چھڑا لیجئے۔ سلطان کی نازک مزاجیاں ان باتوں کی عادی نہیں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی برداشت نہیں کرتے میں نے سلطان کی شاہی لغت میں انتظار کا لفظ نہیں دیکھا۔“ یہ کہتے کہتے علی عامر آفریدی کو بھی محسوس ہوئے لگتا تھا جیسے وہ خود علاء الدین خلجی کی زبان میں بول رہا ہو۔

وکرم سنگھ نے ناپسندیدہ نظروں سے آفریدی کی طرف دیکھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

اس رات بھی آفریدی کے کمرے میں صراحتی بدست رقاہہ بھیجی گئی۔ رام دیو اور وکرم سنگھ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے ان کی مسلسل یہی کوشش تھی کہ کسی طرح آفریدی ایک بار لڑکھڑا جائے یا خوف و ہمت کی پرچھائیاں اس کے دل و دماغ کو گھیر لیں۔ منصوبے نئے نئے انداز سے ترتیب دیئے جاتے تھے مگر آفریدی کا کواڈن ابھی تک برقرار تھا۔ نہ شیشو جام اسے اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے اور نہ ہوش ربا حسن رکھنے والی لڑکیاں اس کے حواس چھین سکی تھیں یہاں تک کہ رام دیو کے تمام جاویدی عمل بھی بے اثر ٹھہرے تھے اور علی عامر آفریدی پہلے سے زیادہ بے باک ہو گیا تھا۔

تقریباً پندرہ دن تک رام دیو کی سفلی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں شاہی سفیر صحت یاب ہو چکا تھا مگر ابھی اسے رانی پد منی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔

رازداری کے ساتھ راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی، وکرم سنگھ سے مشورے کر رہے تھے۔

”مہاراج رام دیو اپنے بہترین ہنر کی نمائش کر چکے مگر شاہی سفیر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔“ مہمانسزی راجہ رتن سنگھ کے سامنے اپنی تمام کارروائیوں کی تفصیلات پیش کر رہا تھا۔ ”علاء الدین خلجی، کا سفیر مہاراجی

کتابوں کو اس کے ایک لفظ نے راجپوت سرداروں اور فوجیوں کے درمیان رانی پد منی کے تقدس کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ سب کچھ تمہاری بے خبری کے باعث ہوا ہے۔ ”راجپوت سنگھ انتہائی عالم جبر میں اپنے لائق ترین مہماننزی کو اس کا گناہ یاد دلارہا تھا۔

”یہ سرگوشیاں صرف راج محل اور وزراء کے اعلیٰ طبقے تک محدود ہیں۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ نہامت آمیز تھا۔ ”یقیناً صورت حال کسی حد تک بگڑ گئی ہے مگر پھر بھی آپ کی علم رعایا کو یہ خبر نہیں ہے کہ سلطانی سفیر یہاں کس لئے آیا ہے؟ وہ بس اتنا جانتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی نے مہاراجہ رتن سنگھ کی طرف صلہ اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ آپ کا یہ خادم بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ بگڑی ہوئی صورت حال کو نیا رخ دے کر عوام کے ذہنوں کو غبار آلود ہونے سے بچالے۔“

”عورتوں کی حد سے بڑھی ہوئی خوبصورتی شہستان محبت کو سیاسی قتل بناتی ہے۔“ راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ ٹھنکے نظر آنے لگا تھا۔ رانی پد منی نے فوراً ہی ایک جام سرخ لبریز کر کے اپنے شوہر کی خدمت میں پیش کیا۔ رتن سنگھ بیشد پد منی کے ہاتھ سے شراب پیتا تھا اس کی دوسری رانیوں کو یہ سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی جب کبھی سیاسی صورت حال الجھ جاتی تو رانی پد منی رات رات بھر راجہ رتن سنگھ کو شراب پلاتی رہتی اور چوڑ کا کمرہ اپنے سرسکون اعصاب کے ساتھ ان مسائل کا حل تلاش کرتا رہتا۔ پد منی کے ہاتھ سے کئی جام پینے کے بعد رتن سنگھ نے مہماننزی کی طرف دیکھا۔

”اب ہمارے سامنے تین راستے کھلے ہوئے ہیں آفریدی کو مسلسل قید میں رکھا جائے یا پھر قتل کر دیا جائے۔ اس طرح ہم اپنی حکومت کے سفینے کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہیں اگر سلطان نے ہم سے اپنے سفر کا حساب طلب کر لیا تو پھر بڑے بڑا سنگین حادثہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو تم کل رات یہ راز جاننے کی کوشش کرو کہ پیغام زبانی ہے یا تحریری؟ میرے خیال میں خصوصی پیغام زبانی نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ امکان موجود ہے کہ آفریدی کے پاس سلطان کا تحریری پیغام موجود ہے اگر ہم وہ پیغام حاصل کر لیں تو شاہی سفیر کو بے دست و پا کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس خفیہ پیغام کی عبارت سے بھی باخبر ہو جائیں گے اور پھر اس کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔“ حالت بے خودی میں بھی راجہ رتن سنگھ کا مشورہ بہت معنی نیز تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن فضا بہت زیادہ پرسکون نظر آرہی تھی۔ مہاراجہ رام دیو کو اطلاع دیدی گئی تھی کہ آج کی رات وہ آفریدی کے کمرے میں نہیں جائیں گے بلکہ آدھی رات کے قریب راجہ رتن سنگھ رانی پد منی اور وکرم سنگھ خود ان کے درشن کو حاضر ہوں گے۔ منصوبے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے گا اس کی خبر چوڑ کی ان تین مستیوں کے دوش کی چوتھے فرد کو نہیں تھی۔ پھر جب شام ہوئی تو آفریدی کے لئے کھانا بھیجا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی سلطان کے سفیر کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کی طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی ہے۔ آفریدی نے اس تبدیلی پر کوئی ردیہا نہیں دیا وہ اسے طبیعت کی سستی سمجھتا رہا اور کچھ دیر بعد بے ہوشی کی دوا نے اس کے حواس بھین لئے جب آفریدی اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو گیا تو حافظ سپاہی اسے اٹھا کر آشرف محل سے گئے۔ آفریدی کو بے ہوش دیکھ کر رام دیو راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی کے ہونوئی پر مسکراتے ہوئے امر آئی پندیدہ شکار بڑی بے دست و پا حالت میں ان کے سامنے لا گیا تھا۔

”اسے یہاں ڈال دو۔“ رام دیو نے تحقیر آمیز لہجے میں سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ رام دیو نے جس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا وہ لکڑیوں کی بنی ہوئی ایک بلند جگہ تھی جو گیندے کے پھولوں کی کثرت سے

سے کس لئے ملنا چاہتا ہے؟“ آخر راجہ رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ کئی دن سے اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آج وہ خاموش نہ رہ سکا اور وکرم سنگھ پر برس پڑا۔

مہماننزی سر جھکائے کھڑا تھا۔ ”میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح میرے سامنے کھل جائے۔ وکرم سنگھ بہت آہستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ”میں سارے خربے استعمال کر چکا ہوں۔ مگر وہ یہی کہتا ہے۔“ سلطان کا پیغام صرف مہارانی پد منی کے لئے ہے۔“

راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر اپنی خوبصورت شریک حیات کی طرف دیکھا۔ رانی پد منی کا چہرہ غصے سے ہو گیا تھا۔ وہ ایک نامحرم کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ فوراً ہی بولی۔ ”اس کی زبان کاٹ کر پھینک دو یا پھر اس حالت میں دہلی واپس بھیج دو۔“

”نہیں مہارانی! ہمیں سلطان کا پیغام سننا ہی ہو گا۔“ وکرم سنگھ نے ادب کے ساتھ رانی پد منی سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”علاء الدین خلجی طاقت کا وہ طوفان ہے جس کے اثر سے مضبوط ترین سنگھیں خس و خاشاک کی مانند اڑی جا رہی ہیں۔ یہ بات خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر ہمیں ان سرکش ہوا کے صحیح رخ کا اندازہ کرنا ہو گا ورنہ چوڑ کا ایک ایک چراغ بجھ جائے گا۔“

”یہ راز تمہارے علاوہ کس کو معلوم ہے کہ دہلی کا سفیر رانی پد منی کے لئے خفیہ پیغام لے کر ہے؟“ راجہ رتن سنگھ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”راج محل کے کبھی نوایں اس راز سے واقف ہیں۔“ وکرم سنگھ اس حقیقت کو چھپانا چاہتا تھا کہ طرح رانی پد منی کے رسوا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

”آخر ایسا کیوں ہوا؟“ راجہ رتن سنگھ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور چیختے ہوئے بولا ”کیا؟“ تمہیں اسی دن کیلئے وزارت عظمیٰ کا منصب بخشا تھا کہ تم گہری نیند سو جاؤ اور راج محل کے راز بند کرو اور نکل کر چوڑ کی سہاڑوں میں گونجنے لگیں۔“

راجہ رتن سنگھ کے اس سوال پر وکرم سنگھ کا چہرہ فق ہو گیا مگر وہ ایک مضبوط اعصاب کا انسان تھا۔ نے اپنے آپ کو نکھرے نہیں دیا۔ ”مہاراجہ میں نے اس راز پر گہرا پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر راز رقرار میرے ارادوں سے زیادہ تیز تھی۔“ وکرم سنگھ بہت محرا اعتماد لہجے میں بول رہا تھا۔ ”جب“ سرحدی محافظوں نے ایک زخمی نوجوان کو نیم بے ہوشی کے عالم میں پایا تو وہ بار بار چیخ رہا تھا کہ میں علاء خلجی کا سفیر ہوں مجھے رانی پد منی کے حضور لے چلو۔ میں چوڑ کی حکمران کے لئے سلطان کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ الفاظ ہمارے کئی سپاہیوں نے سنے اور پھر بات پھیلنے چلی گئی۔ علاء خلجی کا سفیر انتہائی مشکوک اور ہنگامی حالت میں یہاں تک پہنچا تھا۔ میرا ذہن حادثہ کی تیز الجھا رہا۔ اور چوڑ کے سپاہی اشاروں کنایوں میں راز ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہے۔ ان کی آج بھی خاموش ہیں مگر نگاہیں سلطان کا وہ مخصوص پیغام جاننے کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔“

”تم راجپوت سپاہیوں کی بے چینی کا مطلب سمجھتے ہو وکرم سنگھ؟“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”کچھ دن پہلے گجرات میں یہ شرمناک واقعہ رونما ہو چکا ہے کہ راجہ کرن کلکتہ کھا ہو گیا اور اس کی بیوی کلا دیوی مسلمان ہو کر سلطان کے حرم میں داخل ہو گئی۔ سلطان کا یہ خصوصی بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے دہلی کا حکمران چوڑ کے راجپوتوں کے چروں پر سپاہی مل دینا چاہتا ہے۔ فوجوں نے ابھی تک گردش نہیں کی لیکن سفیر بھیج کر سلطان نے ہماری عزت و ناموس پر بلیا کر دی تم بار بار یہ جاہلانہ تبصرہ کرتے رہتے ہو۔ علاء الدین کا سفیر مشکوک حالات میں یہاں تک پہنچا ہے

زرد نظر آ رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ آگے بڑھا اور رام دیو سے عرض کرنے لگا۔ ”مہاراج! یہ ہمارے دشمن کا ایک خوذہ پیغام لے کر آیا ہے۔ اگر وہ پیغام کسی طرح ”پر جا“ کے سامنے سنا دیا گیا تو آپ کے سامنے والوں کی رسوائی ہوگی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گیان سے اس پیغام کی حقیقت معلوم کر لیں۔ پرتائیں کہ وہ زبانی پیغام ہے یا تحریری؟“

مہاراج رام دیو نے رتن سنگھ کا سوال سن کر پہلے تو بھڑکتی ہوئی آگ میں مٹی بھر لوہان ڈالا اور جب دھوئیں سے بھر گیا تو پھر آفریدی کے سینے پر اپنی پانچوں انگلیاں رکھ کر چند ناموں کلمات پڑھے اور گرا

آواز میں کہا۔

”پاپی! اسی میں میری گشتگتا (سلاشتی) ہے کہ تو اپنے من کا بھید کھول دے اور صاف ما بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے؟“ رام دیو کا یہ جادوئی عمل سائنسی دور کے عمل تو خیم سے مشابہ تھا۔ موجودہ تمام لوگ سمجھ رہے تھے کہ رام دیو کی پہلی ہی ہدایت پر آفریدی زبان کھول دے گا مگر بار بار ایک ہی کو دہرانے کے باوجود علی عامر آفریدی کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوسکی۔ جادوگر رام دیو کو ایک مرتبہ ایک مسلم نوجوان نے شکست دیدی تھی۔ رام دیو شدید ہتھیلا ہٹ کا شکار ہو گیا۔

”بڑا پاپی ہے، بڑا پاپی ہے۔“ رام دیو اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ پھر اچانک راجہ رتن سنگھ سے مخاطب کہنے لگا۔ اس کے پاس کوئی زبانی پیغام نہیں۔ یہ جو کچھ لایا ہے وہ تحریری شکل میں کہیں موجود ہے تم تلاش کر لو۔ کامیابی حاصل ہوگی۔“

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی رام دیو کے اس انکشاف کے بعد بہت خوش تھے۔ رتن سنگھ نے فوراً سنگھ کو حکم دیا کہ وہ شاہی سفیر کی باریک بینی سے تلاشی لے۔ وکرم سنگھ نے اپنے فرمانروا کی ہدایت کے آفریدی کے لباس کا ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالا مگر وہاں کوئی شاہی دستاویز موجود نہیں تھی پھر جب راجہ سنگھ اور رانی پدمنی کے چرسے گہری اداسیوں میں ڈوبنے لگے تو وکرم سنگھ اچانک بہت زیادہ خوش نظر آ لگا۔ آفریدی کے پیڑ بہن میں کسی ٹھوس چیز کی موجودگی ان کے خوابوں کی تعبیر پیش کر رہی تھی۔ مگر وکرم سنگھ کا ہاتھ باہر آیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں وکرم سنگھ کے ہاتھ میں دو خون ہتھکڑ تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ حیرانی سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ راقصہ ساوتری کے پیروں کے ہتھکڑ ہیں جو کچھ دن پہلے آفریدی کے کمرے میں قتل کر دیا تھی۔ اور اس کا یہ جرم تھا کہ وہ شاہی سفیر کے سامنے اپنے حکمرانوں کی تذلیل کر رہی تھی۔“

”یہ ہتھکڑ وہ لہ کا کیا کرے گا؟“ راجہ رتن سنگھ کی حیرت برقرار تھی۔

”ہمارے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق یہ احمق نوجوان ساوتری کے ہتھکڑ ولے جا کر اپنے سلطان بارگاہ میں پیش کرے گا اور انہیں بتائے گا کہ چوتھیں انسانوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جارہے ہیں وکرم سنگھ نے اپنے حکمران کے سامنے آفریدی کی وحشت و دیوانگی کی تفصیلات پیش کیں۔

”مجھے کسی اچھوت راقصہ کے ہتھکڑ نہیں علاء الدین خلجی کی وہ دستاویز چاہئے جو غیور راجپوتوں نے زندگی اور موت کا سلسلہ بنی ہے۔“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ قہر و غضب میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وکرم سنگھ کوئی جواب دیتا رام دیو کی مکروہ آواز سے رات کا سناٹا بھرجو ہو گیا۔ شاہی دستاویز لے کر نہیں آیا ہے۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے زبانی پیغام کی شکل میں ہے اس پر تشدد

ہوئی ہی دیر میں زبان کھول دے گا۔“ رام دیو کے لہجے میں آفریدی کے لئے بدترین نفرت موجود تھی۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور مہانتزی حیرت زدہ نگاہوں سے رام دیو کی طرف دیکھ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مہاراج کی کس بات کا اعتبار کریں۔ رام دیو نے پہلے کہا تھا کہ آفریدی زبانی پیغام لے کر آیا ہے۔ جب وہ متنوں کی شہتی سے سلطان سیفر کی زبان نہ کھلوا سکے تو کہنے لگے کہ اس کے پاس اپنی تحریری دستاویز موجود ہے بہت دیر کی تلاشی کے بعد جب ہتھکڑ وہاں کے سوا کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا تو ام دیو نے ایک بار پھر اپنا بیان پلٹ دیا۔ اس کی یہ حرکت کسی سیاستدان سے کم نہیں تھی۔

”مہاراج ہم تو آپ کی ایک بات بھی نہیں سمجھ سکے۔“ بالآخر رتن سنگھ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے

کہا۔ ”مجھے تو یہ خود بھی کوئی جادوگر معلوم ہوتا ہے۔“ رام دیو بڑی بے حیائی کے ساتھ بول رہا تھا۔ ”اس نے اپنی سحرانہ قوتوں کا سہارا لے کر علاء الدین خلجی کے پیغام کو کہیں ایسی جگہ چھپا دیا ہے جسے کوہجنے کے لئے ہمیں کھن جوہر کرنا پڑے گا۔ تم لوگ اسے ایک رات کے لئے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ آنے کی صبح میں روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ یہ سب کچھ اگل دے گا۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے آپ کا داس بن گئے گا۔ مجھے ایسے ٹیڑھے جانور کو سدھارنا خوب آتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے رام دیو کی مخمور سرخ آنکھیں توں سے باہر نکل آئی تھیں اور کانوری شمعوں کی روشنی میں بڑا بھیاں بھیاں منظر پیش کر رہی تھیں۔

راجہ رتن سنگھ اور مہانتزی وکرم سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا تھا ابھی وہ دونوں حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے تھے کہ چند سپاہی مہاراج رام دیو کے آشرم کے دروازے پر نمودار ہوئے۔

”ہم نے رات دوت کے گھوڑے کی زین کو ادھیر کر دیکھ لیا ہوا ابھی کوئی کاغذ موجود نہیں۔“ ایک سپاہی نے بلند آواز میں راجہ رتن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک ہی کاغذ ہاتھ آیا ہے جو اس کے نیچے کے نیچے موجود تھا۔“

سپاہی کے الفاظ کی گونج ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ وکرم سنگھ دوڑتا ہوا آشرم کے دروازے تک پہنچا اور سپاہی کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھنے لگا۔ حالت اضطراب میں راجہ رتن سنگھ بھی مہانتزی کے پیچھے چکا تھا۔ ”کیا یہ وہی پیغام ہے؟“ رتن سنگھ کسی بچے کی طرح وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

”نہیں مہاراج! یہ تو علی عامر آفریدی کے شناختی کاغذات ہیں جن سے اس کے شاہی سفیر ہونے کا پتہ فراہم ہوتا ہے۔“ وکرم سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

”ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اس کے پاس کوئی تحریری پیغام موجود نہیں۔ رام دیو بھی منکرانہ انداز میں ہوا اور راجہ رتن سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر تم لوگ پریشان کیوں ہو؟ بس ایک رات ہی کی تو بات مہاجرہ راج دوت آپ کی آنکھ کے اشاروں پر ناپے گا۔“

رام دیو کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر وکرم سنگھ، راجہ رتن سنگھ سے سرگوشیوں میں مخاطب ہوا۔ ”میری درخواست ہے کہ آفریدی کو ایک لمحے کے لئے بھی مہاراج کے حوالے نہ کیجئے گا۔ مہاراج کو اس کی زندگی سے شدید نفرت ہے اور یہی نفرت شاہی سفیر کی زندگی کا بھی خاتمہ کر سکتی ہے۔“ وکرم سنگھ نہایت یقین سے کہہ رہا تھا۔ وہ مہاراج رام دیو کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اپنی بات ختم کر لینا چاہتا تھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ مہاراج، آفریدی پر تشدد کے حربے آزمائیں گے اور پھر یہی تشدد ہماری زندگی کے خلاف مسلے کوئی طرح اٹھاتا کر دے گا۔“

جیسی وکرم سنگھ کی بات ختم ہوئی رام دیو، راجہ رتن سنگھ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

”اب آپ لوگ سکھ کی نیند سو جائیں۔“ مہاراج رام دیو اپنے ہونٹوں پر ایک خبیث مسکرائے ہوئے بڑے سفاکانہ انداز میں بول رہا تھا۔ ”بس ایک رات ہی کی قیامت ہے۔ بھور ہوئے سورج دیتا تو اپنے درشن دیں گے تو آپ کا کام ہو چکا ہو گا یہ ٹپھ جو اس سے مون (خاموشی) مار ہے کل اس دشمن نہیں پایا جائے گا۔“ رام دیو نے علی عامر آفریدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب یہ ندرا (نیند) سے جاگے گا تو رام رام کرتا شے گا اور اپنا سارا دھرم کرم بھول جائے گا۔ راجہ رتن سنگھ نے بہت کوشش کی کہ وہ علی عامر آفریدی کو راج محل میں واپس لے جائے مگر رام مانا۔ اور چوڑ کا حکمران اس جادوگر کے سامنے مجبور نظر آنے لگا۔ پھر رام دیو نے اپنے شاگرد خاص شیوا کو طلب کر کے کہا۔ ”اپنی ساحرانہ قوتوں سے اس بچے نشتر کرو۔“

شیوانے بے ہوش آفریدی پر کئی منتر آزمائے مگر شاہی سفیر کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہو سکا شیوانے اپنے کروے کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! آپ کا یہ داس بھی ناکاہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ناویدہ طاقت اس کی مدد کر رہی ہے اور یہ خود بھی کوئی بڑا جادوگر ہے۔“ شیوانے جس ناویدہ طاقت کا ذکر کیا تھا، وہ محض تائید نہیں تھی۔ رام دیو اور شیوا نہیں جانے علی عامر آفریدی حافظ قرآن تھا۔ اس لئے شاہی سفیر بدترین جادو بھی اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے شاگرد کی ناکامی دیکھ کر رام دیو پر وحشت طاری ہو گئی۔ پھر اس نے علی عامر آفریدی کو قتل کے لئے نشتر اٹھایا۔ ”مہاراج! اسے قتل نہ کیجئے گا۔ یہ دلی کاراج دوت (سفیر) ہے۔“ شیوا چیخنے لگا۔ مگر جنون طاری تھا۔ چوڑ کا درندہ علی عامر کو قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن اچانک اس کا ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ نشتر چمک رہا تھا۔

”شیوا! میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا؟“ رام دیو پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ”مہاراج! اسے جانے دیں۔ مجھے ایک نامعلوم خطرے کی آہٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ شیوا بار پھر اپنے گرو سے درخواست کی۔

مسلسل ناکامیوں نے رام دیو کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ اس نے شیوا کو حکم دیا کہ وہ لڑ کر کے آگ بھڑکائے اور آفریدی کے جسم کو خونخوار شعلوں کے حوالے کر دے۔ شیوا اگر وہ آگے مجبور تھا۔ پھر جیسے ہی آگ بھڑکائی، ایک تیز ہوا چلنے لگی اور جلتی ہوئی لکڑیاں رام دیو پر سے اس کا پورا چہرہ جھلس کر رہ گیا۔ ”شیوا! یہ سب کچھ کیا ہے؟“ رام دیو کسی ذبح والے جانور کی طرح چیخ رہا تھا۔

”اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم شنیاسی آندپال سے مدد لیں۔“ شیوانے اپنے گرو کا دیکھ کر کہا۔ ”آندپال کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ راج دوت کن طاقتوں کے زیر اثر ہے؟“ شنیاسی آندپال ایک تارک الدلیا اور انتہائی شریف النفس انسان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رام دیو شخص شنیاسی سے نفرت کرتا تھا۔ مگر مجبوریاں اسے آندپال کے دروازے تک لے گئیں۔ رام کے ہمراہ شاہی رتھ میں بیٹھ کر ”جین“ کے سات مندروں سے گزرتا ہوا ”کمبھ شام“ پہنچا۔

شیوا بچے دل کے ساتھ رتھ سے نیچے اترا اور مندر میں چلا گیا۔ بیشتر پجاری زمین پر پڑے سو رہے تھے مگر کوئی دور کا مارا جاگ رہا تھا اور اپنے گھنٹیاں کو پکار رہا تھا۔ شیوانے اسی جاگنے والے سے شنیاسی آندپال بارے میں پوچھا۔ پجاری نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ شنیاسی جی اسی کمرے میں رات بند پڑے رہتے ہیں، کبھی کبھی باہر نکلتے ہیں۔ اتفاقاً کسی شخص سے بات کر لیتے ہیں ورنہ ان کے دشب خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزر جاتے ہیں۔ رام دیو نے تو اپنے تکبر کے نشے میں آندپال کی بات کو جھٹلایا مگر شیوا اس رحم دل شنیاسی کے مقام سے کچھ کچھ واقف تھا۔ اس لئے ڈرتا ہوا آگے اور پھر آہستہ سے آندپال کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آندپال جاگ رہا تھا۔ شنیاسی چاہا کہ وہ دستک کا جواب نہ دے مگر یہ سوچ کر کہ آدھی رات کو دشوار ترین راستے طے کر کے آنے والا دھمی انسان بھی ہو سکتا ہے۔ یہی سوچ کر شنیاسی اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ایک دروازہ قامت سیاہ و جوان آندپال کے سامنے کھڑا تھا۔ شیوا کی صورت دیکھ کر شنیاسی نے کراہیت محسوس کی تھی مگر وہ اپنی باخلاقیت سے مجبور تھا۔

”میرے بچے! تم کون ہو اور اتنی رات کیوں کیا ہوا ہے؟“ آندپال کی آواز دل موہ لینے والی تھیوانے ہاتھ جوڑ کر شنیاسی کو پر نام کیا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میں مہاراج رام دیو کا شیوا ہوں۔ مہاراج مندر سے باہر رتھ میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ رام دیو کا نام سنتے ہی شنیاسی کے بزرگ اور معصوم چہرے پر نفرت و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ ام دیو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں مانوتا (انسانیت) پرستم و حسانے والے ہتھیاروں (قاتلوں) نہیں ملتا۔ اسے جب راجاؤں کے تلوے چاٹنے سے فرصت مل جائے تو پھر ادھر کا رخ کرے۔ اس سے میں اس کا چہرہ دیکھنا بھی پاپ سمجھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر شنیاسی آندپال نے دروازہ بند کر لیا۔

رام دیو کو مجبوراً طاقت کی بھیک مانگنی پڑی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شنیاسی آندپال ایک بڑا سادھو ہے انے زندگی بھر اپنے دیوتاؤں کی بے لوث عبادت کی تھی۔ سخت مجاہدات کئے تھے اور وہ (ہندو مذہب اعتبار سے) روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اسے حکمرانوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ امراء اور اہم کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس لئے راجہ رتن سنگھ نے اس پر چوڑ کی سماجی زندگی کے راستے بند کر دیئے تھے۔ وہ مستقل طور پر مختلف مندروں میں پڑا رہتا تھا۔ شنیاسی آندپال کی عمر اب ستر باس کے قریب ہو چکی تھی۔ وہ تہجد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ چوڑ کے کئی اعلیٰ نسل برہمنوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کی لڑکیوں سے شادی کر لے مگر آندپال ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کرتا تھا۔ ”میں نے مار کو تیاگ دیا۔ اب باپا مہ کے راستے پر میرے قدم دوبارہ نہیں اٹھیں گے۔“ آندپال زندگی کے ان لمحات میں انتہائی سخت گیر انسان تھا۔ چوڑ کی بے شمار عورتیں اس کے پاس اپنی ہزاروں مرادیں لے کر آتیں مگر وہ کسی بھی عورت سے ملنا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کسی غم زدہ عورت کی سناٹ کا سامنا نہیں کیا۔ اس طرح آندپال ”مرد بیزار“ سے زیادہ ”عورت بیزار“ نظر آتا تھا۔ سخت ریاضت نے آندپال کو انتہائی نڈر اور سبک باک بنا دیا تھا۔ وہ کھلے الفاظ میں راجپوتوں کے نظام ست اور جبر و تعدد پر کٹھن چینی کیا کرتا تھا۔ بالآخر راجہ رتن سنگھ نے ایک فرمان جاری کر دیا تھا جس کے تحت ہمال دور دراز کے مندروں میں زندگی گزار سکتا تھا۔ ان حدود سے نکلنا اس کیلئے ایک سنگین جرم ٹھہرا

تھا۔ راجہ کا معتوب ہونے کے باعث کوئی درباری آئندہ پال سے نہیں ملتا تھا۔ مگر آج رام دیو کی اسے ایک ایسے شخص کے پاس کھینچ کر لے آئی تھیں جو سرزمین چوڑ پر سب سے زیادہ سچ بولے تھا۔ جس سے لوگ ڈرتے تھے اور وہ خود لوگوں کی منافقانہ زندگی کا مذاق اڑاتا تھا۔

رام دیو اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ آئندہ پال ایک بہت بڑے جوگی امپال کا بیٹا ہے۔ امر بیٹے آئندہ پال سے بھی زیادہ صادق القول اور بے باک تھا پھر یہی سچائی اور بے باکی اس کی موت کا سر تھی۔ راجہ رتن سنگھ کے باپ راجہ سر سنگھ نے حکومت وقت پر کڑی تنقید کرنے کے جرم میں امپال کو راجہ کا تھالا وقت آئندہ پال کی عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مرتے وقت امپال نے ان الفاظ میں نصیحت کی تھی۔

”بیٹے! میں کوئی نانا انسان نہیں ہوں جو اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی بے فنا کے راستے پر جا چکے ہیں۔ آج جو لوگ میری جان لے رہے ہیں انہیں بھی ایک دن اسی راہ پر بے شک! میں تمہیں دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں نہیں دے سکا مگر پھر بھی ایسی چیز دے کر پر لوگ دنیا) جا رہا ہوں جس کے سوا سنار میں کوئی دوسری شے زندہ رہنے والی نہیں ہے۔ ایک باپ! سچائی سے بڑی جاگیر نہیں دے سکتا۔ سچ ہی حقیقت ہے اور سچ ہی امر ہے۔ میں جس کو زندگی بھر دھم پتھروں میں نہیں کہیں اور چھپا ہے۔ تم بھی آخری سانس تک سچ بولتے رہنا۔ شاید تمہاری سچائی ہو کر کسی دن وہ تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے۔“ اس نصیحت کے بعد راجہ سر سنگھ کے باپ جوگی امپال کو قتل کر دیا تھا۔ باپ کو خون میں نہاتا ہوا دیکھ کر آئندہ پال بہت رویا تھا اور پھر اسے پرستوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ عالم شباب میں راجہ رتن سنگھ کے اشارے پر چوڑ کی خوبصورت عورت آئندہ پال کو گمراہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر وہ فریب حسن کے جال سے سلامتی کے ساتھ نکل کے بعد کئی مواقع پر راجہ رتن سنگھ نے اسے آزمائش کی کوشش کی تھی لیکن آئندہ پال ہر امتحان اور آزمائش ثابت قدم ٹھہرا تھا۔ انجام کار راجہ رتن سنگھ نے اسی میں عافیت سمجھی کہ آئندہ پال کو شہری زندگی کر کے پہاڑی مندروں میں محصور کر دے۔

سنیاسی آئندہ پال کو تھائی کی زندگی بسر کرنے کرتے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ آج چوڑ کے سب شعبہ باز کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔ آئندہ پال اپنی اسی خوشی کیلئے رام دیو سے پوچھ رہا تھا کہ تیرا ایک ہاتھ مفلوج کیوں ہو گیا ہے اور چہرے پر جلے ہوئے زخموں کیسے ہیں؟

رام دیو نے انتہائی حالت جبر میں اپنی ناکامیوں کا قصہ سنایا اور سنیاسی کے پاؤں چھونے کے لئے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ پال! اہل چوڑ اور راجہ رتن سنگھ کے سامنے مجھے بے آبرو ہونے نہیں اس کی آؤ شکست (ضرورت) نہیں۔“ آئندہ پال نے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ ”تیرے کی ایک ہی دوا ہے کہ تو اپنے ہاتھ سے اس راجہ دوت کے پاؤں چھو لے جو تیرے آشرم میں ہے۔“

”سنیاسی!“ رام دیو چیخ اٹھا۔ ”میں تیرے گیان کے پاؤں چھو رہا ہوں، کسی ٹھہ یا اچھے نہیں۔“

”اپنی دھونی (آواز) نیچ کر رام دیو۔“ سنیاسی آئندہ پال بھی اپنی حقیقت کی طرف اشارہ دیتے والا جو کچھ دے بھکاری کو شیش (سر) جھکا کر سونیکار کر لینا چاہئے۔“

رام دیو فوراً ہنصل گیا۔ اس کی آنکھوں میں گدگداری کا وہ رنگ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ ”اس طرح تو یہ بھیجی جی جان لے گا کہ راجہ دوت کون ہے؟“ آئندہ پال نے بیزار لہجے میں کہا اور منہ لیا۔ ”بس اب جا، میری آنکھوں سے اوجھل ہو جا۔“

رام دیو اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں جا رہا ہوں۔ آئندہ پال! تیرا بہت بہت دھنیواد (شکریہ) میں پھر آؤں گا۔“

”نہیں! بس یہی نہیں۔“ آئندہ پال نے مڑ کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ ”اب کے آئے گا تو میں کو اڑ بھی کھولوں گا۔“

”تیری کرپاہوگی سنیاسی! بس ایک اور الجھن دور کر دے۔“ رام دیو نے کسی حریف بھکاری کی طرح پال کے سامنے اپنا کھنڈل پھر بڑھا دیا تھا۔

آئندہ پال خاموش تھا مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رام دیو کی بات سننے کے لئے آمادہ ہے۔ ”میرے سارے منہ پر بھارت (غیر موثر) کیوں رہے؟“ رام دیو، آئندہ پال سے پوچھ رہا تھا۔

”میں نے نہ ہونے دے تو بھی راجہ دوت کی سرکشا (حفاظت) کون کر رہا تھا؟ میرے یہ منہ تو وہ تھے جن کا ار میں کوئی تڑپ نہیں۔ پھر وہ کون تھا جس نے سب کچھ کاٹ کر رکھ دیا۔“

رام دیو کا سوال سننے ہی آئندہ پال گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سنیاسی اپنے ن (مراٹھے) میں تھا۔ اس کے چہرے پر مسلسل کئی رنگ ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سر کو فنی میں جکڑ دیتے ہوئے کہا۔

”میری سچائی راجہ دوت کے چہرے تک ہے۔ جب اس کے دل کی طرف دیکھتا ہوں تو آنکھوں کے اندر میرے کی ایک دیوار کھینچ جاتی ہے۔ پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اندھا ہو جاتا ہوں۔“

”سنیاسی ایک عجیب سے عالم میں بول رہا تھا۔“ دلی سے آنے والے راجہ دوت کا دل ایک بند ی ہے۔ میں اسے کھولنے کی شکتی نہیں رکھتا شاید مائی بھان متی کھول سکے اب مائی کا گیان ہی ہماری مایا۔ شاید ایسا ہو جائے۔ مگر نہیں!! ایسا نہیں ہو سکتا۔ بس تو یہاں سے چلا جا۔“ سنیاسی آئندہ پال پر تکی طاری تھی۔

رام دیو نے گہرا کر آئندہ پال کی طرف دیکھا۔ وہ چٹائی پر اپنی انگلی سے آڑے تیرے نشان بنا رہا تھا۔

”نہاں متی۔“ رام دیو نے اس نام کو دل ہی دل میں دہرایا اور دروازہ کھول کر تیرے قدموں سے باہر نکل آیا۔

آشرم پہنچ کر رام دیو نے اپنا ہاتھ علی عامر آفریدی کے کٹوؤں سے مس کیا اور اس کا مفلوج ہاتھ پہلے کی حرکت کرنے لگا۔ رام دیو بہت خوش تھا مگر ساتھ ہی ساتھ شامی سفیر اور سنیاسی آئندہ پال کو گالیاں بھی رہا تھا۔ ”میری یہ شکست عارضی ہے۔ میں عنقریب تم دونوں سے بھیانک انتقام لوں گا۔“

پھر اس کے بعد رام دیو نے سچ سے ذرا پہلے آفریدی کو اس کے کمرے میں پھنچا دیا۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن راجہ رتن سنگھ نے رام دیو سے پوچھا۔

”مہاراج! کیا آپ نے دلی کے راجہ دوت پر قابو پا لیا؟“ راجہ رتن سنگھ بڑے حسرت آمیز لہجے میں رہا تھا۔ ”سلطان کا وہ گہمت سندیش (غنیہ پیغام) کیا ہے؟ ہمارے دچار میں تو آپ نے اب تک دوت کا دھرم بھی بدل ڈالا ہو گا۔“

”نہیں! راجپوت سمرات! میں ایسا نہیں کر سکا۔“ رام دیو کے لہجے سے ندامت کا اظہار ہوا۔
”راج دوت ایک بڑا جاودگر ہے جس پر قابو پانا تامل نہیں ہے۔“
”پھر؟“ راج رتن سنگھ سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا تھا۔

”راج دوت یا اس کے سلطان سے ہمیں اتنا خطرہ نہیں جتنا گھر کے بھیدیوں سے ہے۔“ را
عیاریوں کا کاروبار شروع ہو گیا تھا۔

”مہاراج! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ رتن سنگھ اس انکشاف پر وحشت زدہ سانپڑے آنے لگا تھا۔
”یہ گھر کے بھیدی آپ کی انکا کوڑھا دینا چاہتے ہیں۔“

”وہ کون پائی ہیں، مہاراج!“ شدت غضب میں راج رتن سنگھ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تو
”میں نے گرجن کی اس رات کو بیکار نہیں گنوا یا ہے۔ سمرات! میں نے آپ کیلئے چوڑ کیلئے
راجپوتوں کیلئے اپنے چہرے کا بلیڈن دیا ہے۔“ یہ کہہ کر رام دیو نے اپنے چہرے پر لپٹی ہوئی۔
ہٹادی۔ راج رتن سنگھ اور مہمانزئی، رام دیو کا جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ کیا ہوا مہاراج؟“ رتن سنگھ اور وکرم سنگھ بیک وقت بولے۔
”آپ کی آن پر میں نے اپنے برائوں کی بی (قرانی) چڑھا دی تھی۔ بھور ہوتے ہی آپ کو آ
میرا مردہ جسم نظر آتا۔ وہ تو دیوتاؤں کی کرپاتی کہ کیل (صرف) میرے کچھ پر ہی یہ آتی (آفت)

پڑی۔ ورنہ پورا شیر جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔ میں راج دوت کے دل پر اپنا منتر آزمایا تھا کہ آگ
سامنے اچانک ”کبچہ شام“ کا مندر ابھر آیا اور پھر مندر کے ایک کمرے میں آندپال کا
دینے لگا۔ یہ بڑی انوکھی بات تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے راج دوت کو چھوڑ دیا اور

(گناہ گار) کے بارے میں سوچنے لگا جو سمرات کے سارے پر پوار کو نشٹ بھرشت (تباہ و برباد)
چاہتا ہے۔ میں پلٹ پڑا اور آدھی رات کو آندپال کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنی شتی کے بل
جلا دیا۔ پھر ایک بڑی لڑائی کے بعد میں نے اسے اجیت (بے ہوش) کر دیا۔ بے سدھ ہو

لگا۔ ”سلطان علاء الدین خلجی چوڑ کی بنیادیں اکھاڑ پھینکے گا۔ رانی پدمنی کا بڑا ایمان
راج رتن سنگھ کو بندی (قیدی) بنالیا جائے گا۔“ اتنا کہہ کر رام دیو خاموش ہو گیا اور راج
کے چہرے پر اپنے جھوٹ کا رد عمل تلاش کرنے لگا۔

”بہت ہو چکا۔“ راج رتن سنگھ جذبات سے مغلوب ہو کر چیخنے لگا۔ ”ہم سے بڑی بھول ہو
پانی کے پران نہیں چھینے۔ پتائی ٹھیک ہی کہتے تھے کہ شترو کو گھات لگانے کا دوسرا دوسرا (موقع)

چاہئے۔ پھر بھی وہ بھاگ کر کہاں جائے گا۔ ہمارے ہاتھ سب سے لمبے ہیں اور ہماری تلوار کی چکا
بھی ڈرتی ہے۔ ہم آندپال کو ایسی سزا دیں گے کہ اس کے باپ کی آتما بھی کانپ اٹھے گی۔“
رتن سنگھ، مہمانزئی سے مخاطب ہوا۔ ”وکرم سنگھ! آندپال کو ”کبچہ شام“ کے مندر سے کچڑ
کے آشرم میں لے آؤ۔ آج رات ہم اس کی موت کا جشن منائیں گے۔“

☆ ☆ ☆

راج رتن سنگھ کا حکم سنتے ہی مہمانزئی اس مخصوص کمرے سے باہر نکلا اور اپنے گھر کی
ہو گیا۔ وکرم سنگھ کا مکان راج محل کے درمیانی حصے میں واقع تھا۔ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے
کے ذہن میں ایک شہر سا پاتا تھا اور سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ ذاتی طور پر سیاسی آند
احترام کرتا تھا اور آج وہی محترم شخصیت راج رتن سنگھ کے قہر و غضب کا نشانہ بن کر دنیا سے رخصت

والی تھی۔ وکرم سنگھ کسی ملازمہ یا خادمہ سے کچھ کہے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر دراز
وکرم سنگھ کی آمد نے آندپال میں ایک پاپل سی بچادی تھی۔ آندپال وکرم سنگھ کے مکان کا نام
ہو گیا۔ وکرم سنگھ کی برہنہ و آسائش موجود تھی۔ وکرم سنگھ ایک خاندانی راجپوت تھا۔ اس کے بزرگ
تھامس میں واقعتاً دنیا کی برہنہ و آسائش موجود تھی۔ وکرم سنگھ ایک خاندانی راجپوت تھا۔ اس کے بزرگ
صدیوں سے حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز چلے آ رہے تھے۔ رانی پدمنی اس کے حقیقی بڑے بھائی
کی بیٹی تھی۔ رانی چوڑ کا کچا ہونے کے باعث اس کے اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہوشمند
اور مدبر وزیر اعظم تھا۔ اس نے بیشتر مواقع پر اپنی فطری ذہانت سے کئی گڑے ہوئے کام سنوارے تھے لیکن
جب سے سلطان علاء الدین خلجی کا سفیر چوڑ آیا تھا اسی دن سے مسائل اچھٹے جا رہے تھے۔ اور آج
وکرم سنگھ کے لئے ایک اذیت ناک مرحلہ آپہنچا تھا۔

”کیا میں حاضر ہو سکتی ہوں؟“ کمرے کے دروازے پر ایک شیریں آواز ابھری۔ آنے والی لڑکی وکرم
سنگھ کی لائٹ بیٹی نرملاکاری تھی۔ ”میں گزشتہ چندہ میں دن سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ دن رات کسی
اذیت ناک خیال میں کھوئے رہتے ہیں۔ پہلے مجھے شک تھا کہ کوئی تکلیف دہ مرحلہ درپیش ہے جسے آپ مجھ
سے چھپانا چاہتے ہیں مگر آج بے وقت کی آمد اور چپ چاپ کمرے میں داخل ہو کر محصور ہو جانا اس بات کی
علامت ہے کہ وہ مسئلہ اپنی آنکھوں کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔“ یہ کہہ کر نرملاکاری خاموش ہو گئی اور افسردہ
نگاہوں سے باپ کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”آپ کی بے پناہ محبت نے مجھے ایک پراعتماد زندگی بخشی۔“ اب نرملارونے لگی تھی اور اس کی آواز سے
لرزش صاف نمایاں تھی۔ ”ماں کے انتقال کے بعد آپ نے ان کے حصے کی محبت بھی میرے نام کر دی۔
ہر قدم پر اپنے ساتھ ساتھ رکھا اور ہر سیاسی مسئلہ پر گفتگو کر کے مجھے حوصلہ دیا کہ میں خارزار زندگی کے مزاج
اور موسم سے آشنا ہو جاؤں۔ پھر آج آپ سوچوں کا یہ عذاب تنہا کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ کیا باپ میں
اس قابل نہیں رہی یا وہ مسئلہ میرے ذہن کی سطح سے بلند تر ہے؟“ نرملاکاری نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں
اپنے باپ سے سوال کیا۔

”نہیں میری بیٹی! ایسا نہیں ہے۔“ وکرم سنگھ، نرملاکاری کی دل پکھلا دینے والی گفتگو سن کر سخت
اضطراب کا شکار نظر آنے لگا۔ ”میں نے تمہیں چوڑ کی سیاست سے ہر قدم پر باخبر رکھا ہے مگر انسان کی زندگی
میں کچھ ایسے لمحات آجاتے ہیں کہ وہ بعض امور کو اپنے آپ سے بھی چھپانے لگتا ہے۔“ مہمانزئی کی
آنکھوں میں الجھن اور پریشانی کا گہرا رنگ نمایاں تھا۔ ”میں نے بی بی بار چاہا کہ تمہیں انقلاب کی ان گرم
ہواؤں کے بارے میں بھی تفصیل سے سب کچھ بتا دوں جو عنقریب چوڑ کا رخ کرنے والی ہیں۔ مگر میں یہی
سوچ کر خاموش رہا کہ کہیں ان ہواؤں کا ذکر تمہاری آنکھوں سے نیندیں نہ چھین لے اور جوانی کی وہ تمنائیں
جن کے سینے پر ایک زخم کی سی لگی ہو چکی ہیں کہیں مزید زخموں سے لالہ رنگ نہ ہو جائیں؟ وکرم سنگھ نے باتوں
کی باتوں میں اپنی بیوی سندیہا کی موت کا ذکر کر دیا تھا۔ اس وقت نرملاکاری کی عمر پانچ چھ سال تھی۔
سندیہا کے انتقال کے بعد وکرم سنگھ نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور اپنی اکلوتی لڑکی نرملاکاری کو مسلسل بیس سال
تک ایک بیٹے کی طرح تربیت دی تھی۔ چوڑ کے دو دونوں (عالیوں) سے بہترین تعلیم دلائی تھی اور خود اپنی
مگرانی میں تمام فنون جنگ سکھائے تھے۔ اس کے علاوہ وکرم سنگھ فرصت کے اوقات میں نرملاکاری سے
سیاست کے موضوع پر بھی تفصیلی گفتگو کرتا تھا۔ بیٹی کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتا تھا اور ایک رحم دلانہ
زندگی گزارنے کی تلقین بھی کرتا تھا۔ اسے ذاتی طور پر راجپوتوں کے نظام تشدد سے نفرت تھی مگر وقت نے

اسے اقتدار کے ہاتھوں کا کھلونا بنادیا تھا۔ ان مجبوروں کے باوجود وکرم سنگھ، نرملا کماری کو متوازن منصفانہ زندگی کے آداب سکھاتا رہتا تھا۔ مگر جب سے علی عامر آفریدی، سلطان علاء الدین خلعی کاہلے لے کر چوڑا آیا تھا، اس دن سے وکرم سنگھ نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اگر کبھی نرملا نے باپ سے سیاسی صورت حال کے بارے میں کچھ پوچھا بھی تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ دل چوڑے کے سیاسی تعلقات کا مسئلہ ہے جو آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ مگر رام دیو کی مداخلت نے معاملہ کو اس قدر بگاڑ کر رکھ دیا کہ ہر گزرنے والا لمحہ نئی صورت اختیار کرنے لگا اور ہر صورت اتنی خوفناک ہوتی گئی کہ نرملا سے اس کا ذکر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وکرم سنگھ خاموشی سے اپنے فرائض انجام رہا لیکن آج جب سیاسی آندپال کی محترم شخصیت سازشوں کا بد بن گئی تو وکرم سنگھ اپنے جذبات پر قابو رکھ سکا اور اس کے چہرے پر گہرے رنج و الم کی پرچھائیاں لرزے لگیں۔ یہی وہ سنگین ساعتیں تھیں جنہیں نرملا کماری نے اپنی جاگتی آنکھوں سے وکرم سنگھ کے چہرے پر پڑھ لیا تھا اور بیٹی اپنے باپ کو ایک بار اذیت میں مبتلا دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھی تھی۔

”کیا میں آپ کی بیٹی نہیں جو مجھ سے اس طرح رازداری برتی جا رہی ہے؟“

وکرم سنگھ، نرملا کے لمبے کی شدت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا اور پھر اس نے اپنی بیٹی کو علی آفریدی کی آمد سے لے کر راجہ رتن سنگھ کے موجودہ فیصلے تک تمام واقعات سنا ڈالے۔

”آپ علاء الدین خلعی کے سفیر کو رانی پد منی کے سامنے پیش کیوں نہیں کر دیتے؟“

”بیٹی! تم اس نازک معاملے کو نہیں سمجھتیں۔“ وکرم سنگھ نے نرملا کماری کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ”یہ تو بڑی نادانی ہے کہ ہم مفروضات میں الجھ کر وقت برباد کرتے رہیں۔“ نرملا کماری اپنی کم کے باوجود نہایت مدبرانہ انداز میں بول رہی تھی۔ ”اگر کوئی شخص ہماری موت کی خبر لاتا ہے تو ہمیں پورا حوصلے کے ساتھ اس خبر کو سننا چاہئے۔ اس طرح فائدہ یہ ہو گا کہ ہم تمام قوتوں اور تدبیروں کے ساتھ زندگی کا تحفظ کر سکیں گے۔ اگر پھر بھی موت ہم پر غالب آجائے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی کہ دو روزانہ ہزاروں اور لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں۔“ نرملا کماری نے ایک مضبوط دلیل کے ساتھ اپنے کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”آفریدی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر میں اس شخص کی جان کس طرح بچاؤں جس کی زندگی کی سانس شمار ختم ہونے والا ہے۔“ وکرم سنگھ نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔ ”بیٹی! اگر آندپال کر دیا گیا تو وہ لوگ بھی جیتے جی مر جائیں گے جو انسانی کردار کی اصلاح کیلئے مخالف ہواؤں سے جنگ کر رہے ہیں۔ یہ گنتی کے دو چار چراغ ہیں جو آندھیوں کے رخ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی تھر تھرائی لوگوں کو اس بچانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شاید ہواؤں کا طوفان ختم جائے اور اندھیروں کے مسافر روشنی کی اس گلی سارے اپنا راستہ تلاش کر لیں۔“ سیاسی آندپال چراغ نہیں، روشنی کی ایک قندیل ہے۔ اگر قندیل بجھا دی گئی تو یہ غمناک دیئے ظلمتوں سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے۔“

”آپ اس قندیل کو بچانے کی بھرپور کوشش کیجئے۔“ نرملا نے بے تحجک ہو کر باپ سے کہا۔ ”اگر ہلاکت خیز جھوٹا قندیل کی طرف بڑھے تو آپ اپنی پشت اس کی جانب کر دیجئے۔ یہ آپ کا فرض ہے۔“ ”سیاسی کے گیان نے اسے قتل کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔“ وکرم سنگھ شدید بے چینی کے عالم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر پشت پر اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹھلنے لگا۔ ”جھوٹوں کی سچے گیان کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

”راجپوت سمرات تو ایک ہوشمند فرمانروا ہیں۔ انہیں سنیاہی کی بچی باتوں کو برداشت کرنا چاہئے۔“ ”سنیاہی آندپال کہتے ہیں کہ چوڑا تباہ ویرا باد ہو جائے گا۔“ وکرم سنگھ نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ سر موٹا کر رہا ہو۔ ”سنیاہی نے یہ بھی کہا ہے کہ راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی کی بڑی رسوائی ہوگی اب تم ہی بتاؤ کہ یہ باتیں سننے کا حوصلہ کس میں ہے؟“

”میرے نزدیک تو سنیاہی قابل احترام ہیں کہ وہ وقت سے پہلے سیلاب کی خبر دے رہے ہیں۔ نرملا کماری کی باتوں میں وہی سادگی اور وہی مصومیت تھی۔

”لوگ سیلاب کی خبر سننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مکران ہوں یا عوام۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ ندیاں بہتی رہیں، تنگنائی رہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ پانی کے ترنم ریز دھاروں کو موج ہلا کی شکل میں دیکھ سکیں۔“ مہمانی بار بار اپنے ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔ ”کوئی بھی سنیاہی کا احسان ماننے کیلئے تیار نہیں۔ سب کے سب اسے احمق کہتے ہیں، گناہ گار سمجھتے ہیں۔ آندپال جیسے پاگل کو اس ہوشیار دنیا سے جاننا ہو گا۔“ وکرم سنگھ کو مضطرب دیکھ کر نرملا کماری گھبرا گئی۔ ”اگر آپ راجہ رتن سنگھ سے سنیاہی کیلئے رحم طلب نہیں کر سکتے تو میں رانی پد منی سے بات کر سکتی ہوں۔ آخر وہ میری بہن بھی ہیں۔“

”نہیں نرملا! ہرگز نہیں۔“ وکرم سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ ”کوچہ اقتدار میں داخل ہونے والے کا کسی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ پد منی کو اپنے ناز و اور غرور شاہانہ کی نمائش ہی سے فرصت نہیں۔ وہ سنیاہی کے اسرار کو کیا سمجھے گی؟ وہ تو خود چاہتی ہے کہ صرف اس کے اشاروں پر ناپنے والے زندہ رہیں۔ آندپال اس کی جنبش چشم پر رقص نہیں کر سکتا اس لئے اسے قتل ہونا ہی پڑے گا۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ کمرے سے باہر آیا اور پھر طویل رادیاں ملے کر تباہ اپنے مکان سے نکل کر راجہ رتن سنگھ کے پاس گیا جو مہمانی کیلئے مخصوص تھا۔ کچھ دیر بعد وکرم سنگھ نے اپنے دستہ خاص کے چار سپاہیوں کو طلب کیا اور انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ “کعبہ شیم“ کے مندر جاکر سنیاہی آندپال کو احترام کے ساتھ لے آؤ۔ ان کے پیروں میں بزیان نہ ڈالنا کہ وہ کوئی مفرد مجرم نہیں۔ اور انہیں ایذا بھی نہ پہنچانا کہ وہ کوئی قاتل یا عداوت نہیں۔“

☆.....☆.....☆

جب ریاست چوڑے کے سپاہیوں نے کعبہ شیم کے مندر پہنچ کر سنیاہی آندپال کے دروازے پر دستک دی تو فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔ سپاہیوں نے چاہا کہ وہ سنیاہی کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں مگر پھر انہیں مہمانی کی ہدایات یاد آ گئیں۔ دوبارہ دستک دی گئی اندر سکوت طاری رہا۔ میری دستک پر سنیاہی کی جھنجھلائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم لوگ کون ہو جو مجھے مرنے بھی نہیں دیتے۔ واپس جاؤ کہ میں کسی سے نہیں مل سکتا۔“ ”ہم راجپوت سمرات رتن سنگھ کے سپاہی ہیں اور آپ کو راج محل لے جانے کیلئے آئے ہیں۔“ ایک سپاہی نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”میں کسی سمرات کو نہیں جانتا۔“ آندپال کی آواز میں جھنجھلاہٹ کے ساتھ غصہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ ”رتن سنگھ سے کہہ دو کہ میں اس کا ملازم نہیں ہوں۔“

سپاہی کچھ دیر کے لئے ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف انہیں اپنی نازک ترین ذمہ داری کا احساس تھا اور دوسری طرف مہمانی وکرم سنگھ کے ہدایت نامے کا۔ بالآخر دوسرے سپاہی کو صاف صاف

کہہ دیتا پڑا۔ ”سنیاسی! خاموشی کے ساتھ باہر نکل آؤ۔ راجہ رتن سنگھ کی طرف سے تمہاری گرفتاری کاہ دیا گیا ہے۔ تمہیں اسی وقت دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اگر تم نے نہیں پیش سے کام لیا تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔“

”ٹھہرو! تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ ایک آئندہ پال کی آواز پر سکون محسوس ہونے لگی تو ”تم نے پہلے کیوں نہیں کہا کہ میری موت کا بیغام لے کر آئے ہو۔ چند لمحے انتظار کرو۔ میں ابھی ہوں۔“ یہ کہہ کر سنیاسی آئندہ پال نے ایک گوتے میں پڑا ہوا کپڑے کا وہ جوڑا اٹھایا، جسے اس نے اپنے ہاتھ سے کل بی دھویا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اطمینان سے باہر آیا اور سپاہیوں کو مخاطب کر کے بولا ”وہ سامنے تال ہے۔ میں ابھی اٹھان کر کے واپس آتا ہوں۔“

سپاہی تالاب کے کنارے پہنچ کر ٹھہر گئے۔ سنیاسی اطمینان سے منہ ہاتھ۔ اس کے بعد وہ پانی سے اٹکا، کپڑے تبدیل کئے اور مغرب کی جانب جھکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”تو بھی مجبور ہے اور میں بھی بے دست و پا ہوں۔ تو کتنا ہی چکے مگر اس مگر کی بے بسی اندھے ہیں۔ انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا کہ ان کا مقدر ہی اندھے ہے۔ میں کتنا ہی چیون لیکن اس بستی کے رہنے والے۔ نپٹ، ہرے ہیں۔ انہیں کچھ سنائی نہیں دے گا کہ ان کے کانوں پر سدا سے جھوٹ کا پہرہ ہے۔ میں اپنے پر جا رہا ہوں تو یہی اپنی منزل کی طرف چلا جا۔“ سپاہیوں کو ایسا لگا جیسے سنیاسی سورج سے باتیں کر رہا ہو۔ ایک سچے انسان کے اشاروں کا مرکز کون سمجھتا؟ دنیا دار تو اسے پاگل ہی سمجھ رہے تھے۔

پھر وہ پاگل شخص راجہ رتن سنگھ کے سپاہیوں کو دیکھ کر ہنسا اور چپ چاپ اس رتھ پر بیٹھ گیا تو مندر دروازے پر کھڑا تھا۔

سپاہیوں نے سنیاسی کو رام دیو کے آشرم میں پہنچا کر مہمانتری کو اطلاع دی۔ وکرم سنگھ نے بڑے جوش کے ساتھ یہ جان گداز خبر سنی اور سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے طے جانے کے لئے کہا۔ چوڑے جاں نثار سپاہی یہ منظر نہ دیکھ سکے کہ چٹانوں جیسے اعصاب رکھنے والا وکرم سنگھ چپ چاپ رو رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

پھر جب وکرم سنگھ اپنے کمرے میں آیا تو ملامتاری اس کی منتظر تھی۔ ملامتاری کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قرار ہو گئی۔ ”پتاچی آپ رو تو سکتے ہیں مگر.....“

”فریاد نہیں کر سکتا۔“ وکرم سنگھ نے ملامتی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! بیٹی! سنیاسی کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر چیخا پاتا ہوں۔“

”تو پھر چیخے۔“ ملامتاری نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”اتنی زور سے چیخے کہ آپ کی آواز راجہ رتن سنگھ تک پہنچ جائے۔ یہی آپ کے چیخنے کا وقت ہے۔ اگر اس وقت مہمان پرش (مرد عظیم) کو ہوا گیا تو پھر سارے چوڑے چیخیں بھی لا حاصل ہوں گی۔ راجہ رتن سنگھ، اپنی خدمات یاد دلانے اور ان خدمات کے صلے میں سنیاسی آئندہ پال کی زندگی مانگ لیجئے۔ یہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا تاج و تخت، عہدہ و منصب بہت عارضی چیزیں ہیں۔ سنیاسی کا گمان ان سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ گمان قتل کر دیا گیا تو جماعت فاتح قرار پائے گی اور اندھے رشتہ کو نکل لیں گے۔“ ملامتی آواز میں کا گداز شامل تھا۔

”نہیں! میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ وکرم سنگھ کی آواز میں لرزش تھی۔

”اقتدار کی ہوس نے آپ کی زبان کو زنجیر بے سادہ ہی ہے۔ اس لئے آپ راجہ کے سامنے آئندہ پال

سپاہیوں کا اعتراف نہیں کر سکتے۔“ ملامتاری نے کہا۔ ”میں نے تمہیں بے ادبی کی تعلیم نہیں دی تھی۔ پھر تمہاری باتوں

”ملا!“ اچانک وکرم سنگھ چیخ اٹھا۔ ”میں نے تمہیں بے ادبی کی تعلیم نہیں دی تھی۔ پھر تمہاری باتوں میں گستاخی کا یہ رنگ کس طرح شامل ہو گیا۔ تم فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

حساس بی بی باپ کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکی اور دوڑ کر وکرم سنگھ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ مہمانتزی نے ملامتاری سے سر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بیٹی! تجھے خبر نہیں کہ تیرا باپ کیسی آنکھوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ شاید میں سنیاسی کیلئے اپنی جان بھی دے دیتا مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بھی آنے والا طوفان نہیں رکے گا۔ جس طوفان کو روکنے کیلئے میں اپنی زندگی کی بازی کھیلوں گا، اسی طوفان کے شکرے ایک اور طوفان پیدا ہوگا۔ اس طوفان کی فطرت بڑی ہلاکت خیز ہوگی۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا کسی کو میری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں تجھے بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ طوفان کیسا ہوگا۔ بس! اب چلی جا اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔ آنے والی سارہ دو خیریں رات میں کوئی کسی کا دوست نہیں رہے گا۔“

ملامتاری روٹی ہوئی اٹھی اور باپ کو انجانی اذیت میں مبتلا چھوڑ کر چلی گئی۔

ملامتاری جاتے ہی وکرم سنگھ نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر ایک خفیہ تجوری کھول کر شراب کی بوتل نکالی اور اس نشہ آور سیال سے اپنا حلق تر کرنے لگا۔ وکرم سنگھ عادی شرابی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں دوسری بار توڑ گور کو نہ گالیا تھا۔ ایک بار اس وقت جب اس کی محبوب بیوی سندھیا کا انتقال ہوا تھا۔ شریک حیات کی محبت آمیز یادوں سے چیخا پھڑانے کیلئے اور زخم فراق کی سوزش کو کم کرنے کیلئے اس نے مسلسل ایک ہفتے تک شراب نوشی کی تھی۔ اس کے بعد جب وکرم سنگھ کا دل سمجھ گیا تو اس نے ساغر و صراحی کو توڑ دیا اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرنے لگا۔ اعلیٰ ترین شراب کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی خفیہ تجوری میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کبھی کبھی وکرم سنگھ کسی نشست میں اپنے مخصوص دوستوں کو شراب پیش کرتا تھا مگر خود اس کے ہونٹ آلودہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ کیف و سرور اور رقص و شباب کی محفلوں سے بہت دور رہتا تھا مگر آج وکرم سنگھ نے دوسری مرتبہ بادہ گنگام کا سہارا لیا تھا۔ آج بھی اس کی محبوب ترین، ہستی اس سے چمچ جانے والی تھی۔ وکرم سنگھ، سنیاسی آئندہ پال کا خاموش پجاری تھا۔ راجہ رتن سنگھ کا معتب ہونے کی وجہ سے وکرم سنگھ، سنیاسی سے بظاہر کوئی رسم و راہ نہیں رکھتا تھا مگر اس کے جذبات عقیدت، ہمیشہ سنیاسی کی بارگاہ میں غمر رہتے تھے۔ وہ ذاتی طور پر اس کا قاتل تھا کہ اگر سنیاسی کے گمان کو اہل چوڑا اپنی زندگی میں شامل کر لیتے تو خون آشام تہذیب کا خاتمہ ہو جاتا اور قتل گاہوں میں سکون اور روشنی کے پھول گل اٹھتے۔ مگر اس مگر کی کے ہاں رام دیو کے سفلی مظاہروں کے دیوانے تھے اور آئندہ پال جیسا اہل دل راجہ پوتوں کی بستی میں اچھوت بن کر رہ گیا تھا۔ وکرم سنگھ پھر بھی خوش تھا کہ کم سے کم آئندہ پال زندہ تو ہے۔ انسانیت کی کوئی علامت کس نظر تو آتی ہے لیکن آج سچائی کی وہی علامت اور کردار کی وہی نشانی بچھ جانے والی تھی۔ اسی سنگین وقت کا احساس کر کے وکرم سنگھ غم زدہ ہو جاتا تھا اور پھر وہ غم اس قدر بڑھا کہ مہمانتزی گھبرا کر پڑنے لگا۔

وکرم سنگھ جانتا تھا کہ آج کی رات وہ غرق مئے آب ہو کر اپنے خواں کھو بیٹھے اور رام دیو کے آشرم میں جو حادثہ پیش آئے وکرم سنگھ اس کا تماشا نہ ہو۔ مگر مہمانتزی یہاں بھی بے اختیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راجہ رتن سنگھ اس کی موجودگی ہی میں گناہ کا یہ کھیل کھیلے گا۔ اس لئے وکرم سنگھ کا ہوش میں رہنا بھی ضروری تھا۔ اگر وہ ہوش کھو دیتا تو رام دیو اور دیگر مخالفین اس کی بد مستی کے عجیب عجیب مفہوم تراشتے اور پھر وکرم سنگھ پر ایک نئی قیامت نازل ہو جاتی۔

”بیٹی! میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔“ وکرم سنگھ بند کمرے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”اگر میں سنیاسی

کی زندگی بحال رکھنے کے لئے راجہ رتن سنگھ سے سفارش کرتا ہوں تو چوڑو کا حکمران اور رانی پد منی دونوں میرے دشمن ہو جائیں گے۔ رام دیو پہلے ہی میرے تعاقب میں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی مقام پر میرا سر قلم لڑکھائیں اور میں اس کی نفرتوں کا شکار ہو جاؤں۔ اگر ان تینوں کی نفرتیں میری جان لینے کے بعد بھی ختم ہو جائیں تو میں آئندہ پال پر قربان ہونے کے لئے تیار ہوں مگر مجھے خبر ہے کہ ان کی نفرتیں ختم نہیں ہوں گی۔ میرے مرتے ہی وہ مجھے اپنی نفرتوں کا نشانہ بنالیں گے۔ تو انہیں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں؟ وہ سنیاہی کی کسی بھی حالت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سنیاہی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ بد صورتوں کے شرمز آئینہ ہے۔ تو نے غور سے نہیں دیکھا کہ ہر ہاتھ میں ایک پتھر ہے۔ میں کس کس کے ہاتھ کو روکوں؟ میری مجبوریوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ”وکر م سنگھ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ شدید عالم اضطراب میں اپنے م کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔

پھر وہ بستر پر بڑی بے ترتیب حالت میں گر گیا۔ شراب آہستہ آہستہ اثر کر رہی تھی اور رات کے اندھیرے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وکر م سنگھ کی آنکھ لگ گئی۔ خوابوں کے جزیرے میں داخل ہوتے ہی وکر م سنگھ نے دیکھا کہ وہ زمین کے ایک خشک حصے پر تنہا کھڑا ہے اور اس کے چاروں طرف لامحدود پانی کا چر شور سمندر ہے۔ مرتے ہوئے ساپنوں کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوئی موجیں اس کی طرف بڑھتی ہیں مگر اچانک واپس لوٹ جاتی ہیں۔ پھر ناگماں وہ سارا پانی انسان کے تازہ خون کی طرح سرخ ہو گیا اور موجوں نے سرے بلند ہو کر وکر م سنگھ کو اپنی بے رحم آغوش میں چھپالیا۔ خواب اس قدر ڈراؤنا تھا کہ خوف سے وکر م سنگھ کی چیخ لگی اور وہ اپنی ہی چیخ کی آواز سے جاگ اٹھا۔

وکر م سنگھ نے دھندلی آنکھوں سے وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ خوئیں سمندر کی گرفت سے بہت دور اپنے کمرے میں موجود بھی تھا اور محفوظ بھی۔ مگر دروازے پر مسلسل دستک سنائی دے رہی تھی۔ شراب کے اثر سے اپنا جسم تھکا تھکا محسوس ہو رہا تھا۔ وکر م سنگھ نے خود کو سنبھالا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر زلزلہ نما مری سر جھکائے کھڑی تھی۔ ”آپ کو راجہ رتن سنگھ یاد کر رہے ہیں۔“ ”نرملانے آہستہ سے کہا۔ ”راجپوت سمرات کا حکم ہے کہ آپ مہاراج رام دیو کے آشرم میں پہنچ جائیں۔“

”تم جاؤ!“ وکر م سنگھ نے بیٹی سے کہا اور اندر واپس چلا گیا۔ مہمانتزی کی ظاہری حالت گہڑی ہوئی تھی اس نے لباس تبدیل کیا۔ کچھ دیر تک منہ دھوتا رہا اس سے چہرے پر تازگی تو نمایاں ہوئی مگر آنکھوں کے خمار کو چھپانا ممکن نہیں تھا۔ غرض اس نیم مستی کے عالم میں وکر م سنگھ اپنے مکان سے نکلا اور راج محل کی مختلف راہ داریوں سے گزرتا ہوا اس سنان علاقے میں پہنچ گیا جہاں رام دیو کا آشرم ظلم و ساحتی سے آباد تھا۔

آشرم میں داخل ہوتے ہی وکر م سنگھ نے تین کرسیوں پر راجہ رتن سنگھ، رانی پد منی اور رام دیو کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ رام دیو بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا اور راجہ رتن سنگھ بھی اس کی بے غم ہنسی میں برابر کا شریک تھا۔ البتہ رانی پد منی کے ہونٹوں پر ہلکی سی غرور آمیز مسکراہٹ تھی جس سے اس کی بے پناہ خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ وکر م سنگھ چوڑو کے حکمرانوں کے سامنے جا کر ٹھہرا اور نصف قد تک خم ہو کر راج دربار کی رسم ادا کی اور پھر اس نے نفرت و کراہیت کے ساتھ مہاراج رام دیو کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس وقت چوڑو کے یہی آداب تھے کہ راجپوت رتن سنگھ اور رانی پد منی کے سامنے خم ہوتے تھے مگر مہاراج رام دیو کے قدموں پر سر رکھ کر انہیں اپنی مکمل اطاعت کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ پوری ریاست میں صرف رانی پد منی اور راجہ رتن سنگھ کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ رام دیو کے پاؤں چھو کر ہی اپنی عقیدت کی نمائش

کرتے تھے۔ ورنہ سب کے سب اس شعبہ باز کے سامنے سر پہ سجدہ رہتے تھے۔ وکر م سنگھ بھی اپنے سر کو اٹھوڑ کر قدموں سے مس کر کے اٹھا اور آخری کر سی پر بیٹھ گیا۔

”ام دیو کے قدموں سے غور سے وکر م کا جائزہ لے رہا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود مہمانتزی کے قدموں کی راجہ رتن سنگھ بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ ”وکر م سنگھ!“ اچانک راجہ رتن سنگھ کی آواز بلند ہوئی۔ ”آج تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے بھی توبہ توڑ دی ہے۔“

اپنے حکمران کی بات سن کر وکر م سنگھ فوراً کھڑا ہو گیا۔ سرشاری کی کیفیت پر قابو پایا اور رک رک کر کہنے لگا۔ ”آج کے دن میں شراب کیسے نہیں پیتا۔ آج تو میرے سمرات کی زندگی کا سب سے بڑا جشن ہے۔ نصرت و کامرانی کے ایسے عظیم الشان جشن میں بے خوئے ہونا بھی تو گناہ ہے۔ یہی سوچ کر میں بھی آپ کی خوشی میں شریک ہو گیا۔“ وکر م سنگھ کی زبان عالم جبر میں جھوٹ بول رہی تھی مگر اندر ہی اندر اس کے دل پر فردوسلامت کی سنگسباری ہو رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ وکر م سنگھ!“ راجہ رتن سنگھ نے انتہائی مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہم تمہاری وفاداریوں پر باز کرتے ہیں۔ تم اپنے سمرات کے حقیقی مزاج شناس ہو۔ اگر آج کی رات تم لڑکھاتے ہوئے آشرم میں داخل نہیں ہوتے تو ہم سمجھتے کہ تمہیں ہمارے فیصلے سے کیس نہ کہیں کوئی اختلاف ضرور ہے۔ مگر تم نے اپنی سعادت مندی اور فرمانبرداری کو اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔“

اتنے میں رام دیو کے شیطان چیلے سنیاہی آندہ پال کو لے کر آئے۔ وہ عجیب شان بے نیازی کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا جیسے اس کے سامنے چوڑو کا سمرات نہیں کوئی غلام بیٹھا ہو۔

”آندہ پال! تیرا باپ بھی غدار وطن تھا اور تو بھی۔“ راجہ رتن سنگھ جوش غضب میں کھڑا ہو گیا۔ ”آج ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہمارے پوچھ پچائی سمرات سر سنگھ نے تیرے بد کار باپ، جوگی امپال کو کیوں قتل کر دیا تھا۔ کاش! ہم بھی تجھے پہلے ہی قتل کر چکے ہوتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔“ ”کیوں بچھتا ہے راجپوت سمرات!“ سنیاہی آندہ پال کے لمبے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ ”میں گزرا ہوا وقت تو نہیں ہوں کہ واپس لوٹ کر نہ آسکوں۔ سامنے کھڑا ہوں۔ اپنی ایک ایک منو کا منا (دلی خواہش) پوری کر لے۔ مجھے تو خود بھی افسوس ہے کہ تیرے عہد میں اتنے دن زندہ کیوں رہا؟“

سنیاہی کی اس گرم گفتاری نے راجہ رتن سنگھ کے دل و دماغ جلا ڈالے۔ وہ کسی وحشی کی مانند چیخنے لگا۔ ”سناہیو! اس کی پانی کہ وہ زبان کاٹ ڈالو جو ہمارے تخت و تاج اور چوڑو کی تباہی کے من گھڑت افسانے سناتی ہے جو راجپوتوں کی آن رانی پد منی کی ذلت و رسوائی کی بے سرو پا کہانیاں بیان کرتی ہے۔ اسے عبرت ناک سزا دو۔“

”سمرات! میری زبان تو کٹ جائے گی مگر تجھے وہ راز کون بتائے گا جو دلی سے آئے ہوئے راج دوت کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔“ آندہ پال ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”وہ راز جسے جاننے کی کوشش میں مہاراج رام دیو بھی ناکام ہو گئے۔“

”سنیاہی! کیا تو اس راز کو جانتا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ جو چند لمحے پہلے قہر و غضب کا مجسمہ نظر آ رہا تھا، اچانک حیرت و استعجاب کے پیکر میں ڈھل گیا تھا۔

”اس دھرتی پر میرے سوا اس راز کو اور کون جان سکتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے سنیاہی کے چہرے پر اس کے ظلم کا جلال روشن ہو گیا تھا۔ ”میں تجھے بتا سکتا ہوں کہ راج دوت، رانی پد منی کیلئے کیا سندی لے کر آیا ہے؟“

سنیاسی آئندپال کی گفتگو سن کر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا اور خود راہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ عالم وحشت میں بار بار سنیاسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ہوئی صورت حال کو کس طرح نبھالے؟

”نہیں راجپوت سمرات! ہرگز نہیں۔“ رام دو کالجہ بہت تیز تھا۔ ”اس فریب کار کی باتوں پر آنا۔ یہ جھوٹ بول کر اپنی موت کا وقت ٹالنا چاہتا ہے۔“

”ہماراج! آپ سب کچھ جانتے ہیں مگر اتنا نہیں جانتے کہ موت کا وقت ٹالنا نہیں جاسکتا۔“ رتن سنگھ کے لہجے میں شدید حقارت تھی۔ ”ہماراج کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر میری زندگی پر راجپوت سمرات کو اختیار ہوتا تب بھی میں اس سے اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں تو ایک ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور تم اندھوں کو نظر نہیں آتا۔“ آئندپال ایک صاحب جلال سنیاسی تھا مگر آج کی رات وہ حالت بے حال ظاہر ہوا تھا۔ آئندپال کے اسی ٹھہراؤ اور اطمینان کو رام دیو موت کے خوف سے تعبیر کر رہا تھا مگر سنیاسی جلد ہی راجہ رتن سنگھ کی رائی پدمنی اور جادو گر رام دیو کی ساری غلط فہمیاں دور کر دیں۔ وہ چند لمحوں میں وہ کر دوبارہ رام پور سے مخاطب ہوا۔

”ہماراج! آپ کچھ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سنیاسی کی زرا جھوٹ ٹھہری نہیں سکتا۔ اگر یہ ہونٹ منافقت کا ذائقہ ایک بار چکھ لیتے تو پھر آپ کا وجود راج گل بجائے کسی شمشان میں ہوتا پھر آپ چوڑی گلیوں میں سگھول لئے ہوئے، دروازے دروازے ایک ایک سوال کر رہے ہوتے۔ یہ ریشمی لباس، یہ قیمتی پتھروں کی مالاں، یہ طاقتور غذاؤں، یہ نرم بستری، یہ شربت و اسیاں میرے چچ کی دین ہیں۔ میرے چچ کا ٹیشن جلا تو ریا کاروں اور منافقوں کے آشیانوں پر آگئی۔“

سنیاسی کے الفاظ کیا فتنے بھڑکتی ہوئی آگ کی پلٹیں تھیں۔ جس نے رام دیو کی جھوٹی شخصیت کے پیرہن کو جلا ڈالا تھا۔

”سمرات! آپ اس نمک حرام کی باتیں سن رہے ہیں؟“ رام دیو نے سنیاسی کے سامنے زچ ہو کر رتن سنگھ کو پکارا۔

”میں کسی سمرات کا نمک نہیں کھاتا بلکہ پورا چوڑو میرا نمک کھاتا ہے۔ میری دعائیں اس زمین کے والوں کو رزق پہنچاتی ہیں۔ اگر میں اپنی زبان بند کر لوں تو چوڑو کے پاس بھوکے مرجائیں۔“ رتن سنگھ آئندپال پر اچانک مجذوبانہ کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس نے اپنے باپ امربال کی طرح دنیا کے ہر اقدار جھٹلایا تھا۔

سنیاسی کی شعلہ بیانی راجہ رتن سنگھ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ حرفوں کی آگ پھیلی تو راجہ سمرات کے غرور کی قابھی جل گئی۔ ”سنیاسی! تو اپنی حد سے گزر گیا۔“ ایک ایک رتن سنگھ اٹھا۔ ”تو نہیں جانتا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے؟ تجھے یہ بھی پتا نہیں کہ ہم تیرے ساتھ کیا کریں گے؟“

”موت! صرف موت! تو اس سے زیادہ برا سلوک نہیں کر سکتا۔“ سنیاسی نے ایک شان بننے کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کو سرسے پاؤں تک دیکھا۔ ”جلدی کر کہ اس ناپاک مقام پر میرا دم گٹ ہے۔“

”اور راج دوت کا وہ سندیش؟“

راجہ رتن سنگھ گھبرا کر بولا۔ آئندپال کی موت پر آمادگی نے چوڑو کے حکمران کو بدحواس کر دیا تھا۔ ”وہ سب کچھ مجھے یہ جادو گر بتا دے گا۔“ سنیاسی آئندپال نے رام دیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غارت سے کہا۔

”نہیں سنیاسی! وہ راز تیری ہی زبان سے آشکار ہو گا۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور تو ہر حال میں اپنے غلط کام بند ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے مجبور ہو کر اپنے غصے پر قابو پالیا تھا اور اب اس کے لہجے میں خوشامد اہل ہو گئی تھی۔

”رتن سنگھ! میں تجھے خوب جانتا ہوں۔ تو مجھے میرے چچ کی قسم دے رہا ہے اور جب میری زبان سے جچ ابرہہ ہو جائے گا تو پھر تیری عیار فطرت اپنے مرکزی طرف لوٹ جائے گی تو مجھے قتل کر اؤے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے چچ بولنے کی یہ آخری رات ہے۔ اس اندھیرے کے بعد میرے لبوں پر کوئی روشن حرف لوٹ نہیں ہو گا۔ بے زبانی ہی بے زبانی ہوگی۔ اس ذات کی قسم! جو پتھروں میں پوشیدہ نہیں ہے، مجھ سے بری طاقت گفتار جھین لی جائے گی۔ میرے اشاروں پر سنگساری اور میرے الفاظ قتل کر دیئے جائیں گے۔ تو یہی چاہتا ہے اور یہی ہو گا۔“ سنیاسی کے گیان کی آنکھ نے راجہ رتن سنگھ کے قلب سیاہ کا پردہ چاک کر ڈالا تھا۔

”اگر وعلاء الدین خلجی کے خفیہ پیغام کو ظاہر کر دے تو کوئی عجب نہیں کہ میں تجھ پر مہربان جاؤں۔“ رتن سنگھ نے نئی چال چلی۔

”میں تیری مہربانیوں کو اپنی ٹھوکروں پر رکھتا ہوں۔“ اچانک آئندپال کی گردن میں کبھی نمایاں دھکی تھی اور نرم لہجے نے چٹان کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

”مجھے آشرم میں اپنے شوہر کی یہ تذلیل دیکھ کر رانی پدمنی بھی خاموش نہ رہ سکی۔“ چوڑو کی تاریخ گواہ ہے۔ ہمارے رحم کو رحم کی حقیر کرنے والوں کی سانسیں زیادہ نہیں ہوتیں۔ کیا تو نے اپنے باپ کے آخری ات کو فراموش کر دیا۔“ رانی پدمنی نے انتہائی طیش کے عالم میں سنیاسی کو اس کے باپ امربال کا انجام بدلاتے ہوئے کہا۔

”یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔“ سنیاسی اس مغرور عورت کی متکبرانہ روش دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے لگا تھا۔ ”باپ پر جو گزرتا تھی سو گزرتی۔ اب تو تیری مملکت کے غلاموں کو اس سے دلچسپی ہے کہ بیٹے کا کیا حشر ہوتا ہے؟ میں تیرے بازار ستم میں اپنی سانسیں فروخت کرنے آیا ہوں۔ اگر خرید سکتی ہے تو خرید لے اور برس برس میں زیادہ نہ سوچ کہ میں تو ہمیشہ جان اپنی کوچہ قاتل میں رکھتا ہوں۔“

رانی پدمنی، آئندپال کی اس گرجی گفتار کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے چچ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

”سنیاسی کے پانی شری کو ٹکڑوں میں بانٹ دو۔“

پدمنی کے فرمان کو حکم پر سپاہیوں میں ہلچل ہوئی مگر وہ سنیاسی آئندپال کے لاغر جسم پر مشق ستم نہ رکھے۔ ان کی آنکھیں راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور سماعتوں کو چوڑو کے حکمران کی جنبش لب و انقار تھا۔

رانی پدمنی ایک بار اپنے غضب کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر راجہ رتن سنگھ نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ یہ بسا اشد تھا کہ وہ ہوش اور مصلحت سے کام لے۔ رانی پدمنی بیچ تاب کھا کر رہ گئی۔

راجہ رتن سنگھ نے ایک خود غرض انسان کی طرح اپنا لہجہ بدل لیا۔ ”سنیاسی! مجھے یا ہماراج رام دیو کو تم سے لاکھ اختلاف سہی مگر تم اول و آخر ایک ہندو ہو اور اس وقت پوری ہندو قوم کو اپنے بدترین دشمن کا سامنا

ہے۔ ”رتن سنگھ! مجھ سے کھلے لفظوں میں بات کر۔ مرد پر دے کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو نہیں کر۔
 سنیاں آند پال کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ”کبھی اپنے دل کی غلای کرتا ہے اور کبھی عورتوں
 بچ کاراستہ چھوڑ دے۔ اسی میں تیری بھلائی ہے۔“
 راجہ رتن سنگھ کے دل میں قہر و نفرت کا طوفان پھرا تھا مگر مصلحت نے اسے دبا دیا۔ ”سنیاں! اس
 بتادے کہ راج دوت دلی سے کیوں آیا ہے اور سلطان کے کیا ارادے ہیں؟“
 ”میں نے ابھی تک راج دوت کو نہیں دیکھا۔ پھر میں کس طرح بتا سکتا ہوں کہ اس کے دل
 ہے؟“ آند پال اپنی موت سے بے خبر مسلسل مسکرا رہا تھا۔
 مجبوراً راجہ رتن سنگھ نے سنیاں کو آفریدی کے کمرے میں جانے کی اجازت دیدی۔ رام دیو اور
 وکرم سنگھ سب ساتھ ساتھ تھے۔

پھر جب سنیاں آند پال، رام دیو اور وکرم سنگھ آشرم کے دروازے سے نکل کر راج محل
 راہ داری میں داخل ہو گئے تو راجہ رتن سنگھ نے ان چاروں سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ باہر سیرا دیں۔
 نے اپنی برہنہ شمشیروں کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور گردنیں جھکائے ہوئے چلے گئے۔ اب آند
 مکمل تنہا تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے محبت آمیز نظروں سے اپنی سرکش بیوی کی طرف دیکھا جسے احسام
 اور شدت غصہ نے دھکتا ہوا نگارہ بنا دیا تھا۔ ”ہمارا بی! میری ذہنی کشش کا اندازہ کر اور۔
 غصے کو پھر کسی موسم کے لئے اٹھا رکھو۔“ چوڑا حکمران بارگاہ حسن میں گداگری کر رہا تھا۔
 دل و دماغ بھی جل رہے ہیں اور تمہارے رخسار بھی، پھر یہ آگ کہاں ٹھہرے گی؟ تم اگر برا
 گھنٹھ گھنٹہ کی طرح نہیں برس سکتیں تو پھر شہنشاہ بن جاؤ۔ تمہاری یہ ہمہ وقت کی شعلگی ایک دن
 جلا کر رکھ دے گی۔“

رانی پدمنی کی آنکھوں میں غور و خج نے اٹھائی لی اور وہ بے نیازانہ منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھے
 ”میں یہ سب کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔“ راجہ رتن سنگھ کی آواز سرگوشیوں میں بدل گیا
 ”میں نے چوڑے کے تخت و تاج کو تمہاری گزر گاہ بنا دیا ہے کہ تم جب چاہو اسے پامال کرتی ہو گی۔
 میرا راجپوتی و قدار تمہارے ماتھے کی بندیاں سمٹ گیا ہے اور میری شمشیر آبدار تمہاری چوڑیوں کی کو
 کر رہ گئی ہے۔ پھر یہ جارحانہ بے رخی کیسی اور یہ غمزدہ سفاک کیوں؟ تمہیں ایک لمحے کیلئے بھی وقت
 کا احساس نہیں ہوتا۔ کم سے کم ایک ہی ساعت کے لئے اپنی ذات کے آئینہ خانے سے نکل کر
 خونی ہوائیں اپنے دامن میں کیسی کیسی بھاری چٹانوں کو لئے ہوئے تمہارے شیش محل کی جانب
 ہیں۔ سنیاں سے مجھے دلی نفرت ہے مگر میں پھر بھی اس کے گیان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس
 شک نہیں کہ آند پال کا علم ہمارا راج دیو سے زیادہ نہیں لیکن کبھی کبھی کم جانے والے بھی کئی
 جان لیتے ہیں۔ شاید سنیاں، سلطان علاء الدین خلجی کے اس خفیہ پیغام تک پہنچنے میں
 ہو جائے۔ جسے دلی کا راج دوت اپنے من کے اندر چھپائے ہوئے ہے۔“ حسن کے رعب
 گزرا نے پر مجبور کر دیا تھا۔

رانی پدمنی نے نیک ادائے دلبری کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دی اور تانیاک دے داغیشالی پہلا
 ہوئے کہا۔

”سمرات! اب اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہئے۔“

”ہمدانی! یہ کسی بازی گر کا کھیل نہیں ہے۔“ راجہ رتن سنگھ، پدمنی کی طرف جھکتے ہوئے
 ”یہ اقتدار اور ہوس کا کھیل ہے، یہ آفات و مصائب کا تماشہ ہے جس نے صرف میرا گھر دیکھ لیا
 ”کس کی ہوس اور کس کا اقتدار؟“ رانی پدمنی نے اپنے پائے حنائی سے منھلیں گھاس کو ملتے ہوئے

”علاء الدین خلجی کی ہوس اور دلی کا اقتدار۔“ راجہ رتن سنگھ یکایک جل اٹھا اور اس نے اپنے غصہ
 بومیں رکھنے کے لئے کمری کے دونوں بازوؤں پر ہاتھوں کی گرفت اس قدر مضبوط کر دی کہ رگیں تنک
 آئیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایک ان سنے پیغام سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟“ رانی پدمنی کے
 لی شعلہ ریزی برقرار تھی۔

”پدمنی میں وہ پیغام سننا نہیں چاہتا جو ایک غیر مرد نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔“ بالآخر راجہ رتن سنگھ کی
 برداشت جواب دے گئی۔ ”تمہارا یہ ناز، یہ غرور، یہ احساس برتری تمہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتا کہ
 علاء الدین خلجی کی اس حرکت کا مفہوم سمجھ سکو۔ ابھی یہ سوال صرف راج محل کے راجپوتوں کی
 دل میں ابھر رہا ہے کہ سلطان نے راجہ رتن سنگھ کے بجائے رانی پدمنی کو پیغام کیوں بھیجا؟ کل یہی
 چوڑے کے ایک ایک باشندے کی زبان پر ہو گا۔ میں اس وقت سے بہت ڈرتا ہوں۔“

”سمرات کا خوف بے حقیقت ہے۔“ رانی پدمنی کے ہونٹوں پر یکایک ایک فاتحانہ تبسم ابھر آیا تھا
 لطان کو کہ نہ کسی طرح پتا چل گیا ہو گا کہ چوڑی اصل حکمران رانی پدمنی ہے۔ اسی لئے علاء الدین
 برے نام اپنا پیغام بھیجا مناسب سمجھا۔“ حسن کی سرشتی نے عجیب رخ اختیار کر لیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ نے بڑی حیرت سے اپنی بیوی کا جواب سنا۔ دل و دماغ ایک بار پھر جل اٹھے مگر اس نے
 اوجھاس نہیں کھوئے۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے دل کے ساتھ چوڑی بھی حکمران ہو مگر
 ناک یہ روش آداب سفارت کے خلاف ہے۔ اس ریاست کا جاہل ترین فرد بھی تمہاری پیش کردہ
 کو قتل نہیں کرے گا۔“ رتن سنگھ نے پدمنی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کے لئے اپنا بے انداز فکر
 بظاہر بھی نہ کرنا کہ لوگوں کی انگلیاں ہماری عزت کے پیر ہن کو تار تار کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔“
 اپنی پدمنی فطرتاً ایک ذہین عورت تھی مگر راجہ رتن سنگھ کی بے جا ناز و دیواروں نے اسے بد دماغ بنا دیا
 آج جب چوڑے کے حکمران نے راج دوت کے لائے ہوئے خفیہ پیغام کے سلسلے میں شکوک و شبہات کا
 کیا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔ ”پھر آپ نے اس مسئلہ کا کیا حل تلاش کیا ہے؟“ رانی پدمنی کے
 من گھڑاؤ تھا۔

”میں نے اسی کام کیلئے سنیاں آند پال کو راج دوت کے پاس بھیجا ہے۔“ رانی پدمنی کو پرسکون دیکھ
 رتن سنگھ بھی مطمئن نظر آنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم صبر سے کام لو اور سب لوگوں کے سامنے
 معاملات میں مداخلت نہ کرو۔ اگر سنیاں آند پال نے راج دوت سے وہ راز اگوا لیا تو یہ ہماری بڑی
 لطمیل گفتگو کے بعد آشرم کی فضا پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔

☆ ☆ ☆
 مگر راجہ رتن سنگھ سنیاں کی کامیابیوں کا منتظر تھا اور ادھر آند پال نے علی عامر آفریدی کے کمرے

”اللہ کے لئے لے کر آئے ہو۔“

ماجوہر دینا والوں کے لئے جو حیرت میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں تک کسی بے جان مورت کی طرح آفریدی، سناسی کی بات سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ ”وہ پیغام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔“

[illegible]

کچھ دیر تک رام دیو اس انقلاب کو سمجھ ہی نہیں سکا مگر جب اس نے آئندہ پال کے الفاظ پر غور کیا تو سارا بڑبڑا کھٹکا۔ رام دیو، سنیاہی کی یہ حالت دیکھ کر فرط غضب سے پاگل ہو گیا۔ ”دیوتاؤں کے اس عدار شرم میں واپس لے چلو۔“ رام دیو نے ان سپاہیوں کو حکم دیا جو دن رات آفریدی کی حفاظت پر مامور تھے۔

رام دیو کا حکم سن کر سپاہی آگے بڑھے اور پوری طاقت سے بوڑھے سنیاسی کو پکڑ کر کھینچا۔ آئندہ پالنا پر نذرانہ رکھ سادور کمرے کے فرش پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے رام دیو کی بھرپور ٹھوکر اس کے منہ پر بارش ہوئی۔ سنیاسی کی چیخ نکل گئی مگر اس چیخ میں ایک ایسا لفظ بھی شامل تھا جس کی گونج پہلی بار خانہ چوڑھو سنائی دی تھی۔ آئندہ پال نے اذیت و کرب کے عالم میں بھگوان کے بجائے ”اللہ“ کو تھا۔ ابھی اس مقدس ترین لفظ کی بازگشت ختم ہونے نہیں پائی تھی کہ رام دیو کی دوسری ٹھوکر نے سنیاسی چہرے سے خون کا آبشار جاری کر دیا۔ آفریدی کے لڑنے کی ہمدردی سے کایہ تعداد ناقابل برداشت تھا۔ ”رام دیو!“ علی عامر نے اس جادوگر کو پکارا جس کے پیچھے ستم میں چوڑھو کے حکمران ایک چڑیا کی مانند تھیں۔ یہ ٹھوکر اس بوڑھے سنیاسی کے منہ پر نہیں، سلطان علاء الدین خلجی کے چہرہ جلال پر پڑی تھی۔ یہ ضعیف و ناتواں شخص جسے تو نے اس کے خون سے نہلا دیا ہے، سلطان کا رشتہ دار ہے اور ان اپنے رشتہ دار کے ایک ایک قطرہ خون کا حساب اس طرح لے گا کہ تمہارے سروں پر لو کے سمندر بڑھ گئے۔“

”اس سے سلطان کا کوئی رشتہ نہیں۔“ رام دیو کی مکر وہ آواز گونجی۔ ”یہ ہندو دھرم کا دوشواس گھاتی (نریب کار) ہے اس کے کئے کی سزا اس طرح دی جائے گی کہ پھر کوئی بچاری اپنے دیوتاؤں سے

108 ○ شعلوں کا کفن

میں چنچنے ہی اپنے عقائد کی بازی ہار دی تھی۔ ستر سالہ بوڑھا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک تلاش اور چمبو نے میں گزارا تھا، جب وہ علی عامر آفریدی کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو دلی اس نوجوان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

”ہاں! تم وہی ہو جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا“ آندپال پر جذبہ کی سی کیفیت اور وہ بڑے والہانہ انداز میں بول رہا تھا۔ ”آخر میں نے تمہیں پالیا۔ دیکھو! دینا نے میرے درمیان کتنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں مگر میں ہر بندش سے گزر آیا۔ یہ میرا شوق آوارہ ہی پتھر سے ٹکرا رہا۔ میرے بچے تم نہیں دیکھ سکتے کہ میں کہاں کہاں سے زخمی ہوں۔ آؤ آؤ اور اس شخص کی حالت زار کا اندازہ کرو جو صحرائی چوٹی ہوئی ریت سے پانی مانگتا رہا۔ میرے دیکھو اور اس دل پر نظر ڈالو جو آگ اور دھوئیں کے درمیان کب سے سلگ رہا ہے اس سے ذات راگھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے“ تم آخری منظر کو اپنی نگاہوں میں محفوظ کر لو۔ جو ایک دن میرے بچ پر گواہی دو گے۔“

سنیاسی کی آواز ایک طاقتور مقاماتیں تھی جس نے آفریدی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک مانند اپنے بستر سے اٹھا اور اس اجنبی شخص کے قریب آکر کھڑا ہو گیا جو بظاہر ہندو تھا۔ مگر مہا مختلف۔ اس کے لہجہ میں واقعتاً ایک آگ تھی جس کی آپش آفریدی کو بھی اپنے دل کے قریب تھی۔

”برزر! میں نے نہیں پہچانا کہ آخر آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا جاتے ہیں؟“ آنر ہو کر پوچھا اور ایک نظر رام دوپڑ والی جس کی آنکھوں میں اس وقت بھی نفرتوں کے شعلے لہرا رہے تھے، اُسے دیکھ کر کہہ اٹھا۔ ”ابھی تم مجھے نہیں پہچانو گے لیکن اور تمہارا رشتہ ازل سے ہے جسے زمینوں اور زمانوں کے کچھ دن کے لئے تو ڈھپاتا۔“ یہ کہتے ہوئے سنیا سی آندہ پال نے اپنا دایاں ہاتھ آفریدی کے دیاں۔ ”آج وقت نے اسی رشتے کو دوبارہ جوڑ دیا ہے۔“

”سنیاسی!“ اچانک رام دیو گر جا۔ ”تم جس کام کے لئے آئے ہو اسے تکمیل تک
رشتے قائم کرنے میں وقت برباد نہ کرو۔“

”مہاراج!“ سنیا سی نے پلٹ کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ ”میں وہی کام انجام دے کر رہی ہوں، بس چند لمحوں کی بات ہے۔“ آفریدی جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”کیا کام؟ کیا تم سے تعلق رکھتے ہو جو تقریباً ایک ماہ سے مسلسل مجھ پر اپنے منتر آزمایا رہا ہے۔“ آفریدی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور کیا تم بھی اسی مہمانتزی کے قبیلے کے ایک فرد ہو جو مجھے گم رات کو میری تھالی میں ایک خوبصورت قاصد بھیجتا ہے اور صبح ہوتے ہی وہ معصوم لڑکی مہاراج کر دی جاتی ہے؟“

”میرے بچے! جو تم سمجھ رہے ہو میں وہ نہیں ہوں۔ مجھے اتنا بتادو کہ تم کیا پیغام لے
 سنیا سی نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہا۔

آفریدی پھر بھڑک اٹھا۔ ”جس پیغام کو قبل از وقت جانے کیلئے مجھے پیسہ ادا نہیں؟ میں اسے رانی پندی کے سوا کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔“

”تم پھر غلط سمجھے۔“ سنایا کے لہجے میں بنا بے محبت تھی۔ ”میں تو اس پیغام کے بارے

نداری کی جرأت نہ کر سکے گا۔

”سنیاسی نے دیوتاؤں سے اپنی نسبت کو توڑ دیا۔ اب یہ خدا پرستوں کا حوالہ ہے اور مسلمان حوالے کو رسوائی نہیں ہونے دیں گے۔“

”تم کیا اور تمہارا حوالہ کیا؟“ رام دیو نے انتہائی نفرت و حقارت کے لہجے میں کہا اور جھک کر آندپال کو اٹھا یا اور پھر آفریدی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تیرا یہ حوالہ میں اہل چوڑ کے لئے عبرت کا نشان بن جائے گا۔“

آفریدی بے دست و پا تھا۔ اس کی فریاد بے اثر تھی اور تینہمہ رائیگاں پھر بھی آخری امید کا سر اس نے وکرم سنگھ کو پکارا جو کمرے کی دیوار سے پشت ٹیکے، آنکھیں بند کئے اس طرح کھڑا تھا جیسے معاملات سے لافٹکھٹک ہو۔ ”مہامنتری! مجھے اسی وقت راجہ رتن سنگھ کے روبرو حاضر کر دیں یا پھر آپ کی زندگی بچانے کے لئے اپنے انشور سوخ استعمال کریں۔ اگر حلقہ اسلام میں داخل ہونے والا شخص آپ کی جابرانہ رویاؤں کی بیعت چھڑ گیا تو بدلی پر اس کے خوفناک اثرات مرتب ہوں گے۔ آفریدی کے مخاطب پر وکرم سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی مگر اس کی پلکوں پر صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اس اپرا دھی (جہرم) کو کوئی نہیں بچا سکتا۔“ وکرم سنگھ کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ را سے پورا کمرہ لرز اٹھا اور پھر اس جفاکار نے لومہاں سنیاسی کو باہر کی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ اضطراب میں آفریدی بھی آگے بڑھا مگر سفارتی آداب کی زنجیروں اور راجپوت سپاہیوں کے طائفہ کی گرفت نے اسے روک دیا۔ خیف و نزار سنیاسی کو کسی ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح پایا جا رہا تھا اور طویل راہ داری میں اس کی غمزدہ آواز گونج رہی تھی۔ ”بیٹے! میری موت کا غم تو چراغِ محروم ہو۔ جھپٹا ہاتھوں۔ اپنے حوصلہ کو بند کر رکھنا کہ ابھی تجھے بڑی آزمائشوں سے گزرنا دھندلی آنکھیں ظلم کے عفریوں کو تیری طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ ثابت قدم رہنا کہ دن اپنی ہی آگ میں جل بجھیں گے۔ کوئی کچھ بھی کر لے مگر انجام کار فتح تیرا ہی مقدر ہے۔ بڑھ گئے اور سنیاسی کی آواز ظلم کے مقبرے میں گم ہو گئی۔

آخر میں مہامنتری وکرم سنگھ کمرے سے باہر نکلا۔ جاتے جاتے ایک لمحے کیلئے ٹھہرا اور مڑ کر طرف دیکھنے لگا۔ پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسوؤں خشاروں تک آئے۔ وکرم سنگھ کی بے زبانی اپنی مجبوری کا نشانہ بنایا اور پھر چوڑ کا وزیر اعظم تیز قدموں سے اس طرف چلا گیا جہر رام آندپال کو لے کر گیا تھا۔

جاودگر کے آشرم میں ایک حشر سا برپا تھا۔ رام دیو، راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی کو چیخ چیخ کے جرم کی تفصیلات سنارہا تھا۔ جب وہ سیاہ فام سیاہ کار خاموش ہوا تو رتن سنگھ، آندپال، ”تو نے اپنے ناپ دادا کی رسمیں بھی اس لمحے کے ہاتھوں بیچ ڈالیں۔“

”ہاں! میں نے اندھیرے بیچ کر روشنی خرید لی۔“ آندپال آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ہوں کہ تو خسارے کا سودا کرے گا مگر پھر بھی تجھ پر آخری احسان کئے جاتا ہوں۔ میری بات یہ فاسق و فاجر رام دیو جو تیرے سامنے اپنے گمان کے جھوٹے دعوے کرتا ہے، چاند گرہن مفلوج ہاتھ لے کر میرے پاس آیا تھا۔ اس کے سارے منتر اسی پر الٹ گئے تھے۔ پھر جب اس نے راجہ دوت کے پاؤں چھوئے تو وہ فاجح زندہ ہاتھ حرکت میں آیا۔“ سنیاسی کچھ دیر

راہوں کی سوزش نے اسے بے قرار کر دیا تھا۔

”سراٹ! یہ اپنے گناہوں کو چھپانے کیلئے دوسروں پر ہتھیں تراش رہا ہے۔“ رام دیو نے آندپال سے سکوت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

”رتن سنگھ! ابھی وقت ہے۔ اس شعبہ باز کے حصار سے نکل کر حقیقت کا چہرہ دیکھ ورنہ جھوٹے سمات کی زمین تجھ پر تنگ ہو جائے گی۔“ آندپال، رام دیو کی پتلیوں سے بے نیاز، ایک عجیب سے عالم بخودی میں بولے جارہا تھا۔ ”سلطان کے راجہ دوت کو بے گناہ لڑکیوں کے قتل اور لوہان کے دھوئیں سے ہراساں کرنے کی کوششیں چھوڑ دے کہ اس نوجوان کو سارے ہندوستان کے جادوگر مل کر بھی فزہ نہیں کر سکتے۔“

”سنیاسی! تو جھوٹ بولتا ہے۔“ اچانک رانی پد منی نے مداخلت کی۔ ”راجہ دوت ایک حقیر کیڑا ہے۔“

ہاؤں اور راٹھوروں کی بے پناہ قوت اسے ہی نہیں اس کے سلطان کو بھی روند ڈالے گی۔“ آندپال نے پد منی کے چہرے پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی اور رتن سنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”اس کی ان کو گام دے اور ہونوں پر آہنی قفل لگا دے کہ یہ عورت خود بھی رسوا ہوگی اور تجھے بھی سارے جہاں ذلیل کر اے گی۔“ یہ کہہ کر سنیاسی آندپال خاموش ہو گیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نوں سے خون رس رہا تھا۔ سنیاسی کے دونوں ہاتھ سرخ ہو گئے۔ آندپال نے رنگین ہاتھوں کو غور سے لہا پھر آسمان پر نگاہ کی اور سر جھکا لیا۔

راجہ رتن سنگھ اپنی مغرور رانی کی زبان کو گام تو نہ دے سکا لیکن اس نے تبدیلی مذہب اور شعلہ بیانی کے میں سنیاسی کی زبان کاٹ دی۔ رام دیو، آندپال کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر رانی پد منی کی خواہش تھی کہ باہر کی زبان کاٹ کر اسے تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ بڑا اذیت ناک منظر تھا جب ایک بچ بولنے لے کو اس کی زبان سے محروم کر دیا گیا۔ آندپال نے اس موقع پر غیر معمولی قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔ منہ سے ٹوکلی چیخ نہیں نکلی مگر آنکھیں بسنے لگیں۔ تکلیف کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ مہامنتری وکرم سنگھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا تو شدت غم سے بے ہوش ہو گیا۔

پھرات کے اندھیرے میں سنیاسی کو راج محل سے باہر نکال دیا گیا۔ سورج طلوع ہوا تو اہل چوڑ کے لئے جہر تن سنگھ کا یہ فرمان جاری ہو گیا کہ سنیاسی پر ریاست کی غذا اور پانی حرام ہے۔ اگر کسی نے اس سلسلے میں آندپال سے معاونت کی تو وہ بھی راجپوت سمرات کے قہر کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی دو سپاہی مسل آندپال کے تعاقب میں تھے۔ سنیاسی پانی کے کسی چشمے پر جھکتا تو سپاہی اسے کھینچ کر دور لے جاتے رہے۔ آواز بلند اعلان کرتے۔

”اس پر دیوتاؤں کا غضب نازل ہو رہا ہے۔“

سنیاسی نے ایک دوبار پانی پینے کی کوشش کی مگر جب سپاہیوں کو اس شقی القہری پر آمادہ پایا تو خاموشی سے اپنے کمرے میں محصور ہو گیا۔ شاید وہ زبان کے زخم سے جانبر ہو جاتا لیکن پیاس نے اسے تیسرے دن ہی مار ڈالی۔ سنیاسی آندپال بڑی بے کسی کی موت مرا تھا مگر مرنے سے پہلے اس نے اپنے ہم وطنوں کیلئے ایک زندہ نیا بھجوا دی تھی۔ جاسوس سپاہیوں نے راجہ رتن سنگھ کو سنیاسی کی موت کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بہر تن سنگھ، رانی پد منی اور رام دیو کے لئے سپاہیوں کی یہ اطلاع حیران کن تھی۔

آخر اس پانی نے مندر کی دیوار پر کیا لکھا ہے؟“ رتن سنگھ اور رام دیو کو اپنے اپنے خیالات میں

غرق پاکر رانی پدمنی نے سپاہیوں سے دریافت کیا۔

دونوں سپاہیوں نے احقر کا اپنی گردنیں خم کر دیں اور لرزتی ہوئی آوازیں کہا۔ ”ہمارا رانی کا اقبال ہو۔ ہماری زبانی ان باتوں کو دہرانے سے عاجز ہیں۔“

”پھر ہم خود اپنی آنکھوں سے اس شیطان کی آخری حرکت کا مشاہدہ کریں گے۔“ یہ کہہ کر

نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ راجہ رتن سنگھ نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور رام دیو کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ سارا راضا حاصل کرنا چاہتا ہو۔

رام دیو کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ آج اس کے بدترین دشمن کو کے بے رحم ہاتھوں نے چھو لیا تھا اور یہ کامیابی رام دیو کے نزدیک عظیم الشان کامیابی تھی۔ ”میں اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ دیوتاؤں کے ٹھکرانے ہوئے کئے کا انجام کتنا دردناک ہوا۔“ یہ رام دیو نے پدمنی کی طرف دیکھا۔ ”اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ مہارانی کی رسوائیوں کی جڑ کرنے والا خود کس طرح ذلیل ہوا؟“ رام دیو نے چوڑی مغرور عورت کی نفسیات پر بڑی ہوشیار ساتھ ضرب لگائی تھی۔

رتن سنگھ نے اس اذیت ناک فضا سے نکلنے کے لئے بات کا رخ حقائق کی طرف موڑ دیا۔ اپنے دشمن کی موت کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ دشمن جاتے جاتے ہمارے کو کتنی غنی سازش چھوڑ گیا ہے۔ ہمیں اس موقع پر وکرم سنگھ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ آخر ریاست کا دماغ بھی ہے اور ہمارا بھروسہ بھی۔“ شاید وہ اس سفر میں ہمارے شریک نہ ہو سکیں۔“ رانی پدمنی دن سے مہامستری بیمار ہیں۔

وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ یہ ایک رسمی سا ذکر تھا مگر رام دیو یہاں بھی خاموش نہ رہ سکا۔ ”سمرات! انہیں سنایا آئے موت کا بہت صدمہ ہے؟“ یہ ایک بڑی خوفناک بات تھی جو مسکراتے ہوئے لہجے میں کہی گئی تھی۔ رانی پدمنی نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک رقیق القلب انسان ہیں۔ خوں منانے برداشت نہیں ہوتے۔“

”نہیں! کوئی بات نہیں۔ بس مجھے شبہ سا تھا کہ وکرم سنگھ راجہ چوڑا اور رانی پدمنی کے دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شاید اسی غم نے انہیں بیمار ڈال دیا ہے۔“ رام دیو نے وکرم سنگھ کے خلاف کی ایک چنگاری چھوڑ دی تھی جسے شعلہ بننے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

☆ ☆ ☆

مہامستری وکرم سنگھ اسی وقت بے ہوش ہو گیا تھا جب سنایا آئے رانی کی زبان کا ٹیٹھی تھا بے ہوشی کی حالت میں اسے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔

پھر جب مہامستری کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے بڑی رازداری کے ساتھ بیٹی کو اس خونی و تفصیل سنائی اور اپنے بے پناہ رنج و دالم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نرمل! وہ سنایا پوری ریاست میں تشاخص تھا جسے دیکھ کر زندگی کا حوصلہ ملتا تھا۔ اس کی میرے دل میں جینے کی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ اب سنایا کے بعد ریاست چوڑا ایک شیشاں بھوی جس میں رہنے والے لوگ بھوت بن کر مجھے ڈراتے ہیں۔ کاش! میں سنایا کو بچا سکتا۔“

وکرم سنگھ نے سنایا کی تبدیلی مذہب کی کہانی بھی نرمل کو سنا ڈالی۔

”کیا سلطان کا راج دوت ایک ایسا ہی انسان ہے جسے دیکھ کر لوگ اپنے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے مذہب کو ترک کر دیتے ہیں؟“ نرمل نے بڑے اثر انگیز لہجے میں اپنے باپ سے سوال کیا تھا اور وہ عجیب سے خیالات میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

”راج دوت روشن چہرہ رکھنے والا ایک باوقار نوجوان ہے۔ جن لوگوں نے اسے ایک بار دیکھا ہے وہ اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر آئندہ پال کا تو یہ حال تھا کہ آفریدی سے دیوانہ وار لپٹ کر روئے تھے۔ پھر سنایا نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان کے سارے جاوہر گمل کر بھی راج دوت کی زندگی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ وکرم سنگھ رقت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ”جہاں مجھے سنایا پر کئے جانے والے تشدد سے اذیت پہنچی ہے وہاں میں اس نوجوان کی بے جا قید و بند سے بھی پریشان ہوں۔ میں یہ راز صرف تم سے کہہ رہا ہوں کہ جسے دیکھ کر آئندہ پال نے اپنا مذہب بدل ڈالا وہ کوئی عام نوجوان نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے بھی آفریدی سے اپنے بچے کی طرح محبت ہو گئی ہے اور میں اس کا احترام کرنے لگا ہوں۔“

نرمل کماری، وکرم سنگھ کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہی تھی ایک اجنبی نوجوان کی بے پناہ تعریف اور شخصیت کے اس تابناک پہلو نے نرمل کو خیالوں کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ ”نرمل!“ وکرم سنگھ نے بیٹی کو آواز دی مگر جواب میں خاموشی طاری رہی۔ وکرم سنگھ نے نرمل کو دوبارہ پکارا تو اس خوبصورت لڑکی کا اٹھنا ختم ہوا اور وہ خیالوں کے حصار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئی۔ ”بیٹی! امیری مجبوریوں نے سنایا کو تو کھو دیا۔ اب ڈرنا ہوں کہ کہیں آفریدی بھی رام دیو کی جھاکاریوں کا نشانہ نہ بن جائے۔ میری تو خواہش ہے کہ راج دوت آج ہی چوڑے نکل کر دلی واپس چلا جائے ورنہ کون جائے کہ یہاں کو سناقت نہ کھڑا ہو جائے۔“

”تو پھر راج دوت کو دلی واپس بھیجے میں کیا رکاوٹ ہے؟“ نرمل نے اپنے مضطرب باپ سے پوچھا۔ ”وہی ایک ضد کہ جب تک راجہ رتن سنگھ، سلطان کے خفیہ پیغام سے آگاہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک نہ اسے رانی پدمنی سے ملنے کی اجازت ہے اور نہ دلی واپس جانے کا اختیار۔ مہاراج رام دیو تقریباً ایک ماہ سے اپنے منتر آزمایا ہے ہیں، مگر راج دوت کسی طرح بھی اپنی زبان نہیں کھولتا۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے گڑے ہوئے تمام واقعات اپنی بیٹی کو سنا دیئے۔ مہامستری کے ذہن پر جو ناقابل برداشت بوجھ تھا، آج وہ کی حد تک کم ہو گیا تھا۔

اس دوران نرمل کماری کے چہرے پر مختلف رنگ ابھر کر ڈوبتے رہے۔ اور جب بار بار رام دیو کا ذکر آیا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ”کیا مہاراج کے اثرات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ راج محل ان کی جنبش چشم کا پابند ہو کر رہ گیا ہے؟“ نرمل کی آواز شدید حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”کیا اب چوڑی قسمت کے فیصلے ایک جاوہر کے آئینہ میں کئے جائیں گے؟“

”بس بیٹی! خاموش رہو!“ نرمل کی بے باکی کا یہ انداز دیکھ کر وکرم سنگھ لرز اٹھا۔ ”اس شخص کے بارے میں اپنے گھر کی دیواروں سے بھی کچھ نہ کہنا۔ تم مہاراج کے متعلق صرف سوچ سکتی ہو لیکن تمہیں انکار دے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس لمحے سے پہلے تمہیں کوئی حق حاصل بھی تھا تو تمہارا باپ آج تم سے وہ حق چھین رہا ہے۔ مجھے معاف کرنا نرمل کہ تمہارا باپ اس ریاست میں بالکل تنہا ہے۔ تمہیں میری تنہائی کی کم! اپنے ہونٹوں پر موت جیسی خاموشی کے پہرے بٹھا کر انتظار کرو کہ انتظار ہی نئے راستے کھولتا ہے۔“

آفریدی تین راتوں سے عجیب اذیت و کرب کا شکار تھا۔ جس دن ابتدائے شب میں رام دیو، آندپال کو بے دردی کے ساتھ چھینچتا ہوا آفریدی کے کمرے سے لے گیا تھا، اس رات علی عامرہ لکھوں کے لئے سو کا تھا اور پھر وہی لمحے اس کے لئے ایک عذاب جاں بن گئے تھے۔ آنکھ لگتی ہی نے خواب دیکھا تھا کہ سنیاہ آندپال کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرف ہوئے ہیں جیسے وہ آفریدی کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے مگر اچانک راجپوت سپاہی درمیان میں حائل ہو ہیں۔ پھر سنیاہ کی ایک تیز چبھتی ابھرتی ہے۔

”بیٹے! میری زبان کاٹ دی گئی۔ میں دنیا سے جا رہا ہوں۔“

یہ خواب اتنا لرزہ خیز تھا کہ دہشت سے آفریدی کی آنکھ کھل گئی تھی پھر اس نے محافظ سپاہی راہنہ در خواست کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے راج رتن سنگھ کے پاس لے چلو۔ مہمانتزی و کرم کم کرو کہ آفریدی ان سے ملنا چاہتا ہے۔ سنیاہ آندپال پر کیا کڑی؟ تم نے میرے ایک ہم مذہب کے کیسا بے رحمانہ سلوک کیا ہے کہ وہ خواب میں آکر مجھے پکار رہا ہے؟“ آفریدی وحشیوں کی مانند چڑچڑاہوں نے اس کی ایک بھی نہیں سنی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پتھر کے ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اپنی با

☆.....☆.....☆

راج محل کے ایک کمرے میں آفریدی کی آنکھوں سے اشک جاری تھے اور ”کبھیہ شام“ میں جادوگر رام دیو سنیاہ آندپال کی لاش دیکھ کر چیخ رہا تھا۔ ”آخر تو اپنے بدترین انجام کو پہنچا اور لئے آگ کے دروازے کھل گئے۔ وہ آگ جو ایک پانی کا جسم جلانے کے بعد اس کی روح کو بھی بندہ رہتی ہے۔“

راج رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بھی سنیاہ آندپال کی لاش کو دیکھا اس مختصر سے کمرے میں جسے بونے خون کے نشانات نظر آرہے تھے۔ یہ سنیاہ کی کئی ہوئی زبان سے بھنے والا خون تھا۔ سپاہی اطلاع کے مطابق آندپال نے تین دن کی بھوک اور پیاس کے بعد اڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی گئی کے چہرے پر اذیت و کرب کا ہلکا سا لمس تک نہیں تھا۔ موت کے خوف اور تکلیف سے اکثر بگڑ جاتے ہیں۔ مگر سنیاہ کا چہرہ مرنے کے بعد کچھ اور روشن ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھول معصوم مسکراہٹ تھی اور آنکھیں نیم باز تھیں۔ جیسے آندپال کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک کر اس دوران رانی پدمنی خاموش کھڑی، سنیاہ آندپال کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی اچانک آنکھوں سے حیرت اور بے چینی جھلنے لگی۔ ”سمرات! آپ فضول باتوں میں وقت برباد کر رہے ہیں دیوار کو دیکھئے جس پر ہمارا دشمن اپنی آخری تحریر چھوڑ گیا ہے۔“

پدمنی کی آواز سن کر راج رتن سنگھ اور رام دیو چونک اٹھے ان کی نظریں بیک وقت اس دیوار کو اٹھ گئیں تھیں جس پر ہمارا دشمن اپنی پدمنی اشارہ کر رہی تھی۔

رام دیو نے بہ آواز بلند اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا جسے سنیاہ آندپال نے لوہے کی کسی نوٹکی دیوار پر نقش کیا تھا۔

”اہل چوڑ! میں تمہاری اس دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں۔ جس میں ہوس، ظلم اور جھوٹ کے نہیں۔ میں نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک پتھر کے دیوتاؤں کی خدائی تسلیم نہیں کی۔ اس لئے ایک کمرے میں محصور کر دیا گیا۔ تم نے مجھے اچھوت سمجھ لیا کہ میں راج رتن سنگھ کا معتب تھا۔“

اکہماری کے آگے اپنے سروں کو جھکا دیا جس کا نام رام دیو ہے۔ پھر اس وقت میری زبان کاٹ دی گئی میں نے سارے بتوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ میں دروازے سے دروازے پھر کہ تمہیں اردوں میں اس عذاب کی خبر دوں جو کسی خونیں آندھی کی طرح چوڑ پر منڈا رہا ہے۔ مگر تم بد نصیب تھے اپنی جیسے ایک فانی انسان کے خوف سے گھروں کے کواڑ بند کر لئے۔ جب ملین اپنے مکانوں کا ایک نہ روزانہ بند کر دیں تو پھر حیات بخش تازہ ہوا کہاں سے آئے گی؟ مجھے معلوم ہے کہ ایک دن سیاہ مہر و راج کے جس میں تمہارا دم گھٹ جائے گا۔ تمہارا ایک جرم یہ بھی ہے کہ تم نے مجھ پر پانی بند کر دیا۔ نہ والے کیس گئے کہ میں پیاس سے مر گیا لیکن ایسا نہیں ہے۔ بے شمار لوگ اس طرح بھی مرتے ہیں کہ کے منہ میں ”گنگا جل“ ہوتا ہے۔ پھر پانی کی کیا حیثیت ہے؟ میں تو اس اللہ کے حکم سے فنا ہوا جو اپنی ذات میں تھا ہے۔ اگر تم مجھے پانی پلا دیتے تو شاید میرا پلن بار (پالنے والا) تمہارے تالابوں، نموں اور آشلوں کو سرخ ہونے سے بچا لیتا مگر اب ایسا نہیں ہو گا۔ جس پانی کی ایک ایک بوند کو بچانے کے لئے تم نے میری بے کسی کا تشاؤ دیکھا، غنیمت یہ وہ پانی تمہارے ہی خون سے سرخ ہو جائے گا۔ دلی سے نے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ میرے بھائی ہیں، میرے بچے ہیں۔ ان کے جسم گھوڑوں کی پیٹھ پہنچ چکے ہیں بس لگاموں کو جنبش ہونے کی دیر ہے۔ پھر ان کے گھوڑوں کے سم تمہاری چٹانوں کے جگر دیں گے۔ یہ ”اراولی“ پھاڑ اور ”آبو“ کی بلند چوٹیاں انہیں سجدے کریں گی پھر نہ تمہیں کہیں کوئی ن لے گی اور نہ تمہارے دیوتاؤں کو۔ میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اللہ کی جت پوری جائے۔ وہ کسی کو بے خبری کے عالم میں نہیں پکڑتا۔ میں نے تمہیں خبر پہنچادی۔ میرا کام ختم ہوا اب ماری ڈسے داری یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی ادھر آئے تو راج رتن سنگھ تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ مہندو دھرم چھوڑ چکا ہوں اس لئے مجھے مرنے کے بعد آگ کے حوالے نہ کیا جائے۔ راجپوت سمرات کو بے کہ وہ میری لاش کو گھوڑے کی پشت پر باندھ کر دلی روانہ کر دے۔ وہیں میرے تمام رشتے دار بخود ہیں وہ میرا ختم سندس کار (آخری رسوم) اپنی مرضی کے مطابق کر لیں گے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو پھر میرا مردہ جسم راج دوت کے سپرد کر دیا جائے کہ مذہبی رشتے سے وہ میرا بیٹا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ مذہم کے سامنے والوں کو دنیا سے کس طرح رخصت کیا جاتا ہے۔ پھر جب راج دوت میرا بے روح جسم حاصل رے تو اسے لازم ہے کہ وہ کوہ ”آبو“ پر مائی بھان متی کے مندر کے قریب میری لاش کو ٹھکانے لگا دے ایک باپ کی حیثیت سے اس پر میرا یہ قرض ہے کہ وہ میرے گناہوں کی بخشش کیلئے اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اس کے بعد دیوار کا کچھ حصہ خالی تھا۔ اندازاً ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سنیاہ آندپال نے یہ بات اپنے منہ پر لکھ کر پڑھ کر تحریر کی ہے پھر جب وہ شدید کمزوری کے باعث کھڑا نہ رہ سکا تو زمین پر گرا اور پھر اس نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

”مجھے جو چھ کہنا تھا، کہ چکا۔ پھر بھی اہل چوڑ کو آخری ہدایت دیتا ہوں کہ اگر میری وصیت سے اگروانی گئی اور میرے مردہ جسم کو چٹا پر رکھ کر جلادیا گیا تو میں نہیں جانتا کہ آسمان تمہارے ساتھ کیا لوک کرے گا؟ ہو سکتا ہے کہ اس بڑے عذاب سے پہلے تم پر ایک اور عذاب نازل ہو جائے۔“

اس کے بعد عبارت ختم ہو گئی تھی مگر سنیاہ نے تین بار ”اللہ“ کا نام تحریر کیا تھا۔ دو شکلیں مکمل تھیں رتہ رتہ لفظ تامل رہ گیا تھا اور درمیان سے ایک لکیر کھینچنے ہوئی نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ اس بات کا علامت تھی کہ سنیاہ کے ہاتھ بے جان ہو چکے تھے۔ لوہے کا وہ ٹکڑا بھی وہیں فرش پر پڑا تھا جس سے بابت دیوار پر کندہ کی گئی تھی۔ خود سنیاہ کی لاش دروازے کے قریب پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آندپال

نے اپنا آخری پیغام یا وصیت لکھنے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر مرنے سے پہلے وہ زمین پر گھٹیا کے بل دروازے تک پہنچا تھا اور کواڑ کھول کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔
رام دیو نے سنیا سی کی تحریر پڑھ کر راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی جانب دیکھا وہ دونوں سکوت میں کھڑے تھے اور ان کے چروں پر وحشت برس رہی تھی۔

”اب کیا ہو گا مہاراج؟“ راجہ رتن سنگھ نے لڑکھائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سنیا سی کی لاش کو آگ کے حو لے کریں۔ دیوتاؤں کا قہر اسے چھونک کر رکھ دے گا۔ پھر چوڑ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ آئندہ پال کتا بڑا جھوٹا تھا۔“ رام دیو کے ایک ایک لفظ سے سنگھ ہوری ہو رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ نے بظاہر رام دیو کی تجویز کو قبول کر لیا تھا لیکن ابھی اس کے دل میں ایک خلش تھی۔ ”مہاراج! ہمیں اس نازک صورت حال میں مہمانتزی سے مشورہ طلب کرنا ہو گا۔ وکرم سنگھ! دماغ ہر آڑے وقت میں ریاست کے کام آیا ہے ایسے موقع پر مہمانتزی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ رتن سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

☆ ☆ ☆

پھر جب مہمانتزی وکرم سنگھ کو شاہی رتھ میں بٹھا کر کلمبھ شام کے مندر لایا گیا تو صورتہ الجھ گئی۔ وکرم سنگھ نے سنیا سی کی لاش دیکھی تو دل پڑ کر رہ گیا۔ مہمانتزی جانتا تھا کہ آئندہ پال پر تشدد کیا جا رہا ہے اس کا انجام دردناک موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ مگر جب موت مجسم ہو کر سامنے وکرم سنگھ کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سنیا سی تیسرے دن ہی پتھروں دنیا سے چلا جائے گا۔ ”زبان کٹ جانے سے انسان کی موت واقع نہیں ہوتی۔“ غمزہ مہمانتزی ڈوبے ہوئے بہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ ”پھر کیا راجہ رتن سنگھ نے دوسرا حکم جاری کر کے سنیا کے تمام دروازے بند کر دیئے؟“

وکرم سنگھ ابھی اپنے سوال کا جواب تلاش ہی کر رہا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کی بارعب آواز ”وکرم سنگھ! یہ ہمارے دشمن کے ماتم کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے ہمارے بدخواہوں کے لئے کچھ نرم گوشے موجود ہیں۔“ بالآخر رتن سنگھ نے وہ بات کہہ ڈالی جس کو رام دیو نے اشارہ کیا تھا۔

”نہیں سمرات! میں آپ کے دشمنوں کا خیر خواہ نہیں ہوں۔“ وکرم سنگھ نے اپنی طرف والے طوفان کو روکنے کی کوشش کی اور وہ دل و دماغ کی بکھر جانے والی ساری قوتیں سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ”پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”جب ہم نے مہار آشرم میں سنیا سی کی ناپاک زبان کا ٹیخی اس وقت تم شدت غم سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب یہ ہو رہا ہے کہ جیسے آئندہ پال کو موت نہیں آئی خود تمہاری جان بدن سے نکل جانے والی ہے۔ ہونا تو تھا کہ دشمن کی ذلت و خواری پر تم جشن مناتے لیکن ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اگر جیتا میسر آجائے تو تم سنیا سی کے صدمہ فراق میں گر یہ وزاری کے ساتھ سینہ کوئی شروع کر دو۔“

”سمرات! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔“ وکرم سنگھ نے اس آفٹ ناگمانی کو ٹالنے کے لئے اپنا ڈالا۔ ”اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرے اعصاب بھی اتنے شکستہ ہیں کہ کوئی بھی غم برداشت ہوتا۔ میں آئندہ پال کو ایک گیلیانی ضرور مانتا تھا لیکن میں نے آج تک آپ کی وفاداری پر کسی شے کو توڑا

دی۔“ راجہ رتن سنگھ، مہمانتزی کی وضاحت سے تو مطمئن نہیں ہوا مگر رانی پدمنی کی بروقت مداخلت نے اسے راجہ رتن سنگھ کے غضب سے بچالیا۔ ”سمرات! یہ بات درست ہے۔ نرلا کی ماں کے دیہانت راجہ رتن سنگھ نے مہمانتزی کی دنیاوی بدل ڈالی ہے۔ شیر جیسا دل رکھنے والا اب کسی کا خون بہتے ہوئے نہیں (انتقال) دیکھ سکتا۔“

”اب اس کمزوری پر قابو پاؤ وکرم سنگھ! کیا خبر تمہیں کل خون کا دریادیکھنا پڑ جائے۔“ راجہ رتن سنگھ کا غصہ و خشم ہو گیا تھا مگر انداز گفتگو تحقیر آمیز تھا۔ ”فی الحال تم اس بیچ انسان کی آخری دھمکی کا جائزہ لو جس کے غم نے تمہیں بڑھال کر دیا ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر جب وکرم سنگھ نے سنیا سی آئندہ پال کی پتھر کے سینے پر رقم کی جانے والی تحریر پڑھی تو ان کا دل پھل کر آنکھوں کے راستے باہر آنے لگا اور جسم اس قدر لرزا کہ وکرم سنگھ کو دوبارہ فرش پر بیٹھ جانا پڑا۔ ”مہمانتزی! اپنے چہرے پر کہاں تک نقاب ڈالو گے؟ تمہاری شخصیت کا ایک ایک زاویہ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تم راجہ رتن سنگھ کے دشمن سے دلی ہمدردی رکھتے ہو۔“

وکرم سنگھ نے دوبارہ سننے کی کوشش کی۔ ”مہاراج! یہ اس شخص پر الزام تراشی ہے جس کی ایک ایک سانس راجہ رتن سنگھ کی عظیم روایات کے عشق میں بسر ہوئی ہے۔ مجھے سنیا سی آئندہ پال کی موت کا قلق نہیں۔“ مہمانتزی نے اپنے دل پر جبر کر کے یہ سنگین جھوٹ بولا۔ ”میں تو اپنی جہم بھومی (مادر وطن) کی تپائی کے تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سنیا سی کی پیش گوئی غلط ہے لیکن اگر وقت نے اسے حقیقت کا روپ دیدیا تو پھر کیا ہو گا؟ سمرات میرے جذبات سے باخبر ہیں کہ میں چوڑ کے شیشو قار پر خوف پارسوائی کا ایک ذرہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ وکرم سنگھ نے بڑے جرات مندانہ لہجے میں عیار رام دیو کی تہمت کا جواب دیا۔

”وکرم سنگھ ہم نے تمہیں اس مشورے کے لئے طلب کیا ہے کہ سنیا سی کے مردہ جسم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ہندو رسم و رواج کے مطابق بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیں یا پھر آئندہ پال کی وصیت کا لحاظ رکھیں؟“

بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ حالات وکرم سنگھ کو ایک بار پھر موت و زیست کے دوراہے پر لے آئے تھے۔ مہمانتزی نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے لئے سلامتی کا راستہ منتخب کیا۔ ”سمرات دونوں صورتوں پر مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سلطان کا راجہ دوت، سنیا سی کی لاش کو اس کی وصیت کے مطابق آج کی بلندی پر لے جا کر پتھروں کے نیچے دبا دے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم سنیا سی کی دھمکیوں سے ڈر گئے۔“ رتن سنگھ پھر چراغ پا ہو گیا۔ ”اس طرح تو چوتھوں میں ایک رسم زندہ ہو جائے گی کہ جو بھی چاہے اپنے باپ و دادا کے مذہبی دائرے کو توڑ کر نکل جائے۔ ہم اس گمراہی کے بیچ کو پھونٹنے کیلئے سازگار موسم فراہم نہیں کریں گے۔ یہ بڑی شکست ہو گی۔“ وکرم سنگھ خاموش رہا اب وہ دیوار کا سارالے کر کھڑا ہو چکا تھا۔

”سنیا سی کو آگ میں جلاتا ہی ہو گا۔“ رام دیو نے مہمانتزی کی طرف دیکھتے ہوئے نعرہ زنی کی۔ ”سبے شک! کسی انسان کا قہر نہیں بدلا جاسکتا۔“ ہواؤں کا رخ دیکھ کر وکرم سنگھ نے بھی اپنی زبان کو مصلحت کے سانچے میں ڈھال لیا۔

راجہ رتن سنگھ نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے اس جھوٹی تحریر کو دیوار سے کھرچ دو اور پھر

دیوتاؤں کے ٹھکرائے ہوئے ایک ناشکر گزار انسان کو چتا پر رکھ کر پھونک ڈالو۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں بڑے عذاب سے پہلے چھوٹا عذاب کس طرح نازل ہوتا ہے۔

چوڑے فرمانروا کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے سنیا سی کی کندہ کی ہوئی عبارت کو مٹانا چاہا مگر نقوش گہرے اس لئے سپاہی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

”اس پر سنیا سی پھیر دو۔“ سپاہیوں کی بے بسی دیکھ کر رتن سنگھ نے دوسرا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد سنیا سی روشن تحریر کو کالے رنگ نے اس حد تک چھپا لیا کہ انسانی آنکھ اسے واضح طور پر پڑھنے سے قاصر تھی۔

پھر ایک مفلس انسان کی طرح سنیا سی کی چتا معمولی لکڑیوں سے سجائی گئی۔ اس کی لاش پر نہ خوشبو پھول تھے اور نہ مہکا ہوا صندل کا پانی بس ایک گھٹیا درجے کا تیل جسے لکڑیوں پر چھڑک دیا گیا تھا۔ آگ لگ کر رسم رام دیو نے ادا کی۔ جا دو گر کاسیا ہاتھ بڑھا اور لکڑیوں میں آگ لگ گئی۔ شعلے آہستہ آہستہ بڑھ گئے اور سنیا سی کا پورا جسم ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ آگ نے اپنی فطرت کے تقاضے پورے کئے۔ سنیا سی ہڈیاں جھنجھٹے لگیں اور گوشت جلنے لگا۔ فضا ایک ناگوار بو سے بھر گئی۔ دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے اور پھر مندر کے باہر موجود تمام لوگوں نے محسوس کیا کہ سورج کی تیز دھوپ مدہم ہوتی جا رہی ہے۔ راجہ سنگھ نے گہرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ جا دو گر کے چہرے پر وحشت نمایاں تھی۔ ابھی وہ موسم کی تبدیلی راز سمجھنے نہیں پایا تھا کہ دیر پر شام لگنا شروع ہوئی۔

”سمرات! راج محل واپس چلیں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔“ رام دیو نے چیخ کر کہا۔

پھر دوسرے ہی لمحے شاہی رتھ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور وکرم سنگھ کو لے کر محل کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ابھی اقتدار کی سواری اپنی پانچ گاہ تک پہنچنے نہیں پائی تھی کہ چاروں سمت گہری تاریکی پھیل اور ہوا کے جھونکے دم بدم تیز ہونے لگے۔

رام دیو رتھ چلانے والے کو قہر آلود لہجے میں ڈانٹ رہا تھا۔

”تمام فاصلے چند لمحوں میں طے کر ڈالو۔“

ہاتھیوں جیسی جسامت رکھنے والے بیل تیز رفتاری سے پتھر لے راستے پر بھاگ رہے تھے اور ہواؤں شور بڑھتا جا رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی جو آگے بیٹھے ہوئے تھے، ان کے چہروں پر وحشت بریں تھی۔ ایسے سنگین لمحات میں رانی پدمنی نے مڑ کر جا دو گر رام دیو کی طرف دیکھا جو خود بھی بدحواسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

مہمانداری وکرم سنگھ بھی آنے والے طوفان سے خوفزدہ تھا مگر اس کے چہرے پر کبھی کبھی خوشی کی ایک بھی ابھرتی تھی۔ ایسی لہر جسے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دیکھنا نہیں جاسکتا تھا۔ وکرم سنگھ کی یہ خوشنیا آئندہ پال سے ایک تعلق خاص کے سبب تھی۔ وہ سنیا سی کی موت پر زور دہ شور کے ساتھ نوحہ خوانی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب آئندہ پال جیسے عظیم گیانی کا جنازہ اٹھے تو پورا چوڑا نڈ آئے۔ ایک ایک گھوڑے آدھ فغان بلند ہو۔ ایک ایک چراغ بجھا دیا جائے اور پھر جب سنیا سی کی چتا میں آگ لگے تو اس کی چٹا سے سرسبزہ جل اٹھے۔ مگر یہ ایک غریب آرزو تھا، آسودہ تمنائوں کا ظلم تھا جسے وقت کے بدلے ہاتھوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ سنیا سی جو پہلے ہی ارباب اقتدار کا معتب تھا، تبدیلی مذہب کے بعد وہ چوڑے کے بندوؤں کے لئے سب سے زیادہ لعنت زدہ انسان بن گیا تھا۔

”کاش! یہ اندھیرا اتنا بڑھ سکے کہ رام دیو کا پورا وجود تاریکی میں گم ہو جائے اور رتن سنگھ چوڑی پہاڑیوں پر، گلیوں میں، کوچوں میں چیتا پھرے کہ اس نے ایک مہاپرش (مرد عظیم) کو قتل کر دیا اور یہ طوفان

اسی سرشتی کا انجام ہے۔“

وکر سنگھ سوچ رہا تھا اور شاہی رتھ ہواؤں سے الجھتا ہوا راج محل کی طرف جا رہا تھا۔ رتھ میں بیٹھے والے وکرم سنگھ کو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے تیز ہوائیں بیلوں کے منے ہوئے قدموں کو اکھاڑ پھینکیں گی اور قیمتی چاروں افراد کو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے تیز ہوائیں بیلوں کے منے ہوئے قدموں کو اکھاڑ پھینکیں گی اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ سواری کسی گہرے کھڈ میں جا گرے گی۔ مگر یہ صرف اندیشے تھے جو ہواؤں کے زور کو دیکھتے ہوئے قہقہے سے نکلے گئے تھے۔ رتھ کئی بار لڑکھڑایا، رانی پدمنی کی چیخیں ابھریں، راجہ رتن سنگھ کی زبان سے دعائیہ کلمات ادا ہوئے اور رام دیو کے نعرے گونجنے لگے۔ ”جے جگ دیسے۔“ (دنیا کے چلانے والے کا نام سر بلند رہے) سب اپنے اپنے انداز میں چیخ رہے تھے۔ مگر وکرم سنگھ انتہائی پرسکون حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی تو خواہش ہی یہی تھی کہ بھینک طوفان آئے اور آئندہ پال کی سچائیاں تمام چوڑے والوں پر غبار ہو جائیں۔

پھر کسی نہ کسی طرح شاہی رتھ راج محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہر طرف ایک حشر سا بڑا تھا۔ نفاذِ اقتدار میں غرق رہنے والے لوگ چیخ چیخ کر اپنے دیوتاؤں کو پکار رہے تھے اور ان سے مدد مانگ رہے تھے کوئی ”برہما“ کو آواز دے رہا تھا، کوئی ”شیو“ کا نام لے رہا تھا، کسی کی زبان پر ”شکر“ کا ذکر تھا کسی کو ”کرشن“ کی ضرورت تھی، کوئی ”رام“ کا طلب گار تھا، کوئی ”ہنومان“ کے سامنے دامن پھیلائے ہوئے کھڑا تھا اور کسی نے قہر کی دیوی ”درگا“ کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ مگر ہوا کے جھونکوں کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پورے چوڑے پر ایسا گھبراہٹ اندھیرا چھا ہوا تھا کہ اس کے مقابل ”امادس کی رات“ بھی چھٹی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ محل کے ہر کمرے میں فانوس جلا دیئے گئے تھے اور کانوری شمعیں روشن کر دی گئی تھیں مگر پھر بھی ہر شے دھندلی نظر آرہی تھی۔ محل سے باہر غریب عوام کی بستیوں پر کیسی تاریکی چھائی ہوئی تھی اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔

راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور مہمانداری وکرم سنگھ دربار خاص میں داخل ہوئے تو چوڑے کے امراء اور سردار حیران و پریشان کھڑے ہوئے تھے۔ مسلح محافظ سپاہیوں کے چہروں پر انجانے خوف کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے اپنے درباریوں کو ہوش و حواس میں رہنے کی تلقین کی مگر راجپوت سرداروں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں نہ ایسا اندھیرا دیکھا ہے اور نہ ایسا پر شور آندھی۔ راجہ رتن سنگھ کے حقیقی کاموں بلرام سنگھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ آندھی نہیں، شاید چوڑے دیوتاؤں کا قہر لوٹ رہا ہے۔

رتن سنگھ رتن سنگھ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بلرام سنگھ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے رام دیو کی طرف دیکھا۔

”مہاراج! آپ ہی اپنے سامنے والوں کو اس سیاہ آندھی کے بارے میں بتائیں۔“

رام دیو جو شل اضطراب میں کھڑا ہوا اور بہ آواز بلند، اہل دربار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”یہ کوئی اسادھارن (غیر معمولی) بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی ستاروں کی گردش ایک ایسے نقطے پر آجاتی ہے جس سے موسم میں عجیب و غریب تغیرات رونما ہو جاتے ہیں۔ چاند گرہن کی رات کے بعد شنی (ستارہ زحل) اور مٹکل (ستارہ مریخ) میں مقابلے کی نظر قائم ہوتی ہے جس کے سبب فضاؤں میں انتشار پرا ہو گیا ہے۔ کل بارہ بجے دن جب یہ مکمل نظر ختم ہوگی تو اندھیرے خود بخود چھٹ جائیں گے اور ہواؤں کی سرکشی باؤمبا کے نرم و لطیف جھونکوں میں بدل جائے گی۔“

رام دیو کی وضاحت سن کر راجہ رتن سنگھ کاموں بلرام سنگھ سرد رہا کھڑا ہو گیا۔ ”مہاراج! مجھے آپ کی جھٹک کر وہ اس تو جیسہ بہ شدید اختلاف ہے، میں نے بھی چوڑے کے ایک بڑے گیانی ست پال سے علم نجوم

داسیوں کو طلب کر کے اس نے اپنی تمام سانسیں شراب میں غرق کر دی تھیں۔ جب تک ہوش باقی رہے، رام دیو، سنیا سی آئندہ پال کو غلیظ گالیاں بکھار رہا۔

ہواؤں کی سرخی بڑھتی رہی، راجہ رتن سنگھ بھی بار بار رانی پد منی سے ساغر مئے طلب کر رہا تھا۔

”آپ کب تک پئیں گے؟“ رانی پد منی جھجھلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

”جب تک چوڑے درو دیوار پر اجالا نہیں پھیل جاتا اور یہ دیوانی ہوائیں سکون کی زنجیریں نہیں پھینکتیں۔“ شراب اور خوف و دہشت کے اثرات سے رتن سنگھ کی آواز کانپ رہی تھی۔

”مدارج رام دیو تو کہہ رہے تھے کہ مرنے اور زحل کے مقابلے کی نظر کئی دن تک قائم رہے گی۔“ رانی پد منی بھی ہراساں نظر آ رہی تھی۔ ”اس طرح چار پانچ روز تک نہ اندھیرے چھٹیں گے اور نہ پاگل ہوائیں فہرں گی۔“

”جھگڑا جانے کے اگلے پل کیا ہو گا؟“ راجہ رتن سنگھ بہت شکستہ نظر آ رہا تھا۔

”جھگڑا کیوں جائیں؟“ پہلی بار رانی پد منی کے لہجے میں ساحر اعظم کے خلاف بغاوت کا عکس نظر آیا تھا۔ ”زمین و آسمان کے معاملات تو مدارج کے سپرد ہیں، پھر وہی جان سکتے ہیں کہ آنے والی گھڑیاں کیا خبر لے کر آتی ہیں؟“

”مدارج! تمہاری زبان سے یہ تلخ باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔“ راجہ رتن سنگھ نے مخمور آنکھوں سے اپنی اس بیوی کی طرف دیکھا جس کی رعنائی شباب پر کسی آتش فشاں کا دھوکا ہوتا تھا۔ ”میں نے تو صرف تمہاری خاطر رام دیو کو سرچھایا ہے کہ تم اس کے قدم چھوٹی ہو۔“

رانی پد منی سنبھل گئی کہ اسی کی وجہ سے رام دیو کو راج دربار میں غلبہ حاصل ہوا تھا۔ رانی پد منی نے اپنے شوہر کو غلام بنانے کے لئے رام دیو سے بڑے بڑے چاپ اور منتر کرائے تھے، پھر جلدی ان کی کوششوں کے اثرات اس طرح ظاہر ہوئے تھے کہ رتن سنگھ جیسے مغرور اور سرکش حکمران کو اپنی بیوی کی ناز برداری کے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

”میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مجھے مدارج کے گیان پر کوئی اعتراض ہے۔“ رانی پد منی نے کسی بے ہوش شاطر کی طرح نئی چال چلی۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مدارج رام دیو کو بلائیں اور ان سے کہیں کہ اپنی نشتیوں کے ذریعے اس خوفناک فضا کو بدل ڈالیں۔“

”مدارج! میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مدارج کچھ نہیں کر سکتے۔“ راجہ رتن سنگھ کی آواز بدستور لرز رہی تھی۔ ”پہلے ہمیں سنیا سی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب محسوس ہوتا ہے جیسے آئندہ پال بچ کھاتا۔“

”کوئی بات؟“ رانی پد منی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”میں کہ چاند گرہن کی رات، مدارج رام دیو، آفریدی پر منتر آزماتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو گئے تھے اور پھر ان کا ہاتھ اسی وقت متحرک ہوا تھا جب انہوں نے راج دوت کے قدم چھوئے تھے۔“

چوڑے کا ساحر اعظم اپنے گیان کی شکستوں سے سلطان کے خفیہ پیغام کو نہ پڑھ سکا، پھر وہ آسمان پر ہونے والے فیصلوں کو کس طرح روکے گا؟ ”یہ کہہ کر راجہ رتن سنگھ مایوس نظروں سے رانی پد منی کی طرف دیکھنے لگا۔“

”سمرات! دھیرج دھیریں۔ اگر آپ نے اس وقت ہوش و حواس گنوائے تو پھر راجپوتوں کی عظیم الشان سلطنت کا کیا ہو گا؟ آپ مدارج کو طلب تو کریں۔ وہی کوئی اُپائے (ترکیب) سوچیں

بڑھا ہے۔ میں بھی ستاروں کی چالیں سمجھتا ہوں۔ اگر مرنے والے کے مقابلے کی وجہ سے یہ موسم آیا ہے تو پھر اہل دربار کو یہ بھی بتائیں کہ زحل کی سیاسی اور مرنے کی سرخی اتنی آسانی سے زائل نہیں اندھیرے نے گل کھلائیں گے اور یہ سرکش ہوا میں نئے حادثوں کو جنم دیں گی۔“

برام سنگھ کی بات سن کر رام دیو غصے سے کانپنے لگا۔ ”سمرات! میں کچھ دن سے دیکھ رہا ریاست کے معمولی انسان بھی میرے گیان کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ میں اپنی ریاستوں کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر برام سنگھ کا گیان چوڑے کو آفات و مصائب سے بچا سکتا ہے تو پھر میری کماں باقی رہتی ہے؟ میں اپنے آشرم میں جا رہا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کے میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔“

رام دیو نے بڑی عیاری سے نینا نکر چا رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کے ماتھے پر پل پڑ گئے اور اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے خاندان کے ایک سردار بار ڈانٹا تھا۔ ”برام سنگھ! میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ تمہاری جمالت میری ریاست کے بڑے گیانی کو ناراض کر دے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم سے راضی رہوں اور تم پر دربار کے کھلے رہیں تو مدارج کے سامنے اپنے جہل کا اقرار کرو۔“

بوڑھے برام سنگھ نے اپنے اسحق و نادان بھانجے کو ایک نظر دیکھا اور یہ کہتا ہوا دربار سے نکل کر اہل علم ہیں وہ ان پڑھ لوگوں کا بھی مذاق نہیں اڑاتے۔ علم تو انسان کے صبر و ضبط اور ظرف و تحمل کرتا ہے۔ بے شک! میں جاہل ہوں مگر ستاروں کے جن اثرات کا ذکر مدارج نے کیا ہے، اور بے بنیاد ہے۔ میں اس طرح جا رہا ہوں کہ پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گا لیکن مدارج کو صحیح صورت ہو گی کہ اس ”اندھیرے اور آندھی“ کے پیچھے کیا چھپا ہے؟ میں کسی بھی صورت میں ماننے کو ہوں کہ یہ آندھی چوڑے کوئی ستم ڈھائے بغیر چپ چاپ گزر جائے گی۔“

برام سنگھ کے چہرے کا غبار اسی غبار کو لے کر وہ دربار سے نکل گیا۔

برام سنگھ کے جانے کے بعد رام دیو نے پرجوش لہجے میں کہا ”میں رام دیو، ساحر اعظم کام آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آندھی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تاریکی بے حقیقت ہے اور پرشو اپنے اندر کوئی ضرر نہیں رکھتیں۔ آپ سب لوگ اطمینان سے اپنے گھروں میں آرام کریں۔“

کی تقریر نے اہل دربار کو مطمئن کر دیا تھا اور پھر چوڑے کی یہ بات اثر ہستیاں دربار سے نکل کر اپنے اپنے گھر لوٹ گئیں۔ جادوگر رام دیو محل کی طویل راہ داریاں طے کرتا ہوا اپنے آشرم کی طرف بڑھنے لگا۔

دکرم سنگھ دربار سے اٹھ کر اپنے مکان میں چلا گیا جو قلعے کے وسط میں آباد تھا۔ اور راجہ رتن پد منی کو لے کر دربار سے ملحقہ اپنی آراستہ خواب گاہ میں آ گیا۔

☆ ☆ ☆

چوڑے کے بایسوں کا خیال تھا کہ یہ سیاہ آندھی جو پچھلے برسوں میں آنے والی تمام آندھیوں سے تھی، کچھ دیر بعد دم توڑ دے گی مگر جب ہوا کے جھکڑوں نے طول کھینچنا تو پوری ریاست پر خوف و حیرت کی نظر آنے لگی۔ لوگوں نے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں کو تختی سے بند کر لیا تھا، لیکن ہر لمحے گمان ہوتا تھا کہ ان کے درو دیوار تنگوں کی طرح اڑ جائیں گے۔ غریبوں کی بستیوں میں تمام بوڑھے بچے اور عورتیں اپنے اپنے دیوتاؤں کے ساتھ رام دیو کو بھی مدد کے لئے پکار رہے تھے کہ وہ ان کا

تھا۔

اور زندہ دیوتا کا یہ حال تھا کہ وہ ہوا کے تھپڑے کھاتا ہوا اپنے آشرم تک پہنچا تھا اور پھر یکے

گے۔ آخر وہ ساحر اعظم ہیں۔ ان کے ترش میں دشمنوں کے لئے اب بھی کوئی نہ کوئی زہر ملا ہوگا۔

”تم یہ کوشش بھی کر دیکھو، مجھے تو شراب کی ایک بوند کے برابر بھی توقع نہیں کہ مہاراج کچھ گے۔“ رتن سنگھ کی زبان بری طرح لڑکھڑاہی تھی۔

پھر جب رانی پدمی نے ایک پہرے دار سپاہی کے ذریعے رام دیو کو طلب کیا تو اسے مایوسی کے نہیں ملا۔ سپاہی بہت دیر میں زخمی حالت میں ناکام واپس آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گردوغبار پانی بہہ رہا تھا اور جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔

”ابھی جا کر مہمانتزی و کرم سنگھ کو اطلاع دے کہ انہیں مہارانی یاد کر رہی ہے۔“ پدمی میں بھی وہی تنہی تھی جس کا مظاہرہ سرکش ہوا کر رہی تھی۔

سپاہی لرزے ہوئے قدموں سے وکرم سنگھ کے مکان کی طرف جانے لگا۔ عین اسی وقت مہاراج بیٹی نرملا سے پر جوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”میرا سنیاسی سچا ٹھہرا۔ اگر چوڑ پر یہ عذاب نازل آئے تو پال جھوٹا قرار پانا اور میری تمام عمر کی عقیدت رائیگاں جاتی۔“

”کیا آپ اس آندھی کو سنیاسی کے شراب (بدعا) کا نتیجہ سمجھتے ہیں؟“ نرملا نے حیرا ہوئے کہا۔

”یقیناً! سنیاسی نے یہی لکھا تھا کہ اگر اس کی لاش کو جلا یا گیا تو تر عظیم سے پہلے چوڑ پر ایک اور عذاب ہوگا۔ غور سے دیکھو! یہ عذاب نہیں تو اور کیا ہے؟“

”جانتی! آپ اس عذاب سے خوش ہیں؟“ نرملا نے اپنے باپ سے ایک عجیب سا سوال کر دیا۔ ”نہیں! میں اپنے وطن اور قوم کی تباہی پر خوش نہیں ہوں۔ مگر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم کی دروزنک موت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ بیٹی! تم نہیں جانتیں کہ وہ کیسی پیاس لے کر رخصت ہوا ہے۔“ یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ رونے لگا اور پھر اس نے آہ زاری کے ساتھ وہ داستان جو سنیاسی آندھیال نے ”گمبھ شام“ کے مندر کی دیوار پر تحریر کی تھی۔

یہ واقعہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ نرملا کی پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ ابھی وہ اپنے مہریان باپ سے دریافت کرنا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ وکرم سنگھ نے باہر آکر دیکھا تو اس کا ملاز راجہ رتن سنگھ کا حکم سنا رہا تھا۔ مہمانتزی نے پلٹ کر نرملا کو صورت حال سے آگاہ کیا اور تسلی دی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج تو تنگدو اور ہوس کاروں کے حساب کا دن ہے۔ وہ جن بے داغ ہیں اور جن کے ہاتھ صاف ہیں، آج انہیں کسی غم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مکان سے رخصت ہوا اور ایک مختصر سا فاصلہ طے کر کے راجہ رتن سنگھ کی خلوت خاص میں ہو گیا۔

مہمانتزی نے مودبانہ سلام پیش کر کے چوڑ کے حکمرانوں کو اپنی آمد کا احساس دلایا۔ رتن بے شکل تمام اپنی بندہ ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور ہاتھ کے اشارے سے مہمانتزی کو اپنے قریب کے لئے کہا۔ ”وکرم سنگھ! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”سمرات میں کچھ نہیں جانتا۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔ ”نہ مجھے ستاروں کی چال اور نہ میں جادوگری کا ہنر جانتا ہوں۔ مہاراج رام دیو آسمانوں کی بھی خبر رکھتے ہیں اور زمینوں کی وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے اپنے فطر کے شہزادہ دیو کے توانا جسم میں اتار دیئے تھے۔

”مہاراج کا ذکر نہ کرو کہ وہ آشرم کا دروازہ بند کئے کسی چاپ میں غرق ہوں گے مگر یہ سرکش بان کے منہوں کی زنجیر سے گرفتار ہونے والی نہیں۔“ کثرت شمار اور شدت خوف سے رتن سنگھ اڑ بڑھ رہی تھی۔ ”ہمیں سنیاسی کے جسم کو آفریدی کے حوالے کر دینا چاہئے تھا۔“

وکرم سنگھ کے جواب دینے سے پہلے رانی پدمی بول اٹھی۔ ”سمرات نے جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ میری دسترسوائی کی پیش گوئی کرنے والے کا انجام اتنا ہی عبرتناک ہونا چاہئے تھا۔“

پورے حال دیکھ کر وکرم سنگھ نے اپنے لہجے کو وقت کی ضرورت اور مصلحت کے سانچے میں ڈھال لیا۔ رات! جو قدم آپ کو اٹھانا تھا وہ اٹھا چکے ہیں۔ اب چوڑ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر گری نیند میں۔ جو کچھ لکھا ہو گا وہ آئندہ چند گھنٹوں میں ظاہر ہو جائے گا۔ ابھی ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ آندھی

ہاں پیش گوئی کا نتیجہ ہے یا نقل مہاراج مرتضیٰ و زحل کے مقابلے کا انجام؟ ہمیں صبح تک بہر حال انتظار دے گا۔“

☆ ☆ ☆

رات اہل چوڑ کے لئے قیامت کی سی رات تھی۔ بس کچھ عیش پرستوں نے حد سے زیادہ شراب پی کر شہ کی آغوش میں نہا ہوا حاصل کی تھی ورنہ ریاست کا ہر شخص موت و زیست کی کشش کے دوران جاگ رہا ات کے ختم ہونے کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو سکا لیکن جب سپاہی میں کچھ کمی واقع ہوئی تو قیاس کر لیا گیا کہ اٹل آیا ہے۔ راجہ رتن سنگھ کے اعصاب شراب کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے اور وہ مہمانتزی سے کہہ رہے تھے۔ ”وکرم سنگھ! انھو، ہم خود چل کر مہاراج سے دریافت کریں کہ انہوں نے اس آفت ناگمانی کو کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں؟“

اراجت سمرات اور وکرم سنگھ سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ راج محل سے باہر نکلے تو ہواؤں کا ٹکڑا اور تاریکی بھی اس قدر کم ہو گئی تھی کہ قریب سے دیکھنے کے بعد چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں لکھتا تھا۔ رتن سنگھ کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ جیسے وہ ایک طویل عذاب سے نجات پا کر اپنے اکی زندگی کی طرف پلٹ رہا ہو۔ مگر اس وقت رتن سنگھ حیران رہ گیا جب اس نے آشرم کے دروازے پر اس پایا۔ سرکش ہواؤں نے فولا اور پتھر کی اس مضبوط ترین پناہ گاہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر دیا تھا۔ سپاہیوں نے ملہ صاف کر کے اپنے حکمران کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ بنایا۔

لہذا اتنی خوف کی حالت میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا آشرم میں داخل ہوا تو اب کی بار اس کے منہ سے تیز چیخ مگر یہ چیخ دہشت کی چیخ تھی۔ رام دیو کا خوبصورت آشرم ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا ن کے تمام چیلوں کی کنیاں منہم ہو چکی تھیں اور چھوٹے شیطان اینٹوں کے ڈھیر میں دبے پڑے رتن سنگھ کے اشارے پر سپاہیوں نے جائزہ لیا تو تمام جادوگر شدید زخمی ہو کر مر چکے تھے۔ راجپوت نے گھبرا کر تالاب کی جانب دیکھا تو وہ پتھروں اور لکڑیوں سے بھر چکا تھا۔ رام دیو نے اپنے جادوئی ہتھکنڈے کو جانور پالے تھے وہ بھی اس حادثے کی تاب نہ لا کر فہو چکے تھے۔ رتن سنگھ سمے ہوئے ن آگے بڑھا تو ایک اور عبرتناک منظر اسے دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ رام دیو کا چالیس کمروں پر مبنی محل بھی طے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ رتن سنگھ نے شدت خوف سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سمرات! جل رہی! اس میں خوشی کی ایک لہر اٹھی تھی جسے اس نے اپنے سینے ہی میں دبا دیا۔

ن مہمانتزی کی خبر سن کر اسے اس کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔“ وکرم سنگھ کی

ایک لاری تھی اور چوڑا کفر ماروا اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی اسی فریب و عیاری کا اسیر نظر آرہا تھا۔ وکرم کے سامنے تذبذب اور کشاکش کی ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ مہمانتزی اپنے جسم کو اس دیوار سے ٹکرانا میں چاہتا تھا مگر دقت کے بیچ و خم نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ایک بار ہمت کر کے وہ اس دیوار کو گرا دے۔ آخر وکرم سنگھ نے اس جھجک پر قابو پا لیا جو اسے آج تک لب کشائی سے روکتی رہی تھی۔

”سراٹ! میں مہاراج رام دیوی کی روحانی عظمت پر طنز نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کا بیان ہمارے کسی کام نہیں آیا۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ بہت سرد تھا۔

”آخر تم کہنا چاہتے ہو؟“ رتن سنگھ نے شرر باز نظروں سے مہمانتزی کی طرف دیکھا۔

”شاید اب وقت آگیا ہے کہ راجپوتوں کی بے مثال طاقت کا مرکز مہاراج کے طلسمی حصار سے نکل جائے ورنہ یہ عظیم الشان سلطنت ان منتروں کی نذر ہو جائے گی جو ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔“ وکرم سنگھ نے اپنی قوم سے رسم وفاداری نبھانے کے لئے وہ بات کہہ ڈالی تھی جو خود اس کی زندگی کے لئے خطرے کا ایک نشان بھی بن سکتی تھی۔

”کیا آپ اپنی بات کا مفہوم سمجھ رہے ہیں؟“ رانی پدمی نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ ایک ذہین عورت ہونے کے باوجود رام دیوی کی شان میں کسی حرف گستاخ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”ہاں مہارانی! تمہارے اس بوڑھے چچا نے بہت غور و فکر کے بعد ہی آج پہلی بار زبان کھولی ہے۔“ وکرم سنگھ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ ”مہاراج نے اپنی تماشہ راجدوتی کو تین آڑائیں مگر وہ دلی کے ان دوت پر قابو نہیں پاسکے۔ اگر ہم کچھ دیر کیلئے آفریدی کو جادوگر تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہو گا کہ مہاراج بڑا ساحر ہے۔“

راجدوت سنگھ اور رانی پدمی کے پاس وکرم سنگھ کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں شدید نیرت کے عالم میں مہمانتزی کو دیکھ کر رہے تھے۔

”اور اگر ہم مہاراج کے بقول اس سیاہ آندھی کو مانی بھان متی کی ساحرانہ کرشمہ سازیوں کا نتیجہ سمجھ لیں تو پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔“ وکرم سنگھ نے رام دیوی کی قوتوں کو جھٹلانے کے لئے ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”جو عورت کوہ آبو کی چوٹی پر بیٹھ کر چوڑی فضاؤں کو زیر و زبر کر سکتی ہے، اسے قتل کرنے کے لئے کون جائے گا؟“ وکرم سنگھ کا سوال بڑا عجیب تھا۔

راجدوت سنگھ اور رانی پدمی کی حیرت بڑھتے بڑھتے وحشت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے پاس مہمانتزی کے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔

”سراٹ! جو عورت ہواؤں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی قدرت رکھتی ہے وہ کس طرح کسی انسان کو اپنے قریب بخینے دے گی۔“ آہستہ آہستہ وکرم سنگھ کا لہجہ پر جوش ہوتا جا رہا تھا۔ ”اور اس بات کی بھی کیا ضمانت ہے کہ مانی بھان متی کے قتل ہو جانے کے بعد کوئی دوسرا طوفان نہیں آئے گا۔“ وکرم سنگھ نے ریاست چوڑا کاسب سے بڑا دماغ سمجھا جاتا تھا، آج اسی دماغ نے راجدوت سنگھ کے سامنے بیک وقت ایسے ہی سوال اٹھائے تھے جن کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔

”پھر کیا ہو گا؟“ رانی پدمی نے جھجکتے ہوئے اپنے سیاستداں چچا سے پوچھا۔ پہلی بار اس کی پتھر ملی شخصیت میں ہلکی سی دراڑ پڑی تھی۔ اور سر پر غرور میں پہلی مرتبہ معمولی سے جھکاؤ کا زاویہ نمایاں ہوا تھا۔

”مہاراج کی روحانی شخصیت کو سیاست کے دائرے سے خارج کر دیجئے۔“ وکرم سنگھ کے لہجے نے سارا ماحول سے مکمل بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ”مہاراج کا کسی مشورے میں شریک ہونا وہ بات ہے مگر

اور جب کچھ دیر بعد ریاست کے نومند سپاہیوں نے لمبہ صاف کیا تو بڑے دلخراش منظر آئندہ سامنے ابھر آئے تھے۔ ہر کمرے میں ایک بے لباس لڑکی مردہ پائی گئی یہ سب کی سب رام دیوی کی رات تھیں۔ اب رتن سنگھ کو یقین ہو چلا تھا کہ مہاراج بھی کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ اور پھر ایلو جب رام دیو کے منہم کمرے کو صاف کیا گیا تو وہاں موجود چار پانچ لڑکیاں تو سر جچی تھیں مگر رام پتھروں کے نیچے دبا ہوا سکہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھا لیکن چلتی ہوئی سانسیں اس کی زندگی کا ثبوت کر رہی تھیں۔

”مہاراج کو جلدی باہر نکالو اور اسی وقت راج وید کے پاس لے چلو۔“ رتن سنگھ جوش جذبہ چینا۔ آج اس کا روحانی پیشوا بڑی بے چارگی کی حالت میں تھا۔ سپاہیوں نے برق رفتاری سے کار رام دیو کے شگفتہ جسم کو اینٹوں اور پتھروں کے انبار سے باہر کھینچ لیا۔ پھر جیسے ہی راجدوت سنگھ اور وکرم رام دیو کے بے ہوش جسم کو لے کر راج محل کی طرف بڑھے، ہوائیں یک بہ یک تیز ہو گئیں اور اندھیرا طرح گہرا ہونے لگا۔

راج وید نے رام دیو کے جسم پر اپنی مسیحا کے تمام نسخے آزمائے پھر کہیں جا کر اس نے ا کھولیں۔ راجدوت سنگھ کے چہرے پر خوشی کا گہرا عکس ابھر آیا اور اس نے گہرا کر رام دیو سے ”مہاراج! اب کیسی طبیعت ہے؟“

”میری فکر چھوڑو اور چوڑا کو بچانے کی کوشش کرو۔“ رام دیو نے کہا۔

”چوڑا دشمن ابھی اس دھرتی پر موجود ہیں۔ اسی وقت راج دوت کو قتل کر دو اور اس کا کتا ہوا سر گیش را قدموں میں ڈال دو۔ اس کے بعد کوہ آبو کے مندر پہنچ کر اس بوڑھی غیبیت جادوگر مانی بھان متی ہلاک کر ڈالو۔ وہ آندہ پال کو اپنا بھائی کہتی ہے۔ آندھی کا یہ طوفان اسی ذلیل عورت کا لایا ہوا۔ بھی سنیا سی کی طرح اپنا مذہب بدل چکی ہے۔ جب تک یہ دونوں ملے چوڑی پاک دھرتی پر موجود رہیں آندھی اسی طرح بڑھتی رہے گی۔ اگر آپ نے تاخیر کی تو پھر میں چوڑی سلامتی کی ضمانت نہیں سکتا۔“ یہ کہہ کر رام دیو دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ایک بار پھر والئی چوڑی عشرت گاہ میں خفیہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس اجلاس میں رانی پ شامل ہو گئی تھی۔ راجدوت سنگھ نے کسی شگفتہ دل عاشق کی طرح پھر شراب کو اپنے ہونٹوں سے لٹا ”وکرم سنگھ! کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا حکمران کس اذیت میں مبتلا ہے؟“ رتن سنگھ کے غضب بھی تھا، نفرت بھی تھی اور احساس شکست بھی۔

”میں سراٹ! ابھن کو سمجھتا ہوں۔“ وکرم سنگھ نے اپنے الفاظ کو ہمدردی اور غمگساری کی پہنائے ہوئے کہا۔

”ابھن نہیں، عذاب کو، کبھی ختم نہ ہونے والا عذاب۔“ رتن سنگھ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ ”جس دن سے یہ بد بخت سفیر چوڑا میں داخل ہوا ہے اسی روز سے ریاست پر عذاب کے دھند منڈلاتا شروع ہو گئے تھے اور اب وہی بادل اتنے سیاہ ہو چکے ہیں کہ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔“ ٹھیک سی کہتے ہیں، اسے گیش دیوانی سمیٹ چڑھا دو اور پھر اس بوڑھی جادوگر مانی بھان متی کے کھوکھلے جسم کو سے باندھ کر چٹانوں پر کھینچو۔ اندھیرے کا یہ عذاب خود بخود فنا ہو جائے گا۔“

راجدوت سنگھ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وکرم سنگھ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رام دیوی کی

جب ان کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ”حکم“ کا درجہ اختیار کر لیتا ہے تو مسائل ادا ہیں۔“

راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی نے سکوت اختیار کر لیا تھا۔

”سمرات! میری گستاخی معاف کریں۔ اگر سنیاہی کی لاش علی عامر آفریدی کے حوالے کر دو اس میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔“

”لیکن کہنے والوں کی زبان کون روکتا؟ اسے ہماری شکست سے تعبیر کیا جاتا اور پھر اہل چہ پر سکون عقائد میں ایک پھل سی مچ جاتی۔“ راجہ رتن سنگھ نے جواباً کہا مگر اس کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

”اس وقت کوئی پھل نہیں پھلتی۔“ وکرم سنگھ نے راجہ رتن سنگھ کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت سب کچھ خاموشی سے ہو جاتا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ چوڑ میں ایک گوشہ نشین لاش گزر گئی۔ عام لوگوں کو تو سنیاہی کے عذاب کی کیفیت اس وقت معلوم ہوئی جب وہ اپنی زبان سے محرم

پراس کی شرت میں ایک ایک قطرہ آب کیلئے ترسا۔ چوڑ کے باشندوں نے سنیاہی کو ٹالابوں اور چڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی آنکھوں نے یہ مناظر بھی محفوظ کر لئے کہ راجپوت سپاہی سنیاہی کو مار

پانی پینے سے روک دیتے تھے جب اس کے ہونٹ ذخیرہ آب کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ عوام آرمعوب و جلال کے خوف سے اپنی زبانیں نہیں کھولتے مگر ان کی آنکھوں میں ایک ایک نقشِ جم کر رہ گیا

پانی کسے کہتے ہیں اور ایک معتب انسان پر بھگوان کی یہ ازاں نعت کس طرح بند کی جاتی ہے؟“

”وکرم سنگھ! جو گزر گئی سو گزر گئی۔“ راجہ رتن سنگھ نے ایک اور لبریز جام سرخ اپنے ہونٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”اب سوچو کہ ہمیں ان بلا یز اندھیروں سے کس طرح نجات مل سکتی ہے؟“

”میرے نزدیک بس ایک ہی صورت ہے کہ آپ مائی بھان متی سے رابطہ قائم کریں۔“ وکرم سنگھ نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔

”سنیاہی آمدنیال بھی مائی کا بہت احرام کرتے تھے۔ اب ان کے سوا اور کون رہ گیا ہے جو مستقبل کے رازوں کو منکشف کر سکے۔“

وکرم سنگھ کے مشورے پر راجہ رتن سنگھ بری طرح چونک اٹھا اور رانی پد منی بیچ و تاب کھانے لگا۔ اس سے برداشت نہ ہوا تو بیچ اٹھی۔

”آپ سمرات کو ایک طوائفِ زادی کے سامنے دامن بچھا ترغیب دے رہے ہیں۔ کیا اب راجپوتوں کی آن اس طرح نیلام ہوگی؟“

وکرم سنگھ نے اس الزام تراشی کے شتر کو بڑی مشکل سے سینے پر روکا اور پھر بہت افسوسناک لہجہ لگا۔

”سمرانی! آپ شاید نہیں جانتیں کہ بھان متی کی ماں روپ متی کو راجپوت سردار نے دھوکا روپ متی ایک غریب سپاہی کی بیٹی تھی اور راجپوت سردار اجیت سنگھ نے نیکروں نے تمہیں کھا کر ہل مندر میں بھگوان شکر کو گواہ بناتے ہوئے روپ متی سے خفیہ شادی کر لی تھی۔ پھر جب زبردست

میں جاہ و اقتدار کا سوال اٹھا تو اجیت سنگھ نے روپ متی کو پچپانے سے انکار کر دیا اور غریب روپ متی عیش پرستیوں کی زندہ نشانی دے کر دوسرے راجپوت سردار کنور سنگھ کی نوخیز بیٹی سے شادی روپ متی کے ماں باپ رسوائی کے خوف سے خودکشی کر کے مر گئے مگر وہ خود بھان متی کی پیدائش

رہی۔ روپ متی بے گناہ تھی اس لئے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے حالات سے جنگ کرتی رہا

اجیت سنگھ کے ہاتھ بہت دراز تھے اس نے مستقبل کے کسی دعوے کے خوف سے روپ متی کو زہر دیا

اس وقت بھان متی کی عمر چھ سات سال تھی مرتے وقت ماں نے بیٹی کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ اس

معاشرے کے ہاتھوں اس پر کیا گزری ہے اور آخری سسکیوں کے درمیان یہ ہدایت بھی کر دی تھی

کے مرنے کے بعد وہ مندر کے نیک دل پجاری ست رام کی شرن (پناہ) میں چلی جائے۔ بے سہارا بھان متی مندر میں چلی گئی اور پجاری ست رام نے اپنی بیٹی سے زیادہ اس کی نگہداشت کی۔ بھان متی کے

ذہن پر اس سنگین حادثے کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ وہ دنیا والوں سے شدید نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب مندر میں آنے والی اس سے بڑی عمر کی لڑکیاں بھان متی پر انگلیاں

اٹاتی تھیں کہ اس کا باپ نہیں ہے۔ ایسے نازک موقع پر پجاری ست رام اپنی بے لوث محبت دے کر اس کے مصوم ذہن کو غبار آلود ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر زہر پھر زہر تھا۔ قطرہ قطرہ کانوں

میں ٹپک کر دل کی طرف اترا تا ہی راجن لوگوں کو بھان متی کا بچپن یاد ہے وہ اس کی گریہ و زاری کو بھی نہیں بھولیں گے۔ وہ دن رات دیوتاؤں سے اپنی ماں کا انصاف مانگتی تھی۔ پھر جب بھان متی کے ساتھ انصاف

کیا گیا تو سردار اجیت سنگھ کی دوسری نوخیز بیوی آگ میں جل کر مر گئی۔ اس موقع پر لوگوں نے اجیت سنگھ کو بت سمجھا کہ وہ بھگوان سے ڈرے اور علی الاعلان اپنی بیٹی کو اس کے جائز حقوق دے دے۔ مگر وہ خاندانی

غور کے نشے میں یہی کہتا رہا کہ روپ متی جیسی عورتیں سرداروں کے حملات کی زینت بڑھانے کے لئے صرف داشتہ بی بن سکتی ہیں ایک بیوی نہیں۔ اجیت سنگھ نے بڑا تکبر کیا تھا اور پھر جب کوڑھی ہو جانے کے

سبب اسے تمام رشتے داروں نے بدستی سے باہر نکال کر پھینک دیا تو وہ بھان متی ہی تھی جس نے دن رات اپنے باپ کی خدمت کی مگر اجیت سنگھ بڑا سفاک انسان تھا جب تک اس کی زبان بھی کوڑھ کے اثرات سے گل

کر زمین پر نہیں گر گئی اس وقت تک بھان متی کی خدمات کے صلے میں کثیف و غلیظ گالیاں ہی دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے سارے اعضاء گل گئے اور وہ گوشت کا سرخ ٹوکڑا بن کر رہ گیا پھر جب

دست اجل نے اس کی جان سلب کی تو اجیت سنگھ کی آنکھوں میں گیلندوں اور لومڑیوں جیسا خوف تھا اور پھر وہ خوفزدہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بچھ گئیں۔ ایسی عبرتناک فضا میں بھی بھان متی ہی کی ذات تھی جس نے اجیت

سنگھ کا آخری کرایم کیا اور قصاب باپ کی چٹا کو آگ لگائی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بھان متی اس طرح ریاست کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ مندر میں

آنے والے کسی شخص کا منہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی۔ اسے انسانوں سے نفرت تھی اور پھر یہی نفرت بڑھتے بڑھتے دیوتاؤں کے خلاف نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بچپن ہی سے کہا کرتی تھی کہ ایک دنیا کے اتنے

مالک نہیں ہو سکتے پھر وہ ایک خدا کے دھیان میں گم ہو گئی اور اسے اتنا گیان حاصل ہو گیا کہ اگر کسی بڑے سے بڑے ہندو کو بھی ٹھاکر گم سے دیکھ لیتی تو اس کے بدن میں آگ لگ جاتی۔ یہی وہ حادثہ تھا جس نے

بھان متی کو جلال کا پیکر بنا دیا ہے۔ اب وہ کسی انسان سے ملنا بھی گوارہ نہیں کرتی اور لوگ خود بھی اس کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

”وہ کوئی بھی روپ دھار لے مگر ہم ایک طوائفِ زادی کے دروازے پر بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔ چاہے ریاست چوڑ کا ایک ایک ستون ہوا میں اڑ جائے اور ہمارے زندہ جسم پتھروں کی چٹانوں میں دب کر

بچھ کر کیلے خاموش ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر رانی پد منی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور راجہ رتن سنگھ اس کے

نہروں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔

”سمرات! ابھی کبھی جنگ جیتنے کیلئے اپنی فوجیں پیچھے بھی بھانی پڑتی ہیں اور کبھی مناسب موقع کی تلاش

میں دشمن سے دب کر بھی معاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے ایک جنگی حکمت عملی ہی سمجھ لیجئے۔“ وکرم سنگھ نے

رضامندی کے لہجے میں کہا کہ بھان متی کی شکر گردہ رانی پد منی کے حسن کا غلام تھا اس لئے اس مغرور عورت کی

کڑھائی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

جب صورت حال قابو میں نہ آئی تو دکر م سنگھ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس ہجے میں راج دوت سے بھی ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر دکر م اور طویل راہداری سے گزرتا ہوا آفریدی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

مہمانتزی، سلطان کے راج دوت کا چہرہ دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ آفریدی کی سرخ و سفید رنگت کا میں تبدیل ہو گئی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔ دودن سے اس نے نہیں کھا یا تھا۔ وکر م سنگھ کو دیکھتے ہی چیخا۔

”سنیاسی! کہاں ہیں؟ مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتا۔ تمہارے محافظ سپاہی کیے ہیں۔ اب ختم آئے ہو تو مجھے دھارس دی ہوئی ہے کہ شاید تمہاری زبانی سنیاسی کا کچھ حال معلوم ہو۔ آفریدی کی آنکھوں میں وحشت تھی اور لمبے میں ایک عجیب سادہ تھا۔

”سنیاسی آندپال ٹھیک ہیں مگر انہیں تبدیلی مذہب کے جرم میں حوالہ زنداں کر دیا گیا۔ وکر م سنگھ نے آفریدی کی بے قراری دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا ہی مناسب سمجھا۔

”نہیں! مہمانتزی تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“ آفریدی نے تیز آواز میں کہا۔ ”میں مسئلہ راتوں سے سنیاسی کو خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی زبان کاٹ دی گئی ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں میں دینا سے جا رہا ہوں۔“ آفریدی کے بیان میں اس قدر خلتش اور بے ساختگی تھی کہ مہمانتزی سنگھ لرز کر رہ گیا۔

”مہمانتزی! مجھ سے جھوٹ نہ بولنے کہ اس جھوٹ کے بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ قاتل کسی ہندو کو قتل نہیں، ایک مسلمان کی ہلاکت ہے اور اس ہلاکت کا حساب پوری ریاست چوڑ ہے۔ خیر! میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں لیکن میرے بعد آنے والے سنیاسی کے قتل کا اتنا طرح لیں گے کہ تاریخ ہند میں صرف راجپوتانے کا ذکر باقی رہ جائے گا اور زمین اپنا نشان تک گی۔“ آفریدی کا لہجہ آتش فراق سے جل اٹھا تھا اور اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔

راج دوت کے جذبات کا یہ الم انگیز مظاہرہ دیکھ کر خود وکر م سنگھ بھی رونے لگا تھا۔ ”بیٹے! اپنے دل کا غبار آنسوؤں سے دھو دیا۔ میں اس درد کو کہاں لے جاؤں جس کی شدت سے میرا ہوا جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ میں اس بھری ریاست میں سنیاسی کا تمام عقیدت مند ہوں۔ خواب میں آندپال کی شکستہ حالت دیکھی ہے اور میں تو خود اپنی جاگتی آنکھوں سے اسے مرنے اور میں جلتے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ صبر کرو! میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ یہ کہہ کر وکر م سنگھ نے سنیاسی کی زبان کاٹنے جانے اور پھر مندر کی دیوار پر خوفناک تحریر لکھنے اور آخر میں ایڑیاں لرز کر مرنے والے واقعات آفریدی کو سنا ڈالے۔ یہ فسانہ غم اتار، اذیت ناک تھا کہ آفریدی پاگل سا ہو گیا۔ وہ راجپوتوں کے اس نظام آمریت کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر وکر م سنگھ کی عاجزانہ درخواست نے غصہ سے دور رکھا۔

”تم دودن سے بھوکے ہو۔“ ایک ایک مہمانتزی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میں اس غم میں دو مہینے بھی بھوکا رہ سکتا ہوں۔“ آفریدی کے ہونٹوں پر آگ روشن تھی۔

”تمہیں کچھ دن کیلئے اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنا ہو گا۔ تمہارے لئے یہ اس شخص کی نصیحت

ہ تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔“ وکر م سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم مجھ بوڑھے انسان کی ہنگاموں کا بھرم رکھو گے اور ان لوگوں کے سامنے اپنی زبان کو ہرگز جنبش نہیں دو گے۔“ اتنا کہنے کے وکر م سنگھ چلا گیا اور آفریدی نے دل پر جبر کر کے چند لقمے اپنے حلق سے اتارے مگر ایک لمحے کیلئے بھی وہ اپنی آندپال کے منہ سے بہتے ہوئے خون کو فراموش نہ کر سکا۔

☆ ☆ ☆

دوسری رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ اندھیرے ہر شے کو نگل گئے تھے اور سرکش ہواؤں نے راج محل کی اداں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں بہترین صنایعوں کی بنائی ہوئی یہ رات اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ اسی رات کوئی نصف شب کے قریب رانی پدمنی نے خواب دیکھا کہ وہ وحشی مانوں کے جہنم میں گھری ہوئی ہے۔ ان کے تیر اور نیزے پدمنی کے سر و سمن جیسے جسم میں پیوست گئے ہیں۔ منظر اس قدر خوفناک تھا کہ رانی پدمنی چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی اس کی جگر خراش چیخ سے راجہ ن سنگھ نے بھی اپنی محو آنکھیں کھول دیں۔ پھر جب رانی پدمنی نے سراٹ کو اپنا خواب سنایا تو رتن سنگھ کڑائی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔

”یہ سیاہ طوفان مبارا راج رام دیو کے منترؤں سے نہیں رکے گا۔“

”ہیں اپنی غرض کیلئے اس طوائف زادی کے دروازے پر بھی جانا ہو گا۔“ راجہ رتن سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”بس ایک بار یہ طوفان ٹل جائے پھر ہندو دھرم کی اس دشمن پر بھی چوڑ کی زمین تنگ رہ جائے گی۔“ راجہ رتن سنگھ نے بڑی رازداری کے ساتھ پدمنی کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنی آندپال کی طرح مائی بھان متی کو بھی اس کے عبرتناک انجام تک پہنچا کر دم لے گا۔ پدمنی نے اموشی اختیار کر لی۔

☆ ☆ ☆

یہ مسئلہ حل ہوا تو وکر م سنگھ کو دوبارہ طلب کیا گیا۔

”اس آندھی میں ”کوہ ابو“ کا دشوار ترین سفر کس طرح طے پائے گا؟“ راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر غصہ ہراس کی ہلکی سی لہر نمایاں تھی۔

”ممکن ہے کہ آپ عام حالت میں باہر نکلتے تو یہ سرکش ہوائیں آپ کا راستہ روک لیتیں مگر اس وقت بارش ایک نیک کام کیلئے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس دشوار گزار راہ میں مائی بھان متی کا آئینہ واد ہمیں حاصل رہے گا۔“

اب کی بارشانی راتھ میں برق رفتار سیاہ گھوڑے جوڑے گئے۔ پھر جیسے ہی وہ راتھ راج محل کی حدود سے نکلا تو حکومت چوڑ کے دونوں با اثر افراد کو اندازہ ہو گیا کہ پاگل ہوائیں کتنی بھری ہوئی ہیں اور تاریکی کس قدر گہری ہے؟ کئی بار راتھ اس طرح ڈولنے لگا کہ اس کے کیڑوں فٹ گرے کھڑ میں گر جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس قدر تنگین فضا میں وکر م سنگھ نے با آواز بلند پکارا۔

”مائی بھان متی! ہم تیرے مہمان ہیں، اس کا لحاظ رہے۔“ وکر م سنگھ کے الفاظ کی گونج جیسے ہی ختم ہوئی ڈولہ ہوا شای راتھ متوازن ہو گیا۔ راجہ رتن سنگھ نے حیرت سے وکر م سنگھ کی طرف دیکھا مگر اس کے دل میں مائی بھان متی کیلئے اب بھی نفرت کی آگ جل رہی تھی۔

علاقے کا سسر ”بھل شاہ“ کے مندر کی طرف تھا۔ راجپوتانہ (راجستھان) کا پہاڑی سلسلہ اس علاقے کو قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک مغربی اور دوسرا مشرقی حصہ۔ یہ تمام پہاڑی سلسلے

”اراولی“ کے نام سے مشہور ہیں، یہ سلسلے ”ایشان کوثر“ سے شروع ہو کر ”نیترو بینہ کوثر“ گئے ہیں (کوثر سنسکرت زبان میں زاویے کو کہتے ہیں) یہ پہاڑ ”اڑے پور“ ”بانسواڑہ“ اور پور“ میں نسبتاً چوڑے نظر آتے ہیں۔ اسی کو ہمارا ایک سلسلہ ”مانڈل گڑھ“ سے ہوتا ہوا ”بوندی“ اور ”بھالواڑ“ تک پہنچ گیا ہے۔ ”جودھپور“ میں ”اراولی“ ایک مکمل پہاڑ کی مانند ہے لیکن ”جیسلمیر“ میں یہی پہاڑ اونچے نیچے ٹیلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

”اراولی“ کے سلسلہ کو ہمارے ”آبو“ سب سے زیادہ بلند مقام ہے۔ ”ہندووا“ ”جینوں“ کی مذہبی کتابوں میں ”آبو“ کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ اس مذہبی نقطہ نظر سے بھی ”کوہ آبو“ کو موجودہ دنیا میں ایک خوبصورت پہاڑی مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں کے مطابق کوہ آبو ”زمانہ قدیم میں رشیوں اور سنیاسیوں کی پناہ گاہ تھی پہلے پہلے یہاں گو تھے۔ ان کھدوں کے متعلق ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بڑی دلچسپ روایتیں موجود ہیں۔ یہ ایک بار کسی باشندہ نامی رشی کی گائے کھدی گئی۔ اس نے اپنے دودھ سے کھڈ کو بھر دیا اور پھر نکل آئی۔ مگر خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ باشندہ رشی نے اسی خطرے کے پیش نظر ”ہمالیہ“ درخواست کی کہ وہ کسی چھوٹے پریت کو بھیج کر ان تمام گڑھوں کو بھر ڈالے۔ ”ہمالیہ“ نے درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے بیٹے ”مندور دھن“ کو حکم دیا کہ وہ ”آبو“ کے تمام گہرے، اسے ہموار کر دے نتیجہ ایک سانپ ”مندور دھن“ کو اپنی پشت پر اٹھا کر وہاں لے آیا اور اس طرح تمام ناہمواریاں دور کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ”اربد“ سانپ پہاڑ کے نیچے رہنے لگا۔ یہ کہ ”آبو پہاڑ کو ”اربد اچل“ یا ”مندور دھن“ بھی کہتے ہیں۔

آبو کا سب سے اونچا حصہ ”گرو شکھر“ کہلاتا ہے۔ جو سمندر کی سطح سے پانچ ہزار چھ سو چھ اونچا ہے، یہاں ”گرو داکے قدم“ ”گوشالا“ اور کمنڈل کنڈو وغیرہ ہندوؤں کیلئے مقامات مقدس رکھتے ہیں۔ ”کوہ آبو“ کی مخصوص شہرت ”ویل واڑا“ کے جین مندروں کے باعث ہے۔ ان کی تعمیر بارہویں صدی عیسوی میں گجرات کے سینا پتی (سپہ سالار) تیج پال اور منتری و استوپال۔ تھی۔ ان مندروں میں دست انسانی کی صنایعی قابل دید ہے۔ نقاشی کا کام اس قدر باریکی سے کیا کہ چشم انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ کتنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر تاج محل کے پس منظر میں ایک کی جنوں رنگ محبت کار فرما نظر آتی ہے تو کوہ آبو کے جین مندروں کے درو دیوار پر بے پناہ مذہبی عکس نظر آتا ہے۔

تیج پال اور و استوپال سے پہلے گجرات کے سولنگی راجہ بھیم دیو کے وزیر اور سپہ سالار ”بھل شہ“ اپنے نام پر 1031ء میں ایک دلکش مندر تعمیر کرایا تھا۔ اس مندر میں سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے کی خاص صورتوں کی آنکھوں میں بیش قیمت ہیرے آویزاں کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ”مو“ سنیاسی آدمی تھا کہ ہے جو ہندوؤں میں پہلے تارک الدنیا مانے جاتے ہیں۔

مانی بھان متی ”بھل شاہ“ کے اسی مندر میں زمانہ دراز سے مقیم تھی۔ کئی کھنوں کا طویل فاصلہ طے کر کے راجہ رتن سنگھ اور وکرم سنگھ مندر کی سیڑھیوں کے قریب وہاں جا کر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مانی بھان متی شب دروازے پر کمرے میں بند رہتی ہیں اور ملاقات نہیں کرتیں۔ اگر کبھی کوئی غمزہ عورت ملنے آگئی تو اسے اپنے کمرے میں بلا لیتی ہیں ورنہ داخلہ قطعاً بند ہے۔ راجہ رتن سنگھ جو تباہ کار موسم کی سختیاں بھیتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا خدا

دروٹ کا یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوا۔ پھر بھی وکرم سنگھ نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ مانی بھان متی کی سیوا

رہنے والی ایک عورت سے مخاطب ہو کر بولا۔
”مانی سے کہنا کہ ان کا داس (غلام) وکرم سنگھ بڑی پریشانی کے عالم میں یہاں تک پہنچا ہے اور انچوت سرائ رتن سنگھ بھی ان کے سلام کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔“ رتن سنگھ کو وکرم سنگھ کا یہ اظہار

قدت گراں گزرا تھا مگر مہمانتبی کی آنکھ کے اشارے نے رتن سنگھ کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔
کچھ دیر بعد اسی نے باہر آکر بتایا کہ دونوں مہمانوں کو مانی نے اندر بلایا ہے۔ وکرم سنگھ نے مانی کا جلال لاری تھا، اس لئے وہ کاہنہ قدموں سے کمرے کے دروازے میں داخل ہوا۔ مگر رتن سنگھ پر حکومت کا نشہ اب تھا، اس لئے سرائ کی رفتار میں کبھی نمایاں تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے مانی کی پُر رعب

داز کو ٹھکی۔
”سرائ رتن سنگھ! تمہیں ایک طوائف کے دروازے پر آتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوئی۔“ رتن سنگھ نے گہرا کر دیکھا۔ مندر کے فرش پر ایک نوے سالہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ عمر کی زیادتی نے اس کی سرخسائی تھی مگر سفید چہرے سے ایک روشنی سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ رتن سنگھ حیران و پریشان کھڑا نا۔ یہ بات اس کی عقل سے بالاتر تھی کہ رانی پدمی اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کو مانی بھان متی نے کس طرح سن لیا تھا؟

”میں اس لئے آیا ہوں کہ پورا چوڑا خونا ک طوفان کی لپیٹ میں ہے“ اس بلا کو کسی طرح ٹال دیجئے کہ بیٹور (خدا) کے ہزاروں بندوں کی جانوں کا سوال ہے۔“ رتن سنگھ کے لیے میں اب بھی اقتدار کی ملک موجود تھی۔

”اور ان لوگوں کی جانوں کا حساب کون دے گا جنہیں تو اپنے اقتدار کی بھینٹ چڑھا چکا ہے؟“ مانی مان متی مکرانی۔ ”مجھے کب سے خدا کے بندوں کی حفاظت کا خیال رہنے لگا ہے“ اور تیرے مہاراج ام دیو نے چوڑی حفاظت کیلئے کچھ نہیں کیا؟“ اچانک مانی کے لیے سے آگ برسنے لگی تھی۔

راتن سنگھ کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت کھڑا رہا۔

”مجھے یاد تو ہو گا کہ تیرے باپ راجہ سر سنگھ نے میری ماں کے ساتھ کیسی نا انصافی کی تھی۔ اس نے اپنے عزیز راجت سنگھ کو زبردستی قرار دے کر میری ماں کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ تیرے باپ کے قانون نے میری بے گناہ ماں کو ”داشتہ“ کا لقب دے کر عدالت سے نکلوا دیا تھا۔ پھر جب روپ متی کو زہر دیا گیا اتنی عدالت نے اسے سانپ کا زہر ثابت کر کے مجھے دوبارہ انصاف سے محروم کر دیا۔ اس قدر نا انصافی کے بعد تو مجھ سے سیاہ آدمی کے روکنے کی تدبیر پوچھنے آیا ہے؟ میں اپنی ذات پر ڈھائے جانے والے ظالم خاموش بھی کر دوں تو اپنے بھائی سنیاسی آندھ پال کے غم کو کیسے بھلاؤں؟ تو نے اس کی زبان کاٹ کر اپنی بھی بند کر دیا۔ اب اگر پورا چوڑا بھی برباد ہو جائے تو مجھے کیا غم ہو گا؟ ہونے دو، جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔“ مانی بھان متی پر جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ”آندھ پال کی لکھی ہوئی تحریر پر سیاہی مٹی بکھر کر تیرے اندر دیکھا کہ تو نے خود اپنا منہ کالا کر لیا ہے۔ رتن سنگھ بد اخون سے گا، بڑی رسوائی کا۔“

”مانی! ہمارے حال زار پر رحم کرو۔ ہم نادان ہیں، آپ کی عظمت سے واقف نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وکرم سنگھ بھان متی کے قدموں پر جھک گیا۔

راجہ رتن سنگھ گھبراہٹ میں مائی بھان متی کے لہجے کی نشتریت کو محسوس نہیں کر سکا اور تیز رفتاری کے ناکہ کر شاہ رتھ میں سوار ہو گیا۔

ساتھ مندر سے نکل کر سناٹا رہ گئی۔ اس نے اپنے دل سے کہا: "میں نے اس کو اپنی جگہ مگر مائی بھان متی کے انداز گفتگو نے اسے بڑا صدمہ پہنچایا تھا کسی عورت کی روحانی قوت اپنی جگہ مگر رتن سنگھ بھان متی کو ایک راجپوت سردار کی ناجائز اولاد ہی سمجھتا تھا۔ رتن سنگھ کو براؤن تھا کہ وہ کرم سنگھ کی موجودگی میں اس کی تمام عظمتوں کو ایک عورت نے پامال کر ڈالا تھا اور وہ ایک مظلوم انسان کی مانند پھرتی ہوئی آنکھوں سے اپنی ذلت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ رتن سنگھ کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مائی بھان متی نے اس کے باپ دارا کے صدیوں پرانے مذہب کی تحقیر کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خوفناک پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ دلی سے آنے والے مہاجروں کے گھوڑوں کے سم چوڑی کی سرزمین کو روند ڈالیں گے اور اس کا اقتدار ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ رتن سنگھ نے عالم جبر میں یہ تمام باتیں سنی تھیں اور وہ کسی ایک حرف تحقیر کا بھی جواب نہ دے سکا تھا۔ رتن سنگھ کے سینے میں نفرت و غضب کی آگ سلگ رہی تھی اور وہ اس کے دھوئیں کو کرم سنگھ کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کہا ہوا سہاٹ؟“ بدمنی نے شوہر کے چہرے کا گہرا ہوا رنگ دیکھ کر پوچھا۔

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک خاموشی سے اس عورت کی طرف دیکھتا رہا جس کے توبہ شکن حسن نے بڑے نئے ٹھہرے کر دیئے تھے۔ راجپوت سراٹ کا دل چاہا کہ آج وہ پدمنی کے ساتھ کینیوں جیسا سلوک دے، اس کے سرو سخن جیسے جسم پر تشدد کے نشانات ابھارے اور پھر اسے ذلیل کر کے اپنے عشرت سے باہر نکال دے۔ مگر نفرت و قہر کا یہ رنگ بہت عارضی تھا۔ رتن سنگھ، رانی پدمنی کے سامنے خود اس برن کی طرح بجھنے لگا جو شیر کے خونی پنجوں کی زبرد آ کر دہشت سے سسم گیا ہو۔ رام دیو کی پوری احزانہ زندگی کا بس یہی کمال تھا کہ اس نے مختلف منتر آزمایا مگر رتن سنگھ کو رانی پدمنی کا زرخیز غلام بنادیا۔

”آپ کا چہرہ بھجا بھجا کیوں ہے؟ کیا اس طوائف زادی کے پاس بھی اس آندھی کا کوئی حل نہیں۔“

انی پد منی کی رعوت پھر لوٹ آئی تھی۔ ”میں تو پہلے ہی اس کیلئے آمادہ نہیں تھی کہ آپ ایک زمانے بھر کی مگرانی ہوئی عورت کے دروازے پر چوڑی سلامتی کی بھیک مانگنے جائیں۔“

”بھگوان کیلئے اپنی زبان بند کر رکھو کہ اس بوڑھی جاودگرنی کو اس کمرے میں کی جانے والی باتوں کی بھی خبر ہو جاتی ہے تم جنہوں کو اپنے دل میں قید رہنے دو کہ زبان کی کوئی جیش ہمارے حق میں نہیں ہے۔“

دن تک عکبر بری طرح سہا ہوا تھا۔

رانی پدمی نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی اور راجہ رتن سنگھ اسے مابی بھان متی کی تمام باتیں جھوٹ کی رنگ آمیزی کے ساتھ سنانے لگا۔ رتن سنگھ نے چوڑی کتابی کے تمام ذکر کو حذف کر دیا تھا اور رانی پدمی کو صرف یہ خوشخبری دی تھی کہ اس آندھی کو راج دوت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔ راج دوت کلام میں کہ غرور حسن لوٹ آتا تھا اور پدمی کی پیشانی ان گنت کیلیروں سے بھر گئی تھی۔

”راہِ نبوت! ایک ادنیٰ انسان! ایک حقیر خادم! کیا ہمیں اس کے احسانات کا بھی بار اٹھانا پڑے گا؟“

اب آفریدی کی آمادگی کا مسئلہ تھا۔ مہمانتہری و کرم سنگھ اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ بہت اداس تھا۔
 وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی علم عامراجا بول اٹھا ”شاء آہنہ رات بھی میرے خواب میں آئے

”جیسے ہی علی عامر بے اختیار بول اٹھا۔ ”سنیاسی انڈیا پل رات ہی میرے خواب میں آئے

جسم کو چٹائے شعلوں کے درمیان دیکھنا چاہتا ہوں۔“ آفریدی کالجہ چٹانوں سے بھی زیادہ سخت ہو چکا تھا۔

”راجہ رتن سنگھ کسی صورت بھی مہاراج رام دیو کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے۔“ وکرم سنگھ نے صورت حال کی نزاکت بیان کرتے ہوئے کہا۔

”تو میں بھی اپنے مطالبے سے باز نہیں آؤں گا۔“ آفریدی بھی کسی پتھر کے ستون کی طرح جما ہوا تھا۔

”پھر کیا یہ سارے معصوم بچے، بے گناہ دو شیزائیں، بے قصور عورتیں، بوڑھے اور بیمار مرد زمین کی ذراک بن جائیں گے؟“ وکرم سنگھ نے انتہائی جذباتی لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

آفریدی ایک بار پھر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے رنگ ابھر ابھر کر ڈوبنے لگے تھے۔ پھر سکوت کا یہ وقفہ طویل تر ہوا چلا گیا۔

”آفریدی! میں بھی سیاسی کا عقیدت مند ہوں اور ان ہی کے نام پر تم سے اہل چٹوڑ کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔“ شدت جذبات سے وکرم سنگھ کی آنکھیں جھلک اٹھی تھیں۔

آفریدی ختم خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔ ”مہمانتری! آپ گواہ رہیں کہ میں اس وقت سیاسی کے خون کا انتقام نہیں لے رہا ہوں مگر جب بھی مجھے موقع ملے گا میں یہ فرض ادا کروں گا۔“

☆.....☆.....☆

پھر وہ منظر بڑا عجیب تھا جب علی عامر آفریدی کو اس جگہ لے جایا گیا جہاں سیاسی آئندہ پال کی لاش جلائی گئی تھی۔ وکرم سنگھ نے راجہ رتن سنگھ سے بھی چلنے کیلئے کہا تھا مگر وہ یہ کہہ کر گریز اختیار کر گیا کہ اسے وہاں جانے ہوئے شرم محسوس ہوگی اور وہ ایک معمولی انسان کے احسان کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھا سکے گا۔ اب شمشان میں وکرم سنگھ اور آفریدی کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔ اندھیرے کی وہی کیفیت تھی اور ہواؤں کے بھڑائی انداز میں چل رہے تھے۔ آفریدی نے جھک کر اس بجلے کو دیکھا جہاں سیاسی کے جسم کی راکھ کالیک ذرہ بھی موجود نہیں تھا۔ سرکش آندھی مرنے والے کی ہر نشانی کو اڑا کر لے گئی تھی۔ صرف ایک سیاہ داغ تھا جو چٹائی لکڑیاں جلنے کے بعد زمین کے سینے پر نقش ہو گیا تھا۔ علی عامر آفریدی نے اس سیاہ نشان کو اس طرح چھوا جیسے وہ سیاسی کی بیخانی کو چھو رہا ہو۔ بڑی جذباتی فضا تھی۔ آفریدی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار روئے لگا۔ وکرم سنگھ بھی اس رقت انگیز منظر کی تاب نہ لاسکا اور اس کی آنکھیں بھی الٹک برساتے نکلیں۔

بچہ دیر بعد جب دل کا غبار آنسوؤں سے دھل گیا تو آفریدی نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔

”اے خدا! میں اس شخص کو جانتا بھی تھا کہ وہ تیرا نیا دیدہ پرستار تھا اور تیرے نام لیواؤں کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا مگر جب اس نے تیری وحدانیت کا اقرار کیا تو دیوتاؤں کے بھجن گانے والوں نے اس کی زبان کو بک دیا اور اس کے ہونٹوں پر پانی کی بوند بوند کو حرام ٹھہرا دیا۔ وہ سیاسی کی زبان سے بلند ہونے والی تیری تعریف کو برداشت نہیں کر سکے پھر ان کی سنگدلی ان پر ہوا کا عذاب لے آئی۔ مجھے تیرے ان بے شمار بنوں کا خیال ہے جو سیاسی کے قتل میں ملوث نہیں تھے۔ انہیں اس عذاب سے بچالے کہ میں ایک روحانی فرزند کی حیثیت سے اپنے باپ کا خون اہل چٹوڑ پر معاف کرتا ہوں۔ جادوگر رام دیو کا معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں کہ تو عظیم و خیر اور دیر زبردست انتقام لینے والا ہے۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ وکرم سنگھ نے گھبرا کر رقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”کہہ رہے تھے کہ میری خاک پریشان کر دی گئی۔ اب غبار اور دھوئیں کے سوا چٹوڑ میں کیا رہ گیا ہے اب تم بھی اپنے گھر چلے جاؤ۔“ یہ کہتے کہتے علی عامر آندھیرہ ہو گیا تھا۔

”راجہ دوست! تم یقیناً عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر واپس جاؤ گے مگر ابھی تو تمہارا فریضہ سفارت ہے۔ کیا اس کی تکمیل کے بغیر تم دلی لوٹ جانا پسند کرو گے؟“ وکرم سنگھ چٹوڑ کو تباہی سے بچانے کے لئے آفریدی کے دل سے نفرت کا غبار دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”منصب سفارت کی تکمیل کے بغیر تو آفریدی“ آفریدی نہیں رہ سکتا۔“ علی عامر کا لہجہ پر جوش ہوا تھا۔ ”مگر میں یہاں تنہا ہوں اور میری تنہائی سے بڑے ناجائز فائدے اٹھائے جالے ہیں کسی مذہب مکرور نے کسی غیر ملکی سفیر سے یہ وحشیانہ سلوک نہیں کیا ہو گا۔“ آفریدی کی زبان پر حرف شکایت اس طرز پر کہ وکرم سنگھ شرمسار نظر آنے لگا۔

”یہ آندھی سیاسی آئندہ پال کی بد دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“ وکرم سنگھ آہستہ آہستہ اپنا دماغ عیاں کر رہا تھا۔ ”سیاسی نے مرنے سے پہلے تمہیں اپنا روحانی فرزند قرار دیا تھا۔ اب اگر باپ کسی ظلم کا شکار ہو جائے اس کے قتل کا دعویٰ کون کرے گا؟“ وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے سوال کیا۔

”میں“ علی عامر آفریدی اور لاکھوں فرزند ان توحید کہ جانے والا ہی میں سے ایک تھا۔ ”ایکایک ہوندا سے آفریدی کا چہرہ جل اٹھا تھا اور ہونٹوں سے تخیوں کی بارش ہونے لگی تھی۔

”اور اگر سیاسی کے قتل کی معافی کا سوال اٹھے تو اسے کون معاف کرے گا؟“ وکرم سنگھ نے بڑے تدبر کے ساتھ دوسرا سوال کیا۔

”پہلے تو یہ ممکن نہیں اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو معافی کے فرائض بھی پوری مسلمان قوم انجام دے گی۔“ آفریدی بڑے بے باکانہ لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

”تو پھر سیاسی کے قتل کو معاف کر دو کہ اس طرح لاکھوں معصوم جانیں بچ جائیں گی۔“ وکرم سنگھ گفتگو میں ابھی تک ابہام تھا۔

”مہمانتری! میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔“ علی عامر حیران نظر آ رہا تھا۔

”یہ آندھی اس وقت تک نہیں ٹھہرے گی جب تک تم اپنے روحانی باپ کا خون معاف نہیں کر گے۔“ بالآخر مہمانتری وکرم سنگھ نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

آفریدی کچھ دیر تک خیالات میں گم رہا پھر طنز آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ”ہمارے مذہب میں آنکھ کا بدلہ کان کا بدلہ کان اور ناک کا بدلہ ناک ہے۔ رام دیو نے سیاسی کا پورا جسم جلا ڈالا، انصاف کیا کہ رام دیو کو بھی نذر آتش کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سیاہ آندھی چند لمحوں میں رک جائے گی۔“ علی عامر آفریدی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”آفریدی! میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔“ وکرم سنگھ اچانک جذباتی ہو گیا تھا۔ ”انصاف نے تقاضے یہی ہوتے ہیں مگر میں بھی تمہارے ایک بزرگ کی حیثیت سے درخواست کرتا ہوں کہ تم بے رحم عوام کی خاطر اپنا طریقہ انصاف بدل ڈالو۔“ وکرم سنگھ کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے آفریدی کے سامنے دامن پھیلا دیا ہو۔

”بے شک! چٹوڑ کے عوام بے قصور ہیں مگر رام دیو کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ میں اس کے کرم

جیسے ہی علی عامر آفریدی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، آندھی کے جھونکوں میں کچھ اور شلٹا آفریدی نے تاریک تر فضا کو دیکھا اور پھر بڑے کریمک لہجے میں سنیا سی کی روح سے مخاطب ہوا۔

”بس اے جان بے قرار ٹھہر جا! کہ بے گناہ عورتیں اور معصوم بچے اس قبر کی زمیں آگے ہیں۔ کہنا تھا کہ ہوا کا زور ٹوٹنے لگا اور اندھیرا بندرتج کم ہوتا چلا گیا کچھ دیر بعد چوڑی فضا معمول پر آگئی تھی اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

دو دن اور دو راتوں سے محصور لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور بے پناہ خوشی کر رہے تھے۔ علی عامر آفریدی بھی وکرم سنگھ کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ مسامحتی کی آواز میں مسرت کے آنسو تھے۔

”بیٹے! تم نے ریاست کے باشندوں کے سامنے میری لاج رکھ لی۔ آخر یہ میری رعایا ہیں۔ میں ہلاکت و بربادی کس طرح دیکھ سکتا تھا۔“

”جائیے آپ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی وحشیانہ مسرتوں میں شریک ہو کر خود کو سرخرو کر جانے والا تو چلا گیا یہ رس، یہ دار، کرو گے کیا؟“ آفریدی کے لہجے میں سارے زمانے کی نکلیاں بر تھیں۔ اس نے اپنے چہرے کی وحشت اور دل کا درد چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا تھا۔

وکرم سنگھ آگے بڑھا اور اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ علی عامر آفریدی کے کاندھے پر رکھا۔

”راجہ دوت! تمہیں کیا خبر کہ یہ بوڑھا شخص کون ہے جسے وکرم سنگھ کہتے ہیں۔ خیر! تم بہت جلد پتا لگے کہ میں راجہ رتن سنگھ کی وحشتوں میں شریک ہوں یا.....؟“ وکرم سنگھ اپنی بات ادھوری کر کے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

نرملہ کماری بڑی حیرت سے اپنے باپ کی بیان کردہ تفصیلات سن رہی تھی۔ پھر جب وہ ”آندھی“ کے موضوع پر آیا تو اس کے ہونٹ کا پٹنے لگے اور آنکھوں میں گہری اداسیاں کر رہی گئیں۔ ”بیٹی! اب چوڑے مستقبل کے بارے میں طے ہو چکا کہ تم، تم نہیں رہو گی اور ہم، ہم نہیں رہیں گے۔“ شدت جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔ ”جب دو بڑے انسان دیوار کے طرف ایک ہی منظر دیکھیں تو وہ آنکھوں کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ میں نے سنیا سی کی بات پر شبہ نہیں کیا، خود فریبی سی تھی کہ شاید آنے والا عذاب ٹل جائے۔ پھر مائی بھان متی نے بھی اسی قبر کی طرف اشارہ کرنا چوڑے کو کون بچا سکتا ہے؟“

”کیا آپ کی سیاست بھی اس مقام پر عاجز نظر آتی ہے؟“ نرملہ کماری اپنے باپ کو یوں دیکھ کر آواہن ہو گئی تھی۔

”سیاست کچھ دیر کیلئے تلواروں کو شام گل تو بنا سکتی ہے مگر آسمان کے فیصلوں کو نہیں بدل سکتا۔ وکرم سنگھ کا دلچسپا جا رہا تھا۔ ”راجہ رتن سنگھ نے بہت دیر کر دی۔ تمہاری مغرور بہن اور مہاراجہ نے مسائل کو یہاں تک الجھا دیا کہ اب موت کی خونی انگلیاں ہی گرہ کشائی کر سکتی ہیں۔ زندگی کے بھی کٹ گئے اور ناخن بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ پھر عقدے کو کون سلجھائے گا؟ کوئی بھی نہیں۔“ وکرم سنگھ نے لگا تھا۔ ”کاش! پہلے دن ہی کسی نے میری بات سن لی ہوتی۔“

”پھر کیا ہوتا؟“ نرملہ کماری باپ کو اس طرح روتا دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔

”شاید یہ خطرہ ٹل جاتا۔“ آنسوؤں کی نمی سے وکرم سنگھ کی آواز بھی بھتیجی جا رہی تھی۔

آندھیاں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، ایک عظیم عورت طوائف زادی قرار پائی اور سلطان علاء الدین خلجی جیسے طاقتور حکمران کے راج دوت کو مسلسل ذلیل کیا جا رہا ہے۔ آخر ہمارا کونسا عمل ایسا ہے جو ہمیں تباہی و روائی سے بچا سکتا ہے؟“ یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کے لہجے سے غصے اور جھنجھلاہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا۔

”آپ کے خیال میں ہندو دھرم کے باغیوں کو معاف کر دیا جاتا۔“ نرملہ نے حیران ہو کر اپنے باپ سے عجب انداز میں پوچھا۔

”کیسا دھرم اور کیسے باغی؟“ وکرم سنگھ یکایک بھڑک اٹھا تھا۔ ”دھرم تو وہ ہے جسے بچاتے بچاتے مائی بھان متی نے سنسار کو تیاگ دیا اور جس کا دفاع کرتے کرتے سنیا سی نے موت کو گلے لگالیا۔ دھرم وہ نہیں جس پر راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور رام دیو عمل کرتے ہیں۔ یہ تو پتھر تو کا قانون ہے جسے نرم و نازک انسانوں کے دل و دماغ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔“ وکرم سنگھ کا ذہنی انقلاب مکمل ہو چکا تھا اور دل کی سرکشی نے زبان کو بھی باغی بنا دیا تھا۔

باپ کی باتیں سن کر نرملہ کماری مبسوت ہو گئی تھی۔ ”کیا آپ بھی آج تک غلط راستے پر چلتے رہے؟“

”ہاں! میں بھی گمراہی کا شکار تھا مگر سنیا سی نے اپنی جان کی قربانی دے کر مجھے اندھیروں کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ اب میں روشنی میں کھڑا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

چوڑی زندگی معمول پر آگئی تھی مگر علی عامر آفریدی کی زندگی میں نیا حشر برپا ہو گیا تھا۔ وہ چوڑی سرزمین پر پہلی رات تھی جب اس نے اپنی والدہ شائستہ بیگم اور چھوٹی بہن عالیہ آفریدی کو خواب میں دیکھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی ہانسی کے مکان کے ایک کمرے میں خاموش بیٹھی تھیں کہ اچانک عجب کی دیوار میں ایک شکاف پڑ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس شکاف سے ایک دروازہ قامت سیاہ پوش انسان برآمد ہوا۔ شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی اس سیاہ پوش کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ وہ سیاہ پوش دبے قدموں ان کی طرف بڑھا۔ فاصلہ آہستہ آہستہ سمٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سیاہ پوش ان کے قریب آگیا۔ ناگہاں شائستہ بیگم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔ دھواں اس قدر گہرا تھا کہ انسانی آنکھ کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بس شائستہ بیگم اور عالیہ کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ علی عامر شدت خوف سے جاگ گیا اور گہرا کراہا دھر دیکھنے لگا۔ کچھ لمحوں بعد جب نیند کا خمار ٹوٹا اور گرد و پیش کی دھندلی چیزیں صاف نظر آنے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ محض ایک خواب تھا۔ آفریدی نے اطمینان کا سانس لیا مگر یہ اطمینان عارضی تھا۔ علی عامر نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے تو اسے خواب کی ہولناکیوں کا اندازہ ہوا سر سے لے کر پاؤں تک آفریدی کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ پریشان خیالات تھے یا حقیقت؟ آفریدی اس کا ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ روز و شب کے دائرے میں اس مختصر وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر جب آفریدی نے ایک سیاہ پوش کو شائستہ بیگم اور عالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی چیخیں گونجے لگیں تو اسے احساس ہوا کہ ہمیں دن نہیں، تیس صدیاں گزر گئی ہیں۔ ایک باریادوں کا غبار اٹھا تو ذہن بے شمار دوسروں سے بھر گیا۔ یہ خواب مستقبل کے کس خطرے کی علامت ہے؟ سلطان اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ دربار شاہی میں ملک کا فور کی محبوبیت اور قتلہ انگیزوں کا کیا حال ہو گا؟ اس کے پیچھے رقصہ زہرہ جمال پر کسا کڑا، مہنگی؟ ان گنت سوال تھے جو آفریدی کے ذہن پر مسلسل یلغار

کر رہے تھے۔ اس نے یادوں کی آگ سے دامن کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر شعلے تھے کہ راز ہی رہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس کی پلکیں نہ جھپک سکیں۔ آفریدی چاہتا تھا کہ رات کے اندر وقت چھٹ جائیں اور صبح ہوتے ہی وہ اپنے سفارتی فرائض انجام دے کر دلی واپس چلا جائے۔ دہشت ناک خواب نے آفریدی کو عجیب سے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر جب صبح ہوئی اور سورج ”اراولی“ کی چٹانوں سے اتر کر چوڑے میدانوں میں پھیل گیا تو وکرم سنگھ، علی عامر آفریدی سے ملنے کیلئے اس کے کمرے میں آیا۔

”سنیاسی آندھ پال بھی قتل ہو چکے، آندھی بھی ختم ہو چکی اور مجھ گناہ گار پر بھی رام دیو مشتق نے آخراں اقتدار کا دور کونسا شغل باقی ہے۔“ آفریدی کی زبان پر حرف شکایت بھی تھا اور گمراہی پر بھی۔

”اب مجھے اور کتنے دن بدترین قیدیوں جیسی زندگی بسر کرنی ہوگی؟“

وکرم سنگھ نے آفریدی کے گڑے ہوئے تیوروں کو شدت سے محسوس کیا اور اس جذباتی سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اب تمہارے لئے فضا ہموار ہو چکی ہے۔ ریاست کے عوام تو اس راز میں ہیں کہ وہ خوفناک آندھی کیوں آئی تھی اور پھر کس کے اشارے پر رک گئی؟ مگر راجہ رتن سنگھ پدمنی جانتے ہیں کہ اس بلا کو نالے میں پس پردہ تمہارا ہاتھ حرکت کر رہا ہے۔“ وکرم سنگھ یا خاص لمبے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”اب راجپوت سمرات تمہیں زیادہ دن تک ایک کمرے میں محصور رکھتا۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں علی عامر آفریدی کو تمام واقعات سنادیئے۔

کاپسلا قدم تھا جو مہمانسزئی کی طرف سے علی عامر کی طرف بڑھا تھا۔

آفریدی نے شکر گزار نگاہوں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا۔ ”آفریدی! میں بھی تمہارا مگر میرا سفر آگ کا سفر ہے۔“ یہ ایک بڑا اہم اشارہ تھا جس کی گہرائیوں پر آفریدی سوچتا رہا اور کمرے سے نکل کر راجہ رتن سنگھ میں چلا گیا۔

راجہ رتن سنگھ، مائی بھان متی کے اس طنزیہ جملے سے دھوکا کھا گیا تھا کہ سلطان کا پیغام سن کر عزت و وقار میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ بالآخر یہ طے پا گیا کہ راجہ رتن کو کل کسی وقت دربار کا کر دیا جائے گا کہ دوسرے راجپوت سردار بھی سلطان کے پیغام کو سن لیں اور رانی پدمنی کے شہادت کی جو گرد و جہم گئی ہے وہ دور ہو جائے۔

وکرم سنگھ بہت خوش تھا کہ عفریب سیاسی پیچیدگیوں کا کوئی حل نکلنے والا تھا۔ فضائیں ٹھنڈی تھیں مگر رام دیو کے ہوش میں آتے ہی ایک بار پھر راجہ رتن سنگھ کی پیش گوئی کی جارہی تھی ابھی بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم پیٹوں سے جکڑا ہوا تھا لیکن حواس پوری ہو چکے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اپنے نائب شیوا اور دوسرے چیلوں کے بارے میں دریافت کیا۔

پھر جب رام دیو کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ اس کے سارے پیچاری مر چکے ہیں اور آشرم نیست ہے تو وہ کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخا۔ اس نے مائی بھان متی اور علی عامر آفریدی کو گالیاں دیں اور پھر اپنے خدمت گاروں سے کہا کہ اسی وقت راجہ رتن سنگھ کو اطلاع دیں، مہاراجہ ملنا چاہتے ہیں۔

پھر جیسے ہی راجہ رتن سنگھ، رام دیو کی عیادت کیلئے حاضر ہوا تو اس فریب کار ساحر نے پسلا سوال آندھی رک چکی ہوگی؟

رتن سنگھ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ رام دیو چیخا۔ ”مجھے میرے گیان نے یہی خبر دی تھی کہ اگر اس پنج عورت بھان متی اور راجہ رتن کو ایک ہی وقت میں قتل کر دیا جائے تو یہ آفت ناگمانی چوڑے سے غل جکتی ہے۔ کیا سمرات نے ان دونوں راکتسوں کو نرک میں پہنچا دیا۔“ رام دیو نے راجہ رتن سنگھ سے بڑا خوفناک سوال کیا تھا۔ راجپوت سمرات ایک لمحے کیلئے سکوت میں آگیا تھا مگر وکرم سنگھ نے فوراً ہی بگڑی ہوئی بات کو سن لیا۔

”مہاراجہ کے حکم پر مائی بھان متی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جیسے ہی اس کی گردن تن سے جدا ہوئی، سیاہ آندھی نے دم توڑ دیا۔ جب ایک شخص کے قتل سے عذاب ٹل گیا تو پھر دوسرے انسان کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وکرم سنگھ نے اس قدر بر جستہ جھوٹ بولا تھا کہ رام دیو کو اس کے بیان کی صداقت پر یقین آیا۔

”نہیں سمرات! دوسرے دشمن کو بھی قتل کرنا ضروری ہے۔“ زخمی ہونے کے باوجود رام دیو کا لہجہ رندوں جیسا تھا۔

”اسے زندہ چھوڑ دینے میں ایک سیاسی مصلحت ہے۔“ اب کی بار رتن سنگھ نے رام دیو کی بات کا جواب دیا تھا۔ ”ہماری سیاسی مجبوریاں یہ ہیں کہ ہم ایک غیر ملکی سفیر کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”اور سلطان کے اس سندیش کا کیا ہو گا جس کی وجہ سے میں نے ایک ماہ تک کٹھن جاپ کئے ہیں اور خفت ترین آزار جھیلے ہیں۔“ رام دیو کی عیار فطرت کسی طرح بھی دم لینے کیلئے آمادہ نہیں تھی۔

”اس سندیش میں کچھ نہیں ہے۔ وہ محض ایک خیر گالی کا پیغام ہے۔“ رتن سنگھ نے زخمی ساحر اعظم کو طعن کرتے ہوئے کہا۔ ”پیغام رسائی کی ایک مختصر سی سرکاری تقریب ادا ہوگی اور پھر راجہ رتن کو دلی روانہ کر دیا جائے گا۔“

”وہ تقریب میرے بغیر ادا نہیں ہوگی۔“ رام دیو چیخ کر بولا۔ ”مجھے چار آدمیوں کے کاندھوں پر لٹا کر راجہ رتن سنگھ لے چلنا۔ میرا گیان تو زخمی نہیں ہے۔“ رام دیو کا غور اپنے عروج پر تھا۔ اس نے پتہ چلوں کی موت اور آشرم کی تباہی سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تھی۔

راجہ رتن سنگھ اور مہمانسزئی وکرم سنگھ مجبوراً سر جھکائے چلے گئے اور پھر یہ خبر سارے چوڑے میں عام ہو گئی۔ راجہ رتن کا غیر رانی پدمنی کے حضور سلطان کا پیغام پیش کرے گا۔

☆ ☆ ☆

وکرم سنگھ نے شام ہونے سے پہلے ہی علی عامر آفریدی کو یہ خبر پہنچا دی تھی کہ کل کا دن اس کی زندگی کا سب سے بدترین دن ہو گا۔ ”آخر ہمیں ایک راجپوت سمرات کے دربار میں جانا ہے۔“ وکرم سنگھ نے اسے سناں دلاتے ہوئے کہا۔

”سنیاسی آندھ پال کے رشتے سے میں آپ کا احترام کرتا ہوں ورنہ ایوان خلجی کے سامنے ایک راجپوت عکراں کے دربار کی حیثیت ہی کیا ہے۔“ علی عامر نے آہستہ لہجے میں کہا۔ ”جہاں آنکھیں ملے وہاں ہوش نہیں اٹھتا اور اکثر بولنے والوں کی قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے، میں اس دربار کا نمائندہ ہوں۔“ آفریدی کی گفتگو میں اس قدر اعتماد تھا کہ مہمانسزئی وکرم سنگھ شرمسار نظر آنے لگا تھا۔

”میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔“ مہمانسزئی نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں تو تمہیں اس محاذ پر بھی

”اسیے عکراں کے خلاف۔“ آفریدی نے غیر ارادی طور پر ایک چپتا ہوا سوال کر دیا۔

”نہیں! انہی اسی آئندہ پال کے قاتلوں کے خلاف۔“ وکرم سنگھ نے آگے کی طرف جھٹکتے ہوئے، کے انداز میں کہا۔ ”شہنشاہوں کے خلاف، جاہلوں اور پتھر کے پجاریوں کے خلاف۔“ یہ کہہ کر سنگھ چلا گیا۔ اور آفریدی ریاست چوڑ کے اس وزیر اعظم کے بارے میں سوچنے لگا جس کا رویہ ایک مشفقانہ تھا اور دوسری طرف ناقابل فہم۔

وہ رات چوڑ کے حکمران طبقے کے لئے ایک عجیب رات تھی۔ اچانک رتن سنگھ کے منتشر ذہن ایک خوفناک تصور نے سراہا۔ ”کیا مجھے مہلت تو نہیں دی گئی ہے کہ میں مطمئن ہو جاؤں اور مجھ پر رام دیو سے بھی زیادہ شدید عذاب نازل ہو جائے۔“ یہ روح کو پھٹلا دینے والا خیال تھا۔ رتن رانی پدمنی سے تو اپنے خدشات کا اظہار نہیں کیا مگر وحشت دل پر قابو پانے کے لئے تیز شراب کا سا نرم و گداز بستر میں منہ چھپا کر سو گیا۔

رانی پدمنی جاگ رہی تھی اور اس کا مغرور ذہن ہر پریشانی سے آزاد تھا۔ مائی بھان متی کے سے پہلے وہ اس سلسلے میں اکثر سلطان علاء الدین خلجی کی ذات کو تازیبا کلمات کا ہدف بناتی رہی۔ ایک مسلمان حکمران کے سبب راجپوت سرداروں کے درمیان اس کی شخصیت مشکوک بن کر رہی۔ جب راجہ رتن سنگھ نے مائی بھان متی کی پیش گوئی منتقل کی تھی کہ سلطان کا خفقہ قبول کرنے کے بعد اقتدار میں مزید اضافہ ہو جائے گا تو رانی پدمنی بہت زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ مائی بھان متی نزدیک ایک معتب عورت تھی لیکن جب اس طوائف زادی نے پدمنی کو اپنی خبر فراہم کی تو پدمنی نفرت میں تو کہی نہ آسکی لیکن سخت و تکبر میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے اقتدار ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس رات رانی پدمنی کے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست چوڑ کا سمجھتی تھی۔ پدمنی کے خیال میں اگر سلطان نے اسے جنگ کی دھمکی بھی دی تو وہ کسی پائل کی جگہ رائیگاں جائے گی۔ وہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ سیاسی امور میں بھی اسے بڑا دخل لئے راجپوتانے (راجستھان) کی پوری تاریخ اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پدمنی نے بڑے راجپوتوں کی ماضی کی تاریخ پر ایک اچھی سی نظر ڈالی اس نے عالم تصورات میں پر تھو راج چہان کے نمائے ہوئے دیکھا، پھر وہ منظر بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر آیا کہ شہاب الدین غوری پر تھو راج کا سر کاٹ کر اجیر کی قسمت پر پیشہ کیلئے مہر غلامی ثبت کر رہے تھے۔ اس خون رنگ احساس نے رانی پدمنی کے جسم کو پسینے میں غرق کر دیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں جیم راج کا پیکر ابھر آیا جس نے بغاوت کر کے مسلمانوں سے اجیر کا اقتدار چھین لیا تھا۔ اس رانی پدمنی کو چند ساعتوں کے لئے سرشار کر دیا مگر یہ ساعتیں عارضی تھیں۔ رانی پدمنی نے اپنے کے پردے پر ایک اور مسلمان حکمران قطب الدین ایک کے چہرے کو ابھرتے دیکھا۔ ایک جیم راج کو زلت آمیز شکست دے کر اس علاقے سے چوہانوں کے اقتدار کو پیشہ کیلئے۔ رانی پدمنی بڑے اضطراب کے عالم میں بستر پر کوٹیں لینے لگی۔ وہ راج محل کے ایک آرائش موجود تھی لیکن اس کا منتشر ذہن ماضی کی شاہراہوں پر بھٹک رہا تھا۔ اچانک پدمنی کو ”جاوہر“ یاد آیا جس پر سلطان شمس الدین التمش نے یلغار کر کے راجہ اڈیہ کو شکست فاش دی تھی اور اس حکمران کو مسلم حکومت کا خراج گزار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک اور لرزہ خیز منظر تھا جس کی رانی پدمنی کو کچھ دیر کیلئے بے قرار کر دیا تھا پھر اس کی نظریں جھٹکتے جھٹکتے بعض سوچوں کی طرف چلی

قلعہ سلطان شمس الدین التمش کے وزیر الغ خان (غیاث الدین بلبن) کا پرچم لہراتا دیکھ کر پدمنی کے ذہن میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی مگر یہ آگ فوراً ہی بجھ گئی کہ اسے ریاست چوڑ کا قلعہ ناقابل تخیل نظر آنے لگا۔ رانی پدمنی کے دل میں احساس غرور پھر کر وٹیں لینے لگا اور یہ بات اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی کہ اگر چوڑ ناقابل تخیل نہ ہوتا تو مسلمان حملہ آور اسے بھی پامال کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ ماضی اور حال کے تمام شب و فراز پر غور کرنے کے بعد رانی پدمنی خود کھائی کے انداز میں یہ کہتی ہوئی سو گئی۔

”چوڑ کا ماضی، حال اور مستقبل آزادی کے سوا کچھ نہیں۔“ غرور حسن نے اسے بڑے رنگین خواب دکھائے تھے۔ اس رات اگر کچھ لوگ بیدار تھے تو ان کے خیالات میں انقلاب آچکا تھا۔ یہ جاگنے والے مہمانسز وکرم سنگھ اور اس کی بیٹی نرملا کماری تھی۔ دونوں خاموش تھے اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یکایک نرملا نے سکوت توڑا اور اپنے باپ سے پوچھنے لگی۔ ”آپ کے خیال میں آنے والی صبح اہل چوڑ کیلئے کیا پیغام لے کر آئے گی؟“

”وہ پیغام زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا۔“ وکرم سنگھ نے بڑی ذہانت سے ایک ایک لفظ کا استعمال کیا تھا۔

”مائی بھان متی نے تو ایک اچھی پیش گوئی کی ہے۔“ نرملا نے راجہ رتن سنگھ کے دہرائے ہوئے الفاظ کو بنیاد بنا کر کہا۔

”یہ چوڑ کی بد نصیبی ہے کہ رتن سنگھ، مائی بھان متی کے الفاظ کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے۔“ وکرم سنگھ نے اشارہ کیا۔ ”اگر راجپوت سرٹ مائی کے الفاظ کی گہرائی کو سمجھ لیتے تو ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں اور رانی پدمنی کے شعلہ رنگ رخسار بھگ کر دھواں ہو جاتے۔“

”کیا آپ کو اس صورت حال پر کوئی افسوس نہیں ہے؟“ نرملا کماری نے ایک بار پھر وہی سوال کیا تھا جس سے اس کی روح کی بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

”ہاں! اب میرا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ ان کے دیوتا الگ ہیں اور میرا خدا الگ۔“ آج وکرم سنگھ نے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دی تھی۔

نرملا کماری پہلے بھی باپ کی گفتگو سن کر حیران ہوتی رہی تھی مگر آج تو اس کی حیرت، وحشت میں بدل گئی تھی۔ ”کیا پرکھوں کا تمام سرمایہ لٹ گیا اور کیا سارے دیوی دیوتا ٹوٹ کر بکھر گئے؟“ نرملا کماری کا لہجہ ملت اس تھا۔

”دیوتا ٹوٹنے ہی کیلئے بنائے جاتے ہیں۔ پتھر کے مجسمے موسم کی زیادہ سختیاں برداشت نہیں کر سکتے۔“ مہمانسز وکرم سنگھ کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی۔

”تو پھر آپ دیوتاؤں سے بے وفائی کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟“ نرملا کے لہجے میں ہلکی سی سختی نمایاں ہو گئی تھی۔ ”اپنے عقائد کو پسینے میں چھپا کر زندہ رہنا راجپوتوں کی شان نہیں۔“

”حقیقت کی آگ کو برداشت کرنا اس سے بڑی بہادری ہے۔“ وکرم سنگھ نے اپنی ذہین بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کئی بار اپنے عقائد کا اعلان کر کے نئے راستے پر جانا چاہا مگر ہر مرتبہ تمہاری مہم زور مہم کرنے کے بعد تمہاری تھائی اور بے چارگی سے خوف آتا ہے۔ رام دیو کے ماننے والے تمہیں ملت آزار پہنچائیں گے۔ اگر چوڑ کے حکمران مجھے تمہاری آبرو مندانہ زندگی کی ضمانت دیدیں تو میں اسی

وقت سنیا سی آندپال کے نقش قدم پر چلنے کیلئے تیار ہوں۔“
”پھر کیا آپ دلی سے آنے والی ہواؤں کے ترجمان بن جائیں گے؟“ نرملا کے چہرے کی اذرائل ہو چکی تھی مگر حیرت بدستور قائم تھی۔

”یقیناً۔“ وکرم سنگھ نے پورے اعتماد سے جواب دیتے ہوئے کہا۔
”تو پھر کس چیز کا انتظار ہے؟“ نرملا کماری نے ایک اور مشکل سوال کر دیا تھا۔
”ان آنے والوں کا جو عورتوں کی عزت و ناموس کے محافظ ہیں۔“ وکرم سنگھ نے بڑے اثر و اثر میں کہا۔

”وہ کب آئیں گے؟“ اب نرملا کماری بھی بے چین نظر آنے لگی تھی۔
”بس آباہی چاہتے ہیں۔ سنیا سی نے بھی یہی کہا تھا اور ماہی بھان متی کی بھی یہ پیش گوئی ہے۔“
کتے وکرم سنگھ کے چہرے کی چمک کچھ گہری ہو گئی تھی۔

”پھر جب وہ آجائیں گے تو میں تمہیں ان کے حوالے کر کے سنیا سی سے جا ملوں گا۔ اب مجھ سے یہ جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ فراق صدیوں کی طرح گزر رہا ہے۔“ شدت جذبات وکرم سنگھ رونے لگا تھا۔

باپ کو اس قدر آرزو دیکھ کر نرملا بھی رونے لگی تھی۔
”جب انسانی قہقہے اور خوشیاں ایک گھر میں سمٹ جاتے ہیں تو پوری ہستی آہ و زاری میں جھلا ہوا اور ایک ایک آنکھ اشک برسانے لگتی ہے۔“ وکرم سنگھ انسانی مظالم کی تاریخ بیان کر رہا تھا۔ ”اگر ہم قہقہے اور خوشیاں برابر سے لوگوں میں تقسیم کر دی ہوتیں تو پھر وہ عذاب کبھی نہیں آتا۔ مگر اب روک سکتا ہے کہ وقت گزر چکا اور مہلت ختم ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ روشن فانوسوں، باتیموں اور پتیلیں ہونی کا فوری شععوں کو دیکھنے لگا۔ ”کون جانے کیا اندھیرا ہے؟“

مہمانتزی کا کردار اداسیوں کا مقبرہ بن کر رہ گیا تھا۔ وکرم سنگھ نے بھی بھی فضاؤں کا اثر و اثر کے لئے نرملا سے کہا۔ ”بیٹی! اب سو جاؤ کہ آنے والی صبح ہمارے تمام اندیشوں کا خاتمہ کر دے
ذہنوں پر چھایا ہوا غبار چھٹ جائے گا۔“

باپ کا حکم سنتے ہی نرملا اپنے بستر پر دراز ہو گئی تمام روشنیاں گل کر دی گئیں مگر اندھیرے میں بھی ذہن برقی لہروں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس ناختم مرد کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی جس نے آندپال سے اس کے عقائد چھین لئے تھے اور اب وہ وکرم سنگھ کو زیر کرتا ہوا خود اس کے اپنے دل پر حملہ آور ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆
مہمانتزی وکرم سنگھ اور نرملا کماری کے ساتھ عامر آفریدی بھی اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ بارہا سماعت میں سلطان علاء الدین خلجی کا ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

”آفریدی! حسن کی عدالت میں ہمارا مقدمہ تسماری و کالت کے رحم و کرم پر ہو گا۔“
سلطان کا یہ اعتماد بڑا عجیب اعتماد تھا اور سفارت کی ذمہ داری تھی اور اسی اعتماد نے آفریدی میں اور جسم پر بڑے زخم سمجائے تھے اور وہ ان ہی زخموں کو سجا کر سر بر سر پار چلا جانا چاہتا تھا۔
اسی دوران سوچتے سوچتے کچھ دیر کیلئے علی عامر آفریدی کی آنکھ لگ گئی پلکیں جھپکتے ہی آفریدی میں چلا گیا اور پھر اس کی بند آنکھوں کے سامنے ایک خواب روشن ہو گیا۔ آفریدی نے سنیا سی

دیکھا اب اس کے منہ سے خون نہیں بہہ رہا تھا لیکن چہرے پر شدید اذیت و کرب کارنگ نمایاں تھا۔
آفریدی نے سنیا سی سے حزن و ملال کی وجہ دریافت کرنا چاہی لیکن سنیا سی اس سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”بیٹے! تو نے اچھا کیا کہ چوڑے معصوم انسانوں کو بچالیا۔ اس آگ کو تیرے سوا بھانے والا کوئی نہیں تھا۔ تیری محبت نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو راکھ بنادیا اور سیاہ آندھی کو باد نسیم کے خوشگوار جھونکوں میں بدل ڈالا۔ بت پرستوں کی اس ریاست پر تیرا احسان ہے۔ مگر تو نہیں جانتا کہ یہ لوگ بہت ناشکرے ہیں۔

غریب بچے بڑی اذیتیں پہنچنے والی ہیں۔ یہ غریب کار سنے سنے بھانے تراش کر تجھ پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن انہیں تجھ پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ عظیم الشان فتح تیرا مقدر ہوگی مگر بڑی خونریزیوں کے بعد بڑی رسوائیوں کے بعد ثابت قدم رہنا کہ تو اہل ایمان کا عظیم وارث ہے۔“ یہ کہہ کر سنیا سی آندپال روپوش ہو گیا اور علی عامر آفریدی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

اب ایک اور نئی نادیہ مصیبت اس کی منتظر تھی۔ آفریدی شدید حیرت و وحشت کے عالم میں بہت دیر تک سنیا سی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ آندپال کا خواب میں آتا ہے سبب نہیں تھا۔ وہ جس خونریزی اور رسوائی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آفریدی نے خونریزی کا یہی مفہوم لیا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی چوڑے پر حملہ کرے گا جس کے نتیجے میں راجپوتوں کی سنگلاخ زمین انسانی خون سے نم ہو جائے گی۔ اور اس کے نزدیک رسوائی کا مطلب یہ تھا کہ راجہ رتن سنگھ یارام دیو کوئی نئی چال چل کر اسے نئے انداز کی کوئی اذیت پہنچائیں گے۔ آفریدی کچھ دیر تک خواب کے اثرات سے پریشان رہا پھر اپنے ذہن سے تمام اندیشوں کو جھٹک کر آنے والی صبح کا انتظار کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

چوڑکی وہ صبح عام دنوں سے زیادہ روشن تھی مگر حکمران طبقے کے ذہنوں پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ اس کے برعکس آفریدی کے دل و دماغ پر سرشاری کی سی کیفیت طاری تھی۔ مہمانتزی وکرم سنگھ خلاف معمول آج کچھ پہلے ہی آفریدی سے ملنے کے لئے آیا تھا اور اس نے سلطان کے سفیر کو مطلع کیا تھا کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور اسے دوپہر سے پہلے راجپوت سمرات کے دربار میں پیش کر دیا جائے گا۔

اور علی عامر آفریدی رانی پد منی کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ہر دلی میں علاء الدین خلجی کی بے قریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سلطان کے دن بے سکون اور راتیں بے خواب تھیں۔ شاہی فکرات کے عیش پروردہ گمانوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے کینڈہ شطرنج کے ذرائع ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ سلطان کی بیگمات محض اس لئے پریشان تھیں کہ علاء الدین خلجی ان کی ناز و داریوں سے بے نیاز ہو کر رانی پد منی کے حسن سوزاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر اس وقت چوڑی خوبصورت حکمران درمیان میں حائل نہ ہوتی تو سلطان کی کسی بیوی کو بھی ہوش نہ ہوتا کہ اس وقت علاء الدین کماں ہے اور جذباتی طور پر کیا چاہتا ہے؟ یہ تو صرف جذبہ رقابت تھا جس نے بیگمات کو نرم اور کمزور کر دیا تھا اور اس کے لئے مجبور کر دیا تھا اور سلطان کی کوئی بیوی بھی اس کی حقیقی نمائندہ نہیں تھی۔ کسی شریک حیات کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا شوہر ایک باجبروت حکمران ہوئے ہوئے بھی کس قدر خوفناک تنہائی کا شکار ہے۔ کئی بیویاں اور بے شمار کنیزیں ہونے کے باوجود

علاء الدین خلجی خود کو اکیلا سمجھتا تھا اور اس تنہائی کے احساس کو پرورش کرنے میں بیگمات کی بے حسی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ سلطان اپنی بیگمات کو اعلیٰ ترین خطابات عطا کرتا تھا اور ان کے خالی دامنوں کو ہر روز نئی آرائشوں سے مزین کرتا تھا مگر خود اس کے اپنے دل کی دنیا ویران ہی رہتی تھی۔ وہ تخیل عالم کے خواب دیکھتا

تھا اور بیگمات اپنے جسموں کو آراستہ کر کے آئینوں کے سامنے خود نمائی کرتی رہتی تھیں۔ دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے منصوبے بناتا تھا اور بیگمات اپنے نااہل رشتے داروں کو نوازنے کے لیے تقریبات منعقد کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے نئے نئے محاذ کھولنے میں غرق رہتا تھا اور بیگمات سلطان کیلئے خانگی انتشار کے نئے مورچے سنوارتی رہتی تھیں۔ یہی باوجود محرومی علاء الدین خلجی کو ملک کا فورجیہ نمک حرام غلام کی محبوبیت تک لے گئی تھی۔ پھر جب اس بھی دل نہیں بدلتا تو سلطان نے گھر کو آگ لگا کر تماشہ دیکھنا چاہا۔ رانی پدمنی کی محبت ایک ایسی ہی حادۃ نے علاء الدین خلجی کی ازدواجی زندگی کو نئے حادثات سے دوچار کر دیا تھا۔ اگرچہ چوڑی کی تعمیر مکمل ایک سیاسی ضرورت تھی لیکن رانی پدمنی کے حصول کی خواہش کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تھا کہ علاء الدین خلجی ابھی کچھ دن اور چوڑی کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن ایک برہمن راگنوں چیتن میں آمد نے تسخیر کی دہلی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا کر شعلہ بنا دیا تھا۔

راگنوں چیتن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ مختلف شہروں میں گھومتا ہوا چوڑی پہنچا اور راجہ کے دربار میں داخل ہو گیا۔ برہمن ہونے کے ناتے سے راجہ رتن سنگھ راگنوں چیتن کے عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا۔ دراصل راگنوں ایک دوسرے درجے کا جادوگر تھا، مہاراجا راہ اپنی ساحرانہ شکستوں سے راگنوں کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب الٹ دیا اور راجہ رتن سنگھ کے سامنے ثابت کر دی کہ راگنوں چیتن کسی دشمن حکمران کا جاسوس ہے جو مذہبی متروں کی آڑ لے کر داخل ہوا ہے۔ جیسے ہی اسے ریاست کے قیمتی راز معلوم ہو جائیں گے۔ وہ چوڑی چھوڑ کر چلا جائے گا۔ رتن سنگھ رام دیو کے زیر اثر تھا، اس لئے راگنوں چیتن کی کوئی دلیل کام نہیں آئی۔ بالآخر راگنوں زلت و رسوائی کے ساتھ چوڑی سے نکال دیا گیا۔ جانے سے پہلے ایک دن اتفاقاً اس نے رانی پدمنی کو دیکھ لیا۔ راجستھان کی تاریخ لکھنے والے ہندو مصنفوں کا کہنا ہے کہ رانی پدمنی کا تپا تک چہرہ دیکھ کر چیتن بے ہوش گیا تھا پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ چوڑی کی حدود سے نکل کر دلی پہنچا اور سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ علاء الدین کی یہ خوبی تھی کہ وہ ہر مذہب و ملت کے باکمال دل سے قدر کرتا تھا جس کے نتیجے میں اہل فن کی ایک بڑی جماعت سلطان کے گرد جمع رہتی تھی۔ چیتن کو بھی سلطان نے خوش آمدید کہا۔ پھر ایک دن تھائی میسر آتے ہی راگنوں چیتن نے سامنے رانی پدمنی کے غیر معمولی حسن کا طویل قصیدہ پڑھا۔ سلطان ایک عورت کی صفات کا ذہن بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چوڑی کی تسخیر کے خواب میں رانی پدمنی کے حسن و دلفریب نے نئے رنگ بھرد۔ راگنوں چیتن دلی کے سلطان کو اکسار راجہ رتن سنگھ سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا اور سلطان نے خوش تھا کہ ریاست کی فتح کے ساتھ ایک ایسی عورت بھی اس کے حرم میں داخل ہو جائے گی جس کی بھی مالک ہے اور امور سیاست کی ماہر بھی۔ سلطان کی نظر میں چوڑی دولت و اقتدار کا ایک اور رانی پدمنی اس کا سودا۔ بالآخر علاء الدین خلجی نے طے کر لیا کہ وہ کاروبار سیاست کے ساتھ دل بھی جاری رکھے گا۔ اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لئے اس نے علی عامر آفریدی کو اپنے حلیت سے چوڑی روانہ کیا تھا اور جب ایک ماہ تک آفریدی کی کوئی خبر نہیں ملی تو سلطان مضطرب نظر پھر یہ اضطراب اس حد تک بڑھا کہ علاء الدین خلجی کی راتیں بے خواب ہو گئیں۔ آفریدی واپس نہ آنے پر سلطان بہت زیادہ پریشان تھا۔ بالآخر اس ابھرنے والی حل تلاش کرنے کے لئے اپنے لائق ترین سپہ سالاروں حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کو خلوت میں طلب کر لیا۔ وہ اس

چھوٹے چھائی الخ خان سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر رانی پدمنی کا حوالہ علاء الدین اور الخ خان کے درمیان شرم و حیا کے ایک دیوار بن گیا تھا۔ اسی رشتے کی نزاکت کے پیش نظر سلطان نے اپنے ہمراہ سپہ سالار الخ خان کو خصوصی مجلس مشاورت سے دور رکھا۔ پھر بھی ملک کا فروہاں موجود تھا کہ اس کے اور علاء الدین کے درمیان اس قسم کا کوئی جواب باقی نہیں رہا تھا۔

خلجی جب دونوں امیر لشکر حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی خلوت خاص میں پہنچے تو سلطان بہت زیادہ ادا اس نظر آ رہا تھا اور ملک کا فروہاں گردن جھکائے دست بستہ کھڑا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کے سرخ ہو گئے تھے اور پھر جیسے ہی وہ فرمانروائے ہند کے نزدیک پہنچے، زمین بوس ہو کر شاہی آداب بجالائے۔ دونوں سپہ سالاروں کے سر سلطان کے در و درونک محرر کے فرش پر یوں لگے ہوئے تھے جیسے وہ سجدے کی حالت میں ہوں۔ یہی اس وقت شاہان ہند کے درباروں کی رسم احترام تھی۔

”افسوس کہ تمہارا سلام قبول کیا گیا۔“ علاء الدین کی رعب دار آواز گونجی۔ مگر وہ اپنے لہجے کی افسردگی کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کھڑے ہو گئے۔ خلجی فرمانروائے اپنے جاں نثاروں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کی آنکھیں دھندلا گئی ہوں۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سلطان نے دونوں امیران سپاہ کو حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کا فروہاں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی، علاء الدین خلجی کے عین سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔ ملک کا فروہاں اپنی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے سلطان کے بائیں ہاتھ کی جانب ذرا آگے بڑھ کر بیٹھا۔ چند لمحوں کے لئے حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی کی سانسیں رک گئیں۔ ایک بدکردار غلام، تاجدار ہند کے اس قدر قریب بھی ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کر ان شہسواروں کے ذہن جل اٹھے تھے جن کے دم سے دنیا میں شمشیر و سناں کی آبرو برقرار تھی۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی جیسے شجاعان وقت نے اس صورت حال کو برداشت تو کر لیا مگر ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون لودے اٹھاتا تھا۔

”سلطان معظم!“ حاجی خواجہ نے حضور شاہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ ”خدام اپنے آقا کی اس سبقتداری کا سبب جاننے کے لئے کہیں ہیں۔ کیا ہماری کسی لغزش نے تمک خوار کی اعتبار کھو دیا؟ اگر ایسا ہے تو ہماری گردنوں میں طوق رسوائی ڈال دیجئے۔ پھر ہم خود ہی کوچہ در کوچہ گھوم کر آپ کی رعایا کو بتا دیں گے کہ اپنے فرائض سے غفلت برتنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔“ حاجی خواجہ کی آواز سوز و رن سے لبریز تھی۔

”تمس خواجہ۔“ سلطان بے اختیار ہو کر بول اٹھا۔ ”چشم فلک تمہاری جانفروشیوں کی گواہ ہے۔ تم سے کوئی کوٹاہی سرزد نہیں ہوئی ہے تم بہترین فرض شناس ہو۔ میں علی عامر آفریدی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ آج اسے چوڑی کی طرف گئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ مگر اس طرح کہ نہ اس کی خبر آئی اور نہ راستے سے کوئی خبر اٹھا۔ میرا سفیر کدھر گیا خواجہ؟“ سلطان نے اپنا زاویہ نظر تبدیل کیا۔ ”تم بتاؤ عراقی! میرا سفیر کہاں کم ہو گیا؟“ فاق عالم علاء الدین خلجی کا سفیر۔ ”یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان نے ساری دنیا کی تفریح کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے اور وہ تصورات میں اپنے آپ کو فاق عالم سمجھنے لگا تھا۔

حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی، سلطان کی وحشت دیکھ کر چند ساعتوں کے لئے سہم سے گئے۔ ابھی ان دونوں میں سے کوئی بھی علاء الدین کے سوال کا جواب دینے نہیں پایا تھا کہ سلطان انتہائی تند و تیز لہجے میں دوبارہ بولنے لگا۔ ”پچاس پچاس میل تک میرے پادے شب و روز دوڑ رہے ہیں مگر اب تک کوئی بھی

جاموسوں نے اطلاع دی ہے کہ آفریدی کا مکان اسی روز سے بند پڑا ہے۔ ”ملک کا فور بڑی احتیاط سے اپنی فطری عماری کے حربے استعمال کر رہا تھا۔“

”شہابی جاسوسوں کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ ہمارے سفیر خاص کی سراغ رسانی کریں۔“

یہ ایک مشکل سوال تھا جس کا جواب دیتے وقت ملک کانور کو سرا سبکی کا شکار ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ بے غیرت ”خواجه سرا“ اپنے ذہن میں سازش کے منصوبے کی ایک ایک کڑی کو مضبوطی کے ساتھ جوڑ چکا تھا۔ ”غلام کا فرض ہے کہ وہ آقا کی عظیم الشان سلطنت کے ایک ایک گوشے پر نظر رکھے۔“ آفریدی کی ماں اور بہن تیار ہتی ہیں۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ ان کی حفاظت کیلئے ایک پہرے دار مقرر کر دیا جائے۔ مگر جب وہ محافظ ”آفریدی کے مکان پر پہنچا تو سارا گھر مقفل تھا اور مکین وہاں سے غائب تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید تنہائی کے خیال سے وہ لوگ اپنے رشتے داروں کے یہاں منتقل ہو گئے ہوں گے لیکن جب تحقیق کی گئی تو یہ راز بھی فاش ہوا کہ دیلی میں آفریدی کا کوئی عزیز موجود نہیں۔ کچھ دور کے رشتے دار ہیں تو ہوائی میں رہتے ہیں۔ پھر میں نے قیاس کیا کہ آفریدی کی والدہ اور بشیرہ بانی چلی گئی ہوں گی۔ بظاہر یہ کوئی فکر انگیز بات نہیں تھی مگر جب آفریدی کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی تو یہ راز چوک پڑنا ایک فطری امر تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ آفریدی واپس آنے کے ارادے سے چوڑ نہیں گیا ہے۔“

”آخر کیوں؟“ سلطان کے غصے نے قمر کارنگ اختیار کر لیا تھا..... ”ہمارا ایسا کونسا کرم ہے جو اس پر نازل نہیں ہوا..... پھر وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ ملک! اگر تمہارا یہ دعویٰ محض ایک الزام تراشی ثابت ہوا تو پھر ہم تمہیں بھی معاف نہیں کر سگے۔“

ملک کانور کو سلطان سے ایک قربت خاص کے سبب اپنی ذات پر پورا اعتماد تھا۔ اس لئے وہ آفریدی کی شخصیت کو نئے انداز سے دائدار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”وہ نمک حرام“ سلطان کی حکومت کو ظلم کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت سمجھتا ہے۔ اس نے ایک بار مجھے آپ کے حوالے سے غلط گالیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ جس عسکران نے اپنے حقیقی بچہ کو قتل کیا اور پھر اپنے محسن کے بریدہ سر کی گلی گلی رسوائی کی اس کی سلطنت میں رہنا بھی حرام ہے۔ آفریدی کہتا ہے۔“

سلطان نے ملک کافور کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔..... ”کیا اس طرح وہ ہماری سلطنت کی حدود سے نکل جائے گا؟“ سلطان کی گفتگو سے خدائی کا سا انداز جھلکے اٹھا۔..... ”اگر آفریدی ہمیں ایک مناسب و جاہل حکمران سمجھتا ہے تو پھر اسے کو سنا خطۂ زمین قبول کرے گا؟ کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔“

”سلطان معظم! آفریدی کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ پہلے چوڑی سیاسی پناہ حاصل کرے گا اور پھر اپنی ماں درہن کو بھی دیں بلا لے گا۔.....“ ملک کافور نے سلطان کی حالتِ غضب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نصت طرازی میں نارنگ بھرنے کی کوشش کی۔

سنان کے چونک کر ملک کا فوری طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ ”ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا میں اس قدر احمق شخص
آفریدی۔۔۔۔۔۔ ”اچانک سلطان کالب و لوجہ بدل گیا تھا۔ ”یہ ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔ آفریدی
مہار احراف اعتبار ہے۔ وہ خود تو موت کے گرد و غبار میں گم ہو سکتا ہے مگر ہمارے یقین کو دھندلا نہیں
ہوئے دے گا۔ ابھی ہم اس کا انتظار کریں گے۔ کون جانے کہ ہمارے سفیر پر کیا گزری ہے؟ وقت ہی
بتائے گا کہ وہ ہمارے بخشے ہوئے اعزاز کا مستحق تھا یا نہیں؟“

مہمانزئی کی تعریف اتنی بے ساختہ تھی کہ آفریدی ایک لمحے کیلئے شرما سا گیا آج پہلی بار کسی شخص نے اس کے مردانہ حسن کی تعریف کی تھی۔ آفریدی نے نظریں نیچی کر لیں اور وکر م سنگھ سے اپنی تلوار کا ذکر کیا جو چوڑی میں داخل ہوتے وقت اس کے جسم پر آویزاں تھی وکر م سنگھ نے فوراً ہی محافظ سپاہیوں کو حکم دیا کہ آفریدی کی وہ شمشیر لائی جائے جسے سفیر کے زخمی ہوجانے کے بعد ریاست کے اسلحہ خانہ میں جمع کر دیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد تلوار لائی گئی تو اس پر جگہ جگہ خون کے داغ نمایاں تھے۔ آفریدی نے تلوار کو نیام سے کھینچا لیکن وہ آسانی سے برآمد نہ ہو سکی خون کی آمیزش کے سبب تلوار نیام میں چپک کر رہ گئی تھی۔ بشکل اسے کھینچا گیا۔ آفریدی بہت غور سے اپنی اس تلوار کو دیکھا رہا جس پر اس کے بے نام اور ناویدہ دشمنوں کا خون جم کر سیاہ دھبوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

”مہمانزئی! تلوار پر نظریں جمائے ہوئے آفریدی نے وکر م سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”میں امن اور محبت کا سفیر ہوں اس لئے اپنی شمشیر پر انسانی خون کے داغ لے کر دربار چوڑی میں داخل ہونا نہیں چاہتا۔“

مہمانزئی نے آفریدی کے اس انداز فکر کو پسند کرتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ تلوار کے دستے اور پھل کو صاف کر دیں پھر جب شمشیر کی اپنی حقیقی آب و تاب لوٹ آئی تو آفریدی نے اسے نیام میں ڈالا اور مہمانزئی وکر م سنگھ کی طرف استغنامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آؤ آفریدی! تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دوں۔“ وکر م سنگھ نے محبت آمیز لہجے میں کہا ”میں بھگوان سے براؤتھا (دعا) کرتا ہوں کہ وہ تمہیں سرخروئی عطا کرے۔“

”مہمانزئی! آپ کی محبتوں کا شکریہ۔“ علی عامر آفریدی نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

”سرخروئی اہل وفا کا مقدر بھی ہے اور حق بھی۔ زندہ رہے تو فتح و نصرت کے جذبات کی سرخی ہمارے چروں کو لگانا نہ دے گی اور اگر قتل کر دیئے گئے تو خود ہمارا الو شوق بن کر پورے جسم کو رنگین کر دے گا۔“

وکر م سنگھ نے ایک بار پھر دلی کے سفیر کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کرنے سے باہر نکل آیا۔

پھر جب علی عامر آفریدی سپاہیوں کے زرخے میں، مہمانزئی وکر م سنگھ کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کے دربار میں داخل ہوا تو ایک لمحے کیلئے درود یوار تک ساکت ہو گئے۔ امرائے چوڑی نے آج تک مختلف ریاستوں کے سیکڑوں سفیروں کو دربار میں داخل ہوتے دیکھا تھا مگر علاء الدین خلجی کے سفیر کو دیکھ کر حاضرین ششدر رہ گئے تھے۔ دراز قامت آفریدی کی جتنی بہ شخصیت نے کچھ دیر کیلئے اہل دربار کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آنے والا سفیر کسی عام خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا کوئی تری شہزادہ ہے؟ آفریدی کا ایک ایک قدم اس شان سے اٹھ رہا تھا جیسے وہ کوئی فاتح ہے اور سرزمین چوڑی کو پامال کر تا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ تمام امرائے دربار عالم سکوت میں سلطانی سفیر کو دیکھ رہے تھے۔ آفریدی، حاضرین کی دور دروہی قطاروں سے گزر کر مند اقتدار کے قریب ٹھہر گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک مرصع تخت تھا جس پر رانی پدمی ایک عجیب شان بے نیازی کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ رانی پدمی کے دائیں جانب اس کا شوہر راجہ رتن سنگھ بیٹھا تھا۔ راجہ رتن سنگھ کے دائیں جانب مہاراج رام دیو اپنے پورے جسم پر زخموں کے نشان سجائے موجود تھا۔ اسی سحرِ عظمیٰ کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر دربار تک پہنچ سکتا۔ اس لئے رام دیو کرسیوں پر بیٹھے تھے ان معززین چوڑی میں ایک قطار مردوں کی تھی اور دوسری عورتوں کی۔

آفریدی نے ان تمام لوگوں پر ایک اچھتی سی نگاہ کی، پھر اس کی نظریں رانی پدمی کے چہرے پر مرکوز

سلطان کے بدلے ہوئے تو ردیکھ کر ملک کا نور کا دل ڈوبنے لگا۔ ”کچھ بھی ہو حضور والا! آفریدی! آپ کے اقتدار کو دل سے تسلیم نہیں کرتا۔“ ملک کا نور نے ایک بار پھر وہی ناگوار قصہ چھیڑ دیا تھا۔ کوئی بھی حکمران سنا پسند نہیں کرتا۔ ”آفریدی قومی تعصب کا شکار ہے۔ وہ ہندوستان کے تخت و تاج کو اہل کابل کی میراث سمجھتا ہے۔“ ملک کا نور نے دلوں کی زمین میں نفرت کا ایک بیج اُلا دیا تھا۔

”مگر تم پر یہ راز کس طرح فاش ہوا؟“ سلطان اپنے محبوب غلام کی باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ ملک کا نور نے اپنے جھوٹ کو بے اثر ہوتے دیکھا تو ایک ایسی تاویل پیش کرنے لگا جو انسانی نفسیات کے غیر مطابق تھی۔ ”اے شاہ ذی وقار! اگر آفریدی آپ کو غاصب جابر نہیں سمجھتا تو پھر اس حقیر غلام تک یہ خبر کیسے منتقل ہوئی کہ سلطان معظم نے اپنے حقیقی چچا کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔“ بے جا ملک کا نور نے اپنی دلیل کو پر زور بنانے کیلئے نئی چال چلی تھی۔ ”اس نے شراب کے نشے میں ایک درباری راقصہ سے یہ بات کہی تھی کہ سلطان اپنے چچا کے قاتل ہیں۔ اور وہ ایسے احسان فراموش حکمران کے دربار سے وابستہ رہنا نہیں چاہتا۔“

سلطان ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ ”آفریدی شراب بھی پیتا ہے اور زنان درباری سے دل ہم بھلاتا ہے۔“ سلطان کو ملک کا نور کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”حضور والا! وہ کون سی علت کا شکار نہیں۔ یہ تو شخص آپ کا حسن ظن ہے کہ اسے پارسیجے ہیں۔“ ملک کا نور کی عیاریاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ ”اگر وہ موجود ہوتا تو میں اس کے گناہ کو ثابت کر کے کیلئے بیک وقت گئی گواہیاں پیش کر دیتا۔“

ایک ذلیل غلام نے سلطان کی شہ پر زہر آلود نشتر رکھ دیا تھا جس کی تکلیف سے ہندوستان تاجدار تڑپ اٹھا تھا۔ ”ہم اپنے اعتبار کا خون کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔“ آفریدی نے ابھی ہمارے کرم کے انداز دیکھے ہیں اسے فاتح عالم کے قہر کا اندازہ نہیں۔ ملک! تمہ اور آفریدی کے اہل خانہ کی نگرانی پر شاہی جاسوس متعین کر دو۔ اگر تمہارا دعویٰ درست ثابت ہوا تو عقرۂ ہم آفریدی کو اس کے گناہ عظیم کی دردناک سزا دیں گے۔“

ملک کا نور خلوت خاص سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس روشن تھا۔

☆.....☆.....☆

گروش وقت کا عجیب انداز تھا۔ دلی جو آفریدی کیلئے جائے پناہ تھی، اب اس کی آغوش سے اُٹا پھوٹ رہے تھے اور ان تمام فتنوں کا خالق نمک حرام ملک کا نور تھا جس نے سلطان علاء الدین خلجی سمارالے کر اہل وفا کے پیر بن کر کوادعا کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسری طرف چوڑی تھا جو علی عامر کیلئے ہی دن سے ایک مقبرہ، ایک مدفن ثابت ہوا تھا۔ کئی بار موت اس کے بدن کو چھوٹی ہوئی گزر گئی اور آفریدی مرمر کے جیتا رہا۔ بالآخر ان ہی فتنوں اور ہنگاموں سے الجھتا ہوا علی عامر، رانی پدمی کے دربار تک پہنچ گیا دربار میں داخل ہونے سے پہلے مہمانزئی وکر م سنگھ اس کے کمرے تک آیا اور پھر جب وکر م سنگھ آفریدی کو نئے لباس میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

”راستے کے گرد و غبار، زخموں کی کثرت اور چوڑی اذیت رسانی نے تمہیں بھگا کر رکھ دیا تھا۔ وکر م سنگھ نے علی عامر کی ظاہری شخصیت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”واقعاً تم سلطان علاء الدین خلجی کے سفیر معلوم ہوتے ہو۔“ وکر م سنگھ کا کالجہ عجیب سا تھا۔

ہو گئیں۔ رانی پدمنی ایک سفید باریک نقاب میں تھی جس نے اس کے گلابی چہرے کو حسین ترین بنا دیا۔ آفریدی چند لمحوں تک اس لالہ صحرانی کو دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار فتنہ انگیز تھے اور جس کا مرمز تو یہ ممکن۔ آج اسے اندازہ ہوا کہ علاء الدین خلجی کا عشق اس قدر جنوں خیز کیوں ہے؟ ایک بہت سی موجودگی نے آفریدی کو احساس دلایا کہ سلطان وحشت و دل سے مجبور ہو کر وادئی فانیں اتر جائے کیوں بے قرار ہے؟ آفریدی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ رانی پدمنی بے مثال حسن رکھنے والی ایسی عورت ہے جس کی خاطر کوئی بھی حکمران دل و جان کی بازی کھیل سکتا ہے۔ آفریدی کے سکوت نظروں کے ارتکاز نے دربار میں پھیل سی جادوی تھی۔ امراء بڑی بے چینی سے اپنی نشستوں پر پھلوں پر تھے۔ انہیں علاء الدین خلجی کے سفیر کی یہ ادائیگی ناگوار گزری تھی کہ وہ ایک تسلسل اور خاص اہم کے ساتھ مہارانی چوڑ کو دیکھ کر جا رہا تھا۔

پدمنی نے بھی شاہی سفیر کی لغزش نگاہ کو محسوس کر لیا تھا مگر آنے والے سے براہ راست نہ ہونا ایک حکمران کی شان کے خلاف تھا، اس لئے رانی پدمنی نے ریاست کے وزیر اعظم کو آواز دیا ”وکر م سنگھ۔“ پدمنی کے لہجے سے سخت ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

وکر م سنگھ جو علی عامر آفریدی کے قریب ہی کھڑا تھا، تیزی سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ سے رانی پدمنی کے سامنے خم ہو گیا۔ ”سلطان علاء الدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی مہارانی چوڑ کی بارگاہ میں حاضر ہے۔“

پھر جیسے ہی وکر م سنگھ خاموش ہوا، علی عامر کے قدموں کو جنبش ہوئی وہ تخت کے نزدیک پہنچ کر رہا۔ اس کا دایاں ہاتھ سینے کی بلندی تک اٹھا اور گردن میں معمولی سا خم پیدا ہوا۔ یہ درباری رسم تھی آفریدی نے آزاد قوم کے نمائندے کی طرح ایک خاص وقار کے ساتھ ادا کیا پھر اس کی دلکش اور بلند ابھری۔

”مرکز قہر و کرم، مالک جاہ و حشم، تاجدار ہند، سلطان معظم علاء الدین خلجی کا سفیر، رانی پدمنی راجہ رتن سنگھ کی خدمت میں آداب پیش کرتا ہے۔“

”تمہارا سلام قبول کیا گیا۔“ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بیک وقت جواب دیا تھا مگر راجہ کی آواز پدمنی کی آواز غالب تھی۔

پورے دربار میں سناٹا چھا ہوا تھا۔ سرکش و خود سر راجپوت پہلی بار ایک شاہی سفیر کی جھمکت کا سامنا کر رہے تھے۔ رانی پدمنی نے ابھی تک آفریدی کی گستاخ نگاہی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

”تمہاری آمد کا مقصد؟“ راجہ رتن سنگھ نے تلخ لہجے میں آفریدی سے سوال کیا۔

”راجپوت سرٹامیری آمد کے مقصد سے بخوبی واقف ہیں۔“ علی عامر نے اپنا بیان جاری رکھا۔

”راجہ رتن سنگھ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کی ریاست کی حدود میں کب داخل ہوا تھا اور آج جب دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دی گئی ہے تو کونسا دن ہے؟“ آفریدی نے انتہائی شائستہ لہجے میں پلٹا ہونے والے تمام ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

”چوڑ کی حدود میں داخل ہوتے وقت تم بے ہوش ہو گئے تھے۔“ راجہ رتن سنگھ نے سیاسی حربہ استعمال کیا۔ ہم نے جس طرح تمہاری تہاداری کی ہے اس کیلئے ہمیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے۔“

”میں والئی چوڑ کی نوازشات کا شکور ہوں۔“ آفریدی کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہی سفیر چند لمحوں کیلئے خاموش رہا پھر رتن سنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”رانی پدمنی“

کے لئے سلطان علاء الدین خلجی کا ایک خصوصی پیغام ہے۔“

شاہی سفیر کے انکشاف پر راجپوتوں کے دربار میں زلزلہ سا آگیا۔ ”وہ پیغام زبانی ہے یا تحریری؟“

راتن سنگھ نے مشکل اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

راتن سنگھ کے پیغام زبانی نہیں ہوتے۔“ علی عامر کا لہجہ ایک نشتر تھا جسے وہ چوڑ کے حکمرانوں پر بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ ”اور وہ پیغام تو زبانی ہو بھی نہیں سکتا کہ جس پر وقار شاہی کی بقاء کا انحصار ہے۔“

اس انکشاف پر اہل دربار کی سانسیں رک سی گئیں۔ راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر چند لمحوں میں کئی رنگ ہرگز مٹے تھے۔ رانی پدمنی نے بڑے غور کے ساتھ اپنی نشست پر پھلوں پر بٹھایا تھا۔ مگر رام دیو غیر متوقع طور پر دھڑکتا نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں گزشتہ ناکامیاں اور رسوائیاں تازہ ہو گئی تھیں۔

”سلطان کا پیغام پیش کیا جائے۔“ بالآخر ایک عالم جبر میں رتن سنگھ نے اس پر اسرار پیغام کو سرور بار پیش کرنے کی اجازت دیدی تھی جس نے مسلسل ایک ماہ سے ریاست کا امن و سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا۔

اجازت پاتے ہی علی عامر آفریدی نے کانڈ سے اپنی تلوار اتاری تمام درباریوں کی نظریں شاہی سفیر کی اس حرکت پر مرکوز تھیں۔ آفریدی نے دونوں ہاتھوں سے اس بھاری شمشیر کو سنبھالا اور نیام کے اگلے حصے پر لگے ہوئے باریک پتھروں کو کھولنے لگا۔ کچھ دیر بعد اہل دربار نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ آفریدی کی نیام دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی نیام کا اگلا حصہ اضافی اور کھوکھلا تھا پھر اس حصے سے آفریدی نے ایک سرخ رنگ کا نقاب برآمد کیا۔

”یہ پیغام آپ مہارانی کے ملاحظے کیلئے پیش کر دیتا ہے۔“ آفریدی نے وکر م سنگھ سے کہا۔

”نہیں! چاکل رانی پدمنی کی آواز گونجی۔ اب اس کی مترنم آواز کی سحر کاریاں ختم ہو چکی تھیں اور مہارانی کے لہجے میں رنگ قہر شامل ہو گیا تھا۔ ”ہم اس شخص کی تحریر کو دیکھنا پسند نہیں کرتے جس نے تمام آداب سفارت کو پامال کر کے ایک غیر مذہبانہ روش اختیار کی ہے۔ سلطان کا پیغام زبانی بیان کیا جائے۔“

”مہارانی! سلطان کے پیغام کو اپنی زبان سے ادا کرنا میرے اختیار کے دائرے میں نہیں۔“ یہ کہہ کر علی عامر آفریدی نے وہ سرخ نقاب مہمانتزی وکر م سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

”تم بڑھو مہمانتزی کہ اس مغرور سلطان نے کیا لکھا ہے؟ ہماری نظریں یہ پردہ داری ناقابل معافی جرم ہے۔ اسے جو کچھ کہنا تھا راجپوت سرٹام سے کہنا تھا۔ غیرت مند خواتین غیر مردوں سے پراسرار گفتگو کی مکمل نہیں ہوتیں۔“

رانی پدمنی کی اجازت کے بعد مہمانتزی وکر م سنگھ نے علاء الدین خلجی کا سر بھر نقاب چاک کر ڈالا۔ نقاب نے ہر آمد ہونے والا کانڈ سرخ تھا اہل دربار شدید حیرت و سکوت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وکر م سنگھ نے سرخ کانڈ پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ سنہری حروف اس کے سامنے اس طرح نمایاں تھے جیسے ڈوبے سورج کی کرنیں شفق کے کناروں سے ابھرتی ہیں۔ مہمانتزی خاموشی سے سلطان کا پیغام پڑھتا رہا۔ حاضرین دربار اپنی سانسیں روکے وکر م سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں گھبراہٹ اور استعجاب کے سوا کسی دوسرے جذبے کا عکس موجود نہیں تھا۔ ابھی علاء الدین خلجی کا خط تمام ہونے بھی نہ پایا تھا کہ درمیان میں علی عامر آفریدی بول اٹھا۔

آفریدی نے رانی پد منی کے تخت زر نگار سے لے کر دربار کے آخری گوشے تک نظردہائی پھر یہ آواز بلند کئے

”اہل دربار گواہ رہیں کہ میں نے رازداری قائم رکھنے کیلئے ایک ماہ تک دنیا کی ہر تکلیف برداشت کی مگر رانی پد منی نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔“ اتنا کہ کر آفریدی نے سلطان کے خط کو بغور دیکھا۔ اگرچہ وہ علاء الدین خلجی کے مفہوم سے باخبر تھا لیکن تفصیلات اس کے علم میں نہیں تھیں۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ سخت بے ادبی ہے مگر مجھے سفارت کی ناکامی منظور نہیں۔ کاش! مہارانی اپنا فیصلہ بدل دیتیں۔“

”ایک ایک حرف پڑھا جائے۔“ رانی نے آفریدی کی آخری امید کا بھی خون کر ڈالا۔

علی عامر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور راجپوت سرداروں کی ساعیں شاہی سفیر کی آتش گفتار سے جلنے لگیں۔

”حکم نامہ سلطان۔ بنام رانی چوڑ۔“

یہ عبارت پڑھ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے ٹھہر گیا۔ سلطان کے انداز مخاطب نے راجپوت زاوی کے پورے جسم میں آگ لگادی تھی۔

آفریدی کی نظریں دوبارہ مکتوب شاہی کی طرف پلٹ آئیں پھر اہل دربار پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔

آفریدی کی دلکش مگر بارعرب آواز دوبار چوڑ کے ایک ایک گوشے میں گونج رہی تھی۔

”پد منی! یہ تمہاری خوش نصیبی ہوگی کہ ہندوستان کا مطلق العنان حکمران تمہارے حسن بے مثال کواں طرح بے نقاب دیکھے کہ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ تمہارے شوق دیدنے ہمارے دنوں کو بے آرام اور راتوں کو بے خواب بنا دیا ہے۔ تمہیں کسی تاخیر کے بغیر خلوت شاہی تک پہنچ جانا چاہئے۔ اب یہ عزت شاہ پر منحصر ہے کہ وہ دیدار خاص کے بعد تمہیں چوڑ واپس جانے دے یا پھر رسم تاج پوشی ادا کر کے ایک رانی کو ملکہ ہند بنادے۔ ہم نہیں جانتے کہ تم سے ملاقات کے بعد ہمارا جذباتی رد عمل کیا ہوگا؟ پھر بھی ہم یہ بات طے کر چکے ہیں کہ تمہارے حسن شر بار سے اپنے شہستان محبت کو آراستہ کریں۔“ سلطان کی غور راہی بات تھی مگر آفریدی کو تلواریں کی جھنکار سن کر چند ساعتوں کیلئے رک جانا پڑا۔ دربار میں موجود تمام راجپوت سپاہیوں کی تلواریں بے نیام ہو چکی تھیں اور ان کے چہرے پر وحی وحشت ناچ رہی تھی جو بھوکے

اردنوں کے غول براس وقت طاری ہو جاتی ہے جب وہ شکار کو اپنے زرعے میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ علی عامر نے تاناک فزاد کے غلوں کی کھٹک کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ اب اس کی نظریں رانی پد منی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چوڑ کی حکمران شہید غضب سے کانپ رہی تھی اور واقعتاً اس نے تہ کی دیوی درگا کا روپ دھار لیا تھا۔ حسن اس قدر پرہم ہو چکا تھا کہ رخساروں پر بسنے والے پسینے کے گلاب رنگ قطرے زہری بوندوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وکرم سنگھ اپنے دونوں ہاتھ سے سر پکڑے رانی پد منی کے بائیں ہاتھ والی نشست پر

جل رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کی سب سے اہم بازی ہار گیا ہو۔ راج رتن سنگھ کا چہرہ بھی آتش نفرت سے آنکھیں کھسک رہی تھیں اور عصبانیت کھل طور پر شکستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ دربار میں موجود تھا لیکن اس کی سرخ

”مہارانی اس خط کو خود ملاحظہ کریں۔ شاہی پیغام ایک راز ہے اور راز کو سر محفوظ بیان جا سکتا۔“

”ہمارا سلطان سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے نام رازدارانہ پیغام ارسال کرے رانی پد منی کے لہجے سے قہر کی آگ برسنے لگی تھی۔“ وکرم سنگھ! ہمارے حکم پر فوری عمل کیا جائے۔ غیروں کی جانب سے ہوا یا بیٹوں کی طرف سے، یہ جرم ہمارے حضور قابل معافی نہیں ہوتا۔“

”مہارانی! راج دوت کا مشورہ درست ہے۔ اس پیغام کو صرف آپ ہی ملاحظہ کر سکتی ہیں خوفناک ترین حالات میں بھی ثابت قدم رہنے والا وکرم سنگھ اس وقت بہت زیادہ شکستہ نظر آ رہا ہے کائنات ہاتھوں سے علاء الدین خلجی کا خط آفریدی کی طرف بڑھا دیا۔

”اگر مہمانتزی کے احساس وفاداری نے ان سے ان کی زبان چھینی تو پھر تم ہی اپنے سلطان بہ آواز بلند پڑھو۔“ رانی پد منی نے آفریدی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شاہی پیغام ایک راز ہے اور راز کو سر دربار فاش نہیں کیا جاتا آفریدی نے پد منی کے غضب ناک لہجے کا لکا سا تاثر بھی قبول نہیں کیا تھا وہ اسی بے باکی کے ساتھ ہوا جیسے کوئی شخص حلقہ یاراں میں بے تکلفانہ گفتگو کرتا ہے۔

”یہ تمہارے سلطان کا کھل نہیں، دربار چوڑ ہے۔ اور اس دربار میں آنے والے ہماری ایک ایک چشم و لب کے پابند ہوتے ہیں۔“ اب رانی پد منی کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح شعلہ بر ہو گئی

”مہارانی! میں آپ کے حضور آنے والے تمام انسانوں سے جدا ہوں۔“ آفریدی کے الفاظ تھے مگر لہجہ جارحانہ نہیں تھا۔ ”میں ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں جاؤں لیکن میری آنکھیں پھر مرکوز رہتی ہیں۔ میں صرف اپنے سلطان کی زبان سمجھتا ہوں۔ باقی زبانیں میرے لئے کوئی حشیہ نہ رکھتیں۔“

”تو پھر اسی وقت چوڑ کی حدود سے نکل جاؤ۔“ دلوں کی تسخیر کرنے والی آواز سے بدستور شہا رہے تھے۔ ”پھر جب دلی پہنچو تو اپنے سلطان سے کہہ دینا کہ غیرت مند راجپوتوں کی بیٹی نے اس سننے سے انکار کر دیا۔“

علی عامر نے بڑے حوصلے کے ساتھ رانی پد منی کے اس تحقیر آمیز سلوک کو برداشت کیا۔ ”میں تو جانے ہی کیلئے آیا ہوں مگر سلطان کے خط کا سر دربار پڑھا جانا آپ کے مفاد میں نہیں ہے۔“

”چوڑ کی حکمران سے درخواست کروں گا کہ وہ سلطان کے پیغام کو تہائی ہر رازداری کے ساتھ پڑھیں اور تحریری جواب لکھ کر میرے سپرد کر دیں۔ میری نظریں ہی سلامتی راستہ ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا مجھے جو حکم دیا گیا ہے میں اسی پر عمل کر رہا ہوں۔“

”تمہاری گفتگو نے نہ صرف مجھے بلکہ اہل دربار کو بھی شہامت میں مبتلا کر دیا ہے۔“ رانی پد منی نے قہر غضب کا وہی عالم تھا۔ ”سلطان کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ مجھے خفیہ پیغام ارسال کرے۔ تمہارے حکمران سے یہ ذلیل حرکت سرزد ہو چکی ہے تو پھر لازم ہے کہ جو کچھ کہنا جائے سب کے

کہا جائے ورنہ جدھر سے آئے ہو اسی طرف ناکام و نامراد واپس چلے جاؤ۔“

علی عامر آفریدی شہید ذہنی کشش کا شکار تھا۔ اپنی سفارت کو ناکام دیکھتا یا سلطان کے طشت از بام ہو جانا۔ اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔ آفریدی نے بڑے کرب کے ساتھ راستے کا انتخاب کر لیا۔ وہ ایک ناکام سفیر کی حیثیت سے دلی واپس جانا نہیں چاہتا تھا اس فیصلے

دربار کی دلی کیفیات کا جائزہ لیا اور دوبارہ اپنے سلطان کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ علاء الدین خا چوڑ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”پد منی! تم یقیناً اس حقیقت سے باخبر ہو گے کہ ہماری ہر خواہش حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر ایک ہی مضمون ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد اس گناہ کا مرتکب ہو گا تو زندگی اس سے اپنا رشتہ توڑے گا۔ کوئی قوم ہمارے حکم سے روگردانی کرتی ہے تو پھر حیات و زیست کے تمام عناصر بھی اس سے منقطع اور اگر کوئی حکومت ہماری خواہشات کا احترام نہیں کرتی تو تاریخ اس کے انجام پر روتی ہے اور المناک موت پر صدیوں تک مرثیہ پڑھتا رہتا ہے۔ ہم نے تمہارے بارے میں سنا ہے‘ نعمتوں کے ساتھ ہوش و خرد کی صلاحیتوں سے بھی شرفیاب کی گئی ہو۔ ہم ایسی ہی شریک حیات میدان جنگ میں فتح و نصرت کا پرچم اٹھا کر ہمارے دوش بہ دوش چلے۔ اور جب ہمارے جموں کے چراغ روشن ہو جائیں تو وہ اپنی مشک بار سانسوں سے ان چراغوں کو بجھا دے اور حریری سے جراثیم کی سوزش کو کیف میں بدل ڈالے۔ ہمیں بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اس ہندوستان میں تم ہی ایک ایسی عورت ہو جو ہمارے فوق جمال کی گہرائیوں کو سمجھ سکتی ہے کہ اس وضاحت کے بعد تم ”رانی چوڑ“ اور ”ملکہ ہند“ کے فرق کو بھی باسانی سمجھ سکو گے۔ تم نے مٹھی بھر راجپوتوں کی حمایت کے نشے میں ہمارے جذبات وارفہ کو عزت و توقیر نہیں؟ ایک نظر راجپوتانے کی پہاڑیوں کی طرف دیکھو جن کے سنگلاخ سینوں میں عنقریب ہمارے گے کبھی نہ بھرنے والے شکاف ڈال دیں گے، پتھروں کے درمیان بسنے والی تمام ندیاں انسانوں کی ہو جائیں گی، کیسے کیسے جوان مردوں کی لاشیں زمین کی خوراک بن جائیں گی اور کسی کیسی بے دوشیزائیں اپنے ہاتھوں سے اپنی تشہ جوائیوں کو آگ لگا دیں گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ منظر ہو گا اور تمہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہو گا کہ ہمارے ہاتھ کتنے دراز ہیں؟ پد منی! ایک با کے بھڑکوں سے اس تپتے ہوئے صحرا کو دیکھو جس کا ایک ایک ذرہ بہت جلد تم سے بے ہوا ہے۔ چوڑ کی زمین کا ایک ایک گوشہ ہمارے حکم کا تابع ہے۔ جب دربار شاہی سے یہ حکم نازل ہو گا تو وہ مٹی جسے تم اپنی ماں سمجھتی ہو، تمہیں فراموش کروے گی اور اپنی تمام اولاد علاء الدین خلجی کے ہاتھوں فروخت کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ خونی تجارت کا یہ باز ہمارے حرم میں چلی آئے۔ تمہارے لئے یہ شرف کافی ہو گا کہ ہم دلی کی حدود سے نکل کر استقبال کریں ورنہ ہمارا مزاج تو یہ ہے کہ ہم کسی دیوی کو کوئی اعزاز نہیں بخشے۔ پتھر کے یہ بت قدموں پر سجدہ ریز ہونے کیلئے بے قرار رہتے ہیں۔“

جیسے ہی شاہی حکم نامے کی آخری سطر ختم ہوئی، رانی پد منی غصے سے بے قابو ہو کر کھڑا حکمران کا یہ اضطراب عمل دیکھ کر راجپوت سردار بھی اپنی اپنی پشتوں پر کھڑے ہو گئے۔ تلواریں آہنی خول میں روپوش تھیں، وہ بھی بے نیام ہو گئیں۔ پھر سارا دربار مختلف آوازوں کے شور سے گونجنے لگا۔ کسی مسلمان حکمران نے آج راجپوتوں کی اتنی تذلیل نہیں کی ہے۔ یہ دنیا کی غلیظ ترین گالی ہے جو سلطان علاء الدین خلجی نے رانی پد منی کیلئے استعمال کی ہے۔ ہم سلطان کو اس حرف بد کا جواب اس طرح دیں گے کہ نفرتوں کے اظہار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے۔

پھر اسی شور میں ایک راجپوت سردار کی گرجدار آواز ابھری۔ ”ہم مہارانی سے التجا کریں

یہ سیر کا سرکٹ کر دلی بھیج دیا جائے۔ سلطان کے غلاظت نامہ کا یہی بہتر جواب ہو گا۔“ رانی پد منی نے راجپوت سردار کے اس مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شدید غصے کے باعث اپنے اس کھچے کھچی اور کسی برگ خزاں رسیدہ کی طرح کانپ رہی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے اپنی بیوی کی بگڑتی ہوئی لٹ دیکھی تو خود تخت سے اٹھا اور رانی پد منی کو سہارا دے کر اپنے قریب بٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام چہت سردار بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مگر ان کی کشمکشیں بدستور بے نیام تھیں۔ راجہ رتن سنگھ نے اشارے پر راج کل کی ایک کینز گلاب سے بھرا ہوا ایک بلوریں پیالہ لے کر آئی جسے پینے کے بعد پی پد منی کے گلے ہوئے اعصاب کسی حد تک پرسکون ہو گئے۔

رانی پد منی کے دربار میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کے دل میں آفریدی کیلئے نفرتوں کا وانا نہ بھرا ہو۔ مگر اس مشتعل اور کشیدہ فضا میں ایک ایسی ہستی موجود تھی جس کی نظریں مستقل فریدی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی مجسمے کی مانند خاموش بیٹھی ہوئی یہ ہستی اس نوجوان اور دلکش لڑکی کی تھی جسے اہل چوڑ زنا کماری کے نام سے جانتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کا عشق زدہ حکم نامہ سن کر وہ بھی موجود ایک ایک فرد کے جذبات برا بھلا گھنٹنے ہو گئے تھے۔ خود زنا کماری بھی اپنی بہن کے ایلے سلطان کے اس پیغام کو انتہائی ناشائستہ حرکت سمجھتی تھی مگر علی عامر آفریدی کی دلکش اور باوقار حثیت نے اس کی توجہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کبھی وہ علاء الدین خلجی کا اقتدار کے نشے میں پھولتا نامہ سن کر اپنے سینے میں نفرت کا جذبہ موجزن پاتی اور کبھی آفریدی کی سحر کار شخصیت میں کھو کر جاتی۔ اس وقت بھی زنا کماری، علی عامر آفریدی ہی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ راجہ رتن سنگھ کی تیز آواز نے اسے چو نکا دیا چوڑ کا حکمران اپنی خوبصورت رانی کو زمانے کے نشیب و فراز اور سیاست کے پیچ و خم ماننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”علاء الدین آدمیت کی قبائیں ایک خون آشام درندہ ہے جس کے خونی پنچے اور آہنی دانت انسانی نیوں کی طرف لپک رہے ہیں اس کی وحشتوں کے خلاف حصار کھینچنا اتنا آسان نہیں۔ تمہیں بہر حال بدبو ہوش سے کام لینا ہو گا۔“

”سلطان نے آپ کے ناموس کو بدترین گالی دی ہے۔“ رانی پد منی اسی تند و تیز لہجے میں راجہ تن عم سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ نے میرے بارے میں ایک نامحرم کے غلیظ کلمات سن کر نہ صرف اپنے ناموس کو گھٹا کر دیا بلکہ مجھے بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ میں اپنی ساتوں پر پیرے بٹھادوں اور شرمناک قول کو ایک کردی دوا سمجھ کر پی جاؤں۔ نہیں! سہرا! میں اس سیاست کی قائل نہیں۔ یہ سیاست میں بے حمیاری اور بے حیائی کی بدترین علامت ہے جسے برداشت کرنے کے بعد عورت، عورت نہیں ہوتی۔“

راجہ رتن سنگھ شدید اعصابی دباؤ کا شکار تھا۔ وہ اس نازک ترین صورت حال پر قابو پانے کیلئے ابھی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ راجپوت سردار اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مہاراج! ہم آپ کی ذہانت اور تدبیر کے قائل ہیں مگر یہ ہماری زندگی کی سب سے زیادہ شرمناک ایجنڈوں کی فہرست کا فطری تقاضا ہے۔ انہیں ایسا کوئی مشورہ نہ دیجئے جسے قبول کرنے کے بعد وہ راجپوتوں کے ناموس کا ایک سیلاب بن کر رہ جائیں۔“

ایک؟ اب موت کا قص ہو یا زنجیروں کی جھنکار، جو کتنا تھا کہہ دیا گیا اور جو سنا تھا اس لیا گیا۔ میں اپنا ادا کر چکا ہوں۔ یہ منی بھی اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ ” یہ کہہ کر علی عامر آفریدی نے ان راجپوتوں کی طرف دیکھا جو اپنی شیشیں بے نیام کئے ہوئے اس کیلئے اذیت ناک سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آفریدی کے ہونٹوں پر ایک ایسی تلخ مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو راجپوتوں کے گھر میں ان کے تمام تر کھانا ذخائر بھی تھے۔

”اس کی گستاخ آنکھیں بجا دو اور بے ادب زبان کاٹ دو۔“ رانی پد منی نے اپنا آخری فیصلہ سنایا

”سلطان سے انتقام لینے کا یہ انداز غیر سیاسی ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے رانی پد منی کی آتش انتقام کو بند کرنے کی کوشش کی۔ مگر نفرت کی اس آگ کو بجھانے کے لئے الفاظ کے چند قطرے ناکافی تھے۔

”سر! میں خود بھی سیاست کے بیج و خم کو سمجھتی ہوں مگر سیاست انسان کی ہر بیماری کا علاج نہیں ہے۔“ شوہر سے گفتگو کرتے ہوئے بھی رانی پد منی کا لہجہ تلخ تھا۔ ”اگر شاہی سفیر کو کسی اعزاز کے بغیر ت کر دیا گیا تو سلطان کے ناپاک حوصلے اور بلند ہو جائیں گے۔“

”سفیر کا اپنی زبان اور آنکھوں سے محروم ہو جانا کوئی سرکاری اعزاز نہیں۔“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ نہ تھا جسے کسی ضدی بچے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”یہ تو ہماری طرف سے دی جانے والی ایک الی ہوگی جو سلطان کے قہر کی آگ کو بجھانے کا کر رکھ دے گی۔“

”میرے وقار کا پرہیز، جل جانے کے بعد اس آگ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔“ رانی پد منی سیاسی اختیار کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھی۔ ”اب وہ آگ تخت و تاج کو جلائے یا چوڑے کے ایک ایک گوشے کو کر رکھ دے۔“

راجہ رتن سنگھ نے اپنی غضب ناک بیوی کو منانے کیلئے کئی متبادل طریقے پیش کئے آخر وہ اس پر آمادہ ہو کر علی عامر آفریدی کی ایک بار اپنی زبان سے سلطان کو گناہ گار کہہ دے تو اسے چوڑے رخصت کر دیا۔ وہ نہ اس دور ان اس پر اس وقت تک تشدد جاری رہے گا جب تک سفیر کے ہونٹوں پر علاء الدین جی کیلئے کوئی حرف گستاخ نہیں ابھرتا۔

آفریدی نے ایک بار پھر رانی پد منی کے اس ذلت آمیز مطالبے کو ٹھکرا دیا تھا جس کے جواب میں اس نے کمپناؤں کی بارش شروع ہو گئی تھی طاقتور جلاو آفریدی کو مشق ستم نہ رہے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی ہلچل مچ رہی تھی کہ وہ اپنے سلطان کی مذمت کرے راجہ رتن سنگھ پریشان تھا کہ بگڑے ہوئے راجپوتوں اور مہتممیں و کرم سنگھ کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی اگر وہ ایک بار بھی سراٹھایا تو کوئی درباری اس کے

ملاوڑ پر بھی مسمو ہو جاتا کہ وہ شدید اذیت و کرب کا شکار تھا۔ و کرم سنگھ کے علاوہ دربار میں یہ یہ نرملہ گداری تھی جس نے آفریدی کے جسم پر پڑنے والے نازیباؤں کی ضرب اپنے دل پر محسوس کی تھی۔ ان کو وہ کاٹھن چہرہ شدت رنج و الم سے دھواں ہو گیا تھا اس نے اپنے دل پر جبر کر کے آفریدی کا پورا جسم گھر گھر ہو گیا تھا وہ زخم جو ملک کا نور کے سپاہیوں کی عنایت سے ابھی تک ہرے تھے

علی عامر آفریدی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی کہ رانی پد منی اس قدر ذلت آمیز شرط پیش کرے گی۔

”اور یہ بھی کہہ دو کہ تمہارا سلطان بزدل ہے جو اپنی فوجی طاقت کے نشے میں غیرت منداہ کے سر اپنے قدموں پر جھکنا چاہتا ہے۔“ رانی پد منی نے اپنے شرائط نامے کا ایک اور سواک تھا۔ ”اور یہ بھی کہہ دو کہ اس کے ہاتھ شیطان کے ہاتھ ہیں جن کی درازی سے کوئی عزت نہیں۔ اور یہ بھی کہہ دو کہ وہ فاحش بندوستان نہیں، ایک غاصب، ایک لٹیرا ہے جسے گردش وقت لے آئی ہے۔“ یہ کہہ کر رانی پد منی خاموش ہو گئی اور علی عامر کو انتہائی حقیر آمیز لگا ہوں۔ آفریدی کسی جھٹکے کی مانند ساکت کھڑا تھا اور اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس دوران یہ پہلا مرحلہ تھا جس کی سنگینی نے آفریدی سے اس کی زبان چھین لی تھی۔

”اگر تمہیں ہماری یہ شرائط حرف بہ حرف منظور ہیں تو پھر تمہارا گناہ معاف کیا جاسکتا ہے نے آفریدی کے تن داغ داغ پر اپنے زاویے سے نشتر زنی کی تھی۔

”ورنہ.....“ آفریدی نے شکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہوگی؟“

”تم کہہ چکے ہو کہ تمہاری آنکھیں سلطان کی آنکھیں ہیں اس لئے ان بے ادب آجائے گا اور تم یہ بھی کہہ چکے ہو کہ تمہاری زبان سلطان کی زبان ہے ہم ایسی گستاخ زبان کو دیں گے۔“ رانی پد منی نے آفریدی کے جرم کی سزا سنائی تھی اور اس فیصلے سے مسرت و جوش کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔

”میری انصاف ہے اور یہی سلطان کی گالیوں کا مناسب ترین جواب ہے۔“ اچانک سپہ سالار ہری سنگھ کھڑا ہوا اور اپنی شیشی کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر بے آواز بلند کہنے لگا۔ ”راجہ مہارانی پد منی پر دیوتاؤں کا کرم ہمیشہ سایہ گلن رہے۔“

ہری سنگھ کے بعد دیگر سرداران قوم بھی رانی پد منی کے فیصلے کی پرزور تائید کرنے لگے رگوں میں اٹھنے والا خون مسلسل مطالبہ کر رہا تھا کہ رانی پد منی جلد از جلد اپنے فیصلے کو عملی غیرت مند قوم کی خواہشات کا احترام کریں۔

مہتممیں و کرم سنگھ سر جھکائے بیٹھا تھا اور پسینے کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے جوتے تھے۔ نرملہ کا سرخ و سفید اور شاداب چہرہ شدت الم سے دھواں ہو گیا تھا۔ اور اسے زندگی نہ ہوا تھا جیسے آنے والے لمحات اس کی متاع عزیز چھین کر وقت کے گرد و غبار میں گم ہو جانے راجہ رتن سنگھ کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی تھی مگر اس نے ابھی تک اپنی مغرور بیوی کے معاملا نہیں کی تھی۔

رانی پد منی ایک بار پھر علی آفریدی سے مخاطب ہوئی۔ ”اگر تم ہماری مرضی کے مطابق مذمت کرنے کو تیار ہو تو دردناک سزا کا یہ حکم واپس لیا جاسکتا ہے۔“ چوڑکی عکراں سے خوفزدہ کرنے کیلئے نفسیاتی دباؤ ڈال رہی تھی۔

”بے شک! رانی پد منی اور راجپوت سرداروں نے اپنی غیرت کے ترانے بہت پر مشور آگائے مگر افسوس! ان لوگوں نے اپنے مخاطب کی شخصیت کو نظر انداز کر دیا۔ جب سلا خلیج کے سفیر نے پہلی بار لے چھیری تھی تو رانی چوڑو کو اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ نفوذ کر کو

ان سے دوبارہ خون کے آثار جاری ہو گئے تھے اور کچھ نئے زخم بھی تھے جو آفریدی کی قبائلی تہذیب کے معصوف تھے۔ تازیانی کے ہر ضرب پر آفریدی کے چہرے کارنگ بدل جاتا مگر کوئی آواز بلند نہ ہوتی۔ رانی پد منی کے حکم پر جلاد اس سے وہ مطالبہ کر رہے تھے، آفریدی اس کے جواب میں یہی کہتا چوڑا! مجھ سے واقف نہیں گردش وقت نے انہیں میرے جسم پر با اختیار بنا دیا ہے مگر مجھے ان کے نیلام گاہ میں فروخت نہیں ہو سکتے ممکن ہے کچھ لوگوں نے ان کے ہاتھ اپنے ضمیر اور زبانیں بچا دی ان کی لگائی ہوئی یہ قیمت مجھے خریدنے کیلئے نا کافی ہے میں جس کے ہاتھوں فروخت ہوا ہوں وہ ذی وقار کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ خدا میرے تاجدار کے جلال کو برقرار رکھے۔ عنقریب ہو جائے گی کہ آفریدی پر کیا گزری؟ پھر راجپوت سورماؤں کو اندازہ ہو گا کہ ایک سفیر کی تذلیل خنیں منافرت پیش کرتی ہے۔ میرا الو تو بدن میں جمی ہے اس لئے ہوا تھا کہ ایک دن وہ بہہ جائے اور چوہا پران مٹ نقش و نگار بناوے۔

آفریدی کے صبر و استقامت پر تشدد کی لے اور بڑھ جاتی۔ یہاں تک کہ آفریدی بے ہوش ہوا گر پڑا۔
”بس ہمارا! آپ کا شوق انتقام پورا ہو چکا۔“ راجہ رتن سنگھ سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اُن سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”شاہی سفیر کو زندہ رہنے دیں کہ اس کی موت کا قرض راجپوتوں سے ہو سکے گا۔“

”نہیں سمرات! ابھی میرے انتقام کی آگ کہاں بجھی ہے۔ سفیر کے خون کی چھینٹوں سے تو اور بھڑک گئے ہیں۔“ رانی پد منی اس قدر غصے میں تھی کہ درباری آداب کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تیز قدموں سے باہر جانے لگی۔

راجہ رتن سنگھ نے بڑے کرب کے عالم میں اس عورت کو جاتے ہوئے دیکھا جس نے چوڑی وادی مرگ تک پہنچا دیا تھا اور وہ خود ایک خاموش تماشا کی طرح اپنے اقتدار کی لاش کا نظارہ کر رانی پد منی کے جاتے ہی رتن سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے تختیوں سے اٹھ کر دیا۔ جب دربار خالی مہمانتزی بھی اٹھ کر جانے لگا تو راجہ رتن سنگھ نے اسے پکارا۔ ”وکر م سنگھ! تم بھی ہمیں اس غم بآہ تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

وکر م سنگھ اپنے حکمران کی آواز سن کر پلٹ آیا اور سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”سمرات! میں کہاں جا سکا تو اس حکم کی تعمیل بھی جواہل دربار کو دیا گیا تھا۔“

”تم عام اہل دربار میں سے نہیں ہو۔“ راجہ رتن سنگھ نے تنکھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم شاہ اپنی گمرانی میں رکھو کہ آفریدی کے لئے تمہارے مکان سے زیادہ محفوظ کوئی دوسری پناہ گاہ چوڑا نہیں ہے۔“

مہمانتزی وکر م سنگھ نے گردن کے خم سے اپنے فرمانروا کے حکم کی تعمیل کا اظہار کیا اور پھر چند باد سے حبس ہوش آفریدی کو اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ دوسرے ہی لمحے راجہ وید بھی طلب کر لیا گیا فوری طور پر آفریدی کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر جیسے ہی رتن سنگھ اپنے کمرے میں داخل ہوا، رام دیوی پائل کی بھی دہاں پہنچ گئی۔ عیار جاوہر تک راجپوت سمرات کو یہی کچھا تا رہا کہ جب تک شاہی سفیر کو قتل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک چوڑا

غلاب نازل ہوتے رہیں گے۔ رتن سنگھ اپنے دل پر جبر کر کے رام دیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے فریب کار ساحر کو رخصت کیا۔

رام دیو کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ اپنی خصوصی نشست گاہ میں واپس آ گئے۔ راجپوت سمرات پر ایک بدھو رشت طاری ہو گئی تھی اور اس نے شغل سے نوشی شروع کر دیا تھا۔ رانی پد منی خاموشی سے شوہر کی انفرادی کیفیت کو دیکھتی رہی پھر تاب خطبہ نہ رہی تو بول اٹھی۔

”آخر تک شرب پیتے رہیں گے؟“ پد منی کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔
”جب تک میں پاگل نہیں ہو جاتا۔“ راجہ رتن سنگھ کی گفتگو کا انداز دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی حکمران کو یہ خبر دی جا رہی ہو کہ اس کی فوجیں مسلسل پیچھے ہٹ رہی ہیں اور کسی بھی وقت ملک پر دشمن کا قبضہ ہو سکتا ہے۔

”آخر کیوں؟“ رانی پد منی نے بڑے غرور و ناز کے ساتھ کہا۔ ”وہ کونسا غم ہے جسے آپ شرب کے ذریعے فراموش کرنا چاہتے ہیں؟“

راجہ رتن سنگھ اپنی خوبصورت اور نوجوان بیوی کی اس بے نیازی پر سگ اٹھا تھا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مجھے کیا غم ہے؟“ چوڑا کے حکمران کا لہجہ بہت تلخ تھا۔
”نہیں۔“ پد منی کا وہی انداز دلربائی تھا۔

”تمہیں بہت جلد سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ راجہ رتن سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ”جب علاء الدین خلجی چوڑی کی بنیادیں اکھاڑ پھینکے گا۔ جب حیادار و دیشناؤں کے سروں سے اٹھل کھینچ لے جائیں گے۔ جب سہاگوں کی بیج چٹانیں جائے گی۔ جب کمر خیزہ بوڑھے پتے ہوئے صحرائیں موت کی تمنا کر رہے ہوں گے جب کڑیل جوان پیوند خاک ہو جائیں گے اور جب معصوم بچوں کے سینے پر شہی کے داغ روشن کر دیئے جائیں گے اس وقت تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ راجہ رتن سنگھ کا پورا جسم لرز رہا تھا اس نے گہرا کر کرسی کا سہارا لیا اور مشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

”سمرات! آپ کی باتیں سن کر تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دلی کا سفیر دربار چوڑا میں تقریر کر رہا ہو۔“ رانی پد منی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہمارا بیوی عجیب بات ہے۔“ راجہ رتن سنگھ کو پد منی کی یہ شوخی و شرارت سخت گراں گزری تھی۔

”تو کیا میں تمہاری بیوی ہوتے ہوئے بھی سلطان کے حرم میں چپ چاپ داخل ہو جاتی۔“ رانی پد منی کی بے دلی غیر شائی بے شمار کٹنوں سے بھر گئی تھی۔

”تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ راج محل چھوڑ کر علاء الدین خلجی کے شہستان کیف و نشاط میں چلی جاؤ۔“ راجہ رتن سنگھ نے خلاف معمول تند و تیز لہجے میں کہا۔

”مگر سلطان کے حکم نامے کا کیا مفہوم تھا؟“ رانی پد منی اسی ادائے بے نیازی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
”وہ اقتدار کی ایک شیطانی ادائیگی اور اس شیطانی ادا کا یہ جواب نہیں تھا کہ شاہی سفیر کے جسم پر تشدد کی عی کر دیا جائے۔“ راجہ رتن سنگھ کا ہاتھ دل پر تھا اور وہ لمبی سانس لے رہا تھا۔ ”میں نے تم سے پہلے سوا کچھ بھی بتائی نہیں ایک سیاہ آندھی ہے جب وہ کسی طرف کارخ کرتا ہے تو پھر موت کی تاریکی کے راجپوتوں کے جسموں میں ریموت کے نشان ثبت کر دے گا۔ اور پھر چوڑا کے خوبصورت محلات کو شمشان

بھوی (قبرستان) بنانے کا الزام اس عورت کے سر جائے گا جسے ناجائز آزادیاں بخشی گئی تھیں۔ راجہ رتن سنگھ نے ایک آہ سرد کھینچی اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔

رانی پد منی نے ایک بار پھر ناز وادا کا سہارا لے کر سرکشی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر راجہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

”خاموش ہو جاؤ۔ یہ میرے ہی اعمال کی سزا ہے کہ میں نے تمہاری محبت میں گرفتار ہو کر کے آداب کو فراموش کر دیا۔ میں نے یہ نازیرداریاں اس لئے نہیں کی تھیں کہ تم میرے اقتدار بنا ڈالو۔ تمہیں راجپوت قوم کے سامنے اس لئے سر بلند نہیں رکھا گیا تھا کہ میری ذات محض ایک کر رہ جائے۔“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ بہت سگوار تھا اور اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

”اب وقت آگیا ہے کہ عشق اپنے دعوے کی سچائی کو حسن کے حضور ثابت کرے۔“ رانا بڑے متکبرانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ ”کیا آپ نے مجھ سے شادی کے بعد یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ آپ کے درمیان جو شے بھی حائل ہوگی، اسے مٹا دیا جائے گا؟ کیا آپ نے شبِ عروسی میں میرے قسم کھاتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ میری ایک جنبش لب پر چوڑ کے تاج و تخت تک قربان کر دیئے جائیں پھر یہ کشمکش کیسی اور وعدوں سے یہ انحراف کیوں؟“

”ہاں! مجھے اپنا کہا ہوا ایک حرف یاد ہے۔“ رتن سنگھ کی آواز بھی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ”میں اپنے عہد پر قائم ہوں مگر تمہارے حسن کی یہ شادابی و شکفتگی بھی میرے اقتدار کے دم سے فنا جب یہ تخت جلا دیا جائے گا اور دشمن میرے تاج کو چوڑ کی گلیوں میں اچھالتے پھریں گے اس وقت یہ غرور، یہ ادائیہ عشوہ طرازی کہاں پناہ ڈھونڈے گی۔ تمہارا یہ حسن تو بہ شکن آسائشوں کی آغوش میں ہوا کر فتہ گری کی منزل تک پہنچا ہے۔ اگر تم اقتدار کے اس سائبان سے محروم ہو جاؤ گی تو آنکھیں جادو گری کی قوت سے محروم ہو جائیں گی اور عارضوں کے گلاب صحرائی گرم ہوا سے جھل جائیں گے۔ پھر تمہیں کوئی پہچان بھی نہیں سکے گا کہ یہ راجپوت ساحرہ رانی پد منی ہے یا تیز دھوپ کا سیاہ ہو جانے والی کوئی عام سی بدھاتی لڑکی؟“ راجہ رتن سنگھ بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ ”تمہارا دولت و اقتدار سے مشروط ہے۔ مہارانی ابھی تم نے افلاس کی صورت تک نہیں دیکھی۔ غربت اور عفریت ناز و غرور کو کجا انسان سے اس کی پہچان تک چھین لیتا ہے۔“

”ہوتا ہو گا۔“ رانی پد منی کی گردن کا کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ ”اگر آپ کو مجھ سے سب کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ سلطان کے سفیر کو میری مرضی کے مطابق قتل کیا جائے گا۔ اگر جواب میں چوڑ پر قیامت بھی نازل ہو جائے تو اسے گوارہ کیجئے کہ قیامت کی ادائیری ادا کے وقت ہو سکتی۔ میں رانی پد منی ہوں جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رکھنے کیلئے پورے چوڑ کو فدا پڑے گا۔ اور یہ قربانی بھی ایک حقیر سی قربانی ہوگی۔“ اتنا کہہ کر رانی پد منی راجہ رتن سنگھ کی غلطی سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رانی پد منی کے مطالبے نے سیاسی صورت حال کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ پھر جب رتن سنگھ آزاد کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اس نے مہامنتری کو اپنی خلوت میں طلب کر لیا۔ ”وکر م سنگھ! ہم نے اپنے میں اتنے سیاہ دن کبھی نہیں دیکھے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے دھواں ہے، مجبوریوں اور الجھاؤ گاڑا دھواں جس کے درمیان کچھ نظر نہیں آتا۔“ یہ کہہ کر رتن سنگھ نے ایک اور جام لبریز کیا

ہونٹوں سے لگایا۔

”ہمارے پاس ان مسائل کا حل ہے سہرا۔“ وکر م سنگھ بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ”کوئی حل نہیں مہامنتری! کوئی حل نہیں۔“ راجہ رتن سنگھ کی مایوسیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ”رانی پد منی کی رفاقت اور علاء الدین خلجی سے بدترین دشمنی؟ ہمیں ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔“

”مجھے ایک بار مہارانی سے بات کر لینے دیجئے۔ پھر ہم کشمکش کے گرداب سے باہر نکل آئیں گے۔“ ”تم اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔“ رتن سنگھ نے اپنے مہامنتری کو اس عورت سے مذاکرات کی اجازت دے دی تھی جو اس وقت سرایا شعلہ برہم تھی، ہوا کا ایک سرکش جھونکا تھی اور کھل کر برس جانے والی ایک کالی گھٹائی۔

کچھ دیر بعد وکر م سنگھ، رانی پد منی کے سامنے ایک ایسے ٹکٹل خوردہ سیاستدان کی طرح بیٹھا تھا جو اپنے دلائل پیش کرتے کرتے عاجز آگیا ہو اور اس کے مخاطب نے کسی بات کا کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔

تقریبی راج دوت کی زندگی کی جھینٹ لینے سے کم کسی بات پر آمادہ نہیں تھی۔ وکر م سنگھ شدید مایوسی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مہارانی! تو پھر کیا تمہارا یہ پوڑھا چچا زہر سے زیادہ تلخ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ آپ نے زندہ و خوشحال چوڑ کے مستقبل کو بچانے میں کوئی تعاون نہیں کیا۔“

”یقیناً!“ رانی پد منی مزید غضب ناک ہو گئی۔ ”تم بھی تسلیم کر لو اور اپنے سہرا کو بھی سمجھا دو کہ چوڑ کا مستقبل ہماری آبرو سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“

مہامنتری وکر م سنگھ خود بھی راجپوت تھا۔ اس کی غیرت کے بھی وہی زاویے تھے جن کا مظاہرہ رانی پد منی کر رہی تھی مگر قوم کی سلامتی کے احساس نے اس کے خون کو بہت پہلے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ اپنے مشتعل جذلوں کو ہوش و خرد کے تابع رکھتا تھا لیکن آج جب رانی پد منی نے اپنی عزت و آبرو کی خاطر تمام راجپوت خاتونین کے ناموس کو جھلا دیا تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔

”مہارانی! آپ جس کو غیرت و جیاد اور آبرو کا نام دے رہی ہیں وہ محض خود غرضی ہے، پندار ذات ہے اور نا کا بھو نا ظلم ہے۔“ وکر م سنگھ کی آواز پُر شور ہو گئی تھی اور غصہ کا رنگ نمایاں طور پر بھلنے لگا تھا۔

رانی پد منی، وکر م سنگھ کے چہرے کا تغیر اور لب و لہجہ کی گرمی و یکہ کر چند ساتوں کے لئے دم بخود رہ گئی۔ وکر م سنگھ نے آج تک اس سے اس طرح گفتگو نہیں کی تھی۔ پد منی کا ذہن جل اٹھا اور پھر اس کے ہونٹوں کو بھی آگ لگ گئی۔

”مہامنتری! آپ نے اپنی حیثیت کو فراموش کر دیا ہے۔“

”ہاں! میں نے آج براس آئینے کو توڑ دیا ہے جو مجھے میری حیثیت کا عکس دکھایا کرتا تھا۔“ وکر م سنگھ کے لیے جس دبی پیش تھی۔ ”میں نہیں سمجھتا تھا کہ میرے بھائی کی یہ نشانی حرص اور خود غرضی کی اس منزل تک پہنچی جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک عورت اپنے جذبہ خود پرستی کی تسکین کیلئے اپنی لاکھوں مہمنوں کو مجبوریوں کے غول میں چھوڑ کر فرار ہو جائے گی۔“

”پہلے بزرگوں کو بات مکمل کر لینے دے۔ پھر اپنی اس دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتی رہنا۔“ وکر م سنگھ نے انجام کی پروا نہ کرتے ہوئے پد منی کو جھڑک دیا۔ ”یہ بھی تو ممکن تھا کہ تو زہر کھا کر اپنے آپ کو بلاک کر دیتی اور راجہ رتن سنگھ سے کہتی کہ تیری لاش کو علاء الدین خلجی کے پاس بھیج دیا جائے۔ سلطان کے

”اس کے علاوہ تو آپ کو مہارانی سے کوئی اختلاف نہیں؟“ ایک مختصر سے سکوت کے بعد نرمالنے وکرم سنگھ سے دوسرا سوال کیا۔

”قوی مفاد سے ہٹ کر ایک اور اختلاف بھی موجود ہے اور اس کا بنیادی سبب سلطان علاء الدین کا شیر علی عامر آفریدی ہے۔“ وکرم سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ آفریدی کو قتل خلعی کرنا چاہتی ہے اور میں اسے چاہتا ہوں۔“

نرمالہ جہان رہ گئی۔ آفریدی کے نام پر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ ”ایک ایسے شخص کی خاطر آپ راج محل کے معتب بننا چاہتے ہیں جس سے نہ آپ کی کوئی شناسائی ہے اور نہ مذہبی رشتہ۔“

”دلی کے سفیر سے میرے کئی رشتے ہیں مگر لوگوں کو نظر نہیں آتے۔“ وکرم سنگھ بڑے جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر مرکوز تھیں اور زبان سے کئی سربستہ رازوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس قدر شجاع تو جوان نہیں دیکھا جو مردانگی کے ساتھ تہذیب و شائستگی بھی رکھتا ہو۔ یہ پہلا رشتہ ہے جو آفریدی سے اس وقت قائم ہوا جب وہ چوڑی حدود میں داخل ہوا تھا۔ پھر سلطان علاء الدین سے اس کی وفاداریوں نے ثابت کر دیا کہ سفیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے انداز سفارت نے میرے دل کو مسح کر لیا۔ میری آنکھوں سے فرض شناسی کی ایسی کوئی زندہ مثال نہیں گزری۔“ اور پھر

یہ دونوں رشتے ایک انوٹ رشتے میں ضم ہو گئے۔ وہ رشتہ سیاسی آئندپال کے حوالے سے ہے جس نے آفریدی کو محترم بنادیا ہے۔ اب میری نظر میں وہ علاء الدین خلعی کا نہیں، سچائی اور روشنی کا سفیر ہے۔ اگر وہ چوڑی میں داخل نہ ہوتا تو میں زندگی بھر ناندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ میرے تاریک جذموں کے لئے سورج بن کر آیا ہے۔“

”کیسی روشنی، کیسا سورج؟“ نرمالنے چونک کر پوچھا۔

”میں تم سے پہلے کہ چکا ہوں کہ مجھے صرف دو انسانوں سے عقیدت رہی ہے۔ ایک قتل کر دیا گیا اور دوسرا کو آہو کے مندر میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔“ وکرم سنگھ کا اشارہ مقتول آئندپال اور ملکی بھان متی کی طرف تھا۔ ”میں نے ان دونوں عظیم انسانوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ملکی بھان متی ابھی کسی انقلاب کا انتظار کر رہی ہے مگر سیاسی آئندپال انقلاب سے قبل ہی مسلمانوں کا مذہب اختیار کر چکے تھے۔ اب میں بھی اسی راستے کا مسافر ہوں جس پر سنیا سی بہت آگے جا چکے۔“

”کیا آپ بھی اپنا دھرم بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ نرمالہ کماری پر شدید حیرت طاری تھی۔

”جس دن سنیا سی نے ایک خدا کا اقرار کیا تھا، میں نے بھی اسی دن نئی روش اختیار کر لی تھی۔“ وکرم سنگھ نے نبی کے سامنے اپنے روحانی انقلاب کا اعتراف کر لیا۔

”میں تو اب تک بھی یکتا رہی کہ آپ سنیا سی آئندپال کے اقدام سے صرف متاثر ہیں۔“ نرمالہ کماری عجیب الہج میں بھٹا ہو گئی تھی۔

”دل سے اقرار تو ہو چکا، بس زبان کا اقرار باقی ہے۔“ وکرم سنگھ کے انداز گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ”پھر آپ زبان سے اقرار کب کریں گے؟“ نرمالہ کی حیرت میں دم بدم اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

”بہت جلد۔“ اچانک وکرم سنگھ کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ ”اب آفریدی میرے قریب آ گیا ہے۔ اللہ اسے صحت دے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔“

منہ پر تھوکنے کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا جسے تو نے اختیار نہیں کیا۔ مرنے کے بعد تیری آبرو کس طرح ہوتی؟ مگر راجپوتوں کی تاریخ میں یہ بات بیشک کیلئے امر ہو جاتی کہ رانی پدمنی نے اپنی جان دلاکھوں انسانوں کی جانیں بچالیں۔ غیرت کے اظہار کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا کہ تیرا مردہ جسم سلطان دربار میں پہنچا اور اس بھڑے کے منہ پر قیامت تک کیلئے سیاہی مل دی جاتی۔ یہ بھی تو علاء الدین خلعی غلاظت نامے کا ایک جواب تھا۔ تیرے ہونٹوں پر یہ الفاظ کیوں نہیں آئے کہ ”مجھے چھ عزت و ناموس پر بھیٹ چڑھا دیا جائے۔“ تو نے اپنی خلوت نازکی آرائش کیلئے ہزاروں دوشیزاؤں جنگل میں چھوڑ دیا کیوں گوارہ کر لیا؟ تجھے کیا خبر ہماری راتیں کب سے بے خواب ہیں اور سلامتی تلاش کرنے کیلئے ہمارے ذہن کب سے جل رہے ہیں؟ ہم نے اس علاقے میں امن برقرار رکھنے کیسے کیسے منصوبے بنائے مگر تو نے ایک بدکار جادوگر کی خوشامدہ باتوں میں عقل و ذہانت مصبوبوں کو غرق کر دیا۔ اب اپنی ذات کے آئینہ خانے میں بیٹھ کر جبر و تشدد کے ان پتھروں کا جن کو دلی کے طاقتور ہاتھ چوڑی طرف اچھالیں گے۔ عنقریب یہ تماشا ہونے والا ہے۔ اس بارش سنگ شروع ہو جائے اس مہاری رام دیو کو بھی باخبر کر دے جس کے بے ہودہ منصوبوں نے تجھے دیوی بنادیا ہے۔“ یہ کہہ کر مہامنتری وکرم سنگھ باہر جانے لگا۔

”ٹھہرو! رانی پدمنی نے چیخ کر کہا مگر وکرم سنگھ آگے ہی بڑھتا رہا۔“ اس گستاخی کے جرم میں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے اور تمہاری تمام شاہانہ مراعات سلب کی جاتی ہیں۔“ مہارانی کو اس اعلان کی ضرورت نہیں تھی میں خود بھی اس ریاست سے وابستہ رہنا نہیں چاہتا

رام دیو جیسے مہاری انسانیت کے قانون سے گھناؤنا کھیل کھیلے ہیں۔“

مہامنتری وکرم سنگھ نے بلند آواز میں کہا اور رانی پدمنی کے کمرے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

راجہ رتن سنگھ بڑی بے چینی سے وکرم سنگھ کا انتظار کر رہا تھا مگر مہامنتری، راجپوت سہراٹ آنے کے بجائے اپنے گھر چلا گیا۔ نرمالہ کماری باپ کا اداس چہرہ دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ ”کیا پھر کوئی اٹھ کھڑا ہوا؟“ نرمالہ کے لہجے میں بڑا اضطراب تھا۔

”گردش وقت کی آگ میں سب کچھ جل گیا۔ تمہاری بہن مہارانی چوڑی نے مجھے وزارت عہدے سے برطرف کر دیا۔ وہ اپنی ذات کی خاطر پورے چوڑی کو ایک خوں رنگ تماشا بنانا چاہتی ہیں اس تماشا میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔“

”پھر انہیں اس تماشا کا اہتمام کرنے دیجئے۔“ نرمالہ نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اگر موت اور رسوائی کے اس کھیل میں صرف راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی ملوث ہوتے دلیپیاں نصیحت کی حدود سے آگے نہ بڑھتیں۔ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر پیچھے ہٹ جا وکرم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ حکمرانوں کا کوئی تقریبی مشغلہ نہیں کہ ہرنو غول پر درندے چھوڑ کر اپنے حیوانی شوق کا محل کے بھڑکوں سے نظارہ کریں۔ یہ لاکھوں انسان زندگی کا سوال ہے۔ وہ زندگی جو ہزاروں عذاب جھیلنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اقتدار اور دولت ذخائر راجہ رتن سنگھ یارانی پدمنی کی خاندانی میراث نہیں۔ چوڑی کے باغوں، کھیتوں اور زمینیں ہاں بسنے والے بر انسان کا حق ہے۔ میں ان رقص کرتی فصلوں میں کیسے آگ لگا دوں اور آگ لگتی کو کس طرح خون سے بھر دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔“

نرملہ کی سماعتوں میں عجیب سا شور بلند ہوا۔ پہلی بار اس کے کانوں میں بھگونان کے بجائے ”انہ“ نام کی صدا گونجی تھی۔

”بھئی! پہلے میں اس بات سے بہت ڈرتا تھا کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟“ وکرم سنگھ نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہر وقت یہ اندیشہ خوفزدہ رکھتے تھے کہ میرے اعمال کی سزا کہاں کہیں یہ لوگ تمہیں جان لیوا آزار نہ پہنچائیں۔ مگر سنیا سی آئندہ پال کی موت نے میرا یہ خوف بڑا دور کر دیا۔ وہ دینا سے جاتے جاتے مجھے زندگی کا سب سے بڑا سبق دے گئے کہ سچائی کی راہ میں موت رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ میں اس موت کو دل کی تاملتہ کشادگی کے ساتھ قبول کر چکا ہوں جو مقربہ مقدر بننے والی ہے۔ لیکن میں تمہیں اجازت دیتا ہوں تم اپنے لئے زندگی کا انتخاب کر لو۔“

باپ کی بات سن کر نرملہ کے چہرے پر رنج و الم کے گہرے سائے پھیل گئے۔ ”کیا آپ مجھے توقع رکھتے ہیں کہ میں اس زندگی کو قبول کر لوں گی؟“ نرملہ نے بڑے آزدہ لہجے میں باپ سے سوال کیا۔ ”نہیں میری بچی! یہ توقعات باندھنے کا وقت نہیں۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ شاید نوخیزی کے عو تمنا میں تمہیں اپنی ریت اور رواج سے بغاوت نہ کرنے دیں۔ اس لئے میں تمہیں ہر ذہنی کڑ سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ بوڑھی آنکھوں کا مشاہدہ کچھ اور ہوتا ہے، نوجوانی کا زاویہ نگاہ کچھ اور۔ وکرم سنگھ نے انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں نرملہ کو سمجھانا چاہا۔

”جس سچائی کو سنیا سی جیسے باکر دار انسان نے تسلیم کر لیا، ہم جیسے کمزور ارادوں کے لوگوں کو اس شک نہیں کرنا چاہئے۔ جو شخص تمام عمر حکومت کا معتبوب رہا اور پھر جس نے موت کے سائے میں غم بغاوت کا اعلان کیا، وہ نظر کا فریب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً سنیا سی کی آنکھوں نے کسی غیر معمولی شے کو دیکھ ورنہ وہ اس طرح مستانہ وار قتل کی طرف نہیں جاتے۔“

نرملہ کے انداز فکر نے مہامنتری کو ناقابل بیان مسرت بخشی تھی۔ ایک شریف النفس انسان نے اپنی تربیت کیلئے جو خون جگر بیا تھا وہ آج رنگ لارہا تھا۔ ”نرملہ میں آج تم سے راضی ہو گیا تم میری جان نشتا وہ درخت ہو جس کی گھنٹی چھاؤں کیلئے میں نے دیوتاؤں سے شب و روز دعائیں کی ہیں“

”دیوتاؤں سے؟“ نرملہ نے وکرم سنگھ کو ٹوکا۔

مہامنتری، نرملہ کماری کی اس گرفت پر مسکرایا۔ ”بتوں کو پکارتے صدیاں گزر گئی ہیں۔ لئے زبان کی لغزش پر تمہیں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے۔“ وکرم سنگھ کے لہجے میں شکستگی تھی مگر یہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔

مہامنتری کے ایک خدمت گار نے سکون کے ان چند لمحات کو منتشر کر دیا اور ایک بار پھر فضائیں بکھل گئیں۔ خدمت گار نیم قد بھگا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”راج محل کا ملازم خاص حاضر ہوا ہے۔ راجپوت رتن سنگھ بہت دیر سے آپ کے منتظر ہیں۔“

رتن سنگھ کا نام سنتے ہی وکرم سنگھ کے سینے میں بیزاری کی ایک تیز لہر ابھی مگر اس نے اپنے چہرے سے تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ”سراٹ کے حضور عرض کرو کہ میں ریاست کے ایک ضروری کام سے ہونے کے بعد پہلی فرصت میں حاضر ہوتا ہوں۔“

ملازم کے جاتے ہی وکرم سنگھ نے نرملہ کماری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جب دونوں باہر طویل راہداری طے کر رہے تھے اس وقت وکرم سنگھ نے اچانک مڑتے ہوئے کہا۔ ”میں آفریدی کے جابر ہوں۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔“

”آپ نے راج دوت کو کس کمرے میں رکھا ہے؟“ نرملہ نے جذبوں کی روانی میں باپ سے سوال تو رہا مگر ذہنی اسے شرم اور ندامت کا احساس ہونے لگا۔

”آفریدی ہمارے مخصوص تہ خانے میں موجود ہے۔“ وکرم سنگھ نے چلتے چلتے جواب دیا۔

”مخصوص تہ خانہ؟“ نرملہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وکرم سنگھ نے مختصر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمارے برموں کا نیا باہو ایک ایسا تہ خانہ ہے جس کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہمارے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ لائی کے بے باہ نفرت نے راجہ رتن سنگھ کو مجبور کر دیا کہ وہ علی عامر آفریدی کو میرے حوالے کر دیں۔ ان کے خیال میں راج دوت کی سلامتی کا یہی ایک راستہ ہے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ان آفریدی کو اپنے بزرگوں کے مخصوص تہ خانے میں منتقل کر دوں۔“

”تو کیا راجپوت سراٹ بھی اس تہ خانے تک نہیں پہنچ سکتے؟“ نرملہ نے باپ سے ایک اور سوال کیا۔ ”میری راجپوتی کے بغیر وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وکرم سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تہ خانہ میں اس تہ خانے کے متعلق تمام تفصیلات بتا دوں گا۔ تہ خانے کے راستے اس خاندان کے ارٹ کا وقت ہونا ضروری ہے اور تمہارے سوا میرا کوئی وارث نہیں۔ فی الوقت تم واپس جاؤ اور رانی پدمنی سے ہوشیار ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باتوں باتوں میں تم راج دوت کی یہاں موجودگی کا ذکر کر دو۔ جی نکلتی جذباتی لہجہ اختیار کرے“ اپنے رشتے کا کوئی بھی حوالہ دے مگر تم آفریدی کے معاملات سے قطعاً غائب نہ ہوگی۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ راہداری میں بائیں جانب مڑ گیا اور نرملہ کماری بے شمار خیالات میں بھی ہوئی اگلے قدموں واپس چلی گئی۔

وکرم سنگھ قہر و قہر تہ خانے سے گزرتا ہوا آفریدی تک پہنچا۔ شاہی سفیر ابھی تک بے ہوش تھا۔ فریدی کے نزدیک راج وید خاموش بیٹھا تھا اور ایک چالیس سالہ مسلح راجپوت بے قراری کے عالم میں ادھر جھل رہا تھا۔ وکرم سنگھ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں راج وید سے پوچھا۔ ”کیا آفریدی کو ہوش آیا؟“ مہامنتری کی آواز سے گمراہ درجہ بھگ رہا تھا۔

وکرم سنگھ کی آواز سنتے ہی راج وید احتراماً اٹھ کھڑا ہوا اور مسلح نوجوان نے بھی آگے بڑھ کر تعظیماً سر جھکا یا۔

”راج دوت کے ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے اور دماغ کی فحشیت مگر ہے۔“

”اس کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟“ شدت جذبات سے وکرم سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔

”جان کو تو کوئی خطرہ نہیں مگر بیانی زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“ راج وید آفریدی کی صحت سے اپنا نظر اتارتا۔ ”اگر آنکھیں بے نور ہونے سے بچ گئیں تو وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے گا۔“

”مگر تمہاری حکمت فن اور طب کا ہنر کس دن کام آئے گا؟“ وکرم سنگھ نے تقریباً جیتے ہوئے کہا۔

راج وید، مہامنتری کے مجازے ہوئے تیردیکھ کر کانپ گیا۔ ”میں تو اپنی بہترین دوائیں استعمال کر رہا ہوں۔ مگر صحت و شفا میری قدرت میں نہیں۔“ راج وید نے ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جس میں مختلف عرق، سیال اور محلول بھرے ہوئے تھے۔

نرملہ نے اپنی زندگی میں جو کچھ سیکھا ہے، وہ سب راج دوت پر آزمایا۔ وہاں میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی نسخہ ذہن کے کسی گوشے میں آجائے۔ ”ہ جائے۔“ وکرم سنگھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ

جذباتی ہوتا جا رہا تھا۔ ”راج وید! میری بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو جیسے تمہارا اپنا بیڑا سڑ رہا ہو۔“

”میں سمجھ رہا ہوں مہمانتری۔“ راج وید کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”تم کچھ نہیں سمجھ رہے ہو راج وید! کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔“ مہمانتری نے اضطراب کو عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو گڑتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر سمجھنا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ کرو کہ یہ نوجوان جو بے ہوش پڑا ہے تمہارے اپنے سینے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔“ وکر م د وحشت زدہ انسان کی طرح آگے بڑھا اور آفریدی پر جھک گیا۔ ”ایک تمہارے سینے کا یہاں کیا ہے“ اس کی زندگی تو خود میری بیٹی نرملہ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔“ یہ کہہ کر وکر م سنگھ سیدھا ہوا اور اس کے چہرے کا بخور جائزہ لینے لگا۔

”تم میری بات سمجھ گئے؟“ مہمانتری کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

”سمجھ گیا مہمانتری! خوب سمجھ گیا۔“ راج وید کچھ بھی نہیں سمجھا تھا وکر م سنگھ کے جذباتی رویے اسے اقرار پر مجبور کر دیا تھا۔

”اور یہ بھی سمجھ لو کہ جب تک راج دوت ہوش میں نہیں آجاتا، تم اس وقت تک اس کمرے نہیں نکل سکو گے۔“ وکر م سنگھ نے راج محل کے معالج خاص پر ایک عجیب پابندی لگا دی تھی۔ ”اور سمجھ لو کہ اگر راج دوت کی موت واقع ہو گئی تو اس میں تمہاری نا اہلی اور غفلت کو دخل ہو گا۔“ وکر م سنگھ نے راج وید کو اس طرح تنبیہ کی جیسے شمشیر فاس کی شہ رگ کے قریب پہنچ چکی ہو اور بلند ہونے ہی والا ہو۔

راج وید چند لمحوں میں ریشہ کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ اس تنبیہ کے جواب میں وہ مہمان قدموں پر جھکا مگر وکر م سنگھ نے اپنے پاؤں سمجھنے لئے۔ ”اس کی ضرورت نہیں۔“ اور دباؤ سے آزاد ہو مگر اتنا یاد رکھو کہ اپنے مقدس پیشے سے بے وفائی نہ کرنا۔“ یہ وکر م سنگھ اس مسلح نوجوان سے مخاطب ہوا جو خود بھی مہمانتری کی طرح بے قرار و مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ”چندر سنگھ! راج وید کے کھانے کا انتظام کر دینا۔ مجھے واپسی میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔“ مسلح نوجوان نے سر جھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وکر م سنگھ بھی جھکا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”چندر سنگھ! یہاں میری مرضی کے بغیر برہنہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ آنا۔“ گرد مضبوط ترین حصار سمجھ دیا گیا ہے مگر تم جانتے رہنا کہ اس دنیا میں نرملہ کے بعد تم ہی میرا جانشین تمہاری موجودگی میں آفریدی کے قسم تک دشمن کا ہاتھ پہنچ گیا تو پھر کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرے گا۔ جذبات سے وکر م سنگھ کی آواز رقت آمیز ہو گئی تھی۔

”میں پھر پو (مالک) ایسا نہیں ہو گا۔“ چندر سنگھ نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا کہ اسے بلند نہ ہو سکے اور راج وید کے کانوں تک یہ راز کی باتیں نہ پہنچ سکیں۔ ”اگر کوئی آپ کو یہ کہ دشمن کے ہاتھ نے آفریدی کے لباس کو چھو لیا ہے تو پہلے اس بات پر یقین کر لیجئے گا کہ چندر سنگھ موجود نہیں ہے۔“

وکر م سنگھ نے راجپوت نوجوان کے کاندھے کو دباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے۔“ مہمانتری اپنے آسودوں کو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور سر کو جھٹکا ہوا کمرے گیا۔

مہمانتری راج رتن سنگھ کے عشرت کدے میں داخل ہوا اور رسم احترام ادا کرنے کے بعد دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”وکر م سنگھ تنہائی میں تم درباری آداب کے پابند نہیں ہو۔“

”سمرات کی عنایتوں کا شکر یہ مگر اب میں اپنے آپ کو ان نوازشات کے لائق نہیں سمجھتا۔“ وکر م سنگھ نے ریاست کے ایک وفادار ملازم کے لہجے میں کہا۔

راج رتن سنگھ نے چونک کر وکر م سنگھ کی طرف دیکھا۔ ”مہمانتری کے علاوہ تم میرے بزرگ بھی ہو وکر م سنگھ! میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں۔“

”جس رشتے کے سبب آپ میرا احترام کرتے ہیں، آج اسی رشتے کو مہارانی نے بڑی بے رحمی کے ساتھ توڑ دیا۔“ وکر م سنگھ نے اس ناخوشگوار واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا جو کچھ دیر پہلے رونما ہوا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ راج رتن سنگھ جوش و خروش میں کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے قدم لرز رہے تھے۔ ”ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم ایسے گراں وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ جاؤ گے۔“ راج رتن سنگھ پلوں انسانوں کے لہجہ میں گفتگو کر رہا تھا۔

ابھی وکر م سنگھ راجپوت سمرات کے اس جذباتی سوال کا جواب دینے نہیں پایا تھا کہ غضب ناک پدمنی رتن سنگھ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے داخلے کا انداز بہت خوفناک تھا مگر وکر م سنگھ پر نظر پڑتے ہی وہ جھجک سی گئی۔ پھر بھی غصے کی وہی کیفیت تھی اور چہرے پر ایک آگ سی روشن تھی۔

”مہارانی! اب غیظ و غضب کے اس مظاہرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میں گناہ گار وکر م سنگھ اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والا مہمانتری بہتر انداز میں ریاست چھوڑ کر خدمات انجام دے سکے گا۔“ وکر م سنگھ کے الفاظ شائستہ تھے مگر ان میں پسپا ہونے کی پوشیدہ تھی۔

رائی پدمنی کچھ دیر کیلئے ساکت کھڑی رہی۔ پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں مہمانتری کی خدمات سے انکار نہیں کرتی مگر راج دوت کی حمایت میری عقل سے بالاتر ہے۔“

اس سے پہلے کہ وکر م سنگھ کوئی جواب دیتا، رتن سنگھ درمیان میں بول اٹھا۔ ”مہارانی! تم ریاست کے انتہائی وفادار شخص پر الزام تراشی کر رہی ہو۔ ان کا علی عامر آفریدی سے کوئی رشتہ نہیں مگر بات میں ایک راج دوت کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور وہ بھی علاء الدین خلجی جیسے شیر کا منبر۔“ اسے کسی طور بھی قتل نہیں کیا جاسکتا۔ آفریدی کے ساتھ اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ سیاسی قوانین کی سرعام خلاف ورزی تھی۔ تم نے راج دوت کے جسم کو تشدد کا نشانہ بنایا اور توجیہ پیش کی کہ وہ تمہاری شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا تھا۔ حالانکہ اس نے شدید مجبوری کی حالت میں تمہارے اصرار پر سلطان کا خط موزوں پڑھا۔ یہ اس کا ذاتی جرم نہیں تھا۔ پھر بھی تم نے اسے سزا دی۔ اب چاہتی ہو کہ آفریدی کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں ڈال دیا جائے۔ ہم تمہاری خاطر یہ بھی گوارہ کر لیتے مگر دباؤوں کا کرم اسی طرح جاری رہا تو ایک دن ہم تمہاری اس خواہش کی تکمیل بھی کر دیں گے۔“

راج رتن سنگھ پدمنی کی فطری کمزوریوں سے واقف تھا۔ وہ خوشامد پسند تھی، اس لئے رتن سنگھ نے بھی اپنے وکر م سنگھ کو بدوں میں چھپا لیا تھا۔ راجپوت سمرات غرور حسن کی دیوی کو بھی رام کرنا چاہتا تھا اور مہمانتری وکر م سنگھ کو بھی اس کے خوں میں واپس لانا چاہتا تھا۔

رانی پدمنی نے بہت غور سے شوہر کا ایک ایک لفظ سنا اور پھر نہایت سنجیدہ لہجے میں راجہ رتن سنگھ مخاطب ہوئی..... ”کیا راج دوت کی زندگی ہمیں اس کی سفاکیوں سے بچا سکتی ہے؟“ پدمنی نے کہا اور پھر کسی تاخیر کے بغیر خودی جواب دینے لگی..... ”اس بد نہایت اور ہوس کا رانسان کو کسی طرح اخلاق اور تہذیب کا سبق نہیں سکھایا جاسکتا۔ آپ کے اور مہاشعزئی کے بقول اگر سلطان ایک دروغہ اس کیلئے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ راج دوت زندہ رہے یا قتل کر دیا جائے.....“

”مہارانی! آپ کی یہ سوچ زیادہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔“ رتن سنگھ نے نرم لہجہ میں خود سر ہوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”سیاست میں کوئی چال آخری چال نہیں ہوتی۔ مفروضہ یقین کر لینا دانش مندوں کا طریقہ نہیں ہے۔ انسانوں سے زیادہ درندوں کو اپنی انا عزیز ہوتی ہے۔ راج دوت کو قتل کر دیا گیا تو سلطان کے اراوے کچھ اور جنوں خیز ہو جائیں گے۔ مہامستری کو کھڑے مستقبل کے بارے میں سوچنے دو۔ ابھی تو آکاش پر گھٹا ٹھی ہے، برسی نہیں ہے، ابھی خوں رنگ پانی ریلوں سے پی جا سکتا ہے۔“ وکرم سنگھ یقیناً آفتوں کے سیلاب کے مقابل کوئی مضبوط بند باندھ کو ششوں میں مضروب ہوں گے اور تم انہیں ان کے عہدے سے برطرف کر دینا چاہتی ہو۔“ رتن سنگھ نسنے میں ہونے کے باوجود بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

رانی پد منی شرمسار سی نظر آنے لگی..... ”مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اپنے محترم چچا کی
میں نامناسب الفاظ ادا کئے..... مگر کون جانے کہ میں کس آگ میں جل رہی ہوں.....“ یہ
کتے پد منی کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

و کرم سنگھ اپنے بھائی کی نشانی کو مغموم دیکھ کر خود بھی افسردہ ہو گیا۔..... ”ہمارا بی بی مجھے خواب ہے کہ ایک حرفِ غم سن کر کوئی غیرت مند عورت کس طرح سہلِ انتحی ہے لیکن گردشِ وقت کو کیا جس نے میرے اور آپ کے راستے جدا کر دیئے ہیں۔.....“

رانی پدمنی نے کچھ عجیب سی نگاہوں سے وکرم سنگھ کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی..... ”نہ بد کلامی کیلئے معافی کی خواستگار ہوں۔ آپ استغفری نہ دیں مگر سلطان سے میری بے آبروئی کا ضرور لیں۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے آپ پر یہ انتقام قرض ہے۔ اگر علاء الدین خلجی تک آپ ہاتھ نہ پہنچ سکیں تو پھر اس کے سفیر کو میرے حوالے کر دیجئے گا۔“ یہ کہہ کر رانی پدمنی اس طرف سے نکل گئی جیسے شعلوں کے ذخیرے سے کوئی چنگاری جدا ہوئی ہو کچھ دیر فضا میں لہرائی ہو اور پھر اچانک؟

و کرم نگہ حیرت سے رانی پد منی کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔

نہ تم بدلے نہ ول بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبار انقلاب آسمان کرلوں

”کیا سوچ رہے ہو کرم نگہ؟“ مہامستری کو اپنے خیالات میں غرق پاکر راجہ رتن نگہ نے فرمایا۔

وی۔ ”اب تو تمہیں اپنی جھنجھی سے کوئی شکایت نہیں ہے؟“
”شاید سمرات نے ہمارا پی کے لیے پر غور نہیں کیا..... وی ضد ہے، وی سرکش ہے۔“
حالات میں کیسویں سے کام نہیں کر سکتا..... “و کرم سنگھ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا.....
کے حق میں ہی بہتر ہے کہ مجھے سکدوش کرو یا جائے۔“

”نہیں دکر م سگھ! ہم اپنے دماغ کو کھونا نہیں چاہتے۔“ راجہ رتن سگھ بدحواس نظر آنے لگا۔
 ”وچہر کچھ دن کیلئے اپنے دل کو کھود دیجئے۔“ دکر م سگھ نے برستہ جواب دیا۔
 ”ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھتے۔“ راجہ رتن سگھ نے چونک کر کہا۔

”جب تک علماء الدین خلیجی کے ارادے عملی شکل اختیار نہیں کر لیتے“ اس وقت تک رانی پد منی اور مہاجرین ام یو کی سیاست سے دور رکھے۔ ”و کرم نگلے نہ بڑی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔“ ”خصوصاً ام دیو کو اس کے تباہ شدہ آشرم میں محصور کر دیجئے۔ اس کارانی پد منی سے ملنا سب کے اقتدار کیلئے انتہائی خطرناک ہے۔“

”ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے کچھ دیر کی کشمکش کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔
 ”سہرا کی دورانیسٹ کو سلام۔ دیوتا چٹوڑ کی گنہگار کریں.....“ وکرم سنگھ نے اپنی زندگی میں
 پہلی بار گھلا بوجھٹ بولا اور رخصت کی اجازت طلب کی۔

”راج دوت کا کیا حال ہے؟“ راج رتن سنگھ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں اسے ہوش چھوڑ کر آیا تھا۔ راج وید اس کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں۔ انہیں آفریدی کی
 قتل کے بارے میں شک ہے۔“ وکر سنگھ کا لہجہ غیر ارادی طور پر بجھا بھجھا تھا۔

”کیا ہم اسے ایک نظر دیکھ سکتے ہیں؟“ راجہ رتن سنگھ نے گہرا کر پوچھا۔
 ”آپ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ وکر م سنگھ نے بے جھجک ہو کر کہا۔ ”آپ چہ پڑکی
 عدول کو مضبوط کریں۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق علاء الدین خلجہ کی فوجیں دہلی سے کوچ

[illegible]

پھر جبہ لغیر بیاہا گیا ہوا اپنے مخصوص تہ خانے میں پہنچا تو ایک اہم انگیز خبر اس کی منتظر تھی۔ راج وید کی ایک کوششوں سے علی عامر آفریدی کو ہوش آچکا تھا مگر اس کی بیانی زائل ہو چکی تھی۔

میں یقین ہے کہ راج دوست کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بچھ گئیں۔ ”آہنی اعصاب رکھنے والے راج دوست کی آواز لرز رہی تھی۔

میرا ابو ویدک گیان تو یہی کہتا ہے کہ اب راج دوت اس دلکش دنیا کے کسی منظر کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے گا۔ ”راج وید کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اسے ایک خوبصورت نوجوان کے عالم شباب میں اندھا جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔

دوسرے ملک اندری اندر سلگ اٹھا۔ اس نے چاہا کہ وہ راج وید سے اس بے حسی کا حساب طلب کرے مگر قسمت بڑک تھا۔ وکرم سنگھ نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پایا اور چند رنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم بھنیہ کی کوکری سے مل لے جاؤ اور ان کے کھانے کا انتظام کرو۔ جب تک میں آفریدی کی جگہداشت کر رہا ہوں۔“

چند منظرہ: اجنبی کو دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں سنگ مرمر کے فرش پر لذیذ کھانے رکھے ہوئے تھے۔ اس واقعہ نے سب کو حیرت سے دیکھا۔ وہ بڑھاپا اور پھر اپنے شکم کی آگ بجھانے لگا۔

”نہیں بیٹے!“ افسوسناک انداز میں فریدی نے کہا۔ ”جہاں تک آہستہ آہستہ لہجے میں اسے پکار رہا تھا۔“ آنکھیں

مہمانتری کے کئی بار آواز دینے کے بعد علی عامر آفریدی کی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ شاہی سفیر نے آہستہ آنکھیں کھولیں۔ بظاہر اس کی آنکھوں پر کسی چوٹ کا نشان نمایاں نہیں تھا۔ وکرم سنگھ کو اس کے بیان پر شک ہوئے لگا۔ مہمانتری نے بے قرار ہو کر علی عامر کو مخاطب کیا۔

”آفریدی! تم نے مجھے پہچانا؟“

وکرم سنگھ کی آواز پر علی عامر نے اپنی پتلیوں کو دونوں طرف حرکت دی پھر اس نے بی عمل دہرایا۔ وکرم سنگھ کانپ اٹھا۔ راج وید کا بیان درست تھا مگر مہمانتری کو اس المناک حادثے کا یقین آ رہا تھا۔ ”جواب دو بیٹے! تم نے مجھے پہچانا؟“

”میں اندھیرے..... میں..... کسی کو..... نہیں پہچان سکتا..... روشنی کرو لوگوں نے..... چراغ لگیو..... بھجادیئے.....؟“

آفریدی رک رک کر بول رہا تھا۔ آواز اس قدر مدہم تھی کہ وکرم سنگھ بڑی دشواری کے ساتھ جواب سن سکا۔ مہمانتری کچھ دیر تک منتظر رہا کہ آفریدی مزید گفتگو کرے مگر شاہی سفیر نے آنکھیں بند تھیں۔

وکرم سنگھ کا دل رونے لگا۔ آفریدی کے پورے جسم پر سفید پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف آنکھ اور ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جیتنے کی کسی انسان کو کفن پہنا دیا گیا ہو۔

وکرم سنگھ بے قراری کے عالم میں آفریدی کے بستر کے گرد ٹھلٹھا رہا، کبھی اس کی نظریں فائوہ ققموں پر ٹھہر جاتیں اور کبھی وہ آفریدی کی دلکش آنکھوں کے چراغوں کو دیکھنے لگتا جو راج وید کے بچے تھے۔ پھر راج وید کھانے سے فارغ ہو کر آیا تو وکرم سنگھ نے بے اختیار یہ سوال کر دیا۔ ”کیا یہ اندھیرا ہے جسے ہم دواؤں کے مسلسل استعمال سے زائل کر سکتے ہیں؟“ وکرم سنگھ کو پورا یقین راج وید حقیقت بیان نہیں کرے گا بلکہ اس کی خاطر جھوٹی تسلیوں سے کام لے گا۔ مگر مہمانتری قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔

راج وید نے اسی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مہمانتری! اگر آپ کہیں تو میں راج مکمل صحت کا اعلان کر دوں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ روشنی کا کھیل ختم ہو چکا۔ اگر مجھ جیسا وید راج آنکھوں کے اجالے واپس نہیں لاسکتا تو کم سے کم ہندوستان میں کوئی وید موجود نہیں ہے جو اسے نجات دلا سکے۔“

وکرم سنگھ نے سر کو جنبش دی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ پھر اس نے چندر سنگھ کو الگ لے جا کر ”یہاں دوسرے سپاہی متعین کر دو۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔“

چندر سنگھ نے احتراماً سر جھکا دیا۔ پھر تین قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ آفریدی کمرے میں زیر علاج رکھا گیا تھا اس کمرے کے باہر چیتیس ماہر تیغ زنوں کا ایک چاق و چوبند دستہ موجود تھا۔ چندر سنگھ ان میں سے دو سپاہیوں کو لے کر اندر آ گیا۔ پھر راج وید کو ہدایت دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کی خدمت کیلئے حاضر ہیں گے۔“

راج وید نے عجیب سی نظروں سے پہلے چندر سنگھ کو اور پھر مہمانتری کو دیکھا۔ ”میں کب تک اس جاسکوں گا۔“

”میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ تمہاری واپسی راج دوت کی مکمل صحت سے مشروط ہے۔“

کی آواز تھم آمیز تھی۔ ”ویسے تمہیں یہاں کیا پریشانی ہے؟“

”کچھ نہیں مہمانتری! کچھ بھی نہیں۔“ راج وید اپنا کمرے کی سرانسی کی طرف نظر آنے لگا تھا۔

”ویسے بھی کسی وید کی بہترین تپسیا (عبادت) یہی ہے کہ اس کا مریض صحت یاب ہو جائے۔“ وکرم سنگھ نے تیرے لیے میں کہا اور تہہ خانے کے پیچیدہ نظام کے سارے بالائی منزل پر آ گیا۔ وہاں بھی چیتیس شیشیز زون کا ایک دستہ متعین تھا ان سپاہیوں نے وکرم سنگھ کو دیکھتے ہی گرو میں جھکا دیں۔

”میرے وفادار فوجو! سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“ وکرم سنگھ نے سپاہیوں کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! سر! آپ کا ہر جاں نثار اپنی جگہ سرکھ کھڑا ہے۔ یہاں خود ہم راج (موت) کا زینہ (بھی ہماری اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔“ جوش جذبات میں وکرم سنگھ کے سپاہی انتہائی مبالغے سے کام لے رہے تھے۔

”میں یہ غور اور یہ خود اعتمادی بھی اچھی نہیں بس جاگتے رہو۔ میں تمہارے جذبوں کا معترف ہوں۔“ وکرم سنگھ نے اپنے حفاظتی دستے کی تعریف کرتے ہوئے کہا پھر وہ اسی طرح اپنے مختلف دستوں کا جائزہ لیتا ہوا چندر سنگھ کے ہمراہ اپنے محل کے بالائی حصے میں پہنچ گیا۔

چندر سنگھ اس کے انتہائی وفادار ملازم رنیر سنگھ کا لڑکا تھا۔ بظاہر وہ ملازم تھا مگر دراصل وکرم سنگھ کے خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ چندر سنگھ کے ساتھ آج تک ملازموں جیسا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ حقیقت میں خاندانی وفاداریوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ تقریباً دو سو سال پہلے چندر سنگھ کے مورث اعلیٰ کو وکرم سنگھ کے پرداد اور سنگھ نے اپنے محافظ خاص کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ پھر اس خاندان کے آنے والے ہر وارث نے اپنی وفاداری کا ثبوت کچھ اس طرح پیش کیا کہ رنیر سنگھ کا خاندان بھی وکرم سنگھ کے خاندان کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔ چندر سنگھ ان ہی ہماذر اور جاں نثار راجپوتوں کی اولاد تھا۔ اس قربت کے باوجود چندر سنگھ کو تہہ خانے کا راز معلوم نہیں تھا کی خاص مواقع پر چندر سنگھ، مہمانتری کے ہمراہ اس تہہ خانے میں آیا مگر اسے اب تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ تہہ خانہ ایک حیرت انگیز طلسم کے ذریعے بنایا گیا ہے وہ تو بس حیرت زدہ نظروں سے دیواروں میں شگاف ہوتے دیکھتا تھا اس کے بعد نظروں کے سامنے کشادہ اور آراستہ کمرے ابھرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ تہہ خانے سے نکل کر ساتویں منزل پر آیا تھا اور ابداری میں بائیں جانب مڑ کر ایک دلکش نقش و نگار والی دیوار کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اپنا کمرے میں شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ لائبریریاں چھ کر چھٹی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ چندر سنگھ اس طلسم کے راز جاننے کیلئے بے چین رہتا تھا مگر اس نے اپنے آقا وکرم سنگھ کے سامنے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔

مگر اس پہنچنے پر وکرم سنگھ نے اسے مخصوص کمرے میں طلب کیا جہاں نرملا کمار بھی موجود تھی۔ نرملا شگاف کو دیکھتے ہی انتہائی تیزی سے لہجے میں آفریدی کے متعلق پوچھا اور پھر وکرم سنگھ نے شاہی سفیر کی وہی المناک حالت بیان کر دی تھی جسے کچھ دیر پہلے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نرملا اس ہو گئی مگر چندر سنگھ کی موجودگی میں اپنے جذبوں کا اظہار نہ کر سکی۔

کمرے کی فضاؤں پر کچھ دیر تک اداسی طاری رہی پھر وکرم سنگھ نے چندر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں نے راج وید کے بیان پر شک کیا تھا مگر بعد میں میرے کہنے سے آفریدی نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ دردناک حقیقت سامنے آئی تھی کہ وہ بیانی سے محروم ہو چکا ہے میں جانتا ہوں کہ اس سہیسا تشدد کس کے ہاتھ آفریدی کا زندہ رہنا بھی ایک معجزہ ہے۔ آنکھوں سے محروم ہو جانا میرے نزدیک کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر مجھے یہ راج وید کے طریقہ علاج سے مطمئن نہیں ہوں۔“

”تو پھر کیا ہمیں کوئی دوسرا طیب تلاش کرنا ہو گا؟“ چندر سنگھ نے چونک کر پوچھا۔

”شاید! مگر ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ وکرم سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں تمہیں اسی وقت کوہ آبو چلا جانا چاہئے۔“ وکرم سنگھ نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس کا منہ سے نہ نکلا کلمہ اور چندر سنگھ دونوں عاجز تھے۔

”کوہ آبو؟“ چندر سنگھ اور نہلا کلمہ نے بیک وقت چونکتے ہوئے کہا تھا۔ ”رات کے ان میں؟“

”اب اندھیرا ہو یا موت کا طوفان۔ تمہیں کوہ آبو تو جانا ہی ہے۔“ وکرم سنگھ نے پر زور لہجہ بمل شاہ کے مندر میں مائی بھان متی کے پاس۔ یہ کام بہت رازداری کا تھا اور اصولی طور پر مجھے خود جانا چاہئے تھا مگر میں مجبور ہوں۔ راج محل کی فضا اس قدر مخدوش ہے کہ وہاں رہنے والے ہر رتن سنگھ کے جاسوس کا گمان ہوتا ہے۔ اگر میں نے کوہ آبو کے راستے پر چند قدم بھی آگے بڑھائے یقین ہے کہ راجپوت سمرات میری روانگی سے باخبر ہو جائیں گے اور اس فضا میں مائی بھان متی سے ملنا حق میں مفید نہیں ہو گا۔ مائی رانی پدمی اور رتن سنگھ دونوں کی اس قدر معذرت ہے کہ اگر ان کا اس ممان عورت کو زندہ جلا ڈالیں۔ اس صورت میں میرا وہاں جانا بے شمار شکوک و شبہات پیدا ہے۔“

”آپ حکم دیجئے! میں وہاں جاؤں گا۔“ چندر سنگھ جوش جذبات میں کھڑا ہو گیا اور دوسرے اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر پکڑ لیا۔

”اگر راستے میں تمہارا تعاقب کیا جائے تو خواہ مخواہ کسی سے ابھنے کی کوشش نہ کرنا۔ صاف ما دینا کہ تم اس وقت ایک مخصوص پوجا کیلئے بمل شاہ کے مندر جا رہے ہو۔“

چندر سنگھ نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

”مائی بھان متی تمہیں نہیں جانتیں۔“ وکرم سنگھ نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہا کر کوئے کے تمہیں ان کے داس وکرم سنگھ نے بھیجا ہے۔ پھر جب وہ تمہیں تنہائی میں طلب کر لیں تو دینا کہ رانی پدمی کے تشدد کے سبب راجدوت اپنی بیٹائی کھو چکا ہے۔ راج وید ہر قسم کی دوا آزما رہا ہے کہ دعوے کے مطابق آفریدی دوبارہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکے گا ایسی سنگین فضا میں ہمیں آپ کی دلا مشوروں کی سخت ضرورت ہے۔ اس گزارش کے بعد مائی بھان متی جو کچھ کہیں اسے حرف ذہن نشین کر لینا۔ جاؤ جلدی کرو۔“

چندر سنگھ گہری سیاہ رات میں مہمان نوازی کے محل سے نکلا اور کوہ آبو کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

چندر سنگھ کے جانے کے بعد وکرم سنگھ اپنی بیٹی نہلا کلمہ کی سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے چندر بھان متی کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ وہ میری رہنمائی کر سکیں۔ مجھے یہاں کسی پر مجبور نہ رہنا چاہئے۔ راج وید ایک زر پرست طیب ہے۔ اس کا فن راجہ رتن سنگھ نے چند سکوں کے عوض خرید لیا۔ شب و روز ان دواؤں کی تلاش میں رہتا ہے جو راجہ رتن سنگھ اور رام دیو کو مصنوعی جوانی فراہم کر سکیں۔ رانی پدمی کا یہ حسن تابناک برقرار رہ سکے۔ بے شک! وہ اپنے بہتر میں بیکتا نہ رہے گا۔ راجہ بہت مطالعہ کیا ہے۔ اپنی ذہانت سے بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں مگر دولت کی حد سے بڑھی ہوئی نے اسے پیٹ کا کتابا دیا ہے۔ اسے یہ علم اس لئے بخشا گیا تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اذیت نہ دے۔“

نجات دلائے مگر راج وید کا یہ حال ہے کہ بیمار لوگ اس کے مکان کے سامنے کھڑے رہتے رہتے ہیں اور وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بیٹی! مجھے تم سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ راج وید کی غفلت نے کہے کیسے ذہین لوگ بے موت مار دیئے اسے ہمہ وقت صرف ایک ہی فکر رہتی ہے کہ راجپوت سمرات رتن سنگھ اور شہیدہ باز رام دیو آج حیات پائی کر کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی حاصل کر لیں اور رانی پدمی کی دلکشی آج جس مقام پر ہے وہیں ٹھہر جائے۔ تمہیں خبر نہیں کہ کئی سرکاری کارندے دور دراز کے جنگلات میں دن رات قیمتی جڑی بوٹیوں کی جستجو کرتے رہتے ہیں اور راج وید انہیں سرکبات میں تبدیل کرنے کے مسلسل نئے تجربات کر رہا ہے۔ یہ تجربات چوڑے کے صرف تین انسانوں کیلئے وقف ہیں۔ راجہ رتن سنگھ، رام دیو اور رانی پدمی۔ ”وکرم سنگھ کا جہد زہر سے بھی زیادہ تلخ تھا۔“ وہ رتن سنگھ اور رام دیو کا خاص آدمی ہے اور چوڑے کے دونوں بت نہیں چاہیں گے کہ آفریدی جیسا انسان زندہ رہے۔ اگر شاہی سفیر کو زندگی مل بھی گئی تو رتن سنگھ، رانی پدمی اور رام دیو یہ پسند نہیں کریں گے کہ آفریدی مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے تمہے خانے میں قید کر رکھا ہے ممکن ہے کہ آفریدی کا وقت پورا ہو جائے مگر میں اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے کر چکا ہوں کہ راج وید کو دوبارہ کھلی فضا میں واپس جانے نہیں دوں گا۔ اس کی لاش بھی اسی تمہے خانے میں سڑ جائے گی اور اہل چوڑے کو یہ پتہ بھی نہیں چل سکے گا کہ ان کا مایہ ناز طیب کہاں ہو گیا؟“

”مائی بھان متی! کیا وہ بھی طیب ہیں؟“ نہلا کلمہ نے پوچھا۔

”سرمزن چوڑے پر بسنے والی سب سے بڑی طیب۔“ وکرم سنگھ کے چہرے پر رنگ عقیدت پوری تابناکی کے ساتھ تھلنے لگا تھا۔ ”وہ روح کی بھی طیب ہیں اور جسم کی بھی۔ دیوار کے پار دیکھنے والی ان آنکھوں پر روشن ہو جائے گا کہ راج وید جھوٹ بول رہا ہے یا آفریدی کی آنکھیں بے نور ہو جائے گی تلخ سچائی ہمارا مقتدر بن گئی ہے؟ مائی بھان متی نے میرے سامنے تو یہی کہا تھا کہ حالات کچھ بھی ہوں مگر کوئی شخص راجدوت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ظلم کے اندھیرے جیت گئے یا روشنی نے فتح حاصل کر لی؟“

”کیا آپ کو چندر سنگھ پر مکمل اعتماد ہے؟“ نہلا کلمہ نے ایک اور سوال کر دیا تھا جو ان مشکوک فضا میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

چندر سنگھ نے بارے میں صرف اتنا جانتی ہو کہ وہ ہمارا خاندانی ملازم ہے لیکن آج میں تمہیں اس کے ملازم تھے مگر ایسے ملازم کہ ان کا عزت و احترام ہمارے اہل خاندان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا جب ہم ہم کو دینا سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے میرے دادا کے سامنے ایک انکشاف کیا جس پر آج کی دنیا اعتبار نہیں کر سکتی۔ ہمیں سنگھ نے بتایا کہ ان کے پاس میرے خاندان کا ایک بہت بڑا خزانہ بطور امانت محفوظ ہے۔ وہ خزانہ نسل در نسل ہمیں سنگھ کے خاندان کی تحویل میں چلا آ رہا تھا۔ میرے بزرگوں نے ہمیں سنگھ کے سے دوپہر ہو جائے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی سوچ تھی کہ آڑے وقت میں دولت کا اتنا بڑا ذخیرہ ہمارے ہمارے پاس ہے تو ہم غریب و افلاس کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں اس راز کو میرے دادا اور چندر سنگھ کے دادا نے ہم کو کبھی نہیں بتایا تھا۔ پھر میرے دادا کا انتقال ہو گیا اب اس خزانے کا مدعی دنیا میں موجود صرف ہم ہیں۔ اگر چندر سنگھ کے دادا چاہتے تو ہم دوزخ کے اس انبار کو اس طرح غصب کر سکتے تھے کہ ان کے

دامن پر خیانت کی چھینٹ تک نہ آئی پھر جب چندر سنگھ کے دادا دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انہوں میرے پتائی کو بستر مرگ پر بلایا اور روتے ہوئے کہا: ”اب میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہوں۔ مجھ زندگی کے بارے میں اتنی بھی امید نہیں کہ کل کا سورج دیکھ سکوں اس لئے چاہتا ہوں کہ اپنے دلدار سے امانت کا وہ بوجھ اتار دوں جس نے مجھے تھکا کر رکھ دیا ہے۔“ اس کے بعد چندر سنگھ کے دادا میرے پتائی کے سامنے وہ خفیہ خزانہ ظاہر کر دیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا: ”تاہتھ (آقا) اب میں ہوں کہ میری آنے والی نسل اس امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گی اس لئے مجھے تمام ذمہ داریوں سبکدوش کر دیا جائے۔“ یہ کہتے ہی چندر سنگھ کے دادا کی روح پرواز کر گئی۔ ”چندر سنگھ! امانت داروں کی اولاد ہے۔“ وکرم سنگھ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر وہ بھی مجھے سمجھ لو کہ وکرم سنگھ بھی وقت کی بنیاد گاہ میں فروخت ہو سکتا ہے۔“

”میں ان حالات سے بے خبر تھی۔ اس لئے چندر سنگھ پر شک کرنا کچھ زیادہ غیر فطری نہیں تھا۔“ کماری نے معذرت کے انداز میں کہا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں نے ہی تمہیں بے خبر رکھا۔“ وکرم سنگھ بہت تیز لہجے میں کر رہا تھا۔ ”اب وقت آگیا ہے کہ میں اس بے خبری کو ختم کر دوں اور زندگی کے بعض گوشوں پر ہوئے دیز پر دے ہٹا دوں۔ لوگ اپنی خاندانی وراثت کو برقرار رکھنے کیلئے لڑکے کی تمنا کرتے ہیں۔ بہت دن اپنے سینے میں اس آرزو کو پروان چڑھا یا مگر آسمانوں پر میرے لئے یہی تحریر کیا گیا تھا کہ میں سے محروم رہوں۔ کچھ دن تک میں آسمانی فیصلوں کو جھٹلانے کیلئے مقدر کے خلاف جنگ کرنا تمہاری ماں کی موت کے بعد یہ آرزو دم توڑ گئی۔ میں اس وقت جوان تھا۔ لوگوں نے دوسری شادی مشورہ دیا۔ درباری نجومیوں نے پیش گوئیاں بھی کیں کہ اگر میں دوسری شادی کر لوں تو مجھے خاندان وارث مل جائے گا۔ آخر انسان تھا احساس محرومی نے یہاں تک مجبور کیا کہ میں دوسری شادی کر آمادہ ہو گیا مگر جب شادی سے پہلے میں نے سنیاسی آئندہ پال سے ملاقات کی تو اس نماز (مرد عظیم) نے نجومیوں کی ساری پیش گوئیاں کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

”وکرم سنگھ! تمہیں بیٹا یقیناً ملے گا مگر شادی کے بعد نہیں۔ تمہارے خاندان کا وارث کسی اور میں آئے گا شاید تم اسے پہچان بھی نہ سکو۔ میرا گمان کتنا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔ اگر آنے والا ہے اسے بے دریغ اپنے سینے سے لگا لینا یہ خود غرض اور گمراہ دنیا تم سے تمہارے وارث کو چھیننے کی بات کرے گی مگر تم کسی کے فریب میں نہ آ جانا مونجوں بھی سر سے گزر جائے تو خوفزدہ نہ ہونا کہ بلاخ دی وارث تمہیں نجات اور سلامتی کے راستے پر لے جائے گا۔ آنکھیں کھلی رکھنا اور زندگی کی مسلسل دیکھتے رہنا کہ وہ آنے ہی والا ہے۔“ یہ کہتے کہتے مہاسنتری وکرم سنگھ کے چہرے پر یادوں کا پھیل گیا تھا۔ اذیت و کرب کی ایک تند لہر بھی جود کے کسی گوشے سے اٹھ کر پورے وجود پر چھٹی تھی۔ وکرم سنگھ نے بشکل ان یادوں سے اپنا دامن چھڑایا مگر لہجے کی اداسی پر قابو نہ پاسکا پھر سنیاسی کے کہنے پر میں نے دوسری شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور تمہاری پرورش اس انداز میں کرنے لگا کہ تم ہوتے ہوئے بھی میرے نزدیک ایک مرد تھیں۔ یہ تیر اندازی، یہ شمشیر زنی، یہ شہسواری اور یہ تعلیم، سنیاسی آئندہ پال کی اسی ہدایت کا نتیجہ تھی کہ میں تمہاری شکل میں اپنے خاندان کے ایک نژاد دیکھ رہا تھا۔ اس دور میں میں نے کئی بار سنیاسی سے اس وارث کے بارے میں دریافت بھی کیا مگر وہ رعبہ کہ انتظار کرو آنے والا ایک دن ضرور آئے گا۔ پھر اچانک سنیاسی آئندہ پال، راجہ رتن

نی پڑ مٹی کے معتب قرار پائے۔ اس لئے میرا اور ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ بس ایک روح اور دل کا تعلق تھا جو تم باہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن جسمانی فاصلوں کے درمیان زندہ رہنے والا یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے۔ سنیاسی سے آخری چند ملاقاتیں ہوئیں مگر اس طرح کہ وہ ریاست چوڑے کا قانون کی نظر میں بدترین مجرم رہے تھے۔ پھر سنیاسی اس طرح قتل کر دیے گئے کہ تمام جفا کار و سنگتر اپنے آپ کو آج تک بے قصور تھے۔ میں ایسی کریمک فضا میں ان سے کس طرح سوال کرنا کہ میرا وارث کب آئے گا؟ یہ تو بڑی تہہ ہیں۔ ثانیہ خود غرضی ہوئی مگر آج مجھے یقین آگیا ہے کہ وہ جانے سے پہلے میرے سوال کا جواب دے چکے تھے۔“

”کیا جواب؟“ نرملاکماری نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میں کہ میرے خاندان کا وارث مجھ تک پہنچ چکا ہے۔“ وکرم سنگھ کے لہجے میں اسی مسرت کا رنگ مل تھا جو ایک بے اولاد انسان کو بیٹا مل جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

”کون وارث؟“ نرملاکماری کی حیرت اکتا کو پہنچ چکی تھی۔

”علاء الدین خلجی کا سفیر علی عامر آفریدی۔“ یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کا چہرہ جوش جذبات سے روشن لہکا۔ ”سنیاسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ بڑے عجیب انداز سے مجھ تک پہنچے گا۔“ وکرم سنگھ کے چہرے پر آنے والی نشاط رنگ خوشی اچانک بجھ گئی۔ ”کیسی گردش وقت ہے کہ آنے والا آیا بھی تو کس طرح کہ مائے پورے جسم پر زخموں کی فصل اگی ہوئی ہے اور آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔“

باپ کے اظہار غم نے بیٹی کو بھی اداس کر دیا۔ نرملاپنے خیالات میں غرق بیٹھی رہی اور کمرے پر موت کا اظہار ہو گیا۔

پھر وکرم سنگھ کی پُرسوز آواز نے اس الم انگیز سنائے کے جگر میں شگاف ڈال دیا۔

”اب تم دونوں ہی میرے وارث ہو۔ خدا تمہیں وقت کے تمام ہنگاموں سے، فتنہ و شر سے اور نینوں کی دست درازیوں سے محفوظ رکھے۔“ یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔ ”میں اپنے وطن، اپنی زمین چھوڑ کیلئے بھی یہی دعائیں مانگتا ہوں مگر خود یہاں رہنے والوں کو احساس نہیں کہ ان کیلئے عذاب نازل ہونے والا ہے۔“

عذاب کے ذکر پر نرملہ چونک اٹھی اور استغما میری نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں! وہ عذاب نازل ہو کر رہے گا سے کوئی روکنے والا نہیں۔“ وکرم سنگھ کے لہجے میں پوشیدہ درد مل تھا اور جھٹکنا ہوا غصہ بھی۔ ”سنیاسی آئندہ پال نے مکھ شام کے مندر پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا۔“

”پھر اپنی قوم کو، اپنی دھرتی پر بسنے والوں کو وقت سے پہلے خبردار کیوں نہیں کرتے؟“ نرملانے اپنے ساتھ احتجاج کیا۔ ”آپ ایں اس عذاب سے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جو سنیاسی کے بقول اہل ہند کا مقدر بن چکا ہے۔“

نرملانے وکرم سنگھ سے بڑا عجیب سوال کیا تھا جس کا جواب دیتے وقت مہاسنتری شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ ”ہاں میں جانتا ہوں کہ اس عذاب کا نشانہ میرے بزرگوں کی صدیوں پرانی تہذیب ہے میرے دوست، میرے رشتہ دار، میری زمین، میرے دریا، میرے کھیت، میری مملکت اور وہ تمام نعمت جس سے میری شناسائی ہے سب اس عذاب کی لپیٹ میں آنے والی ہیں۔ میں اپنے ہر تعلق اور بہ نسبت کو اس آسمانی قہر سے بچانا چاہتا ہوں مگر میری بات سننے کیلئے کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔ کیامی بھان مٹی

نے راجہ رتن سنگھ کو اس عذاب کی اطلاع نہیں دی ہے؟ کیا سنیا سی آئندہ پال نے اپنی جان دے کر کرا سمجھانے کی کوشش نہیں کی..... مگر سب کے سب اندھے ہیں..... سارے کے سارے..... انہیں کچھ سناٹی نہیں دیتا یہ اپنی ناک کے سامنے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ پھر مستقبل کی دیوار کے پیچے طرح دیکھیں گے جو فلوادو آئین سے بنائی گئی ہے اور جس کے پار گزر جانے کی صلاحیت ہر آنکھ میں ہوتی۔ میں انہیں پکاروں گا تو وہ میری زبان بھی کاٹ دیں گے۔ میری معصوم بیٹی! دنیا میں اکثریت لوگوں کی ہے جو روشن خانیاں دیکھنے کے بعد بھی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یہ ایک کیلئے اپنے سیکڑوں خداؤں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ سنیا سی کے قتل کا مشریتہ پڑھنے والی سیاہ آدمی نے نہ زیر و زبر کر کے رکھ دیا مگر یہ لوگ اسے اتفاق سمجھتے رہے۔ ستاروں کے اثرات کہہ کر سچائی سے منہ چھپ رہے۔ یہاں تو سب رام دیو کے پجاری ہیں۔ جھوٹ، ظلم اور اندھروں کے پرستار۔ میں ان کے سر کی چمکی شمع نہیں جلا سکتا۔ یہ میری اور تمہاری زندگی کے چراغ بھی بجھا دیں گے۔ ”وکر م سنگھ کی آنکھوں کرب اور مجبوری کے آنسو تھے۔

”بس نہیں جانتا کہ آنے والے دنوں میں سیاست کی بارخ اختیار کرے گی لیکن میں آفریدی پر مبنی کے حوالے نہیں کروں گا چاہے اس کشمکش اور تصادم میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے وگرم سنگھ ایک باہر پھر انتہائی جذباتی نظر آنے لگتا۔“ ”نرمل! میں اپنی زندگی میں آفریدی کو گمراہی اور شوخا کر نہیں بنے دوں گا۔ سنیاہی آندہ پال کے روحانی فرزند سے اب میرا بھی ایک انوٹ رشتہ ہے۔ رشتے کو قائم رکھنے کیلئے میں آفریدی کو اس تمہ خانہ تک لے آیا ہوں۔ یہ وہ تمہ خانہ ہے جسے راجہ رنر کی پوری فوج مل کر بھی تلاش نہیں کر سکے گی۔ آفریدی یہاں اپنی ماں کی آغوش کی طرح محفوظ ہے۔ بنی! آج میں تمہیں اس تمہ خانے کا راز بتا دوں جو آفات و مصائب کے وقت تمہاری آخری پناہ ہوگی۔“ یہ کہہ کر مہماننزی راٹھا اور نرملاکماری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ نرملاکے دل کو دو عالمیں مل گئیں۔ ”یہ کہہ کر مہماننزی راٹھا اور نرملاکماری کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ نرملاکے دل کو دو عالمیں مل گئیں۔“ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں اس قدر برق رفتاری کے ساتھ اسنے پتہ نہ لگے۔ راجہ دوست کی چوڑی آمد، سنیاہی کا قتل، وگرم سنگھ کی تبدیلی مذہب، راجہ رنر سنگھ اور رانی سے شدید سیاسی اختلاف، راجپوتوں کی سر زمین کی تباہی کے اندیشے اور خود اس کے اندر حشر برپا کرنے جذباتی کشمکش۔ بیک وقت کئی طوفان اٹھے تھے جن کا براہ راست ہدف نرملاکماری اور وگرم سنگھ کی تھی۔ اسی سوچ میں غرق وہ تیز قدموں سے باپ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ وگرم سنگھ طویل راہدار کر کے بائیں جانب گھوم گیا۔ ایک اور طویل راہدار موجود تھی۔ اس موڑ پر پہنچتے ہی وگرم سنگھ ایک کے سامنے رک گیا جو سنگ سرخ کی دیوار پر آویزاں تھی۔ نرملاکماری بھی باپ کی تقلید میں ٹھہری۔ ”یہ کرشن جی کی مورتی ہے جو کبھی ہمارے بھگوان ہوا کرتے تھے۔“ وگرم سنگھ کا جبہ سیاہ قلم دل سے دیوتاؤں کی عقیدت اس طرح رخصت ہو چکی تھی کہ جیسے ان پتھر کے خداؤں سے وہ کبھی متعلق تھا۔ نرملاکماری نے کیلوں بار اس سونے کی مورتی کو دیکھا تھا جو سونے کی دھات سے کسی ماہر نے ہاتھوں تراشی تھی۔ کرشن جی کے ہاتھوں میں چاندی کی ایک بانسری تھی جسے شیم، مرلی منوہر، مندلال جیسے خطابات رکھنے والے کرشن کی مشہور علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ بانسری اسی مرلی کی یاد تازہ کرتی بنے کرشن جی بندرا بن میں بجایا کرتے تھے اور جس کی وگرم سنگھ تائیں سر کر گویاں مستانہ دار کرتے تھیں۔ چند لمحوں کیلئے نرملاکے حالات متغیر ہو گئی اور دل کو کئی کامنیاں یاد آ کر رہ گئیں۔ پھر ان ذہن نے ماضی کی تمام کامنیوں کو فراموش کر دیا کہ آج وقت اسے کوئی اور ہی کامنی سنا رہا تھا۔

ملاکاری نے غور سے کرشن جی کی سنہری مورتی کو دیکھا اور اس نفرتی بانسری پر نظر کی جس میں قیمتی نیلم
 ہے ہوئے تھے۔

”مورتی ہمارے بزرگوں کے بنائے ہوئے اس مخصوص تہ خانے کی ابتداء ہے جس کے اندر مورتی کے بغیر داخل نہیں ہوا جاسکتا۔“ وکرم سنگھ نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مورتی کے بغیر تہ خانے میں داخلہ ناممکن ہے؟“ نرملا کماری کی دلفریب آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئی تھیں۔

”تمہارا خانہ تو ایک عام محافظ ہے۔“ وکرم سنگھ نے نرم لہجے کی حیرت دور کرنے کیلئے وضاحت کی۔ ”اے باب ظلم کدہ کو، دنیا کا عجیب و غریب ظلم کدہ۔ اسی ظلم کدے کے سات پردوں میں سلطان لاء الدین خلجی کا سخی علی عام آفریدی موجود ہے۔“

”سات پردے؟ ظلم کدہ؟“ نرم لہجے کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”اب تم میری ایک ایک بات غور سے سنو اور جو کچھ میں کہوں اسے اپنے ذہن پر پتھری لیکری طرح کش کرلو۔ اس ظلم کدے کا راز یادداشت کیلئے کسی کاغذ پر تحریر نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح یہ خوف راندہ باقی رہتا ہے کہ اگر وہ تحریر کسی دشمن کے ہاتھ لگتی تو پھر راز، راز نہیں رہے گا اور یہ ظلم کدہ مارے مخالفین کی عام گزرگاہ بن جائے گا۔ اس لئے تمہیں صرف اپنے حافظے پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ہر پاس دقت بہت کم ہے کسی بھی لمحے میری زندگی کو کوئی المناک حادثہ پیش آسکتا ہے اور میں تمہیں کچھ بے غور دنیا سے رخصت ہو سکتا ہوں۔“

”آپ کیسی دل شکن باتیں کر رہے ہیں بتاجی!“ نرملا کلمی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ابھی تو سالہا سال آپ کی محبتوں کا سایہ میرے سر پر قائم رہے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہو..... مگر سایہ آخر سایہ ہے۔ گردش کا کوئی اندھیرا اس سائے کو کسی بھی وقت سے ملتا ہے۔ تم ایک راجپوت زاوی ہو، تمہیں اس قدر کم ہمتی اور ناطقہ کی بات نہیں کرنی چاہئے۔ فساد فطر کے ہر احساس کو اپنے ذہن و قلب سے کھرچ ڈالو اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس ظلم کدے کی ایک ایک راز کو اپنے حافظے کی گہرائیوں میں جذب کر لو۔“

باپ کی باتیں سن کر نرملہ اکملاری پوری طرح مستعد ہو گئی۔ وکرتم سنگھ نے کرشن کی موت پر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پہلی موتی ہے۔ تم آگے بڑھو اور بائیسری رتھ پہنچ کر مارو۔“

نرملہ لکھاری چند لکھوں کیلئے جھجکی اودھر پھر باپ کی ہدایت کے مطابق اس نے آگے بڑھ کر اس باندھی کے لئے سو رانچ پر چھونک ماری جو کرشن جی کے ہاتھوں کا ایک مخصوص کھلونا نظر آرہی تھی۔ نرملہ کے ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ہی رابداری میں ایک انتہائی مسرور کن آواز گونجنے لگی۔ یہ گونج محل کی فضاؤں میں دوڑتی پھرتی رہا اور پھر آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی۔ پھر جیسے ہی مرلی کی تان ختم ہوئی مسوری کی دواںس جانب دیوار میں ایک صاف نمایاں ہونے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر نرملہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی ”اوه میرے خدا!“ نرملہ نے آواز ایک بلکی کی چیخ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

یہ سب باتوں کے اظہار کا وقت نہیں ہے۔ ”وکر م سنگھ نے نرملا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ یہ ساتوں
نرملا نے نرملا کے بائیں ہاتھ کی جانب کھلے ہوئے تھے۔ ”اب ادھر دیکھو۔“ مہمانتری نے اپنے دائیں
نرملا نے نرملا کے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سید لڑباہ کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ہی اس کی آنکھوں نے وکرم سنگھ کے اٹھے ہوئے ہاتھ

کا تعاقب کیا تو وہ ایک بار پھر حیرت کا شکار ہو گئی۔ بھگوان کرشن کی مورقی کی بایں جانب بھی سات دروازے کھلے ہوئے تھے۔

”پتاچی! یہ سب کچھ کیا ہے؟“ نرملا کماری نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہ اس ظلم کدے کا سپلاراز ہے۔ جو دروازے مورقی کی دائیں جانب کھلیں گے وہ تمہارے بائیں جانب کے دروازے شمار ہوں گے۔ اور جو مورقی کے بائیں جانب واہوں گے وہ تمہارے لئے دائیں طرف کے دروازے کہلائیں گے۔ کیونکہ تم مورقی کے بالکل سامنے کھڑی ہو۔ اس لئے زادیہ بدل جائیں گے۔ یہاں یہ راز سمجھ لینا ضروری ہے کہ ظلم کدے میں پہنچنے کیلئے تم ہر مرتبہ اپنے دائیں ہاتھ کے دروازے استعمال کرو گی۔“

”اور اگر کوئی شخص غلطی سے بائیں جانب کے کسی دروازے میں داخل ہو جائے؟“ نرملا نے گہرا ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”ظلم تیار کرنے والوں نے دشمنوں کو دھوکا دینے کیلئے دونوں طرف ایک ہی انداز کے دروازے بنائے ہیں۔ اگر بد قسمتی سے ہمارا کوئی دشمن ظلم کدے کا نامکمل راز حاصل کر لے تو پھر اسے پہلے ہی قدم دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلے ہی مرحلے میں آنے والا الجھ کر رہ جائے گا کہ وہ بائیں جانب کے دروازے سے داخل ہو یا دائیں طرف کے راستے سے۔ اگر اس نے بائیں جانب کے کھلے ہوئے دروازے کا استعمال کیا تو پھر وہ کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت کا شکار ہو جائے گا۔“

”وہ کس طرح؟“ نرملا کماری بہت زیادہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

”ٹھہرو! تمہیں یہ بات عملی طور پر سمجھنا پڑے گی۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ تیزی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر اس خوبصورت عورت کا مجسمہ اٹھا لایا جسے کسی ماہر فن کے ہاتھوں نے تراشا تھا۔ باپ کے اہم میں یہ مجسمہ دیکھ کر نرملا کی حیرت کچھ اور بڑھ گئی۔

وکرم سنگھ نے واپس آکر بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ مجسمہ ہمارا دشمن اور اسے کسی طرح ظلم کدے کا راز حاصل ہو گیا ہے۔ یہ مجسمہ اصول کے مطابق بانسری میں بچھو کر لانا۔ اور مورقی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل جاتے ہیں۔ اب اس مجسمے کو یہ راز نہیں معلوم کہ کون سے دروازے میں داخل ہو کر دوسرے تہ خانے تک پہنچا جاسکتا ہے۔ نتیجتاً وہ غلطی کا مرتکب ہو جائے گا۔ بائیں جانب کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب غور سے دیکھو کہ اس غلطی کا کیا انجام ہوتا ہے۔“ کہہ کر وکرم سنگھ آگے بڑھا اور اس نے عورت کے دلکش مجسمے کو کھلے ہوئے دروازے میں رکھ دیا۔ مجسمہ دروازے کے فرش سے ٹکرایا، دائیں اور بائیں جانب کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ صرف وہ دروازہ کھلا رہ گیا جس میں وکرم سنگھ نے مجسمہ رکھا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کا فرش تیزی سے نیچے کی طرف گرنے لگا۔

”نرملا! میرے قریب آؤ اور اس مجسمے کا شہرہ دیکھو۔“

نرملا تیزی سے باپ کے قریب آئی اور اس خلاء میں جھانکنے لگی جو مجسمے کے رکھنے والی اچانک پیدا ہوا تھا۔ نرملا نے دیکھا، وہ مجسمہ بہت تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ پھر نرملا کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا اظہار آیا۔ مجسمہ سنگ مرمر کا تھا اس لئے گہری تاریکی کے باوجود نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اوپر سے نیچے جانے والے تاریک غار میں سفر کر رہا ہو یا کوئی چیز بلندی سے پستی کی طرف گرا رہی ہو۔ یکایک نرملا نے دیکھا کہ مجسمہ کسی چیز سے ٹکرایا اور اس تصادم کے نتیجے میں ہی سی روکنی پڑی ہوئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے تاریکی چھا گئی اور دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

”وہ مجسمہ کہاں گیا؟“ نرملا کماری کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر واہورہے تھے۔

”اس غلطی کا کوئی ازالہ ممکن نہیں۔“ وکرم سنگھ نے گہرے رازوں سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہ مجسمہ ساتوں تہ خانوں سے گزرتا ہوا اس سرنگ تک چلا گیا ہے جو دشمنوں کیلئے موت کی سرنگ ہے۔ تم نے مجسمے کے گرتے وقت کچھ روشنی ہی دیکھی تھی۔ دراصل وہ پانی کی جھینٹیں تھیں جو کسی وزنی چیز کے گرنے سے بلند ہوئی تھیں۔ بائیں جانب کے دروازوں کا انجام موت کی سرنگ پر ہوتا ہے۔ یہ پانی کا ایک تیز رفتار چشمہ ہے جس پر سرنگ تعمیر کی گئی ہے۔ جو شخص بھی اوپر سے گر کر پانی کے چشمے تک پہنچے گا تیز لہریں اسے طویل اور تاریک سرنگ میں کھینچ کر لے جائیں گی۔ یہ سرنگ بیس میل لمبی ہے۔ سرنگ کے خاتمے پر مضبوط ترین لوہے کی سلاخیں نصب کی گئی ہیں تاکہ کوئی سخت جان دشمن سرنگ سے باہر نہ جاسکے اور آہنی سلاخیں اس کے ٹھکے ہوئے جسم کو روک لیں اور پانی کے خوفناک تھپڑے اسے ہلاک کر ڈالیں پھر وہ مردہ جہ جھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر دریائے گنگہ میں پہنچ جائے۔“

وکرم سنگھ نے محبت سے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یہ دشمنوں کی سزا ہے، غداری اور خیانت کا انجام ہے۔ اگر ظلم کدے کا معمار اس تہ خانے کو اس پیچیدہ انداز میں تعمیر نہیں کرتا تو پھر کسی وقت بھی ہمارے خلاف کوئی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا اور دشمن تمہارے اس خاندانی راز کو چر کر غلط فائدے بھی حاصل کر سکتے تھے۔“

نرملا کماری نے آہستہ آہستہ اپنے اعصاب پر قابو پایا اور جب وہ پرسکون نظر آنے لگی تو وکرم سنگھ نے کہا۔ ”اب تم دوبارہ ظلم کدے کے پہلے مرحلے کو سر کرنے کی کوشش کرو۔“

نرملا خاموشی سے آگے بڑھی اور اس نے بانسری پر تیز پھونک ماری۔ ایک بار پھر فضاؤں میں مدھرتان گونجی اور مورقی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل گئے۔

”مثال کے طور پر کوئی شخص چوری کی نیت سے یہاں داخل ہو اور اس قیمتی مورقی کو چرالے جائے۔ اس طرح ظلم کدے کا سپلاراز تباہ ہو جائے گا۔“ نرملا نے اچانک اس بحث کو ایک نئی سمت میں موڑ دیا تھا۔

وکرم سنگھ مسکرائے لگا۔ ”تمہارے ذہن میں اس اندیشے کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ مگر ظلم کدے کے بنانے والے ہم سے زیادہ ہوشیار تھے۔ ان لوگوں نے صدیوں پہلے انسان کی اس کمزوری کو سمجھ لیا تھا۔ اس لئے حفاظتی طور پر مورقی کو اس قدر مضبوطی کے ساتھ نصب کیا گیا ہے کہ کبھی زور آور انسان ل کر بھی اسے دیوار سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ مجبوراً انہیں کسی آہنی آلے کا سہارا لینا پڑے گا اور پھر جیسے ہی لوہا مورقی سے ٹکرائے گا اس آہن بدست چور کے جسم میں آگ لگ جائے گی۔ انجام کار اس کے دوسرے ساتھی بھی اپنی غلطی کو دہرانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ویسے یہ ایک انتہائی مشکل کام ہو گا کہ کوئی شخص اپنے بھگوان کو چرانے کی کوشش کرے۔“

نرملا ایک بار پھر شدید حیرت کے عالم میں اپنے آپ کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

وکرم سنگھ نے بیٹی کی حیرت کو دور کرنے کے لئے کہا۔ ”اگرچہ تمہارا یہ سوال بھی اس ضروری گفتگو کا ایک حصہ تھا لیکن اب اس وقت ہم اپنے اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ اب ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اگر ظلم کدے میں داخل ہوتے وقت ہم سے یہ غلطی سرزد ہو جائے کہ ہم پہلے دروازے کی بجائے دوسرے تہ خانے یا ساتوں دروازے میں داخل ہو جائیں تو پھر اس غلطی کی اصلاح کس طرح ہوگی؟ اس کا

”کیا آپ کے سپاہیوں کو بھی اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ مہمانتہری کے مخصوص طلسم کدے کے اندر پروردہ رہے ہیں۔“ نرملہ کماری نے اپنے باپ سے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں! ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ وکرم سنگھ کے محل میں ایک طلسم کدہ موجود ہے۔“ وکرم سنگھ نے نرملہ کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”پھر یہ لوگ یہاں کس طرح پہنچے ہیں؟“ نرملہ، وکرم سنگھ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

”دراصل ہمارا محل دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ فلاوی دیوار طلسم کدے کو محل سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔“ وکرم سنگھ نے سامنے کی دیوار کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس وقت آفریدی، راج وید اور

ہفتہ باہی دیوار کے دوسری طرف موجود ہیں۔ میں نے مصلحتاً آفریدی کو محل کے اسی حصے میں رکھا ہے جس سے ہمارے دربار، ملازم، فوجی دستے، راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی واقف ہیں۔ اس حصے کے تمام دروازے عقب میں کھلتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس حصے میں پہنچنا چاہے تو اسے زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔“

”پھر آفریدی کس طرح محفوظ رہے گا؟“ نرملہ کماری نے ایک اور سوال کیا۔

”ہم اسے آج رات کے پچھلے پر طلسم کدے کے ساتوں تہ خانے میں منتقل کر دیں گے۔ مجھے صرف ملای جان مٹی کے جواب کا انتظار ہے۔ راستہ پر بیچ اور طویل ہونے کے سبب چندر سنگھ کی واپسی شب کے آخری حصے میں ممکن ہو سکے گی۔ اس وقت تک آفریدی عام تہ خانے میں رہے گا۔“

نرملہ خاموش ہو گئی۔ اس کے ذہن میں طلسم کدے کے متعلق جو سوالات ابھر رہے تھے۔ ان کا سلسلہ عارضی طور پر ختم ہو گیا تھا۔

”جی کو خاموش پا کر وکرم سنگھ نے کہا۔“ اب ہم طلسم کدے کا دوسرا مرحلہ طے کریں گے۔“

نرملہ نے سوالیہ نظروں سے مہمانتہری کی طرف دیکھا۔

”یہاں پہنچ کر ہم وائیں جانب کچھ دور تک چلیں گے۔“ یہ کہتے ہی وکرم سنگھ نے راہداری میں دائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ باپ کی تقلید میں نرملہ بھی آگے بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وکرم سنگھ ٹھہر گیا۔

نرملہ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے کی دیوار میں اسی شکل کی دو مورتیاں نصب تھیں اور دونوں کے ہاتھوں میں نعلی بانسریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

”یہ دو مورتیاں کیسی ہیں بہانی؟“ نرملہ نے بہت دیر بعد ایک نیا سوال کیا۔

”یہ مورتیاں بھی اسی طلسم کدے کا ایک حصہ ہیں۔“ وکرم سنگھ نے اس پر اسرار تہ خانے پر پڑا ہوا ایک اور پردہ اٹھا دیا۔ ”دو مورتیاں اس لئے ہیں کہ تم دھوکا نہ کھا سکو اور آسانی کے ساتھ سمجھ لو کہ یہ

طلسم خانے کا دوسرا مرحلہ ہے۔ جب تمہیں دو مورتیاں نظر آئیں تو پھر لازم ہے کہ تم کسی ایک بانسری میں دو بار پھونک مارو گی۔ پھر یہ محو کر کن آواز فضا میں گونجے گی اور آواز کے ڈبے ہی پہلے مرحلے کی طرح مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل جائیں گے۔“

نرملہ اس منے کو سمجھ لیا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ دروازے میں داخل ہو گئی۔ وکرم سنگھ بھی ایک دننگل طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں تیسرے تہ خانے کی راہداری میں پہنچے۔ اس بار

وہاں تین محل مورتیاں موجود تھیں اور تینوں کے ہاتھوں میں علیحدہ علیحدہ چاندی کی بانسریاں نظر آ رہی تھیں۔ کسی مابہر نقاش نے ان خوبصورت مورتیوں کو اس طرح تراشا تھا کہ کوئی شخص بھی انہیں ایک دوسرے سے مختلف ثابت نہیں کر سکتا تھا وہ ہم شکل بھی تھیں اور ہم رنگ بھی۔

”یہاں ہمیں تین بار پھونکوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔“ نرملہ نے مورتیوں پر نظر پڑتے ہی کہا۔

ایک ہی جواب ہے کہ ہم غلط دروازے سے نکل کر دوبارہ مورتی کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔“

نرملہ باپ کا اشارہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھی اور مورتی کے عین مقابل کھڑی ہو گئی۔

”اب تم اس بانسری کو اس طرح پھو دو کہ ایک ہاتھ پہلے سرے پر ہو اور دوسرا ہاتھ آخری سرے پر۔“ غلطی سے تم نے ایک ہاتھ استعمال کیا تو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔“ مہمانتہری وکرم سنگھ نے

کو ہدایت کی۔ ”لیکن یاد رہے کہ تمہارے ہاتھ کرشن بھگوان کے ہاتھوں سے مس نہ ہونے پائیں۔“

نرملہ نے وکرم سنگھ کی ہدایت کے مطابق بیک وقت دونوں ہاتھوں سے بانسری کو پھولیا۔ پھر دیکھ

دیکھتے تمام دروازے بند ہو گئے اور پوری دیوار ہموار نظر آنے لگی۔

”اس طرح ہم نے اپنی غلطی کا زائلہ کر دیا۔“ وکرم سنگھ نے سرور لبے میں کہا۔ ”اب ہم دوبارہ انداز میں اپنے سفر کا آغاز کریں گے۔“

نرملہ نے دوسری مرتبہ بانسری میں پھونک ماری۔ راہداری میں ایک ترنم ریز گونج پیدا ہوئی اور پھر گونج ختم ہوتے ہی پہلے کی طرح مورتی کے دونوں جانب سات سات دروازے کھل گئے۔ نرملہ نے سوا

نظروں سے باپ کی طرف دیکھا جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو گا۔

”اب ہم پہلے دروازے میں قدم رکھیں گے۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے نرملہ کو آگے بڑھایا۔ نرملہ

سہمی ہوئی دروازے میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ وکرم سنگھ بھی اندر چلا آیا۔

ایک نرملہ نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

گھنٹیوں کی آواز مندر کی گھنٹیوں سے مشابہ تھی۔ جیسے کوئی پجاری بھگوان کو پوجا کیلئے بلارہا ہو۔

”یہ گھنٹیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم صحیح دروازے میں داخل ہوئے ہیں۔“ وکرم سنگھ نے نرملہ

حیرت کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ”بانسری کی تان کی طرح یہ گھنٹیاں بھی کچھ دیر تک بجتی رہیں گی۔“

آوازوں کے بند ہونے کا انتظار کرو اور دیکھو کہ طلسم کدے کا کونسا در کھلتا ہے۔“

نرملہ اپنی سانسیں روک کر ان سحر کار گھنٹیوں کی آوازیں سنتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ آوازیں آہ

آہستہ ڈوبنے لگیں۔ پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ یہ سکوت لمبائی تھا۔ نرملہ نے اپنی آنکھوں کے سامنے دروازے

بند ہوتے دیکھا۔ دیوار کا شگاف ختم ہو گیا تھا اور نرملہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی تاریک زندان میں

قید کر دی گئی ہو۔ وہ اس وحشت ناک اندھیرے سے گھبرا کر کوئی نیا سوال کرنے ہی والی تھی کہ وکرم سنگھ

آواز ابھری۔

”نرملہ! پیچھے مڑ کر دیکھو۔“

پھر جیسے ہی نرملہ نے گھوم کر دیکھا، عقب کی دیوار میں بھی ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔

”باہر چلو۔“ وکرم سنگھ نے کہا۔ ”ہم طلسم کدے کے پہلے مرحلے سے گزر آئے۔“

نرملہ دروازے سے باہر آئی تو اسی انداز کی راہداری اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ قدم قدم

فانوس جل رہے تھے اور قدیلیں روشن تھیں۔

”عام دنوں میں رات کے وقت اندھیرا رہتا ہے مگر آفریدی کی وجہ سے روشنی کے انقلابات

گئے ہیں۔ دن میں تمہیں یہ جگہ بھی محل کے رہائشی حصے کی طرح روشن نظر آئے گی۔ اس تہ خانے کے

اور تمہاری رہائش گاہ کے نقشے میں سرمو بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے تم اپنا دوسرا محل کہہ سکتی ہو۔

یہاں تمہاری آسائش کیلئے ہر شے مسابا کی گئی ہے۔ آفریدی کی حفاظت کیلئے تہ خانے میں میرے وفادار

جنگجو سپاہیوں کا ایک دستہ موجود ہے۔“ وکرم سنگھ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یقیناً۔“ وکرم سنگھ زیر لب مسکرایا۔ ”تین مورتیوں کی موجودگی ثابت کر رہی ہے کہ ہم تمہ خانے میں داخل ہونے والے ہیں۔“

غرض اسی طرح وکرم سنگھ نے ملا کو لے کر ساتویں تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔ پھر جب عقب کی طرف تو وہاں کوئی راہداری نظر نہیں آئی چاروں طرف درخت، درخت نظر آرہے تھے۔ اور سامنے نمازین دیوار تھی جس کی اونچائی پچاس گز کے قریب ہوگی۔

”کیا ہمارا ظلم کدے کا سفر ختم ہو گیا؟“ یہاں پہنچ کر نرملانے سوال کیا۔

”ہاں! ہم ساتوں تمہاںے خانے عبور کر چکے۔“ وکر م سنگھ نے وضاحت کی۔ ”ان تمام مرطو گزرنے کے بعد ہمارے سامنے دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک راستہ درختوں سے دوٹکی ہوئی رہ جو تمہیں بحفاظت چٹوڑکی سرحدوں سے نکال کر اجیر جانے والی راہ پر ڈال دے گی۔ اور دوسرا میں داخل ہونے کا ہے۔ آفریدی اس آہنی دیوار کے پیچھے ایک کمرے میں موجود ہے۔ دیوار کی طرف پہنچنے کیلئے ہم اس سیاہ پتھر کی مورتی کو استعمال کریں گے جس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کی بانہا ہے۔ اس بانہاںی میں سات پھونکیں مارنے کے بعد آہنی دیوار میں شکاف پیدا ہو جائے گا۔“ وکر م پلٹ کر اس مورتی کی طرف اشارہ کیا جو ساتوں میں سے خانے کی باہری دیوار پر دائیں جانب نصب تھی۔ نزلا کو اندھیرے کی وجہ سے وہ مورتی صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے وکر م سنگھ نے نیکی کی کشش کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ”تم سرنگ اور محل کے راستوں کو دن کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھ کر کسی وقت تمہیں ان دونوں چیزوں کا بھی عملی مشاہدہ کر اویا جائے گا۔ فی الوقت ہمیں رہا جائے۔“

”وہ کس طرح؟“ نرملاکاری نے طلسم کدے کے دوسرے رخ کو جاننے کی خواہش ظاہر کی۔
”یہاں سے واپسی کا طریقہ بالکل الٹا ہے۔“ وکرم سنگھ نے کہا۔ ”تمہارے بائیں ہاتھ پر۔
جیسی ایک موٹی موجود ہے جو تم نے پہلی بار دیکھی تھی سات پھونکیں مارنے کے بعد روزانہ کلچا۔
تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ آتے وقت ہر تہہ خانے کی دیوار میں مقرر تعداد کے مطابق بڑے بڑے سوراخ
ہیں۔ جب تم طلسم کدے سے باہر آنے کے بعد بائیں رخ میں سات پھونکیں مارو گی تو تعداد والے تہہ
سوراخوں میں خود بخود چھ مورتیاں ابھر آئیں گی جو اس بات کی نشاندہی کریں گی کہ تم چھ تہہ خانے
چکی ہو اور پھر چھ پھونکیں تمہیں پانچویں تہہ خانے میں پہنچا دیں گی۔ دیوار پر تمہیں جس قدر سوراخ
آئیں گی اسی تعداد میں پھونکوں کا استعمال کرنا ہو گا یہاں تک کہ تم اپنے محل میں واپس پہنچ جاؤ گی۔
تہہ خانے سے محل واپس آنے کے بعد وکرم سنگھ نے اپنی بیٹی نرملاکو مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا
تم کسی وقت اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے اس طلسم کدے میں منتقل ہو جاؤ گی۔“ میں تمہیں اس
نہیں رہنے دوں گا جس کے ایک ایک گوشے سے تمہاری بہن رانی پدمی واقف ہے۔“
”آخر آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟“ نرملاکو اپنے باپ کے لہجے میں پوشیدہ گہری بایوسی کا احساس
تھا۔

”میری یہ سوچ کسی خوف کا نتیجہ نہیں۔“ وکرم سنگھ کی گفتگو کا انداز جارحانہ تھا۔ ”میں ہمارے
 کا ایک فرد ہوں جس کے وارثوں نے آفات و حادثات کے سامنے کبھی سر نہیں جھکا یا اگر ہماری بہن
 مجھے فطری طور پر کمزور بنا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اہل چوڑ بھلیجھ کہ باؤسوم کا ہرجو کا پیسے بہن
 دیوار کو جلائے گا اگر وہ گرم ہوا اٹھارے دامن کے قریب سے بھی گزرنے کی تو پھر میری زندگی بگڑ جائے گی۔“

میں گندھاروں کی طرح گردن جھکا کر جینا نہیں چاہتا۔ میں نے تمام عمر پتھر کے دیوتاؤں سے دعا کی ہے کہ جب تک زندہ رہوں اس وقت تک لوگ مجھے میرے سر سے پہچانیں میں چوڑے کھلی کوچوں سے گزروں تو ہنسنے والے بساختہ پکارا نہیں کہ..... ”وہ آ رہا ہے سرفراز و کرم سنگھ چوہان۔ میری پہچان میرے سر سے ہے کاجنچے ہوئے قدموں سے نہیں۔ آج میں آفریدی کے خدا سے بھی کچھ دعا کرتا ہوں کہ میرے کامرواں پیر امیر اسباقی رہے میں بغیر سر کے جینا نہیں چاہتا۔“ وکرم سنگھ کالج دوم بہ دم رقت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔

”دو کون ہے جو آپ سے آپ کا سر چھیننا چاہتا ہے؟“ نرملاکماری بدستور باپ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔

”جی! اس کس کانام لوں؟ تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں۔“ وکرم سنگھ نے اس ماتمی نضالو بلے کیلئے اپنے سوگوار لہجے پر قابو پایا اور درشت آواز میں کہنے لگا۔ ”میں رام دیو کی مسلسل شکستوں کا پشیمان ہوا ہوں۔ آفریدی کے سامنے اس کی نام نہاد عظمتوں کابٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ وہ آدمی جو راج دوت کی دعاؤں سے رکی اس نے رام دیو کے آشرم کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا اور اس کے بیکنوں بدکار چیلوں کو ہلاک کر دیا۔ چوڑے کے باقی باشندے ہر طرح محفوظ رہے۔ اس واقعے نے راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیو اور تمام راجپوت سرداروں پر یہ بات ثابت کر دی کہ ہندوؤں کا پورا مذہبی نظام ایک معمولی سفیر کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ رام دیو اپنی اس شکست کو فراموش نہیں کرے گا۔ میں نے استغفار واپس لینے کیلئے یہ شرط عائد کی تھی کہ رانی پدمنی اور رام دیو سیاست سے علیحدہ رہیں گے اور راجہ رتن سنگھ نے وقتی طور پر میری یہ شرط مان بھی لی تھی مگر میں صاحبان اقتدار کے مزاج کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے مفادات کے لئے انتہائی پستیوں میں بھی گر جاتے ہیں اور جیسے ہی انہیں مجبوریوں سے نجات ملتی ہے وہ اپنی فکری خود غرضی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ اہل وفا کو صرف اس جرم پر مٹا دیا جاتا ہے کہ وہ حلیس نہیں ہوتے اور آزمائش کے وقت سچ بولتے ہیں پھر یہی سچ انہیں زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے اپنی آنکھوں سے رام دیو کو ناکام و نامراد دیکھتے ہوئے دیکھ لیا مگر جب بھی وہ خوشامدی چادور چوڑے کے حکمرانوں کی خلوت میں پہنچے گا یہ غیرت مند راجپوت اس کے قدموں پر سرسبزھا دیں گے۔“

”آخر ایسا کیوں ہوتا ہے پتاجی؟“ نرملاکماری اب بھی رو رہی تھی۔

”راجہ رتن سنگھ اور رام دیو کے درمیان پدی اور گمنانہ کا طاقتور رشتہ موجود ہے جو اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک ایک فریق اپنا راستہ نہیں بدل لیتا۔ رام دیو عیار ہے اس لئے راجہ رتن سنگھ کے ظلم و تشدد کو بھی دیکھتا تو اس کا اثیر واد کرتا ہے۔ چوڑ کے عوام کے ساتھ ہونے والی انصافیوں کی تعریف کرتا ہے اور پھر یہی ذلت آمیز خوشامد راجہ رتن سنگھ کے عشرت کدے میں اسے گہری نیند سلا دیتی ہے۔ اس نے اپنے آشرم کی بنیاد ڈال کر اہل چوڑ کو مندروں سے دور کر دیا جو کام شیو گیش اور شکر کرتے تھے وہ کام رام دیو کرے گا۔ سادہ لوح اور جاہل عوام اس کی شہدہ بازیاں دیکھ کر آشرم کی میزبانیوں پر سجدے کرنے لگے۔ مصوم لڑکیاں غریب تعلیم سیکھنے کے شوق میں رام دیو کے آشرم میں پہنچنے لگیں۔ وہ تمام دوشیزائیں جو ایک بار آشرم میں داخل ہو گئیں پھر وہ کبھی سلامتی کے ساتھ اپنے گھر نہیں پہنچیں۔ آشرم اور راجہ رتن سنگھ کے محض کدے کے درمیان ایک خفیہ سرنگ موجود ہے۔ یہ ناگفتہ کلیاں اسی سرنگ کے ذریعے راجہ رتن سنگھ کی مملکت خاص میں لے جاتی جاتی ہیں اور پھر ظلم دھوس کی گرم ہوائیں ان کلیوں کو جھلسا کر رکھ دیتی

ہیں۔ رام دیو تو مہ کی بیٹیوں کا تاجر ہے اور اس تجارت نے اسے مہا مہا دیا ہے۔
 ”رانی پدمنی“ راجپوت سمرات کے اس گھٹاؤ نے نعل پر کوئی اعتراض نہیں کرتیں؟“ نرملہ نے
 ہوئی آواز میں کہا۔

”اس کیلئے اس کا شوق آرائش ہی کافی ہے۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ”اس کا فہرہ
 برقرار رہے۔ اگر چوڑی ایک ایک دو شیزہ کا دامن بھی چاک ہو جائے تو پدمنی کے خواب ناز میں کو
 واقع نہیں ہوگا۔ وہ اسی طرح سوتی رہے گی کہ راج رتن سنگھ اس کا غلام ہے۔“
 ”مگر ان راجپوت سرداروں کو کیا ہو گیا ہے۔“ اب نرملہ کی آواز بھی شعلہ ریز ہو گئی تھی۔
 ”رانی پدمنی کی توہین پر سلطان علاء الدین خلجی کو قتل کرنے کی قسم کھانے والوں کو اپنی قوم کی
 لباس اور بے آپکل بیٹیاں نظر نہیں آئیں۔“

”نہیں! کسی کو کچھ نظر نہیں آئے گا کہ یہ سب کے سب رام دیو کے کاروبار ہوس میں ہوا
 حصے دار ہیں۔ چوڑے ناموس کی شراب قطرہ قطرہ ہر اس شخص کے ہونٹوں تک پہنچتی ہے جو اقتدار میں
 ہے۔“ غصے کی آگ سے وکرم سنگھ کا چہرہ بھی جل رہا تھا اور ہونٹ بھی..... ”مائی بھان متی نے
 مانگتا تھا تو طوائف زادی کھلائی۔ آندہ پال نے ہونٹوں کو جنبش دی تو ان کی زبان کاٹ دی گئی۔ اب
 ہوں تو میری سزا بھی سنیا سی کے انجام سے مختلف نہیں ہوگی۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ کچھ دیر کیلئے
 ہو گیا اور اپنے قدموں سے لپٹی ہوئی نرملہ کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بیٹی! تمہیں اس المناک حادثے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ تمہارا باپ اس فریب کار دنیا سے کسی بڑے
 رخصت ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد یہ درندے اپنے خونیں پنجوں کے ساتھ تمہاری
 جھپٹیں۔ ممکن ہے کہ راج رتن سنگھ اور رانی پدمنی قزاق داری کے سبب تمہیں زندہ رہنے کی رعایت
 دیں۔ مگر رام دیو کے کالے قانون میں معافی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ لو مزوں اور گیدڑوں کی طرح
 چلے گا اور انسانی جسم کے ساتھ بھینڑوں سے بدتر سلوک روا رکھے گا۔.....“

”مگر اس سے پہلے تو میں خود کو آگ کے حوالے کر سکتی ہوں۔“ نرملہ کی اداسی ختم ہو گئی تھی
 نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”یہ تو آخری صورت ہے۔“ وکرم سنگھ نے نرملہ کے خیالات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔
 عزت و وقار محفوظ رہ سکتے ہیں تو انسان کو زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں تمہیں ایک پر
 آبرو و مندانہ زندگی دے کر اس بے وفادار سے منہ موڑنا چاہتا ہوں۔ اور تمہیں وہ زندگی اس ظلم کے
 اندر ملے گی۔ وہاں زندگی کا ایک سچا سفیر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر
 سے موت مل جائے گی۔ اگر وہ بیٹائی سے محروم ہو گیا تو تم اس کا سہارا بنو گی۔ آفریدی میرے دروازے
 اندھا ہوا ہے، اس لئے اس کا علاج بھی مجھ پر فرض ہے۔ جب تک مجھے سانسوں کا سرمایہ حاصل
 وقت تک میں خود اس کی نگہداشت کر رہا ہوں۔ اور جب فرشتہ اجل میری سانسیں غصب کرے
 اس فرض کو اس شخص کی بیٹی تکمیل تک پہنچائے گی جو تمام عمر اپنے خیالات و نظریات کی آگ میں
 رہا۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ دشمنوں پر غالب آجائیں۔“ نرملہ نے پرامید لہجے میں کہا۔
 ”ایک جسم ناتواں اور لاٹھوں پتھر؟ تمہیں اندازہ ہے نرملہ کہ کتنے زخم اس شخص کا مقدر بنے
 نہیں میری بیٹی! خدا تمہیں وہ منظر کبھی نہ دکھائے۔ میں بہت دن جی لیا۔ اپنے باقی دن تمہارے“

نروالوں کے نام لکھ رہا ہوں جو بچ کی امانت کا بارگراں اٹھائے ہوئے چوڑی طرف آئیں گے۔“

☆.....☆.....☆

چندر سنگھ نصف شب سے پہلے محل شاہ کے مندر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مائی بھان متی سوچکی ہوں
 رجب چندر سنگھ نے ایک داسی سے پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ مائی جاگ رہی ہیں مگر وہ کسی سے ملاقات
 کر نہیں
 ”تم مائی کے حضور عرض کرو کہ ان کے داس مہامنتری وکرم سنگھ کا ملازم شرفیہ بیاریانی چاہتا ہے۔“
 سنگھ نے اس قدر عاجزانہ لہجے میں کہا کہ داسی حیران رہ گئی۔ یہ عزت و احترام تو خود راج رتن سنگھ کو بھی
 ل نہیں تھا۔

داسی نے چندر سنگھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے کمرے کے اندر چلی گئی جہاں مائی
 متی آنکھیں بند کئے اپنے گیان میں غرق تھی۔

”مائی! میری یہ جرات نہیں تھی کہ میں اس وقت آپ کی خلوت میں داخل بھی ہو سکوں مگر آپ کے
 وکرم سنگھ کا خادم ایک خاص پیغام کے ساتھ دروازے پر سر جھکا کر کھڑا ہے۔“ داسی کی آواز بھی
 بدی تھی اور جسم بھی۔

”اے آنکھیں کھل کر لرزتی ہوئی داسی کو دیکھا اور پھر بڑے فکر انگیز لہجے میں کہا.....“ اس وقت
 رات کے وقت، مہامنتری پر کیا پتا پڑی ہے کہ اس نے سورج نکلنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اسے جلدی
 ”مائی! یہ بے قرار نظر آرہی تھی۔“

بندر سنگھ نے تانہ داخل ہوا اور مائی کے قدموں پر سر رکھنے کیلئے زمین بوس ہونے لگا۔

”کمرے رہو کہ یہ سجدہ میرے یہاں حرام ہے۔ رتن سنگھ کے آداب اسی کے دربار میں دفن
 ”مائی بھان متی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور پھر فوراً ہی پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔“ سب کھٹل
 بہت (تو ہے۔ وکرم سنگھ نے تمہیں آدھی رات کو یہاں کیوں بھیجا ہے؟“

”رانی پدمنی کے حکم پر راج رتن دوت کو اس قدر زود کوکب کیا گیا ہے کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ بہت دیر بعد
 ہوش آیا تو رات دیدنے یہ راز فاش کیا کہ دلی کا سفیر اپنی بیٹائی سے محروم ہو چکا ہے۔ خود مہامنتری
 ن آفریدی سے دریافت کیا مگر وہ یہ کہہ کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“
 ”مگر کہا ہے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔“ اب مہامنتری آپ کے حکم کے منتظر ہیں
 ”راج رتن پر محروم نہیں کہ وہ راج رتن سنگھ اور رام دیو کا غلام ہے۔ مہامنتری کے خیال میں وہ آفریدی
 کی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”مہان متی بہت دیر تک آنکھیں بند کئے کسی مجتہد کی مانند ساکت بیٹھتی رہی۔ چندر سنگھ امید وہیم کی
 میں اس کی عورت کو دیکھ رہا تھا جس کے ہونٹوں کی جنبش پر ایک بہت بڑے فیصلے کا انحصار تھا۔ اور
 ہمدردی سے لب کشائی کی تو چندر سنگھ کے چہرے پر خوشی کے چراغ روشن ہو گئے۔ مائی، وکرم سنگھ
 میں ہوا ہے۔ راج رتن نے میں کہہ رہی تھی۔“ راج رتن بد جھوٹ بولتا ہے۔ آفریدی کی بیٹائی میں کوئی خلل
 نہ گ۔ یہ دقتی تکلیف ہے جو بہت جلد زائل ہو جائے گی۔ آفریدی کے مقدر میں کسی بہت پرست کے
 نہ لاک ہوا نہیں لکھا ہے۔ جب آسمانوں کا فیصلہ کچھ اور ہے تو زمین والے پریشان کیوں ہیں؟
 ”مگر کچھ ہوا ہے..... اور جو آنے والے ہیں وہ آکر رہیں گے..... اور جو کچھ لکھ دیا گیا ہے

اسے مٹانے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ ”یہ کہہ کر مائی بھان متی خاموش ہو گئی۔
جواب مل چکا تھا۔ اس لئے چندر سنگھ نے اوب سے سر جھکا یا اور اگلے قدموں واپس جانے
دروازے کے قریب پہنچا تو مائی بھان متی نے پکار کر کہا۔ ”وکر م سنگھ سے کہنا وقت بہت کم ہے۔
بربادی کے درمیان مشورے ہو رہے ہیں۔ ”قہر کی لہر“ اٹھنے ہی والی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ جا
(نجات) حاصل کر لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لمحے کسی طوفان کی طرح گزر جائیں اور وہ کفر
رہ جائے، اتنا کہہ کر مائی نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور چندر سنگھ، ہمل شاہ کے مندر سے نکل
کی پشت پر سوار ہو گیا۔

پھر جب وہ رات کے پچھلے پہر مہمانتری کے محل پہنچا تو وکر م سنگھ شدید بے چینی کے عالم میں
نرملہ کماری اور اس نظروں سے اس مشفق و مہربان باپ کو دیکھ رہی تھی جس کا سفید مہیا تیار
میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کبھی ڈوب جانے کا گمان ہوتا تھا اور کبھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ آ
ہو جائے گا۔

”کیا خبر لائے ہو چندر سنگھ؟“ مہمانتری نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

چندر سنگھ نے اپنے آقا کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے بڑی روانی سے ایک ایک بات کہہ ڈالی۔
بینائی محفوظ رہنے کی خبر سن کر مہمانتری، چندر سنگھ سے لپٹ گیا۔ یہ فرط مسرت اور دار فتی
مظاہرہ تھا۔ ”چندر سنگھ! تم اہل دفا کے سر بلند خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور اہل دفا کی ہی جا
لے کر آتے ہیں۔“

پھر جب چندر سنگھ نے اسے مائی بھان متی کا آخری پیغام پہنچایا تو وکر م سنگھ سنانے میں آہ
دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اپنے لمبے بالوں کو اس طرح جکڑ لیا جیسے وہ شدید ذہنی کشش کا شکار
”ہاں! میں جانتا ہوں کہ وقت بہت کم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر وقت گزر گیا
رائیگاں جائے گی۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“ وکر م سنگھ خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا
وقت کو پکڑ لوں گا۔ اگر میرا جذبہ سچا ہے تو میرے انتظار میں چند ساعتوں کے لئے وقت کار
جائے گی۔“

”آقا یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟“ مہمانتری کی وحشت دیکھ کر چندر سنگھ لرز اٹھا۔
”کچھ نہیں! تم جاکر سو جاؤ۔“ وکر م سنگھ نے فوراً ہی اپنی بیجا کیفیت پر قابو پاتے ہوئے
تم سے بات کروں گا۔“

چندر سنگھ تجھے ہوئے چہرے اور تجھے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

چندر سنگھ کے جاتے ہی وکر م سنگھ مڑا اور نرملہ کی طرف دیکھنے لگا۔
باپ کی یہ حالت دیکھ کر نرملہ خاموش نہ رہ سکی۔ ”مائی کے اس پیغام کا کیا مطلب ہے؟
میں ارتعاش اور آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔

”یہی کہ چوتھ کے مقدر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“ وکر م سنگھ نے نرملہ کی خاطر مسکرائے کی کو
ایک ایسا بیہوشی کے پیچھے ہزاروں غم نہاں تھے۔ ”موت اور بربادی کے مشوروں کا
ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ مل کر چوتھ پر حملے کا منصوبہ
ہے۔“ قہر کی لہر“ اٹھنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سلطان کی فوجیں دلی سے کوچ کرنے لگی

☆ ☆ ☆
دوسرے دن مہمانتری نے انعام و اکرام دے کر راج وید کو رخصت کر دیا اور خود اس کمرے کے
دروازے پر آیا جہاں پنجیس مسلح سپاہی سپردہ رہے تھے۔ وکر م سنگھ کو دیکھ کر وہ تمام سپاہی احتراماً خم
ہوئے مہمانتری ان کے اوب و احترام کا جواب دیتا ہوا بے پاؤں کمرے میں اس طرح داخل ہوا کہ ہلکی سی
آہٹ تک نہیں ہو رہی تھی۔ وکر م سنگھ نے ایک بار پھر وہی جگر شکاف منظر دیکھا۔ علی عامر آفریدی سفید
چٹوں میں اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے کسی شخص نے کفن اوڑھ لیا ہو۔ وکر م سنگھ تڑپ کر رہ گیا۔

”اے عظیم نوجوان! تجھے کس جرم بے گناہی پر سزا دی جا رہی ہے!“ وکر م سنگھ نے دل ہی دل میں
کہا اور آفریدی کی طرف دھڑکتا چلا گیا۔ قریب پہنچ کر وکر م سنگھ آفریدی کے چہرے پر جھک گیا۔ شاہی سفیر کی
دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے ہی وکر م سنگھ اس قدر قریب ہوا آفریدی نے چونک کر کہا۔
”کون! راج وید؟“ آفریدی کی آواز میں وہی استقامت تھی۔

”راج وید نہیں بیٹے! یہ میں ہوں مہمانتری وکر م سنگھ۔“ شدت جذبات سے وکر م سنگھ کی آواز لرز
رہی تھی۔

”آپ نے کیوں زحمت کی؟“ علی عامر آفریدی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ایسی
مسکراہٹ جو اپنے ہر زاویے سے زخمی اور ٹکنتہ تھی۔ ”آپ تو صاحبانِ اقتدار میں سے ہیں۔ آپ کو اپنے
مددے کا نظارہ کھنا چاہئے تھا۔ میری مزاج پر سی کے لئے رانی پدمی اور راجہ رتن سنگھ کی فوج کا کوئی سپاہی
یا ان کا کوئی خدمت گار ہی کافی تھا۔ ہم جس درجے کے لوگ ہیں، اسی پیمانے پر ہماری تواضع بھی ہونا
چاہئے۔ براہ کرم آپ تشریف لے جائیں میرے لئے راج وید یا کسی ملازم کی موجودگی بہت ہے اور اس کی
بھی کیا ضرورت ہے۔ جب آدابِ سفارت ہی قتل کر دیئے گئے تو پھر شاہی سفیر جئے یا مرے۔ اس سے کوئی
فرق نہیں پڑتا۔“

وکر م سنگھ، آفریدی کے طرزِ کلام پر حیرت زدہ رہ گیا۔ موت کے منہ میں بھی وہی تیور تھے۔ بستر مرگ پر
بمبئی سے نیازی تھی اور دستِ قاتل کو شہرِ رگ کے قریب دیکھ کر بھی زندگی کی وہی اداسی، سرفروشانہ اداجو
کی ایک کاہو جانے کے بعد دوسرے کی غلامی تسلیم نہیں کرتی۔

”نہیں بیٹے! تم معمولی انسان نہیں ہو۔“ وکر م سنگھ نے آہستہ سے آفریدی کے زخمی سر پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا۔ ”تم تھاک پورا عہد سیاست ہو، ہندوستان کی تاریخ کا ایک مکمل باب ہو، علاء الدین خلجی کا
عسکری ذات ہو، اولاد دلی کے سلطان کا ایک زندہ اور متحرک حکم ہو۔“ وکر م سنگھ نے آفریدی کی دجوئی
کستہ ہوئے کہا۔

”سلطان کا وہی عسکر ذات جسے اندھیروں کے حوالے کر دیا گیا۔ علاء الدین خلجی کا وہی حکم
جس کی بجائیں ہوا میں اڑادی گئیں اور ایک ایک حرفِ جلال کو پیروں سے سلا گیا۔ اگر میں انتہائی متوجہ تھا تو
خود رانی پر تھی اور راجہ رتن سنگھ کو میری عیادت کیلئے آنا چاہئے تھا۔“ گفتگو کرتے وقت آفریدی کے

چہرے پر کرب کی علامت نمایاں ہو جاتی تھی اور یہ علامت ان زخموں کی سوزش کا نتیجہ بھی ہو پورے جسم پر بچے ہوئے تھے۔

”قابل کسی کی عیادت کو نہیں آتے۔“ سوزدروں سے وکرم سنگھ کا لہجہ بھی جل اٹھا تھا۔

”پھر مجھے اب تک ہلاک کیوں نہیں کیا گیا؟ ایک بے دست و پا سفیر اور ہزاروں مسلح

شرر فٹاں تلواریں، زہریں بیجھے ہوئے تیر، فولادی نیزے۔ کیا میرے قتل کیلئے اتنا سا زور سامان نا کافی

رانی پد منی چاہتی ہیں کہ میں خود اپنی گردن کاٹ کر ان کے قدموں میں رکھ دوں؟ ایک ماہ ہو گیا ہے میں تو روزانہ ہی اپنی موت سے یہ سوال کرتا ہوں، اے مرگ ناگماں تجھے کیا انتظار

خلش دل رقیق آگ کی طرح آفریدی کے ہونٹوں سے بہہ رہی تھی۔

وکرم سنگھ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”آفریدی کیامت مبرا

سکتے ہو۔“

”میں اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔“ آفریدی ہر شے سے بیزار نظر آ رہا تھا۔

”بیٹے! اب اس تلخ گفتگو کا وقت نہیں رہا۔ جو کچھ گزر گئی اسے فراموش کر دو۔“ وکرم سنگھ

آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ”مجھے صرف اتنا یاد کہ تمہاری قوت بیانی رائل ہو گئی ہے یا تم اپنی

سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟“

”آپ ان دونوں حالتوں میں کس کو پسند کریں گے؟“ آفریدی کے لمحے کی تلخی برقرار تھی۔

”آفریدی تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ وکرم سنگھ کی آواز سے اس

کا درد جھلک رہا تھا۔ ”یہ میری زندگی کی کیسی عجیب مشکل ہے کہ میں تمہیں اپنی زبان نہیں سمجھا

رانی پد منی کی قید میں نہیں، میرے مکان کے ایک محفوظ ترین کمرے میں ہو۔ تم نہیں جانے کہ

یہاں تک کس طرح لایا ہوں؟“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے آفریدی کو تمام واقعات تفصیل سے سنا دیے۔

آفریدی کا پورا چہرہ بیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس کے چہرے سے اس کے دلی تاثرات ظاہر ہو

بے نور آنکھوں میں کئی رنگ ابھر کر ڈوبے اور پتلیاں کئی بار کانپ کر رہ گئیں۔ پھر ایک طویل وقفہ

کے بعد آفریدی، وکرم سنگھ سے مخاطب ہوا۔

”آخر آپ کو میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“ آفریدی نے پہلی بار واضح انداز میں

سے ایک نازک سوال کیا تھا۔ ”میں اس شخص کا سفیر ہوں جو عنقریب آپ کے وطن کی بنیادیں

پھینکے گا۔ آپ جن دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ انہیں محض پتھر کے کھلونے سمجھتا ہے۔ وہ سہلہ ہے

کے سروں کو اپنے قدموں پر چھکادینا چاہتا ہے۔ اس کا تمدن الگ ہے اور آپ کی تہذیب و ثقافت

سیاست کی بسات پر وہ آپ کا دشمن ہے اور آپ اس کے خون کے پیاسے۔ پھر اسی کے نام

ہمدردیاں کیوں؟ مہمانسز؟ میں آج تک اس راز کو سمجھنے سے عاجز رہا کہ رانی پد منی مجھے قتل کر

ہیں اور آپ اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال کر میری جان بچانا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ نوازشات انسانی

کے خلاف ہیں۔ مجھے بتائیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟“

”میں نے سوچا تھا کہ کسی فرصت کے لمحے میں تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا مگر اب

ہوتا ہے کہ وقت میری گرفت سے نکل چکا ہے۔“ وکرم سنگھ بہت زیادہ افسردہ نظر آ رہا تھا۔

تم اس شخص کے سفیر ہو جو عنقریب ہماری زمین پر قبر بن کر رہنے والا ہے مگر پھر بھی تم مجھے عزیز ہو

اور یہ رشتہ بالآخر سنیاں آئندہ پال تک جا بچتا ہے۔ آئندہ پال میرے روحانی رہنما تھے اور تم ان کے روحانی

اس تعلق سے تمہارے اور میرے درمیان بھی ایک انوٹ رشتہ قائم ہوتا ہے میں اس رشتے کو

فرزند..... اس تعلق سے تمہارے اور میرے درمیان بھی ایک انوٹ رشتہ قائم ہوتا ہے میں اس رشتے کو

میں طرح منقطع ہو جانے دوں۔ کیا کسی محبت کرنے والے غیرت مند باپ نے اپنے بیٹے کو مسائل کی آگ

میں جلا چھوڑ کر اپنا دامن بچالیا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آج چوڑی کی تاریخ بھی اسی مقدس روایت کو

دہرا رہی ہے۔“ وکرم سنگھ کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں مگر آفریدی ان آنسوؤں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ”کیا

اب بھی تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ کیا اب بھی تم اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہو کہ میں اپنی جان پر

کھیل کر تمہاری زندگی کیوں بچانا چاہتا ہوں؟“

آفریدی کچھ دیر تک خانے کے عالم میں کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر یہ آنکھیں چند لمحوں کیلئے بند

ہوئیں اور اس کے رخساروں پر جملے ہوئے اشکوں کی دو شمعیں روشن ہو گئیں۔ زبان کا استعمال تو سب

کرتے ہیں مگر درحقیقت آنکھیں ہی انسانی جذلوں کی سچی ترجمان ہوتی ہیں۔

”میں سمجھ گیا۔“ آفریدی کی آواز کانپ رہی تھی۔

”آج اندازہ ہوا کہ چھوڑنے کی ہستی میں غنیمت و گل کا سینہ رکھنے والے کیسے کیسے لوگ زندہ ہیں۔ سنیاں

آئندہ پال عظیم انسان تھے۔ ان کی گواہی بہت بڑی گواہی تھی۔ زبان کٹ جانے کے بعد حق کی شہادت دینا یہ

انہی جیسے حوصلہ مند انسان کا کام تھا۔ ہم تو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے مسلمان ہیں۔ مگر وہ

فصل جسے چوڑے جھاڑوں نے جلادیا، ہم سے بڑا مسلمان تھا۔ سنیاں جانتے تھے کہ ان کے اقرار کا انجام

لڑہ خیز موت ہے مگر پھر بھی انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ اس طرح کہ گئے کہ آنے والے زمانے صدیوں تک ان

کی آواز سننے رہیں گے۔ سنیاں کے بعد آپ بھی ایک بڑے انسان ہیں کہ روشنی کو بچانے کیلئے خود اندھیروں

کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

علی عامر آفریدی ابھی اپنا بیان جاری رکھتا لیکن وکرم سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بیٹے! ان

باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری زندگی کے چند دن بھی بعافیت گزر جائیں۔ موت مجھ سے

انتہے قریب ہے کہ میں اس کے قدموں کی چاپ مسلسل سن رہا ہوں۔ چوڑے جابر و سفاک انسان زہر کا

پالنے میرے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ میں اسے پینے سے پیام انکار کر رہا ہوں..... مگر کب تک! وہ

خدا میں بہت زیادہ ہیں۔ کسی بھی لمحے زہر جبرائیل میرے جسم میں اتار دیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ میرے

ہونٹ نیکیوں ہو کر پتھر جابائیں اور دل و جگر کٹ کر خون بن جائیں، میں بھی اسی پیغام پر گواہی دینا چاہتا ہوں

جسے سنیاں آئندہ پال نے سنا اور جس کی تصدیق کیلئے اپنی جان گنوا دی۔“

”مبارک ہو مہمانسز! آپ کو آپ کی زندگی کا یہ سب سے خوشگوار سفر مبارک ہو۔ وہ سفر جو

میں غلوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر انسانی زندگی کو ہمیشہ کیلئے سرخو کر جاتا ہے۔ میں اس کا نواں بھری

مبارک ہو آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہی خاں زار حیات ایک دن مٹتے ہوئے پھولوں کی رہ گزر پر ختم

ہو جائے گا۔ آپ کی اس اہم پائی کو آفریدی کا سلام عقیدت جو اس سفر میں آپ کا مقدر بننے والی ہے۔

آپوں سے بننے والے اس پانی کو بھی میری محبتوں کا سلام جو اپنی قدر و قیمت میں دریاے یوچ اور گبیہری

کے پانی سے زیادہ حیات بخش اور مقدس ہے۔“

وکرم سنگھ کی آنکھوں سے

دونوں ہاتھ رکھ رکھائے۔

”میں ایک خوش نصیب انسان ہوں جسے تمہارے آنے سے روشنی کا سراغ ملا مگر

میں انکسار کی تسکری آنکھوں کا..... شہی کا کیا حال ہے؟ کل رات تم کچھ دیر کیلئے ہوش میں آئے تھے اور تم

نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”نظر تو مجھے اس وقت بھی نہیں آ رہا ہے لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے دھندلے سے سائے کر رہا ہوں۔“ آفریدی نے عجیبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مائی بھان متی ٹھیک کہتی ہیں۔ تمہاری بیٹائی آہستہ آہستہ بحال ہو جائے گی۔“ وکر دم مچھا بہت زیادہ پرجوش ہو گیا تھا۔ ”راج وید جھوٹ بولتا تھا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔“ مہمانتزی نے آفریدی سے مائی بھان متی کا غائبانہ تعارف کرا یا اور اسے پوری صورت حال سمجھائی۔ ”کہا تھا کہ تمہاری بیٹائی آہستہ آہستہ لوٹ آئے گی اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم صحت یابی کی طرف بڑھ رہے ہو۔“

”مجھے اپنی آنکھوں کا کوئی غم نہیں ہے ایک دن تو ان چراغوں کو بجھنا ہی ہے۔“ آفریدہ سوگوارانہ تھا۔ میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا مگر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ کسی طرح مجھے ہاں پہنچا دیجئے۔ میں اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ روزانہ میں خواب میں بیچہ دیکھتا ہوں پتہ نہیں کہ وہ نقاب پوش کون ہے جو میری ماں اور بہن کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ آفریدہ نے جیسے جیسو تشدد کی انتہا بھی سنا ترنہ کہ کسی تھی وہ اپنے خونریز رشتوں کو یاد کر کے رونے لگا تھا۔

”بیٹا! اگر میں صورتِ حال پر قادر ہوتا تو تمہیں بہت پہلے اس عذابوں کے جنگل سے نجات دلا لیکن کسی سے کیا کموں؟ تصور میں بھی آسکتی نہیں مجبوریاں میری۔ یہی خدا کا بڑا کرم ہے کہ ہم درندوں کے منہ سے کھینچ کر یہاں تک لے آیا۔“ دو کرم سنگھ اپنی بے چارگی پر کفِ افسوس مل، ”پھر تم چلنے پھرنے کے قابل بھی تو نہیں ہو۔ ان بے نور آنکھوں کے ساتھ زخمی جسم کو لے کر کہا گئے۔ ہر قدم پر رانیِ پد منی کے خوانِ غوار کتے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں میں کیا ہو رہا ہے؟ اگرچہ رتن سنگھ کو بڑی مشکل سے یہ نکتہ سمجھا یا کہ تمہارے قتل کے بعد علاء الدین

کے قہر میں اور اضافہ ہو جائے گا اگر وہ فوری طور پر سلطان کے حملے کے تصور سے خوفزدہ نہ ہو جائے۔ پناہ گاہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک! میں اپنی ابتدائی کوششوں میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ خطرات ہمارے سروں پر بھوکے گدھوں کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی کے غلام ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک رات میں اس پر کیا گزری؟ وہ میرے دشمنوں پر عمل کر رہا ہے؛ اور پدمنی اسے ورغلا کر تمہاری جان کا دشمن بنا چکے ہیں۔ ”وکرم سنگھ اپنے حریفوں کی سیاحی کا آفریدی کے سامنے بے نقاب کر رہا تھا۔ ”تم مطمئن رہو! اگر راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور راجہ فریب میں آجھی گیا تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں اپنی جان دے کر بھی سنیاسی آئندہ بالکل حفاظت کروں گا۔ فی الوقت میرا دربار میں جانا بہت ضروری ہے تاکہ کوئی دشمن مہرہ حرکت کرے تو کی چال سے باخبر رہوں۔ تم شام تک میرا انتظار کرنا۔ میں رات میں کسی وقت تمہارے پاس آؤ پھر ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارا اگلا قدم کس سمت میں اٹھے گا۔ ”یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے آفریدی ہاتھ بچھڑا دیے اور اپنے وفادار خدمت گاروں کو سخت نگرانی کا حکم دے کر دوبار چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

دربار میں ایک عجب سناٹا تھا۔ تمام حاضرین کے چروں پر کھنچاؤ اور غصے کی سی کیفیت و کرم سنگھ کے پیچھے ہی چھوٹے وزراء اور راجپوت سردار مہمانتزی کے احترام میں خلاف معمول اپنے پرکھڑے نہیں ہوئے۔ یہ ایک باغیانہ رسم تھی جسے وکرم سنگھ نے نوشتہ دیوار کی طرح ایک نظر

[illegible]

”سہرا! میں آپ کے دور حکومت میں بے شمار ناپسندیدہ مناظر دیکھے ہیں مگر اقتدار کی یہ اوج مجھے سخت پہنچے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چھوٹے لوگ میرے ساتھ اس طرح پیش آئیں گے۔ جیسے ان کی رعایا ہوں اور وہ میرے آقا۔“

”ہم مجرم ہیں وکر مگر سگھ۔“ رتن سگھ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا..... ”ایک شخص کو منانے کے لئے جیل پر سے چوڑا کاغذ نہیں خریداجاسکتا۔ یہ سرپھرے بے عقل لوگ میری ذہانت و تدبیر کو شرمناک شکل میں ظاہر کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب یہی چاہتے ہیں کہ راج دوت کا سر کاٹ کر دلی بھیج دیا جائے۔ علماء الدین کے خط کا یہی مناسب ترین جواب ہے۔“

”آپ کے پسندیدہ میثروں کو اس حرکت کا رد عمل معلوم ہے؟“ وکرم سنگھ نے سوال کیا۔
 ”یہ بیمار اور غیر متنازعہ فیصلہ ہے۔“ رتن سنگھ کا لہجہ تلخ ہو جا رہا تھا۔ ”وہ لوگ صرف
 مہربانیت ہیں اور موت کو کھیل سمجھنے والے کسی کے رد عمل کا انتظار نہیں کرتے۔“ راجپوت سردار
 رتن سنگھ کے اعصاب پر شراب کے نشے کی طرح مسلط ہو گئے تھے۔

”مستقبل کاموں اس حماقت کو شجاعت کے نام سے منسوب نہیں کرے گا۔“ وکرم سنگھ نے بھی ملے تعلقات ختم کر دیئے تھے اور اب وہ ایک باغی کے انداز میں بول رہا تھا..... ”آئندہ جب میواڑ کے راجپوتوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو وہ وقت کا بے رحم ہاتھ کسی رعایت کے بغیر روز و شب کے اوراق پر غور کر دے گا کہ یہ اندھی قوم بیانیاتی نہ ہونے کے سبب عذابوں کی دلدل میں کود گئی اور پھر یہاں تک پہنچ گیا کہ اس نے سڑی ہوئی مٹی کا کفن اوڑھ لیا۔ راجپوت سمراٹ! آپ کے حاشیہ بردار وقت کے اکبر گردش کو روک نہیں سکتے۔ وہ صحنۂ ہستی پر یہ عبارت بھی لکھ جائے گا کہ اجتماعوں کے ایک بڑے گروہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گھاگھوٹ لیا۔ پھر وہ نادان اس خود کشی کو مردانگی کا نام دے کر آنے والی نسلوں کیلئے غلامی کی میراث چھوڑ گئے۔“ وکرم سنگھ نے اتمامِ حجت کیلئے اپنے دل میں کوئی غبار باقی نہیں رہنے دیا۔ جتوں کے اس ذہین ترین شخص نے جو کچھ سوچا اسے زبان برلے آیا۔

”رتن سنگھ نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا اور دو کمرنگھ جیسے

”ہاں! تم راجپوتوں کے لباس شجاعت پر ایک گندی چھینٹ ہو۔“ رتن سنگھ نے عالم غفل میں اس

رشتے کے احترام کو بھی پامال کر ڈالا جو رانی پد منی کے تعلق سے اس کے اور وکرم سنگھ کے درمیان تھیں ہر وقت سلطان کے خوف کا عفریت ڈراتا رہتا ہے اور تم اپنی اسی دہشت کو راجپوتوں کے دل میں بھی مسلط کرنا چاہتے ہو۔

وکرم سنگھ کوئی جواب نہ دے سکا تو برداشت حد سے گزری تو اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔

”تم ریاست کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے بھی غدار ہو۔“ راجہ رتن سنگھ کی آواز اس قدر تیز تھی کہ اس کی گفتگو پر چیخنے کا گمان ہونے لگا تھا۔ ”تم آج تک اس پانی آئندہ پال کو اپنا درویش مانتے رہے جو ہمارا معتب تھا۔ تمہاری غدار یوں کا سلسلہ ہمیں ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ تم اس جاو گرنی کے حضور بھی اپنا سر جھکاتے رہے جو جسے چوڑکی ساری پر جا ایک طوائف زادی کے نام سے ہے۔ تمہارا ایک جرم یہ بھی ہے کہ تم نے ریاست کی مقدس ترین ہستی مہاراج رام دیو کی شان میں نا بجا ادا کئے۔ ہمیں ان کے خلاف درغلا یا اور چوڑکی دھرتی کو ان کے سائے کرم سے دور کرنے کی کوشش کی یہ سب کچھ اس لئے کرتے رہے کہ تمہیں اس ناپاک دنیا سے محبت تھی۔ آئندہ پال نے ہمارا ہر مسلمانوں کا مذہب اختیار کیا تو تم بھی درپردہ اسی کی گناہ گار نہ روش پر چل نکلے۔ بھگوان، مہاراجا کی عمر دراز کرے۔ کل رات ان کے اپارگیان (غیر محدود علم) نے ہماری آنکھوں پر دے، تمام پردے ہٹا دیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم راج دوت کو کیوں بچانا چاہتے ہو؟ اس بدکار دنیا راج دوت کو اپنا بیٹا بنا یا تھا۔ اس لئے تم بھی آفریدی کا مذہب اختیار کر کے اسے پناہ دینا چاہتے ہو۔“ رتن سنگھ کو اپنی زبان پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ وکرم سنگھ سے ایک غلام کی طرح سلوک کر رہا تھا۔ ”راج دوت کو بچانے کیلئے تم نے سلطان کے قہر و غضب کا ڈھونگ چلایا اور ہم بھی تمہاری باتوں میں رہ گئے۔ مگر مہاراج جیسے عظیم گمانی کے علم کو کس طرح بھٹاؤ گے جس کی روشن آنکھوں سے چوٹی بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ مہاراج نے کل رات ہمیں اور مہارانی کو کھلی آنکھوں سے سہ دیکھا دیا۔ علاء الدین خلجی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو گا۔ وہ مہاراج راجپوتوں پر کبھی غلبہ نہیں کر سکا۔ ہم کچھ دیر کیلئے سنسکرت (مصیبت) میں ضرور آئے تھے لیکن مہاراج کی فکری نے بچالیا۔ ہم نے دیکھا کہ مہاراج کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور سلطان کے لشکر میں ہر طرف آگ اٹھی۔ مسلمان سپاہیوں کے جسم جلنے لگے اور وہ جس طرف سے آئے تھے اسی طرف اپنی ناکاویں کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔“ یہ کہہ کر رتن سنگھ خاموش ہو گیا اور وکرم سنگھ کو ان نظروں سے دیکھنے میں سارے عالم کی نفرت بھری ہوئی تھی۔

وکرم سنگھ کیا جواب دیتا؟ فریب کا رام دیو نے اپنی کسی شیعہ بازی سے پوری بساط الہ دی تھی۔ ”جواب دے اے غدار مذہب دوطن! تو نے ایسا کیوں کیا؟“ راجہ رتن سنگھ کی جگہ کوئی اب میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ”مہاراج نے تو میرے دل کا یہ حال بھی جان لیا ہے کہ تو راج دوت کو چوڑکی راز دے کر دلی واپس بھیجنا چاہتا تھا۔ اس طرح تو اپنی ماتر بھومی (مادروطن) کو سلطان کے فروخت کر دیتا اور پھر تیری حصول اقتدار کی ناپاک خواہش تسکین پاتا ہے۔“

”بس! سر اٹ بہت ہو چکا۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ ادب و احترام کی سطح سے زیادہ بلند ہو گیا تھا۔ رات میں اس مداری پر تمام راز فاش ہو گئے؟ میری غدار ی بھی عیاں ہو گئی اور سلطان کا لشکر بھی راکھ ہو گیا۔ میری جاسوزیوں اور رفاقتوں کا اس قدر بھیاںک صلہ؟ میں وکرم سنگھ وطن فروش جو

ہاں وفاق رہتا؟ نسل چوہان اپنی زمین کا تاجر؟ اور رام دیو آسمان سے اتر آیا ہوا تار؟ اے بے وفاز مانے!

تو مجھے کس منزل پر لا کر چھوڑ دیا؟“

”زمانے کا شکوہ نہ کرو وکرم سنگھ! وقت غداروں کو زیادہ دن پناہ نہیں دیتا۔“ راجہ رتن سنگھ پوری قوت سے بچا اور اپنے خدمت گاروں کو آواز دینے لگا۔

دوسرے ہی لمحے دو مسلح محافظ دربار میں داخل ہوئے

”نارائن داس کو پیش کرو۔“ راجہ رتن سنگھ نے محافظوں کو حکم دیا اور پلٹ کر دوبارہ مہمانتزی سے

جواب ہوا۔ ”وکرم سنگھ! تیری ذہانت کو ہم نے تشویر دی۔ ہم نے تیری سیاست کو باکمال بنا کر اہل چوڑ

کے سامنے پیش کیا اور تو سمجھ بیٹھا کہ تیرے دماغ کے سوا یہاں کوئی دوسرا دماغ نہیں ہے۔“ تجھے کیا خبر

کہ ہمارا ذہن.....“

ابھی رتن سنگھ اپنی بات مکمل کرنے نہیں پایا تھا کہ دونوں محافظ ایک سیاہ فام شخص کو لئے ہوئے دربار میں

داخل ہوئے۔ وہ نارائن داس تھا جسے وکرم سنگھ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نارائن داس پاگلوں

کی طرح آگے بڑھا اور تخت کے قریب پہنچ کر سجدے میں چلا گیا۔

”کھڑا ہو جاو تو نے کل رات جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بیان کر۔“ رتن سنگھ نے غضب ناک

لہجے میں کہا۔ نارائن داس کھڑا ہو گیا مگر وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں بدن کا بوجھ اٹھانے سے

انکار کر رہے ہوں۔ نارائن داس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں مائی

بھان متی اور چندر سنگھ کے درمیان ہونے والی گفتگو دہرا رہا تھا۔ وکرم سنگھ جس کی رگوں میں شدت غضب

سے خون جل رہا تھا، کچھ دیر کیلئے اپنا سارا غصہ بھول کر حیرت سے نارائن داس کی طرف دیکھنے لگا۔

نارائن داس کا بیان کردہ ایک ایک حرف درست تھا۔

نارائن داس کے خاموش ہوتے ہی راجہ رتن سنگھ نے اسے باہر جانے کا حکم دیا۔

”اسے پچانے وکرم سنگھ؟“ راجپوت سمرات کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ ظفر کے زہر میں ڈوبا ہوا

تھا۔

”نہیں!“ وکرم سنگھ کی حیرت بدستور قائم تھی۔

”پچان بھی نہیں سکتے۔“ رتن سنگھ کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”سمرات

آخر سمرات ہوتا ہے۔ سارے منتروں کا آقا! چاہے ان میں مہمانتزی ہی شامل کیوں نہ ہو۔ ہم بساط

سیاست کے مالک ہیں۔ تمام مہروں کو بچانے والے اور تم ہی تو ایک مہرہ ہی تھے۔ اپنی رفتار کے نشے میں

شامل کو فراموش کر بیٹھے۔ ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ تمہاری ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟“

وکرم سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اب بھی نارائن داس کے تصور میں الجھا ہوا تھا کہ یہ شخص کون ہے

اور اس نے کئی اہم راز رتن سنگھ کو کس طرح منتقل کئے ہیں؟

”یہ اس طوائف زادی کی داسی کا شوہر ہے جسے تو ایک عظیم عورت سمجھتا ہے۔“ بالآخر راجہ رتن سنگھ

نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے آئندہ پال کی موت کے بعد حالات کے کسی گوشے کو اپنی آنکھوں

سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ جس دن ہم پر یہ راز فاش ہوا کہ تجھے مائی بھان متی سے بھی ایک عقیدت خاص

ہے، اسی روز سے ہم نے بمل شاہ کے مندر میں اپنے جاسوس متعین کر دیئے تھے۔ کل رات جیسے ہی تیرا

دھار ملازم چندر سنگھ اس بوڑھی جاو گرنی کا پیغام لے کر روانہ ہوا، اسی وقت بھان متی کی داسی نے اپنے

شوہر کو تمام گفتگو سے باخبر کر دیا۔ اور پھر نارائن داس نے جو ہمارا زر خرید غلام ہے ایک برق رفتار

”مردش روز شب انسانی خواہشات کی پابند نہیں۔ ہمیں ان جان لیوا نجات کا انتظار تو تھا مگر یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ آندھی کی رفتار سے چل کر ہم تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں نہیں سمجھی بتائی! کیا علاء الدین خلجی نے چوڑے پر حملہ کر دیا؟“ نرملا کماری اچانک پریشان نظر آنے لگی تھی۔

”اگر سلطان حملہ کر دیتا تو سارے مسائل ہی ختم ہو جاتے۔“ وکرم سنگھ کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ”دشمن کی فوجیں چوڑے کی حدود میں داخل ہو جائیں تو پھر راجپوت سورماؤں کا یہ شرمناک رویہ بھی بے وقار نہ رہتا۔ اب بھادری کی رسم یہ ٹھہری ہے کہ رانی پدمی، آفریدی کا سر کاٹ دینا چاہتی ہے۔ شاہ پر بس نہیں چلتا تو اس کے بے دست و پا درباری سے انتقام لینے کو راجپوتوں کی موت و زیست کا مسئلہ بنایا جا رہا ہے۔ رام دیوا پانی شعبہ بازیوں میں ناکام ہو گیا تو مجھے غدار مذہب و وطن کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔“ وکرم سنگھ نے گلوں کو گہرے لیے پورا واقعہ سنا دیا۔

نرملے کا ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کیلئے اس کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی تھی۔

”حوصلہ اور صبر سے کام لو نرملا!“ وکرم سنگھ نے بیٹی کو آواز دی۔ ”ہرگز نہ ولنہ لالچ ہماری جڑاؤں کا امتحان ہے۔ جہاں بھی پر سینے کی کوشش کرو گی وہیں میاں نظر آئے گا۔ اس لئے انجام سے بے پروا ہو کر اڑتی رہو۔ بازوؤں کے شل ہو جانے کی فکر نہ کرو۔ آزاد پرندے بھی زیر دام چلے جاتے ہیں مگر دانے کی تلاش میں نہیں۔ پرواز جاری رکھو۔ اگر حالات کا فتنہ تمہارا مقدر ہی بن گیا تو پھر وہاں اس طرح پہنچو کہ تمہارے بازو جل گئے ہوں اور تمہارا جسم کو ہسار کی بلندیوں سے ٹکرا رہا ہو۔ میاں کے جال کو دیکھ کر بال و پر کی فوٹوں سے انکار کر دینا اہل پرواز کیلئے ایک لعنت ہے، موسم کی غلیظ ترین گالی ہے۔ موسم تو نیا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ تمہارے پر توجہ ڈالے اور تمہیں ذلت و شکست کے پنجرے میں ہمیشہ کیلئے قید کر دے۔“

وکرم سنگھ کی تند و تیز باتیں سن کر نرملا کماری اس طرح چونک اٹھی جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔ ”اب آپ کیا کریں گے؟“

”دلی کروں گا جس کی خبر کل رات تمہیں دی جا چکی ہے۔“ وکرم سنگھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”وقت بہت کم ہے مجھے فوری طور پر دربار واپس جانا ہے۔“ یہ کہہ کر مامنتی نے اپنی پچاس سالہ خادمہ رامیشوری کو آواز دی۔

رامیشوری کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے آقا کو آج سے پہلے اس قدر اضطراب میں مبتلا نہیں دیکھا تھا۔ ”خیریت تو ہے پریمو (مالک)۔“ رامیشوری نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”ہاں سب کچھ ہے رامیشوری۔“ وکرم سنگھ نے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم اور تمہارے اہل خاندان نے وکرم سنگھ کے پیوار سے جس طرح اپنی وفاداریاں نبھائی ہیں، ان کے اظہار کا موقع نہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں اپنی امانت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“ وکرم سنگھ کا اشارہ نرملا کماری کی طرف تھا۔

”تمیں پریمو! ابھی تو آپ کئی جگہ جنیں گے۔ موت آئی تو پہلے یہ داسی آپ پر قربان ہوگی۔“

رامیشوری نے زمین پر بیٹھتے ہوئے وکرم سنگھ کے پاؤں پکڑ لئے تھے اور زار و قطار رو رہی تھی۔

”گلی کی کی موت کو نہیں ٹال سکتا۔ ہر شخص کو اپنی جیتا میں جلا ہوا گا۔“ وکرم سنگھ اپنے کمرے میں

گھوڑے پر راج محل پہنچ کر اس کو اگلے دیا جسے تو نے ہزار پروں میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

وکرم سنگھ کے چہرے پر کئی تاریک سائے آکر گزر گئے اور اس کی کشادہ پیشانی لکیروں سے بھر گئی۔

راج رتن سنگھ اپنے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ تبسم سجائے بولے جا رہا تھا۔ ”کہاں گیا اس دیوانہ بیٹی کا لگیاں جو مستقبل کے پیچھے جھانکنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جسے اپنے گرد ہونے والا تماشا نظر نہ آتا۔ وہ تجھے تیری قسمت کا حال کیا بتائے گی؟ جو یہ نہیں جانتی کہ اس کی داسی چند سکوں کے عوض ایک ہی ہے وہ راج دوت کو ہمارے قہر و غضب سے کس طرح محفوظ رکھے گی۔“

وکرم سنگھ کے لبوں پر ہنس مسکوت تھی اور چہرہ دھواں ہو کر رہ گیا تھا۔

”ہم تجھے یا بے زنجیر کر کے رات کے پچھلے پر بھی اپنی بارگاہ میں طلب کر سکتے تھے لیکن مہارانی نے ہمارا دامن پکڑ لیا کہ آخر توان کا بچا ہے۔“ راج رتن سنگھ لہجہ بدل بدل کر ممانعتی کو ذلیل کر رہا تھا۔ ”ہزار تیرا راج دوت سے کیا رشتہ ہے کہ تو نے اپنی بیٹی کے عزت و ناموس پر اس کی زندگی کو ترجیح دی؟ تو رات کو کس کیلئے جاگتا رہا؟ راج وید کو موت کی دھمکیاں کس نے دیں؟ میں تیرے جرائم کو ثابت کرنے کیلئے کس کی گواہی پیش کروں؟“

وکرم سنگھ کا دم گھٹ رہا تھا۔ کئی بار اس نے چاہا کہ چیخ کر دل کا سارا بوجھ اتار دے مگر ہر مرتبہ ایک خیال اسے لب کشائی سے باز رکھتا تھا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ تجھے عبرتناک سزا دیں۔ آئندہ سال سے زیادہ عبرتناک..... لیکن اپنے دل کو پا کر میں جو مہارانی کے چہرے پر حزن و ملال کا ہلکا سا کس و کینہ بھی پسند نہیں کرتا۔“ راج رتن سنگھ نے اپنے پیروں کو اس طرح جنبش دی جیسے وہ کسی کیڑے کو مسل رہا ہو۔ ”یہ ہمارا تجھ پر آخری کرم ہے کہم نے تجھے بھرے دربار میں ذلیل نہیں کیا۔ بس! ہماری نظروں سے دور ہو جا اور اس نامراد سبکداز زندہ لاش رانی پدمی کی خدمت میں پیش کر دے جسے بچانے کیلئے تو نے اپنے مذہب اور وطن دونوں کو ناپام کر دیا۔“

وکرم سنگھ کے ہونٹ آپس میں پیوست ہو گئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اس نے غلی ہوئی آنکھوں سے راج رتن سنگھ کی طرف دیکھا، اپنی اور دیگر سرداروں کی خالی کرسیوں پر نظر ڈالی اور سر جھکائے ہوئے دربار سے نکل آیا طویل راہداری طے کرتے وقت کئی خدمت گار سامنے سے گزرے تھے آج کوئی ہاتھ اس کے سلام کیلئے نہیں اٹھا تھا۔

”وکرم سنگھ! جلدی کر! شاید وقت تجھے زیادہ مہلت نہ دے۔“ یکایک اس کی سماعت میں ایک ٹھ سا اٹھا۔ یہ مالی بھان متی کے آخری الفاظ تھے جو چندر سنگھ کے ذریعے اس تک پہنچے تھے۔ شور بوم چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی وکرم سنگھ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ بہت تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا۔

وکرم سنگھ اپنے محل میں داخل ہوا تو تمام خدمت گار حیرت زدہ رہ گئے۔ وقت سے پہلے وکرم سنگھ واپسی ملازمین کیلئے تعجب خیز تھی مگر کوئی شخص پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ وکرم سنگھ جب نرملا کماری کے کمرے میں پہنچا تو وہ گہرا کر کھڑی ہو گئی۔ وکرم سنگھ نے بہت کوشش کی تھی کہ اپنے چہرے سے اس طعنہ ظاہر نہ ہونے دے جو اس کے دل میں پوری سرکشی کے ساتھ اٹھ رہا تھا مگر جذبات کی ضرب سے تو پھر چہرے بھی بولنے لگتے ہیں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وکرم سنگھ انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اپنے احساسات کو نرملا کماری سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

نرملہ نے قدرے غم ہو کر دروازے کے اندر جھانکا کمرے میں چند گز کی جگہ مکمل ہموار تھی۔ اس کے بعد بچہ اترنے کیلئے بیڑیاں نظر آ رہی تھیں۔
 ”یہ بیڑیاں جنہیں بچے لے جائیں گی اور پھر وہ طویل سرنگ شروع ہو جائے گی جس کا خاتمہ اجیر کے محل پر ہوتا ہے۔ اگر گردش وقت تمہیں چوڑے فرار ہونے پر مجبور کر دے تو یہ سرنگ تمہاری آخری تباہ گاہ ثابت ہوگی اور تم کسی زحمت کے بغیر اجیر تک پہنچ جاؤ گی جو ہندو راجپوتوں کا کمر کرنے کے بلوچ مسلمان درویش خواجہ اجیر کا شہر نکلاتا ہے۔ وہاں تمہاری دل آزاری کرنے والا کوئی دشمن موجود نہیں ہوگا۔“ انا کہہ کر وکرم سنگھ مرزا اور اس نے بانسری میں دوبار تیز پھونکیں ماریں نتیجتاً خفیہ سرنگ کا آہنی دروازہ بند ہو گیا۔

اس کے بعد مہاشنری نے نرملہ، چندر سنگھ اور رامیشوری کو وہیں ٹھہرنے کیلئے کہا اور خود سیاہ مورتی کے ذریعے اس دروازے کو کھولا جس کی دوسری طرف منتری محل کا وہ حصہ تھا جسے عام لوگ وکرم سنگھ کا نواساں سمجھتے تھے اور جہاں ایک کمرے میں آفریدی زیر علاج تھا۔ وکرم سنگھ کو اپنے سامنے پا کر تمام سہیلیاں غم ہو گئیں۔ انہیں ایک نئے راستے سے مہاشنری کے داخلے پر حیرت ضرور ہوئی تھی مگر وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ وکرم سنگھ کسی مخصوص تہ خانے کو عبور کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ مہاشنری نے اپنے سپاہیوں کو ایک نظر دکھا اور تیزی سے اس کمرے میں چلا گیا جہاں علی عامر آفریدی بستر پر دراز تھا۔ محافظ جو آفریدی کے سر پر بیٹھا تھا اور ایک ایک لمحے کی نگہداشت کر رہا تھا، وکرم سنگھ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاشنری شدیدے قرار کے عالم میں آگے بڑھے اور آفریدی کے قریب پہنچ کر کہنے لگے۔

”فرزند! تم کیسے ہو؟“ وکرم سنگھ کی آواز سے بے پناہ محبت جھلک رہی تھی۔
 ”اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ آفریدی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آنکھوں کے دھندلے پن میں کچھ اور کی نمایاں ہو گئی ہے۔“

”بے فکر ہو۔ جس خدانے تمہیں قہر و ستم کے دریا سے بغایت ساحل تک پہنچایا ہے وہ تمہاری بیٹائی بھی تمہیں لوٹا دے گا۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ نے محافظ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تنہائی ہوتے ہی وکرم سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ آہستہ سے آفریدی کے سر پر رکھ دیئے اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔
 ”فرزند! اب تم یہاں نہیں رہو گے۔ میں تمہیں ایک محفوظ تہ خانے میں منتقل کر رہا ہوں۔ کیا تم اس قابل ہو کہ اپنے پیروں پر کچھ دور چل سکتے ہو؟“

”شاید! میں چلا سکتا ہوں۔“ آفریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے ایک پاؤں کو جنبش دی اور دوسرے پاؤں کی مدد سے اس کی آنکھوں میں درد کے گہرے رنگ ابھر آئے۔ ”مہاشنری! میرا اندازہ غلط تھا پاؤں کی ہلکی جنبش نے میرے پورے جسم کو درد کی سوزش سے جلا ڈالا ہے۔ ممکن ہے کسی زخم کا منہ بھی کھل گیا ہو۔“

”پھر بچے دو! میں صرف تمہاری جسمانی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اپنا گہلا طویل انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل داخل ہو چلا۔ ”ساتویں تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نرملہ جانے لگی تو وکرم سنگھ نے رامیشوری اور وکرم سنگھ کو بھی اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ تم لوگ بائیں ہاتھ کے ساتویں کمرے میں پہنچ کر میرا انتظار کرو۔“

آویزاں اس فانوس کو دیکھ رہا تھا جو قیمت کے اعتبار سے نوادرات میں شامل ہوتا تھا۔ ”یہ فانوس مجھ پر سے اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے۔ اس کے اندر کی آگ کسی دوسرے دل میں کبھی منتقل نہیں ہوئی۔ یہ تقدیر، میرا وقت، میرا مستقبل کسی کی قربانی سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ رامیشوری کہ تمہارے ساتھ اس سفر پر روانہ ہو سکو گی جو کانٹوں اور انگاروں کا سفر ہے۔ تم انکار بھی کر سکتی ہو اور تمہارا انکار مجھ پر گراں نہیں گزرے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آفات و مصائب اور موت کا ہم سفر ہونا آسان نہیں۔ اگر اس راستے پر کسی ساتھی کے قدم لڑکھڑاہیں تو انسان کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ مجھے بھی تمہارا انکار سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میں نرملہ کو تمہا بھی اس سفر پر روانہ کر سکتا تھا مگر ابھی وہ بہت کم عمر ہے ممکن ہے اس کی کم سن اور تنہائی اسے کسی موڑ پر خوفزدہ کر دے، اس لئے تم اس کے ہمراہ جاؤ گی اور وقت تک نرملہ کے ساتھ رہو گی جب تک وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتی۔“ خوف و ہراس زائل ہو چکے تھے اب وکرم سنگھ اسی آمرانہ لہجے میں بول رہا تھا جو اس کا خاندانی لہجہ تھا۔

”کیسا سفر بھلا! مجھے کچھ تو بتائیے۔“ رامیشوری کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
 ”اہل و فاسول نہیں کرتے۔ بس ایک پکار پر دوڑے چلے آتے ہیں۔“ وکرم سنگھ کی آواز سے نمایاں تھی۔ ”سوال و جواب کی مہلت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم نرملہ کے نامعلوم منزل کی طرف جا سکتی ہو یا تمہارے قدم اس ان دیکھے راستے پر چلنے سے عاجز ہیں۔“
 ”نہیں پر بھلا! بوزھی کینز کے آنسو ختم گئے اور چہرہ جوش جذبات سے تہمتا لگا۔ ”میں معافی خواستگار ہوں۔ آپ کو پریشان دیکھ کر زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ میں اپنی آقا زادگی کے ساتھ موت کے نہ بھی جانے کیلئے تیار ہوں۔“

وکرم سنگھ کی آنکھیں بھگنے لگیں۔ ”رامیشوری! تمہاری اس عنایت کا بہت شکریہ۔ وکرم سنگھ مجبور ہے ورنہ تمہیں اپنے غموں میں شریک نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چندر سنگھ کو بلا کر خاندانی ظلم کدے کی طرف بڑھنے لگا۔

نرملہ کو پہلے ہی ظلم کدے کا راز سمجھا چکا تھا اس لئے پرچہ راستوں سے گزرتے ہوئے اسے کوئی جرم نہیں ہوئی مگر چندر سنگھ اور رامیشوری کا برا حال تھا۔ منتری محل میں سالہا سال کے دوران بھی دونوں پر یہ اسرار نہیں کھل سکے تھے کہ مہاشنری وکرم سنگھ اپنے مکان میں ایک پیچیدہ و حسد خاندان بھی رہے ہیں۔ ملازمہ رامیشوری اور چندر سنگھ تو دریائے حیرت میں غرق ہو چکے تھے انہیں بتا بھی نہیں چلا ظلم کدے کا پہلا دروازہ کس طرح کھلا اور کب بند ہوا؟ وہ تو خاموشی کے ساتھ اندھیرے راستوں سے گزرتے رہے۔ پھر ساتواں تہ خانہ عبور کر کے وہ سب کے سب کھلی ہوئی فضا میں آ گئے۔ یہاں ہر طرف آموں کے درخت تھے اور مختلف اقسام کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ بڑی جاذب نظر اور پرسکون تھی۔ پیڑوں کے درمیان سے ٹھیکے پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔

رامیشوری اور چندر سنگھ اس اجنبی فضا میں اچھے ہوئے تھے اور وکرم سنگھ نرملہ کی کو دور خستوں کے کچ کی طرف لے گیا تھا جہاں ایک خفیہ سرنگ موجود تھی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک دروازہ بنا ہوا تھا جسے کر بظاہر ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ کوئی تقریبی کمرہ ہے جسے باغ کے اندر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس دروازے پر ایک سیاہ رنگ کی مورتی آویزاں تھی جس کے ہاتھوں میں نیلگوں بانسری صاف نظر آ رہی تھی۔ وکرم سنگھ نے آگے بڑھ کر اس بانسری میں پھونک ماری اور ایک ہلکی سی گونج کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ ”غور سے دیکھو نرملہ۔“ وکرم سنگھ نے بیٹی کو ہدایت کی۔

”نہیں آقا! ایسا نہیں ہو گا۔“ رامیشوری اور چندر سنگھ نے بیک زبان کہا۔ ”آخر ہم بھی راجپوت ہیں اور راجپوت سو دریاں کا حساب نہیں کرتے۔“

”ایسا نہ کہ میں نے بے شمار راجپوتوں کو نقصان کے موسم میں آنسو بہاتے دیکھا ہے۔“ وکرم سنگھ نے کہا۔ ”تم قادر اس لئے نہیں ہو کہ تمہارا تعلق راجپوت قوم سے ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی بے وفا چہرے ہیں اور ان سب کا تعلق نسل چوہان سے ہے۔ قوم صرف پہچان کیلئے ہوتی ہے۔ سچائی اور کھرے پن کا معیار نہیں ہوتی۔ دیانندارا اور باوفا س قوم میں بھی پائے جاتے ہیں جنہیں تم بچ کر پکارتے ہو۔ میں راجپوت ہونے کے ناتے سے تمہارا احترام نہیں کرتا میں ایک اچھا انسان ہونے کی وجہ سے تم پر نازاں ہوں اور یہ ناز، یہ اعتبار، آج اس آزمائش کی خوفناک منزل تک آپنچے ہیں۔ وہ منزل یہ ہے کہ شاید میں تم سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ کر نئی دنیا کی طرف جا رہا ہوں۔“

نرملاکماری، رامیشوری اور چندر سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا۔

”منزل فراق؟ دوسری دنیا؟“ نرملاکماری کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”پتا ہی! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں بیٹی! ساعت فراق میرے اندازے سے پہلے آپنچی۔“ وکرم سنگھ بنی کو تھما چھوڑتے وقت رونا چاہتا تھا مگر اس نے ان آنسوؤں کے طوفان کو پی لیا جو آنکھوں کے بند توڑنے کیلئے بے قرار تھا۔ ”مجھے اس خوفناک کی آمد پر اسی طرح یقین تھا جیسے میں تم تینوں کو اپنی آنکھوں سے زندہ دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وقت اتنی جلدی پوری بساط کو درہم برہم کر دے گا۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ شاہ پر کیا گزرے گی؟ وزیر کا کیا حال ہو گا اور یادے آگ اور خون کے کس کاخ پر دشمنوں کے لشکر جرارے اٹھیں گے؟ ہائے! یہ میری فوج جو صرف پانچ افراد پر مشتمل ہے۔“ وکرم سنگھ کو اپنے سینے میں درد کی ایک تیز لہری اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے گہرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

”آقا! آپ کی طبیعت بگڑ رہی ہے؟“ چندر سنگھ بے چین ہو کر قریب آیا۔

”نہیں! میرے بچے! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وکرم سنگھ کے لہجے کی گرج لوٹ آئی تھی۔ ”ساعت فراق تو چھروں میں بھی شگاف ڈال دیتی ہے اور میں تو پھر ایک بوڑھا انسان ہوں جسے زمانے کے الٹ پھیرنے کو کھانا کر دیا ہے۔ اپنے پیاروں سے بچھڑتے وقت مجھ پر اتنا اثر تو ہونا چاہئے کہ میری زبان کانپنے لگے، قدم ٹوٹ جائیں اور آنکھوں سے چیت اور اساتھ کے جلتے ہوئے موسم میں سادوں بھادوں کی کوئی بو بند برس جائے۔“

وکرم سنگھ کے ضبط کا یہ انداز دیکھ کر نرملاکماری، چندر سنگھ اور رامیشوری رونے لگے۔

”میں تمہاری آنکھوں پر جبر کے پہرے بٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی میری خواہش ہے کہ کچھ دیر کیلئے اپنے آنسوؤں کو روک لو۔ یہ آنسو اس وقت تمہارے کام آئیں گے جب میں تم سے بچھڑ کر بہت دور چلا جاؤں گا پھر جب برائی آگ بھڑکے گی تو پھر میں ندی کا یہ پورا ترادہ شیشیل جل ہی اس آگنی کو بجھائے گا۔ پانی کے ان چند قطروں کو بچا کر رکھو تمہیں نہیں معلوم کہ کیسی آگ لگے گی؟“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ اپنا کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی طویل و عریض فولادی تجوری کی طرف بڑھا پھر اس نے تجوری کے دروازے کو کھل دیا۔ ”یہ میرے بزرگوں کا خاندانی سرمایہ ہے۔ اس میں کوئی زیور، کوئی ہیرا اور کوئی مکہ ہونے کے حکمراں کی خوشامد کر کے حاصل نہیں کیا گیا ہے۔ سیم وڈر کا یہ انبار راجپوت سمرات کی بخشی ہوئی جاگیر کا ٹھکانہ ہے۔ یہ میرے پڑھوں کا بچی دھن ہے اگر تم اس دولت کو سونگھو گے تو اس سے

جب نرملاکماری، رامیشوری اور چندر سنگھ تمہ خانے کے اندر چلے گئے تو وکرم سنگھ تیزی سے دو بارہ منتری محل کے عام حصے میں چلا گیا۔ مسلح سپاہی بڑی حیرت سے اپنے مہمانتری کی اس آمدورفت پر رہے تھے۔ ”تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔“ آگے بڑھتے بڑھتے مہمانتری نے سپاہیوں کو آواز دی۔ وکرم سنگھ کا حکم پاتے ہی تیز قدموں سے پیچھے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ وکرم سنگھ، آفریدی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”راج دودت کے بستر کو اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کر دو۔“ وکرم سنگھ نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ سات آٹھ سپاہی ایک وقت آگے بڑھے اور آفریدی کے مسہری نمائندگان کو اٹھا کر تمہ خانے کے باہر کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ حیرت کا چلتا پھرتا مجسمہ نظر آرہا تھا۔ کوئی سپاہی بھی اس کو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ تبدیلی کس لئے کی جا رہی ہے؟

آفریدی کا بستر ساتویں تمہ خانے کے پانچویں کمرے میں منتقل کرنے کے بعد وکرم سنگھ تیسری بار باہر اور سپاہیوں کو کچہرہ سخت کرنے کا حکم دے کر لوٹ گیا۔ پھر اس نے سیاہ مورتی کے ذریعے اس دروازے کو بند کر دیا جس کے بعد مہمانتری محل کا یہ حصہ دوسرے حصے سے بالکل علیحدہ تھا۔

وکرم سنگھ نے ٹھہر کر اپنے ہاتھ کا پسینہ پونچھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا طلسم کدے کے ساتویں کمرے میں آیا جہاں نرملاکماری، رامیشوری اور چندر سنگھ اس کے منتظر تھے۔

”تم لوگ یقیناً میرے اس عمل پر حیران ہو گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے اور میں مسلسل یہ کیسی عجیب کر رہا ہوں۔“ وکرم سنگھ نے ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں آقا! ہمارے لئے آپ کی کوئی بات عجیب نہیں ہے۔“ چندر سنگھ نے سر جھکا کر کہا۔ ”آپ ہمارے بزرگ بھی ہیں اور ریاست کے سب سے بڑے سیاستداں بھی۔ آپ کیا سوچ رہے ہمارے ذہن اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور آپ کے ذہن کی جستجو کرنا ہمارے فرض نہیں بھی نہیں۔ ہم تو آپ کی جنبش چشم و لب کے پابند ہیں۔ ہم سے یہ سوال کرنے کے بجائے حکم دیجئے بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑیں یا موت کے خونی دہانے میں اپنی گردنیں رکھ دیں۔“

”چندر سنگھ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اہل وفاقے یہی انداز ہوتے ہیں کہ ان کے ہونٹوں پر کیا کالفظ کبھی نہیں ابھرتا۔ جب ایک بار عہد استوار کیا جا چکا تو پھر کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی وکرم سنگھ کی نظریں چندر سنگھ کے چہرے سے گزرتی ہوئی نرملاکماری پر ٹھہر گئیں۔ ”تم لوگوں نے یہ حکم کو اپنی زندگی سے وابستہ کر لیا، یہ تمہاری فرض شناسی تھی اور جذبہ وفاداری تھا جس نے میرا دل خراب میری روح سرشار ہو گئی۔ مگر اس کے ساتھ میرا بھی ایک فرض ہے کہ تمہیں نئے سفر کی تفصیلات سے کر دوں۔ وہ سفر جس میں جانوں کی قربانی پہلی شرط ہے۔ میں انسانی جان کی قیمت سے واقف ہوں۔ جسم سے نکال پھینکنا آسان نہیں ہوتا۔“

”پرہو! ہم اپنی جانیں تو آپ کے ہاتھوں میں سچ چکے۔ پھر اس وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی اب کی بار ملازمہ رامیشوری اپنے آقا سے مخاطب ہوئی تھی۔

”آج اس وضاحت کی بہت ضرورت ہے۔“ وکرم سنگھ کا لہجہ اچانک اداس ہو گیا تھا۔ ”میں چاہتا کہ بعد میں تمہیں اس خرید و فروخت پر پیشانی ہو۔ کہیں یہ نہ سوچو کہ تم نے گھائے کا سودا کیا اور

”ماستھی! کیا آپ کی صاحبزادی بھی تشریف لائی ہیں؟“ علی عامر آفریدی بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

”آفریدی! میں جا رہا ہوں اور تمہاری گنجائش کیلئے تین غم خواروں کو کھجور دے جا رہا ہوں۔ کون بلا میری سماعت کب تک قائم رہے میں عجیب سا شور سن رہا ہوں۔ یہ شور مجھ سے میری سماعت جھین لے ہے۔ میں بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہوں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بھی وہ پیغام سنا دوں۔ تم نے شیا کی آواز

”ہاں! یہ میری بیٹی نرملا ہے جو تم سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔“ وکرم سنگھ نے جواب کہا۔ ”یہ بھی تمہارا مذہب اختیار کرنا چاہتی ہے۔“

”انہیں مجبور نہ کریں۔“ آفریدی نے آہستہ لہجے میں کہا۔ ”اگر انہوں نے باپ کے ہو کر اقرار کیا تو گواہی نامکمل رہے گی اور نامکمل گواہی خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔“

”نہیں! میں مجبور نہیں ہوں۔“ یکایک کمرے میں برسوز آواز ابھری، میں نے اس اقرار کی طلب آنندپال کو بڑی اذیت ناک موت مرتے دیکھا ہے یہ کوئی جنون نہیں تھا جسے سنیا سی نے لگائی کی آگ میں جل کر خاک ہو گئے۔ سنیا سی کی آنکھوں نے کچھ تو دیکھا جسے پائے کیلئے وہ خار وڑتے چلے گئے تھے۔ آخر اس پیغام کی کوئی توثیق ہے کہ میرے باپ چند حرفوں کے بدلے زندگی قربان کئے دے رہے ہیں اور اس شخص کی زندگی بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے جسے جبر و استبداد اپنے آگے نہیں جھکا سکی۔ ”نرملاکماری کا اشارہ خود علی عامر کی طرف تھا۔

”تو پھر آپ بھی اقرار کر دیجئے۔ اسے حالت جبر نہیں کہہ سکتے۔“ آفریدی کی نظروں کے مارچہ نہیں تھا مگر پھر بھی ایک اجنبی و شیرہ سے بات کرتے وقت اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ پھر جب نرملا کماری نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا تو ایسی مسرور کن آواز فضا میں ابھرنے لگی جو کے آگے مندرروں کی گھنٹیاں بچھ کر رہ گئی تھیں اور ناتوس بے صدا ہو گئے تھے۔

”آفریدی! اب میری روح کا بوجھ اتر گیا۔“ وکرم سنگھ بہت زیادہ سرشار نظر آئے لگاتار۔ چوڑکی لگیاں سوئی ہو جانے کا تو غم ہو گا مگر دل کے نگر کی بربادی کا مرثیہ نہیں پڑھوں گا۔ کہ میری طاقت سے باہر تھی۔“

”اہل و قاتمارہ گئے تھے اور نوکیلے پتھروں پر چلتے چلتے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے کہ تو ہم سفر بھیج دیئے۔ اے خدا! تیرے یہ چند نام لیا آدم خوروں کی بستیوں میں پناہ ڈھونڈتے؟ انہیں اپنے وامن رحمت میں چھپالے کہ تیرے کرم کے سائبان سے محفوظ کوئی دوسرا ما ہے۔“

یہ چند دعائیہ کلمات تھے جنہیں سن کر وکرم سنگھ ’نرملاکماری‘ رامیشوری اور چند سنگھ کے گئے۔

”فرزند! میں جا رہا ہوں۔“ اچانک وکرم سنگھ نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”رتن سنگھ کے جاسوسوں نے مجھے اس منزل پر پہنچا دیا ہے جو موت اور فراق کی منزل ہے میرے را ہو گئے اب وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہارا شکستہ جسم ان کے حوالے کر دوں مگر.....“

”آپ اس میں کوئی پس و پیش نہ کیجئے۔“ آفریدی نے وکرم سنگھ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے انجام سے باخبر تھا۔ سفارت کے یہ مرتلے جان دے کر ہی انجام دیئے جاتے ہیں۔ مجھے انی حضور لے چلے میں ان کا قرض چکا دوں گا۔ میری خاطر اپنے چاہ و جلال اور نرملا کماری کی شایا قربان نہ کیجئے۔ آپ کو وہ پیغام سننا تھا، سن لیا۔ اس پیغام کے سہارے باقی زندگی سکون سے ہے۔ آپ بتوں کے ہجوم میں رہ کر بھی اپنے خدا کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ کچھ دن ہی کی قربان دوسرے ہمہ ہوں کا قافلہ آپ سے آئے گا تو یہ تمہاری بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ لوگ بس آہ ہیں انتظار کی آخری گھڑیاں ہیں جو یک دم چھٹ کر گزر جائیں گی۔ اتنے دن اپنے دلوں پر پھر رکھ لیجئے۔ پتھروں کا کاروبار ختم ہو جائے گا پھر آپ ان شاہراہوں پر اپنے شیشہ دل کو لے کر نکلیں۔

”آفریدی نے وکرم سنگھ کو کئی راہ دکھائی تھی۔

”نرملاکماری نے وکرم سنگھ کو کئی راہ دکھائی تھی۔

”اس میں غور و تردید کی کیا بات ہے؟ میرا کام ختم ہو چکا۔“ آفریدی پرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”میں سلطان کے خلق کا پیغام لے کر آیا تھا جسے رانی پدمنی نے سننے سے انکار کر دیا اور وہ پیغام جو میری نگاہوں میں پوشیدہ تھا اسے سنیا سی آنندپال نے سن لیا۔ آپ نے اور نرملا کماری نے سن لیا۔ میری خوش قسمتی کا اندازہ کن کر سکتا ہے کہ ایک سفر کی حیثیت سے مجھے کیسی فتوحات حاصل ہوئیں۔ مجھے اسی وقت دربار چڑھیں لے چلے میں راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، رام دیوار و دوسرے اہل دربار کو بھی یہی پیغام سناؤں گا پھر مانجے اپنے دیوتاؤں کی بیعت چڑھا دیں گے یا میرے پیغام کو دل سے قبول کر لیں گے دونوں صورتوں میں مجھے کامیابی نصیب ہوگی۔ میرا پیغام سن لیا گیا تو چوڑکی سنگلاخ زمین میں گل و یامین کی فصل پھوٹے گی۔ اور اگر میں قتل کر دیا گیا تو میرے خون کے ہر قطرے سے اس عقیدے کا درخت اگے گا جس کی آبیاری آپ لوگ کریں گے۔“

”میں بیٹے! تم ان لوگوں کو نہیں جانتے وہ بڑے سفاک ہیں انہیں رقص، شراب کے سوا کسی شے سے دلچسپی نہیں۔ وہ پیدا کی اندھے ہیں۔ میں روشنی کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ ان کی گناہ گار سانسیں اس چراغ کو بجھا دیں گی۔ میرا کیا ہے کہ میں زندگی کے درخت کا آخری خزانہ رسیدہ پتہ ہوں۔ میرے لڑنے کے بعد نئی کونپلیں پھوٹیں گی، سنہری اور سبز کونپلیں، ٹھنڈی چھاؤں دینے والی کونپلیں۔ مجھے گرجانے دو کہ میرے بعد ہی فصل بہار آئے گی۔ میں نقیب بہار کو جھلسا دینے والی ہاؤں کے درمیان کیسے لے جاؤں؟“ وکرم سنگھ نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

آفریدی نے ایک بار پھر جرح کی مختلف دلائل پیش کئے مگر وکرم سنگھ نے آفریدی کی ہر منطق کو جھٹلادیا۔ ”آفریدی! تم میرا وقت برباد کر رہے ہو۔ غور سے سنو کہ میں کیا ماننا چاہتا ہوں؟ یہ میری بیٹی نرملا ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ علاء الدین خلجی کی یلغار کو اب و نیکی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ چوڑتاہ ہو جائے گا کہ سنیا سی آنندپال اور مانی بھان مٹی کی آنکھیں سب کچھ دیکھ چکی ہیں پھر بھی اگر سلطان نے اصرار کا رخ نہیں کیا تو تم لوگ اس تہ خانے میں ایک سال تک پرسکون زندگی گزار سکتے ہو۔ میں نے تمہارے آرام کی ہر چیز میاں میاں کر دی ہے جب یہ ساری اشیاء ختم ہو جائیں تو تم سرنگ کے ذریعے اہمیر چلے جانا۔ وہاں سے تم باسانی دلی پہنچ سکتے ہو۔ پھر تمہیں اپنی والدہ اور بہن کی قربت بھی میسر آجائے گی۔ نرملا کو اس وقت تک اپنے ساتھ رکھنا جب تک اس کی زندگی کسی باکر دار مسلمان سے وابستہ نہ ہو جائے۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس قدر نازک امانت کا بار اٹھا لوں گا۔“ علی عامر آفریدی شدت جذبہ سے مجبور ہو کر درمیان میں ہی بول اٹھا۔

”یہ امانت اتنی گراں نہیں۔“ وکرم سنگھ کی آواز آنسوؤں کی نمی سے متاثر نظر آرہی تھی۔ ”تم جس امانت کو جو امانت سمجھتے ہو وہ بڑی امانت ہے میں نے تمہیں ہر زاویے سے امین پایا۔ تمہاری غیبت میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وکرم سنگھ جھکا اور اس نے آفریدی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”تم سلطان کے بچھے جا رہے تھے یکایک وکرم سنگھ سیدھا ہوا۔“ ”تم سلطان کے

دکرم عجم کی دوسرو سوائی کا تماشا اپنے عروج کو پہنچ گیا تو اچہ رتن سنگھ محافظ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔
 ”مہارانی کے حضور ہمارا درخواست پیش کرو کہ راجپوت سمرات دربار میں ان کے منتظر ہیں۔“

گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری تلاش میں اس ظلم کے سہ سے باہر نکل جاؤ۔ اس کے باہر صرف بہت
 منتظر ہوگی۔ ذلت و رسوائی اور اذیت و کرب کی موت۔ یہ میرا حکم ہے تمہارے باپ کا حکم۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سپہ سالار ہری سنگھ کو حکم دیا کہ وہ فوج کا ایک دستہ لے جا کر شہر علی عامر آفریدی، وکرم سنگھ کی بیٹی نرملاکماری اور اس کے تمام خدمت گاروں کو گرفتار کر کے حوالہ کر دے۔ اگر وکرم سنگھ کے مسلح محافظ سرکشی اختیار کریں تو انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ سرت سننے ہی سپہ سالار ہری سنگھ منتزی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد رانی پدمی دربار میں داخل ہوئی تو عبرت کا ایک لرزہ خیز منظر اس کے استقبال کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ رانی پدمی اپنے چچا وکرم سنگھ کی شکستہ حالت پر کوئی تبصرہ کرتی، راجہ رتن سنگھ بول اٹھا۔ ”ہم نے صبر و ضبط کی انتہا کر دی، ہمارا بیٹا! مگر جب تمہارا اپنا خون ہی تمہارے خلاف گواہی پھر کس طرح اس بے وفائی کے تحمل ہوتے۔“

”آپ نے ٹھیک کیا سرت! اب اس شخص سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔“ غرور و تکبر سے رانی پدمی شفاف ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے اور خرد اور بھنوں مکان سے بھی زیادہ کھینچ گئی تھیں۔ ”میں حیران ہو میرے خاندان میں اس قدر بے حیاء شخص کس طرح پیدا ہوا جس نے اپنا مذہب بھی فروخت کر دیا اور خوار گری بھی بچ دی جو راجپوتوں کا امتیاز نشان ہے۔ میں اس کی بیٹی بھی اور اس نے اپنی بیٹی کے نامور قاتلوں کو پوناہ دی۔ میواؤں کی تاریخ اس بے غیرتی کو اپنے صفحات پر کس طرح برداشت کرے گی؟ میرے بے داغ خاندان کی کتاب سے اس سیاہ ترین تحریر کو کھرچ ڈالیں۔ میں کوئی شکہ نہیں گی۔“ رانی پدمی مجسم شعلہ بنی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے وکرم سنگھ کے چہرے پر پاؤں سے ایک لگائی۔ وکرم سنگھ بے ہوش ہو چکا تھا۔

”کیا وکرم سنگھ کو اس حال میں دیکھ کر آپ کی آتش انتقام سرد ہو گئی؟“ راجہ رتن سنگھ بھی رانی کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے انتہائی خوشامدانہ لہجے میں سوال کیا۔

”ہرگز نہیں۔“ رانی پدمی کی ایک اور ٹھوک وکرم سنگھ کے چہرے پر پڑی ”سرت! آپ شعلہ بات کرتے ہیں، ہمارے سینے میں تو نفرت و انتقام کا ایک سمندر موجزن ہے۔ یہ آگ تو اس دن بجے وکرم سنگھ کے بجائے سلطان کا سر ہمارے قدموں میں ہو گا۔“

”وہ وقت بھی آئے گا ہمارا بیٹی!“ رتن سنگھ کا انداز غلامانہ تھا۔

”اسے قید خانے میں ڈال دیجئے اور اس وقت تک تشدد کیجئے جب تک یہ راج دوت کا پتا نہ تار۔“ رانی پدمی نے وکرم سنگھ کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ساتھ ہی نرملہ کے بدن سے نوح لیا جائے اور وکرم سنگھ کو کھلی آنکھوں سے یہ تماشا دکھایا جائے۔ پھر اسے اندازہ ہو گا کہ عطاء خلجی کا خط کس قدر شرمناک تھا اس کے بعد نرملہ کو یہ کہہ کر دی بھیج دیا جائے کہ رانی پدمی سلطان حرم میں داخل ہونے کیلئے آرہی ہے۔“

راجہ رتن سنگھ چونک اٹھا اس کے چہرے پر مسرتوں کی ایک تیز لہر روشن ہوئی مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ سلطان، نرملہ کو رانی پدمی کی حیثیت سے تسلیم کر لے گا؟

”سلطان نے ہماری ایک جھلک بھی نہیں دیکھی پھر اسے کون بتائے گا کہ یہ رانی پدمی نہیں وکرم سنگھ کی غیرت مند بیٹی نرملہ کماری ہے۔“ رانی پدمی کا فاتحانہ قہقہہ ابھرا۔

”مگر وہاں وہ حرام کارا گھو جینیں موجود ہے وہ سارا بھید کھول دے گا۔“ رتن سنگھ اس منصوبہ پر خوش ہوتے ہوئے بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

”جب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔“ رانی پدمی کے جذبہ انتقام نے عجیب کروٹ لی تھی۔

ایک ملہ تھکنی آمادہ نہیں ہو گا۔ اس وقت تک نرملہ کے سر سے قیامت گزر چکی ہوگی اور اگر دلی پہنچ کر نرملہ نے راز فاش کر بھی دیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وکرم سنگھ کی داستان رسوائی دلی کے گلی کوچوں میں ہر شخص کی زبان پر ہوگی اور ہم یہی چاہتے ہیں۔ سلطان نہیں، کوئی اور مسلمان سردار نرملہ کو شکار کر لے گا۔ پھر نرملہ شعلوں میں سے ہمارے انتقام کی ایک چنگاری بجھ جائے گی۔“

”کاش! یہ سب کچھ پہلے ہو جاتا۔“ راجپوت سرت کف افسوس مل رہا تھا۔ ”اس طرح ہمیں اپنے دونوں دشمنوں سے نجات مل جاتی۔“

”نہیں سرت! یہ کام وقت سے پہلے ممکن نہیں تھا۔“ رانی پدمی نے اپنے شبستان خاص میں پہنچنے کے بعد کہا۔

”کسے قہر خیزی کہ سلطان علاء الدین خلجی ہمارے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کرے گا اور کون جانتا تھا کہ خود ہمارے خون میں پرورش پانے والے غلیظ کیڑے جو ان غیرت و شجاعت کے جذلوں کو پٹ جائیں گے۔ وہ مجھے سلطان کے حرم میں بھیج کر اپنی سیاست کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور آج میں اس کی پالیسی پر الٹ کر نرملہ کماری کو آئہ کار بناری ہوں۔ یہ تو سیاست کے کھیل ہیں۔ اب وکرم سنگھ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ریاست میں اس سے زیادہ ذہین افراد بھی موجود ہیں۔ ہم نے اسے مدبر اعظم کا خطاب دے کر غلطی کی تھی کہ اس طرح کم ظرف جھلک جاتے ہیں اور پھر اپنے ذہن کی غلاطی سے دوسرے کا لباس بھی داغدار کر دیتے ہیں۔“ رانی پدمی اس فاتح حکمران کے انداز میں بول رہی تھی جو دشمنوں کی لاشوں سے گزر کر فتح کی منزل تک پہنچا ہو اور پھر خاک و خون میں نہائے ہوئے لوگوں کی بے کسی دیکھ کر اپنی فرصت کا مرانی کا قصیدہ خود اپنی زبان سے پڑھ رہا ہو۔ رانی پدمی بھی اسی طرح وکرم سنگھ اور نرملہ کماری کی شکست پر طعنہ زنی کر رہی تھی اور اپنے غلام شوہر پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ صرف مجلس کیفی کی ساتھی نہیں، میدان جنگ کی بھی سب سے زیادہ با اثر شخصیت ہے۔

”ہمارا بیٹی آپ درست کہتی ہیں۔“ راجہ رتن سنگھ نے پدمی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا کہ وہ اختلافی گفتگو کر کے رنگینی شب کے اثرات کو زائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کیف و نشاط کے یہ لمحے اس وقت برباد ہو گئے جب سرت کے ابتدائی حصے میں سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔

”ہمارا بیٹی کا قابل بلند ہو ہم اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے۔“ ہری سنگھ کے لہجے سے کسی فاتح شمشیر زن کا غرور جھلکنے کے بجائے کسی ہارے ہوئے جواری کی تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ ”منتزی محل ویران پڑا ہے۔ نہ راج دوت کا کہیں پتہ ہے اور نہ نرملہ کماری کا۔“ سپہ سالار ہری سنگھ اپنی شکست کا اعتراف کر رہا تھا۔ چند نقطہ سپاہی تھے جنہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا مگر وہ بغاوت پر آمادہ تھے۔ ان لوگوں نے سرت کے فوجی دستے کے بھگڑنے سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ایک سپاہی مارا گیا۔ چند زخمی ہمارے ہاتھ لگے مگر وہ بھی راستے میں دم توڑ گئے۔ وکرم سنگھ کے چند خدمت گاروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی نرملہ کماری یا راج دوت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”میں لوگ کسی سرحدی راستے سے تو باہر نہیں نکل گئے۔“ راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔

”یہ تو ممکن نہیں سرت! ہری سنگھ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہتر جانتے ہیں کہ ہم نے سرحدی راستوں کو کس طرح محفوظ بنادیا ہے۔“

”اب تم جاؤ اور حفاظتی انتظامات سخت کر دو۔“ راجہ رتن سنگھ کسی زخمی درندے کی مانند بھڑک رہی سنگھ کا رخصتی انداز دیکھے بغیر اپنے شبستان میں چلا گیا جہاں رانی پدمنی کے سحر کار کھنکھارے سنائی دیتے تھے۔

”آخر وہ بد نصیب کہاں جا سکتے ہیں جن کے سروں سے ہم نے اپنا دست کرم کھینچ لیا ہے رانی پدمنی نے ایک خاص ادائے ناز کے ساتھ کہا۔ احساس نفرت نے چوڑکی ملکہ کے چلنے ہوئے رخسار کو مزید دہکا دیا تھا۔ ”جنہیں ہم شرن (پناہ) نہیں دیتے انہیں یہ دھرتی کیسے سویکار (قبول) کرنا ہے؟“ یہ کہتے کہتے حسن کی دیوی کے ابروئے خمار کچھ اور کھینچ گئے۔

”اے ناز آفریں! اے کوئی پناہ نہیں دے سکتا جس کی پیشانی تیرے پائے تنائی پر سجدہ ریز نہ ہو۔ رتن سنگھ کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

رانی پدمنی، نرملا کماری اور آفریدی کے بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر راجہ رتن سنگھ دست شوق نے اس کے ہونٹ بند کر دیے۔ ”مہارانی! ان لحوں کو ایسی یادوں کے حوالے نہ کرو سے نفرتوں کی بو آتی ہے۔ ان ساعتوں کو اپنی سانسوں سے مرکادو کہ سیاست کا تعفن ہمارا غائب کر کرتے یہاں تک آپہنچا ہے۔ اپنی خلوت گاہ شوق میں ہم کسی رقیب کا گزر برداشت نہیں کر سکتے۔ وقت تم صرف رتن سنگھ کی جانب دیکھو اور ماسوا سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

پدمنی کے لبوں پر ایک فتنہ خیز تبسم ابھرا جس نے تمام قانونوں اور قدیلوں کو بھگا کر رکھ دیا تھا۔ شبستان راز و نیاز میں صرف پدمنی کے پیکر تبسم کی روشنی تھی اور سیاہ رات کے دوش پر ایک کافرا کے اس طرح کھڑے تھے کہ فضا شبنم ریز بھی تھی اور شرفشاں بھی۔

☆ ☆ ☆

اور وہی ایک رات کچھ غم زدوں پر موت کی رات کی طرح بھاری تھی۔ اسی رات کے اندھیرے میں کاسب سے بڑا دماغ شعل ہو کر رہ گیا تھا اور وہ کرم سنگھ بے شمار زخموں کے ساتھ فرش زنداں پر بے ہوش تھا۔ اور وہی ایک رات نرملا کماری کو خون کے آنسوؤں لاری تھی۔ ”پتاچی! ابھی تک نہیں آئے۔“ نرملا آہ و فغاں پر قابو پا لیا تھا مگر درد کی شدت سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”حوصلہ رکھو راج کماری!“ ملازمہ رامیشوری نے ماں کا روپ دھار لیا تھا۔ ”آہ خور! آئیں گے۔“

”نہیں رامیشوری! پتاچی عجب انداز سے گئے ہیں۔“ نرملا کالہجہ شکستہ تھا۔ ”جو لوگ اس طرح ہیں وہ کبھی واپس نہیں آتے۔“

رامیشوری کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی مگر وہ پھر بھی اس بیٹی کو تسلیاں دے رہی تھی جس نے ابا بعد اب اپنے باپ کو بھی کھو دیا تھا۔

دوسرے کمرے میں چندر سنگھ، علی عامر آفریدی کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا، ”آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ مائی بھان متی کا یہی کہنا ہے۔“ اور مائی جو کچھ کہہ دیتی

پورا ہو کر رہتا ہے۔“

مائی بھان متی کے نام پر علی عامر آفریدی چونک اٹھا تھا۔ اس نے پہلے بھی یہ نام کئی بار سنا تھا اور عورت کے بارے میں تفصیل جاننے کی کوشش کی تھی مگر وقت نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ

اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ آج جب موقع ملا تو آفریدی نے چندر سنگھ سے مائی بھان متی کے متعلق پوچھ دیا۔ چندر سنگھ، مائی کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا وہ اس نے حرف بہ حرف بیان کر دیا اور خود آفریدی کے سامنے مائی کی پیش گوئی کا اظہار بھی کر دیا۔ آفریدی کو یہ سب کچھ سن کر بہت حیرت ہوئی۔

”میں حیران ہوں چندر سنگھ کہ اس بات کے بارے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بتوں کی خدائی کا اقرار نہیں کرتے۔“ اپناک آفریدی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ”ایک سنیا سی آئندہ پال تھے کہ پتھروں سے بدلت کر تے کرتے اپنی جان تک قربان کر دی۔“ اور اب مائی بھان متی ہیں کہ تنہا عورت ہوتے ہوئے طاقت و اقتدار کی نفی کر رہی ہیں۔“

”سردار! مائی آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“ چندر سنگھ نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”میں نے ان کی آنکھوں میں وہ جذبہ موجزن دیکھے ہیں جو کہ مائی کی محبت ہی کا عکس ہو سکتے ہیں۔“

ماں کے نام پر آفریدی کے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے۔ ”چندر سنگھ میرے بھائی میں اپنی بد نصیبی کا ماتم کروں یا خوش قسمتی کا جشن مناؤں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اپنوں نے مجھے اس حال تک پہنچایا اور پہاڑ نے میری خاطر اپنی زندگی کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا۔ سنیا سی مجھے اپنا بیٹا کہہ کر دوسری دنیا میں چلے گئے۔ پھر میری محبت مہمانتزی نے دی اور نفرتوں کا شکار ہو گئے۔ تیرے زخموں پر مرہم لگا رہے ہو اور نہیں اپنے قاتلوں کو سنگھ کی قبر تک نہیں کہ ان کا کیا حال ہے؟“

آفریدی کی جانگداز باتیں سن کر چندر سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ اگر شاہی سفیر کی آنکھیں روشن نہیں ہوتی تو کچھ لیتا کہ چندر سنگھ کے کرم آنسو اس کے رخساروں کو جلائے ڈال رہے تھے۔

”تم بولتے کیوں نہیں چندر سنگھ؟“ آفریدی نے اپنے تنہائی کے ساتھی کو آواز دی۔ ”مجھ سے مسلسل باتیں کرتے رہو۔ اگر تم خاموش ہوئے تو اس قبر میں میرا دم گھٹ جائے گا۔“

”کیا کون سردار؟“ چندر سنگھ بولا تو آفریدی کو محسوس ہوا کہ اس کی آواز آنسوؤں کے اثرات سے بلیک ہو گئی ہے۔ ”سردار! میرے اختیار میں ہوتا تو ان کے پیروں کی زنجیریں جاتا، اگر وہ رک سکتے تو اپنا سر

کاٹ کر ان کے قدموں میں رکھ دیتا۔ مگر غلامی کی یہی تو وہ منزل ہوتی ہے جو انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے، ہم تو ایک غلام ہیں، صرف ایک غلام، آقا کی ایک جنبش لب کے پابند کیا کرتے سردار؟ آقا نے تو

ہمارے دست و پا ہی مفلوج کر دیئے۔ ہم تو اس چراغ کی مانند ہیں جسے کسی کا مہربان ہاتھ جلا کر خود تار کیکی میں گھونک دیا ہے۔ اور جاتے وقت حکم دے گیا ہے کہ اسی طرح چلتے رہو؛ بارش ستم ہو یا ظلم کی آندھیاں

ہمیں ہمارے لئے یہی ایک حکم ہے کہ ہم ہر موسم میں چلتے رہیں، بھڑکتے رہیں۔ ہم اپنی مرضی سے بچھ بھی نہیں سکتے۔ سردار! بچھ بھی نہیں سکتے۔“ یہ کہتے کہتے چندر سنگھ کی آواز تیز ہو گئی تھی اور وہ بچھیا لالے کر

لائے تھا۔ ”میں جانتا ہوں چندر سنگھ! خوب جانتا ہوں۔“ علی عامر آفریدی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے بھی مہمانتزی سے کئی بار التجا کی تھی کہ وہ مجھے رانی پدمنی کے حوالے کر کے اپنی خاندانی عظمت کو

نہال کر پڑاؤ میں لے لے۔ مگر وہ ایک عظیم انسان ہیں۔ انہیں کبھی اپنی

میں مائل ہو گیا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔“ آفریدی شدت جذبات سے بے قرار ہو گیا تھا۔

”مگر چندر سنگھ نے فوراً ہی آفریدی کو اس اضطراری حرکت

”آپ ہمارے نزدیک آقا کی جھوڑی ہوئی امانت ہیں۔“ چندر سنگھ نے ایک ایک لفظ زور سے کہا۔ ”اس امانت کا بار گرا اس وقت تک ہمارے کمزور کاندھوں سے نہیں اترے گا جب بحفاظت دلی نہیں پہنچ جاتے۔“

”بھی میری منزل تو بہت دور ہے۔“ آفریدی نے دوبارہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے انتہائی کمزور میں کہا۔

چندر سنگھ اس خوفناک جذباتی فضا کے تسلسل کو توڑنے کیلئے اٹھا اور آفریدی کے کمرے سے کماری کے پاس پہنچا جو خاموش بیٹھی سامنے کی دیوار کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہاں یا دوں موجود ہو۔ ”راج کماری! یہ میں ہوں آپ کا سیوک (خدمت گار) چندر سنگھ۔“

”آؤ چندر سنگھ! نرملانے اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اوزھنی کو دوں ہاں ٹھیک کیا اور اپنے خاندانی ملازم سے مخاطب ہوئی۔ ”کیسے آئے؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”آقا کی کوئی خبر نہیں۔ اس سلسلے میں راج دوت بہت پریشان ہیں۔“ چندر سنگھ نے بچہ بچہ کہا۔ ”وہ آپ سے ہمدردی کا اظہار کرنے کیلئے خود یہاں آنا چاہتے تھے۔ اس کشش میں ایک بستر پر اٹھ کر بیٹھ بھی گئے تھے مگر زخموں کی سوزش نے انہیں مجبور کر دیا۔“

نرملانے چہرے پر اذیت کا ایک رنگ ابھر کر ڈوب گیا۔ ”انہیں راج دوت نہیں سردار“ نرملانے باوقار لہجے میں چندر سنگھ کو حکم دیا۔ ”وہ یقیناً علاء الدین خلجی کے راج دوت ہیں یہاں ان کی حیثیت ایک سردار، ایک رہنما کی سی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نرملانے کماری اٹھ کھڑی کیا۔ ”میں خود ان سے بات کروں گی۔“

چندر سنگھ اور رامیشوری حیرت سے اپنی آقا زادوی کو دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے جو اپنی زندگی کی ہولناک تنہائی سے کھرا کر ہر شخص کے چہرے کو ادا د طلب نظروں سے مگر جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر جانے لگی تو ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ نرملانہ تمام راجپوت لڑکیوں مختلف لڑکی ہے۔ اس کا اٹھنے والا ہر قدم ہمت و استقامت کی ایک نئی داستان بنا رہا تھا۔

”آپ کی کیسی طبیعت ہے؟“ اچانک علی عامر آفریدی نے ایک دلکش آواز سن کر اس سے وقار جھٹک رہا تھا۔

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں راج کماری۔“ آفریدی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اس پہلی بار کسی ناخام و دو شیزہ سے گفتگو کی تھی۔ اس لئے آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ نرملانے کماری کے لہجے میں بے باکی کے ساتھ ایک جھڑپ کی طرح کہا۔ ”یہ خون کے نشانات ظاہر کرتے ہیں کہ آپ نے احتیاط نہیں برتی۔ پھر کہیں کوئی زخم نہ رہا ہو؟“

”کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا تو صورت حال معمول پر تھی۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟“ نرملانے بڑے عجیب لہجے میں شکایت کی تھی۔ علی عامر آفریدی چند لمحوں کیلئے ٹائٹ

”آنکھوں کی روشنی چلے جانے کے بعد اپنے عیوں کو بھی نہیں چھپا سکتا۔ کامیاب جھوٹ بھی ہیں جنہیں روشنی میسر ہو۔“ آفریدی کو اپنی بنیائی لٹ جانے کا بڑی شدت سے اس

”راج کماری! معاف کرنا میں دیکھ بھی نہیں سکتا اور چل پھر بھی نہیں سکتا۔ اگر یہ دونوں مجبور میں خود رانی پد منی کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مجھے جس طرح جلا یا جا رہا ہے اس کا کسی شمعیں تو پکھل پکھل کر جل جاتی ہیں، دھواں بھی دیتی ہیں، بجھ بھی جاتی ہیں۔ مگر میں نہ جلا

ہو نہ دھواں دیتا ہوں۔ کیسی سوزش ہے، کسے بتاؤں؟ سلطان نے اپنا امین بنا کر یہاں بھیج دیا۔ لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں لالہ رانی کو منتقل کی تو کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ میری ماں اور بھائی میں بے اماں

جب پتا چلی کہ آپ کو اس ظلم کے لئے تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تھا میں ان کے اس فیصلے سے نہ مرنا بلکہ کئی مقامات پر میں نے ان سے اختلاف بھی کیا تھا۔ یہ میرے اپنے ذہن کی رسائی تھی۔ میرے دیوتا ہی سب کچھ تھے مگر آپ کے طرز عمل نے پتھروں کی نفی کر دی۔ آپ نہیں جانے کہ جب بت لٹوئے میں تو انسان کے دل پر کیا گزر جاتی ہے میں بھی اسی عذاب سے گزرتی رہی پھر میں نے پتھروں اپنا ایک ایک رشتہ توڑ لیا۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اور پتا جی دوبارہ ان ہی پتھروں کے آگے سرخشاں اس انسان کو پتھروں سے ٹکرا کر ہلاک ہو جانے کیلئے جھوڑ دیں جو خود شیشے کا ہے اور جس کے دل پر پھولوں کی نرم پتیوں سے بنائے گئے ہیں۔

”میں تو یہ نہیں چاہتا کہ آپ دوبارہ پتھروں کے کاروبار کو زندہ کریں۔“ آفریدی نے ٹھہرا کر تو یہ احساس آزار پہنچا رہا ہے کہ میری وجہ سے کتنے آباد گھرانے ابڑ گئے اور کیسے سربز جھوڑا باؤ خزاں کے گرم جھونکوں میں جھلس گئے۔

”میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ اپنے اس احساس کو دل سے کھرچ ڈالیں۔ میں نے اپنے اس میدان جنگ کی طرف رخصت کیا ہے جہاں وہ اکیلے ہیں اور بے شمار خون آشام شمشیریں ان کا کر رہی ہیں۔ اب اس سے جانگداز خبر اور کیا آسکتی ہے کہ مہمانی و کرم سنگھ قتل کر دیئے گئے۔“ کماری یہ واقعہ اس طرح بیان کر رہی تھی جیسے وہ کسی دوسرے انسان کے قتل کی تماشائی ہو۔ اس کی آوا ہلکا سا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

”آفریدی کی دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس لڑکی کو دیکھ سکتا۔ ہر اسے عزم اور حوصلے کی ایک نئی داستان سنائی تھی۔“ راج کماری! میں نے آپ کو دیکھا نہیں صرف سنی ہیں، بڑی عجیب باتیں ایسی باتیں جیسے کسی چٹان سے یہ صدا آرہی ہو، جیسے پہاڑ کی کوئی ناقابل فہم خبر سے ہم بکلام ہو۔“

آفریدی کی زبان سے اپنی اس قدر تعریف سن کر نرملا شرماسی گئی۔ پھر اس نے بہت مدھم بھم بھم ”آپ ان فضول باتوں میں اپنے ذہن کو نہ الجھائیں اپنی صحت کی طرف دھیان دیں وہ وقت بہت ہے جب آپ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکیں گے۔“

”میں چوتھیں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔“ ٹیکلیک آفریدی کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا۔ ”اب تو میں ایک ہی خواہ ہے کہ جب آنکھوں کی روشنی واپس آئے تو سب سے پہلے اپنے محسن و کرم سنگھ کا چہرہ دیکھوں۔ ہم راج کماری کو دیکھوں جو ایک سپاہی کو بچاتے بچاتے خود بھی وقت کے مقبرے میں داخل ہو گئی ہے۔“

”آپ پھر بے مقصد گفتگو کر رہے ہیں۔“ نرملا نے آفریدی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”جب امیر قندہ دل شکستہ ہو جائے تو دوسرے ہم سفروں کا کیا حال ہوگا۔ آپ اپنے ذہن پر اتنا دباؤ نہ ڈالیں کہ آپ کی روشنی مزید متاثر ہو اور منزل کا نشان دھندلا ہوتے ہوئے مٹ جائے۔ اگر ایسا ہو تو پتا جی کے حادثے کے بعد یہ میری دوسری ہدف بھی ہوگی۔“ یہ کہہ کر نرملا تیرہ قدموں سے واپس ہٹ گئی۔

پھر جب چند سنگھ واپس آیا تو آفریدی نے اس سے کہا ”تمہاری راج کماری تو بہت پرسکون نظر آتی ہیں۔“

”ہاں سردار! وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اتنی ہی پرسکون نظر آتی ہیں۔“ چندر سنگھ کی آواز سوگوار کی جھلک رہی تھی۔ ”وہ چٹانوں کے لہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر سختی ہوتی ہے۔“

”ہاں سردار! وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اتنی ہی پرسکون نظر آتی ہیں۔“ چندر سنگھ کی آواز سوگوار کی جھلک رہی تھی۔ ”وہ چٹانوں کے لہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر سختی ہوتی ہے۔“

”ہاں سردار! وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اتنی ہی پرسکون نظر آتی ہیں۔“ چندر سنگھ کی آواز سوگوار کی جھلک رہی تھی۔ ”وہ چٹانوں کے لہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر سختی ہوتی ہے۔“

☆ ☆ ☆

اور وہ ایک رات شانستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کیلئے قیامت کی سی رات تھی جس طرح آفریدی چوتھ میں رہ کر اپنی والدہ اور بہن کو بحالت خواب بہت زیادہ پریشان اور خوفزدہ دیکھا کرتا تھا اسی طرح شانستہ بیگم نے اسی انداز کے کئی خواب دیکھے تھے جو ان کے بیٹے آفریدی پر نازل ہونے والی آفات کی عکاسی کرتے تھے۔ شانستہ بیگم ان خوابوں سے اس قدر سہمی ہوئی تھیں کہ ان کی نیندیں تک اڑ گئی تھیں۔ ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانوسی کے مزار کے سجادہ نشین ایک مرد کامل ہیں۔ وہ علم ظاہری و باطنی کے علاوہ علم تعبیر میں بھی بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔ شانستہ بیگم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بزرگ کسی روز ان کے مکان پر تشریف لے آئیں اور ایک غمزدہ خاتون کے کچھ خواب سن کر ان کی تعبیر بیان کر دیں۔ مگر بعد میں شانستہ بیگم پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ وہ ایک گوشہ نشین بزرگ ہیں جو اپنے جگرے سے بہت کم نکلے ہیں۔ ضرورت مند لوگ خود ہی ان کے آستانے تک جاتے ہیں اور ان کی روحانی برکتوں سے نیش یاب ہوتے ہیں۔ مجبوراً شانستہ بیگم نے حضرت شیخ جمال الدین ہانوسی کے مزار مبارک پر حاضری دینے کا ارادہ کیا وہ بعد نماز مغرب اپنی بیٹی عالیہ آفریدی کو مردشتے داروں کی نگرانی میں چھوڑ کر دیگر خواتین کے ساتھ ان بزرگ کی خانقاہ جانا چاہتی تھیں مگر جب رات کا اندھیرا پھیل گیا اور شانستہ بیگم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو ان پر یہ بے نیامک راز فاش ہوا کہ مکان کے چاروں طرف مسلح سپاہی گشت کر رہے ہیں۔

”خاتون! آپ کھر کے اندر تشریف لے جائیں، آپ کو اس چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ ملک کانور کے متعین کردہ ایک سپاہی نے مذہب لہجے میں شانستہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آخر اس کی وجہ؟“ شانستہ بیگم کا لہجہ کرخت تھا۔ وہ اسلامی تہذیب کی نمائندہ خاتون تھیں۔ اس لئے قرآن کریم کے حکم کے مطابق نا محرموں سے گفتگو کرتے وقت اپنے لہجے کو سخت کر لیا کرتی تھیں تاکہ لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے شیطان بیدار نہ ہو سکیں۔

”یہ سلطان کا حکم ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔“

چہلے دروازے پر کھڑی کچھ سوچی رہیں اور پھر اگلے قدموں اندر چلی گئیں۔ ماں کو اس طرح واپس آنے کی توجہ دینا آفریدی بے قرار ہو کر پوچھنے لگی۔ ”مادر گرامی! آپ نے اپنا ارادہ کیوں ملتوی کر دیا؟“

”آفریدی کی بوفائی ایک الگ مسئلہ ہے، ہم اسے بعد میں دیکھیں گے مگر انی پد منی ہمارے حکم کی پابند
ہی ہے۔ بلاآخر سلطان کے حرم میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔“ علاء الدین خلجی کے غضب کی آگ کا
وازیہ جلا جاتا تھا۔ ”راجہ رتن سنگھ اس بات کا پابند تھا کہ وہ ہمارے حضور معذرت نامہ پیش کر آیا اپنے
پن ہمال کیلئے ہماری پناہ مانگتا۔ فرمان شای سے یہ بے رخی ناقابل برداشت ہے۔ اسے نہ زمین معاف
کے کی اور نہ آسمان۔“

”بے شک! جسے سلطان معظم پناہ نہ دیں اسے دنیا میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔“ یہ کہتے کہتے
لک کا نور اس قدر جگ گیا کہ اس کا سر فرش سے ٹکرانے لگا۔ ”جب ایک نمک حرام شخص کی وجہ سے
عزت نام کا مہم جوئی تو سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرا سفیر چوڑی کی جانب روانہ کیا جائے اس سلسلے میں غلام
پنا حقیر ذات پیش کرتا ہے۔“

”نہیں ملک! شہنشاہ جاگیرداروں سے مراسلت نہیں کرتے۔“ علاء الدین خلجی کے قہر کی لے تیز
ہوئی جاری تھی۔ ”وہ تو ہمارے دل کا مسئلہ تھا کہ ہم نے اپنا سفیر بھیج دیا اور نہ خود پورے چوڑ کو ہماری
رہنمائی کیلئے حاضر ہونا چاہئے تھا۔“

”مالک جاہو حتم بد نصیب راجپوتوں کو ایک مہلت اور عطا کیجئے۔“ ملک کا نور گڑ گڑانے لگا۔ اس کی یہ
ذلت آمیز خوشامد شخص اس لئے تھی کہ معاملات طول پکڑ جائیں یہاں تک کہ سلطان کے دل سے
انی پد منی کا خیال مٹ جائے اور وہ آفریدی کے انجام سے مکمل طور پر باخبر ہو جائے۔

”مہلت دی جاچکی۔“ علاء الدین خلجی کی آواز میں بکلیوں جیسی کڑک تھی۔ ”خواجہ! ایک لمحہ
ماتع کے بغیر کوچ کی تیاریاں کرو۔“ علاء الدین خلجی اپنے جہاں دیدہ اور دلیر سپہ سالار خواجہ حاجی کی
رف مزہ۔ یہ تجربہ کار اور سرور گرم آتشا میر لشکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور شاہ کے سامنے گردن جھکا لی۔
”عراقی! بس ایک دن یا دو دن! ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔“ سلطان نے دوسرے
سپہ سالاروں کی طرف دیکھا۔ عراقی نے بھی خواجہ حاجی کی تھلید کی اور اپنے فرمانروا کے روبرو سر تسلیم خم
دیا۔

”ہم خود اس فوجی مہم کی قیادت کریں گے۔“ برق جلال پورے دربار میں لہرا رہی تھی۔ ”ہم تو چاہتے
تھے کہ چوڑ ہمارے قہر و غضب سے محفوظ رہے مگر افسوس ان راجپوت تاجروں پر جو ہم سے آگ اور خون کا
غلاں لاشوں کے ذریعے، خون کے آبشار، غلامی کی زنجیریں، غربت و نامرادی کی تسکین ہوئی
ہوئی، اسے جو بھرت چوڑ! ہمارے ہاتھوں کی طرف دیکھ کہ وہ کتنے دراز ہیں۔ اے اراو لی اور آبو کی
نسل! اہل ہند کا قہر کا اندازہ کرو کہ تمہاری انھی ہوئی گردنیں ہمارے قدموں تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔“
موت جہنم میں علاء الدین خلجی کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی تمام حاضرین مجلس بھی اپنی نشستوں پر
بٹھ ہو گئے۔

پچیس دربار پر سکوت طاری تھا اور علاء الدین خلجی کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش صاف نظر آرہی
تھی۔ یہ پہلے ہوئے جذبات کا لاوا تھا۔ جو انسانی جسم میں زلزلے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ”تم لوگ اس بات
میں گواہ رہا کہ ہم نے سر رہا ان چوڑ کو پورا موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو سکیں مگر
کونسلرانیانیت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔“ سلطان کے غصے کی کیفیت جنگل کی آگ جیسی تھی
پوری شدت کے ساتھ بھڑکا رہا تھا۔

ہیں، خدا آفریدی کو اپنی امان میں رکھے۔ سلطان کے معتبر سفیر کی ماں کے ساتھ یہ نازیبا سلوک کی ط
یا طوفان کی نشاندہی کر رہا ہے شاید میرا بیادرباری سازشوں کا شکار ہو گیا۔“
عالیہ آفریدی لرز اٹھی۔..... اور پھر ”میرا بھائی۔“ کہہ کر ماں سے لپٹ گئی۔

”مینی میں انسانی جذلوں کے خلاف نصیحتوں کا بند باندھنا نہیں چاہتی مگر پھر بھی میری تلقین کرتی
کہ تیرے آسوخے اہل دنیا کے سامنے تماشا بنادیں گے ان اشکوں کو خشک کرنے کیلئے کوئی مہمان
تیری طرف نہیں بڑھے گا۔ مگر سوا کن انگلیاں ضرور اٹھیں گی۔“ شائستہ بیگم نے بڑے تحمل سے
سمجھایا تھا مگر خود ان کی پلکیں بھی ہلک جکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور وہی رات دلی میں بڑی ہنگامہ خیز رات تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے تمام
مصاحبوں، مشیروں اور سپہ سالاروں کا اجلاس طلب کر لیا تھا ان سپہ سالاروں میں خواجہ حاجی
تاج الدین عراقی نمایاں تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے بھی سلطان کے مصاحب خاص کی حیثیت سے
ہنگامی اجلاس میں شرکت کی تھی۔ جب تمام مشیر اور سپہ سالار جمع ہو گئے تو علاء الدین خلجی نے انہیں
انہیں دیکھا اور پھر انتہائی پرجلال لہجے میں اپنے اراکین سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ گواہ ہو کہ جس نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہم نے اس کے دامن کو اپنی نواز
سے بھردیا اور جس نے ہم سے نظر پھیر کر بات کی اس سے وقت نے منہ موڑ لیا۔ راجہ رتن سنگھ اور انی پد
بھی ان ہی بد نصیب لوگوں کی قطار میں کھڑے ہیں جن کے زوال و بربادی پر عنقریب زمانہ مرثیہ پڑے
اور ان کے دریدہ دامن میں ہیک کے چند ٹکڑے بھی نہیں ساسکیں گے۔“ علاء الدین خلجی کے
سے آگ برس رہی تھی۔ ”ہمارے سفیر کو کوئی پتہ نہیں کہ چوڑ کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس کے
کیا سلوک کیا گیا۔ آفریدی ایسا نوجوان نہیں تھا کہ دربار چوڑ میں گھٹنے ٹیک کر تادہ تو ہمارا پناہ
علاء الدین خلجی کا پناہ، سرکش و سر بلند و سرفراز پھر وہ کیوں واپس نہیں آیا! دور دراز تک پہنچے
ہمارے تجربوں کا کہنا ہے کہ راستے سے کوئی گرو غبار نہیں اٹھا، کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہیں
تمام راہیں سونی پڑی ہیں۔ پھر آفریدی کا راستہ کس نے روکا اور ہمارے حکم نامے کے روشن حرف
چوڑ کی پیشانی پر کیوں رقم نہیں کئے گئے؟“ دربار کے ایک ایک گوشے میں سلطان کی آواز گون گون رہی تھی
اس کی قہر آلود نظریں ایک ایک چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی تھیں۔

”اس لئے کہ سفیر معتبر نہیں تھا۔“ ”یگانیک ایک نرم آواز ابھری۔ ایسی آواز جس میں مردانہ جلال
تھا۔ یہ آواز ملک کا نور کی تھی جو سلطان کے بائیں جانب دست بستہ بیٹھا تھا جب علاء الدین خلجی نے
مجلس سے یہ سوال کیا تو کسی میں جواب دینے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی مگر ملک کا نور کی محبوبیت نے
علاء الدین خلجی کے سامنے بے باک بنادیا تھا۔

سلطان کے سارے مصاحب اور مشیر ملک کا نور کے اس طرز گفتار پر حیران رہ گئے کیا انقلاب تھا کہ
شخص نے ذلت و رسوائی کے سائے میں پرورش پائی تھی اور جو نسل آدم کی تاریخ میں سب سے
شرمناک باب کا اضافہ کرنے کے بعد علاء الدین خلجی کے دربار میں اس منصب تک پہنچا تھا اس
غلیظ ہاتھ ایک غیرت مند سردار کی دستار فضیلت کو پارہ پارہ کر رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے ملک کا
کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ سپہ سالار خواجہ حاجی اور تاج الدین عراقی کی نظریں بھی اس بے غیظ
جانب اٹھی تھیں مگر فوراً ہی جھک گئیں۔ احساس ندامت سے ان دونوں کے جسم پیٹنے میں نہاتے تھے۔

عراقی کی زبان سے فاتح عالم کا لفظ سن کر علاء الدین خلجی کے ہونٹوں پر پیمانی بار خفیف سا تسمیم نمودار ہوا۔ کئی سالوں سے سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تمام مشیر اور سردار سلطان کے اس خواب جہانگیری سے آگاہ تھے۔ اس لئے عراقی نے قصد افنا فتح عالم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ علاء الدین خلجی کے جذبہ تفسیر نے اس ایک لفظ سے تسکین حاصل کر لی اور وہ تعریفی نظروں سے عراقی کی طرف دیکھنے لگا۔

”عراقی! سلطان کی آواز تیز ہو گئی۔ ”تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے محل سے قدم باہر نہ نکالیں اور تم چوڑا ہالال کروالو؟“

مجھے ہی عراقی کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی اہل مجلس نے دوبارہ سلطان کے چہرے پر آتش غیظ کو بھڑکتے دیکھا۔ علاء الدین کی بلند پیشانی لکڑیوں سے بھر گئی تھی اور کشادہ آنکھوں کے گوشے سنٹے جا رہے تھے۔

”تم مجھے چاہتے ہو عراقی کی ہم اپنی زندگی کی دشوار ترین مہم سے پیچھے موڑ کر بزم کیف و نشاط میں گہری نیند سو رہے ہو۔ اس بات پر یقین کر لیں کہ تمہارے گھوڑوں کے سم اروا کی چوٹیوں سے چنگار یاں پیدا کر دیں گے۔ میں اب یہ کر نہیں ہو سکتا۔“

گوئی کہ شہ پروردگار نے تم کو تھکایا ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم قہرِ پیر اکبرؑ کے ہمارے جلال سے بے جا سپاہیوں کے جسم و جان میں موت سے ٹکرانے کی مینٹن کرنا شروع کیا ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں۔ صرف ہمارے جلال کی نمود اور ہمارے وقار کا قبول بالا۔“

جی سیدر نکار پر کھڑا تھا۔ اس فاصلے اور بلندی کے سبب میثروں اور سپہ سالاروں

”نہیں سلطان والا حشم! یہ غلام اہل ہندو کے کسی مفروضے کو اہمیت نہیں دیتا۔“ بالآخر تاج الدین کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”دنیا میں ہر حقیقت پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ وہ فلاحِ عالم کے سائے! مفروضہ یاد اہمہ بن کر رہ جائے۔“

”پھر ہمارے چہرے پر دھوبیں لے بادل سے ہیں؟“ اسقام کی جلا دیے والی دھوپ یوں آتی؟“ علاء الدین خلیج اپنے سپہ سالاروں کی سردمزاجی سے ناراض نظر آرہا تھا۔

علاء الدین خلجی نے بڑے بے نیازانہ انداز میں اپنے اس سپہ سالار کی گفتگو سنی جو امور جنگ و
خاص مہارت بھی رکھتا تھا اور اپنے سلطان کا اس قدر وفادار بھی تھا جس نے خواجہ کو مردانہ اعتبار کی عزت
نمایا اس مقام پر شہنشاہ۔

خواجه حامی کے خاموش ہونے کے بعد تاج الدین عراقی اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھا اور اسے
تک اٹھایا کہ آدابِ شاہی کے دائرے سے باہر نہ ہو سکے۔ ”سلطان“ ذی وقار یہ ایک ننگ خوارانہ
اپنے شاہ کے اضطراب سے بے خبر نہیں۔ کوئی ایک غلام بھی اس عرصے میں چین کی نیند نہیں سلا۔
ہماری آنکھیں بھی جل رہی ہیں اور خون میں بھی شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اب یہ آگ اسی وقت ٹھنڈی
جب سلطان کے شبستان میں مرادوں کے پھول کھل جائیں گے۔“

عراقی کی جاں نثارانہ گفتگو سن کر علاء الدین خلجی کے چہرے کے تناؤ میں کسی قدر کمی آئی۔
”آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو عراقی؟“ اچانک سلطان کا لہجہ شر بار ہو گیا اور سلگے ہوئے چہرے پر
جو نرمی پیدا ہوئی تھی وہ چند ثانیوں میں غائب ہو گئی۔

کے قد پہلے سے بھی زیادہ چھوٹے نظر آنے لگے۔

”تم جانتے ہو خواجہ کہ چوڑ کیا ہے؟“ اب کی بار سلطان نے گردن کج کر کے خواجہ عالمی کی طرز دیکھا تھا۔

”نہیں سلطان محترم! غلام کچھ نہیں جانتا۔“ سپہ سالار خواجہ نے شاہ کے بگڑتے ہوئے تیوروں کو بھونک لیا تھا۔

”جب تم لوگ چوڑ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو تمہاری زبانوں پر فن و نصرت کے بے نیاز ترائے کیوں ہیں؟“ ایک بیک علاء الدین خلجی گرجے لگا۔ ”چوڑ وہ ہے جس پر ہمارے پیش رو حکمران مرزا لپٹائی ہوئی نظریں ڈال کر رہ گئے۔ کسی فرمانروا نے آگے بڑھ کر آہنی سے ارادوں کی سرکوبی نہیں کی۔ تم نے غور سے نہیں دیکھا کہ ”آبو“ کا سر پر غور رکھ کر بلند ہو گیا ہے اور ”ارادوں“ کی گردن میں ٹی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے۔ اس کجی کا علاج صرف ہمارا دست کار کشائی کر سکتا ہے۔ وہ ہی ہیں جو رتن سنگ کے تاج و تخت کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ سکتے ہیں اور وہ ہماری ہی ذات ہے جو پدمنی کے حریری آنچل میں اُلٹا سکتی ہے۔ ہاں! وہ ہی ہیں ہمارے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ بس! تم لوگ جاؤ اور اپنی صفیں آراستہ کرو۔“ کہہ کر سلطان علاء الدین خلجی نے اہل مجلس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ سلطان کی یہ ادائے خاص تھی کہ جب وہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا چاہتا تو اپنے چہرے کا زاویہ تبدیل کر لیتا۔

”تمام حاضرین مجلس رخصتی آداب بجالائے اور گردنیں جھکا کر سلطانی خلوت خاص سے باہر آگے۔“

ملک کا نور اب بھی سلطان کی تنہائی میں موجود تھا۔

”ملک! تمہاری موجودگی نا فرمانی کی دلیل ہے۔“ علاء الدین کے لہجے میں اب غصے کی آگ نہیں۔

نقروں کی نغمیاں پوشیدہ تھیں۔

”شاہ والا! وہ غلام تو نا فرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جسے سلطان کی نظر کرم نے تخلیق کیا اور سلطان کا نگاہ قربی ایک دن اسے فنا کر دے گی۔“ یہ کہتے کہتے ملک کا نور سجدہ ریز ہو گیا۔ کسی خوشامدھی کا لکھ

غلام نے اپنے آقا کو خدائی صفات کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

”تم یہاں کیوں موجود ہو؟“ سلطان نے اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے ملک کا نور کی طرف دیکھا۔

”یہ نمک خوار اپنے آقا کو بھجان و اضطراب کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“ ملک کا نور گڑگڑائے لگا۔

”دوسرے لوگ جانتے ہیں کہ انیس سلطان کی بے قراری کا احساس نہیں مگر یہ غلام کس طرح چاہا کہ اس پر تو سکون کی ایک سانس بھی حرام ہو چکی ہے۔“ سلطان کے پیروں میں ملک کا نور کی گرفت بکھوڑ

مضبوط ہو گئی تھی خوشامد و گدگاری کے انداز نے پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر لی تھی۔

”اشو ملک! ہم تم سے راضی ہیں۔“ سلطان نے اپنے دائیں پیر کو تخت کی سطح سے بلند کیا اور اس کے ساتھ ہی ملک کا نور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری یہی ادا ہمیں آسودہ کر دیتی ہے کہ تم ہمارے سوا کسی دوسرے شے کے بارے میں نہیں سوچتے۔“

ملک کا نور نے اطاعت و فرمانبرداری کی نمائش کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سینے کی بلندی تک بٹہ

لئے اور سر کو اس قدر جھکا لیا کہ اس کے جسم پر حالت رکوع کا گمان ہونے لگا۔

”اور ملک! ہمارے سوا کسی کے بارے میں سوچنا بھی مت کہ ہم اپنی ذات کو خدا دیکھنا پسند کرتے

ہیں۔“

”نہیں سلطان! ذی حشم! یہ غلام کبھی اس گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔“ ملک کا نور آج کی بار

خوشامد کی آغوش بستیوں میں اتر جانا چاہتا تھا۔ ”اب تو اس نمک خوار کے وہم و گمان میں بھی کوئی دوسرا نہیں آتا۔ دل و دماغ کے سارے گوشوں سے، روح کی ہر گہرائی سے بس ایک ہی صدا آتی ہے۔ مالک مہادرجا! صاحب اقتدار و جروت، سلطان عالم علاء الدین خلجی اس ایک نام نامی کے بعد کوئی دوسرا نام نہیں کوئی نہیں۔“ خلوت شاہ میں بستیوں اور غلامتوں کا ایک گہرا اپنا پٹا طانی کردار بھرپور انداز میں ادا

کر رہا تھا۔

”تمہارے لئے ہر حالت میں امان ہے۔“ سلطان کا ہاتھ بڑھا اور ملک کا نور کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔

”غلام کو اپنی فکر نہیں، شاہ والا! کی اداس اور جلتی ہوئی راتوں کا غم ہے۔“ ملک کا نور سیدھا ہو گیا تھا اور سلطان کو علاج غم کی ترغیب دے رہا تھا۔

”نہیں ملک! اب یہ راتیں ہمارے جلنے کی راتیں ہیں۔“ علاء الدین خلجی نے ملک کا نور کے اشاروں کی زبان کو جھٹلایا تھا۔

”سلطان معظم نے تو ہمیشہ پازیب کی جھکار کو تلواروں کی کھنک کا درجہ دیا ہے۔“ ملک کا نور کی خوشامدوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ”کئی دن سے ایک ایرانی راقصہ شادمان حضور کی چشم و دلنواز

کی خطر ہے۔“

”نہیں ملک! اب ہم شمشیر اور پازیب کی آوازوں کو ہم آہنگ نہیں ہونے دیں گے۔“ سلطان کے چہرے پر اچانک بیزارگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ”اب ہم رقص و فن دیکھیں گے اور نوز و مرگ

منہیں گئے۔“

”کم سے کم اپنے جتنے ہوئے اعصاب کو تو سکون پہنچا لیجئے۔“ ملک کا نور نے بادہ گرگ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہمارے ارادے ہمیشہ تو ناورد تازہ دم رہتے ہیں۔ ہم شراب کے چند قطروں میں نہا نہیں ڈھونڈتے۔“

”شاہ والا! ایک ایک ادا سے یہ غلام واقف ہے۔“ ملک کا نور نے سلطان کو برہم ہوتے دیکھ کر سر جھکا دیا۔

”بھرم تم بھی اپنا چہرہ ہماری نظروں کے سامنے سے گم کر دو۔ اس وقت ہمیں کسی شے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ ہر صورت مکروہ اور ہر آواز نا قابل برداشت ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم چوڑ کے ماتھے پر

البرسٹولی سر غلامی کے سوا کچھ دیکھنا نہیں چاہتے اور پدمنی کی آواز کے سوا کوئی آواز قبول سماعت نہیں کہ وہ

بلوے سامنے بے حجاب ہو اور اس کی جلوہ آرائیاں ہمارے التفات خاص کی جھیک مانگ رہی ہوں۔ اس

فیصلے کے ساتھ ہی ہم نے ہر قطرہ شراب کو اس وقت تک کیلئے اپنی ذات پر حرام کر لیا ہے جب تک ہمارے

ہونٹ سرکشوں اور نا فرمانوں کی شرگوں کو نہیں چھو لیتے۔“

ملک کا نور نے اندازہ کر لیا تھا کہ جنگ سلطان کے ذہن پر مسلط ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ لرزتے ہوئے

قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

علاء الدین خلجی اپنے کمرے میں تماشل رہا تھا اور اس کی قہر آلود نظریں ہندوستان کے نقشے پر مرکوز

”زمین والوں نے اپنی حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور وہ آسمانوں کی طرف اڑنے لگے جیسے وہ ہوں کی حدود سے نکل جائیں گے مگر ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ ایک دن ان پر ان کے مکان بھی بہت ہوں کی عبادت کی جارہی ہے وہ ان کی لاشوں کو بھی قبول نہیں کرے گی۔“ یہ بہر جائیں گے۔

ملک کا فساد شدت خوف سے لرزنے لگا۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا اور کئی برسوں سے مسلسل سن رہا تھا۔ یہ آواز ہمیشہ رات کے وقت قلعے کی فصیل کے نیچے سنائی دیتی تھی۔ اس آواز پر پہرے بٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ کئی پیش پست مصاحبوں نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ وہ آواز ان کے نشاط آمیز خوابوں میں غلغلہ مچاتی ہے، اس لئے آواز کو بند کر دیا جائے مگر علاء الدین خلجی ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ فساد کو بند کرو۔ اگر وہ آواز کسی کی سماعت پر گراں گزرتی ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے درتپے بند کرے اور اپنے کانوں پر دیز غلاف لپیٹ لے۔

لوگوں میں لرزہ ڈال دینے والی وہ آواز دلی کے مشہور بزرگ بشیر مجذوب کی تھی بشیر ایک صاحب جذب ہونی چاہتے تھے جنہیں عشق خداوندی کی آگ نے جلا دیا تھا وہ حقیقتہً بہت باخبر انسان تھے مگر اہل دنیا کیلئے ہمیشہ پوش نظر آتے۔ ہر وقت ان کے گرد حاحات مندوں کا جھوم رہتا تھا مگر بشیر کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ کمر لگی بولنے تو ایسے اشاروں میں کہ ان کا کھنکھانا مشکل ہوتا۔ دن بھر کسی درخت یا دیوار کے سائے میں بیٹے رہتے۔ رات ہوتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دیتے اور دلی کے مختلف گلی کوچوں میں نعرہ زنی کرتے رہتے۔ یہ ان سے عجیب عجیب کلمات ادا کرتے۔ عام لوگوں کیلئے ایک مجذوب کی بے سرو پاپاتوں میں کوئی مفہوم نہ ہوتا مگر اہل خبر جان لینے کہ بشیر کیا کتنا چاہتے ہیں وہ درپردہ مگر اہل حکمرانوں کو بھی متنبہ کرتے اور عوام الناس کو ڈراتے لیکن اس طرح کہ ہر بات ایک معمہ ہوتی۔ نصف شب کے قریب بشیر مجذوب سلطان علاء الدین خلجی کے عظیم الشان محل ”قصر ہزار ستون“ کے نیچے سے گزرتے اور اپنی زبان میں جو کچھ کہتا ہوتا کہہ جاتے۔ شروع میں علاء الدین نے بھی بشیر مجذوب کی اس نعرہ زنی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا مگر وہ روز گاہ دین کی عظمتوں سے واقف تھا اس لئے بشیر کو چھیننے کی جرأت نہ کر سکا۔

نقص ہر استون کے رہنے والے روزانہ ہی اس مرد قلندر کی آوازیں سنتے۔ کبھی صد بلند ہوتی۔
 "افسوس! بے خبریوں کی بستیوں پر کہ آگ ان کے گھروں تک اچنچی اور وہ بے ہوشی کی نیند سو رہے
 ہیں۔"

کبھی اس لیے میں پکارتے۔
 ”نفسان بڑا شکر ہے۔ اس کیلئے کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی گئیں مگر اس نے پاکیزہ چیزوں سے ہاتھ کھینچ لئے اور غلاموں سے اپنے شکم بھر لئے۔“
 کبھی لوں پکارتے۔

ہیں وہ اس لئے اہل جفا کو پوری مہلت دی مگر مستکروں نے سمجھ لیا کہ خدا بے اثر ہو گیا۔ ”

تھیں۔ وہ بار بار نقشے کے سامنے رک جاتا اور ان چند لکیروں کو غور سے دیکھنے لگتا جن کے درمیان ایک نو چوڑ لکھا ہوا تھا۔ بہت دیر تک سلطان کی نگاہیں اسی خاص نقطے پر جمی رہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے اٹھایا اور چوڑ کے دائرے میں کئی شگاف ڈال دیئے۔ ہر مرتبہ سلطان کا خنجر اٹھتا اور وہیں کھڑے رہ کر اپنے نقشے کے ایک مخصوص حصے کو چیرتا ہوا گزر جاتا اور ہر بار سلطان کے ہونٹوں سے ایک ہی کلمہ ابھرتا۔

”من فاتح عالم چوڑ رانخت و تاراج کردم۔“ (میں نے ایک فاتح عالم کی حیثیت سے چہرہ تباہ و برباد کر ڈالا)

ان الفاظ کی بازگشت کے ساتھ ہی سلطان علاء الدین خلجی کا تقسیمہ بند کرے میں گونجنے لگا اور وقت کوئی دوسرا شخص سلطان کی خلوت میں موجود ہوتا اور اس ہنسی کی آواز کو سن لیتا تو اسے یہی گمان ہوتا کہ موت بے شمار انسانوں کی لاشوں پر تقسیمہ زن ہے۔

پھر یکایک سلطان علاء الدین خلجی نے نقشے کے اس مخصوص حصہ پر سیاہی پھیر دی اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

”اے بد نصیب چوڑا! ہم نے تیرا مستقبل سبیلہ کر دیا۔“

ادھر اپنے شہستانِ خاص میں فرمانروائے ہند جی کے مضبوطے ترتیب دے رہے تھے اور دوسری طرف نو ہزار ستون کے ایک کمرے میں تمام بڑے سپہ سالاروں کا خفیہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ان سپہ سالاروں میں خواجہ حامی اور تاج الدین عراقی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان دونوں سپہ سالاروں نے حضرت امیرؒ کو بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ جب یہ سلطنتِ خلجی کے مضبوط ترین مہرے کمرے کے ایک گوشے میں جمع ہو گئے تو عراقی نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سب پر فرض ہے کہ کسی طرح سلطان کو اس ارادے سے باز رکھیں اور وقارِ شاہ کے نازک انیسے کوچوڑ کے برابر ہم چھروں سے بچانے کی کوشش کریں۔“

”میں تو سلطان کے روبرو لب کشائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ سالار خواجہ حاجی نے اپنی مجبورِ بارِ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”پوری سلطنت میں بس ایک امیر کی ذات ہے جو سلطان کو کوئی مشورہ دے سکے ہیں۔“ خواجہ نے خسروؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امیر خسرو کچھ دیر تک خاموش بیٹھ رہے۔ پھر بہت آہستہ سے بولے۔ ”میں مزاج سلطانی سے واقف ہوں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لینے کے عادی نہیں ہیں۔ پھر بھی میں کسی مناسب موقع پر کوشش کروں گا؟“ شاہ کی آتش جلال سرد ہو جائے اور وہ اس بازی سے ہاتھ اٹھالیں جس کے کھیلنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ عراقی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ برہمن راگھو جیتن کو قتل کر دیا جائے تاکہ وہ رانی پد منی کے حسن و قصیدے پڑھ کر سلطان کے شعلہء عشق کو مزید نہ بھڑکاسکے۔

”اب اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ حضرت امیر خسروؒ نے کہا اور وفادارانِ ملت خفیہ اجلاس پر خاست ہو گیا۔

☆ ☆ ☆
رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ علاء الدین خلیجی خیالات کے دوش پر پرواز کرتے ہوئے چہرہ
واغل ہو گیا تھا اور اس نے تصورات کی دنیا میں چہرے کو تھام کر باد کے خینکے کی آغوش میں تھام دیا تھا۔
نصف شب کے ہوتے ہوئے پورا قصر ہزار ستونوں سو گیا تھا مگر ملک کا نور اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ اپنی
رات کے سنائے کا جگر چاک کر کے ایک تیز آواز ابھری۔

”ہو دوں اپنے گھر میں محصور کر دی گئی ہیں۔ بس حضور کے دوسرے اشارے کا انتظار ہے۔“

”ہاں ہوتوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری۔“

”ہمارے دوسرے حکم کے منتظر ہو۔ ان دونوں شریف زادیوں کو بھی بہت جلد ایک لرزہ خیز انجام سے دوچار ہونا ہے۔“ یہ کہتے کہتے ملک کا نور نے بلوریں ساغر کو اتنی طاقت سے دبا یا کہ وہ کھڑے کھڑے زمین پر گر پڑا۔

”نور! آپ کا یہ دست مبارک..... اور خون.....“ نور اب قرار ہو کر آگے بڑھا۔

”ہمارے خون کے چند قطرہوں کی طرف نہ دیکھ، لو کہ اس سپہدر کی جانب نظر کر جو عنقریب اپنی

”ہمیں قہر کر ہندوستان کے گلی کوچوں میں بہہ نکلے گا۔“

”نور! ملک کا نور کورات کا آخری سجدہ کرنے کے بعد کمرے سے جانے لگا تو علاء الدین خلجی کے محبوب غلام کی آواز گونجی۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”یہ ایک آفریدی موت کی نیند سوچکا ہو گا مگر ہمیں جاگتے رہنا چاہئے کہ آنے والی ہر رات قیامت کی رات ہے۔“

”تو نے شرفاء کے گریبان چاک کر ڈالے اور اپنے بدن پر گناہوں کی قباحتیں بکرا دیں۔“

”بہت عار منی ہے۔ دیوار کو نہیں دیکھا کہ وہاں تیرے لئے کیسی پستیاں اور ذلتیں لکھ دی گئی ہیں۔“

”بشیر مجذوب کی آواز آہستہ آہستہ سنسن فضاؤں میں ڈوب گئی اور ملک کا نور کا خوف و ہراس

ہوا جسم میں سے نکل گیا۔ بشیر مجذوب نے رات کے اندھیرے میں راہ چلتے چلتے اسے آئینہ دکھایا تو وہ

کا نور اس آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر ایک بار پھوڑ پھوڑ گیا تھا۔ اس کا پس چلتا تو دلی کے اس مرد قہر کو

کھینچ دیتا یا اس کے جسم کے کھڑوں سے اقتدار کے مقلد کو آراستہ کر دیتا۔ مگر وہ مجبور تھا اور اپنی ہی

کے احساس کو مٹانے کیلئے اس نے ایک لبریز جام سرخ اپنے حلق میں اتار لیا۔ پھر جب اعصاب آہستہ

سن ہوئے لگے تو ملک کا نور نے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ کو آواز دی۔ ”نور!

ملک کا نور کی آواز سنتے ہی نور اکرم سے میں داخل ہوا اور احتراماً اس طرح جھک گیا جیسے دوسرا

سلطان علاء الدین خلجی کے سامنے سجدہ ریز ہو جایا کرتے تھے۔ ”نور! ملک کا نور کے معتد سے

سپاہی تھا جس کا اصلی نام نور الدین تھا لیکن ملک کا نور اسے نور اکرم کر پکارا کرتا تھا۔“

”اشھ اور سیدھا کھڑا ہو جا۔“ ملک کا نور نے اپنے قدموں پر جھکے ہوئے نور کو ٹھوکر مارے ہوئے

نور ایک غلام کی ٹھوکر سے کانپ اٹھا اور لرزے جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ”حضور! کیا اس غلام

کوئی گناہ سرزد ہو گیا؟“ نور کی آواز میں گہری لرزش تھی۔

”یہ مکاریاں چھوڑ اور ہمیں تفصیل سے بتا کہ آفریدی کا کیا حشر ہوا؟“ ملک کا نور اسے

ہوئے واقعات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”سرکار! میں تو سب کچھ عرض کر چکا۔“ نور کا جسم بدستور کانپ رہا تھا۔ ”اس بات کو ایک

زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔ اب کیا باقی بچا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔“ نور نے ملک کا نور کے سامنے دونوں

جوڑ دیئے تھے۔

”بد بخت! تجھے نہیں معلوم کہ سلطان نے چوڑ پر لشکر کشی کا ارادہ کر لیا ہے؟“ ملک کا نور نے

ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ”اسے بند کر دے۔ اگر میری زبان سے ادھر ہوا

لفظ بھی کمرے کی چار دیواری سے باہر چلا گیا تو ہم سب کی شہر گیس کاٹ دی جائیں گی اور ہمارے جسم

کتوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔“

نور نے ووڑ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور جواب طلب نظروں سے ملک کا نور کی طرف دیکھنے لگا۔

”اگر سلطان نے چوڑ پر قبضہ کر لیا اور آفریدی وہاں موجود پایا گیا تو پھر.....؟“ فرطِ غصہ

ملک کا نور کا سوال ادھر ادھر گیا تھا۔

”حضور! آفریدی تو کب کا سرچکا۔ زمین کی خوراک بن چکا۔ پھر ایک مردہ کیڑے کے نصیب

اپنے ذہن کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟“ عیار نور الجہ بدل بدل کا ملک کا نور کو مطمئن کرنے کی

کرت رہا تھا۔ ”اگر اب بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو پھر اپنی شمشیر سے اس غلام کا سر قطع کر دیجئے کہ میرا

کی قربانی آفریدی کی موت پر آخری گواہی ہوگی۔“

ملک کا نور حیرت سے نور کی طرف دیکھنے لگا جس کی گردن اس غلام کی مانند جھکی ہوئی تھی

کرنے کیلئے مقلد کی جانب بڑھا یا جا رہا ہو۔ نور کی چرب زبانی بہر حال رنگ لائی اور ملک کا نور نے

سکون و اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

”اور ہانسی کی صورت حال کیا ہے؟“ ملک کا نور نے شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کی طرف اشارہ کیا۔

کچھ طے پایا تھا، آج رات اس کے خلاف عمل ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے امیر خسروؒ نے سوچا کہ وہ بھی ہوا اختیار کر لیں مگر انہیں اپنا وعدہ یاد آگیا اور اسی وعدے کو وفا کرنے کیلئے وہ ایسی فضا میں بول اُڑا امن و سکون کی گفتگو کیلئے قطعاً ناساز گار تھی۔

بظاہر امیر خسروؒ کے ہونٹوں پر ہر مسکوت تھی مگر آپ کا چہرہ کسی خاص اضطراب اور بے چینی کاغز امیر خسروؒ اپنی نشست پر بار بار پھلویدل رہے تھے کہ اسی دور ان سلطان نے ان کی طرف دیکھا۔ ”خسروؒ! ہم بے چین نظر آ رہے ہو۔“ علاء الدین خلجی اپنی عادت کے خلاف نرم لہجہ میں ہوا اور کیوں نہ ہو تاکہ امیر خسروؒ عام درباری مصاحب نہیں تھے۔ شاہ کے ملازم ہوتے ہوئے بھی آپ خاص درجہ احترام رکھتے تھے۔ خسروؒ نے علاء الدین خلجی کی شان میں بے شمار قصیدے لکھے تھے مگر یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا محبوب مرید تماشا گاہ خلجی کا ایک کھلونہ کر ہو۔ علاء الدین کا رعب و جلال اپنی جگہ مگر خسروؒ سے ہم کلام ہوتے وقت سلطان کو اپنا بوجہ دلانا اس وقت بھی وہی کیفیت تھی کہ علاء الدین نے ایک مخصوص رعب اور انیت کے ساتھ امیر خسروؒ اضطراب کا سبب دریافت کیا تھا۔

”سلطان! یہ خادم اپنی ذات کیلئے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔“ امیر خسروؒ نے درباری آداب رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر؟“ سلطان کا سوال بہت مختصر تھا۔

”میری یہ وحشت اور بے چینی بھی آپ کی بے خوابی کے سبب ہے۔“ امیر خسروؒ نے اتنا ہی ا سے اپنا مدعا بیان کرنے کیلئے تمہید باندھی۔

”خسروؒ! ہم تمہارے جذلوں کی سچائی سے باخبر ہیں۔“ سلطان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہ آئی تھی۔ ”ہم جانتے ہیں کہ اگر ہماری آنکھیں جاگیں گی تو تمہاری پلکیں بھی نہیں چمکیں گی۔“

”اگر آپ کو اپنے خدام کے جذبات کا اس قدر پاس ہے تو پھر اپنے شہستان جمال میں کو خواب کہ جائے کیلئے لاکھوں غلام ہیں۔“ حضرت امیر خسروؒ علاء الدین خلجی کو آہستہ آہستہ اس دائرے

طرف کھینچ کر لارہے تھے جہاں ایک شہنشاہ سے نازک ترین موضوع پر گفتگو کی جاسکتی تھی۔ ”نہیں خسروؒ! ابھی کچھ دن کیلئے ہم نے اپنی آنکھوں پر نیندیں حرام کر لی ہیں۔“ سلطان ا دائرے میں سمٹ گیا تھا۔ ”اگر ہم سو گئے تو ہندوستان کی تقدیر سو جائے گی۔“

”بے شک! سلطان کی بلند اقبالی اہل ہند کی قدیروں کو تاریک سایوں سے محفوظ رکھے گی مگر پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ محض چوڑی خاطر قصر ہزار ستون کو خالی نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ امیر خسروؒ بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ”ہر طرف نئے نئے فتنے سر اٹھ رہے ہیں زمین کے بیشتر غلام ہنگاموں کے بیچ بوائے جا رہے ہیں۔ اگر شاہ والا کی غیر موجودگی میں شورشوں کی یہ زہریلی فصل پاز اس کے اثر سے ہماری سکون و عافیت کی اہلسانی کھیتیاں جل اٹھیں گی۔“

”خسروؒ! ہم کہیں بھی رہیں مگر ہمارا جلال ان کھیتوں کی حفاظت کرے گا۔“ علاء الدین اپنے ذہن کے خول سے نکلنے کیلئے آمادہ نہیں تھا۔

”سلطان معظم کا ہر ارشاد بجا مگر پھر بھی خادم کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔“ اب یہ واضح انداز میں اپنا مفہوم پیش کرنا چاہتے تھے۔

”خسروؒ! حضرت شیخ کے صدقے میں تم کسی اجازت کے پابند نہیں ہو۔“ علاء الدین خلجی

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کیلئے ایک عقیدت خاص کا اظہار ہو رہا تھا اور اسی عقیدت نے اسے خسروؒ کے سامنے بھی نرم گفتار بنادیا تھا۔ ”خسروؒ! تمہیں جو کچھ کہتا ہے بے خوف و خطر کہو۔ ہماری ساعیتیں تو تہدی شیریں کلائی کی بیش بہا منتظر رہتی ہیں۔“

”سلطان والا! کیا چوڑی پر لشکر کشی کا حکم آپ کی کسی اضطرابی کیفیت کا نتیجہ ہے۔“ امیر خسروؒ نے سلطان کے جتنی منصوبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں خسروؒ! ایسا ہرگز نہیں۔“ سلطان علاء الدین خلجی کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رھاں تھی، ہم مضطرب ضرور رہتے ہیں مگر ہمارے اضطراب کسی احمق یا دیوانے کا اضطراب نہیں۔ جو لوگ ہمارے اس فیصلے کو ایک عاشق کا فیصلہ سمجھتے ہیں وہ مزاج شاہ سے کچھ زیادہ آشنا نہیں۔ ہم نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ چوڑی تباہی کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسی تباہی کہ جس کی شدت یا کسی کا انحصار راجپوتوں کے طرز عمل پر ہے اگر وہ آسانی کے ساتھ ہمارا بخشا ہوا طوق غلامی اپنی گردنوں میں ڈال لیں گے تو قطعاً چوڑ

کے دیوار اور ہمارے قریب سنگباری سے محفوظ رہیں گے۔ اور اگر ان لوگوں نے سرکشی اختیار کی تو ہمارا اتر راجپوت ریاست کے آثار تک جلا ڈالے گا۔ اس طرح کہ پھر ان بد نصیبوں کی بربادی پر کوئی مرثیہ پڑھنے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ چگاڑوں میں ان کے شہستانوں میں بیڑا کر س کی اور لوؤں کا غول ہماری فتح کے

فدے بجا کر کما کرے گا۔ ”چوڑ میں بسنے والے گیدڑوں کی ایک نسل نے ترکی شیروں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی ابھی شیروں نے اپنے دانت اور پنجے کھولے بھی نہ تھے کہ گیدڑوں کی پوری قوم ان کے قدموں کی دھمک سے مر گئی۔“ علاء الدین خلجی کے لہجے کی آگ اس قدر بھڑک چکی تھی کہ امیر خسروؒ کو اپنے نرم و شیریں الفاظ بے حقیقت نظر آنے لگے تھے۔

ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد حضرت امیر خسروؒ دوبارہ علاء الدین خلجی سے مخاطب ہوئے۔ ”شاہو ذوقدار! بے شک! ہم آپ کے مزاج کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر کیا ایک شادی شدہ عورت کا وجود اتنا قیمتی ہے کہ جس کے حصول کیلئے سلطان اپنے جاں نثروں کے قافلے کو واڈی مرگ میں

گم کر دینا چاہتے ہیں؟“ ”خسروؒ! ہم جسے شاعر و دانشور کی زبان سے یہ الفاظ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“ علاء الدین خلجی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”کیا کسی جاں نثار کو اپنی زندگی ہمارے حکم سے زیادہ عزیز ہے؟“ سلطان نے امیر خسروؒ سے سوال کیا۔

”شاہو عالی مقام! میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس معرکہ آرائی کو ایک عورت کے حسن و عکاسے وابستہ نہ کیا جائے کچھ بھی ہو، ایک ساحرہ کے چشم و لب اس لائق نہیں کہ وہ سلطان کو واڈی فانی سلطان لائیں اور فواد کے اعصاب رکھنے والا شہنشاہ موم ہو کر رہ جائے۔ میں اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ

گردنیں بے دغاں پیراہن فتوحات پر شکست کا کوئی داغ ابھر آئے۔ اور یہ غلام ندامت و شرم ساری سے پہلے کٹنے کی فیصل پر کھڑے ہو کر قہقہہ زنی کریں۔ یہ بڑی ہولناک صورت حال ہوگی کہ رانی پدمنی اور اس کے تہاڑا زہارے جسموں کو اس طرح چھید رہے ہوں کہ ہم نے میدان جنگ سے منہ موڑ لیا ہو۔ سلطان

ننگ نواڑوں کا اقتدار بھی نہیں کر سکتا کہ آپ کا وقار خود غلاموں کا وقار ہے، آپ کا اقتدار خود مجاہدین کا ہے۔ اور آپ کا جذبہ تسخیر خود غلاموں کے سینوں میں پرورش پاتا ہے۔ اگر یہ

مجاہدین اس قدر مہیا تو آپ کے قطار در قطار غلام بھی حسرت و مراد کے ساحل پر پیاسے مرجائیں گے اور وقت

کامورخ زندگی کے قرطاس پر یہ عبارت تحریر کر دے گا کہ والئی ہند نے خود اپنی فتوحات کا احرام منہا محض شعلہ لبور خسار میں جلنے کیلئے پوری سلطنت خلیجی کو آگ اور دھوئیں کی نذر کر دیا اور وقت بہ یہ بھی لکھے گا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا سوداگر جس کی تیلاہ گاہ میں بڑے بڑے حکمران اپنی قیمتیں کرانے آتے تھے وہ خود چوڑے ایک دیرہاتی بازار میں سستے داموں فروخت ہو گیا۔ شہنشاہ ایہ خسار تجارت ہوگی۔ کاش! آپ پدمی جیسی جنس حقیر کی طرف سے منہ پھیر لیں اور راستے کے اس بے ہودہ کو ٹھوکر مار کر اپنی منزل کے دائرے سے خارج کر دیں۔ کاش! ایسا ہو جائے۔ کاش! ایسا ہو جائے امیر خسرو بڑے حسرت آمیز لہجے میں یوں رہے تھے۔

”تہیں خسرو! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ ایک باہر پھر سلطان کے لہجے سے جلال کی آگ برسنے لگی وہ ”ایک شاعر اور حکمران کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے تم اپنے تصور میں آسمانوں کی سیر کر سکتے ہو مگر اونچے ایک نیلے پر نہیں چڑھ سکتے۔ پھر کہاں وہ ”اراہلی“ اور ”آبو“ کی سرکش چوٹیاں۔ خسرو! تم کے شکاریوں کو پھونک بھی نہیں سکتے مگر تمہارا سلطان پہاڑوں کو اپنے قدموں پر چھکا سکتا ہے۔ ہم رانی پا کو ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے الگ کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری تو خواہش ہے کہ راجپوت سورما اپنی آن کر ریزہ ہوتے دیکھیں اور پھر ہمارے قہر کی آندھی ان ریزوں کو تاریخ کے اوراق پر یکجہ دے۔ ہم نے کر روز و شب کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ہماری تاریخ رقم کرے ہم تو خود ہی اپنی تاریخ لکھتے ہیں اور اس وقت تک لکھتے رہیں گے جب تک فرشتہ اجل ہمارے ہاتھ سے قلم نہ چھین لے اور خون روشنائی کو فرش پر نہ بہا دے۔“

دیوار دور پر سکوت مرگ طاری تھا اور اہل مجلس کے دل کی دھڑکنیں اس طرح سنائی دے رہی تھیں جیسے سارے کے سارے دل سینے کی ہڈیاں توڑ کر باہر آگئے ہوں۔ امید کی آخری کرن بھی بجھ گئی تھی پھر اسی اندھیرے کا قبضہ چیرتی ہوئی سلطان کی آواز دوبارہ ابھری۔

”نہیں خسرو! تمہارا سلطان اس قدر عاقبت کا اندیش اور بے خبر نہیں ہے۔ اپنے فرمانروا کو بھروسہ رکھو۔“ علاء الدین خلیجی نے تمام اراکین مجلس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”خسرو! یہ جنگ عورت کیلئے نہیں لڑی جا رہی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے قہر کے کتنے رنگ ہیں؟ اور چ تو یہ ہے خود بھی اپنے قہر کی انتہا سے واقف نہیں اگر ہم اپنے بلب کسی گلاب کے چرے پر رکھ دیں تو وہ ہمارے متحمل نہ ہو سکے اور دیکھنے والے دیکھیں کہ گلاب جل اٹھا ہے اور اس کی پتیوں سے چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ اگر ہم کبھی کسی نازنین کے پیکر کیس کو چھو لیں تو وہ بھی ہمارے قہر و جلال کی حرارت سے تھکی چلنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ایک ڈھیر ہو جائے۔ ہماری چشمِ تنخیر تو آتشوں کو بھی خوں دیکھتی ہے ہم تو نیم و صبا کی سرکوشیوں میں بھی موت کے نغے سنتے ہیں تم ایک عورت کا ذکر کرتے نہیں خسرو! یہ تمہاری لغزش نگاہ ہے اور عراقی؟ تمہاری بیانی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اور خواجہ! تم آکھیں دھندلا گئی ہیں تم لوگ اپنے چروں سے دس قدم آگے تک بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تم ناپائیدار ہو! اور یہ بھی کہو کہ تم بے ہوش و بے خبر ہو! اور یہ بھی کہو کہ تم مزاجِ شاہ سے قطعاً نا آشنا ہو! اور کہو کہ تمہارے شکستہ بال و پر طوفانی فضاؤں میں اپنے سلطان کی بلند پروازی کا اندازہ نہیں کر سکتے علاء الدین خلیجی کے الفاظ نے شعلگی کی قبائیں کی تھیں اور لہجے کی حرارت سے پوری مجلس جل اٹھی تمام سپہ سالاروں اور مشیروں کے سر جھک گئے۔ علاء الدین خلیجی کی فطرت نے نقاب ہونچا اور مزاج اس قدر برہم ہو گیا تھا کہ اب اسے اعتدال پر لانے والا کوئی نہیں تھا۔

”سلطنت خلیجی کے وفا شعار خدمت گزارو! ہم تمہیں کیا بتائیں کہ ہمارا قہر کیا ہے؟ ہم خود بھی نہیں جانتے کہ ہمارا جلال کیسی کیسی شکلیں اختیار کرتا ہے اور اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہونے کیلئے کیسے کیسے نہایت تراشتا ہے؟ پدمی کی ذات بھی محض ایک بہانہ ہے۔ راگھو چیتن کتاب ہے کہ وہ عورت صرف ہمارے حرم کیلئے پیدا کی گئی تھی مگر تن سنگھ نے اسے اپنے عشرت کدے کی زینت بنالیا ہم جانتے ہیں کہ وہ قریب کار بہن ہمارے قہر کی پناہ میں آکر تن سنگھ سے اپنی ذلت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ہمیں صرف ایک غضب ناک حکمران سمجھتا ہے جسے کوئی بھی خوشامدی درباری آگ کے شعلے کی طرح ہلکا سا سکتا ہے۔ وہ کیسا احمق ہے کہ ایک عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کو دل کے ہاتھوں میں پھیلنے والا ایک ٹھکانہ قرار دیتا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ ہمارا دل بھی ہمارے قہر و جلال کا تابع ہے اس کی دھڑکنیں بھی ہمارے دماغ کی پابند ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر ہمارا دل بھی کسی کے گیسوؤں کا سیر نہیں ہو سکتا۔ اگر بھی ایسا ہو جائے تو ہم اپنے دل کو بھی سینے سے نکال کر پھینک دیں۔ اس لومڑی کو خود ہم نے ایک موقع فراہم کیا ہے کہ وہ شیروں کے نرے میں سے کچھ دیر اچھل کود کر لے ہم تو اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ ایک کم ظرف اپنی ہی قوم کی ایک عورت کے جیاد سوز افسانے غیر مرد کو سنارہا ہے۔ وہ بے غیرت راٹھو چیتن ہیں کچھ گاہ کہ ہم کون ہیں اور اپنے جاہ و جلال کے کتنے حوالے رکھتے ہیں۔“

”یہ کون سا شاہ والا! بے شک۔“ کئی آوازیں بیک وقت ابھریں حاضرین مجلس نے اپنی گردنیں جھکادی تھیں اور زبانوں کو سلطان کی تعریفوں کیلئے وقف کر دیا تھا وہ جانتے تھے کہ اب علاء الدین کی سامعین کسی ایسے حرف کو قبول نہیں کریں گی جو اس کے منصوبے کی خلاف ورزی کرتا ہو۔

تاہم امیر خسرو کی ایک تہنا ذات تھی جس نے آخری وقت تک علاء الدین خلیجی کو اس کے خوفناک ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”خسرو! ہم تمہاری ذہانت کے بھی قائل ہیں اور تمہاری وفاداریوں کو بھی بے داغ سمجھتے ہیں۔“ اس وقت علاء الدین خلیجی قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ”تمہارے اندیشے درست ہیں مگر پھر بھی ایک شاعر ہی کا اندیشہ نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ہم ایک پیدائشی فاتح ہیں۔ پیدا کرنے والے نے ہماری تقدیر میں فتح کے سوا کوئی دوسرا لفظ تحریر نہیں کیا ہم تو شکست کے تصور سے بھی آشنا نہیں۔ یہ غلط خیال ہمارے ذہن میں کبھی نہیں ابھرا۔ چوڑے کا محاذ پر بھی ہم شکست کا منہ نہیں دیکھیں گے۔ دوسرے لمحے کے بدلے میں بڑوں کو ہارنے کوکے لوگ سوچتے ہیں۔ ہمارے لئے تو بس یہی ایک لمحہ ہے۔ یہ راز کوئی نہیں جانتا کہ ہمیں المام ہوتا ہے اور اسی المام نے ہمیں بتایا ہے کہ ارادوں کی ساری چوٹیاں جدہ ریزی کیلئے تیار کھڑی ہیں۔ بس انہیں ہماری آمد کا انتظار ہے۔ ہمارے قدم آگے بڑھیں اور وہ اپنی ماتر بلند یوں کے ساتھ جھک جائیں۔“ یہ کہہ کر علاء الدین خلیجی چند ساعتوں کیلئے خاموش ہو گیا اور اپنی روشن و کشادہ آنکھوں سے اہل مجلس کو دیکھنے لگا جن کی گردنیں خم تھیں اور چہروں پر مصنوعی شادابی تھی۔

”خسرو! ہم نے تمہاری باتیں بہت غور سے سنیں۔ غلاموں کی تربیت کے فلسفے کو بھی سمجھا۔ مگر غلام تو ہی لے کر پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کے ایک اشارے پر قربان ہو جائیں۔ یہی غلاموں کا سب سے بڑا اعزاز ہے اگر وہ اس اعزاز سے محروم رہ جائیں تو پھر انہیں غلام نہیں کہا جاسکتا۔ وہ حشرات الارض کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کوئی بھی حادثہ انہیں پامال کر کے بے نام و نشان بنا سکتا ہے۔ غلاموں کی حقیقی پہچان یہ ہے کہ وہ کس کے غلام ہیں؟ علاء الدین خلیجی کے یا خوف و ہراس کے دائرے میں سے ہونے کی کھمت حکمران کے غلام۔ یقیناً وہ فاتحِ عالم کے غلام ہیں اور ان کی قیمتیں دنیا کے عام غلاموں

سے کہیں زیادہ ہیں ہمارے جاں نثاروں کو اس بات پر یقین کر لینا چاہئے کہ ہم اپنے نام لیاؤں گے اور تم خود بھی سمجھ لو کہ ایک نازنین کے لبہ و خرا گراں بہا نہیں ہیں کہ ہم تم جیسے وفادار ان سلطنت کو چوڑی اجنبی واہوں میں لے جا کر موت کے ایک لقمہ بنادیں۔ ہم نے آفریدی کو اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ ہمارے لئے رانی پدمنی کے وصال کی بات لگے۔ یہ تو ہمارے اقتدار کی ایک ادا ہے، سیاست کا ایک عجیب منصوبہ ہے جسے باشندگان ہند سمجھ سکتے اور نہ اہل چوڑ۔ مگر تم لوگ ہمارے معتمد ہو اس لئے تمہیں جان لینا چاہئے کہ ہم نے بساط عشق کو سلوڈ ہی سمجھا ہے ہم نے رتن سنگھ کو اس کے ناموس کی گالی دی ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور سوراخ سے گھبرا کر باہر نکل آئے جسے وہ شیر کا غار سمجھتا ہے۔ وہ اول و آخر ایک چوہا ہے جسے چوڑ کی پناہ گاہ نے خود ساختہ شیر بنادیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کلمات سن کر اس چوہے کی نیندیں حرام ہوں گی اور وہ پاگل ہو کر باہر آنے کیلئے بے قرار ہو گا۔ بس یہی وہ ساعتیں ہوں گی جب ہم چوڑ کے سر اس کی آزادی کا تاج اتار لیں گے اور ہمیشہ کیلئے ”اراوی“ اور آبو کی گردن میں غلامی کا طوق ڈال دیں پھر یہ سر بلند پہاڑ ہماری عظمتوں کے ترانے گائیں گے۔“

اہل مجلس حیرت سے اپنے سلطان کا رخ تابناک دیکھ رہے تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ رانی پدما نادیہ عاشق اپنی محبت کے پردے میں اس قدر خوفناک جنگی منصوبہ ترتیب دے چکا ہے۔ مجلس کا یہ سکوت بہت عارضی تھا اچانک علاء الدین خلجی اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ”خواجہ! تم اپنی مقبوضہ دست رکھو کہ کل صبح ہم قصر نزار ستون کو اس وقت تک کیلئے خیر یاد کہہ دینا چاہئے جب تک قلعہ چوڑ پر ”علائی پرچم“ نہ لہرا جائے۔ اور عراق! تم بھی ان جوانوں کو تیار کی حکم دے دو کی شمشیروں کی کاٹ نرالی ہے اور جن کی شہسواری کے انداز ساری دنیا سے انوکھے ہیں۔“

خواجہ جامی اور تاج الدین عراقی کے ساتھ دوسرے سپہ سالار بھی اٹھے۔ رخصتی آداب پیش کئے سلطان کی مجلس خاص سے اس طرح باہر نکلے جیسے ان کے قدم اراوی اور آبو کے نامور راستوں پر پڑ ہوں۔

☆.....☆.....☆

حضرت امیر خسروؒ بھی دیگر سپہ سالاروں اور مشیروں کے ہمراہ جانا چاہتے تھے مگر انہیں سلطان کہہ کر روک لیا۔ ”خسرو! تم کہاں جا رہے ہو ہم نے بہت دنوں سے تمہاری کوئی غزل نہیں سنی۔“

امیر خسروؒ اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر سلطان کا حکم سن کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

”خسرو! چوڑ ہماری سیاسی اور تجارتی ضرورت ہے اگر ہم اس علاقے کے راجپوتوں کی سرکوب کریں گے تو پھر ہماری سلطنت کی یہ ہمہ گیری بھی برقرار نہیں رہے گی۔ ہمیں اقتدار کی وسعت کے ساتھ تجارت کا فروغ بھی درکار ہے۔ ہماری آنکھیں برسوں سے تغیر عالم کا خواب دیکھ رہی ہیں مگر ہم حقیقت کو جانتے ہیں کہ ابھی ہندوستان کے بعض گوشوں پر ہماری گرفت کمزور ہے۔ چوڑ بھی ان ہی حلقوں میں سے ایک ہے کہ اگر اسے بہت جلد مغلوب نہیں کیا گیا تو ہمارا خواب بکھر جائے گا۔ دیگر اہل سلطنت سمجھتے ہیں کہ ہم رانی پدمنی کے جنون میں مبتلا ہیں۔ انہیں ایسا سمجھنے دو۔ خود ہم بھی ایسی چاہتے ہیں ہمارے قربانکاروں پر حسن پرستی کا پردہ ہمارے مگر تمہیں تو جان لینا چاہئے کہ چوڑ ہماری داستان کا ایک ایسا صفحہ ہے جو اب تک علانی فوجات کی کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنا تحریر میں جلد از جلد یہ صفحہ بھی جوڑ دیں۔“

”خسرو! چوڑ ہماری سیاسی ضرورتوں کو سمجھتا ہے۔“ امیر خسروؒ نے اعتراف کر لیا کہ قلعہ چوڑ کو ختم کرنا ہمارے لئے ایک نازنین کا پابند ہونا چاہئے۔“

”خسرو! تم اپنے سلطان کے جذبوں کا پاس تو رکھتے ہو مگر ہماری تسکین کیلئے عملی قدم نہیں اٹھاتے۔“ علاء الدین کا منہ کھلا کر ادا کیا تھا جسے کوئی شخص اپنے قریبی ساتھی سے خفا ہو مگر اس خفگی میں بھی محبت کا رنگ

شامل ہو۔ ”خسرو! چوڑ ہمیں اس نے بھی اپنے عمل میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہو۔“ امیر خسروؒ حیران ہو کر

سلطان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ”یہ کوئی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہماری درخواست اب تک حضرت شیخ کی سماعت سے نہیں گزری۔“ علاء الدین خلجی نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا مقصد بیان کیا اور پُر امید نظروں سے خسروؒ کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں آج رات ہی پیر و مرشد کی بارگاہ جلال میں سلطان کی درخواست پیش کروں گا۔“ بالآخر امیر خسروؒ راضی ہو گئے۔

”خسرو! حضرت شیخ کی جناب میں ہماری درخواست کس طرح پیش کرو گے؟“ علاء الدین خلجی اچانک مضطرب نظر آنے لگا تھا۔ ”تم جانتے ہو کہ چوڑ قلعہ کیسے پر خطر مقام پر آباد ہے۔ راجپوت اپنے اس آہنی حصار پر ناز کرتے ہیں۔ انہیں اپنی اس پناہ گاہ پر غور ہے۔ کئی حکمران پتھر کی ان بلند دیواروں سے گرا کر اپنی لوٹ گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا سلطان بھی نامرادوں کی صف میں کھڑا ہو اور آہن کی آنکھ ذلت کا مظہر نہاں تماشا دیکھ رہی ہو۔ خسرو! وہ بڑا نازک وقت ہو گا علاء الدین اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔ خدای جاننا ہے کہ پھر تمہارے شاہ کا کیا حشر ہو ممکن ہے کہ قصیدہ لکھنے کے بجائے تم اپنے سلطان کا مرثیہ لکھو۔“

”ایکایک علاء الدین خلجی بہت زیادہ شکست نظر آنے لگا تھا۔ ”نہیں سلطان ایسا نہیں ہو گا۔“ علاء الدین خلجی کی حالت دیکھ کر امیر خسروؒ بھی افسردہ و پریشان نظر آنے لگے تھے۔ ”اس کائنات کا مالک میرے شیخ کی ہمت سنتا ہے۔ اس نے میرے پیر و مرشد کی دعاؤں کو بے قیوت سے کبھی واپس نہیں لوٹایا۔ انشاء اللہ! آپ کی فتوحات کا دامن داغدار نہیں ہو گا۔ آپ تو فنا میں موجود نہیں ہوں گے مگر چشم تصور سے دیکھ لیجئے گا کہ خادم نے حضرت شیخ کے پائے مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور یہ سراسر وقت تک نہیں اٹھے گا جب تک محبوب الہی (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) اپنا دست و دعا نہیں بلند نہیں کر دیں گے اور یہ نمک خوار اس وقت تک اپنے مرشد کا دامن نہیں چھوڑے گا جب تک دعا یہ کلمات سے حجۃ شیخ کے دیوار دور نہیں گونج اٹھیں گے۔ آپ کی سرخوردگی اور فتنہ مندی کیلئے ان کی شبائے شیخ سے سب کچھ مانگ لوں گا۔“

”اے افسردہ! ایسا کیوں کرنا۔“ علاء الدین کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ”ہم تو خود اپنے قدموں سے گل کر بارگاہِ شمس حاضر ہونا چاہتے تھے مگر کیا کریں کہ شیخ نے ہمارے پاؤں ہی کاٹ دیے ہیں۔ وہ ہم نے زیادہ تنگ کیا تو شیخ ہمارا تنگ ہی چھوڑ دیں گے۔ خسرو! یہ کیسی مجبوری ہے کہ ہم حضور شیخؒ نہیں اور ہمیں مجبوری ہے کہ اپنا سچا کعبہ اجازت کے بغیر ہی چلے جائیں مگر.....“ علاء الدین خلجی نے اپنی بات

”نہیں سلطان، معظم! ایسا کبھی نہ کیجئے گا۔“ امیر خسروؒ نے گہرا کر کہا۔ ”آپ حضرت شیخ کے مزاج

لکھنا شروع کیا۔ شہزادہ سمجھتے ہیں کہ شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے دکھاتے ہمارے بازو شل ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے بے خبر اور نادان ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے اعصاب تھک گئے ہیں اور ہم تھک رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم نے اپنے بچائے کوئی خواب اور ساز سننا چاہتے ہیں۔ صد حیف! وہ بہت جاہل ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم نے اپنے سوا کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تو جنگ و باب کیلئے اپنی سماعتوں کے دروازے محض اس لئے کھول دیئے تھے کہ کبھی آنے والا وقت ہمیں سنگد آہن کا انسان نہ کہنے والے یہ نہ لکھیں کہ سلطنت جنگ و جدل کے علاوہ کسی چیز سے رغبت ہی نہیں تھی۔ ہم نے لوگوں کے امن و سکون کی خاطر اپنا بدل ڈالی تھی اپنے مزاج کو تبدیل کر لیا تھا مگر اہل چوڑ بڑے احسان فراموش ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے الطاف و اکرام کا شکر ادا نہیں کیا۔ اور ہم ایسے ناشکروں کو معاف نہیں کرتے۔

یہ کہہ کر سلطان گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے مڑا اور اپنی شمشیر بے نیام کا رخ قصر ہزار ستون کی طرف کر دیا پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔

”اے ارض دلی! ہمارا انتظار کر کہ یہ چند روزہ سفر ہے۔ ہم غمغریب اس طرح واپس آئیں گے کہ چہرہ فتح و نصرت کے جلال سے سرخ ہو رہا ہو گا اور سرزمین چوڑ بڑے حکم کے تابع ہو چکی ہوگی۔“

ان الفاظ کی گونج میں سلطان کا لشکر آگے بڑھا۔ ہر سپاہی اپنی جگہ مطمئن تھا کہ وہ وادی فک کی طرف ہے اور اس سفر میں واپسی کے امکانات بہت کم باقی رہ جاتے ہیں اس لئے ہر مسلمان فوجی کے جذبہ ہی کے تھے۔ گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہی سلطان کے ہر لشکری نے موت کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا۔ خیالوں کی دنیا میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا گھوڑا اپنی حدود مملکت میں کسی ہموار راستے پر خوشام آراوی اور آہو کی چوٹیوں پر دوڑ رہا ہے اور ہر طرف خوفناک آوازیں گونج رہی ہیں۔ گھوڑے کے سوار چٹانوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آوازیں۔

لشکری روانگی سے پہلے برہمن راگھو جیتن نے بھی سلطان کی بارگاہ جلال میں حاضر ہو کر عرض کیا ”سراٹوں کے سمرات علاء الدین خلجی کو یہ سفر مبارک ہو مگر حضور کے قدم ان پر بچا راستوں نا آسائیں۔“

”پھر؟“ سلطان نے غضب ناک لہجے میں سوال کیا تھا۔

”اگر حضور مجھے اس سفر میں ہمراہ لے چلیں تو میں راستے کے بے شمار کانٹے اپنی پکوں صاف کر دوں گا۔“ راگھو جیتن اپنی زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس لئے سلطان سے شاعرانہ لہجہ میں کر رہا تھا۔ ”میں قلعہ چوڑ کے کئی خفیہ راستوں سے واقف ہوں۔ میری رہنمائی ایک اجنبی دیار میں کیلئے بہت سودمند ثابت ہوگی۔“

راگھو جیتن کی دلیل مقبول تھی مگر سلطان نے بڑی حقارت سے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ”وہ درندوں کا کیا ہوا شکار تو کیا ہم اپنے ہی ہم جنس کسی شیر کے مارے ہوئے جانور کو بھی کھانا بنا کرتے۔“ علاء الدین خلجی کا جلال اس شعلے کی مانند تھا جو بھڑکتے بھڑکتے بے قابو ہو گیا ہو۔

ہے کہ ہماری عظیم الشان فتح ایک عیار برہمن کی ساز باز کا نتیجہ ٹھہرے اور تاریخ ہمارے حلقے کا ذکر ہوئے یہ غلیظ عبارت تحریر کرے کہ فاجعہ عالم کی فوجیں چوڑ پر یلغار کر رہی تھیں اور رتن سنگھ کے دربار ٹھکرایا ہوا برہمن، سلطان کو اپنے گھر کے بھید بتا رہا تھا۔ نہیں راگھو! ہم اس ذلت و رسوائی کی نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے آج تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہماری ذاتی صلاحیتوں کا ثمر ہے۔ ساری فتوحات بے داغ ہیں۔ ہم تسخیر چوڑ کو بھی دوسروں کے احسانات سے پاک رکھنا چاہتے۔

رتن سنگھ! میں تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔“ شدید زخمی ہونے کے باوجود و کرم سنگھ کی آواز سے اب بھی ان کا وہی جلال نمایاں تھا۔ ”اپنی فکر کر کہ میری زندگی کے دن تو پورے ہو گئے۔ میری یہ سزائیں قیوں اپنے دست ستم کو جتنا چاہے دراز کر لے مگر وہ میرے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے بدن نے ایک ایک تار کوچ لے کر میں پھر بھی برہمنی کے الزام سے محفوظ ہوں گا۔ برہمن تو وہ ہوتے ہیں مگر ان کی باتوں کے ہاتھوں اپنے ضمیر بیچ دیتے ہیں۔ پھر ان کے غلیظ جسم ہزار ریشمی قباؤں میں لپٹ کر بھی مارے جاتے ہیں۔ میری دھندلی آنکھیں زندان کے اس اندھیرے میں بھی تیرا کوڑھ زدہ جسم دیکھ رہی تھی، میں پہلے ہی سوچتی تھی اب تیرا بدن بھی آہستہ آہستہ گل رہا ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ تم کی کوکھ سے پیدا ہونے والے عذاب کے زہر پلے کیڑے تیرا گوشت چاٹ لیں گے۔ اور تیری مٹا سوراخ کر دیں گے۔“ و کرم سنگھ کے دل میں نفرتوں کا جس قدر زہر بھرا ہوا تھا وہ سب ہونٹوں سے باہر آ رہا تھا۔

ساتھ ساتھ انسان! عذاب تجھ پر نازل ہو رہا ہے یا مجھ پر؟“ راجہ رتن سنگھ نے مہامستری کے چہرے پر نندہ دار ٹھوکر لگائی۔

غلاب تو بھی پر نازل ہو گا۔“ و کرم سنگھ نے کہا۔ ”میں اپنی گمراہی کے دور میں عذاب میں مبتلا تھا۔ اب میرے لئے کوئی عذاب نہیں ہے۔ راحت ہے، اطمینان ہے، بے اندازہ نندہ سوائی کا شائد غصہ و ملالت کا کھد۔“ و کرم سنگھ دنیا کے ہر خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اب یہ حقیر کیڑے ڈانٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

انجمن ہمارے دیر سے ہمارے پیروں کے نیچے کلہا رہا ہے۔ ہم اسے کچل دینا چاہتے ہیں مگر ہمارے راجہ رتن سنگھ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آپ حکم دیں تو آج ہم اسے اس کی حیثیت میں کھٹک لیں گے۔ تم کو تو دیکھتے ہیں میں رانی پد منی سے پوچھا۔

کہہ دوں گا! آپ اس نندہ مذہب و وطن کے خون سے اپنے دامن کو ناپاک نہ کریں۔“ رانی عروین پر تھی اور اس نے تمام خونی رشتوں کو جھٹلایا تھا۔ وہ اس شخص کو پچھلے

ابھی وقت ہے میں سب کچھ فراموش کر کے تیری خاطر خود دلی جاسکتا ہوں مجھے یقین ہے کہ میں کفن کے قہر غیب کی آگ بجھا کر چوڑا واپس آؤں گا۔ ”مامامتری و کرم سنگھ نے اپنے جذبہ وطن پرستی کے ساتھ ہر کرم سنگھ گوارہ کر لیا تھا۔

”دیوتاؤں کی قسم! میں نے آج تک اتنا حیلہ ساز انسان نہیں دیکھا۔“ رانی پد منی دروازے کے قریب کڑے کڑے رہنے لگی۔ ”دلی جانا چاہتا ہے کہ اس طرح چوڑے فرار ہو جائے اور ریاست کے فوجی راز کو لے کرے۔“ آخر تیری ناپاک خواہش زبان پر آئی مگر میں تیرے گھناؤنے ارادوں کا اقتدار حاصل کر لے۔ اب تجھے ایک ہی شرط پر زندگی کی بھیک دی جاسکتی ہے کہ تو آفریدی اور نرملا کو جیل تک نہیں پہنچے دوں گی۔

”یہ ممکن نہیں مہارانی چوڑا! میری زندگی میں بھی نہیں اور میری موت کے بعد بھی نہیں۔ میرے وہ دونوں بچے تیری پہنچ سے بہت دور ہو چکے ہیں۔“ وکرم سنگھ کالجہ بار پھر رخ ہو گیا تھا۔ ”ان ہی کو بلانے کیلئے میں نے یہ سارے آزار جھیلے ہیں۔“

”آئے سرات! دیوتاؤں کے کرم سے یہ پانکھنڈی قبل از وقت بے نقاب ہو گیا۔“ یہ کہتے ہوئے رانی پد منی قید خانے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

”وکرم سنگھ! ابھی تیری سزا ختم نہیں ہوئی ہے۔“ غمگین وہ وقت آنے والا ہے کہ تو مجھ سے میرے کرم کی ایک سزا کا دور میں اپنے دونوں ہاتھوں کو بند کر لوں گا۔“ راجہ رتن سنگھ نے کہا اور غلامانہ انداز میں اپنی ہڈی کے پیچھے جھپکے چلا گیا۔

غلام ہوتے ہی وکرم سنگھ نے زنداں کے فرش پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”اے خدا! تو میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ سب نادان اور بے خبر ہیں۔“ وکرم سنگھ بے اختیار رو رہا تھا۔ ”میرے وطن کے سر بلند پہاڑوں کو لوگوں ہونے سے بچالے کہ یہ وکرم سنگھ کے آباؤ اجداد کی نشانی ہیں۔ چوڑے کے سبزہ زاروں کو خاکستر ہونے سے محفوظ رکھ کہ یہ میرے باپ دادا کا سر پایہ ہے۔ یہ میری وادیاں ہیں میرے کوچے ہیں میری گلیاں ہیں میرے ہموطنوں کو بھی اس دولت سے محروم نہ رکھ۔“ وکرم سنگھ عجیب ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ وہ مسلمان ہو چکا تھا مگر ایک بت پرست قوم کی عادت کیلئے دعائیں مانگ رہا تھا اور یہ دعائیں اس غیر مسلم ملت کی عادت تھیں جو اسے اپنے وطن اور اہل وطن سے نفرت تھی۔ وکرم سنگھ فطرتاً ایک درد مند اور حساس انسان تھا اور اس کے دل کی یہی کیفیت اسے اہل چوڑے سے نفرت کرنے کے بجائے محبت کا آخری بیجام دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل وطن بھی اس کی فطرتوں کی پرستش چھوڑ کر ایک خدا پر ایمان لے آئیں اور اگر ایمان نہ لائیں تو کم سے کم علاء الدین خلجی کے قہر غیب سے محفوظ رہیں۔ وہ کسی طرح بھی اہل چوڑے کی تباہی نہیں چاہتا تھا اور یہی جذبہ اس کی فطرت کا امین تھا کہ اس کی محبت جسے سمجھنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ شدید اذیت و کرب کے باوجود وہ اپنا سر فرش پر ملتا رہا اور زنداں کے پرہول سنائے میں بس ایک ہی صدا کو غونجتی رہی۔

☆ ☆ ☆

قید خانے سے کام و نامہ اور واپس لوٹنے کے بعد رانی پد منی اور راجہ رتن سنگھ اپنے خصوصی کمرے میں سر جھکے بیٹھے تھے اور ان کے چہروں کی شادابی رخصت ہو چکی تھی۔ ”اب کیا ہو گا مہارانی؟“ راجہ رتن سنگھ نے غمگین لہجہ میں کہا۔ ”راجہ رتن سنگھ! رتن سنگھی قاتلین کو اپنے پیروں سے رگڑنے لگا۔“

اسے انکار کر رہی تھی جو اس کا چچا تھا اور جس نے باپ کے مرنے کے بعد اسے اپنی بیٹی نرملا سے بھلا کر لیا تھا۔ اب اسی کا خون ناپاک ٹھہرا تھا اور وہ اقتدار کی ٹھوکروں میں اس طرح پڑا تھا جیسے کوئی در ماند ہو گیا تھا۔ ”سرات! اسے زنداں کی تاریکیوں میں اس طرح سانس لینے دیجئے۔ اس کیلئے یہی سزا کافی ہے۔“ ہمارے رحم و کرم کی بھیک پر زندہ رہے۔ ایک دن یہی احساس غلامی اسے مار ڈالے گا۔“

”میں کسی کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہا۔“ اچانک قید خانے کی پرہول فضا میں وکرم سنگھ کی ابھری۔ زخموں کی شدت سے اس کا لہجہ شکستہ تھا مگر آواز میں گداگری یا غلامی کا رنگ شامل نہیں تھا۔ ”ہاں! میرا آخری سفر قریب ہے۔ شاید میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں لیکن اس طرح نہیں جاؤں گا کہ چوڑے کی تاریخ میرے احسانات کو جھٹلاوے۔ اگر لکھنے والوں نے میرے نام کے ساتھ بد و بدنامی کے بام و در و درکار انھیں گے کہ ان کی بنیادوں کو کس نے اپنا خون پلایا ہے؟ بے ضمیر انسانوں کے خاموش رہے تو شاہراہیں پتھیں گی کہ کبھی ادھر سے وکرم سنگھ گزر کر آتا تھا۔ وہ وکرم سنگھ جس نے اپنے کے کاٹنے ہمارا نہیں گزارنا چاہا اور اسی کشمکش میں مارا گیا اگر شاہراہیں بھی پامال کر دی گئیں اور زبانوں کو روند ڈالا گیا تو تاریخ اور گھمبیری کا آواز دوشخاف پانی بولے گا کہ چوڑے کے کھیتوں کو سر بہرہ نشا رکھنے کیلئے وکرم سنگھ نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دیا مگر افسوس کسی نے اس کے خون کی قدر کی۔ اگر بڑے چور گھمبیری کے لب بھی سی دیئے گئے تو چوڑے کی فضا میں میری وفاؤں کے ترانے گانے وکرم سنگھ کی سزا زمین دوست اور کیا وطن پرست تھا؟ مجھ سے زیادہ اپنی دھرتی سے محبت کرنے والا ہے؟ کوئی نہیں کوئی نہیں۔“ یہ کہتے کہتے وکرم سنگھ کی آواز لرزنے لگی تھی اور آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

”چلیں سرات! یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔“ رانی پد منی نے ایک بار پھر احترام و ادب کے رشتے توڑ ڈالے تھے۔

”پد منی! میری بیٹی! میں نے تیرے باپ سے عہد کیا تھا کہ میں گرم ہوا کے کسی جھوٹے کوئی نہیں آنے دوں گا۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو اپنا سینہ سامنے کر دوں گا۔ چاہے اس کشمکش میں میرا برابر جائے لیکن میں تجھے بچانے کی کوشش کروں گا۔ میرے بھائی کی نافرمانی اور سرکش نشانی! اپنے چنگ نظر کر کہ وہ سرے پاؤں تک سازشوں کی آگ میں جل اٹھا ہے۔“

”مجھ پر تیرا کوئی احسان نہیں۔“ رانی پد منی کے لہجے میں وہی نفرت و حقارت تھی۔ ”یہ میرا ہے کہ جس کے سہارے تو اب تک زندہ ہے۔ اگر میں تیری طرف سے اپنی چشم عنایت پھیر لی تو تیرے جسم کو چوڑے کے گلی کوچوں میں کھینچا جا رہا ہو اور لوگ تیرے سیاہ چہرے پر ہنسنے لگے۔“ صرف اپنے باپ کے حوالے سے بے خیالی اور نہ تیری غدار بوہی کی سزا بڑی دردناک ہوتی وکرم سنگھ! ”بیٹی! میں تجھ سے اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔“ ایسے اذیت ناک لہجوں وکرم سنگھ کو اپنے خون کی محبت پریشان کر رہی تھی۔ ”میں اپنے وطن کا غدار نہیں ہوں مگر مجھے دیوتاؤں سے نفرت ہے۔ میں نے ان پتھروں سے بغاوت کی ہے۔ میرے عظیم خاندان کی یاد میں میری بغاوت کو سمجھنے کی کوشش کر۔“ آخر وہ کوئی خوشی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے میں نے دنیا کی ٹھکرا دی؟ زور نگار محلوں کو چھوڑ کر زنداں کی تاریکیوں میں چلا آیا۔ آخر کیوں؟ موت میرا کھڑی ہے مگر میں اپنے باغیانہ جذبوں کو نہیں چھوڑتا۔“

”دیوتاؤں نے تجھ سے تیری عقل چھین لی ہے۔“ رانی پد منی نے اسی تحقیر آمیز لہجہ میں کہا۔

ہنے کے جب آوازوں کا پچانا مشکل تھا مگر کچھ دیر بعد چند سنگھ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جیسے کسی چیز کو کھودا جا رہا ہے۔ خیال آتی ہے وہ پریشان ہو گیا۔ ”سردار! ایسا محسوس ہوتا ہے منتری بھون کی دیواریں ڈھائی بلبلے۔ یہ کہتے کہتے چند سنگھ کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے راج کماری کو خبر دینا چاہئے کہ یہ بہت سنگین معاملہ بدل چکا ہے۔“

آزیدی نے اسے روکنا چاہا آدمی رات کے وقت نرملا کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہیں مگر چند سنگھ یہ کہہ کر اسے نکل گیا کہ انہیں ہر گزرنے والے لمحہ سے باخبر رکھنا ضروری ہے۔ چند سنگھ نے ملازمہ رامیشوری کو جگایا اور پھر جب رامیشوری نرملا کے کمرے میں داخل ہوئی تو نرملا پوری طرح بیدار تھی۔

”ہاں! میں ان آوازوں کو سن رہی ہوں۔“ نرملا نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”چند سنگھ سے کہو کہ وہ رات نہ ہو۔ راج رتن سنگھ ہماری تلاش میں ہے اور وہ ہمیں پانے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ منتری بھون کو سنبھال لیا جا سکتا ہے۔“

رامیشوری کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی کہ شاید راج کماری کچھ اور کہے مگر جب نرملا کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی تو وہ لرزے قدموں سے واپس آگئی اور اس نے چند سنگھ کو اپنی آقا زادی کے الفاظ متغزل لڑے۔ چند سنگھ نے آزیدی کو صورت حال سے آگاہ کیا پھر وہ دونوں رات بھر جاگتے رہے اور آوازیں مسلسل سنائی دیتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

اسی رات کہ ابور پھل شاہ کے مندر میں مائی بھان متی اپنی خادمہ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ ”تو مجھے ہے کہ میں تیری سازشوں سے بے خبر ہوں؟“

خادمہ بھان متی کے جلال سے کانپنے لگی۔

”میں جانتی ہوں کہ تیرا شوہر نارائن داس راج رتن سنگھ کا جاسوس ہے اور تیرے ذریعے میاں کی مدد ملتی ہے۔“ مائی بھان متی نے کچھ جھنجھکی سے کہا۔ ”مائی بھان متی کی آواز شعلہ ریتر ہو گئی تھی۔ ”کل تو نے چند لوگوں کی خاطر میرے اعتماد کا خون کیا مگر آج میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ اپنے بچے سے سب کچھ کہہ دے۔ اسی وقت جلی جلا اور نارائن داس سے کہہ دے کہ چوڑی تباہی کا آغاز ہو گیا۔ عذاب کی جس ساعت کا انتظار تھا وہ آسمان سے نازل ہو چکی۔ اپنے ان دانا راج رتن سنگھ کو خبر کر دے کہ علاء الدین خلیجی آ رہا ہے۔ آئے والا کچھ بھی نہیں چھوڑے گا۔ سونے چاندی کے سارے انبار تاج و تخت، عزت و وقار سب بکھیر دینے کے لئے ساتھ لے جائے گا۔ اور اپنی دیوی پدمنی سے بھی کہہ دے کہ ایک طوائف زادی کے فرزند ہونے کا دل آلیا۔ اور شہنشاہی آئندہ پالنے کو کچھ مندر کی دیوار پر لکھا تھا وہ تحریر زندہ ہو گئی۔ سارے خوشامیٹھے اور ہر لحاظ سے قص کر رہا ہے۔ جلدی کر! وقت کم ہے۔ میاں سے جلی جلا اور چوڑے کے تمام کچھ ہاتھ لے لے کہہ دے کہ گڑیاں اچھالی جانے والی ہیں۔ اپنے اپنے آئینے نکال لیں کہ چہروں پر سیاہی ملی دے کہ اگر بھاکہ کہتے ہیں تو بھاکہ میں لے لیں کہ حساب کا دن آچکا۔ اور میری طرف سے یہ بھی کہہ کر دے کہ ہم ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ موت کا دروازہ۔ زلت و رسوائی کا دروازہ۔ یہ کہہ کر مائی بھان متی نے خادمہ کی طرف دیکھا اور اس کا رخ عورت کو محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم جل اٹھا ہو۔

خادمہ بھاکہ کھڑی ہوئی اور مندر سے نکل کر اپنے گھر پہنچی۔ نارائن داس بیوی کی حالت دیکھ کر مضطرب ہو گیا اور جب خادمہ نے پاگوں کے سے انداز میں مائی بھان متی کے الفاظ دہرائے تو نارائن

”وہ دونوں منتری بھون میں موجود ہیں۔“ رانی پدمنی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”انہیں کسی محفوظ جگہ چھپا دیا ہے۔ شاید کسی زیر زمین تہ خانے میں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ رات یا زیادہ سے زیادہ کل صبح ہو تی نرملا ہمارے قفسے میں ہونا چاہئے۔ اب یہی ایک صورت۔ علاء الدین کو دلی تک محدود رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں نرملا کو آراستہ کر کے سلطان کی خدمت میں بھیج دینا۔ یہی وہ تدبیر ہے جو سلطان کی ہوس کے طوفان کو بھی روک سکتی ہے اور ہم نرملا کو شہنشاہی عزت و فروخت کر کے وکرم سنگھ سے اپنی ذلت کا انتقام بھی لے سکتے ہیں۔“

”یقیناً! ہمارا یقیناً! ہم آپ کے حسن تدبیر کے قائل ہیں مگر نرملا کماری ہے کہاں؟“

”ریاست کے تمام تیشہ زنوں کو طلب کر لیجئے اور حکم دیجئے کہ وہ منتری بھون کا فرش توڑ کر لیں۔“ رانی پدمنی اپنے منصوبے پر فوری عمل چاہتی تھی۔ حکمرانوں کی زبان سے ادا ہونے پر بہت پر تاثیر ہوتے ہیں۔ رانی پدمنی کی ایک جنبش لب نے منتری بھون کی شکل ہی بدل ڈالی ان کی تمام فانوس روشن کر دیئے گئے اور اس روشنی میں ریاست کے سیکڑوں ماہر تیشہ زنوں نے وکرم سنگھ کی بنیادیں کھودنا شروع کر دیں۔ جب منتری بھون میں کسی تہ خانے کا سراغ نہیں ملا تو پھر سنگ بنے ہوئے فرش پر تیشہ زنی شروع ہو گئی۔ رات کے سناٹے میں گونجنے والی آوازیں بڑی عجیب پتھروں اور تیشوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی چنگاریاں اس آتش بازی کا منظر پیش کر رہی تھیں کہ قریب قریب وہاں رہ کر بھڑک رہی ہو۔ تیشہ زنوں کے جسم پسینے میں تر تھے اور چرے پاؤں کی جلتے جلتے دھواں ہو گئے تھے۔ نگراں سپاہیوں کی گردنیں بھی اسی طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے کاندھوں کا بوجھ بن گئی ہوں۔

رات کے سناٹے میں تیشوں کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں۔ وکرم سنگھ کا زیر زمین بھی ان کی آوازوں کی دھمک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگرچہ سات تہ خانوں تک پہنچنے پہنچنے کی آواز مدہم ہو گئی تھیں لیکن پھر بھی طلسم کدے میں قیدیوں کی سی زندگی گزارنے والے چاروں افراد ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی ملازمہ رامیشوری نرملا کماری دوسرے کمرے میں سو رہی تھی اور چند سنگھ علی عامر آزیدی کے کمرے میں سو رہا تھا۔ نرملا آتی تھی اور اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ ماضی کی پریشان کن یادیں اسے سونے ہی نہیں دیتی تھیں۔

دوسری طرف علی عامر آزیدی بھی آنکھیں بند کئے ماضی کی خوشگوار یادوں اور حال کی تخیل تھا۔ اس نے آوازیں سنیں تو گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آزیدی حیران رہ گیا۔ اسے اس بات نہیں آ رہا تھا کہ وہ دوبارہ ہریجن کو صاف صاف دیکھ سکتا ہے۔ گم ہو جانے والی بیانیہ یکایک لوٹ آئی تو اسے اسے دھندلے سائے نظر آ رہے تھے۔ مگر اس وقت واقعہ اس کی دونوں آنکھیں روشن تھیں۔ جوش مسرت میں وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اسے فوراً بستر پر لیٹ جانا پڑا کہ زخموں کی فصل بھٹ تیز دھوپ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آزیدی نے لیٹے لیٹے ان آوازوں کو سنا جب ان کے کوئی کمی نہیں آئی تو وہ چند سنگھ کو پکارنے پر مجبور ہو گیا۔

چند سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”سردار! کیا آپ نے مجھے آواز دی؟“

”غور سے سنو! یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟“ آزیدی نے پہلی بار چند سنگھ کا سر نہ ہونے کی شجاعت مردانگی کا اظہار ہوتا تھا۔

چند سنگھ ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو بہت دور سنائی دے رہی تھیں۔

داس کو یوں محسوس ہوا جیسے کوہِ ابو پھٹ پڑا ہو اور پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دبایا ہو اچ رہا ہو۔

☆.....☆.....☆

نارائن داس کئی بار گھوڑے پر چڑھا اور کئی بار نیچے گرا۔ خوفِ دہشت کے سبب اس کے ہاتھ نہیں کر رہے تھے اور گھوڑے کی لگامِ بار بار چھوٹ جاتی تھی پھر بھی دنیا کی محبت اور علاء الدین خلجی حملے کی خبر اسے راج محل کی طرف کھینچنے لئے جاری تھی۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد وہ راجہ رتن سنگھ کے قدموں تک پہنچ ہی گیا۔

راتن سنگھ کا بچاری جاسوس کچھ دیر تک سجدے کی حالت میں پڑا رہا اور پھر اس نے مائی بھان متی کا ہونٹ حرف بہ حرف منتقل کر دیا۔

اگرچہ راجہ رتن سنگھ اس تارک الدین عورت کو طوائفِ زادی کہہ کر ذلیل کرتا تھا لیکن نہ نارائن داس نے علاء الدین خلجی کا ذکر کیا تو وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سلطان کے سپاہی خلوتِ خاص میں داخل ہو گئے ہوں اور اسے گرفتار کرنے کیلئے آگے بڑھ رہے ہوں ”بھان متی؟ آئندہ پال؟ علاء الدین خلجی؟“

راجہ رتن سنگھ کے چہرے کا رنگ اچانک زرد ہو گیا اور وہ خود گلہائی کے انداز میں زور سے زور سے بول تھا۔ ”بھینڑیا آئے گا اور سب کچھ اٹھا لے جائے گا۔ ہمارا تخت و تاج، مال و دولت، عزت و قدر۔ رتن سنگھ پر ناقابلِ بیان وحشت طاری تھی۔

”آئے دیں اس بھینڑیے کو آئے دیں۔ اس طرح اسے اندازہ تو ہو جائے گا کہ چوڑا کیا ہے اور سر زمین پر کیسے شیریتے ہیں؟“ رانی پدمی بہادر راجپوتوں کو شیر کہہ کر پکار رہی تھی مگر اس کی آواز تھر تھراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے آئے والے ایک بھینڑیا ہزاروں شیروں پر بھاری ہے۔

”نہیں مہارانی! آپ نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے اور کس انداز سے آ رہا ہے؟“ رتن سنگھ کی دھڑکتی جارہی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہم اس ذلیل بھان متی کی باتوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔“ رانی پدمی ایک بار پھر اس غنیمت گمانی عورت کو غلیظ کلمات سے یاد کیا۔ ”وہ مجھ سے اپنی ذلت و رسوائی کا انتقام رہی ہے۔ ورنہ میں جانتی ہوں کہ اس کی آنکھیں کہاں تک دیکھ سکتی ہیں۔ ابو کی چوٹی پر بیٹھ کر ملے مناظر دیکھنا بالکل عادی ہے۔“

”مہارانی! بھان متی پاگل نہیں ہے۔ ہم اپنی نفرتوں کے جہوم میں اسے مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس نے سیاسی آئندہ پال کی اس تحریر کا بھی ذکر کیا جس پر ہم نے گہری سیاسی پیمردی کی تھی۔ راجہ رتن سنگھ شدید ذہنی کشمکش کا شکار نظر آنے لگتا تھا۔ ”تمہارے خیال میں اگر وہ پاگل ہے تو میں نے میلوں کے فاصلے سے کچھ شام کے مندر پر لکھی جانے والی سیاسی تحریر کس طرح پڑھ کر آئندہ پال نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ آنے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اور بھان متی بھی یہی کہہ رہی ہے؟ علاء الدین خلجی آ رہا ہے۔ بھاگ سکو تو بھاگ جاؤ۔ دونوں کے الفاظ ایک ہیں۔“

رانی پدمی کا روشن چہرہ بجھ گیا۔ اب اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جب زبانی زائل ہو کر رہ گئی تھی۔

جاوگر رام دیو اپنے سینے میں خباثتوں اور عیار یوں کا طوفان چھپائے ہوئے خاموشی سے بیٹھا حکمرانوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ جب دونوں خاموش ہو گئے تو وہ عیارانہ مسکراہٹ کے

موت اور پوزمی جاوگر کی ابھی زندہ ہے؟“

”ہاں مہاراج! وہ تارک عورت! ابھی زندہ ہے۔“ راجہ رتن سنگھ اس طرح شرمسار نظر آ رہا تھا جیسے غلامِ جرم کرتے دیکھ لیا ہو۔

”ہم نے تو کہا تھا کہ بھان متی قتل کر دی گئی۔“ رام دیو کی گردن کج ہو گئی تھی اور وہ انتہائی گستاخی کا منہ کرتے ہوئے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھنے کی بجائے کمرے کے وسط میں لگے ہوئے ایک بورت فانوس کو دیکھنے لگا۔

”ہم نے آپ کے غصے کی آگ کو سرد کرنے کیلئے جھوٹ بول دیا تھا۔“ راجہ رتن سنگھ حکمران ہوتے ہی غلاموں کی طرح بہانے تراش رہا تھا۔

”توہ سرت یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہندو دھرم میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا پاپ ہے؟“ رام دیو کی باتوں پر عروج پر تھیں اور وہ بگڑی ہوئی سیاسی صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ”آپ کو یقیناً بے لفاظی یاد ہوں گے۔ ہم نے کہا تھا کہ اس ریاست کے تین دشمن ہیں۔ ایک کو تو ہمارے حکم پر قتل کیا اور باقی دو کو بچالیا گیا مگر اسی وقت بھان متی اور راجہ دوت کا قصہ پاک کر دیا جاتا تو آج آپ کو یہ دیکھنا نہیں پڑتے۔“ رام دیو نے بڑی ہوشیاری سے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمی کے نکھرتے ہوئے لب پر ایک اور کاری ضرب لگادی تھی۔

”مہاراج! ہم اپنے ہی دوستوں سے فریب کھا گئے۔“ راجہ رتن سنگھ پشیمانی کے انداز میں بول رہا تھا۔ ”ہم نے دکر م سنگھ پر حد سے زیادہ اعتبار کیا اور اس نے ہمارے اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ دوت کی ترخانے میں چھپا دیا۔ اب وقت ہماری گرفت میں نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں؟“ رتن سنگھ نے گھبرا کر اس شخص کے سامنے اپنا دامن پھیلا دیا جسے کچھ دن پہلے وہ ہندوؤں کے روحانی اے کے بجائے ایک شیعہ باز سمجھنے لگا تھا مگر علاء الدین خلجی کے حملے کی خبر نے ایک بار پھر اس کو مجبور کر دیا۔ وہ رام دیو کو دیوتاؤں کے سنگھاسن پر بٹھا کر اپنا سر جھکا دے اور اسی بدکار شیعہ باز سے رحم و کرم کی مانگنے لگے۔

”راجہ دوت کیس نہیں گیا ہے۔“ رام دیو نے احساسِ فخر سے گردن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا گمان ہے کہ وہ مغربی بھون کے کسی ترخانے میں موجود ہے اور اگر وہ پاتاں (تحت التری) میں بھی ہے تو ہم زمین کا سینہ چیر کر اس کی آخری گہرائی تک پہنچ جائیں گے اور راجہ دوت کو ڈھونڈ نکالیں۔ مگر بھان متی کے بارے میں آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے۔“

”نہیں مہاراج! اب سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔“ اپنے اقتدار اور زندگی کو بچانے کیلئے راجہ نے کمر ہمارے رام دیو کے آگے سر جھکا دیا۔

”ہاں! سرت! اب یہی ایک شرط ہے کہ چوڑی جنگ میری ہدایتوں کے مطابق لڑی جائے گی۔ اگر خود کو اپنی اپنی سیاست (پرتازہ) پر تیار ہے تو یہ پانی رام دیو چلا۔ اسے اس کا بھگوان کافی ہے۔“ رام دیو نے یہی بول کر اپنی بساط کی بہت خوفناک چال چل دی تھی۔

یہ سن کر رام دیو نے جواب دیا تھا۔ وہ پہلے ہی رام دیو کی باتوں کو اپنی جذباتی عقیدت میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے پدمی نے رام دیو کے قدم چھو لئے۔

”مہارانی! تم کیوں اس ہوتی ہو۔“ رام دیو نے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ پدمی کے شانوں پر رکھے۔ ”کچھ دیر کیلئے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ہوس پرست رام دیو کی زندگی کے وہ لمحات سب سے

زیادہ کیف آور ہوتے تھے جب رانی پد منی جیسی حسین و جمیل عورت اس کے قدم چھوٹی تھی اور ایک لمحہ کے ہاتھوں کا لمس اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ پھر جب رانی پد منی کھڑی ہوئی تو رام دیو ہوش کی محفل میں لوٹ آیا۔

”میں نے تو چوڑی میں رہنا ہی اس لئے گوارہ کیا ہے کہ یہاں تم جیسی دھرم داسی موجود ہے ورنہ لایہ تو میں کہیں اور جا چکا ہوتا۔ میرا کیا ہے کہ پوری ہندو قوم راستے میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہے جو ہر گزروں کا میری پوجا کی جائے گی مگر اس دل کو کیا کروں کہ چوڑی کی محبت کے سوا کچھ مجھے یاد ہی نہیں آج رام دیو کی عیاری بڑے عجیب کرشمے دکھا رہی تھی۔ ”نہیں مہاراج! آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔“ رانی پد منی کا سر عقیدت سے جھکا ہوا تھا۔ ”اس چوڑی کو بچا لیتے ہو آپ کی محبتوں کا ہے۔“ رانی نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

”پھر مہاراج! اس غیث جادو گر نے تمہیں مٹی کو قتل کرا دیتے۔“ رام دیو رتن سنگھ سے مخاطب ہوا ”اس کی لاش ہی چوڑی کا سب سے مضبوط دفاع ہو گا۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ آئندہ پالا بھان متی جیسے غدا اذان مذہب و وطن کے منتر ہی ان آفات ناگمانی کا سبب بنے ہیں۔ ہم نے آئندہ پالا پیچھا چھڑا لیا مگر وہ ویشیا (طوائف) ابھی تک زندہ ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ وہ چوڑی کی تباہی کیلئے دن رات جاپ کر رہی ہے۔ اسی کے منتروں کا اثر ہے کہ علاء الدین خلجی نے چوڑی پر یلغار کا ارادہ کیا علاء الدین سے پہلے کتنے حکمران گزرے ہیں مگر کوئی بھی تغیر چوڑی کا تصور تک نہ کر سکا۔ پھر علاء الدین کو یہ جرات کیونکر ہوئی؟“

راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی حیرت سے رام دیو کی باتیں سن رہے تھے۔ ”یہ بھان متی کے ناپاک منتروں ہی کے اثرات ہیں جن کے سبب علاء الدین کے دل میں لشکر کی خیال پیدا ہوا۔ اگر بھان متی کو قتل کر دیا جائے تو منتروں کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا پھر جیسی منٹوں لے لٹے گی“ علاء الدین خلجی کے خوفناک ارادے بھی دم توڑ دیں گے۔ یہ ایک ظلمانی جنگ ہے اگر ہم اس ظلم کو پارہ پارہ کر دیں تو جنگی فضا خود بخود ختم ہو جائے گی اور علاء الدین دہشت زدہ ہو کر آدے راستے سے واپس لوٹ جائے گا۔“

رام دیو نے بڑے عجیب انداز میں اپنے دلائل پیش کئے تھے جنہیں راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی تو ہم پرستی سے فوراً ہی قبول کر لیا۔ کچھ دیر بعد راج محل کے نگرانوں نے دیکھا کہ آٹھ سپاہی اپنی شمشیر بے نیام کئے ہوئے بھل شاہ کے مندر کی طرف جا رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆
سپاہیوں کو بھل شاہ کے مندر کی طرف بھیجنے کے بعد رام دیو نے راجہ رتن سنگھ کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”سمرات! اگر آپ مجھ سے سارے واقعات پوشیدہ نہ رکھتے تو اب تک چوڑی پر منزلہ لانے والے بادل چھٹ چکے ہوتے اور دیوتاؤں کی کرپا سے ہوائیں انہیں ازا کر بہت دور لے جا چکی ہوتیں۔“ راجہ دیواس احساس غرور کے ساتھ بولا جیسے وہ رتن سنگھ کی ڈگمگاتی ہوئی ناکھینوں بار ہو۔ راجہ رتن سنگھ نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا۔ ”مہاراج! میں آپ کو ضرور خبر کرتا ہوں کہ آپ بہت زخمی تھے۔“ رتن سنگھ نے ڈرتے ڈرتے آشرم کی تباہی اور رام دیو کے جیلوں کی ہلاکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں سمرات! ہماری حالت کبھی خراب نہیں ہوئی۔“ رام دیو بھی انتہائی فریب کاری سے کہہ

فائدہ ”میں نے جو ہونے کے بعد بھی ہم اپنی شکایتوں سے محروم نہیں ہوئے۔ اصل شکتی بدن کی نہیں روح کی ہوتی ہے۔ اس سنسار میں بلوان وہی ہے جس کی آتما شکتی شال (ظاہر) ہے۔ ہم ہوتے ہیں۔ سمرات نے پکار کر تو دیکھا ہوتا۔ ہم ہر مقام سے چوڑی کو بچانے کیلئے آجاتے۔“ رام دیو مٹی کی چائے میں۔ سمرات نے پکار کر تو دیکھا ہوتا۔ ہم ہر مقام سے چوڑی کو بچانے کیلئے آجاتے۔“ رام دیو ذلیل و سوا ہونے کے بعد بھی اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے یہ کائنات اسی کے حکم سے چل رہی ہے۔ ”مہاراج! آپ چوڑی کو نہیں بچائیں گے تو پھر کون بچائے گا۔“ رانی پد منی کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے کوئی بچان اپنے دیوتا کے سامنے اظہار عقیدت کر رہی ہو۔

”مہاراج! ہم تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔“ ایک بار پھر رام دیو نے پد منی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ اگر اس وقت راجہ رتن سنگھ علاء الدین خلجی کے حملے کی خبر سن کر بدحواس نہ ہو جاتا اور غور سے رام دیو کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو وہ اس بدکار شعبدہ باز کی نگاہوں کا مغموم سمجھ لیتا لیکن سلطان کی لشکر کشی کے تصور نے اسے بدحواس کر دیا تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر رام دیو کے ہاتھوں کا کھلو تانہ کر رہا تھا۔

”مہاراج! کیا یہ آفت ناگمانی ہمارے سروں سے ٹل جائے گی؟“ پد منی بھی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

”اس لٹھے علاء الدین کو چوڑی کی سیما میں پرویش کرنے کیلئے ہماری انومتی (اجازت) کی ضرورت ہے۔“ رام دیو کی آنکھیں اچانک چڑھ گئی تھیں اور سیاہ ماتھے پر کئی نمایاں ہو گئے تھے۔ ”راجپوتوں کا ہر اعلیٰ مقامی گمرانی میں ہے۔ بھگوان نے اس بھومی کی رکشا ہمیں سونپ دی ہے۔ ہم جسے چاہیں یہاں آئے دیں اور جسے چاہیں دھتکار دیں۔ علاء الدین اپنی حدود سلطنت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اگر اس نے یہ نادانی کی تو پھر اپنے کئے کی سزا اس طرح بھگتے گا کہ آنے والا اس کے منہ پر راجہ (حکمت) کی سیاسی مل دے گا اور رانی پد منی کا نام ہندوؤں کے اتھاس (تاریخ) میں سدا کیلئے روشن ہو جائے گا۔ صدیاں گزر جائے گی بعد بھی لوگ کہا کریں گے کہ چوڑی کی مہارانی امر ہے۔ بھارت دوش میں پیدا ہونے والی انسانی تسلیں مثال دیا کریں گی کہ سب کچھ مٹ گیا مگر پد منی کو موت کے لیے ہاتھ نہیں چھو سکے گا۔ رام دیو ایک مغرور عورت کی فطری کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

”لیکن یہ کس طرح ہو گا مہاراج؟“ رانی پد منی، رام دیو کی لاف زنی سنتے سنتے آگاہی تھی۔ ”وہ طوائف زادی بھان متی تو مٹی ہے کہ سلطان کا لشکر چوڑی پہنچنے ہی والا ہے۔“

”مہاراج! طوائفوں اور پارسائوں کے قول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ بھان متی کا نام سن کر رام دیو بڑک اٹھا۔ ”جس کی اپنی زندگی چند لمحوں کی ممان ہے وہ آنے والے وقت کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے اور چوڑی دھرتی پر کون ایسا ہے جو اس پاپ کی سستان کا اعتبار کرے گا۔ اگر میری باتوں پر پہلے عمل کر لیا گیا ہوتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔“

”مہاراج! آپ ان گزری ہوئی باتوں کو بار بار کیوں دہراتے ہیں؟“ رانی پد منی کی سرکشی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

رام دیو نے مہارانی چوڑی کے بدلے ہوئے تیوروں کو فوراً ہی محسوس کر لیا۔ ”میں آپ کی خاطر ان باتوں کو بھلائے رہتا ہوں۔ رام دیو تو وہ ہے جو کسی ماتھے پر بے نیازی کی ایک شکن بھی برداشت نہیں کرتا۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ اپنا گیان سمیٹوں اور بہت دور جنگوں میں نکل جاؤں۔ پھر اہل چوڑی کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے سروں سے سائبان چلا گیا اور وہ دشت رنج و الم میں اس طرح بے آسرا کھڑے ہیں کہ وقت کا

بے رحم ہاتھ ان کے جسموں پر سنگباری کر رہا ہے۔ ”رام دیو نے ایک بار پھر اپنی اہمیت ظاہر کرنے کی وجہ سے راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

”جسے دیوتاؤں نے ہمارا متعجب بنایا ہے وہ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے؟“ رتن سنگھ نے غور کر کے کہا۔

”ہاں! ہمیں اپنی اس ذمہ داری کا احساس روک لیتا ہے۔ ہم ہندو دھرم کو سنگٹ میں محو کر کہیں نہیں جاسکتے۔ ہمیں دلی سے آنے والے راکششوں کے سامنے اپنے گمان کی طاقتوں سے فائدہ کی ایک دیوار کھینچنی ہوگی۔ جس سے فکر اگر ایک ایک مسلمان ہلاک ہو جائے یا اپنے ناپاک ارادوں کی لاش اٹھائے ہوئے واپس چلا جائے۔ مہارانی کو دیر بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی کہ ہم نے کس طرح بھان متی کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس دیشیا کے قتل کی خبر ملتے ہی ہم علاء الدین کے بڑے بڑے لشکر برتا قاتل بیان عذاب لے آئیں گے۔ کبھی ہواؤں کے طوفان اٹھیں گے اور سلطان کے خیمے ٹکڑوں کی طرح بکھر جائیں گے، کبھی آسمانوں کے دہانے کھل جائیں گے اور قیامت خیز بارش سلطان کے سامان جنگ کو ہمارے لیے جاے گی۔ کبھی میدانوں میں شیروں کی آوازیں گونجیں گی اور علاء الدین کے گھوڑے اپنے سواروں کو لے کر اس طرح بھاگ کھڑے ہوں گے کہ ان کی کوئی منزل نہیں ہوگی اور آوارہ جنگی جانوروں کی طرح ادھر ادھر پھرتے پھریں گے۔“

”رام دیو پرسوز آواز میں اس طرح بول رہا تھا جسے واقف علاء الدین خلجی کے لشکر پر دردناک عذاب نازل کر رہا ہے اور زمین و آسمان پر اسی کی حکومت ہے۔

اسی دوران سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سمرات کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ مگر جب ہری سنگھ اس خصوصی کمرے میں داخل ہوا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ اڑاڑا سا تھا۔

”سمرات! ہماری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ آپ کے جاں نثار سپاہیوں نے منتری بھون کے ایک ایک چپے کو کھود ڈالا مگر وہاں کوئی سرنگ یا تہہ خانے کا نشان تک نہیں ملا۔“ ہری سنگھ شرمناک نظر آ رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہا تھا کہ آخر اس کے یہ دونوں دشمن کہاں گئے؟

رام دیو کے عیار ذہن نے فوراً ہی کڑوٹ لی۔ ”سمرات کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وکرم سنگھ کے گھر میں ہر طرف آگ لگادی جائے شعلوں کی حرارت روپوش ہو جائے والوں کو ہر غیبی ہاتھ سے نکلنے پر مجبور کر دے گی۔ اگر وہ آگ کو بھی برداشت کر گئے تو پھر ان کی زندگی ان سے خفا ہو جائے گی۔ آگ لگانے کے بعد اپنے سپاہیوں کو منتری بھون کے باہر متعین کر دیں۔ ممکن ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کریں۔“

”تم جاؤ ہری سنگھ اور منتری بھون کے ایک ایک گوشے کو پھونک ڈالو۔“ اچانک رانی پدمنی اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوئی اس کا جبہ آتش بار تھا۔ ”مت چھوڑو کوئی نشان نافرمانوں کا۔“ رانی پدمنی نے قہر و لہجہ سے کہا کہ اس کا حکم دے رہی تھی جو اس کے آباؤ اجداد کی ایک حسین یادگار تھی اور جس نے ہام و در کے سامنے اس کا معصوم بچپن گزرا تھا۔

سپہ سالار ہری سنگھ نصف قد تک جھکا اور پھر اٹل قدموں واپس چلا گیا۔

ہری سنگھ کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ اور جاوگر رام دیو نے رانی پدمنی کی طرف دیکھا۔ حضرت دنامراوی کی ایک تصویر اور رنج و الم کا ایک زندہ مجسمہ نظر آرہی تھی۔

رتن سنگھ اپنی بیوی کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا مگر رام دیو نے انتہائی مطمئن لہجے میں کہا۔ ”مہارانی! اب یہ رتن سنگھ کی غموں کی گھٹا کیسی ہے؟“ رام دیو کی زبان بھی اس کے دماغ کی طرح شراب کے اثر سے ہلک سا ڈھونڈا ہوئی تھی۔ ”اوارا اور آج کی چوٹیوں سے سورج بلند ہو چکا ہے۔ رات اپنی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اب تو ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اپنے چہرے کے اس سورج کو ادا سیوں کر بھی کی ڈوب چکی۔ جو آسمان کے سورج سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ اگر یہ سورج بجھا تو اہل چوڑو کے بالوں سے محفوظ رکھیں جو آسمان کے سورج سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ اگر یہ سورج بجھا تو اہل چوڑو کے دل بجھ جائیں گے۔“

رام دیو بظاہر حوصلہ افزائی کی باتیں کر رہا تھا مگر اس کے الفاظ میں کچھ اور ہی مفہوم پوشیدہ تھا۔

”مہاراج! آپ جس سورج کی بات کر رہے ہیں، شاید اس کے بجھنے کے دن آگئے۔“ یہ کہہ کر رانی پدمنی کھڑی ہو گئی۔ ”اگر یہ سورج بجھا تو اس کی تماشہ ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“ رانی پدمنی قوت برداشت کی آخری حدوں سے گزر گئی تھی۔ ”وہ دنیا کا کونسا عیش تھا جو ہم نے آپ کیلئے فراہم نہیں کیا اور وہ کونسا جذبہ اجرام تھا جسے ہم نے آپ کے قدموں میں نہیں ڈال دیا۔ پھر بھی آپ نے ہمارے دلوں کا حال سننے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری نظروں نے بے شمار سوال کئے مگر آپ نے ہر بار جواب دینے سے گریز اختیار کیا۔ ہم آج تک آپ کی ریاضت اور گیان پر بھروسہ کرتے ہیں مگر جب بھی آزمائش کا وقت آیا آپ نے ہمیں اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ وکرم سنگھ اپنی رانجنتی کی چالوں سے راجہ رتن سنگھ کو بچا کر لے گیا اور پھر اس نے اپنی بیٹی نرمل کو بھی کسی قید خانے میں گم کر دیا۔ بقول آپ کے، آپ کا گیان تو اپار (غیر محدود) ہے۔ آپ تو آسمانوں کی خبر بھی لے آتے ہیں مگر ہمارے مجرم جو اسی زمین پر کہیں روپوش ہیں آپ کی نظریں ان تک بھی نہیں پہنچ سکیں۔ پھر کیا ایسی شکتی کے سارے آپ سلطان علاء الدین خلجی کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں؟“ رانی پدمنی بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے مہاراج رام دیو کی محترم شخصیت کو اعتراضات کا نشانہ بنایا تھا۔

”مہارانی!“ راجہ رتن سنگھ بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”مہاراج، کبھی ہمارے مفادات کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ ان سے جو کچھ ممکن ہو سکا وہ ریاست کی بھلائی کیلئے کرتے رہے۔ اور آج بھی ہمارے ہی غم میں رات رات بھر جاگ کر تپسیا کر رہے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو کہ مہاراج کی دعاؤں سے یہ مشکل وقت بھی گزر جائے گا۔“

”ہاں سمرات! وقت کو کون روک سکا ہے۔ وہ تو گزرنے ہی کیلئے آتا ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ مگر کون جانے کہ اس وقت کی دھار میں کس کس کو بہہ جانا ہے۔ سب کی کشتیاں کھارے لگ جائیں گی مگر اس سیلاب میں راجپوتوں کی آن ڈوب جائے گی۔ سب کے سب آسودہ ساحل ہو جائیں گے مگر پدمنی کو آگ کا بھنور نکل لے گا اور پھر دریا بھی ساکت ہو جائیں گے اور ہوائیں بھی بر سکون ہو جائیں گی۔ بس ایک میرے ہی ہونے سے یہ حشر برپا ہے۔ جب میں نہیں رہوں گی تو قیامت کو بھی قرار آجائے گا۔“ اتنا کہہ کر رانی پدمنی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور راجہ رتن سنگھ حیرت و حسرت سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔

سمرات! آپ مہارانی کا دل سلانے کی کوشش کریں۔ ”رام دیو نے انتہائی ہوشیاری کے ساتھ ایک نہالہ لہجے میں کہا۔ ”مہارانی! ہر سال ایک عورت ہیں اور عورت کے اعصاب ریشم کے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے سینے میں پتھر کا دل اور فولاد کا دماغ ہونا چاہئے۔ وہ علاء الدین کے حملے سے خوفزدہ ہیں لیکن ان کی یہ ہمت بے سبب ہے۔ میرے روحانی کمالات پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ آپ اس اعتبار کو کسی بھی

طرح بحال کیجئے ورنہ میں اس بے اعتمادی کی فضا میں اپنا کام جاری نہ رکھ سکوں گا۔“ رام دیو نے ایک سادہ بڑی مکاری سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور اپنی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے لفظوں کا نیا کھیل کھیل رہا تھا۔
”مہاراج! آپ اطمینان رکھیں۔“ رام دیو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر راجہ رتن سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ ”میں مہارانی کے مشعل جذبہ کو اعتدال پر لے آؤں گا۔ آپ اپنے جاپ اور مزہ جاری رکھیں۔“

”ہاں! مہارانی سے یہ ضرور کہہ دیں کہ میری خدمات کا ابتداء اصلہ نہ دیں کہ میں اپنے آپ سے شرمندہ رہوں اور منہ چھپا کر کسی اور طرف نکل جاؤں۔“ رام دیو نے اپنی رسمی سیاہ چادر کو کانٹے پر ڈالتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل کر جانے لگا۔ راجہ رتن سنگھ بڑے غور سے ہندوستان کے مہاترک (عظیم جاوگر) کو جاتے ہوئے دیکھتا ہوا جو لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ اس حادثے کی نشانی تھی جب مہاراج کا پورا آشرم سیاہ آندھ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ تمام چیلے پتھروں کے ڈھیر میں دب کر ہلاک ہو گئے تھے اور رام دیو پر یہ طرح زخمی ہو گیا تھا۔ درباری حکیم کی سخت تگمداشت اور علاج سے رام دیو کے زخم تھرم گئے تھے لیکن دائیں ٹانگ میں ہلکی سی کچی باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی رفتار کا توازن بگڑ گیا تھا اور وہ دوڑنے بھاگنے سے معذور ہو گیا تھا۔

رام دیو کے جاتے ہی راجہ رتن سنگھ، رانی پد منی کی خواب گاہ میں داخل ہوا اس وقت رانی پد منی اپنے بستر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ”مہارانی! راجہ رتن سنگھ نے اپنی محبوب بیوی کو پکارا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پد منی نے آنکھیں کھول کر شوہر کی طرف دیکھا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ ”اگر تم اسی طرح آزدہ خاطر رہیں تو میرے حوصلے پست ہو جائیں گے اور میں سیاسی جنگ کے ساتھ اپنی زندگی کی جنگ بھی ہار جاؤں گا۔“ راجہ رتن سنگھ کی آواز جذبات سے لبریز تھی اور اس کے ارتعاش کو صاف صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ”اگر تمہارا دست خانی میری پشت پر ہے تو میں آغوش فنا کو بھی تمہارے مرمرس بازو سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ اور تمہاری چشم ناز پھر گئی تو دنیا کی ہر شے مجھ سے روٹھ جائے گی۔“ رتن سنگھ کا انداز گفتگو گدا گرا نہ تھا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی بھکاری کے جذبوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ رانی پد منی نے ایک خاص ادا سے اپنے نیازی کے ساتھ راجہ رتن سنگھ کی جانب دیکھا اس کے سر و گداز ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”سمرات! اگر آپ کو کچھ خیال ہوتا تو میرے شہنشاہ جمال پر بدنامیوں کے یہ سائے ہی کیوں پڑتے؟“ رانی پد منی اپنے اس شوہر کے تعادل کا گلہ کر رہی تھی نے اہل چوڑ بیوی کا غلام سمجھتے تھے۔

”مہارانی! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“ راجہ رتن سنگھ کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

”ہاں! یہ میری ہی عداوت ہے جو آپ کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔“ پد منی کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا اور وہ جوش جذبات میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”آپ نے بیش و کم سنگھ کی رائے کو میری باتوں پر ترجیح دی۔ بیش و کم منافق و غدار کی سیاست کے گن گائے۔ جب بھی میں نے زبان کھولی، میرے ہونٹوں پر یہ کہہ کر آمریت کی مہر لگادی گئی کہ میں عورت ہوں اور مجھے رانہ بیتی کا ایک حرف بھی نہیں آتا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ سلطان کے سفیر کا سر کاٹ کر دی بھیج دیا جائے مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ یہاں تک کہ اس بھیڑیے کے منہ سے چپنے والے خون نے میرے وقار کے پیرہن کو اندھا کر دیا۔“ پد منی کی تلخ کلامی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔

”میں سے کی ہستی دھار کو واپس لے آؤں گا پد منی! تیری خاطر! صرف تیری خاطر۔“ راجہ رتن سنگھ ”میں سے کی ہستی دھار کو واپس لے آؤں گا“ ”سب کچھ لوٹ آئے گا“ ایک ایک گھڑی، ایک ایک پل۔ جب سلطان بھی جذبات سے مغلوب ہو گیا تھا۔ ”میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہ بڑی باریک انداز کی فہم چوڑ کے قریب پہنچیں گی تو ہمارے سرحدی سپاہی اسے اس کے سفیر کا سر پیش کریں گے۔ یہی اس کے دل کا جواب ہو گا۔“ رتن سنگھ اپنی خفا ہو جانے والی بیوی کو منانے کیلئے خوشامد کے عجیب عجیب انداز اختیار کر رہا تھا۔

”اور نرملہ کا کیا ہو گا؟“ پد منی بظاہر ہل گئی تھی مگر اب بھی اس کے دل کا اضطراب چہرے پر نمایاں تھا۔ ”اب نرملہ کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے؟“ رتن سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تمہارا منصوبہ اسی وقت کار ہو سکتا تھا جب سلطان دلی میں ہوتا اور ہمارے سپاہی اسے شاہی حرم میں پہنچا دیتے۔“ ”یہنا حضرت طالع بدل گئی ہے مگر ہمارے دل کی آگ تو اسی وقت بجھے گی جب وکرم سنگھ کی بیٹی سلطان کے سپاہیوں کی خوراک بن جائے گی۔“ ”میں اپنی اس خواہش کی تکمیل کیلئے کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔ شاید رات تک یا پھر کل صبح تک۔“ راجہ رتن سنگھ لہجہ بدل بدل کر اس عورت کو پراسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو سراپا نفرت تھی، جسم انتقام تھی۔

”رات تک کیوں؟“ نخوت و غرور سے پد منی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ ”ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟“ اقتدار کے نشے کو اب انتظار نہیں تھا۔ ”ہمارے سپاہی ان دونوں کو تلاش کر رہے ہیں۔“ رتن سنگھ نے سرکش بیوی کو کسی بچے کی طرح بھانپتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو منتری بھون میں آگ بھی نہیں لگی ہوگی۔ پہلے تو تارے غلام آگ سلگائیں گے پھر شعلے بھونیں گے، اس کے بعد کہیں جا کر وہ چوہے اپنے سوراخوں سے نکلیں گے جنہیں وکرم سنگھ نے کسی محفوظ پناہ گاہ میں پھنسا دیا ہے۔“

”شاید منتری بھون کو نذر آتش کر دینے سے بھی ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔“ لیکر رانی پد منی بہت زیادہ عجیدہ نظر آئے گی تھی اور اس کے چہرے پر نفرت و غضب کی کیفیات کا عکس تک باقی نہیں رہا تھا۔

”کہو کیوں؟“ راجہ رتن سنگھ نے حیران ہو کر پد منی کی طرف دیکھا جو اس وقت بالکل مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ ”وکرم سنگھ نے جس یقین کے ساتھ کہا تھا کہ ہمارے ہاتھ آفریدی اور نرملہ تک نہیں پہنچ سکتے اس سے ظہور ہوا ہے کہ اس نے مکمل منصوبہ بندی کی ہے۔“ پد منی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر وہ بڑی باریک انداز کے انداز میں غصہ بھری نظر سے پڑی۔ ”خیر! کچھ نہ ہو۔ گھر تو جلے گا، تماشا تو ہو گا، ناموروں کے نشان تو نہیں گے، منسوبوں کے غداروں کی خاک تو اڑے گی۔“

پھر غرور توں نے شہنشاہ کو دیا گلی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ سپہ سالار ہری سنگھ کی نگرانی میں ریاست کے سپاہی اس بھون کے گھر کو آگ لگا رہے تھے، جس کے آگے کل تک اہالیان چوڑ کی گردنیں جھکی رہتی تھیں منتری نورات، جیسی سازو سامان، بام و در، محرابیں، طاقت، شمشیریں، نیزے، گچڑیاں، لباس سب کچھ انتقام کی آگ کا اندھ، سن گئے تھے۔ ہر طرف کثیف دھواں تھا اور رقص کرتی ہوئی چنگاریاں تھیں۔ گولے

آپ دیکھئے گئے؟ آپ کی بیٹائی..... آپ کی آنکھیں..... ”نرملہ جیسی اعصاب رکھنے والی آپ کی فرعون کو اپنی منگٹو کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ بڑی عجیب خبر تھی۔ جیسے موت کی وادی میں بیٹا اس فرعون کی پیٹھ سے لے کر آیا ہو۔“

نرملہ زندگی کا پیغام لے کر آیا ہو۔ یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا کہ ایک غیر مرد کی آنکھیں دیر تک اس کے چہرے پر چلنے والی تھیں۔ آج سے پہلے وہ کئی بار علی عامر کے سامنے بے حجابانہ آئی تھی مگر اس وقت نرملہ کو یقین تھا کہ آفریدی کوئی باہری منظر دیکھنے کے قابل نہیں ہے اس لئے نرملہ کسی تکلف کے بغیر شامی سفیر کے سامنے جا کر آئی تھی مگر آج وقت نے نئی کروٹ لی تھی اور اس کے دلکش چہرے کو کسی کی خوبصورت آنکھوں کا ہدف بنا رہا تھا۔ یہ تصادم اہل دل کو سرشار کر دینے کیلئے کافی تھا۔ نرملہ منہ پھیرے کھڑی تھی مگر اس کے جسم نے راجہ کی بارش میں سیکڑوں فوجوں اور چوتوں کو دیکھا تھا مگر ایک بار بھی نہ اس کے دل کا ہڑکنیں غیر حاذق ہوئی تھیں اور نہ آنکھوں کا زاویہ تبدیل ہوا تھا۔ پھر جسم و جان میں یہ انقلاب کی لہر سی کیوں اٹھ رہی تھی۔ شامی اور اہلنگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نرملہ کو یقین آ گیا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر علی عامر آفریدی سے وابستہ ہو چکی ہے ورنہ شرم و حیا اور گھبراہٹ کا یہ مظاہرہ ممکن نہیں تھا۔

”سر دار! آپ کو زندگی کا یہ نیا دور مبارک ہو۔ روشن اور تابناک دور۔“ نرملہ کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

”ہاں راجہ کلماری! خدا نے میری بے بسی کی شرم رکھ لی۔“ آفریدی نے گلو گیر لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں مگر آفریدی کے یہ آنسو نرملہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ”اگر دینے والا آنکھوں کی روشنی واپس نہ دیتا تو زندگی کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھائے پھرے؟ کون سہارا بننا اور کب تک مجھے راستہ دکھائے؟ خدا نے میری والدہ اور بہن کی دعائیں سن لیں کہ ان کی دعاؤں کے بغیر تو میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اب میں واپس جاسکوں گا۔ ان آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کیلئے جو میرے انتظار میں پھرا گئی ہوں گی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کشمکش انتظار میں ان کے شب و روز کیسے گزرے ہوں گے۔ انہیں کس نے بتایا ہو گا کہ ان کا بیٹا اور بھائی زخموں کا کفن اپنے ایک تہہ خانے میں مجرموں کی طرح پڑا ہے۔ چوڑکی ہوائیں بھی اس طرف نہیں جاتی ہوں گی کہ انہیں آفریدی پر گزرنے والی قیامت کا علم ہو جائے۔“ آفریدی کے جذبات کا بندھن ٹوٹ گیا تھا اور اذیت و کرب کا کھولتا ہوا لادہ نکلا تھا۔

نرملہ کی سانسیں رک گئی تھیں گلاس نے مرکز آفریدی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ جس کام سے یہاں آئی تھی اسے بھی فراموش کر دیا تھا اور آفریدی کے درد کی داستان اس طرح سننے لگی تھی جیسے اس کے اپنے غموں کی کئی کئی کڑیوں کی تھی۔

”راجہ کلماری! اب تو میں کسی کا سہارا لئے بغیر یہاں سے جاسکوں گا؟“ آفریدی نے پر جوش لہجے میں نرملہ سے سوال کیا۔

”یقیناً! آپ اس تاریک زنداں سے باہر جاسکیں گے۔“ نرملہ نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا اور ایک لڑکی کی آواز میں چٹانوں جیسی سختی آگئی تھی۔ ”آپ کو کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں

آفریدی چمک اٹھا۔ اب اس کے ذہن پر نرملہ کے الفاظ کی گہرائیاں واضح ہو چکی تھیں۔

اٹھ اٹھ کر چوڑے رہنے والوں کو تباہی و بربادی کی ایک نئی داستان سن رہے تھے۔ متری مومن کے کسی دل میں سوز پیدا نہیں ہوئی تھی کہ راجہ رتن سنگھ کی طرف سے پہلے ہی وکرم سنگھ کو دیوتاؤں کا کرم چلن کا غدار قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لئے مہاشنتری کی عظمتوں کے سارے مجسمے زمین بوس ہو گئے۔ اس شکست و بربادی پر کسی کو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کیسے عزت و آستانہ کی آخری نشانی راکھ ہو جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پھر جب آگ بڑھنے لگی تو اس کی تپش سے فولا دی دیواریں جھپٹنے لگیں۔ وکرم سنگھ کے بزرگوں کا قائم کردہ یہ طلسم کدہ آگ اور پانی کی یورش سے ہر طرح محفوظ تھا مگر عمارت جل جانے کے سبب شعلوں کے اثرات نے طلسم کدے کے اندرونی حصے کو بھی کی حد تک کر دیا تھا اور اچانک یہاں کے رہنے والے چاروں افراد کو شدید گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ طلسم کی بیرونی دیوار میں بظاہر کوئی نمایاں شگاف نہیں تھا لیکن پھر بھی ہلکی دراڑوں سے دھواں اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ دراڑیں عام انسان کو نظر نہیں آتی تھیں اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوری دیوار کو خوبصورت چمن سے آراستہ کر دیا گیا تھا اس لئے کوئی چوہا اور کوئی جوڑ دیکھنے والوں کی نظر کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔

بھی بال برابر دراڑوں کا وجود ایک حقیقت تھا اور ان ہی دراڑوں سے دھوئیں سے اندر داخل تہہ خانوں کے کینکوں کو یہ اندھناک اطلاع دیدی تھی کہ ان کا قصر زرنکار آگ کی خوراک بن گیا۔ سب سے پہلے نرملہ کلماری نے محسوس کی تھی۔ جب ہلکے ہلکے دھوئیں کی بوجھ سے گزر کر درجوں میں ہوئی اور کمرے کی حرارت بڑھ گئی تو نرملہ نے خادمہ رامیشوری کی توجہ اس طرف دلائی۔ ”یہ دھواں ہے رامیشوری اور یہ حرارت کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟“

رامیشوری کوئی جواب نہیں دے سکی تو نرملہ اپنے کمرے سے نکل کر علی عامر آفریدی کے کمرے داخل ہوئی۔ وہاں چند سنگھ موجود تھا۔ ”تم باہر جاؤ۔“ نرملہ نے چند سنگھ سے کہا اور آفریدی کے قریب پہنچ گئی۔ آفریدی راجہ کلماری کے احترام میں تکیے کے سارے سیدھا ہوا اور حیرت سے طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے دنیا کی حسین ترین دوشیزہ کھڑی تھی۔ آفریدی ہلکی سی جھپٹا کر نرملہ کے دلفریب چہرے کو دیکھتا رہا۔ نرملہ کیلئے آفریدی کی یہ حرکت بڑی اجنبی اور غیر متوقع تھی۔ اس میں نہیں آ رہا تھا کہ آج آفریدی کو کیا ہو گیا ہے؟ جب علی عامر کا حقیر آئینہ سکوت ختم ہوا تو نرملہ نے آواز پکارا۔

”سر دار! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ نرملہ کے لہجے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

آفریدی فوراً ہی ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا اور اس نے احساسِ ندامت کے ساتھ سر جھکا لیا۔ ”ہاں! راجہ کلماری میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آفریدی کی زبان سے الفاظ ٹوٹے اور پھر یہ تھے۔

”پھر آپ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کیوں نظر آ رہے تھے؟“ نرملہ کا لہجہ پر غلوص تھا مگر بے تکلفی نہیں تھی۔

”راجہ کلماری! میں اس عظیم باپ کی عظیم بیٹی کو دیکھ رہا تھا جن کے دم سے شگروں کی بستی بننا کا بھرم قائم رہا۔“ آفریدی نے نظریں اٹھائے بغیر کہا اور اس کے چہرے پر کہیں کہیں پینے کے پھوٹے قطرے ابھر آئے۔

”راج کماری! معاف کیجئے گا، جب مٹھڑی ہوا کا پھلا جھونکا آگ میں جلنے والے کسی انسان کے جسم کو ہوتے تو وہ اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اس اچانک ملنے والی خوشی نے مجھے کچھ دیر کیلئے پاگل سا کر دیا تھا۔ دن بعد روشنی آئی ہے۔ اس لئے اپنے معمولی دکھوں کے سامنے آپ کے غموں کا پڑاؤ نہیں دیکھ سکتا۔“
”ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے غموں کا ایک پڑاؤ کھڑا ہے۔ وہ کس کس کو دیکھے اور کس کے غم رکھے۔“
”نرملانے بڑے خوصلے کے ساتھ اپنے دکھوں کو صبر کی چادر میں لپیٹ لیا اور اس آگ کی دلوٹ آئی جس کی حرارت سے ظلم کدے کے درو پوار تپنے لگے تھے۔“
”کیا آپ کو اپنے کمرے کی نو بدلی ہوئی محسوس نہیں ہوئی؟“
”نرملانے آفریدی سے پوچھا۔

بدون تھا۔

☆ ☆ ☆
راج محل بھی روشن تھا اور وہاں ایک جشن کا سماں نظر آرہا تھا۔ رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ اس خوش تہے جیسے ان کے سپاہیوں نے علاء الدین خلجی کے لشکر پر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔ رام دیو کی رتنا قابل بیان تھی اس کے دشمن کی آخری نشانی بھی مٹنے کے قریب تھی۔ رام دیو نے وکرم سنگھ سے اپنی ناک انعام لے لیا تھا۔

”مدارانی فوتحات کا آغاز ہو چکا ہے۔“
”رام دیو نے پدمنی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔
”منتری بھون کو جلنے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں مگر ابھی تک ہمارے کسی سپاہی نے راج دوت اور نرملانے بد میں کوئی خبر نہیں دی ہے۔“
”پدمنی خوش ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھی۔
”دیفیوں کی خبر ہی کیا، کسی گوشے میں جل مرے ہوں گے۔“
”رام دیو مسکرایا۔ ”سمرات! منگہ کو زنداں کے پھروں سے یہ ذل فریب منظر دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنی زبان بند ہو کر سکے گا۔“
”رام دیو اذیت پسندی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پدمنی کا چہرہ بھی رخ کے تصور سے سرشار نظر آنے لگا۔ مداران کا یہ مشورہ کسی پتھری زبان کھولنے کیلئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔“
”رتن سنگھ قہقہہ مار کر ہنسا اور اگلے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جب چوڑ کا کھراں رانی پدمنی، رام دیو اور چند سپاہیوں کے ہمراہ آگ کے پاس پہنچا تو وہ زمین پر اونڈھالیا ہوا تھا اس کے بال، چہرہ اور کپڑے خون سے تر تھے۔
”وکرم سنگھ! انھو! میں تمہاری زندگی کا سب سے دلنشین منظر دکھاؤں۔“
”راجہ رتن سنگھ نے لڑکا۔

”وکرم سنگھ کے جسم کو حرکت ہوئی اس نے گردن اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے اپنا سر ہار کر گر پڑا۔

”انھو! مجھے عظیم سیاست دان! اور غور سے دیکھو کہ زمانہ کیسی چال چل گیا۔“
”رتن سنگھ دوبارہ چیخا۔
”انھو! رتن سنگھ نے آگے بڑھ کر ٹھوکریاں مار دی۔

”انھو! رتن سنگھ نے آگے بڑھ کر ٹھوکریاں مار دی۔
”سمرات! شاید آپ کا مہاجتھی آخری دن ہے۔“

”نرملانے اس نے پلٹ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”اے اس کے قدموں پر کھڑا کرو اور در پیچے اگلے کے پیچے۔“
”رتن سنگھ نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جہاں سے منتری بھون کے شعلے صاف

”راج کماری! معاف کیجئے گا، جب مٹھڑی ہوا کا پھلا جھونکا آگ میں جلنے والے کسی انسان کے جسم کو ہوتے تو وہ اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اس اچانک ملنے والی خوشی نے مجھے کچھ دیر کیلئے پاگل سا کر دیا تھا۔ دن بعد روشنی آئی ہے۔ اس لئے اپنے معمولی دکھوں کے سامنے آپ کے غموں کا پڑاؤ نہیں دیکھ سکتا۔“
”ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے غموں کا ایک پڑاؤ کھڑا ہے۔ وہ کس کس کو دیکھے اور کس کے غم رکھے۔“
”نرملانے بڑے خوصلے کے ساتھ اپنے دکھوں کو صبر کی چادر میں لپیٹ لیا اور اس آگ کی دلوٹ آئی جس کی حرارت سے ظلم کدے کے درو پوار تپنے لگے تھے۔“
”کیا آپ کو اپنے کمرے کی نو بدلی ہوئی محسوس نہیں ہوئی؟“
”نرملانے آفریدی سے پوچھا۔

”میں تو بہت دیر سے گھٹن سی محسوس کر رہا ہوں۔ گرمی بھی معمول سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور گرجے ہوئے میں دھویں کی ناگوار بو شامل ہو گئی ہے۔“
”آفریدی نے حیران ہو کر کہا۔ ”مگر آپ یہ کیوں کر رہی ہیں؟“

”اس لئے کہ کل رات بھر منتری بھون کا فرش کھودا جاتا رہا اور اب اس کی دیواروں کو آگ لگ گئی۔“
”نرملانی اور آفریدی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ”میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہو گا۔ ہمیں تلاش والے اتنی آسانی سے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔“

”خدا یا!“
”آفریدی کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”ظلم کے ہاتھ بہت دراز ہو گئے ہیں۔ اب انہیں دے کہ کہیں اہل چوڑ تیری رمتوں سے مایوس نہ ہو جائیں۔“

”ظلم تو اپنے وقت پر ہی فنا ہو گا مگر کیا آپ اس قابل ہیں کہ کسی کا سہارا لے کر باہر نکل سکتے ہیں؟“
”آفریدی کی باتوں کو ٹیسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”شاید!“
”آفریدی حیران و پریشان نظر آرہا تھا۔

”ہمیں اس وقت تک ان کمرؤں سے باہر رہنا ہو گا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔“
”نرملانے گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر کہا۔ ”یہ پورا ظلم کدہ فولاد و آہن سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس لئے ہرگز ہوئے لمحے کے ساتھ گرمی بڑھتی جائے گی اور پھر سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔“
”یہ کہہ کر نرملانے خادمہ رامیشوری اور چند سنگھ دونوں اس کے منتظر تھے۔ ”تم سردار آفریدی کو سہارا دے کر باہر دروازہ کھولتی ہوں۔“
”نرملانی بڑی سے آگے بڑھی اور اس نے وکرم سنگھ کے بتائے ہوئے طریقے ساتویں تہ خانے کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب آفریدی، چند سنگھ کے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے کر باہر آیا تو باغ میں ہر طرف دھواں تھا۔ ”مجھے زمین پر بٹھا دو چند سنگھ! میرا دل ڈوب رہا ہے۔“
”آفریدی کے زخموں میں ٹھیس فود رہی تھیں مگر یہ تکلیف اس قدر ناقابل برداشت نہیں تھی کہ آفریدی جیسا مرد آہن بیچ اختیار کر لیا تھا کہ رانی پدمنی اور رتن سنگھ نے اس کے محسنوں کے آستانے کو چھوٹ ڈالا تھا اور نازل ہونے والا عذاب کا سبب محض اس کی ذات تھی۔ اگر وہ سلطان کا سفیر بن کر چوڑ نہ آتا تو اس زمین کی کوکھ خون رنگ مناظر بھی نہیں بھونکتے۔ اسی احساس نے آفریدی کو چپخہ پر مجبور کر دیا تھا۔ آگ کے شعلے عظیم انسان کی تاریخی یادگار کو چاٹ رہے تھے جس نے راجپوتوں کی اس طاقتور ریاست کی تعمیر کی تھی وہی معمار اپنے گھر سے دور جہاں پرستوں کی قدیم زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا اور اس کی لادہ دھویں کے پار نیلے آسمان کو دیکھنا چاہتی تھی مگر آسمان نظر نہیں آرہا تھا۔ رامیشوری اور چند گریہ و زاری کرتے ہوئے اپنی آقا زادی کو تسلیاں دے رہے تھے لیکن نرملانے خاموشی سے آہن کی

و کرم سنگھ کو کھینچ کر کھڑکی تک لے جایا گیا۔ خون زیادہ خارج ہو جانے اور دونوں تک بھوکھڑے سبب و کرم سنگھ کی جسمانی طاقت زائل ہو چکی تھی اور اب وہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا رونا سپاہیوں کے ہاتھوں پر تھا۔

”وہ آگ دیکھ رہے ہو و کرم سنگھ؟“ راجہ رتن سنگھ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ رام دیو اور رانی بھی مہمانتری کے نزدیک آگئے تھے۔

و کرم سنگھ نے دھندلی آنکھوں کے ساتھ ان شعلوں کی طرف دیکھا جو پوری شدت سے بھڑک رہے تھے۔ ”ہاں..... دیکھ..... رہا ہوں۔“ و کرم سنگھ بے شکل تمام رک رک کر بول رہا تھا۔ ”گھر..... جل..... رہا..... ہے۔“ و کرم سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے لوہے کی سلاخوں لیا۔ ”بے ادب! اپنے غلیظ ہاتھ ہٹا لو میرے جسم سے۔ یہ و کرم سنگھ چوہان کا جسم ہے جو اس حالت میں بوجھ خود اٹھا سکتا ہے۔“ چند لمحوں کیلئے و کرم سنگھ کے ضعف و ناتواں بدن میں قوی جلال کی آگ اٹھی۔ سپاہی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور و کرم سنگھ اس طرح کھڑا رہا جیسے کوئی زبردست آندھی میں کھڑا رہا۔ ”میرا گھر جل رہا ہے رتن سنگھ میرا گھر جس کی بنیادوں میں خدا کے بندوں کا خون نہیں، میرے پیر کا لوشاں ہے۔ ایسی عمارتیں دنیا میں کبھی کبھی تعمیر ہوتی ہیں۔ اسے جل جانے دے کہ اس کی روشنی والے قافلوں کو راستہ دکھائے گی۔ یہ بتا رہا ہوں کہ جو میرے مہمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ میرے مہمان! انہیں میرا سلام پہنچے۔“ یہ کہتے کہتے و کرم سنگھ کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں۔ طائفہ کو ہوتی جارہی تھی۔ و کرم سنگھ دل کے زور سے بول رہا تھا۔ ”اے میرے نمکسار چوڑی آزاد ہواؤں! کو میری مجبوریاں بتا دینا کہ وقت کم تھا۔ اس لئے میزبان محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور یہ بھی کہ و کرم سنگھ بہت مفلس تھا۔ اس کے پاس اجڑے ہوئے دل اور باپ دادا کے چھوٹے ہوئے گھر کے نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے روشنی کیلئے دونوں کو جلا دیا۔“ چند ساعتوں کیلئے و کرم سنگھ کے جسم میں بھڑکاتھا وہ جھگڑ گیا اور لوہے کی سلاخیں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ و کرم سنگھ فرش پر گر گیا۔ ”و کرم سنگھ!“ رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ”اس آگ میں تیری بیٹی جلا اور وہ راجہ رتن سنگھ بھی جس نے تجھ سے تیرے دیوتا چھین لئے۔ اگر انہیں بچا سکتا ہے تو بچالے کہہ۔ آگ کو بجھانے والا کوئی نہیں۔“

”رتن سنگھ! تیری لگائی ہوئی آگ ان کے دامن کو کبھی نہیں چھو سکتی۔“ و کرم سنگھ مسکرا پورا آنکھیں بند کر لیں۔

راجہ رتن سنگھ کو احساس شکست نے پاگل کر دیا تھا وہ دیوانوں کی طرح و کرم سنگھ کے ٹھوکر مارا۔ مہمانتری نے زبان نہ کھولی۔ یہاں تک کہ اس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے اور جسم آواز خنہ گیا۔

☆ ☆ ☆
اس رات پورا چوڑ جاگ رہا تھا۔ شر کے باشندے شعلوں کا رقص دیکھ رہے تھے اور مٹی کے کین بے گھر مسافروں کی طرح درختوں کے نیچے خاموش بیٹھے تھے۔ راجہ محل کا ایک مخصوص کمرہ تھا جہاں رام دیو، رتن سنگھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”سہرا! آپ کے سپاہی بھان متی کا سر لے کر آیا نہیں ہوئے؟ بھل شاہ کا مندر راتنی دور تو نہیں۔ کیا انہیں بھی وہ جادو کرنی کھائی؟“ رام دیو کی خوف جھک رہا تھا۔

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے گھبرا کر رام دیو کی طرف دیکھا۔ دہشت سے دونوں کے چہرے زرد پڑے تھے۔ ”یہ غیر معمولی بات ہے۔“ آخر رتن سنگھ کے ہونٹوں کو جنش ہوئی۔ ”اب تک بھل شاہ کے سپاہی غیر معمولی بات ہے۔“

”کی کئی پھیرے لگائے جاسکتے تھے۔“ رانی پدمنی بھی بول اٹھی مگر اس کی آواز میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ رام دیو خاموش تھا وہ بار بار اپنی پیشانی کو رگڑ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب پر وحشت مسلط ہوتی گئی۔ ”ہمیں مزید سپاہی بھان متی کے قتل کیلئے روانہ کرنے ہوں گے۔“ رام دیو نے شدید ذہنی کے وارز سے نکلے ہوئے کہا۔ وہ سپاہیوں کے واپس نہ لوٹنے سے خوفزدہ تھا مگر راجہ رتن سنگھ اور بھان متی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ”ہمیں ہر حال میں بھان متی کا سر چاہئے۔ اس پیر کی ایک منتر، کوئی چاب کار گر نہیں ہو سکے گا۔ علاء الدین خلجی کے حملے کو روکنے کا یہی ایک ہے کہ کوہ ابو میں بیٹھی ہوئی اس جادوگرنی کو ہلاک کر دیں۔ ورنہ..... ورنہ.....“ رام دیو تباہی مکاری کے ساتھ بات کو ابھادیا تھا۔

”ورنہ کیا ہو مہاراج؟“ راجہ رتن سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ رام دیو نے اپنی شعبہ بازی کا مظاہرہ کرنے کیلئے اپنا دایاں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھایا۔ ”ہمیں وہ آسمان کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔“ ایسا دیکھ بھی کر سکتا ہے، دیوتا ہم سے خفا بھی ہو سکتے ہیں۔ اے رتن سنگھ! نافرمانوں کو چوڑی دھرتی پر کیوں پناہ دی؟ یہ بڑا گناہ ہے اور بڑے گناہ کی سزا بھی بیشہ ورنہ نکال ہوتی ہے۔“

رانی پدمنی برہم ہوتے ہوئے رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی بکھری ہوئی قوت برداشت کو سمیٹا۔ راجہ رتن سنگھ کیلئے اس انداز گفتگو کو ترک کر دیں۔ آپ کے گمان کی مشککیوں پر ہم میں سے کسی اس کی شک نہیں ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ ہی چوڑی تیا کے کیوں ہار ہیں مگر چوڑ تو لے لے، پانی تو پھینکے کہ اس میں کیسے کیسے بھنور پڑ رہے ہیں۔ رانی پدمنی، رام دیو سے التماس کر رہی اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ شدید حالت بیزاری میں ہو اور اس صورت حال سے کچھ بچھڑنا چاہتی ہو۔

رام دیو کچھ دیر چوتھا رہا اور پھر نہایت تمکیر لیے میں کہنے لگا۔ ”بھان متی اور آندپال کا قتلہ بہت دن پہلے ہو گیا تھا۔ اگر راجہ رتن سنگھ دن اور چوڑ نہ آتا تو ان دونوں کی بے وقافتوں پر اسی طرح ہلاکت۔ بھان متی اور آندپال نے دیوتاؤں سے کہے ہوئے عہد بھلا دیئے تھے اور پھر وہ اس فکر میں کہ کس طرح اپنے غلیظ جذبوں کو تسکین پہنچائیں اور چوڑ کی آزادی کو مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کرے۔ اسی دوران جب علاء الدین خلجی کی فوجوں نے گجرات پر قبضہ کر لیا اور راجپوتوں کا ایک طاقتور ستون گر گیا تو پھر بھان متی اور آندپال کو اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی۔ یہی وہ قہرمان دونوں نے مل کر اپنی روحانی طاقتوں کے ذریعے علاء الدین خلجی کو ورغلا دیا۔“

”ایک انسان کیوں میل کے فاصلے سے دوسرے انسان کو کس طرح ورغلا سکتا ہے؟“ رام دیو کی زبان سے پدمنی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مہارانی! جس طرح آپ چوڑ کے قہر پر حکومت کرتی ہیں، اسی طرح ہم سادہ و سست لوگ اس نظام پر حکومت کرتے ہیں جو ظاہری آنکھ سے نظر نہ آتا۔ یہ ایک مشکل گیان ہے جو اپنی ذات کو فنا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ گیانیوں

کے اس طریقہ کار کو ایک عام انسان نہیں سمجھ سکتا۔ ”رام دیو نے ایک مضبوط دلیل پیش کی تو رانی پدمنی کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

پھر بھی وہ ایک ذہین عورت تھی۔ رام دیو کے جھوٹ کے انبار میں سے اس نے اپنے مطلب بات نکال لی۔ ”مہاراج آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھان متی اور آئندہ پال بھی گمان رکھتے تھے۔“

”ہاں! انہیں شہتی حاصل تھی مگر تخریب اور گناہ کی شہتی۔“ رام دیو نے چند لفظوں میں انتہائی بھان متی کی نفی کر دی۔ ”اپنی اسی تخریب و گناہ کی شہتی سے ان دونوں نے علماء الدین خلعی کوڑے چھڑکی طرف متوجہ کیا۔ راجپوتوں کی غیرت مند ملکہ کا چہرہ اسے خوابوں میں دکھایا کہ اس طرح علماء کے ہوسناک جذبے مشتعل ہو جائیں گے اور پھر وہ چھڑ پر لشکر کشی کر دے گا۔“

”مہاراج! ہم نے تسلیم کر لیا کہ مذہب و وطن کے دغداروں نے ہماری ذلت و تباہی کا ایسا منصوبہ بنایا تھا مگر آخر اس کا کوئی توڑ بھی ہے؟“ اس بار راجہ رتن سنگھ نے زبان کھولی تھی اور واضح الفاظ رام دیو سے مدد کی درخواست کی تھی۔

”یہ طلسم ہل بھر میں ٹوٹ جائے گا سمرات! مگر پہلے اس کی شرائط تو پوری کیجئے۔“ رام دھڑلے اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ ”مجھے اپنی زندگی کے اس خوفناک عمل کیلئے تین سراسر اور ایک جسم چاہئے۔“

کے بے شمار جیج و خم دینے کے بعد بالآخر رام دھڑلے ناپائیدار عیالیں کر دیا۔

”کس کے سراور کس کا جسم؟“ رانی پد منی نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”بھان متی“ وکرم سنگھ اور آفریدی کے سر۔“ رام دیو کے نفس کی تمام تر خیانت اس کے ہونٹوں

”آپ ان سروں کا کیا کریں گے؟“ رتن سنگھ اور پدمنی دونوں پرستہ ساطاری ہو گئے تھے۔
 ”اصولی طور پر مجھے چوتھا سر بھی درکار تھا۔“ رام دیو نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی یاقت کی بالائے اُ
 ہوئے کہا۔

”وہ کس کاسر ہے؟“ رانی پدمنی کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔
 ”آئندہ پال کاسر کہو، وہی اس ظلم کا بانی تھا۔“ رام دوہست تیزی سے بالاکو گردش دینے لگا۔
 ”ہم اس کاسر کہاں سے لائیں مہاراج کہ پانی کی تو راج بھی ہوا میں اڑا کر لے گئیں۔“ راجدھن
 شندیدے چارگی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو گرڑ رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں سہرا! میں جانتا ہوں۔“ رام دیو کے سیاہ اور بھدے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہو گئی۔ ”اسی لئے تو میں اصرار نہیں کر رہا ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا گیبانی ہوتا تو آخندہاں کی طرف طلب کرتا۔“

رتن سنگھ اور پدمنی کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔
 ”مگر آپ ان سروں کا کیا کریں گے؟“ چوڑے کے کھراٹے نے اس سنگدل جادوگر سے پوچھا۔
 زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف پراسرار تھا۔ ”میں آفریدی کا سر کہاں سے لاؤں گا۔“
 وکرم سنگھ کے سر تو پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اچانک ایک اور ابھرنے لگی تھی جس نے تنہا
 ا منی کی امیدوں پر خاک ڈال دی تھی۔

”دنیا کا ہر گمانی جانتا ہے کہ ہر منتزاد اور ہر چاہ کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں، کچھ شرائط ہوتی ہیں۔ کوئی بھی اصول ترک ہو جائے یا کوئی بھی شرط پوری نہ کی جائے تو پھر ناکامی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔“

مگر ان میں سے عمر ریاضت کرتا رہے، اپنی زبان کھس ڈالے یہاں تک کہ آتما بھی تیاگ دے مگر کچھ مدت سہی۔ میں تو صرف آپ کی خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہوں۔ اس عمل میں میری اپنی مل نہیں ہوگی۔

میں نہیں ہوں۔ لیکن اپنے مذہب اور اہل وطن کو مضر خود دیکھنے کیلئے میں یہ خطرہ بھی مول لے کر نکلتا ہوں۔

”ام دیوئے ایک بار پھر انتہائی چالاک سے رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے کاندھوں پر اپنے احسانات کو یاد دلاتا تھا۔“

”مبارج! ہم“

رام دبو اپنے شکار کو اتنی آسانی کے ساتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ ”مہارانی! آپ غلط مشیروں کی سے مسائل کے جال میں گھر گئی ہیں، اس لئے ہمت شکن باتیں کر رہی ہیں۔ مایوسیوں کے گہرے برے کے سبب آپ کو ہماری شخصیت نظر نہیں آتی ورنہ ساری ہمتی جانتی ہے کہ ہم جیسے گیان والے ت کے لکھے کو بھی مٹا دیتے ہیں۔“ رام دیو مکرو فریب کانیا چولا پن کر بولا..... ”اگر چوڑو دشمنوں کو غور، ہاتھ اور اس کے پیچھے ہماری ہی طاقت کا فرما ہوگی۔ ہماری تپسیا اور شہتی کو اس طرح نہ جھٹلائیں۔ منہ لیم نہ تو نوانہ رہے گی۔“ اتنا کہنے کے بعد رام دیو بھی ایک ادا نے بنے نیازی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ل دن کے ٹھیک بارہ بجے دونوں خنس ستاروں شہنی اور منگل (زحل و مریخ) کا میل ہے۔ لکاش کرنے کیلئے اس سے بہتر گھڑی اگر کوئی ہے تو برسوں بعد آئے گی۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ لے لیں۔ یہ میرا اہل چوڑ پتر آخری کرم ہے۔ آپ بھان متی اور وکر منگھ کے سرکل بارہ بجے تک بھہ نیام کے سمندر پہنچو اور بیجئے۔“ رام دیو نے آفریدی کا سر کم کر دیا تھا۔

والی پدمنی کے چہرے پر گھسدا مسرتوں کے سائے لوٹ آئے۔ ”مہاراج! واقعہ سیاسی مسائل
 بخدا! وہی سکون برپا کر دیا ہے ورنہ آپ کی شان میں اس گستاخی کے مرتکب نہیں ہوتے۔“ پدمنی
 دلت کا اظہار کر رہی تھی۔

ہم نذر نذر فی الساعت کو فراموش کر دیجئے۔ چوتڑ آپ کا ہے اور آپ ہی کار ہے گا۔ ہمارا کیا ہے، یارین جن لوگ میں جیتا ہے، باقی دن بھی غنیاں لے کر گزار دیں گے۔ ایک بار پھر اپنے سر کا جو بھی اتار لے گا آکاش سے پار چلے جائیں گے۔ دھرتی کے کاسیوں نے ہماری قدر نہیں کی، رام دیواس طرح نہ کر رہا تھی جسے تمام مخلوق خدا کا در اپنے سینے میں چھپائے پھر تار ہا ہوا اور اب اس در کی شدت سے مگر مرے دل داعیں کر رہا ہو۔

نور محمد نے کہا: ”میں نے اپنی زبان پر نہ لائیں۔“ رانی پد پنی نے خوش عقیدت میں دونوں کو دیکھا اور کہا: ”میں نے اپنی زبان پر نہ لائیں۔“ رانی پد پنی نے خوش عقیدت میں دونوں کو دیکھا اور کہا: ”میں نے اپنی زبان پر نہ لائیں۔“

”ایک آدمی نے کہا کہ اس شخص سے کمال حاصل ہے۔ وہی چوڑ کو اس شکست سے نکال سکتے ہیں۔“ رانی پد منی، رام دیو

”یہیٹا۔“ راجرتن سنگھ نے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ ”ہم مہاراج کے گیان کے کب قائل نہیں ہیں۔“ آج تک ان ہی بات تو چوتھوں میں اونچی رہی ہے۔ اب بھی وہی سر بلند رہیں گے۔ ہم تو ان کے ایک ہیں۔“ رتن سنگھ ایک باہر پھرام دیو کی شجہہ بازیوں کا مکمل امیر نظر آ رہا تھا۔ ”تو پھر بھان متی کے قتل کیلئے دوسرے سپاہی روانہ کر دیجئے۔“ پدمنی نے رام دیو کے منصوبے کو ٹھیک پہنچانے کیلئے سہا قدم اٹھایا۔

”سہا تو کب کے بھیجے جا چکے مگر ان میں سے ایک بھی لوٹ کر نہیں آیا۔“ ایک ایک رتن سنگھ
 شت زورہ ساد کھائی دینے لگا۔

اس سلسلے میں رانی پد منی خود بھی پریشان تھی مگر اس نے دل کو سمجھانے کیلئے نئے زاویے سے سوچنے کی کوشش کی۔ ”سمرات! ہو سکتا ہے کہ وہ چاروں سپاہی بھی در پردہ اس طوائف زادی کے عقیدت مند ہوں اور اس بنائے بھان متی سے جا کر مل گئے ہوں۔“

”مہمان! رتن سنگھ کی آواز اونچی تھی اور لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”اگر سب کچھ درپردہ ہی ہو رہا ہے تو ہمارے سامنے کھنڈے والے کون لوگ ہیں؟ ان کے چروں پر کیا لکھا ہے اور ان کے دلوں میں کیا انفاق ہے؟ ہم کچھ بھی نہیں سمجھے۔“

”سمرات! میں نے تو صرف ایک خیال ظاہر کیا تھا۔“ رانی پدمنی کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔
”آپ دوسرے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیں، پھر میرا عقدہ کھل جائے گا۔“

”یہی عجیب بات ہے ایک بوڑھی عورت کو قتل کرنے کیلئے فوجی دستے روانہ کئے جا رہے ہیں۔“
 قتل عام کی طرح ہلکا ہلکا اٹھا اور پھر اس نے شدید عالم میں پیش و پیچاس بہترین شمشیر زنیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اس خبیث جادو گر نے کاسر کاٹ کر ہمارے حضور پیش کر اور ان چاروں نمک حراموں کی لاشیں بچتے ہوئے لاؤ جو ہماری نناہ سے نکل کر ایک دیشاک شرن میں چلے گئے ہیں۔“

”کیا تم اپنے چچا

”اُس سے میرا کوئی رشتہ بانی نہیں رہا۔“ رانی پر مٹی نے غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر یہ رشتہ کم بھی رہتا تو راج خانی اس رشتے کو قبول نہیں کرتی۔ اقتدار چنزوؤں سے نہیں دماغ سے برقرار رہتا ہے۔ چھوڑ کر سلامتی پر ایک وکر مٹکھ کیا ناروؤں وکر مٹکھ قمران کئے جا سکتے ہیں؟“

اس دن کیلئے تحریس اپنا شریک زندگی بنایا تھا۔ دیوانوں کا کرم ہے کہ ہماری نگاہ انتخاب نے دھوکا نہیں کھایا۔

☆ ☆ ☆
رات کا قلعہ اپنے آخری مرحلے سے گزر رہا تھا۔ نرملاکامری، علی عامر آفریدی، خادمہ رامیشوری اور چند عمو ایک لمبے کیلے بھی نہیں سوئے تھے اور سوتے بھی کس طرح کہ منتزی بھون جل رہا تھا۔ طلسم کدے کی آہنی دیوار پر ۲۔۳ تپ رہتیں اور اس کے چاروں کین، درختوں کے نیچے بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں گم

”جے جگ دیے..... جے جگ دیے۔“
 چچ کیا تھی کسی جنگی جانور کی دھاڑ تھی۔ رتن سنگھ اور پدمنی اچھل پڑے اور دوسرے بولے۔

فرش پر گر گیا جسے رام دیو تھور رہا تھا۔ رام دیو کی شعبہ بازی رنگ لائی فانوس اپنی جگہ قائم کر رہی تھی۔ رانی پد منی اسے کھلی آنکھوں سے نوٹ کر بکھرے دیکھ رہے تھے۔ رام دیو نظر بندی کے فن میں حلقہ تھا جس شخص کو جو کچھ دکھانا چاہتا تھا اس کی آنکھیں وہی منظور دیکھتی تھیں۔ رانی پد منی نے بھی وہی کچھ دیکھا اور اس نے اسے دکھایا بھی وہ سنہلنے بھی نہیں پائی تھی کہ رام دیو نے اپنی چادر کا پلہ ایک جھٹکے کے ساتھ کنارے پر اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں خوشبودار دھواں بھر گیا۔ اہل چوڑاس دھویں کو مقدس دھواں

تھے۔ راجپوتوں کے بقول اس دھوئیں سے رام دیونے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ رہائش
حملہ آور فوجوں کو وقتی طور پر راندھا کر دیا تھا اور جب چھوڑ کے دشمنوں کو راستہ نظر نہیں آتا تو وہ ناکام واپس
واپس چلے گئے۔ اس طرح ہر طرف رام دیو کی ”جے جے کار“ ہونے لگی اور وہ ساتراظم کا قرار دیا گیا۔

رام دیو کا مقدس دھواں اس وقت بھی بہت کام آتا تھا جب کوئی ہندو دوشیزہ پہلی بار اپنا پانچواں بے
آشرم میں داخل ہوتی تھی اور اس معصوم لڑکی کو اسی مقدس دھوئیں کے ذریعے بے ہوش کر دیا جاتا
الغرض یہ دھواں رام دیو کی سب سے بڑی ہنکتی تھی اور انی اس ہنکتی بروہہ بہت نازاں رہا کرتا تھا کہ

نے آفریدی پر اسی مقدس دھوس کو آزما تا تو سب کچھ رائیگاں گیا اور رام دھو کی شتی کا سارا بھرم کم ہو گیا۔

آگئی۔ پدمنی کے اسی شبہ کو زائل کرنے کیلئے رام دیونے نئے انداز سے اپنی شعبہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اس نے فائوس، توڑا اور پھر کمرے کو دھوس سے بھر دیا۔

”سمراٹ! رتن سنگھ اور پدمی پر مجوش انداز میں چیخے۔
”سمراٹ! میں جا رہا ہوں علماء الدین کی بڑھتی ہوئی فوجوں کو روکنے کیلئے آپ اپنا کام نہ رکھیے۔“

رانی پدمی اپنے روحانی پیشوا کو پکارتی رہ گئی۔ مگر رام دیواس آشرم کی طرف چلا گیا تو کچھ دنوں
سیاہ آندھی میں تباہ ہو گیا تھا اور جسے رتن نگھ نے دوبارہ تعمیر کرا دیا تھا۔ اس آشرم میں رام دیو کا کلہ
موجود نہیں تھا لیکن کئی دودا ساں اس کی خدمت کیلئے حاضر رہتی تھیں۔

رام دیو کے جانے کے بعد دھواں آہستہ آہستہ فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ رانی پدمنی کے چہرے پہانے بیان مسرت رقص کر رہی تھی۔ اس نے بڑے ناز واداکے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر رانی نے قرار نظر سے کبھی کمرے کے فرش کی طرف دیکھتے نہیں اور کبھی اس فائوس کی طرف جو پہلی طرف لگا کر

”مہارانی! یہ فانوس تو ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ ہم نے خود اسے ریڑھ ریڑھ ہوتے دیکھا تھا اور ریشوں کے
کا آواز سنا بھی، یہی قصہ یہ۔“ پھر یہ لکھا ہوا کہ فانوس سالمہ دعائے نظر آ رہا ہے۔ “رتن سنگھ جی، ان چہرے

”سمرات! یہ سب مہاراج کی شہتی کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ ہے۔“ رانی پد منی کسی سادہ لوح عورت کی طرح رام دوکھا، شہدہ ہازر سے بے لگجائی، ”اب آپ کسی شہک میں مبتلا نہ ہوں۔“

تھے۔

”راج کماری! مجھے اجازت دیں تو میں باہر نکلنے کی کوشش کروں“ چندر سنگھ نے اس سکوت کو توڑا۔
 ”تم کہاں جاؤ گے چندر سنگھ! اس آگ نے تو کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا ہے۔“ نرملہ بہت نرم لہجے میں سوگوار کی تھی اور نہ لرزش۔ اس نے اپنا غم سینے کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا مگر پھر بھی آنکھیں بند رہی تھیں کہ آنسوؤں پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اگر وہ اشکوں کو پی لیتی تو پتھر کی ہو جاتی اور ابھی بچ رہنے جانے کا موسم نہیں آیا تھا۔

”میں تو صرف اس لئے باہر جانا چاہتا ہوں کہ مالک کی خبر گیری کر سکوں۔“ چندر سنگھ اپنے جذبات قابو نہ رکھ سکا اور ہچکچوں سے رونے لگا۔ ”خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔“
 ”چندر سنگھ!“ اچانک نرملہ کی آواز سخت ہو گئی تھی۔ ”میرے غم کو تماشا نہ بناؤ۔ مجھے خبر ہے کہ مہمانتری کس حال میں ہوں گے؟ یا غیوں کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ زنداں سے گزرے تو مثل جاپیچے پتا بھی اپنی منزل کی جانب گامزن ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کا سفر ختم بھی ہو گیا ہو۔ ایسے مسافروں کو تلاش نہیں کیا جاتا جو واپسی کے تمام دروازے بند کر کے اپنے گھر سے نکلتے ہیں۔“

چندر سنگھ پھر کچھ نہیں بولا اور فضا میں دوبارہ ساکت ہو گئیں۔ آفریدی، نرملہ سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتا تھا مگر نرملہ کے ضبط غم کا انداز دیکھ کر وہ بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا۔ اندھیروں کے سائے قریب قریب بیٹھے تھے لیکن تاریکی نے ان کے چہرے سے ایک دوسرے سے چھپائے تھے اگر چہ رو سے پانی کا چادر بہت جاتی تو آفریدی، رامیشوری اور چندر سنگھ کو اندازہ ہوتا کہ پتھر کے ایک جیسے میں کتنے گھاٹ پڑے ہیں اور جیسے کی آنکھوں سے پانی نہیں خون بہہ رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

علاء الدین خلجی کا لشکر راستے میں خیمہ زن تھا۔ فوجیوں کی اکثریت مجھو خواب تھی اور کچھ پانا مختلف خیموں پر پہرہ دے رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ علاء الدین خلجی کے خیمے میں موجود تھے اور ان کی نماز ادا کر رہے تھے۔ جب آپ نماز اور دعا سے فارغ ہوئے تو علاء الدین نے بے چین ہو کر پوچھا۔
 ”خسرو! تم نے اپنی دعاؤں میں کیا مانگا؟“

”اپنے سلطان کی بلند آفتابی۔“ امیر خسروؒ نے جواب کہا۔

علاء الدین مسکرایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ”خسرو! حضرت شیخ نے ہماری اس مہم کے بارے میں کیا فرمایا تھا؟“ علاء الدین بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا اگرچہ امیر خسروؒ سلطان کو کئی بار محض محبوب الہی نظام الدین اولیاؒ کے فرمودات سنا چکے تھے لیکن سلطان ایک مردِ کامل کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ بار بار سننا چاہتا تھا۔

”سلطان! پیرومرشد نے عظیم الشان فتحی خبر دی ہے۔ فرمایا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کو کچھ کرنا پڑا۔ ساری بلندیاں زمین بوس ہو جائیں گی اور سلطان کا پرچم قلعہ چوڑ پر اس طرح لہرایا جائے گا کہ آنکھ نے اس سے پہلے یہ منظر نہیں دیکھا ہو گا۔ سلطان جلد سے گزریں گے ان کی بلند آفتابی کے۔ ہوں گے اور راجپوتوں کی گردنیں اس طرح جھک جائیں گی کہ سلطان کے جاہ و جلال کے سوا کچھ باقی رہے گا۔“

”کیا حضرت شیخ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ معرکہ آرائی میں ہمیں بہت دشواریاں پیش آئیں گی اور جلد

ہاں کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔“ علاء الدین خلجی ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا وہ تو سارے راستے ہٹا کر نظام الدین اولیاؒ کی باتیں سننا چاہتا تھا کہ اس طرح اس کے جذبہ تسخیر کی تسکین ہوتی تھی اور نئی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے اعصاب پر بلا کا سا جو فطری خوف مسلط تھا سلطان اسے مکمل طور پر زائل کرنا چاہتا تھا۔

”ہر روز فوجیوں کو دشواریاں تو پیش آتی ہیں۔“ حضرت امیر خسروؒ نے کہا ”مشکلیں جس قدر زیادہ ہوں گی، فوجی ہی رہیں گے، سختیاں آئیں گی مگر سلطان کا سایہ پڑے ہی موم ہو جائیں گی۔ دشمن اپنے تمام حربے استعمال کر ڈالیں گے مگر سلطان کے جسم کو خراش تک نہیں پہنچے گی۔“

”ایسا ہی ہو گا خسرو! ایسا ہی ہو گا۔“ علاء الدین نے جوش اضطراب میں زمین پر سر رکھ دیا۔ جیسے وہ اپنے خدا کا شکر ادا کر رہا ہو۔ ”خسرو! چوڑ پاناں ہو جائے گا اور ہم دنیا میں فتوحات کی ایک نئی تاریخ لکھیں گے۔“ سلطان نے سراٹھا کر کہا اور بے تابانہ اپنے خیمے میں گھسے لگا۔

☆ ☆ ☆

رات گزر چکی تھی اور اندھیرے میں روپوش ہو جانے والے منظر صاف نظر آنے لگے تھے۔ رات بھر جانے کے اڑے منتزی بھون کے کینوں کے چرے بجے بجے نظر آرہے تھے۔ آگ کے شعلے دم توڑ چکے تھے دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا جو چیزیں راہ رکھ ہونے سے بچ گئی تھیں وہ مسلسل سلگ رہی تھیں۔ نرملہ کماری نے بانگ کی آخری گوشے تک جا کر دیکھا مگر اسے منتزی بھون کا کوئی بیزار نظر نہیں آیا۔ ظلم کدہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس طرف محل کے دوسرے حصے کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی بس ایک طویل اور اونچی دیوار تھی جو ظلم کدے اور منتزی بھون کو آپس میں اس طرح جوڑتی تھی کہ دونوں ایک ہی عمارت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ تھے۔ کچھ دیر تک اپنے بزرگوں کی نشانی کی بربادی کا منظر دیکھنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ ہٹتی ہوئی علی عامر آفریدی کے نزدیک آئی اس دوران ملازمہ رامیشوری اور چندر سنگھ شرم کی آگ بجھانے کیلئے ان کے درختوں میں لگے ہوئے پھل توڑنے چلے گئے تھے۔ نرملہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آفریدی اٹھ بیٹھا۔

”آپ کیسے ہیں سردار؟“ نرملہ نے نظر سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔ آفریدی نے نرملہ کے بدلے ہوئے اس طرح نرملہ کو شہت سے محسوس کیا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے والی دوشیزہ اب ایک نوجوان مرد سے لگاں چہ چہ رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو راج کماری مگر آپ کا غم برداشت نہیں ہوتا۔“

”جب مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے تو آپ میرے بارے میں کیوں پریشان ہیں۔“ اس بار نرملہ نے غم کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو تم کون پریشان ہو گا؟“ آفریدی کی آواز میں ساری دنیا کا درد سمٹ آیا تھا۔ ”مہمانتری کے لیے دنیا میں آپ کیلئے پریشان ہونے والا میرے سوا دوسرا کون ہے؟“ آفریدی نے جوش جذبات نرملہ سے چمک کر دی تھی۔

”مجھ کو تو چمک کر شامی سفیری طرف دیکھا۔“ ”سردار! آپ غلطی پر ہیں غور سے دیکھئے۔“

”سچ میں؟“ ”نہیں! چندر سنگھ میری خاطر کیسا عذاب جھیل رہے ہیں کیا آپ کو ان کے چہرے جذبات سے عاری نظر لگتا ہے؟“

”مہمان کی دقتوں پر شک نہیں کرتا۔“ آفریدی کچھ سرسبز سا منظر آنے لگا تھا۔ مگر نوراً

سنبھل کر بولا۔ ”ہر شخص کے جذلوں کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ وہ یقیناً آپ کی خاطر اپنی جانوں سے گھر جائیں گے لیکن کے معلوم کہ یہ جاں نثاری کا طوفان کیسے اور بھی اٹھ رہا ہو۔ اسے طوفان کے وقت سے بھاری پتھروں نے اسے اس کے کناروں میں قید کر دیا ہو۔ طوفان کی مجبوریوں کی کسی کو خبر نہیں۔ کڑا وہ موجیں آزاد ہوتیں تو دریاؤں میں انقلاب آجاتا۔ ایسے بھنور پڑتے کہ سارا پانی تہہ پہلو ہوا کر دیا جاتا دنیا والوں کے بنائے ہوئے تمام سنگی کنارے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔“

”آفریدی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

”طوفان کو خاموش رہنا چاہئے کہ خاموشی سے ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔“ ”مرا“ فریاد کیا۔
 باتوں کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ اس لئے نظریں جھکا کر بول رہی تھی۔ ”جذبہ اپنے آپ کو ظاہر کیوں کرتا ہے کہ اس طرح تو ان کے نمائش ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔“

”اظہار بھی ضروری ہے راج کماری!“ آفریدی کالجہ شدید اضطراب کی عکاسی کر رہا تھا۔ ”ہم نہیں ہیں کہ دلوں کا حال جان لیں۔ عہد اور اقرار اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب دل اور زبان دونوں کو ادا دیں۔“ آفریدی کی دلیل پر نرملہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ ”آپ کا کھر جل رہا ہے اور خاموش بیٹھ کر یہ ثابت کرتا رہوں کہ میرا دل جل رہا ہے۔ کیا میں جندوں کے اسی اعزاز پر قادر کر لوں؟ نہیں راج کماری! میری زبان کو کبھی جل جانا چاہئے۔ پھر دیکھنے والا خود اندازہ کرے گا غلط سمجھ میں اور جذبے نمائشی ہیں۔ آپ کی غیرت و خودداری کو آفریدی کا سلام مگر اسے غموں پر پراتے آبا پر دے نہ ڈالیں کہ آپ کا کوئی ہمدرد انہیں دیکھ ہی نہ سکے۔ اپنی ذات کے گرد گھمچا ہوا یہ دائرہ آپ ایک دن تنہا کر دے گا اور پھر یہ تنہائی آپ کو نفرت و بیزاری کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ یہاں تک کہ سے آپ کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ اگر میں لاحق اعتبار نہیں تو خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ کسی کو کبھی مت تر کر اسے غموں کا شریک بنا لیجئے۔“

اعتبار نہیں ہوتا اچانک ہند کیوں جھوٹی؟ اقتدار کو کیوں ٹھکرائی؟ ”یہ کہہ کر نرملہ نے منہ بھرا۔ آئسوڈ کو آفریدی سے چھاپا ہوا ہنسی۔

”تو پھر خاموش نہ رہیں، بولتی رہیں، خیالات کو منتشر ہو جانے دیں، انہیں ایک نقطہ پر سمیٹنے کی کوشش کریں کہ ہواؤں میں برازہر شامل ہے اگر یہ زہر آپ کے دل میں اتر گیا تو سمیٹیں بھی ایک زندہ لاش بن جائیں گے۔ آپ اس عظیم انسان کی امانت ہیں جس کے احسانات کے بوجھ سے نہ میرا سر اٹھ سکا ہے نہ میری روح آزاد ہو سکتی ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اس امانت کو اس جفا پرست اور لٹاؤ لٹاؤ

زمانے کے حوالے کر کے خاتون کی گفتار میں کھڑا ہو جاؤں اور پھر اپنا ایمان برباد کر ڈالوں؟
 ”میں جانتی ہوں“ میں جانتی ہوں۔“ نرمالے حالتِ اضطراب میں درخت کا سارالے
 آنکھیں بند کر لیں۔ ”سرور! آپ نہیں جانتے کہ میری پرورش کیسے ماحول میں ہوئی ہے اور ان آنکھ
 نے چوتھو میں کیا کیا مناظر دیکھے ہیں، مجھے تو دیوتاؤں کی پرستش کے دور میں بھی اس دنیا سے قوت
 کس سے کتنی کہ دل پر کیا گزرتی ہے؟ ایک سنہ و الا تھا وہ بھی چلا گیا۔“

کس سے کہتی کہ دل پر کیا گزرتی ہے؟ ایک سننے والا تھا وہ بھی چلا گیا۔

”جانے والا کہیں نہیں گیا۔“ آفریدی اس حوصلہ مند و شیرہ کی غم گساری کر رہا تھا جو اپنے آپ کو

میں ایک چٹان تھی مگر آج غموں کی یلغار نے اسی چٹان میں ہلکی ہلکی دراڑیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔

ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے اور ہماری نظروں کے سامنے متحرک ہے۔ اس کا مقام ہمارا اپنے

ہوں، سہمی نہیں جائے گا۔“

یہ عرض محبت کے اظہار نے نرملہ کی پلکیں بھگو دیں۔ صدمات کا غبار جو پتھری طرح جتنا جا رہا تھا، خلوص کے لہجہ کی حرارت سے کھٹکنے لگا مگر آنکھوں کی یہ نمی بہت عارضی تھی۔ یادوں کے شدید جس کے بعد بہت سے بادل اٹھے لیکن چند ہونہیں ہر سارے گزر گئے۔ نرملہ کو آفریدی سے حجاب آنے لگا تھا وہ کھل کر نہ

”رات کے پچھلے پہر کچھ دیر کیلئے میری آنکھ لگ گئی تھی میں نے خواب میں دیکھا کہ جس سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوں، وہ اچانک جڑ سے اکھڑ گیا ہے اور میں اس کی شاخوں میں دوپٹی جی رہی ہوں۔“

پاک نرملہ نے آفریدی کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری پریشان خیالی ہے یا اس خواب کا حقیقت

آزادی، نرملہ کا خواب سن کر چونک اٹھا مگر اس نے فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی اور نرملہ کے اطمینان کیلئے کہنے لگا۔ ”راج کداری! آپ پریشان نہ ہوں یہ محض منتشر خیالات ہیں جو خوابوں کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔“

”نیل سردار! یہ میرا واہمہ نہیں۔ آندھی آچکی اور درخت گر چکا۔“ نرملا کے ہونٹ بھنج گئے اور وہ ہنسی بھون سے اٹھنے والے دھوئیں کو دیکھتی ہوئی اس طرف چلی گئی جہاں رامیشوری اور چندر سنگھ کھانے کیلئے چل تلاش کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
 پورا راج محل پر سکون تھا مگر راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔
 رات تیزی سے گزر رہی تھی اور ہمارا ہاتھ اور ہاتھ شہ کے مندر کی طرف جانے والے سپاہیوں کا دور دور تک کوئی پتہ
 نہیں تھا۔ ہم ان کو قتل کرنے کیلئے جو چار سپاہی ایک دن پہلے بھیجے گئے تھے وہ بھی واپس نہیں آئے تھے اور
 بھران کے تعاقب میں بھیجے جانے والے پچاس فوجی بھی ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔

رام دیوا طمینان سے اپنے آشرم کے ایک کمرے میں کسی دیوداسی سے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا کہ بدھ جیتے میں ابھی کتنی دیر ہے۔ دیوداسی جس کی زندگی تباہ کر دی گئی تھی، بادل ناخوستہ بتا رہی تھی کہ سورج کالی اوپر اُچکا ہے اور دس بجے کا عمل ہوگا۔ رام دیو نے اس مجبور لڑکی کا جواب سن کر ورندوں کی طرف اپنے دانوں کی نمائش کی تھی اور پھر وحشتانہ انداز میں فقرہ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”بس دو گھنٹے باقی ہیں اس کے بعد ہمیں ان دونوں احمقوں سے نجات مل جائے گی۔“

والی پابندی اور تنگہ پر ایک ایک لمحہ کراں تھا۔ راجپوت سمرات نے گھبرا کر اپنے محافظ دستے کے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کومر آبو کی طرف جانے والے سپاہیوں کو تلاش کر کے اسے فوری مہل کر دیں۔

محافظ دستے کے سپاہی قلعے سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں ایک شہسوار بہت تیزی سے قطع کی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا اس نے محافظ سپاہیوں کے روکنے پر کچھ مبسم سی بات کی اور پھر گھوڑے سے اتر کر بھونک بھونک راجپوت تنگہ کی خدمت میں پہنچا۔ سپاہی کی سانسیں جڑھی ہوئی تھیں اور بہت بدحواس نظر آ رہا تھا۔

”کہاں مٹی کا سر کہاں ہے؟“ رتن سنگھ نے چیخے ہوئے کہا۔ ”تم کتنے اور ناکارہ لوگوں کو معلوم ہے کہ رتن سنگھ ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“

لبا ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا تھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”سمرات نے کل جن

بچے ذرا نیچے اس طرح بندھے ہوئے تھے جیسے کوئی مسلمان نماز پڑھ رہا ہو یا پھر کوئی درباری کسی شہنشاہ کی خدمت میں پورے ادب و احترام کے ساتھ حاضر ہو۔

رتن سنگھ نے مہمانی کو ایک اور غلط گالی دے کر اپنی شمشیر باند کی پھر دوسرے ہی لمحے جھجک کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وکرم سنگھ مڑکا تھا اس کی آنکھیں نیم داھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جیسے اسے آخری لمحوں میں نجات کی لازوال دولت میسر آگئی ہو۔

”یہ بھی فریب دے گیا۔“ رتن سنگھ نے عالم طیش میں تلوار پھینک دی اور تیز رفتاری کے ساتھ رام دیو کے آشرم کی طرف بڑھ گیا۔

آشرم کے دروازے پر پہرہ دینے والے سپاہی ڈر کر ایک طرف ہو گئے اور رتن سنگھ رانی پد منی کے ساتھ رام دیو کے مخصوص کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ عیار شہیدہ باز رنگ رلیوں میں مشغول تھا۔ دیو داسیاں اپنے ٹھکانوں کو دیکھ کر ملاحظہ کمرے میں بھاگ گئیں اور رانی پد منی سے شرم سے سر جھکا لیا۔

”ساراج!“ رتن سنگھ بے اختیار ہو کر چیخا۔ ”آپ کیفہ موتی کی محفل سجائے بیٹھے ہیں اور چوڑ پر قامت ٹوٹ رہی ہے۔“

”سراٹ! اپنی زبان پر قابو پائیں۔“ رام دیو نے آخری گھونٹ لے کر بلوریں پیالہ فرش پر پھینک دیا۔ ”آج تک کسی حکمران نے ہم سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔“

آج چوڑ کا ہر فرد رتن سنگھ سے آنکھیں پھیر کر بات کر رہا تھا۔ راجپوت سراٹ نے رام دیو کی کج ادائیگی بھی دیکھی مگر خون کے گھونٹ لی کر رہ گیا پھر اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کی ہلاکت اور وکرم سنگھ کی موت کے واقعات سنائے تو ایک لمحے کیلئے رام دیو کا سیاہ چہرہ مزید دھواں ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”سراٹ! آپ نے وقت کو کھو یا اور وقت نے آپ سے بے وفائی کی۔ مجھے ہر حال میں بھان متی اور وکرم سنگھ کے سراپا نہیں اس کے ساتھ ہی مجھے زلما کماری کا جسم بھی درکار ہے۔“ رام دیو نے اپنی شرائط میں اضافہ کر دیا تھا۔

”وکرم سنگھ تو مڑکا ہے۔“ رتن سنگھ نے گہرا کر کہا۔

”اس کی لاش مسالوں کے ذریعے محفوظ کر دی جائے۔ بوقت ضرورت اس کا سر کاٹ لیا جائے گا۔“

رام دیو کی فریب کاریوں نے نیا انداز اختیار کر لیا تھا۔

”زلما کماری کا جسم تو آپ کے منتر کی شرائط میں شامل نہیں تھا۔“ رتن سنگھ نے ایک اور سوال کیا۔

”یہ آپ کا کام نہیں کہ روحانیت کے معاملات میں دخل دیں۔“ رام دیو اچانک برافروختہ نظر آنے لگا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ زلما کماری اس جاپ میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ زلما کو ہمارے سامنے زندہ پیش کیجئے کھانا دوت کا تم البدل ثابت ہوگی پھر ہم چوڑ کی سرحدوں سے دلی کے محلات تک آگ لگا دیں گے۔

ایک آگ جو دشمنوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔“

رتن سنگھ اور رانی پد منی رام دیو کے آشرم سے ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ ”ساراج نے چوڑ کو چلانے کیلئے جو شرائط رکھی ہیں ہم انہیں پورا نہیں کر سکتے۔“ رتن سنگھ چیخ دتا ب۔ کھارہا تھا اگر ہم کسی طرح زلما کو بچیں بھی کر دیں تو پھر ساراج نامی مسئلہ کھڑا کر دیں گے۔ انہیں عورت اور شراب سے فرصت نہیں ہے۔ چوڑ کی کیا حفاظت کریں گے؟“

رانی پد منی شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھی اور ابھی ہوئی نظروں سے رتن سنگھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سپاہیوں کو ہمل شاہ کے مندر بھیجا تھا ان کی اور گھوڑوں کی لاشیں وادی میں پڑی ہوئی ہیں ہم نے انہیں تلاش کر لیا ہے۔ مندر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھر لے راستے پر چلتے چلتے ان کے گھوڑے بھڑک گئے اور پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھنے کے باعث وہ گرے کھنڈوں میں گر گئے۔ گھوڑے اور سپاہی مڑکے ہیں۔“

رتن سنگھ سنائے میں آگیا اور پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ”تمہارے جسموں کو توہم نے نہیں چھو ا تھا پھر تم لوگ رات کے پچھلے سپرے لے کر اب تک کیا کر رہے تھے۔ کیا ہمل شاہ کا کھنڈ کسی دوسری ریاست میں آباد ہے؟ اور کیا ایک بڑھیا کے قتل کیلئے پچاس سپاہیوں کا دستہ ناکافی ہے؟“ رتن سنگھ انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں سپاہی پر برس رہا تھا۔

”ہمیں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مرنے والے سپاہیوں کی لاشیں نظر آ گئی تھیں اور ہم عاجز تحقیق کئے بغیر بھان متی کو قتل کرنے کیلئے مندر کی طرف روانہ ہو گئے تھے مگر جیسے ہی ہمارے اور مندر کے درمیان نصف میل سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تو.....“ سپاہی کا جسم اچانک کانپنے لگا اور اس کی بات اور دھڑ رہ گئی۔

”پھر کیا ہوا تمک حرام! تو بھی کوئی بھانہ تراش لے۔“ شدت غضب میں رتن سنگھ کے منہ سے کو اڑنے لگا۔

”سراٹ! آپ کے تخت و تاج کی قسم! میں کوئی عذر نہیں پیش کر رہا ہوں۔ مندر سامنے نظر آ رہا مگر اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تو صرف یہ خبر دینے آیا ہوں کہ آپ کے جاں نثار سپاہی اب تک چاروں طرف گھوڑے دوڑا رہے ہیں مگر مندر کا نشان نہیں ملتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے دھڑلے نکل رہا ہو۔“ سپاہی کی زبان لڑکھڑاہی تھی اور پورا جسم سینے سے تر تھا۔

”جو دھڑکتی بھان متی اور ہمل شاہ کے مندر کو نگل گئی وہ تیری لاش کو بھی نگل جائے گی۔“ یہ کہہ کر رتن سنگھ نے قریب ہی دیوار پر لٹکتی ہوئی تلوار کھینچی اور ایک ہی وار میں سپاہی کی گردن اڑادی۔ سپاہی کے سر سے پہلے پد منی نے شوہر کو یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی تھی کہ سراٹ واقعی کی پوری تفصیل تو سن لیں، رتن سنگھ اپنے حواس کو بچکا تھا اور دھبوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ”ہمارے حضور اتنا بڑا جھوٹا؟ ایک ٹھکانا ہوئی بھول عورت گھوڑوں کی رفتار الٹ کر پچاس فوجیوں کی آنکھیں نہیں چھین سکتی۔ یہ سب فریب ہمارے صفوں میں نہ جانے کتنے غدار موجود ہیں جو ہمیں مسلسل دھوکا دے رہے ہیں۔“

”اب کیا ہو گا؟“ پد منی نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”بارہ بیٹے والے ہیں اور ساراج کی ایک ٹرا بھی پوری نہیں ہو سکی۔“

”ہمارے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔“ رتن سنگھ پر مذہیان کی کیفیت طاری تھی۔ ”اب ایک وکرم سنگھ سر ہماری شمشیر کی زو پر ہے اس کو ساراج کے قدموں میں ڈال کر کہہ دیں گے کہ آپ ہی کچھ کریں میرے اپنے سپاہیوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔“

پھر رتن سنگھ خون میں ڈوبی ہوئی تلوار لے کر راج محل کے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں مہمانی وکرم سنگھ کو قید کیا گیا تھا۔ رانی پد منی شوہر کی بگوتی ہوئی حالت کے پیش نظر ساتھ ساتھ تھی۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر کہہ کھولا اور ایک طرف ہٹ گئے۔ ”دنیا کے سب سے زیادہ لعنت زدہ انسان! ہم نے تیری غداروں اور گناہوں سے موت چشم پوشی کی مگر آج تیری سانسیں پوری ہو گئیں۔“ رتن سنگھ کی ہمت دندنے کی مانند چیخا ہوا اندر داخل ہوا۔ سامنے وکرم سنگھ فرش پر چیت لیٹا ہوا تھا اور اس کے دونوں

”وکر م سنگھ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ مہاراج کو ملکی سیاست سے علیحدہ رکھیں ورنہ مسائل اور الجھ جاکم سے آگروہ آج زندہ ہوتا تو ہمیں کوئی نہ کوئی مشورہ ضرور دیتا۔“

”مت لیجئے میرے سامنے اس پاکھنڈی کا نام۔“ یکایک پدمنی کے ہونٹوں سے شرارے بھونٹ لگے۔ ”آپ اس سیاستدان کی بات کرتے ہیں جو ظاہر میں ہندو تھا اور دل سے مسلمانوں کے خدا کو پوتا تھا۔ آپ اس سے مشورہ طلب کرتے ہیں جو آپ کی بیوی کو سلطان کے حرم میں بھیجا چاہتا تھا۔ آپ اس کی بات.....“

رتن سنگھ درمیان میں بول اٹھا۔ ”اس نے کبھی ہم سے اتنی گندی بات نہیں کی۔ وہ ہمیشہ کی کہتا رہا کہ اس الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرے گا۔“

”آخر کیا حل تلاش کرتا۔“ پدمنی کچھ اور بہم رہ گئی تھی۔ ”اس نے ہوش ہمارے جذبات کے خلاف سوچا۔ جو ہمارا دشمن تھا وہ اس کا دوست تھا۔ اس کی نظروں میں بھان متی ایک پار ساعورت مٹی کی آفریدی ایک مقدس انسان۔“

”مہارانی! حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ مصالمانہ تھا۔ وہ ایسے نازک وقت میں اپنی سرکش بیوی کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ”علاء الدین خلجی ہمارے سروں پر آچھلے ہم اس شخص سے انتقام لینے کی بات کر رہے ہیں جس کی سانس لٹ چکیں، گھر جل چکا اور اولاد در در ہو گئی۔ اب آپ کے سینے میں بدلے کی اور کون سی آگ پوشیدہ ہے؟“ رتن سنگھ نے پدمنی سے سوال کیا۔ ”آپ اپنی رعایا کو یہ بتائیں گی کہ وکر م سنگھ مسلمان ہو چکا تھا۔“ رتن سنگھ نے بڑے تحمل کے ساتھ پوچھا۔

”یقیناً ہم اپنی پر جا سے یہی کہیں گے کہ اس لعنت زدہ انسان نے اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک کر دیا تھا اور دیوتاؤں کی تمکبانی کے سائے سے دور چلا گیا تھا اس لئے عبرتناک انجام سے دوچار ہوا“ پدمنی نے پورے زور و شور کے ساتھ اپنی دلیل پیش کی۔

”اس سے آپ کو کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“ راجہ رتن سنگھ نے دھیمے لہجے میں سمجھائے ہوئے کہا۔ ”اس طرح عام لوگوں کے ذہن الجھ جائیں گے۔ آپ کی وفادار پر جا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ آخر اسلام میں وہ کون سی کشش ہے جو وکر م سنگھ کو کوچہ فنانک لے گئی اور اس نے اقتدار کی تمام آسائش چھوڑ کر موت کو گھونٹ لگایا۔ مہارانی! آپ کی یہ دلیل چھوڑ کے لوگوں کو مطمئن نہ کرے گی۔ ذہن منتظر ہو جائیں گے اور دلوں میں شکوک و شبہات سر اٹھانے لگیں گے۔ امیر کے راجہ پلے ہی مسلمانوں کا مذہب قبول کر چکے ہیں، سلطانی فوجوں کے قبضے کے بعد گجرات میں بھی اسی انداز کی کرن اٹھ رہی ہیں، آپ اپنے ہی دامن سے چھوڑ میں بھی فتنے کو ہوا دینا چاہتی ہیں؟ یہ بڑی احمقانہ روش ہوگی۔“ رتن سنگھ کا سارا غصہ زائل ہو چکا تھا اور اب وہ ایک سرد مزاج حکمران کے انداز میں سوچ رہا تھا۔ ”ہم اسے اپنے وطن سے غداری کے جرم میں ذلت و رسوائی کی سزا دیں گے۔“ رانی پدمنی نے بڑا حیلہ تراشا۔

”آپ کی یہ دلیل بھی اہل چھوڑ کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔“ رتن سنگھ حالات کے ایک ایک پہلو جانزہ لے رہا تھا۔ بالقرض محال وکر م سنگھ کو غدار وطن ثابت بھی کر دیا گیا تو رعایا پر ہماری صفوں کا نتیجہ ہو جائے گا۔ لوگوں کی انگلیاں اس انداز میں اٹھ سکتی ہیں کہ غدار وکر م سنگھ رشتے میں رانی پدمنی کا قتل چچا تھا اگر یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی جائے تو لوگ خواہ مخواہ کچھ اندیشوں میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ

”ہمیں ہاتھ بڑھا کر علاء الدین کو پیچھے گا۔“

پدمنی خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر نفرت و غضب کا عکس نمایاں تھا مگر زبان خاموش تھی۔ رانی پدمنی سنگھ کے خلاف یہ سارا ہنگامہ کیوں تھا؟ ”کچھ دیر بعد پدمنی نے رتن سنگھ سے سوال کیا۔ ”پدمنی! اس کی زندگی تک محدود تھا۔“ رتن سنگھ نے جواب کیا۔ ”ہم اس پر تشدد کر کے آفریدی کا بیٹا بن کر پناہ پاتے تھے کہ اس طرح آپ کے جذبہ انتقام کی تسکین ہوتی تھی۔ ہمارا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ وکر م سنگھ کو قتل کر دیا جائے مگر وقت کی رفتار کو کیا کیا جائے کہ اس بار بھی ہم پیچھے نہ رہیں گے۔ ہم وکر م سنگھ کو زلا کو درباری حلقوں سے دور قید تنہائی میں رکھنا چاہتے تھے کہ چھوڑ کے دوسرے لوگ ان کے نظریات سے کوئی اثر قبول نہ کر سکیں۔ لیکن ہمارا یہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔“

”پھر آپ وکر م سنگھ کی لاش کا کیا کریں گے؟“ رانی پدمنی نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مندر کا پجاری اچھڑے گا، انتہائی رازداری سے انجام دے گا اور عام لوگوں کے شمشان میں وکر م سنگھ کی آخری رسوم راکڑی جائیں گی۔“ رتن سنگھ نے اپنی بیوی کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”اور مہاراج کا حکم کہ وکر م سنگھ کی لاش کو مسالوں کے ذریعے محفوظ کر دیا جائے۔ بھان متی کا سر لٹے کے بعد وکر م سنگھ کا جسم بھی ان کے جاپ میں کام آئے گا۔“ رانی پدمنی نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

ملاؤں اور جوگیوں کے منترؤں سے بھل جانے والی پدمنی کی یہ معصومانہ ادا دیکھ کر رتن سنگھ نکرا۔ ”مہارانی! بہتر ہے کہ اب آپ چھوڑ کے ساحرا عظیم کو فراموش کر دیں۔ ان کا گیان تو راجن جوت زبان بھی نہیں ٹھکڑا سکا۔ پھر وہ علاء الدین کی یلغار کو کس طرح روکیں گے؟ سلطان کے لشکر میں تو راول آفریدی ہوں گے۔ جب وہ ایک آفریدی کو تلاش نہیں کر لے تو پھر ہزاروں آفریدیوں کی ہوتے ہوئے قدموں میں کس طرح زنجیر ڈالیں گے؟ مہاراج کو بھول جائیے کہ ان کی مہمان شکستیاں دے لئے ایک خواب تھیں۔“

رتن سنگھ رام دیو کی فریب کاریوں کے جال سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک محافظ دستے کے سپاہی غافل فوجیوں کی واپسی کے بارے میں خبر دی جو بھان متی کے قتل کیلئے روانہ کئے گئے تھے۔

رتن سنگھ سپاہیوں کی ناکام واپسی کی اطلاع پا کر بھڑک اٹھا اور ان سب کو دوسرے کمرے میں حاضر کرنے کا حکم دے کر خود بھی رانی پدمنی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ راجہ رتن سنگھ نے بڑی حقارت آمیز شیوے سے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا جن کی تلواریں نیام میں تھیں اور جن کے سر شرم و ندامت سے سرخ ہو چکے تھے۔

”تم جاننے ہیں کہ تم کیسی ذلت آمیز خبر لے کر آئے ہو۔ ایسی خبر ہمارے کانوں نے آج تک نہ سنی۔“ رتن سنگھ نے غضبناک لہجے میں سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے ہم نے تمہاری ناکامی کے فسانے سناؤ، ہم تمہیں تمہارے ایک ساتھی کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں جو اب ہماری خدمت میں رہا اور جس کی ناکارہ زندگی کو ہماری شمشیر قہر گھاٹی۔ ہم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تم ہم سب کو اپنے انجام سے باخبر ہو جاؤ۔“

سپاہیوں نے گردنیں جھکا دیں۔ پھر مختصر سکوت کے بعد ایک سپاہی نے سر جھکا کر جھکائے اپنے سر پر ہاتھ رکھ دی۔ ”ہم سمرات کے جاں نثار ہیں اگر جاں سے گزر بھی گئے تو ہمیں کبھی زیاں کا

عقلی اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رانی پنہی گراس نے رتن سنگھ کو رام دیو کی اس بے اعتنائی اور گستاخانہ سلوک سے شدید ذہنی اذیت پہنچی مگر اس نے رانی پنہی کی خاطر مدارج کے طرز عمل کو برداشت کر لیا اور چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی رتن سنگھ نے پنہی پر برس پڑا۔ ”مدارانی! یہ ہے وہ تمہارا پوتا جو چوڑے دکھوں میں شریک نہیں۔ چوڑے جس نے اسے پنہا آدر (احرام) دیا اس کی بچھی ہوئی بھوئی بیروں اور موتیوں سے بھری۔ اے ہم نے سنار کا کونسا کٹھ نہیں بخشا۔ آج وہی احسان فراموش ہماری خاطر بمل شاہ کے مندر نہیں چل سکے۔“

رانی پنہی شوہر کی باتوں کا کیا جواب دیتی؟ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ رام دیو قدم قدم پر مایوس کر رہا ہے اور ہر آڑے وقت میں اس طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے جیسے والیان چوڑے سے اس کی کوئی شناسائی ہی نہیں۔

”ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا سارا گیان ہم جیسے لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے ہے۔ جب بھی آزمائش کا وقت آتا ہے وہ اسی طرح پیٹھ موز لیتا ہے۔“ رتن سنگھ بہت دیر تک اپنے دل کا غبار نکالتا رہا۔ پھر اس نے اپنے پر سالار ہری سنگھ اور رانی پنہی کے ماموں کنیش سنگھ کو طلب کیا۔

کنیش سنگھ ایک عمر سیدہ اور بہادر راجپوت تھا۔ کئی جنگوں میں حصہ لے کر اپنی بہادری کے کارنامے دکھایا تھا۔ شجاعت کے ساتھ ذہانت بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رانی پنہی کا حقیقی ماموں تھا۔ اسی رشتے نے کنیش سنگھ کو راج دربار میں ایک ممتاز مقام بخشا تھا۔

کنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ کو طلب کرنے کے بعد راجپوت سمرات نے مختصر آرام دیو کا منصوبہ بیان کرتے ہوئے بھان متی کا ذکر کیا اور ان سپاہیوں کے دعوے کو پرکھنے کی خواہش ظاہر کی جن کی تعداد پانچ تھی اور سب کے سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔

کنیش سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ نے بھی رام دیو کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس فتنے کو ختم کرنے کی کوششوں کو سراہا۔ ساتھ ہی ساتھ راج رتن سنگھ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ خود چل کر مندر کے دروازے پر جانے کی من گھڑت کہانی اور سپاہیوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیں۔

عجیب منظر تھا جب راج رتن سنگھ، رانی پنہی، کنیش سنگھ، سپہ سالار ہری سنگھ اور دیگر راجپوت امراء ان سپاہیوں کو لے کر بمل شاہ کے مندر کی طرف روانہ ہوئے جن کے بقول کبھی وہ مندر نظر آتا ہے اور کبھی انگوٹوں سے اوصل ہو جاتا ہے۔ رتن سنگھ اور رانی پنہی سوئے چاندی کے بنے ہوئے رتھ میں آگے آگے گھڑیاں دیکھ کر سرداران قوم کے گھوڑے تھے اور سب سے پیچھے ان سپاہیوں کا دستہ تھا جن کی بیان فاصلے کو نیا کاسب سے بڑا جھوٹ قرار دیا جا رہا تھا۔

فاصلے کو بھونے تو بمل شاہ کا مندر صاف نظر آنے لگا۔ ”تم سب لوگ بھی دیکھ رہے ہو؟“ رتن سنگھ سنا کر کہا۔ ”کنیش سنگھ! ان سپاہیوں سے بھی پوچھو جن کی بیانی کمزور ہو گئی ہے۔“

سپاہیوں نے اعتراف کیا کہ انہیں بھی مندر صاف نظر آ رہا ہے مگر نصف میل آگے بڑھنے کے بعد کوہ آبو کی طرف ہوا تو مندر چٹانک غائب ہو جائے گا۔ راج رتن سنگھ اور پنہی نے سپاہیوں کی اس دلیل کو تسلیم کر لیا۔ مگر پھر جیسے ہی آدھے میل کا فاصلہ ختم ہوا، تمام سپاہیوں نے بیک زبان فریادی لہجے میں

”ممرات! اب وہ مندر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

احساس نہیں ہو گا۔ ہم نے سپاہیوں اور گھوڑوں کی لائشیں دیکھنے کے بعد اپنی جگہ طے کیا کہ مرسل موت کا تجربہ تو ہوتا ہی رہے گا لیکن اس سے پہلے ہمیں بھان متی کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ اس ارادہ ہم لوگ آگے بڑھتے پھر ہم نے کوئی ایک میل کے فاصلے سے بمل شاہ کا مندر دیکھا۔ ہماری منزل تو مگر جیسے ہی ہم نے نصف فاصلہ طے کیا، مندر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات سب بھگوان کو ساسکی (گواہ) بنا کر سمرات سے عرض کرتے ہیں بہت دیر تک ہم اس فریبہ رہے کہ ہماری آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے مگر جب قرب و جوار کے دوسرے مناظر صاف دکھ رہے اور مندر کا ہلکا سا کس بھی نظر نہیں آیا تو پھر ہمارے دلوں پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو گیا اسے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا گیا تاکہ اس ناقابل یقین صورت حال سے راجپوت مطلع کیا جاسکے۔ اس سپاہی کی روانگی کے بعد بھی ہمارے گھوڑے چاروں طرف دوڑتے رہے مگر مندر ہماری نگاہوں سے روپوش ہی رہا۔ پھر ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا، جب تمام سپاہی گئے واپس آ رہے تھے اس وقت کسی شہسوار نے پلٹ کر مندر کی طرف دیکھا، بھان متی کی عبارت گواہ آنے لگی تھی۔ ہم پھر گھبرا کر پلٹ پڑے مگر جیسے ہی چند قدم آگے بڑھے، مندر ایک بار پھر غائب ہمارے ساتھ یہ کھیل کئی مرتبہ کھیلا گیا۔ اب سمرات آپ کو پورا ادھیکار ہے کہ ہماری باتوں کو جھوٹ سمجھ کر ہمیں کڑی سے کڑی سزا دیں۔“ یہ کہہ کر وہ سپاہی خاموش ہو گیا۔

راج رتن سنگھ سپاہی کا بیان سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔

”مدارانی! آپ کا کیا خیال ہے؟“ رتن سنگھ نے یہ عجیب و غریب واقعہ سن کر پدمنی کی طرف ”ناقابل یقین! انتہائی ناقابل یقین!.....“ رانی پنہی کی خوبصورت آنکھیں ٹشور ہو گئے۔ ”پھر ہمیں خود ہی جائزہ لینا ہو گا۔“ رتن سنگھ نے مختصر آمیز نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم لوگوں کی بیان کردہ صورت حال غلط پائی گئی تو پھر ہم اس دیدہ دلیری کے ساتھ جو والوں کو بڑی دردناک سزادیں گے۔“

”میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گی۔“ رانی پنہی نے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”اور دیکھو بھان متی میرے سامنے اپنی غلیظ جادو گرانہ حرکتوں کا مظاہرہ کس طرح کرتی ہے؟“

بمل شاہ کے مندر جانے سے پہلے راج رتن سنگھ نے رام دیو سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ راجپوت سمرات اور رانی پنہی جادو گر کے آشرم میں پہنچے تو وہ حسب عادت اپنی رنگدلیوں میں تھا۔ آشرم دیو داسیوں سے خالی ہو گیا تو رانی پنہی اور رتن سنگھ اندر داخل ہوئے۔

”سمرات! شاید یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ بھان متی اور وکرم سنگھ کے سر سمجھ شام کے نہیں پہنچائے گئے۔“ فتنے کی زیادتی سے رام دیو کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔

”نہیں ممداراج! بھان متی ہماری دسترس سے بہت دور ہے۔“ یہ کہہ کر رتن سنگھ نے ناکام واپسی کا پورا واقعہ سنا دیا۔ پھر بولا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چل کر ہمیں اس ڈھونگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں..... اور اگر واقعہ ایسا کوئی مسئلہ درپیش ہے تو اسے ایک

کے بغیر ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں۔“

”نہیں سمرات! اس سے زیادہ میری توہین نہیں ہو سکتی کہ میں دیوتاؤں کی مقدر ایک طرف کے جادو مند پن میں اپنے قدموں سے چل کر جاؤں۔“ رام دیو نے رتن سنگھ کی درخواست

حقارت سے جھٹلایا۔ وہ اپنی جگہ اس واقعہ سے بہت خوفزدہ تھا لیکن اس نے عیاری سے کام لے

”تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔“ رتن سنگھ دوبارہ چیخا۔ ”میری آنکھیں اب بھی مندر کے کمرے میں رہی ہیں۔“ رانی پد منی نے بھی اپنے شوہر کے دعوے کی تصدیق کی۔ ”اور کنیش سنگھ! تمہاری آنکھیں تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں؟“ رتن سنگھ نے پد منی کے ماموں سے سوال کیا۔

کنیش سنگھ نے اسے دیکھا تو اس نے کہا: ”اب اسے بھی ہل شاہ کا مندر نظر نہیں آ رہا تھا۔“

کنیش سنگھ کو خاموش پا کر رتن سنگھ پوری طاقت سے چیخا۔ ”تم جواب کیوں نہیں دیتے کنیش سنگھ! اس جادوگر نے کئی بار رتن سنگھ کو بھی لٹ گئی؟“

کنیش سنگھ بدستور خاموش رہا۔ وہ اپنے حکمران کے دعوے کو کس طرح جھٹلا سکتا تھا۔

راتن سنگھ وحشت زدہ ہو کر رتھ سے نیچے اتر آیا۔ ”وہ دیکھو! مندر کا سنہری کمرہ! اور دیواریں۔“ رتن سنگھ نے مندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

راتن سنگھ کے ساتھ ہی تمام امراء اور سپاہی گھوڑوں سے نیچے اتر آئے تھے۔

”اور مہارانی آپ کیا کہتی ہیں؟“ رتن سنگھ نے گھبرا کر پد منی سے پوچھا جو رتھ کے اندر اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی اور آنکھوں میں حیرت و پریشانی کے گہرے سائے رہے تھے۔ ”سمرات! میں بھی آپ کی طرح مندر کی بلند دیواروں اور سنہری کمرے کو دیکھ رہی ہوں۔ دوسرے لوگ اس حقیقت سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟“ رانی پد منی کی آواز میں شدید جھجکا ہوا کی آمیزش تھی۔

”کچھ بھی ہو، ہماری آنکھیں تو مندر کو دیکھ رہی ہیں۔“ رتن سنگھ نے دوبارہ رتھ میں بیٹھنے کو کہا۔

”ہم خود مندر میں جائیں گے اور اپنی تلوار سے اس بدکار عورت کا سر کاٹیں گے جس نے جادو کے زور ہمارے راستے گمراہ کر دیئے ہیں۔“

شاہی رتھ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ فاصلہ بظاہر ختم ہو چکا تھا مگر حقیقتہً مانی بھان متی اور رتن سنگھ کے درمیان کئی حجابات حائل تھے۔ مندر کے قریب پہنچ کر راجپوت سمرات اور رانی پد منی فریب نظر کا شکار ہو گئے۔ رتن سنگھ رتھ سے اتر آیا اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ ”ابھی ابھی مندر تھا۔ پھر اسے اٹھا کر کون لے گیا؟ زمین نے اسے بڑے مندر کو کس طرح نگل لیا؟“ رتن سنگھ نے پوچھا۔

پد منی نے کہا: ”راہی پد منی بھی نیچے اتر آئی۔ اب چوڑے دونوں حکمران بھی اندھوں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ مندر اپنی جگہ موجود تھا مگر کوئی ایک فرد بھی اسے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ پچھلی ہوئی تھیں اور ہل شاہ کی بنائی ہوئی عمارت کا ایک نقش معدوم ہو چکا تھا۔“

ایک ایک ان سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایک اور عجیب منظر ابھر آیا۔ راج رتن سنگھ نے رانی پد منی نے مانی بھان متی کو ایک چٹان پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ بوڑھی عورت سفید چادر میں لپیٹی ہوئی اور چوڑے حکمرانوں کو اشارے سے اپنی طرف بلاتی تھی۔ راج رتن سنگھ اور پد منی نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ کنیش سنگھ کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ اور دوسرے سپاہی براندہم نظر آرہے تھے۔

”چوڑی دیوی اپنے دیوتا کے ساتھ ایک طوائف کی بیٹی کو قتل کرنے آئی تھی۔“ بھان متی کے کو جنبش ہوئی۔ بوڑھی عورت کی آواز میں اس قدر جلال تھا کہ راجپوت سوراؤں کے دل کانپنے لگے۔ ”مجھے تو بت پہلے تیرے باپ نے قتل کر دیا تھا رتن سنگھ!“ بھان متی چوڑے حکمران سے خطاب میں تو کب کی مرچیں۔ میرے جسم ناتواں بکے پیچھے کیوں پڑا ہے؟ ان دیوتاؤں کی طرف دیکھو

دیت تباہیں اور جن کی شمشیروں کی پیاس کبھی نہیں بجھی۔“

بھان متی کی بیٹ سے رتن سنگھ کی سائیں رکنے لگیں۔

”ہیرا بھگوان رام دیو نہیں آیا پد منی؟“ بھان متی نے اب کی بار چوڑی سحرہ کو مخاطب کیا تھا۔ ”وہ تمہارے دیوتا کا رہ گئے؟ انہیں بھی جمع کر لے کہ یوم حساب قریب آ پہنچا ہے۔ میں نے تو تجھے تیرے دیوتا کا رہ گئے کے ذریعے خبر پہنچا دی تھی کہ آگ اور خون کے تاجر آرہے ہیں۔ تہذیب کے نئے بازار بچنے والے ہیں۔ آئے والے سوداگروں میں بڑی قوت خرید ہے۔ سب کچھ بک جائے گا۔ شریف زادے! تو اپنی بٹ منیں کر لے۔“ فضاؤں میں الفاظ کی گونج باقی تھی مگر بھان متی کا چہرہ اچانک ہواؤں میں تحلیل ہو گیا۔ فداور ہل شاہ کا مندر دوبارہ نظر آنے لگا تھا۔ ”چلے آؤ کہ میں نے تمہاری نظروں سے پردے ہٹا دیئے۔ تو تمہاری جتنی طاقتیں تمہارے پاس ہیں انہیں بیک وقت استعمال کر لو کہ ناپاک سینوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہے۔“ بھان متی کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔

راج رتن سنگھ کی جگہ سے رتن سنگھ کی طرح ساکت تھا۔ چوڑی ملکہ کا گھرنگ چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ طاقت کے بدلے دعوے باطل ہو چکے تھے۔ رتن سنگھ نے پھرانی ہوئی آنکھوں سے کنیش سنگھ کی طرف دیکھا، کنیش سنگھ ایک ہوشیار انسان تھا اس نے اپنی بھانجی اور داماد کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کہا۔ ”ایک ناکارہ اور بوڑھی عورت کی بدکلامیوں کا جواب دینا آپ کی شان کے منافی ہے سمرات! واپس چلے کہ ہمیں دنیا میں بت سے کام ہیں۔“ کنیش سنگھ چوڑے حکمرانوں کو بھان متی کے حصار سے نکال کر راج محل واپس لے جانا چاہتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں رتن سنگھ اور پد منی جوش غضب میں آگے نہ بڑھ جائیں۔ کنیش سنگھ نے ہل شاہ کی رانی پد منی سے بھان متی کی روحانی طاقت کے ناقابل یقین مظاہرے دیکھے تھے، اس لئے وہ خاموشی کے ساتھ لوٹ جانے ہی میں عافیت سمجھتا تھا۔

راتن سنگھ اور رانی پد منی رتھ میں اس طرح سوار ہوئے جیسے کوئی حکمران جنگ ہار گیا ہو اور میدان سے فحش ذلت کی حالت میں فرار ہو رہا ہو۔

☆ ☆ ☆

راتن سنگھ نے اب نئے انداز سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس بار خفیہ اجلاس میں رانی پد منی کے علاوہ کوئی سنگھ اور بیٹا پتی (سپہ سالار) ہری سنگھ بھی شامل ہوئے تھے۔ ”ہم نہیں جانتے کہ ہمارے اس اعتبار سے ہمیں کس قدر نقصان پہنچا ہے؟“ رتن سنگھ، کنیش سنگھ اور ہری سنگھ سے مخاطب تھا۔ ”ہم نے ملہا رام دیو اور مہاسنتری وکرم سنگھ کو اپنا سب کچھ سوپ دیا تھا۔ محبت، خلوص، یقین، اعتماد..... مگر انہوں نے کچھ بھی ہمارے کام نہیں آیا۔ وکرم سنگھ، راج دوت کے قریب میں آکر مسلمان ہو گیا اور پھر اس نے موت کو گنگے لگا لیا۔ رہے مہاراج تو وہ بڑے گیلیاں ہیں لیکن ان کا گلیاں آج ہمارے کام نہیں آ رہا ہے۔“

”میں نے آج رتن سنگھ میں بدست پڑے ہیں اور چوڑی سرحدوں پر موت منڈلا رہی ہے۔“

ہری سنگھ نے رتن سنگھ سے کہا: ”سمرات نے وہی کیا جو اہل دل کا پرانا چلن ہے، یہی کہ اپنے خاص رشتوں پر اعتبار کر لیا۔ اب اگر لوگوں کے دل میلے ہوں تو وہ عیاری کے ساتھ نازک جذبوں کا خون کر دیتے ہیں۔“

”میں نے آپ نے اپنے سینے پر بڑے کاری زخم کھائے ہیں لیکن یہ زخم جان لیوا نہیں ہیں۔ ابھی آپ کے دل میں کچھ زندہ ہیں جو اپنی وفاداری کے مزہم سے اس غلغلے کو منادیں گے۔ اب نئے انداز سے ملوث کی بلا بھائی جائے۔“ کنیش سنگھ نے بڑے پرفریب لہجے میں کہا۔ ”پرانے مرنے مات کھا چکے اب

مہر کو کھانچ کر کے چھوڑ کر کے سیاسی امور میں مداخلت کرے اور پھر اپنے اقتدار کے
کے کیاں تک وسیع کر دے کہ راجہ رتن سنگھ مفلوج اور بھول نظر آنے لگے۔ گنیش سنگھ کے خیال
پہلی دن آپہنچا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان کا مدبر امر ہوا تو مہاراجہ رتن سنگھ کی لاش چند سپاہیوں اور مندر کے پجاری رام چندر کی نگرانی
کا نشان گھٹا پر لے جانی گئی جہاں چوڑے عام مردے جلائے جاتے تھے۔ عظیم خاندان کا عظیم
شاہدہ عالم نشانی میں جلا دیا گیا۔ یہ اس کے جرم حق شناسی کی سزا تھی۔ پتھروں سے بناوت کا
نہ اگر وہ یونانوں کے قدموں پر سر رکھے رکھے مرجاتا تو آج پورا چوڑا سو گوار ہوتا۔ اس کی رتھی اس
سے اٹھی کہ راجہ رتن سنگھ رانی پدمی اور بڑے بڑے راجپوت امراء کی گردنیں بارغ سے جھکی ہوتیں
اور انہیں اس کے بے جان جسم کو سلامی پیش کر رہی ہوتیں۔ مگر آج اس کے سمت زدہ جسم کے ساتھ
ذلت آمیز سلوک کیا گیا۔ وہ اس طرح پھونک دیا گیا جیسے جلنے والا کوئی بے سہارا بھکاری تھا یا
(اچھوت) سے بھی بدتر کوئی مخلوق۔ نہ اس کی ہڈیوں کو سمیٹا گیا اور نہ راکھ کو دریائے گنگیری میں
پا۔ بلکہ اسے بکھرا تھا، چپ چاپ بکھر گیا۔ آخری وقت میں کوئی رشتہ کام نہیں آیا۔ ایک بیٹی تھی
یہ قدرے جیتے جی تھا کہ راجہ رتن سنگھ۔ عجیب موت تھی۔ نہ کوئی نوحہ خوانی اور نہ کوئی بین کرنے والا۔ ایک
ہوا میں تھیں جو ایک مرد آزادی کا خاک کو اڑائے لئے جا رہی تھیں۔

نہات نرملہ کماری بے اختیار رو رہی تھی۔

میٹوری اور چندر سنگھ نے بہت دلا سے دیئے مگر آنکھیں ایک لمحے کیلئے بھی خشک نہیں ہوئیں۔
انہیں بھی لکونی کی گردل پر جو گھٹا چھائی ہوئی تھی، برستی ہی رہی۔ منتری بھون کی آگ بجھ چکی تھی مگر
لہنے میں ایک اور آگ بھڑک اٹھی تھی۔ دریائے گنگیری کے کنارے جلائی جانے والی چٹائی آگ اور
لہلہ کی آگ میں بڑا گہرا تعلق تھا۔ اس آگ کے شعلوں نے نرملہ کے دل و دماغ پر برسوں سے جھنے
ف کو کھلا کر رکھ دیا۔ آفریدی نے کئی بار اپنا دامن بڑھایا مگر نرملہ نے غم خواری کے اس انداز کو قبول
نہ کیا۔

نہات نرملہ دو سردار! روئے دو کہ اس اشک ریزی کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتی۔ یہ آنسو تو گھر جل
پڑے ہیں۔ کون تک نہیں آئے تھے۔ پھر یہ دریا کیوں ابل پڑے؟ کون جانے کیا شے جل گئی ہے جو
مردمک تپش ہی تپش ہے۔

آفریدی کو شک تو ہوا کہ باپ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے جس کے اثر سے بیٹی کے دل کی دنیا پر وزیر ہو گئی
مگر اس نے جان بوجھ کر مہاراجہ کی ذکر نہیں چھیڑا کہ اس طرح نرملہ کی وحشیت کچھ اور بڑھ

☆.....☆.....☆

کہات علاء الدین خلجی سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گیا اور حضرت امیر خسروؒ کو آواز دیں دینے لگا۔
نہات نرملہ اپنے رب کے حضور گریہ و زاری کر رہے تھے۔ سلطان کی آواز سن کر خسروؒ نے اپنے
موجود میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ سورج آسمان سے اتر کر میرے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

علاء الدین خلجی نے خواب میں دیکھا ہے کہ سورج آسمان سے اتر کر میرے خیمہ میں داخل ہو گیا۔
نہات نرملہ نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ سورج آسمان سے اتر کر میرے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

نہات نرملہ کوئے محاذوں پر آزما دیا جائے۔
”ہم نہیں سمجھتے گنیش سنگھ کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ رتن سنگھ نے چونک کر پوچھا۔

”مہارانی!“ گنیش سنگھ نے ملکہ چوڑا کو مخاطب کیا۔ ”شاید آپ کو میری یہ بات گراں گذرے
بھان متی کی روحانی قوت مہاراجہ رام دیو سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ہمارے اندازے کی غلطی تھی کہ ہم
مہاراجہ کو دیوتا کا درجہ دے دیا اور بھان متی پورے چوڑے کیلئے ایک لغت زدہ عورت قرار پائی۔“

گنیش سنگھ کی بات مکمل ہونے پر بھی نہ پائی تھی کہ پدمی چیخ اٹھی۔ ”گنیش سنگھ! تم بھی وہی کہہ رہے ہو
وہ کہہ کر سنگھ کما کرتا تھا۔ کیا یہ ہمارا کرم نہیں ہے کہ وہ ہماری مملکت میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہم چاہتے تھے
کہ بوجھ سے دھرتی کو ہلکا کر سکتے تھے۔“ کچھ دیر پہلے جو نا کامی والیان چوڑا کا مقتدر بنی تھی، پدمی نے
کے احساس تک کو مٹا دیا تھا۔ گنیش سنگھ، سینا پتی ہری سنگھ اور سپاہیوں کا ایک دستہ اس بات کا گواہ تھا
رتن سنگھ کی فوج طاقت بھی ایک بوڑھی عورت کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہی تھی۔ مگر پدمی
انسانی بے شرمی کے ساتھ اپنی شکست کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔

گنیش سنگھ نے اس میں اٹھ کر اس نے فوراً ہی ایک ذہین شاطر کی طرح نئی چال چلی۔ ”مہار
نے میری بات کو مکمل نہیں ہونے دیا۔ میں بلکہ کہہ سکا کہ رانی کے لئے پرکتہ چینی نہیں کر رہا ہوں۔ ہر
نظروں کے سامنے جنگ کے کئی محاذ کھلے ہوئے ہیں اور ہر محاذ پر ہمارے بے شمار دشمن موجود ہیں
بھان متی بھی ان ہی دشمنوں میں سے ایک ہے جو چوڑا کا وجود روداشت نہیں کرتے۔ اگر ہمارے پاس
بھان متی کو قتل کر سکتے تو کب کا یہ قصہ ختم ہو چکا ہوتا۔“

رانی پدمی اچانک وحشت زدہ نظر آنے لگی۔ شکست دینا کامی کا یہ تذکرہ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ پدمی
اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ”پھر! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہ جنگ ذہانت سے لڑی جائے گی۔“ گنیش سنگھ رک رک کر بول رہا تھا۔ ”دنیا جیسے ہماری
ہے ہم اسے ذہانت سے لڑتے ہیں۔ مہاراجہ رام دیو کو ان کے مقام پر فائز رہنے دیجئے کہ وہ بھی ہماری سپاہ
کا ایک مرہ ہیں۔ اگر وہ بھان متی سے محاذ آرائی میں شکست کھا چکے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں
کہ ان کی روحانی طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ انہیں فریب میں مبتلا رکھنے کے صرف وہی ہماری کشتی کو پار لگاتے
ہیں۔ مہاراجہ سے لگاڑنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ شاید ان کا کوئی ناکارہ منتر ہمارے کام آجائے۔“

سنگھ بڑی ہوشیاری سے اپنی بازی کھیل رہا تھا۔ ”دوسری طرف ہمیں لازم ہے کہ ہم بھان متی کو بھی
فریب کا آلہ کار بنائیں۔ وہ زمانے بھر کی ٹھکانی ہوئی ایک ستم رسیدہ عورت ہے۔ اگر رات کے اندر
میں کچھ دیر کیلئے ہم خوشامد کے ذریعے اسے رام کر لیں تو پھر آفریدی اور نرملہ کمار کی کاچہ چل سکے
سلطان کے حملے سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ چند روز کیلئے اپنے دل پر جبر کر کے بھان
کو دیوی کا درجہ دے کر اس سے روحانی مدد طلب کر لیجئے۔ پھر یہ آندھی گزر جائے گی تو پرسکون دنوں
عقیدت اور اعتبار کے خنجر سے بھان متی کا بھی خون کر دیا جائے گا۔“ گنیش سنگھ نے ایک ریاکارانہ
پیش کی تھی جسے رانی پدمی نے بڑی کراہیت کے ساتھ قبول کر لیا مگر یہ سوال بھی کر ڈالا کہ منافقت کا

منصوبے کو کس طرح پھیل تک پہنچایا جائے گا۔

”مہارانی! یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے کہ میں اس بوڑھی جادوگرنی کو کس طرح رام کر تا ہوں۔“

سنگھ، رانی پدمی کو آمادہ پا کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ آج اسے اپنے برسوں پرانے خواب کی تعبیر مل

پر یہ سنگین سمت تو لگائی جا چکی تھی مگر اس کا جواب کون دیتا؟ و کرم سنگھ کی تو راکھ بھی ہوائیں کھڑکیوں پر آچاریہ نے اپنی فریب کار یوں سے بات کو نہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے مہمانسزئی گنیش سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”دھرم اور دیس کے خدائر اپنی اپنی جگہ پر چکے۔ اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اپنا حشر دیکھ لیں گے آچاریہ! آپ تو وہ طریقہ بتائیے جس سے چوڑیہ اور اندرونی دشمنوں سے نجات مل سکے۔ ہمارا باہری دشمن دہلی کا سلطان علاء الدین خلجی ہے اندرونی دشمنوں میں وہ ضعیف و ناتواں عورت بھان متی ہے جو اپنے جادو کے زور سے ہمارے منصوبہ میں خلل ڈال رہی ہے۔ ہم بیک وقت دونوں دشمنوں کا خاتمہ چاہتے ہیں آخر اس کا کیا پائے ہے؟“

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ خوش قسمتی سے کل پورن ماشی (مکمل چاند) کی رات ہے اگر ہمارا پورے عروج پر ہو اور اس رات بچے دل سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جائے تو آکاش پر دعائیں قبول ہوں اور انسان منکٹ کال (مہیبت کے زمانے) سے باہر نکل آتا ہے۔ مہمانسزئی کو پہلے ہی مظاہر ہوں کہ جب چاند طلوع ہو جائے اور ماواڑ کی بلند ترین چوٹی سے اوپر نظر آنے لگے تو اس وقت شیش درشن کئے جائیں اور پھر درگاہ اور کالی مائی کی پوجا شروع کی جائے۔ یہ پوجا اس وقت تک جاری رہے گی تک سورج دیوتا اپنے درشن نہیں دیتے۔ سمرات! جو کچھ چاہتے ہیں وہی ہو جائے گا۔ ستارے مجھ سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ چوہانوں کی پکڑی خون سے تر ہو سکتی ہے مگر اسے زمین کی مٹی نہیں چھو سکتا سلطان ایک بد نصیب حکمران ہے۔ اس کے اتنے بڑے دربار میں کوئی ایک بھی جو تھی ایسا نہیں ہے جو ستاروں کی رفتار کے بارے میں انتخابی بنادیتا کہ جب منگل (سیارہ مریخ) کمزور حالت میں ہو تو جنگ ارادے سے اپنی سرحدیں نہیں چھوڑنی چاہئیں۔“ یہ کہہ کر آچاریہ شکر داس نے راجہ رتن سنگھ کی طرف دیکھا۔ ”سمرات ایک خوش قسمت فرمانروا ہیں کہ ان کے دشمن نے جنگ کیلئے غلط وقت کا انتخاب کیا۔ جب ستارے اس زاویے سے حرکت کر رہے ہوں تو عام مسافر کیلئے بھی گھر سے نہیں نکلا جاتا۔ لالہ اچھے جانا اور بھی خوفناک عمل ہے جس کا نتیجہ زلت و شکست کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔“ آچاریہ شکر داس پر غور لہجے میں اپنے علم کا مظاہرہ کر رہا تھا اور علاء الدین کو محض اس لئے احمق قرار دے رہا تھا کہ فکر سے پہلے کسی نجومی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ اب شکر داس کو یہ کون بتاتا کہ سلطان نے اپنی زندگی میں بڑی چوراسی جنگیں لڑیں مگر ایک بار بھی کسی نجومی سے نہیں پوچھا کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ دہلی چوڑی کی جانب روانہ ہوتے وقت بھی اس نے اپنے تمام سپہ سالاروں سے مشورے کئے تھے مگر کسی ادا میں بھی کسی ماہر نجوم کو شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ آج شکر داس اپنے ناپائدار علم کے لئے بدست ہو کر ای علاء الدین کا مذاق اڑا رہا تھا۔

آچاریہ کی باتیں سن کر راجہ رتن سنگھ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ”تم سچ کہتے ہو شکر داس! (مریخ) کی کمزوری کا نکتہ تو کبھی مدارج رام دیونے بھی ہمارے سامنے بیان نہیں کیا تھا۔“

”سمرات! ان کا ذکر نہ کریں کہ آخر وہ مدارج ہیں بڑے گیانی ہیں۔“ شکر داس کا ایک لفظ نظر کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”یہ نکتہ تو ہی شخص بیان کر سکتا ہے جو شکر داس (غلام) ہو اور جس سے راضی ہوں۔“ احساس فخر سے بوڑھے شکر داس کی کمر میں تپاؤ آ گیا تھا۔ اور وہ پورے جوش ساتھ بولنے لگا تھا۔ ”کل رات تمام فیصلے ہو جائیں گے۔ دیوتا سلطان کے بڑے ہوئے لشکر پر غائب کر کے یا تو اسے ہمیشہ کیلئے تباہ کر دیں گے یا پھر وہ ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ جائے گا۔ اور اپنی نفلوں کہہ مرے گا کہ آئندہ چوڑیہ کا رخ نہ کرنا اس کے ساتھ ہی وہ جاہل عورت جسے چوڑیہ کے توہم پر متا

رہ رہا غالی ہوتے ہی مہمانسزئی گنیش سنگھ نے اپنے حکمران بھانجے راجہ رتن سنگھ کی طرف داد طلب نفلوں سے دیکھا۔

”تم بہت ذہین اور ہوشیار راجپوت ہو گنیش سنگھ۔“ رتن سنگھ اپنے عمر رسیدہ ماموں کی نفیرہ متاعش کر رہا تھا۔ ”کاش! ہم نے تمہیں پہلے آزمایا ہوتا پھر ہم اس اذیت و کرب کا شکار نہ ہوتے۔ شکر داس نے ہماری مشکلات اور دشواریوں کو کتنا سمیٹ دیا۔ رام دیونے تو وہ شرائط پیش کی ہیں کہ جنہیں پورا کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔“

”دیر چرکھیں سمرات! اب میں آگیا ہوں تو سیاست کے بازار کی گرمی دیکھنا۔ ایک ایک حریف جل جائے گا اور ایک ایک دشمن کے قدموں پر برہمنوں کی یہ وسیع و عریض زمین تنگ ہو جائے گی۔“

”میں سنگھ اپنی تعریف سن کر بھکاری کے خالی پیالے کی طرح جھجکا تھا۔“ اب میں اس ویشا بھان متی کی طرف چل رہا ہوں تاکہ اسے پورن ماشی کی پوجا سے بے خبر کر سکوں۔ یہ احتیاطی تدابیر اس لئے ہو گئی کہ وہ الہ چوڑی پوجا سے گھبرا کر اپنے گرد کوئی حصار نہ بھینچ لے اور اس طرح قبل از وقت ہوشیار ہو کر وہ اپنی جان بچائیں گا ماب ہو جائے گا۔“

”گنیش سنگھ! کیا تمہیں اب بھی آچاریہ کی پوجا کے اثرات پر شک ہے؟ کیا تم اس کے ستاروں کے جلا کو شریک نگاہ سے دیکھتے ہو۔“ رانی پدمنی نے نئے مہمانسزئی سے پوچھا۔

”میں مہارانی! سیاست میں کوئی چال آخری چال نہیں ہوتی۔“ گنیش سنگھ اس فلاح کے لہجے میں بول رہا تھا جس نے گھر بیٹھے علاء الدین خلجی کی فوجوں کو شکست دے دی ہو۔

”سیاست میں ہر شخص کا تمام البدل ہونا چاہئے۔ اگر آج گنیش سنگھ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہے تو مہارانی کو اس کی کرسی کے تقاضے سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایک گنیش سنگھ سرکشی اختیار کرے تو دوسرا جس کو حکم طعنا ٹھانے کیلئے تیار ہو۔ اس طرح پہلے گنیش سنگھ کی ساری ٹیڑھ درست ہو جائے گی۔ اب تک کہ ہوائے کرم سنگھ کے کاندھوں پر ریاست کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ اس پر مزید بے نیکی ہو کہ انھیں ہند کر کے ایک شخص پر اعتبار کر لیا گیا اور اسے یقین دلایا گیا کہ وہ چوڑیہ کیلئے ناکارہ ہو گا اور اس کی ساری بازیاں اپنے دل کی مرضی سے چھیلیں اور ریاست کے مفادات کو بے رحمی کے ساتھ چھین لیا۔“

”میں سنگھ بے تکلفانہ اور پرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

”میں سخت آواز میں اس کی گرفت کی۔“ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو گنیش سنگھ؟ بات

ہو رہی تھی بھان متی کی لیکن تمہارے الفاظ کی لے ٹوٹی وکرم سنگھ پر۔ ”پدمنی، گنیش سنگھ کی بے سوا پناہ ہے۔ یہ بے زار نظر آ رہی تھی۔“

”مہارانی معاف کیجئے گا کہ یہ سیاست کا ایک اصول ہے جس کا اطلاق وکرم سنگھ پر بھی ہونا چاہیے۔“ گنیش سنگھ نے اپنے دائرے میں محدود ہوتے ہوئے کہا۔ ”سیاست میں ہرگز نعم البدل ہونا ثابت ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ سیاست نہیں، حماقت کہلاتی ہے۔ ہم سے آج کل کے داس نے وعدہ کیا ہے کہ پورن ماشی کی رات میں بھان متی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بالفرض اگر ایسا نہیں ہوا..... اور بھان متی ہماری ان چالوں سے باخبر ہو گئی تو پھر ہم کیا کریں گے؟ ہم نے اس کا کیا نعم البدل سوچا ہے؟“

رانی پدمنی اور رتن سنگھ حیرت سے گنیش سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔

”مہارانی! اس کا نعم البدل یہی ہے کہ ایک طرف ہم بھان متی کی زندگی کی جڑیں کاٹنے دیں اور دوسری طرف اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے رہیں ایک تیر شانہ خطا کر جائے تو ان کی فوری طور پر اس طرح کھینچ لیا جائے کہ اس میں دوسرا تیر موجود ہو۔“ گنیش سنگھ کی باتیں فریب اور ہلچل سے لبریز تھیں۔ وہ ہندوؤں کے مشہور سیاستدان کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

رانی پدمنی اور رتن سنگھ نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

”میں بھان متی کے پاس جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے گنیش سنگھ کرسی سے اٹھا اور رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔

”اس کا خیال رکھنا گنیش سنگھ کہ وہ فاحشہ بڑے لمبے کان رکھتی ہے۔“ پدمنی نے اسے تنبیہ کر دی۔

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مندر میں بیٹھنے کے باوجود میاں کی ایک ایک بات سن رہے۔“

☆ ☆ ☆

گنیش سنگھ راج محل سے رخصت ہو کر بھل شاہ کے مندر پہنچا اور پھر دوسرے پجاریوں سے مل کر ہوا بھان متی کے کمرے کے آگے جا کر رک گیا۔ مانی اس وقت آنکھیں بند کئے اپنے دھیان میں غرق و معمولی کپڑے کی ایک سفید چادر میں لپیٹی ہوئی بوڑھی عورت جو زندگی کی ہر آسائش سے محروم ہوتے ہوئے چوڑے کے اقتدار اعلیٰ کیلئے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ گنیش سنگھ نے اس عورت کے ہت سے اٹانے تھے۔ جسے راج محل کے بسنے والے طوائف زادی کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ گنیش سنگھ بھان متی کو چند قدم کے فاصلے سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی بھان متی کے چہرے پر گنیش سنگھ کی نظر پڑی، محسوس ہوا جیسے جھریاں بھرے چہرے سے چاند کی روشنی پھوٹ رہی ہو۔ گنیش سنگھ چونک کر طوائف زادیوں کے چہرے پر دل کو سکون پہنچانے والی ایسی ٹھنڈی روشنی نہیں ہوتی۔ پھر اچانک اس نے اس روشنی کو اپنا مزاج بند نہ دیکھا۔ ٹھنڈک نے حرارت کی قبائین لی تھی۔ چاند کی سرد گرمیوں سے تیز شعاعوں میں ڈھل گئیں اور پھر بھان متی کے جلال کی تاب نہ لا کر گنیش سنگھ چپ اٹھا۔

”مانی..... اس کے منہ سے وہ لفظ ادا ہو گیا جس کے اظہار پر راج دربار نے پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔“

ناگماں اپنے قریب ایک چنچ سن کر بھان متی نے آنکھیں کھول دیں اور بڑی بے نیازی کے ساتھ گنیش سنگھ کی طرف دیکھا جو دروازے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ مانی کی نظریں انھیں تو مہمانتزی کا سرچرے سے

جھپٹا۔ ”جھپٹ کو اپنے سجدے سے ناپاک نہ کر کہ تیرا سرو تاج دربار میں بھٹکنے کیلئے بنایا گیا ہے۔“

”میری چوٹ عورت کی آواز میں اس قدر بیت تھی کہ گنیش سنگھ کے دل کی دنیا میں لرزہ سا پڑ گیا۔ ایک فیض داتاوں عورت کی آواز میں اس قدر بیت تھی کہ گنیش سنگھ کے دل کی دنیا میں لرزہ سا پڑ گیا۔“

”مانی! میں تیرا داس ہوں گنیش سنگھ۔“ مہمانتزی نے سجدے کی اسی حالت میں گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”پلے کھڑا ہو،“ اپنے حواس درست کر پھر بتا کہ تو کون ہے اور میاں کیوں آیا ہے؟“ مانی کا لہجہ مالک تھا۔

”گنیش سنگھ کھڑا ہو گیا مگر اس کے جسم کی تھر تھراہٹ نمایاں تھی۔“ میں چوڑے مہمانتزی گنیش سنگھ ہوں۔“

”اور وکرم سنگھ کہاں چلا گیا؟“ بھان متی نے حیران ہو کر پوچھا۔

بھان متی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی گنیش سنگھ کی وحشت کم ہو گئی تھی اور اسے یقین آ گیا تھا کہ اس بوڑھی عورت کے روحانی علم کے بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں، ان میں زیادہ سچائی نہیں اگر وہ بند کرے میں بیٹھے بیٹھے راج دربار کا حال جان سکتی تو پھر اسے یہ بھی پتا ہوتا کہ وکرم سنگھ کے ساتھ منتری بھون کو بھی نذر آتش کیا جا چکا ہے۔ یہ سوچ کر گنیش سنگھ کی جان میں جان آئی اور اس نے کسی قدر اعتقاد کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا۔

”وکرم سنگھ ایک غدار وطن اور مذہب فروش تھا، اس لئے سزایاب ہوا اور ذات در سوائی کے ساتھ دنیا سے رخصت کر دیا گیا۔“ گنیش سنگھ اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ مرنے والا وزیر اعظم مانی بھان متی سے کس قدر عقیدت رکھتا تھا۔

”وکرم سنگھ بھی آئندہ پال کے راستے پر چلا گیا۔“ ٹیکاک مانی بھان متی کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا۔

”میں جانتی تھی کہ وہ اسی منزل کا مسافر ہے۔ کسی دوسرے راستے پر چل ہی نہیں سکتا۔ شاید اس نے جانے میں جلدی کی۔ اپنی کرنی کا پھل تو پایا۔ پتھروں کے سینے میں جو بیج بوئے تھے ان کو پھونٹتے ہوئے تو دیکھ لیا۔“ مانی بھان متی مسکرائی مگر یہ ایسی مسکراہٹ تھی جس کے پیچھے دیکھنے والی آنکھوں کو آنسوؤں کا ایک سمندر نظر آ سکتا تھا۔ گنیش سنگھ اندھا تھا، اس لئے مانی کے ہزاروں پردوں میں لپٹے ہوئے جذبات کو نہ دیکھ سکا۔

”اے مانی! اس نے اپنی کرنی کا پھل پایا۔“ اب گنیش سنگھ کا لہجہ کسی قدر پر جوش ہو گیا تھا۔

”دیکھو! میں نے اپنے ایک نافرمان کو ایسی سزا دیدی جسے چوڑے کے رہنے والے رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے مہمانتزی!“ بھان متی کی آواز میں بڑی خلش تھی مگر گنیش سنگھ اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ ”وکرم سنگھ امر ہو گیا اور تیرے دیوتا بے گھر ہو گئے۔“

”اچھا! گنیش سنگھ کو احساس ہوا کہ بھان متی کے تیور پھر بگڑ گئے ہیں اور اس کی باتوں سے نفرتوں کا زہر پکڑا ہے۔“ مانی! جو مر گیا سو مر گیا۔ اس پر خاک ڈال دے اور اپنے اس داس کو اجازت دے کہ وہ تمہارے پاؤں چھو سکے۔“

”جس نے اپنی چوٹ کو چھوٹنے کی اجازت نہیں دی، وہ کسی کے ناپاک ہاتھوں کو اپنے جسم تک کس سے پہنچنے دے گی؟“ بھان متی کا لہجہ دیکھتے ہی دیکھتے شرابا ہو گیا تھا۔

”مانی! میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ راج دربار کے لوگوں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے۔“

”مانی! میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ راج دربار کے لوگوں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے۔“

”ہیرو گھٹ کی دھول پر ابھی تک تیرے گھنٹوں کا عکس موجود ہے۔ جھک کر اسے غور سے دیکھ کہ یہ کیسی عجیب سی بات ہے؟“ بھان متی کا شعلہ ریز انداز گفتگو واپس لوٹ آیا تھا۔

”اب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنے گھٹ سے کوئی جواب نہ بن رہا تو اس کے منہ سے غلیظ کلمات کا فوارہ ابل پڑا۔“ اب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنے گھٹ سے کوئی جواب نہ بن رہا تو اس کے منہ سے غلیظ کلمات کا فوارہ ابل پڑا۔ کوئی تیرے دل میں کسی کیسی ناپاک خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔ دیوی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کوئی نالاش کو کاٹ دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ ار بھی تک نہیں اٹھے گی تیری۔ یہیں اسی ایک گوشے میں جاؤ گی۔ چوڑے دروازے بھی تیری ہڈیاں قبول نہیں کریں گے۔“

”ان بد نصیبوں کو ران بنتی سکھا رہا ہے جن کے اقتدار کی چند ہائی بھان متی مسکرانے لگی۔“ ”ایک مائی کا لہجہ پر جلال ہو گیا۔“ ”مجھے دھوکے سے قتل کرنا چاہتا ہے؟ میں نے ران بانی رہی تھی؟“ ”ایک مائی کا لہجہ پر جلال ہو گیا۔“ ”مجھے دھوکے سے قتل کرنا چاہتا ہے؟ میں نے بے آقاقتن گھٹ سے کہہ دیا تھا کہ وہ راجپوت سورماؤں کا پورا لشکر لے کر آئے۔ پھر تو تمہا کیوں چلا آیا یا کہ تیرا ہلاک قریب آچکا ہے۔ وہ تم سب کو زندگی کا سبق سکھائے گا کہ شہنشاہ کیسے ہوتے ہیں اور ان کی کس شے کا نام ہے؟“

”میں نے مائی بھان متی کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کے بارے میں تجھیں گھٹ پر ہڈیاں کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے مائی بھان متی کو گلا دبا کر ہلاک کرنے کے بارے میں پھر مجھے ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی اسے اپنا پورا جسم شل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گھٹیش گھٹ اصاب پر خوف کی ایک تیز لہر مسلط ہو گئی اور پھر وہ اپنی جان بچانے کیلئے ہمل شاہ کے مندر سے بھاگ رہا۔“

☆ ☆ ☆

پھر جب بھائی میں گھٹیش گھٹ نے راجہ رتن گھٹ اور رانی پد منی کو یہ واقعہ سنایا تو چوڑے کے دونوں حکمران ہاتھوں کیلئے مظلوم سے ہو کر رہ گئے۔ سکوت اور سناٹے کی اس کیفیت سے نکلنے کے بعد پد منی نے ران گھٹ کو انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں مخاطب کیا۔

”تمہارا شوق سیاست آرائی تسکین پا گیا؟ میں نے پہلے کہا تھا کہ وہ بیچ عورت ہے اور ایک بیچ سے کسی نے غصے کا میل نہیں ہو سکتا۔ آکاش دھرتی کو گھٹ لگائے تو دھرتی اپنے بیچ پن کے وجہ سے ہلک ہو جائے۔ آکاش کے جھلنے کو مجبوری سمجھ گی اور پھر وہ اپنی کم ظرفی کے سبب چاند اور سورج کے منہ پر تھوکنے کی کوشش سے لگی۔ بھان متی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے مہارانی پد منی کے منہ پر تھوک دیا۔ کون پد منی؟ اپنی جس کا چہرہ چاند اور سورج سے بھی روشن تر ہے۔“ ”ملکہ کو ہمار پر دوشیوں کی سی کیفیت طاری ہوئی۔“

”گھٹیش گھٹ! تم نے کیسے شفاف آئینے کو کچھ پر رکھ دیا۔ تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔“ غصے کی شدت بڑھتی جا رہی تھی کہ کچھ دیر میں گھٹیش گھٹ کے منہ سے سارے سام کھل جائیں گے اور لب و لہجہ خوار کا تمام خون ابل پڑے گا۔“

”مظلوموں سے کام لیجئے مہارانی!“ پد منی کی بیجانی کیفیت دیکھ کر راجہ رتن گھٹ خود بھی بدحواس ہو گیا۔ ”رتن گھٹ اپنی بیوی کے ملنے ہوئے دل و دماغ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ ”مہارانی! اسے نوکھ کر دیکھو۔ اگر آپ نے گھٹیش گھٹ کو معاف نہیں کیا تو پھر اسے زمین پر کیسے پناہ نہیں ملے گی۔“ ”نوکھنے پر بھی خوشامد کر رہا تھا۔“ ”اور گھٹیش گھٹ! تم بھی آگے بڑھ کر مہارانی کے پاؤں چھو لو۔“ ”نوکھنے پر بھی خوشامد کر رہا تھا۔“

گھٹیش گھٹ نے اپنی عیاری کا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”راجہ رتن گھٹ اور رانی پد منی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہیں اور اپنی کوتاہیوں کازالہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”آخر کس طرح؟“ بھان متی نے اطمینان سے پوچھا۔

”راجہ دربار میں آپ کا شاندار استقبال کر کے، آپ کو دیوی کا مقام دے کر کہ چوڑے آگاہ آپ جیسی گیانی اور اونچے چڑچڑ (بلند کردار) والی عورت پیدا نہیں کی۔“ گھٹیش گھٹ نے منصوبہ کی مطابق اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا تھا۔

”پھر وہ دیویاں کہاں جائیں گی جو راج محل میں اپنی پوجا کر رہی ہیں؟“ اس بار بھان متی کے لیے غم غصے کی آمیزش نہیں تھی، ایک شکستہ لہجہ تھا۔ گھٹیش گھٹ اور دوسرے درباریوں کو ذلیل و سوار کرنے والا جھوٹ بولا۔

”اس طرح تو مجھے سب سے بڑی دیوی بنانا چاہتا ہے۔“ بھان متی مسکرائی۔ ”اگر میں دیوی بن گئی تو پھر مجھے کہاں بٹھایا جائے گا؟“

”چوڑے کا جو مندر بھی آپ کو پسند ہو۔“ گھٹیش گھٹ خوش تھا کہ بھان متی آہستہ آہستہ اس کے بچھائے جال کے قریب آتی جا رہی تھی۔

”کیا درگاہور کالی کی مورتیاں مندروں سے اٹھوا دی گئی ہیں؟“ بھان متی نے ایک اور عجیب سا سوال کیا۔

گھٹیش گھٹ کی پریشانی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ آخر وہ کیا جواب دیتا؟ حیران نظروں سے بھان متی کو دیکھ رہا۔

”بول گھٹیش گھٹ! کیا تیرے حکمرانوں نے ساری دیویوں کو دیس نکالا دے دیا ہے؟“ بھان متی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی اس کے لہجے میں نشتروں سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔

”مائی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ گھٹیش گھٹ ناقابل انکشاف کاشکار تھا۔

”پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بھان متی کے ہوتے ہوئے دوسری دیویوں کو پوجا جائے۔“ مائی گھٹیش گھٹ کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ”اگر پد منی اور رتن گھٹ کو اپنی بدسلوکیوں پر ندامت ہے اور وہ پہلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کہہ دینا کہ یوگیشوری، لکشمی، بھگوتی، اندرا، رادیکا، امبیکا، درگاہور کالی کے مجسمے دریائے گنگیری اور بیچ میں غرق کر دیں۔ پھر ایک ایک مندر کو میری مورتیوں سے سجادیں۔ جب چوڑے کی تمام عبادت گاہوں میں بھان متی کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو وہ اہل چوڑے کو اپنے درشن دینے چلی آئے گی۔“

”ہمارے مذہب کی توہین کرتی ہے بھان متی؟“ گھٹیش گھٹ شدت غصہ میں اپنا لہجہ بھول گیا۔

”گھٹیش گھٹ! یہ اچانک تیری زبان کو کیا ہو گیا؟ کوئی داس اپنی مالک سے اس طرح بات کرتا ہے؟“

بھان متی خلاف عادت ہنس پڑی۔

”نہیں ہوں میں تیرا داس!“ گھٹیش گھٹ عالم طیش میں کانپنے لگا۔ ”ایک اعلیٰ نسل راجپوت ایک دہلی (طوائف) کا داس ہو بھی نہیں سکتا۔“

کنیش سنگھ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر رانی پد منی کے پاؤں پکڑ لئے اور دگر فرتہ آواز میں اپنی اس غریب معافی مانگنے لگا۔ کنیش سنگھ ایک غیرت مند راجپوت تھا مگر ہوس اقتدار نے اسے ہیروں پر کر جانے کو سکھا دیا تھا۔ ہندوؤں کا سیاسی پشتو چانکیہ یہی تو کہتا تھا کہ اپنا مطلب نکالنے کیلئے ہر راستے سے گزریں۔ کنیش سنگھ بھی ایک حادثے میں حاصل کئے جانے والے اقتدار کو بچانے کیلئے بزرگ ہوتے ہوئے بھی ایک عورت کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے بھگور رہا تھا۔

جب کنیش سنگھ کے آنسوؤں سے پد منی کے غصے کی آگ سرد پڑی تو اس نے اپنے حنائی پاؤں کھینچے اور غرور کی انتہا کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”کنیش سنگھ! اگر تم ہمارے پرانے ناٹھ (شہر) کے بہروں ہوتے تو ہم اس زبان کو کٹ کر پھینک دیتے جس نے ہماری بلند و برتر ذات کو سیاست کی بیہوش چوہا تھا۔“

”میں بہت نادام ہوں مہارانی! مگر عہد کرتا ہوں کہ بہت جلد اس رسوائی کے داغ کو دھو دوں گا۔“

”مت کرو ایسا عہد جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔“ رانی پد منی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

پورن ماسی کی رات ہونے والی پوجا سے بھی ہمارا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ دیوتا بھی اس وید شایان مٹی کا کچھ نہیں سمجھتے۔“ مسلسل ناکامیوں کے بعد پد منی شدید مایوسیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ ”ہم بھی کیا یاد کریں گے ہماری ایک جنبش چشم پر ہزاروں تلواریں نیبے نیام ہو جاتی ہیں۔ مگر کوئی ایک تلوار بھی اس بوڑھی عورت کھوکھلی ہڈیوں کو کاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔“

”مہارانی! دھیرج دھیرس۔“ راج رتن سنگھ نے بھدکاریوں کے سے لہجے میں کہا۔ ”بھان مٹی کو دن کیلئے بھول جائیے کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن سر پر آپ بچا ہے۔ ایک ہی رات کی قوت ہے۔ غمراہ کے منتروں کو بھی آزمائیجئے۔ اگر وہ تیر بھی رانگاں گھیا تو کیا، ابھی ہماری سیاست کے ترش میں بے شمار باتیں ہیں۔“

”اب تک لوگوں کو آزمایا ہی تو گیا ہے۔“ رانی پد منی نے نخوت سے کہا۔ ”آپ کی سب کی کمان سے تیر چھوٹے رہیں گے اور ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔“ حسن کے ناز وادا کا سلسلہ جاری رہا کنیش سنگھ اجازت لے کر پوجا کے انتظامات مکمل کرنے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

پورن ماسی کی رات آئی تو مانا کے مندر میں بہت جھوم تھا۔ یہ مندر راج محل کے درمیان میں بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر چوڑے کے امراء اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے تھے۔ آچار یہ شکر داس کی ہدایت کے مطابق راجگان چوڑا اور سردار قوم کی کنواری لڑکیوں نے شیو کی پوجا اس حال میں کی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کا عکس تک نہیں تھا اور ہوتا بھی کس طرح کہ وہ اس بے حیائی کی عادی ہو چکی تھیں۔ شیو پوجا ختم ہوتے ہی آچار یہ غمراہ اس کی ہدایت کے مطابق پجاریوں کا یہ جھوم ”کالکا“ کے مندر پہنچا۔ اس مندر میں ”درگا“ اور ”کالی“ کے طبل القامت مجتھے نصب تھے۔ دشمن کے مقابلے کے وقت خاص طور پر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ کالکا کے مندر میں شکر داس تمام پجاریوں کی قیادت کر رہا تھا۔

غمراہ اس کچھ درد تک بہ آواز بلند مذہبی کتابوں کے اشلوک (فقرے) پڑھتا رہا۔ ابھی اشلوک پڑھتے ہی گزرتے تھے کہ ارادلی اور آبوکی چوٹیوں پر سیاہ گھٹائیں نمودار ہونے لگیں اور تیر بجلی کڑکنے لگی۔ بجاری بہت خوش تھے کہ دیویوں نے ان کی دعائیں فوراً ہی سن لی تھیں۔ رات بھر اسی طرح پوجا ہوتی رہی اور کئی کئی سرخ سانپ کی طرح لہراتی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ موسلا دھار بارش ہوگی مگر آسمانوں نے چوڑی زین کو بانی کالیکا قطرہ بھی نہیں بخشا۔ پھر جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا پجاریوں کے منہ سے سچا تہمتیں نکل گئیں۔ مندر کا فرش اچانک ملنے لگا تھا۔ لوگوں کو شور و غوغا سے باز رکھنے کیلئے شکر داس کو فوری طاقت سے چننا پڑا۔ ”مانا کے پجاری گھبراہٹ میں یہ دیوتاؤں کا لایا ہوا زلزلہ ہے جو چوڑے کے ہر دشمن کو تباہ کر دے گا۔“

☆.....☆.....☆

سارا دن اور ساری رات حکومت کے ڈھنڈور جی نقارے پیٹ پیٹ کر چوڑے کے گلی کوچوں میں اعلان کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ریاست کے اچھوتوں کو بھی تنبیہ کرتے رہے کہ اگر بھولے اس قوم کا کوئی فرد مندروں میں داخل ہو گیا تو اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ جب رات کے سناٹے میں قلعے کی فیصل سے اعلان کیا گیا تو نرملا کماری، آفریدی، رامیشوری اور چند نے بھی یہ پر شور آوازیں سنیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب آوازیں صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جب بھی ہوا کارخ ہوتا تو کوئی نہ کوئی بات سمجھ میں آ جاتی۔ منتری بھون کے خفیہ باغ میں پڑے ہوئے چند خاندان بدوشوں کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آخر منتشر لفظوں کو جمع کرنے کے بعد نرملا نے ایک مفہوم اخذ کیا۔

”کل پورن ماسی کی رات ”مانا“ اور ”کالکا“ کے مندر میں صبح سورج نکلنے تک چوڑے کی سلاخی دعائیں کی جائیں گی۔“ نرملا نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

پورن ماسی کی رات آئی تو مانا کے مندر میں بہت جھوم تھا۔ یہ مندر راج محل کے درمیان میں بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر چوڑے کے امراء اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے تھے۔ آچار یہ شکر داس کی ہدایت کے مطابق راجگان چوڑا اور سردار قوم کی کنواری لڑکیوں نے شیو کی پوجا اس حال میں کی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کا عکس تک نہیں تھا اور ہوتا بھی کس طرح کہ وہ اس بے حیائی کی عادی ہو چکی تھیں۔ شیو پوجا ختم ہوتے ہی آچار یہ غمراہ اس کی ہدایت کے مطابق پجاریوں کا یہ جھوم ”کالکا“ کے مندر پہنچا۔ اس مندر میں ”درگا“ اور ”کالی“ کے طبل القامت مجتھے نصب تھے۔ دشمن کے مقابلے کے وقت خاص طور پر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ کالکا کے مندر میں شکر داس تمام پجاریوں کی قیادت کر رہا تھا۔

غمراہ اس کچھ درد تک بہ آواز بلند مذہبی کتابوں کے اشلوک (فقرے) پڑھتا رہا۔ ابھی اشلوک پڑھتے ہی گزرتے تھے کہ ارادلی اور آبوکی چوٹیوں پر سیاہ گھٹائیں نمودار ہونے لگیں اور تیر بجلی کڑکنے لگی۔ بجاری بہت خوش تھے کہ دیویوں نے ان کی دعائیں فوراً ہی سن لی تھیں۔ رات بھر اسی طرح پوجا ہوتی رہی اور کئی کئی سرخ سانپ کی طرح لہراتی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ موسلا دھار بارش ہوگی مگر آسمانوں نے چوڑی زین کو بانی کالیکا قطرہ بھی نہیں بخشا۔ پھر جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا پجاریوں کے منہ سے سچا تہمتیں نکل گئیں۔ مندر کا فرش اچانک ملنے لگا تھا۔ لوگوں کو شور و غوغا سے باز رکھنے کیلئے شکر داس کو فوری طاقت سے چننا پڑا۔ ”مانا کے پجاری گھبراہٹ میں یہ دیوتاؤں کا لایا ہوا زلزلہ ہے جو چوڑے کے ہر دشمن کو تباہ کر دے گا۔“

☆.....☆.....☆

سارا دن اور ساری رات حکومت کے ڈھنڈور جی نقارے پیٹ پیٹ کر چوڑے کے گلی کوچوں میں اعلان کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ریاست کے اچھوتوں کو بھی تنبیہ کرتے رہے کہ اگر بھولے اس قوم کا کوئی فرد مندروں میں داخل ہو گیا تو اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ جب رات کے سناٹے میں قلعے کی فیصل سے اعلان کیا گیا تو نرملا کماری، آفریدی، رامیشوری اور چند نے بھی یہ پر شور آوازیں سنیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب آوازیں صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جب بھی ہوا کارخ ہوتا تو کوئی نہ کوئی بات سمجھ میں آ جاتی۔ منتری بھون کے خفیہ باغ میں پڑے ہوئے چند خاندان بدوشوں کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آخر منتشر لفظوں کو جمع کرنے کے بعد نرملا نے ایک مفہوم اخذ کیا۔

”کل پورن ماسی کی رات ”مانا“ اور ”کالکا“ کے مندر میں صبح سورج نکلنے تک چوڑے کی سلاخی دعائیں کی جائیں گی۔“ نرملا نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

پورن ماسی کی رات آئی تو مانا کے مندر میں بہت جھوم تھا۔ یہ مندر راج محل کے درمیان میں بنایا گیا تھا۔ جس کے اندر چوڑے کے امراء اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے تھے۔ آچار یہ شکر داس کی ہدایت کے مطابق راجگان چوڑا اور سردار قوم کی کنواری لڑکیوں نے شیو کی پوجا اس حال میں کی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کا عکس تک نہیں تھا اور ہوتا بھی کس طرح کہ وہ اس بے حیائی کی عادی ہو چکی تھیں۔ شیو پوجا ختم ہوتے ہی آچار یہ غمراہ اس کی ہدایت کے مطابق پجاریوں کا یہ جھوم ”کالکا“ کے مندر پہنچا۔ اس مندر میں ”درگا“ اور ”کالی“ کے طبل القامت مجتھے نصب تھے۔ دشمن کے مقابلے کے وقت خاص طور پر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ کالکا کے مندر میں شکر داس تمام پجاریوں کی قیادت کر رہا تھا۔

غمراہ اس کچھ درد تک بہ آواز بلند مذہبی کتابوں کے اشلوک (فقرے) پڑھتا رہا۔ ابھی اشلوک پڑھتے ہی گزرتے تھے کہ ارادلی اور آبوکی چوٹیوں پر سیاہ گھٹائیں نمودار ہونے لگیں اور تیر بجلی کڑکنے لگی۔ بجاری بہت خوش تھے کہ دیویوں نے ان کی دعائیں فوراً ہی سن لی تھیں۔ رات بھر اسی طرح پوجا ہوتی رہی اور کئی کئی سرخ سانپ کی طرح لہراتی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ موسلا دھار بارش ہوگی مگر آسمانوں نے چوڑی زین کو بانی کالیکا قطرہ بھی نہیں بخشا۔ پھر جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا پجاریوں کے منہ سے سچا تہمتیں نکل گئیں۔ مندر کا فرش اچانک ملنے لگا تھا۔ لوگوں کو شور و غوغا سے باز رکھنے کیلئے شکر داس کو فوری طاقت سے چننا پڑا۔ ”مانا کے پجاری گھبراہٹ میں یہ دیوتاؤں کا لایا ہوا زلزلہ ہے جو چوڑے کے ہر دشمن کو تباہ کر دے گا۔“

کہ سلطان کے لشکر اتنی تیزی سے یلغار کریں گے۔ دہلی سے چوتھ تک کا فاصلہ علاء الدین نے کم سے کم وقت میں طے کر لیا تھا۔ وہ صرف رات کے وقت اپنے فوجی دستوں کو قیام کا حکم دیتا تھا اور پھر صبح صاف پہلے تمام سپاہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ فجر کی نماز ادا کر کے کیلئے کچھ دیر ٹھہرتے اور پھر اپنی رفتار بڑھا دیتے۔ جب چوتھ کے محافظ دستوں کے سپاہیوں نے صبح کے دھندلے میں ہر طرف شہسواروں کے سائے دیکھے تو ایک سپاہی نے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے راج محل کی طرف ہٹا کر اشارہ کر دیا۔ اس نے دریائے گنجپری میں اپنا گھوڑا اڑا دیا۔ جہاں دریا کا پانی بہت کم ہو گیا تھا اور پانی گھونٹ کے ٹخنوں سے ذرا زیادہ اونچا نظر آ رہا تھا۔ وہ سرحدی سپاہی اس وقت راج محل پہنچا جب کا کا کے دروازے میں افراتفری مچی ہوئی تھی اور لوگ چیخنے چلاتے اور ہر دھڑک رہے تھے۔ سپاہی نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں راج رتن سنگھ کو بتایا کہ علاء الدین کا لشکر جہاں آ رہا ہے۔ اس خبر کو کرکچھ دیر کیلئے راجپوت سمرات کے اعصاب شل ہو گئے تھے اور پھر اس نے فوراً ہی نئے مہماتری کی پیش اور سپہ سالار ہری سنگھ کو اپنے مخصوص کمرے میں طلب کر لیا تھا۔

”تم نے سنا ہی سنگھ؟“ چوتھ کے حکمران نے اپنے سپہ سالار کو اس طرح مخاطب کیا جیسے اس زبان اور جسم راج محل میں موجود ہوں اور ذہن کسی مفروضہ مجرم کی طرح مختلف راستوں پر گھومتا ہو رہا ہو۔ ہری سنگھ نے اپنے فرمانروا کی سراپسیگی کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سر ہٹا ہوئے کہا۔

”سمرات! میں اپنی سماعتوں کو دنیا کے شور سے محفوظ رکھتا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ اپنے شاہ کے ایک ایک اشارہ چشم کا منتظر اور ایک ایک جنبش لب کا تابع۔ سمرات جو کچھ کہتے ہیں میں ہی ہوں۔“ ہری سنگھ ایک بہادر اور جاں نثار سپہ سالار تھا۔ اس لئے اس کے انداز گفتگو خوشامد سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے اسی حقیقی لہجے میں بول رہا تھا۔

رتن سنگھ کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے اور اس نے تلخ آواز میں ہری سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”بینا پانی! بہت دکھ ہوا کہ اب تم بھی ایک سیاستدان کی زبان میں بات کرنے لگے ہو۔“

سپہ سالار ہری سنگھ حیران و پریشان ہو کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھنے لگا۔ ”سمرات! ممکن ہے کہ جاں نثار کی راج محل کے معیار پر پوری نہ اترے مگر میرے ہونٹ آج بھی جھوٹ سے نا آشنا ہیں۔ منہ مصلحت اور سیاست سے کبھی دوستی نہیں کی۔“ اس الزام تراشی کو ضبط کرتے کرتے ہری سنگھ کا ہوا ہو گیا تھا۔

”تو پھر تمہاری آنکھیں دھندلا گئی ہیں اور کان بہرے ہو گئے ہیں۔“ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار جذبات کا احساس کے بغیر کہا۔

ہری سنگھ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر ابھرنے والی ناگواری کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اس نے اپنی زبان کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔

”میں اب تک سمرات کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔“

”ہری سنگھ۔“ والٹی چوڑکی آواز پہلے سے زیادہ بلند اور تلخ تھی۔ ”یہ تمہاری ذمہ داری تھی کہ چوتھ کی سرحدوں کی نگرانی کرتے اور اگر ہماری مملکت کے حساس علاقے سے کوئی گمراہی گزرے تو آگاہ کرتے۔“

”سمرات! آج تک کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ میں اپنی سرحدوں سے غافل رہا ہوں۔ حالت ایسا بھی میری آنکھیں اپنی مملکت کی نگراں رہی ہیں۔“ سپہ سالار ہری سنگھ سیدھا کھڑا ہو گیا اور

ہری سنگھ نے اپنی آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔

”کیا تم ہمیں یہ خبر کیوں نہیں دے سکتے کہ سلطان علاء الدین خلیجی چوتھ کے قریب آ پہنچا؟“ رتن سنگھ نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا دشمن ہمارے کتنے نزدیک ہے؟“

”ہری سنگھ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اس کی بے خبری ناقابل برداشت تھی۔ وہ مہماتری کی دلدل میں ڈوبنے والی لاکھ تھی۔ تیزی سے ابھرنے والے ایک خیال نے اسے

”ہری سنگھ نے تو میری راتیں بھی سرحدوں پر گزر رہی تھیں سمرات! مگر کل شب میں آپ کے حکم سے قہر“ ہری سنگھ نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”کل دن بھر لوگوں کو شیوا اور درگا کی پوجا کیلئے مندر میں جمع رہا۔ پھر آپ کے ساتھ مل کر رات بھر دیوتاؤں کو پکارا۔ اس دوران سرحدوں کے خیال سے بھی نہیں رہا۔ اگر پوجا کا اہتمام نہ ہوتا تو یہ خبر پہلے بھی تک پہنچتی۔“ ہری سنگھ نے ایک معقول دلیل پیش کر کے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔

راج رتن سنگھ کا غصہ اس دھوئیں کی طرح اڑ گیا جسے تیز ہواؤں دیکھتے ہی دیکھتے فضاؤں میں تحلیل کر دیتی تھی۔ ”اب کیوں گہری سنگھ؟“

”بہادر راجپوت! سلطان کی دست درازیوں کا مقابلہ کریں گے۔“ ہری سنگھ کے بجائے مہماتری سنگھ نے لاف زنی کرتے ہوئے کہا۔ ”غیر مندر راجپوتوں کے گریبانوں کی طرف بڑھنے والے ہاتھ دیکھ جائیں گے اور انہیں قلعہ کے صدر دروازے پر لٹکا دیا جائے گا کہ پھر کوئی شخص ایسے گناہ کا بندہ ہو سکے۔“

راج رتن سنگھ نے انتہائی تحقیر آمیز نگاہوں سے اپنے خوشامدی ماموں کی طرف دیکھا۔ ”تم ہوش ہو ہو گئیں سنگھ؟“

”فیضانِ سر! نکیش سنگھ اپنے فرمانروا کے سامنے اس طرح جھک گیا کہ سنگی فرش اور اس کے سر میں ٹھانہ پھلنے لگا تھا۔

”میں ریاست کا بہترین دماغ ہوں سمرات اور ایسے دماغ کبھی بے ہوش نہیں نہیں رہتے۔“

”میرے گھر سے ہواؤں نکیش سنگھ۔“ راج رتن سنگھ نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”ہم اتنی خوشامدی

نہیں کرتے کہ آدمی اپنے مقام سے گر کر کوئی پالتو کتا نظر آنے لگے۔“ غصے سے رتن سنگھ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”تم جس شخص کو کہتے ہوئے ہاتھوں کا تشاؤ دکھانا چاہتے ہو اسے جانتے ہی ہو کہ وہ کون ہے؟“

”نکیش سنگھ کو جواب دیتا؟ خوشامدی اور زمانہ ساز انسان تھا۔ اپنے حکمران کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتے تو

[illegible]

رات آئی تو ایک شخص کے سوا سارا چوڑ جاگ رہا تھا اور وہ بے خبر سونے والا شخص رام دیو کے سوا کوئی نہیں تھا۔ راجستھان کے ساحرا اعظم نے سریشام ہی اپنے بیٹے میں آگ روشن کر دی تھی۔ آشرم دیویاں رقص کر رہی تھیں اور رام دیو پر فکر سے بے نیاز ہو کر بیٹھا تھا۔

”کھا“ کاندھویر ان تھا اور آچار یہ شکر داس کی لاش رو گئے جیسے کے نیچے پڑی سرہری تھی۔ کوئی شخص خوف سے آچار یہ کے مردہ جسم کو باہر نکالنے نہیں گیا کہ اس پر دیوی کا تہ نازل ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆
 سلطان علاء الدین خلجی دریائے گنجپری کے کنارے خیمہ زن ہوا تھا۔ سرحد کے گمراہ دستوں
 نے پہلے ہی اس کی اطلاع دی تھی۔ دراصل راجپوت حکمرانوں کے نزدیک چوڑی حقیقی طاقت اس مضبوط ترین قلعہ
 خیمہ کی بجائے کوئی مسلمان فاتح تیسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے رتن سنگھ نے بہت کم فوج سرحدوں پر
 رکھ کر خود ہی اس فوج کی موجودگی کا مقصد صرف جنگلی لیروں اور قزاقوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔
 یہ غلط فہمی ہو دینے والے سپاہی اس قابل نہ تھے کہ علاء الدین خلجی کے لشکر جبار کو آگے بڑھنے
 دے۔ چہ اور پھر ایسی ہی ہوا۔ سلطان کے لشکر کے نمودار ہوتے ہی راجپوت سپاہیوں میں پھل سیل
 مچ

پچھن سگھ نہ ہری سگھ کو آتے دیکھا تو جنک اٹھا پھر جب چوڑے کے سپہ سالار نے اپنی الجھن کا ذکر
بوڑھے ٹھاکر کی پیشانی سوچ کی لیکروں سے بھر گئی۔

”ٹھاکر ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سمرات ایک شعبہ باز سادھو اور ایک خوبصورت عورت ہاتھوں کا کھلونا بن جائیں گے۔“ ہری سنگھ نے رام دیو اور رانی پدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قلعے سے نکل جاؤں اور آگے بڑھ کر سلطان کے لشکر کا مقابلہ کروں۔ کیا خود کشی نہیں ہوگی؟“ ہری سنگھ نے ایک خجریہ کار اور جامنیدہ فوجی سے اپنے دل کا درد بیان کیا۔

پچھن سنگھ کے جسم میں بھی وہی آگ بھری ہوئی تھی جس کی حرارت نے راجپوت قوم کو ایک فخرانوار
بخشا تھا۔ سلطان کے حملے کی خبر سن کر پچھن سنگھ کے خون میں بھی جھاگ سے اٹھے لیکن فخرانوار
جنروں کی آگ بجھ چکی تھی۔ بوڑھے راجپوت نے راکھ کو مست کر دیا مگر اب ایک بھی چنگاری ایسی نہیں
جوفضاؤں میں رقص کر سکے پچھن سنگھ کانپ کر رہ گیا۔

”ہری سنگھ! کیسے برے وقت میں کتنی نازک خبر لائے ہو؟“ خون کے ابال کو برداشت کرتے کرتے پچھن سنگھ کے جڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں..... ”ایک جوان شیر نے بوڑھے شیر کے جنگل میں قدم رکھا ہے۔“ میڑھی ہڈیاں اور لنگھتی ہوئی کھال کس کام کی اب تو غراہٹ بھی باقی نہیں جو آنے والے لوگوں کی ہڈوں کا احساس دلا سکے۔“

ہری سنگھ نے حیران ہو کر پھنچن سنگھ کی طرف دیکھا۔ ”ٹھاکر! تم نے سلطان کو شیر کے لقب سے کیا،“ بھیڑ اور بکری کہہ کر کیوں نہیں پکارا؟“

”نہیں ہری سنگھ! علاء الدین واقعہ میر ہے۔“ چھپن سنگھ اپنی دھندلی آنکھوں سے اس شیر کے منہ گھورنے لگا جو اس کی نشست گاہ کے ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا۔ ”اگر سلطان بجھڑ، بکری ہوا تو نسل متان حکومت نہیں کر سکتا تھا۔“ چھپن سنگھ نے ترکی النسل حکمران کو خراج تحسین پیش کیا۔

”تو پھر کیا ہمیں جنگل خالی کرنا ہو گا ٹھاکر؟“ ہری سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہری سنگھ۔“ بوڑھے سپہ سالار کے لہجے میں سخت تشویش تھی۔

قانون کا احترام نہیں کرتے انہیں ایک دن لومڑیاں اور گیدڑ ستاتے ہیں۔“

”ٹھاکر! تم نے بھی مجھے مانوس کیا۔ میں تو تمہارا آنکھوں میں کوئی جگمگاؤ نقشہ دیکھنے آیا تھا کہ میں تو بڑا

اور تھکن کے اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

اور تھر تھرائی روشنی میں راستہ نظر آجائے گا۔ کچھ دیر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ دہلی کے شیر کو چوڑے دنگوں کا

کس نے بتایا؟ کیا پوری ریاست میں کوئی دماغ ایسا نہیں تھا جو اس شیر کو اپنی کچھار میں بندرہ

گئی۔ چند فوجیوں نے مشتعل ہو کر اپنی تلواریں بے نیام کر لیں مگر کچھ دیر بعد ہی ان کے بازو شل ہو گئے۔ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سلطان کے حکم پر انہیں مسلمانوں کے خیمے میں رکھ کر تیار داری کی گئی۔ سپہ سالار خواجہ حاجی نے اپنے حکمرانوں سے اس نرم دلی کے مظاہرے کا سبب پوچھا تو سلطان نے جواب دے ہوئے کہا۔

”ہم اس پر بھی قدرت رکھتے تھے کہ ان شکست خوردہ سپاہیوں کے سر جسے ہم نے غلٹھ کر کے رہائش گاہیں دی ہیں بھادیے یا پھر راجہ رتن سنگھ کے دربار میں یہ خون رنگ تحفہ بھیج دیے مگر ہم لیرے نہیں بن گئے۔ اور ایک شہنشاہ کو ہر قدم پر آدابِ شہانہ کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کل صبح ہم والی چوڑ کو تائیں کے کراں کی سرحدیں کتنی کمزور ہیں۔“

☆.....☆.....☆

اسی رات منتری بھون کے طلسم کدے میں چندر سنگھ اپنی آقا زادی کے سامنے عرض کر رہا تھا۔ ”راج کمار! اب یہ ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ پرہو (مالک) کس حال میں ہیں؟ ایک غلام کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خبر گیری کروں۔“ چندر سنگھ نے پرہو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

نرمل کمار نے اپنے وفادار خادم کو ستائشی نظروں سے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر غم کے آثار ابھر آئے۔ ”خبر مل بھی گئی تو کیا کرو گے چندر سنگھ؟ پتا ہی ایک سنگدل حکمران کی قید میں ہیں۔ کیا تم انہیں تنہا چھوڑا دو گے؟“

”اگر مہمانتری کو قید سے آزاد نہ کر اسکا تو کم سے کم صورت حال کا تو پتا چل جائے گا۔“ چندر سنگھ جذباتی ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ہم اپنے آپ سے تو شرمندہ نہیں رہیں گے کہ غلام ایک گوشہ میں سر چھپائے پڑے رہے اور ان کے آقا پرستم کے پہاڑ ٹوٹے رہے۔“

”ہمارے کاندھے بہت کمزور ہیں چندر سنگھ! تم مصیبتوں کے پہاڑ کا ذکر کرتے ہو جبکہ ہم اپنی طرف آنے والے چند اینٹوں اور پتھروں کا بھی جواب نہیں دے سکتے۔“ نرمل کمار نے بڑے مہربانہ بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چندر سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ”مہمانتری نے رخصت ہوتے وقت حکم دیا تھا کہ اگر سلطان کی فوجوں کو شکست ہو جائے تو ہم سرنگ کے راستے چوڑی کی حدود سے نکل جائیں گے۔ اگر اسلامی لشکر غالب آجائے تو ہم سلطان کے سامنے پیش ہو جائیں۔“

”آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو چندر سنگھ؟“ نرمل کمار نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”اگر ہم اسی طرح اس طلسم کدے میں بند رہے تو پھر ہمیں سلطان کے حملے اور جنگ کے نتائج کی فینہ کس طرح ملیں گی؟“ چندر سنگھ نے ایک انتہائی معقول دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

”پتا ہی کایہ حکم بھی تھا کہ خواہ صورت حال کتنی ہی خوفناک ہو جائے مگر ہم طلسم کدے کی حدود سے نہیں نکلیں گے۔“ نرمل نے مہمانتری و کرم سنگھ کے دوسرے حکم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

”یہ حکم صرف آپ کیلئے اور سردار آفریدی کیلئے مخصوص تھا۔“ چندر سنگھ نے کہا۔ ”میں بھی اس کے دائرے میں آتا ہوں مگر میری زندگی اتنی زیادہ قیمتی نہیں ہے اور اگر میں خطرات مول لے رہا ہوں تو ایک اہم مقصد کی خاطر۔ راج کمار! ابھی باہر نکلتا ہی ہو گا؟“

چندر سنگھ مسلسل ضد کر رہا تھا اور نرمل اس کی ضدوں کو سختی سے جھٹلاتا ہی تھا۔ بالآخر ایک

چندر سنگھ نے اپنے موقف کو درست ثابت کر دیا۔ نرمل اور آفریدی کو چندر سنگھ کی بات ماننی ہی پڑی مگر یہ حال یہ تھا کہ پچان لے جانے کی صورت میں چندر سنگھ کا کیا حشر ہو گا؟

بہت سارے سردار اس حالت میں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا، چندر سنگھ پہلے ہی ہر سوال کا جواب سوچ چکا تھا۔ ”جی ہاں کی طرح داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں نے مجھے نیا پہرہ دیدیا ہے۔ بس چہرے پر نہ ڈھکیں اور گلے میں پتھروں کی مالا پہننے کی دیر ہے۔ پھر میں مکمل جوتی ہو جاؤں گا۔“

نرمل کمار چندر سنگھ کی اس ترکیب پر زیر لب مسکرائی مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

”راج کمار! میں اپنی جاسوسی کے سفر کا آغاز چوڑ کے مندروں سے کروں گا۔ یہیں ایک گوشہ میں ہر کوئی ساری خبریں مل جائیں گی اور پھر میں آدھی رات کے بعد کچھ دیر کیلئے واپس لوٹ آیا ہوں گا۔“ چندر سنگھ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

نرمل نے آفریدی کی طرف دیکھا جیسے وہ چندر سنگھ کے سلسلے میں اس کی اجازت طلب کر رہی ہو۔

نرمل چندر سنگھ کی باتوں سے مطمئن ہوتے ہوئے بھی الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔ ”چندر سنگھ اور رامیشوری! تم دونوں کو دیر کیلئے باہر چلے جاؤ میں تنہائی میں راج کمار سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“ اگرچہ آفریدی کو یہ بات کتنے دقت ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا لیکن وہ مصلحت اور دانشمندی کے تقاضوں سے

بیرہنہ۔

خامد رامیشوری تیزی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چندر سنگھ نے اٹھنے میں کسی قدر تکلف سے اٹھ کر باہر متھکے متھکے قدموں سے باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کا پرچوش چہرہ اب جھکا جھکا نظر آ رہا تھا۔

”چندر سنگھ اسی طرح باہر جا سکتا ہے کہ وہ طلسم کدے کے کھلنے اور بند ہونے کے راز سے واقف رہے۔ ہمیں صورت حال پریشان کن تو ثابت نہیں ہوگی؟“

آفریدی کا سوال سن کر نرمل بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی۔ وہ بڑی بے چینی کے عالم میں بار بار اپنی ذہنی کے آئینے کو لگا لگاؤں کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ کبھی گھبرا کر آفریدی کی طرف دیکھتی اور کبھی نظریں ہاتھوں سے ڈھکیں ہاتھوں سے زیادہ بڑھا ہوا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”سردار! میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔“ آفریدی کشش کے بعد نرمل کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”میں چندر سنگھ کی وفاداریوں پر شک نہیں کر رہا ہوں مگر زمانے نے جو سبق مجھے سکھائے ہیں، ان کا فائدہ اٹھانے میں اپنی ذات پر بھی شبہ کروں۔“ آفریدی بھی جوش اضطراب میں اپنے بستر سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی۔ اس کے زخم بھر گئے تھے لیکن ابھی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ کئی بار اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر وہ بے بس تھی۔

”آپ مجھے جیسے سردار! خدا کیلئے بیٹھ جائیں۔“ نرمل نے بے اختیار ہو کر کہا اور آفریدی نزدیک پڑی اور ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ نرمل کے انداز گفتگو نے اسے ایک باہر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنا بیت کایہ اسے چاہیے تھا۔ آفریدی خیالوں کی دنیا میں کھو گیا اور پھر یہ محویت اس وقت ختم ہوئی جب نرمل نے

نرمل کو غیر معتبر سمجھ کر بھی اعتبار انسان کی ضرورت ہے۔ چندر سنگھ کے باپ دادا نے بھی

چاٹ گئی ہے۔ ہم اسے بانگ کے راستے باہر جانے کا طریقہ سمجھا دیں گے۔ ”نرملاکماری نے بھی اس انداز میں غبی ترکیب سوچ لی تھی۔ ”ہم لوگ اس کے جانے کے بعد ظلم کدے میں بند رہیں گے اور جہاں چندر سنگھ اسی راستے سے واپس آئے گا تو پہلے دروازے پر پہنچ کر ہمیں سات بار پکارے گا پھر یقین کر کے بعد کہ کسی خطرے کا امکان نہیں ہے دروازہ کھول دیا جائے گا۔“

اگرچہ یہ طریقہ بھی زیادہ محفوظ نہیں تھا لیکن آفریدی کو چندر سنگھ پر اعتبار کرنا ہی پڑا۔ جب دہات آ رہے تھے تو چندر سنگھ اس حال میں رخصت ہوا کہ وہ کوئی بھکاری نظر آ رہا تھا۔ جاتے وقت اس آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”راج کماری! اگر چندر سنگھ واپس نہ لوئے تو سمجھ لیجئے گا کہ اس پر کوئی قیامت نازل ہو گئی ہوگی اور کہ

نے اس بہروپ میں بھی مجھے پہچان لیا تو مطمئن رہئے گا کہ میری زبان خریدی نہیں جاسکتی۔ یہ کہ چندر سنگھ نے اپنی قدیم رسم کے مطابق نرملاکماری کے پاؤں چھونے کی کوشش کی مگر آفریدی نے اسے ڈوبا۔

”اب تم مسلمان ہو چندر سنگھ اور مسلمان کسی کے آگے اس طرح نہیں جھکتا۔“

”معافی چاہتا ہوں سر دار!“ چندر سنگھ ایک احساسِ ندامت کے ساتھ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”مدد
تک بتوں کی پوجا کی ہے کبھی کبھی کوئی ٹوٹا ہوئی ختم کسی گوشہ نشین سے ابھری آتا ہے۔“

آفریدی نے آگے بڑھ کر چندر سنگھ کو گلے لگالیا اور پھر اس کی کشادہ پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”میرا کوئی
نہیں چندر سنگھ مگر آج میں تمہیں ایک حقیقی بھائی کی حیثیت سے رخصت کر رہا ہوں۔ کاش! تم مت
ہمیں یہ خبر سنا سکو کہ مہمانتزی ظالموں کے تشدد سے محفوظ ہیں۔ اسیر زنداں سہی مگر ہمیں یہ ماحول ملے
ابھی وہ روشن چراغ بھانئیں ہے کو تھر تھرا کر رہے ہواؤں سے لڑتی ہے لیکن روشنی کی ایک گیرانی رہے کہ
لکیر ہماری زندگی ہے اور اسی لکیر سے روشنی کا ایک مینار تعمیر ہوتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے آفریدی کی آنکھیں
اٹھی تھیں۔ نرملا کے دل پر چھائی ہوئی گھٹا بھی برے کیلئے بے قرار تھی مگر اس نے اپنا منہ دوسری طرف
لیا۔

صبر سر پر جلوہ عیاں توجہ زوال کے ساتھ دینا شروع ہو گئے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے

لیا۔ صبح سویرج طلوع ہوا تو چوڑ پر زوال کے سائے پڑنا شروع ہو گئے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے راجپوت سپاہیوں کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ سپاہیوں کی تعداد سو کے قریب تھی۔ جب انہیں سلطان سامنے لایا تو قیادت دشمن سپاہیوں کی گردنیں اٹھی ہوئی تھیں اور چرے پر کھنچاؤ کی سی کیفیت ظاہر ہوئی۔ علاء الدین نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟“ علاء الدین مہر جلال لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”ہم تمہارے جسوں حصوں میں تقسیم بھی کر سکتے تھے اور تمہیں ناقابل بیان اذیتیں بھی پہنچائی جاسکتی تھیں مگر ہم نے اس گریز کیا۔ آخر کیوں؟“

”ہم کچھ نہیں جانتے۔“ کئی سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔ ”جس کا جوئی چاہے کہے

”ہم کسی کے غلام نہیں ہیں اور کسی کے رحم و کرم کی بھیک پر زندہ رہنا بھی نہیں چاہتے۔“ اب

ہم اپنی ایک ساتھ بول اٹھے تھے۔
 "سلطان نے ایک راجپوت سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
 کہ وہ آئے سمجھ کر لاء۔"
 کہہ کر وہ اٹھا۔

پہلوں کے درمیان سرسبز اور راجہ رتن سنگھ کے سپاہی کو قضاے الگ کر کے اپنے حکمرانوں کے سامنے پیش کیا۔ راجپوت سپاہی کے دونوں ہاتھ زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے فیصلہ کی طرف سے الگ ہوا تو سلطان کا خیال تھا کہ راجپوت سپاہی خوفزدہ ہو جائے گا مگر علاء الدین کو اس طرح پر دہشت کا کاما سکتا بھی نظر نہیں آیا۔ ایک لمحے کیلئے سلطان کے شوق خود نمائی کو ٹھیس سی گئی اور ایک بے پرواہی کے ساتھ ایک معمولی سپاہی نے سر نہیں جھکا یا تھا۔

”میں ہر نسل کے ہر جاندار کو کسی نہ کسی کی غلامی قبول کرنی ہی پڑتی ہے۔ وہ نسل حیوانات کی کوئی ایک نسل نہ ہو، آدم کا کوئی قبیلہ۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے اپنے سپاہیوں کو دوسرا حکم دیا۔ ”اسے لے کر آؤ۔“

قلم نویس کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی گونج ختم ہونے سے بھی نہیں پاتی اور عمل شروع ہو جاتا ہے۔ بیشتر تخلیقی جو پہلے ہی بے نام بھی، برق کی طرح فضائیں اُڑاتی اور اپنی بے مثال کاٹ کا ثبوت اس طرح دیا کہ ہتھ پائی کی گردن علیحدہ تھی اور جسم زمین پر ترنڈ رہا تھا۔

مٹی جیسے میں سناٹا طاری تھا اس سکوت کو خود علاء الدین خلجی نے توڑا۔ ”جن لوگوں کو زندگی کی پلندہ نہیں ہوئی انہیں موت کی غلامی گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اب بتاؤ کہ تمہیں دونوں میں سے کونسا انداز پلندہ ہے؟“ علاء الدین خلجی انتہائی تحقیر آمیز لہجہ میں راجپوت سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

”میں نے غلامی پسند ہے مجھے ہمارے ساتھی نے ہتھ پتے قبول کیا۔“ راجپوت سپاہیوں کا لہجہ شرر آمیز
 گونج رہا تھا غرور سے میز مٹی ہو گئی تھیں۔

طاہر الدین مکرایا۔ ”نہیں! ہم تمہیں یہ غلامی نہیں بخشیں گے۔“ اتنا کہہ کر سلطان نے اپنے بول کو یکبارہ کھردیا۔ ”ان کی پیشانیوں پر ہمارے جاہ و جلال کے نقوش اس طرح روشن کر دو کہ اگر چنانچہ تم کسی ڈالیں تو ہماری نشانیاں دھندلی نہ ہو سکیں۔“

پہر سلطان کے خیمے میں ایک بالچل سی جی گئی۔ علاء الدین جب کسی سے خوش ہوتا تو اس پر اس طرح ٹول کی بارش کر دے کہ انعام ہانے والا ان مہربانیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس کے برعکس کسی مہربان ہوتا تو عجیب عجیب سزا میں دیتا۔ راجپوت سپاہیوں سے بھی وہ خفا ہو گیا تھا اور اپنی خفگی کا اظہار ان کے سلطان کے قیدیوں کی پیشانیوں کو روشن کر دینے کا حکم دیا تھا۔

ان لوگوں کا کیا کیا گیا کہ ان کا سنہری رنگ سرخی مائل ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تمام لوگوں کے چہروں پر وہ جلتی ہوئی اشرفیاں رکھ دی گئیں۔ تکلیف کی شدت سے کچھ راجپوت بیچنے والے ہتھیاروں کو اس طرح برداشت کر گئے کہ ان کے سینے میں نہائے ہوئے جسم خاک پر ترپ چکے۔

میرزا بھارتیہ نے دو سوا حکم دیا۔
 سلطان اس دائرے کے درمیان کچھ حرف ابھر آئے تھے۔ یہ حروف اس نام کو ظاہر کرتے تھے

جو سونے کے سکوں پر کندہ کیا گیا تھا اور یہ نام سلطان علاء الدین خلجی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں لکھا تھا۔ ”اب جاؤ کہ ہم نے تمہیں اپنی غلامی کی سند بخش دی۔ ایسی سند جو سوتے جاتے ہو، محفل میں بیٹھ کر جنگ کے میدان میں اور مندروں میں اس طرح روشن رہے گی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی پکار اٹھیں گے۔“ وہ آ رہے ہیں فاتح عالم سلطان علاء الدین خلجی کے غلام۔

شدت کرب سے راجپوت سپاہیوں کے چہرے سیاہ ہو گئے اور آنکھوں میں نفرتوں کے انگڑے لگے۔

”سلطان! تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔“ کئی سپاہی ایک دم بول پڑے۔ ”ٹلچہ (ٹاپاک) لپو ہے، چاہے بادشاہ کیوں نہ ہو جائے۔ آج تو نے ثابت کر دیا کہ تیرا تعلق کسی پست قبیلے سے ہے راجپوت سپاہی اسیر ہوتے ہوئے گستاخی کی انتہا کو چھوئے لگے تھے۔

ابھی راجہ رتن سنگھ کے فوجیوں کے الفاظ کی سداۓ بازگشت باقی تھی کہ سلطان کے خیمے میں موجود سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ حاجی خواجہ اور تاج الدین عراقی آگے بڑھے علاء الدین خلجی کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں سپہ سالاروں کی نظروں کا ایک ہی مضمون تھا کہ سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہو تو بد کلام سپاہیوں کی گردنیں تن سے جدا کر دی جائیں۔

”نہیں عراقی!..... ہرگز نہیں۔“ سلطان مسکراتے ہوئے بولا: ”گلست خوردہ لوگوں کے گالیاں دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ایک فاتح قوم کو دشمن کے غلیظ کلمات سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ یہ حقیر الفاظ خود ان کی پستی اور بے کسی کی دلیل ہوتے ہیں۔ بے شک! تمہاری شمشیر کا ایک ہی وار ہمیشہ کیلئے خاموش کر دے گا مگر ان کی موت کے بعد ہماری لذت و آسودگی کے مناظر بھی ختم ہو جائیں اور ہم نہیں چاہتے کہ یہ نشاط اور تماشا اتنی جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے۔“ خواجہ اپنی شمشیر کے قدر کرو۔ اس کی کاٹ کو کہیں اور آزما یا جائے گا۔“ اپنے سپہ سالاروں کے مشتعل جذبات کو روکنے کے بعد علاء الدین خلجی قیدی سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

”میرے نسب نامے کی تفصیل اور قبیلے کی پہچان تمہارے ماتحتوں پر لکھ دی گئی ہے۔ یہ خبر اب فرشتہ اجل کے خوبی یا ہمت ہی مٹا سکتے ہیں۔ جاؤ! ہم نے تمہیں ایک لعنت زدہ زندگی بخش دی۔ حکمران کو ہماری یہ روشن نشانی دکھا دو اور اس سے کہہ دو کہ ہم نے اپنی یہ مہر چند انسانوں کے بلے گوشت اور چھلی ہوئی کھال پر نہیں۔ چوڑکی پیشانی پر ثبت کی ہے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین خلجی پھر لیا اور اس کے جاں نثار فوجی راجپوت سپاہیوں کو بھیڑ بکریوں کے روپوں کی طرح ہاتھتے ہوئے بچے لے گئے۔

☆ ☆ ☆

جب وہ سپاہی اپنی جلی ہوئی پیشانیاں لے کر راجہ رتن سنگھ کے سامنے حاضر ہوئے تو چوڑا کاہ بادلوں کی طرح گر بنے لگا۔ ”میرے پاس آنے سے تو بہتر تھا کہ تم دریاۓ جمہیری کے پانی میں ہو جاتے۔ پھر مردہ خود چھلیاں اور بھوکے مگر مجھ تمہارا گوشت کھا جاتے۔ میری آنکھیں اپنی رسوائی کا یہ منظر تو نہ دیکھتیں اور چوہانوں کا قبیلہ اپنے ہی فرزندوں کے اس شرناک فعل پر ہلکا ہونے لگتا۔ زندگی کی ہوس نے تمہارے دلوں سے غیرت کا ایک ایک جذبہ جھین لیا ہے اور گرم خون کی بوند نچوڑ لی ہے۔ تم اچھوتوں سے بھی بدتر حال میں جینا چاہتے ہو۔“ رتن سنگھ کے بچے سے فرقت کی آگ برس رہی تھی۔

”سراٹ! ہمیں ایسی غلیظ گالیاں نہ دیں کہ ہم بھی آپ کے قبیلے سے جدا نہیں ہیں۔“ تمام سپاہی ”سراٹ! سلطان کے خیمے سے نکل کر ہمیں بھی غرق دریا ہونے کا خیال آیا تھا مگر اس طرح تو بکثرت چلے گئے۔“ سلطان کے ایک اور افسانہ ہمارے ناموں کے ساتھ منسوب ہو جاتا۔ کہنے والے کہتے کہ ہم راجہ رتن سنگھ کی طرح پانی میں ڈوب مرے۔ تاریخ چوڑا ہم سے مطالبہ کرتی کہ ہمارے جسم راجپوت مردوں کی طرح پانی میں ڈوب کر داریوں کی آگ میں کیوں نہیں جلے؟ ہم نے اپنی دھرتی اور اتھاس ہونٹوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر داریوں پر ناکامیوں کے داغ سجا کر چلے آئے۔ ہم اس وقت تک (مذبح) کی اسی آواز کو سنا اور اپنے ماتحتوں کی پیشانی پر آپ کی غلامی کی مہر روشن نہ کر دیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ہمارا تاج ہے جس پر جب تک سلطان کی پیشانی پر آپ کی غلامی کی مہر روشن نہ کر دیں۔ پھر جب یہ حساب برابر ہو جائے گا تو ہم دشمن کے اتنے ہی سپاہیوں کے ماتھے آپ کے سامنے جھکا دیں۔ پھر جب یہ حساب برابر ہو جائے گا تو ہم بت درد چلے جائیں گے۔ اتنی دور کہ کوئی بھی آنکھ ہماری رسوائیوں کے ان داغوں کو نہ دیکھ سکے گی۔“

دُخوردہ سپاہیوں کے سینے میں اذیت و کرب کی وہ سوزش تھی کہ ان کے دل پکھلنے لگے اور آنکھیں آنسوؤں سے مگر نکلیں۔

”خوشد ہے، فرار ہے، عیاری ہے اور جھوٹ ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے اپنے مجبور سپاہیوں کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ”بزدل گلست خوردہ لوگ ایسے ہی ہمارے تراشتے ہیں۔ ہری سنگھ! ان سب کو اسی وقت قتل کر ڈالو۔ میدان میں پیٹھ دکھانے والوں کی یہی سزا ہوتی ہے۔“ رتن سنگھ نے سپہ سالار ہری سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا بے رحمانہ فیصلہ سنا ڈالا۔ ایسا فیصلہ جو ذہن کے اشتیاق اور جذلوں کے اشتعال سے مجبور ہو کر کیا گیا تھا۔

ہری سنگھ شدید حیرت کے عالم میں اپنے حکمران کی طرف سوائیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ا! ہری سنگھ! ان کا قتل لازم ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار کے حیرت و سکوت کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”آزاد لوگوں کی صفوں میں غلاموں کے اس سزا یافتہ گردہ کو شامل نہیں کیا جائے۔ ان کی فروخت شدہ پیشانیاں دیکھ کر ہمارے بہادر سپاہیوں میں مایوسی اور بدولی پھیلے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ گلست و زینت کی یہ دیوانی بیماری ہمارے بے داغ لشکروں کو متاثر کرے۔“

ہری سنگھ جیسے شجاع اور ہوشمند سپہ سالار کیلئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ وہ گہرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اتھلی بے باکی کے ساتھ کہنے لگا۔ ”سراٹ! آپ کو اپنے جاں نثاروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر یہ آپ سے مخلص نہیں ہوتے تو سلطان سے معافی مانگ کر زندگی کے محفوظ ساتبان میں چلے جاتے۔ ان کی راج محل میں واپسی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ موت کے سامنے جینا چاہتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ انہیں اپنے لفظوں کی سچائی ثابت کرنے کیلئے ایک ایک اور موقع دیا جائے۔ میرے نزدیک یہ بھونٹے ہیں اور نہ فریب کار۔“ ان پر جو قیمت ٹوٹی ہے اس کا اندازہ راج محل کے ایک گوشے میں جھک کر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر وہ حادثہ ارادہ اور آہو کی چوٹیوں کو پیش کیا تو شاید کئی مضبوط چٹانیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ میں سراٹ سے التجا کرتا ہوں کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔“

راجہ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار کے اس انداز گفتگو کو برداشت نہ کر سکی۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ راج محل میں (خت شامی) پر بیٹھنے والا شخص احمقانہ فیصلے نہیں کرتا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک فیصلہ راج محل اور آہو کی چوٹیوں سے زیادہ ختم و آہل ہوتا ہے۔“

راجہ رتن سنگھ کی طاقت کو بھی تسلیم کرتا ہوں اور سراٹ کی عظمتوں کو بھی..... مگر

ایک سپہ سالار کی حیثیت سے میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ راج دربار کے زاویہ نظر سے مختلف ہے۔ ”ہری سنگھ نے بادقار لہجے میں اس مغرور عورت کو جواب دیا جس نے چوڑی سیاحت کی بات کہی۔
”پھر تمہیں بھی اپنی بیانی کی اصلاح کرنی ہوگی اور ایک ایک زاویہ نظر کو ہماری نگاہوں کا پابند ہوگا۔“

بڑا سخت مرحلہ تھا لیکن ہری سنگھ اس دشوار ترین منزل سے بڑے مہر و ضبط کے ساتھ گزر گیا۔ مخصوص رفتار سے آگے بڑھا۔ پہلے اس نے سر سے اپنی سرخ و ستار اتار کر راجد رتن سنگھ کے قدموں پر رکھ دی۔ پھر شمشیر کھولی اور اسے بھی سر اسٹ کے پیروں پر رکھ کر کہنے لگا۔ ”مجھے جوعاز بننا گیا تھا میری نہایت اذیت و کرب کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر ہری سنگھ سیدھا ہوا۔ اس نے رانی پتی پر ایک اچھتی ہوئی سی نظر ڈالی اور رتن سنگھ کی آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا۔ ”سر اسٹ! آج آپ کی نگاہ کرم نے مجھے ریاست میں اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا تھا ورنہ میں اس عمدہ و منصب کے قائل نہ تھا۔ میری اس گستاخی کا یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ آزمائش کے وقت میں نے دار و وطن سے منہ پھیر لیا۔ آج بھی وہی ہری سنگھ ہوں، چوڑی کی سلامتی کیلئے جان قربان کر دینے والا ہری سنگھ! اگر بار میری حیثیت کی سپاہی کی سی ہوگی جو اپنے نئے سپہ سالار کے ایک اشارے پر نذرانہ جاں پیش کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہے گا۔“

ہری سنگھ کے اس اچانک فیصلے سے راجد رتن سنگھ اور رانی پتی منہ می کو سکتے سا ہو گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں تھے کہ ان کا سینا پتی اس طرح سرکشی پر اتر آئے گا۔ ”کیا تمہاری اس حرکت کو بغاوت کا منہم و جائے؟“ رانی پتی نے سیاسی معاملات میں ایک بار پھر مداخلت کی۔

”سر اسٹ! اپنے فوجی نظام سے بخوبی واقف ہیں۔“ ہری سنگھ نے اپنے عہدے سے دستبرداری کا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی نظروں سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ سلطان کے سامنے ہماری افواہ قلت تعداد کا شکار ہیں۔ آٹھ بے مثال سپاہی جاو و گرنی بھان متی کی جھینٹ چٹھ گئے۔ ایک سپاہی کو سر اسٹ نے جھوٹا قرار دے کر تہ تیغ کر دیا۔ حالانکہ وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اب سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد اس جرم پر قربانی کی جا رہی ہے کہ وہ دریائے گبیہری میں غرق آب کیوں نہیں ہوئے؟ اگر اس طرح چوڑے کے رکھوالوں کی قربانی کا سلسلہ جاری رہا تو میدان جنگ میں دشمنوں سے کون نبرد آزما ہوگا؟ آپ کے اقتدار اور وطن کے وقار کیلئے جان لٹا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ کسی مقصد کے بغیر ناکہ ہار میں مارے جا رہے ہیں۔ میں اپنے سرفروخوں کی یہ بربادی نہیں دیکھ سکتا۔ بے شک! میں آپ کی بلا کا ایک مرہ ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی امیر لشکر بھی۔ اور ایک فرض شناس امیر کسی معمولی سپاہی کو بے مقصد موت کے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔ ہمارے جذبے لاکھ و اڑھتہ سہی اور ہمارا خون کتنا گرم و گرم دشمن سے مقابلے کے وقت دماغ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے دل میں ایسے ہی لور و مار بچھے جا رہے ہیں۔ سر اسٹ! میں نے تمام قوموں کی تاریخ پڑھی ہے۔ جس قوم کے دل میں جانیوں کی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہتی۔“ یہ کہہ کر ہری سنگھ چند لمحوں تک راجد رتن سنگھ اور رانی پتی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر نہایت پر جوش لہجے میں بولا۔ ”اب ایک سپاہی کی حیثیت سے مجھے حکم دیجئے کہ گبیہری اور بڑیچ کے پانی میں کود کر جان دے دوں یا اکیلا سلطان کے لشکر میں تھس کر اس زندگی کو چھوڑ دوں جس کا حساب مجھ سے بار بار طلب کیا جا رہا ہے۔“ سینا پتی ہری سنگھ کا ایک ایک لفظ مود

میں مل رہا تھا۔ اور رانی پتی منہ می اپنے سپہ سالار کی ہوشمندانہ تقریر سن کر خاموش بیٹھ رہے۔ راجد رتن سنگھ اور رانی پتی کے ہونٹوں پر مہر سکوت دیکھ کر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ ایک عین غصہ میں ہمارے محترم برہمن اور پجاری بھی خاموش نہ رہیں انہیں چاہئے کہ وہ اپنے ہونٹوں کی بالائیں چھوڑ کر تلواریں سنبھال لیں۔ اگر مندروں کی گھنٹیاں بجانے کا عمل عبادت کا درجہ رکھتا ہے تو دشمن سے مقابلے کے وقت تلواروں کی کھنگ بھی پوجا کا روپ دھار لیتی ہے۔ سرخ اور زرد رنگوں کا انھوں پر لگائی جانے والی چھاپ اور تنگ میں انسان کا اپنا گوشا مل ہو تو وہ دیوتاؤں کے نزدیک پسندیدہ ہوتا ہے۔“ آج ہری سنگھ نے زندگی کا ایک ایسا از بیان کر دیا تھا جس سے راجد رتن سنگھ اور پتی منہ می تو کیا، چوڑے کے بڑے اہل دانش بھی بے خبر تھے۔

ریاست کے حکمران چونک اٹھے۔ ”آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو ہری سنگھ؟“ ”سر اسٹ! امیری اور آپ کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گستاخی معاف! میں چوڑے کے ایک ایک نرک پانی بنا چاہتا ہوں اور آپ اپنے شاہانہ جذبوں کی تسکین کیلئے تجربہ کار سپاہیوں کو بھی مقتول یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔“ ہری سنگھ نے بڑی جرات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”میری خواہش ہے کہ ہزاروں برہمن اور پجاری جو مندروں میں سوئے چاندی کی مسندوں پر بیٹھے ہوئے، ہجوم ہجوم کے بھگون کی لیلیا کے بھجن سنارے ہیں، جنہیں لوگوں کے سر اپنے قدموں میں بچائے، آئینہ راد کیلئے ہاتھ بلند کرنے اور پیکر اراج اور غلام کی بالائیں چھنے سے فرصت نہیں ملتی، انہیں بھی مندروں سے باہر لاکر آداب جنگ سکھائے جائیں۔ اس کی حالت میں مرلی کی تائیں کانوں کو بہت بھلی لگتی ہیں مگر جب دشمن ہمارے گھروں پر دستک دینے لگتا ہے تو پھر یہی مسکور کن ساز ہمیں موت کی گہری نیند ملا دیتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان سوئے والوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیجئے کہ اب بڑے کے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ سلطان کی فوجیں بے اندازہ ہیں۔ اور اس کی طاقت بے پناہ ہے۔ اس کو بڑے قرار رکھنے اور چوڑے کا دفاع کرنے کیلئے ہمیں چوڑے کے ہر پاسے کے ہاتھ میں تلوار دینا ہوگی۔ یہاں تک کہ شوروں (اچھوتوں) کو بھی کچھ دن کیلئے سپاہی بنانا ہوگا۔ پھر یہ ممکن ہے کہ ہم سلطان کے غر جوار کا مقابلہ کر سکیں اور سکون و عافیت کے ساتھ اپنی زندگی کے خواب دیکھ سکیں۔“

”اگر تمہارے پیش کردہ منصوبوں پر عملدرآمد نہ ہو سکا؟“ راجد رتن سنگھ نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے تھکی ہوئی سیاری سے سوال کیا تاکہ ہری سنگھ مکمل طور پر اس کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔

”توہم ہم اپنی آزادی پر رقرار نہیں رکھ سکیں گے۔“ ہری سنگھ نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ”سر اسٹ! آپ قوم کی حالت نہیں دیکھ رہے ہیں؟ ہر طرف چوڑے، خطرناک اور مخفی کی لہا میں بھی ہوئی ہیں۔ موت کے سائے ارواں اور آہو کی چوٹیوں سے اتر کر میدانوں میں پھیلنے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو ہڈیاں کیل رہے ہیں۔ جوئے میں مال و دولت بھی ہار رہے ہیں اور اپنی بیویوں کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔ شراب، بھنگ اور مدک کا استعمال عام ہے۔ ان کی مدوشیوں کا یہ حال ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے ہاتھ میں کسی خوبصورت راقصہ کا ریشمی آپٹل۔ کیا یہ زندہ رہنے کی علامات ہیں؟ ہمیں سر اسٹ! ایسی غیر فوسے دار اور بے خبر قوم زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔“ جوش

مکمل ہو گیا۔ ہری سنگھ کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

مکمل ہو گیا۔ ہری سنگھ کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

مکمل ہو گیا۔ ہری سنگھ کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

رتن سنگھ، رانی پدمینی، مہمانتزی گیش سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار آئینے میں اپنی صورتیں دیکھ کر گئے پھر اسی خوف نے مینا پتی ہری سنگھ سے اس کے سارے اختیارات چھین لئے..... اور وہ سرفروژ سپہ سالار راج محل کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

علاء الدین خلجی بڑے عجیب فیصلے کر رہا تھا۔ ملک ظفر خان، خواجہ حاجی، ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی جیسے جہاندیدہ سپہ سالار خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان میں اتنی جرات تھی کہ وہ اپنے فرمانروا کو کوئی مشورہ دے سکیں۔ اپنی زندگی کے سب سے خوفناک محاذ پر ان کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں تھی۔ علاء الدین کے جاں نثاروں نے یہ منظر بھی بڑی حیرت سے دیکھا کہ سلطان خود دریائے گنجپری کے کنارے پہنچا اور صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران علاء الدین کو دریا میں کشتیاں نظر آئیں جنہیں ملاح چلا رہے تھے۔ کشتیاں بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں اس لئے ملاحوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر پھر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کشتیوں میں ایک سے زیادہ افراد موجود ہیں۔ سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر ملاحوں کو واپس بلائیں۔ علاء الدین کا حکم سن ہی چند شہسوار دریا کے کنارے آگے بڑھے اور پھر ملاحوں کو تیز آواز میں پکارنے لگے۔ ملاحوں نے سمجھا کہ راجہ رتن سنگھ کے سپاہی انہیں کسی کام سے طلب کر رہے ہیں اس لئے وہ فوراً ہی کشتیوں میں کھڑے ہو کر کنارے کی طرف لوٹنے لگے۔ قریب آنے کے بعد ملاحوں نے ان سپاہیوں کو دیکھا جن کے ہرے اور لباس راجپوت فوجیوں سے مختلف تھے۔ سلطان کے سپاہیوں نے کشتیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں کچھ دیہاتی سوار تھے جو اپنے ظاہری حیلے سے غربت و افلاس کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ملاحوں نے کچھ اشاروں میں اور کچھ شکستہ زبان میں بتایا کہ وہ نسلی طور پر ملاح ہیں اور بستی کے لوگوں کو دریا پار کرانے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب ان ملاحوں پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے سپاہیوں کا تعلق چوڑے سے نہیں تو وہ دہشت و خوف سے لرزنے لگے اور ان کی کشتیاں پانی میں ڈولنے لگیں۔ پلٹا انہیں ولاس دے کر اس مقام تک لائے جہاں سلطان علاء الدین خلجی ان کا منتظر تھا۔ ملاحوں کے ہاتھ قابو میں تھے اور نہ چٹوڑ..... مگر کسی نہ کسی طرح کشتیوں کو کھینچے ہوئے کنارے تک لے آئے پھر جب ملاحوں اور دیہاتی باشندوں کی نظر سلطان کے سرخ و سفید چہرے پر پڑی تو ان کی کشتیاں الٹ گئی اور پھر وہ پانی میں تھیکے ہوئے دریائے باہر آئے۔ اور سلطان کے قدموں پر لوٹنے لگے۔

علاء الدین نے نہایت کر ملک ظفر خان، خواجہ حاجی، ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ جیسے وہ اپنے سپہ سالاروں سے کہہ رہا ہو کہ تم نے ہمارا اقبال دیکھا اور جادو جلال کا نظارہ کیا۔ چاروں سپہ سالاروں نے گردنیں خم کر لیں اور جھکی ہوئی نگاہوں سے سلطان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

علاء الدین نے ہاتھ کے اشارے سے ملاحوں اور دیہاتیوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ چوڑی پانی بستی کے رہنے والے کھڑے تو ہو گئے مگر ان کی سیاہ اور پتلی پتلی ٹانگیں سوکھے ہوئے جسموں کا جو جھلنے سے انکار کر رہی تھیں۔ وہ بار بار اٹھتے اور زمین پر گر جاتے تھے ان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور انگوٹیاں پتلیاں موت کے خوف سے کانپ رہی تھیں۔

”اے چوڑی ناتواں مخلوق! ہم نے تجھ پر زندگی کے دروازے کھول دیئے۔ ہمیں اپنا تاج و تہنہ اور چین کی سانس لے کے تیرے سر پر صدیوں سے چھائی رہنے والی مصیبت کی گھاؤں کو ہمارے ہاتھوں سے

ہٹا کر لئے تھیں۔“
پانی کی اس یقین دہانی کے بعد وہ حقیر و کمزور لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکے۔ پھر سلطان کے حکم پر ملاحوں نے بتایا کہ ان کے بین بچیس خاندان بستی میں آباد ہیں اور اتنی ہی کشتیاں موجود ہیں جتنے کے ذریعے انہیں روزی حاصل ہوتی ہے۔ ملاحوں کی روداد سننے کے بعد سلطان نے اپنے مالداروں کو حکم دیا کہ وہ ان غریب لوگوں میں اتنا سونا تقسیم کر دیں کہ وہ کئی سال تک سکون کی زندگی رکھیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرا حکم دیا کہ تمام کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔ بڑا عجیب حکم۔

ملک ظفر خان اور خواجہ حاجی نے حیران ہو کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھا۔
”ظفر خان! یہ ہمارا داغی خلل نہیں کہ ہم کشتیاں ڈبو کر دریا کے پار اترنا چاہتے ہیں۔ شاید کم ہمت ہمارا جنوں سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی بھی انداز سے دشمن کا احسان لینا نہیں چاہتے۔ ہم رتن سنگھ کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہمارے سبک رفتار گھوڑوں نے اس کے دریاؤں کے سینے چیر ڈالے اور طرح پر اتر گئے کہ انہیں کسی کشتی کا سہارا حاصل نہیں تھا۔“

سپہ سالاروں کے سر تک بار پھر جھک گئے۔ وہ جانتے تھے کہ سلطان کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔ ملاح اور دوسرے دیہاتی سونے کے ٹکڑے لے کر بہت خوش تھے مگر اچانک ایک خیال ان کے ہونٹوں پر ابھر اوروہ اداس نظر آنے لگے۔ ایک ملاح نے آگے بڑھ کر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا زگڑا لگا۔ ”ان داتا! آپ کا دان (بخشش) ہم غریبوں کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے مگر ہم سونے کو لے کر کہاں جائیں گے؟ اس کی قیمت کون ادا کرے گا؟ اور جب دریا کے پار جانے کے بعد ہمیں جہاں گئے تو ہم ہاٹ (بازار) سے کس طرح تاج اور دالیں خریدیں گے؟ ہم تو مرجائیں گے۔“ ملاح رونے لگا۔

”ہم جانتے ہیں، خوب جانتے ہیں۔“ سلطان نے اپنے پیروں کو جنبش دی۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ ملاح بڑا ہو جائے۔ ”ہم نے تمہیں یہ سونا اس لئے نہیں دیا کہ تم اس سے تاج اور دالیں خریدو۔ یہ تو ایک اچھا خوشنماہی انبیاء کا عایا کو دیتے ہیں۔ تم رتن سنگھ کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہو۔ ہمارے قدم جس زمین نے ہمیں ہمارا ملکیت ہو جاتی ہے۔ اب تمہاری کفالت اور پرورش کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ آج کے بعد سے تم اپنی زندگی کا کاروبار جاری نہ رکھ سکو گے۔ ہم نے یہ راستے تم کے سپاہیوں پر بند کئے ہیں۔ غریب رعایا کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ جب تمہیں مسئلہ تو اپنی بستی کے سارے لوگوں کو لے کر ہمارے خیموں میں چلے آنا۔ خدائے ذوالجلال تمہارا حق دیا ہے کہ ہم تقسیم کرتے کرتے تھکے جاتے ہیں مگر وہ ختم نہیں ہوتا۔ تم جب بھی آؤ گے تو ہمارے غم کے ہاتھوں کو تاج سے بھر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ تمہارے دامن تنگ ہو جائیں گے۔“
”خیموں میں کوئی کی واقع نہیں ہوگی۔ یہ سونا ہم نے تمہیں بڑے دنوں سے بچانے کے لئے عتقریب ان دریاؤں میں ایک خونی سیلاب آنے والا ہے۔ ایسے گراں وقت میں یہ سونا تمہارے کسی کام نہیں آتیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ رتن سنگھ کی معصوم رعایا ہماری وجہ سے بھوکے پیاسے ہو جائیں۔ پھر تمہاری نا آسودہ اور ترسی ہوئی زندگیاں کیوں موت کی خوراک بن جائیں گی؟“
”اور پھر جس دن تم نئی کشتیاں پانی میں اتارو تو ہمیں یاد کر لینا کہ ہم نے تمہاری عقلتوں کے راگ سنا کر کیا صاحب دل شہنشاہ ہماں آیا تھا۔“

ملاح اور بہتی کے دوسرے لوگ سلطان کو دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے اور ساری کشتیاں گہیری میں غرق کر دی گئیں۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سلطان نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا اور پاراڑ کر کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد بھی دریائے گہیری کو عبور کر گئی۔ جس جگہ سے دریا عبور کیا تھا وہاں پاٹ بہت چوڑا تھا۔ یہ علاء الدین کی عادت تھی کہ وہ اپنے اور دشوار گزار راستوں کا انتخاب کرتا تھا۔ دریا کو پار کرتے وقت صرف امیر خسرو اور چاروں ہم اس کے ہمراہ تھے۔ باقی لشکر اس جگہ سے گزر رہا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ گہیری میں بعض پر پانی اتنا کم تھا کہ بس گھوڑوں کے سم ہی بھیک سکتے تھے۔ سلطان نے اسی راستے کو سپاہیوں پر گزر گاہ بنانے کا حکم دیا۔ فوجیوں کی ایک مخصوص تعداد خشکی میں متعین کر دی گئی۔ احتیاط کے طور کا ایک بل بھی تعمیر کر دیا گیا جس کے سہارے دریائے گہیری کو آسانی کے ساتھ عبور کیا جاسکتا تھا۔ کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ اس نے چوڑے کسی علاقے کو اپنے سپاہیوں کی موجودگی سے خالی نہ تھا۔ سامان رسد کا یہ حال تھا کہ دہلی سے چوڑے مضافات تک گھوڑوں اور اونٹوں کی ایک طویل جس کا سلسلہ ایک دن کیلئے بھی منقطع نہیں ہوتا تھا۔ علاء الدین نے جاسوسی کے نظام کو اس طریق پر تھا کہ اسے دہلی کی خبریں مسلسل مل رہی تھیں۔ اس طرح دارالحکومت سے دور ہوتے ہوئے بھی پایہ تخت کے قریب تھا۔

☆ ☆ ☆

چندر سنگھ ظلم کدے سے نکلنے کے بعد چوڑے کے مختلف مندروں میں مارا مارا بھر رہا تھا۔ آہ سادھوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا جو نشے کے عادی تھے۔ چندر سنگھ کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی سادھو اس کو اس کھودے گا اور پھر بے خودی کی حالت میں اس کی زبان وہ اہم راز فاش کر دے گی جسے جاہ چندر سنگھ نے اپنی زندگی خطرات کے حوالے کر دی تھی۔ وکرم سنگھ کا یہ وفادار خادم کئی دن تک بڑے اور دمک پینے والے سادھوؤں کی محفلوں میں شریک رہا۔ نشے میں غرق ہو کر ان جوگیوں نے بڑے دعوے کئے کہ راجہ رتن سنگھ، سلطان کی فوجوں کو چوینٹوں کے لشکر کی طرح مسل دے گا، ہمارا اپنی روحانی طاقتوں سے مسلمانوں پر دردناک عذاب نازل کر دیں گے اور نئے مہمانی جیٹ سیاست چوڑے کو ناقابل تخییر بنا دے گی۔ چندر سنگھ نے مہمانی کا نام سن کر چو کاٹھا۔ پھر اس بدست سادھوؤں کو کریدنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بے خبر وکرم سنگھ کے انجام کے بارے میں بتا سکے۔ چندر سنگھ یاموس ہو گیا اور کنیش سنگھ کے مہمانی بن جانے کی اطلاع نے اسے اندیشوں کر دیا تھا۔ یہ سیاسی انقلاب ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وکرم سنگھ اس دنیا میں موجود نہ ہو۔ چندر سنگھ نے اپنے ذہن کو ان پریشان خیالات سے آزاد کیا اور پھر کئی دن بعد آدمی رات کے وقت منی بے جلے ہوئے کھنڈر سے گزر کر ظلم کدے میں داخل ہوا۔

”چندر سنگھ! میرے پتاجی کیسے ہیں؟“ نرملہ کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرے پر افسوس ڈوبے ہوئے کئی رنگ ابھر آئے تھے۔

چندر سنگھ نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی اس نے جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور گفتہ بتائے لگا۔

”مہمانی بالکل محفوظ ہیں مگر انہیں عارضی طور پر نظر بند کر دیا گیا ہے۔“ چندر سنگھ نے اپنے

پہاں مہار کے پیش کیا تھا لیکن نرملہ کی آنکھوں نے پس پردہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

چندر سنگھ نے اپنی آقا زادی کو یقین دلانے کیلئے کئی بار قسمیں کھائیں کہ اسے مہمانی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے مگر نرملہ نے اس کی ہر قسم کو جھٹلادیا۔ ”وہ میرے باپ ہیں۔ ان کے جسم پر جتنی زخمیں آئیں گی، وہ سب میرے دل کے زخم بن جائیں گی۔ چندر سنگھ! کسی کو کیا معلوم کہ میرے دل پر زخم نہیں۔ ان زخموں کو شکار کرتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ میرے باپ کو کیسے کیسے آزار پہنچائے گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر نرملہ کھڑی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچی اور اس نے پورا کاہلایا۔ خادمہ رامیشوری نے آگے بڑھ کر سہارا دینے کی کوشش کی مگر نرملہ نے اس کا ہاتھ جھٹک لیا۔

بہت دیر تک درد دیوار پر سکوت مرگ طاری رہا۔ چندر سنگھ مسلسل روتا رہا اور آفریدی کی آنکھیں بھی ٹپک رہیں۔ آخر طویل خاموشی کے بعد چندر سنگھ نے علاء الدین خلجی کے لشکر کی آمد سے لے کر کنیش سنگھ کے مہمانی بن جانے تک ساری روداد سناتے ہوئے کہا۔ ”آپ راج کھاری کو حوصلہ دیں کہ میں بلائیں اس طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ مہمانی اس بلا میں نہیں رہے۔ کنیش سنگھ کا وزیر اعظم ہو جانا کسی خوفناک حادثے کی خبر دیتا ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر میرے آقا کسی کے تشدد کا شکار ہو گئے تو ان کے خون کا حساب مجھ پر قرض ہے۔ اب میں اسی تعداد میں آؤں گا جب یہ قرض ادا ہو جائے گا۔ واپس نہ آؤں تو آپ اور راج کھاری مجھے معاف کر دیں۔ ایک غلام تھا جو اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھانے ہوئے چلا گیا۔“

آفریدی نے چندر سنگھ کو روکنا چاہا مگر وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا ظلم کدے سے اٹھا اور جبکہ منی بھون کے درمیان سے گزر رہا تھا تو اس پر ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی۔ منی بھون کے لڑنے کے بعد چوڑوں کا ایک گروہ روزانہ رات کے اندھیرے میں یہاں اس خیال سے آتا تھا کہ شاید نرملہ کے ڈھیر میں دبی ہوئی کوئی قیمتی چیز ہاتھ آجائے۔ اتفاق سے اس دن چوڑوں کی وہ ٹوٹی بھی اسی اندھیرے میں داخل ہوئی جب چندر سنگھ واپس جا رہا تھا چوڑوں نے پہچان لئے جانے کے خوف سے نرملہ کو نرملہ کے اٹھنے اور اس راجپوت زادے کو مار ڈالنا جو اپنے آقا کے قاتلوں کی تلاش میں گھر سے باہر نکلنا تاکہ ان کا جانا ٹھیک قدموں کے فاصلے پر، دیوار کے پیچھے زخموں کا کفن پنے لینا ہے۔ نرملہ نے پھر پکار کر کہہ رہی ہے کہ آؤ میرا ماتم کرو اور مجھے اپنے غم خوار ہاتھوں سے زمین کی گہرائیوں میں ڈال دو۔ آواز جلے ہوئے کھنڈر میں گونجتی رہی۔ مگر اس آواز کا سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

نرملہ ہر ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ اور وہ آواز علاء الدین خلجی کی تھی جس کی ہیبت سے

اراولی اور آہو کی چوٹیاں کانپ رہی تھیں۔

علاء الدین دریائے گنہری اور بڑبچ کے درمیان خیمہ زن ہوا۔ پھر اس نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد قلعے کی دوائیں جانب بڑھ رہی تھی اور لشکر کا دوسرا بازو رتن سنگھ کی پناہ گاہ کو آئیں جانب سے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ ہر طرف سری سر تھے۔ بلند اور اونچے ہوئے سر پہنچ چکی ہوئی سرخ دستاریں کسی خوش طوفان کی خبر دے رہی تھیں۔ علاء الدین کے سپاہی مقررہ سمتوں میں بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعہ کا محاصرہ مکمل ہو گیا۔

چوڑے سرحدی سپاہی مارے جا چکے تھے یا پھر انہیں سلطان کے حکم پر ذلیل و رسوا کر کے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ علاء الدین کے سپہ سالاروں ملک ظفر خان، خواجہ عالمی، تاج الدین عراقی اور ملک نصرت خان نے دبے لفظوں میں سلطان کی اس حکمت عملی کو غیر مناسب قرار دینے ہوئے عرض کیا۔

”وہ دشمن جن کی گردنیں ہماری شمشیروں کی زد پر تھیں، انہیں معاف کر کے کہیں ہم نے کوئی غلطی نہیں کی؟“ چاروں سپہ سالار بہت محتاط لمبے لمبے بول رہے تھے۔

”خواجہ! تم سے غلطی ہو سکتی ہے۔ عراقی، تمہارے سوچنے کا انداز غلط ہو سکتا ہے۔ ملک ظفر اور ملک نصرت! تمہارے ذہن پر آئندہ خیالی کا شکار ہو سکتے ہیں مگر تمہارے سلطان سے کبھی کوئی اختلاف نہ مل سوز نہیں ہو سکتا۔“ علاء الدین کے غرور و تکبر کا عجیب عالم تھا۔ سلطنت خلیجی کے جاں نثاروں کو مجبوراً سر جھکا دینا پڑا۔ ”تم لوگ یقیناً یہی سوچتے ہو گے کہ ہم نے اپنے مٹھی بھر دشمنوں کی جان بخش کر کوئی غیر دانشمندانہ حرکت کی ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے فیصلے دیوانوں کے فیصلے نہیں ہوتے۔ ہم نے رتن سنگھ کے سپاہیوں کو اس لئے واپس بھیجا ہے کہ جب وہ زخمی حالت میں اپنے حکمران کے سامنے پہنچیں گے تو دوسرے سپاہیوں کے دلوں میں ہماری ہیبت قائم ہو جائے گی۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ ہمارا جنگ لڑنے کا انداز کس قدر بے نیازانہ ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں دشمنوں کے جسموں پر قابو پالیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں انہیں آزاد کر دیتے ہیں۔ جنگ ہمارے لئے کھیل ہے اور ہم اس کھیل پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ہماری یہی ادائیک روزانہ پہاڑی چوہوں کو ان کے سوراخوں میں منہ چھپا کر مرنے پر مجبور کر دے گا۔ وہ زیادہ دیر اپنی پناہ گاہوں میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے جلال و جبروت سے ان کا دم گھب جائے گا۔ وہ گھبرا گھبرا کر اپنے سوراخوں سے باہر نکل آئیں گے اور پھر ہمارے قدموں سے سر کرکرائی جان دیں گے۔“

بالآخر ایسا ہی ہوا۔ جب زخمی سپاہیوں کا دوسرا دستہ قلعے میں پہنچا تو راجہ رتن سنگھ کے ہوش و حواس اڑ گئے اس نے فوری طور پر ایک خفیہ اجلاس طلب کیا جس میں رانی بدھمی اور مہامنتی گنیش سنگھ کے ساتھ ساتھ تمام راجپوت سردار شریک تھے۔ رتن سنگھ کا حقیقی بھانجا سوگند مال دیو سنگھ بھی اگلی قطار میں موجود تھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ کی نظر بند کی کوئی دن گزر چکے تھے اور اس کی جگہ اجیت سنگھ چوڑی فوجوں کی قیادت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اجیت سنگھ نے آج تک کسی جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا مگر ان خوشامداندہ غادروں کے سبب ہمیشہ راجہ رتن سنگھ کے قریب رہتا تھا۔ ہری سنگھ پر عتاب آتا تھا۔ سپہ سالاری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا مگر اس تبدیلی کو فوج کی اکثریت نے ناپسندیدہ عمل قرار دیا تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو مہامنتی گنیش سنگھ نے اس خوفناک حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ ان کے آزادوں کو دہلی کے سلطان نے اپنے حصار میں لے لیا ہے اور چوڑی شہی بستی دشمنوں کے زرخیزے میں اس طرح

مکمل کر کے قلعے سے اس کا کوئی رابطہ برقرار نہیں رہ سکا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ بستی میں رہنے والوں پر کیا اثر ہے؟ راجپوت نوجوان زندہ ہیں یا موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے؟ کوئی نہیں جانتا کہ بوڑھے اور بچے کس حال میں ہیں؟ اور کسی کو یہ بھی خبر نہیں کہ حیدار دو شیرازوں اور غیرت مند عورتوں کے ساتھ سلطان کے سپاہیوں نے کیا سلوک کیا؟ مہامنتی گنیش سنگھ راج محل کے ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے چوڑی بستی کی زخمی چٹائی کا نقشہ اس طرح کھینچ رہا تھا جیسے علاء الدین کے ظلم و تشدد کو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا

مہامنتی کا بیان سن کر دربار میں بیٹھے ہوئے تمام راجپوت سرداروں کے جسم جلنے لگے اور ان کے چہروں پر بھی نفرتوں کی آگ روشن ہو گئی۔ ”اگر سلطان کے لشکروں کی یلغار کا یہی حال رہا تو ایک دن ہماری زندگی اور آبرو بھی غیر محفوظ ہو جائے گی۔“ راجپوت سردار کرشن سنگھ نے اپنی نشست پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”مہامنتی گنیش سنگھ جواب دیں کہ بستی کی ایک بڑی آبادی کو اس قدر خاموشی کے ساتھ کیوں محصور کر دیا گیا؟“

راجپوت سردار کا سوال سن کر گنیش سنگھ سراپسی گئی کا شکار نظر آنے لگا اس نے فوراً ہی کسی عیار شاطری طرز پر اپنے چہرے پر سکون اور بے نیازی کی نقاب چڑھائی۔ ”یہ سب کچھ ہماری جنگی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ ہم نے سلطان کو خود موقع فراہم کیا ہے کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر چڑھتا چلا آئے۔ یہاں تک کہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے گا کہ وہ چوڑے گرد و آزارہ جنگ کرتے کرتے خود محصور ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر مہامنتی گنیش سنگھ نے مسکراتے کی مصنوعی کوشش کی تھی کہ اس طرح راجپوت سرداروں کو اس کی باتوں پر یقین آجائے۔

گنیش سنگھ نے انتہائی پر زور لہجے میں جھوٹ بولا تھا مگر سردار کرشن سنگھ اس کی تقریر سے متاثر نہ ہوسکا۔ ”اگر سلطان اسی طرح بڑھتا رہا تو آپ کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ آنے والوں کے قدم ہمارے سروں تک نہیں پہنچیں گے؟“

”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“ مہامنتی گنیش سنگھ نے تیز آواز میں کہا۔ ”امور سلطنت کو ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ ہم اہل چوڑے کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کی جانیں بھی محفوظ ہیں اور جاگیریں بھی۔ سلطان کے ہاتھ کتنے ہی دراز کیوں نہ ہوں مگر اسے چوڑی آبرو سے کھینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”مہامنتی! انہیں یہ رُجوش تقریریں مطمئن نہیں کر سکتیں۔“ راجپوت سردار کرشن سنگھ دوبارہ کھڑا ہوا اور انتہائی تلخ لمبے لمبے گنیش سنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”ہم نے اسی دربار میں مہاراج رام دیو کی بھی تقریریں سنی ہیں۔ مہاراج تو کہا کرتے تھے کہ ان کے گیان کی طاقت سلطان کو دہلی کی حدود سے باہر نہیں نکالے گا مگر آج ہم اپنے گھروں کی دیواروں کے پیچھے اس کے تیز قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔ آخر کیا کیوں ہوا؟ اگر مہاراج کا گیان سچا تھا تو سلطان کے سپاہی چوڑی بستی تک کس طرح آ پہنچے؟“ راجپوت قوم کا مزاج یہ تھا کہ جب وہ لوگ دل کی بات کہنے پر آتے تو ان کی زبانوں پر خاموشی کی مرگ کا ناشکل ہو جاتا۔ کسی مہنتی کا تو ذکر ہی کیا، کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ ایک عام راجپوت سپاہی حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے اپنے حکمران کو کبھی خاطر میں نہ لاتا۔ راجپوتوں کی اسی فطری بیباکی نے انہیں ایک آزاد و سر بلند قوم کی حیثیت سے زندہ رکھا تھا۔ کرشن سنگھ بھی اس خفیہ اجلاس میں اپنی اسی روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلطان کو جنگ میں الجھائے رکھے گا اور باقی فوج قلعہ بند ہو جائے گی۔ فیصلہ پر بہترین ہوا۔ تختین کر دیئے جائیں گے کہ اگر سلطان کے لشکر نشیب سے نکل کر قلعے کی طرف بڑھتا ہے تو ہونے والی تیروں کی بارش دشمن سپاہیوں کے سینے چھید کر انہیں موت کی نیند سلا دے گی۔ سلطان نے اس منصوبہ بندی کے ساتھ سامان رسد کی پہچان کر لی اور قلعہ بند کر دیا۔ ایک جازرے کے مطابق قلعے میں اشیائے ضرورت کا اتنا ذخیرہ موجود تھا جس کے سہارے تین ماہ تک قلعہ بندہ کر بھوک کے خوف سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔ یہ سالار ہری سنگھ اور چھمن سنگھ کی رائے میں اتناج اور دیگر چیزوں کا یہ ذخیرہ جنگ کی شدت کو دیکھتے ہوئے کافی تھا۔ چھمن سنگھ کے بقول یہ ذخیرہ اتنا ہونا چاہئے تھا کہ ایک سال تک قلعہ بند لوگوں کو بھوک اہل تک نہیں آنا چاہئے۔ ہری سنگھ کا کہنا تھا کہ یہ ذخیرہ کم سے کم چھ ماہ تک اہل چوڑی کفالت رکھے۔ معمولی سے انکشاف رائے کے بعد طے ہو گیا کہ سامان رسد کے حصول کی رفتار بڑھا دی جائے۔

ان فیصلوں سے تمام راجپوت سردار مطمئن تھے مگر چانچک ایک سردار بے چین ہو کر اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ ”سر! ہم نے خیالی طور پر منصوبہ مکمل کر لیا مگر اس پر عملدرآمد کس طرح ہوگا؟ سلطان کے لشکر نے دونوں جانب سے قلعے کا محاصرہ کر لیا ہے اور اتناج کے ذخائر تک پہنچنے کیلئے ہمیں بستی میں داخل ہونا پڑے گا۔ سچ میں سلطان کا لشکر حائل ہے پھر یہ درمیانی راستہ کس طرح طے ہوگا؟“ راجپوت سردار نے ایک انتہائی نازک سوال اٹھایا تھا۔

”یہ ہلکی ذمہ داری ہے کہ ہم بستی والوں سے کس طرح رابطہ قائم کریں گے؟“ رتن سنگھ نے بڑاؤ اٹھایا۔

”ہمیں آپ کی دانشمندی پر پورا بھروسہ ہے لیکن یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ریاست کے ذمہ دار افراد نمٹے کی بجائے فیصلے اپنے خول میں بند رہیں۔“ دوسرے راجپوت سردار نے ادب و احترام کے ساتھ کہا وہ اپنے حکمران سے اس کے دعوے کی وضاحت چاہتا تھا۔ ”اس منصوبے کو چوڑے جاں نثاروں پر ظاہر کیا جائے کہ اگر اس طرح کوئی سرکاری رہ جائے تو اسے بروقت پورا کیا جاسکے۔“

راجپوت سنگھ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے ان دونوں خفیہ سرنگوں کا ذکر کیا جو حالت جنگ میں سامان رسد حاصل کرنے کیلئے بنائی گئی تھیں۔ یہ سرنگیں راج محل سے گزرتی ہوئی دریائے گمبھیری اور گمبھیری کے عجیب انداز میں عبور کر جاتی تھیں۔ دونوں سرنگیں اس قدر گہرائی میں بنائی گئی تھیں کہ اگر دریا کے کنارے سے والے اپنی ضرورت کیلئے کئی فٹ نیچے تک مٹی کھودیں تو تب بھی سرنگوں کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ راجپوت سنگھ کے باپ سر سنگھ نے اپنے وقت کے بہترین معماروں کے مشورے سے ان سرنگوں کو چوڑی آخری سرحد تک پہنچا دیا تھا۔ راج محل اور مضافاتی بستیوں کے درمیان دو دریا حائل تھے جن سے معماروں نے اپنے فن کا مظاہرہ اس طرح کیا تھا کہ سرنگوں کو دریائے بونچ اور گمبھیری کے کنارے گزرا تھا جن کی گہرائی بہت زیادہ تھی۔ گرمی کے موسم میں دریاؤں کے بہتر حصے خشک ہوتے تھے مگر جہاں سے سرنگیں گزرتی تھیں۔ وہاں خشک سالی کے دوران بھی پانی خشک نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جو دریاؤں کے بیچ سے گزرتا تھا، اسے مضبوط کر کے کیلئے چھروں سے زیادہ سیسے کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان سرنگوں کا دوسرا دروازہ گمبھیری میں کھلتا تھا۔ دروازے پر ہر وقت پندرہ بیس مسلح جوان کھڑے رہتے تھے۔ یہ جگہ اس قدر محفوظ تھی کہ سایہ دار درختوں اور خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے دن

مہمانبری گنیش سنگھ ایک بار پھر گھبرا سکیا اس کے پاس کرشن سنگھ کی اس بات کا کوئی معقول جواب نہیں تھا کہ سلطان کے لشکر کو باقی آسانی کے ساتھ قلعے کا محاصرہ کیوں کرنے دیا گیا؟ مجبوراً کرشن سنگھ نے سپہ سالار اجیت سنگھ کی طرف دیکھا اس کا خاموش نظروں کا ایک ہی مفہوم تھا کہ اجیت سنگھ اپنے جوابات سے راجپوت سرداروں کو مطمئن کر دے۔

اجیت سنگھ راجپوت سرداروں کی پیشینویں کے بل اور آنکھوں کی چنگاریاں دیکھ چکا تھا مگر کچھ بھی اسے مہمانبری کے اشارے پر کھڑا ہونا پڑا۔

”یہ چال ہماری جنگی سیاست کا ایک حصہ ہے۔“ اجیت سنگھ نے بھی مہمانبری کے الفاظ کی نقل کرنا چاہی مگر راجپوت سرداروں نے اسے اپنی تقریر جاری رکھنے سے روک دیا۔ ”سر! ہم اسے اپنا سپہ سالار تسلیم نہیں کرتے۔“ تمام راجپوت سرداروں نے بیک زبان بلند آواز میں کہا۔ ”جو سپاہی کلباس پہننے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے سپہ سالاری کی دستا پہنا کر ہم جان فروشوں پر بڑی قیمت ڈھائی گئی ہے۔ ہمارے ساتھ اس سے زیادہ ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جاسکتا کہ شہسواروں پر ایک ساربان کو مسلح کر دیا جائے۔ اس سے تو تلوار کا بوجھ بھی نہیں اٹھتا۔ یہ ہمیں کس طرح حکم دے گا اور ہم اس کا حکم کس طرح مانیں گے۔ نہیں سر! یہ تو ہمارے لئے میدان جنگ میں ایک مسئلہ بن جائے گا۔ جب سپاہی اپنے سالار لشکر کو تضحیک آمیز نظروں سے دیکھ لیں تو صفوں میں بڑا انتشار برپا ہو جائے گا۔ سر! اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ آپ ہمیں حکم دیں اور ہم آہو کی بلند ترین چوٹی سے نشیب میں کود کر اپنی جانیں چوڑی نذر کر جائیں۔“ راجپوت سرداروں نے بھرے دربار میں اجیت سنگھ کی نفی کر دی تھی۔

مہمانبری گنیش سنگھ کے اس خوشامد ہمارے نے اپنی صورت کو راجپوت سرداروں کی گفتگو کے آئینے میں دیکھا تو شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔

”پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ راج رتن سنگھ نے اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سنوارنے کیلئے اپنے سرداروں سے دریافت کیا۔

”ہم سپہ سالار ہری سنگھ سے اپنے سوالوں کا جواب چاہتے ہیں۔“ ایک بار پھر رتن سنگھ کا دربار تازہ آوازوں سے گونجنے لگا۔

آخر گنیش سنگھ کی غلیظ اور احمقانہ سیاست کا نام ہو گئی اور راج رتن سنگھ کو مجبوراً اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ایک ہوا جاذبانی منظر تھا جب سپہ سالار ہری سنگھ کو نظر بندی کے کمرے سے نکال کر دربار میں لایا گیا جہاں ہری سنگھ داخل ہوا تمام راجپوت سردار اپنی نشستوں پر احتیاطاً کھڑے ہو گئے۔ چوڑی تاریکی میں ہلا موقع تھا جب کسی سپہ سالار کو ایک حکمران کی طرح اعزاز بخشا گیا تھا۔ ہری سنگھ کی یہ عزت و توقیر دیکھ کر راج رتن سنگھ، رانی پدمی اور گنیش سنگھ کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ہری سنگھ کی تاخیر کے بغیر قتل کر دیتے مگر ان کی ہمتیں دیکھ رہی تھیں کہ دشمن سر پر آپہنچا ہے اور خود راجپوتوں کی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے چوڑے حکمرانوں نے ایک خاص مصلحت کے پیش نظر یہ کچھ برداشت کیا۔

پھر طویل بحث کے بعد جنگی صورت حال کا جائزہ لیا گیا اس دوران ہری سنگھ کی درخواست پر سانی سپہ سالار چھمن سنگھ کو بھی دربار میں طلب کر لیا۔ صبح سے لے کر آدھی رات تک یہ خفیہ اجلاس جاری رہا۔ ریاست کے تمام باہوش لوگوں کے مشوروں سے فیصلہ کیا گیا کہ فوج کا ایک مختصر حصہ قلعے کے باہر منتقل

میں بھی اندھیرا چھا رہا تھا اناج سے بھری ہوئی تیل گاڑیاں پر بیچ راستوں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ میں غائب ہو جاتی تھیں اور پھر مسلح سپاہیوں کی اجازت کے بعد انہیں سرنگوں میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ سرنگیں اتنی چوڑی تھیں کہ ان کے درمیان سے ایک تیل گاڑی بہ آسانی گزر سکتی تھی تیل گاڑیاں اس وقت تک اپنا سفر جاری رکھتیں جب تک سرنگ کا راستہ زمین کی سطح کے برابر رہتا اور پھر جیسے ہی قلعے کی طرف شروع ہو جاتی تیل گاڑیاں رک جاتی اور ان پر لدھا ہوا سامان مزدوروں کے ذریعے اتار لیا جاتا۔ اس کے بعد سیکڑوں مزدور اشیائے ضرورت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر راج محل پہنچاتے۔ اس طرح چوڑے باشندوں کو خبر تک نہ ہوتی اور انتہائی رازداری کے ساتھ اناج کے ذخائر میں اضافہ ہوتا رہتا۔

جب راجہ رتن سنگھ نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی سرنگوں کی تفصیلات بیان کیں تو تمام راجپوت سردار یک دیر کیلئے حیرت زدہ رہ گئے اور پھر بے اختیار ان کے ہونٹوں پر آنجنابی راجہ سر سنگھ کیلئے تعریفی کلمات ابر آئے۔

”بے شک! سورگ (فردوس مکانی) سرٹا سر سنگھ ایک عظیم سیاستداں تھے۔ ان کی دور اندیشیوں نے چوڑو کو کیسے مصائب سے بچالیا۔ اگر یہ سرنگیں تعمیر نہ کی گئی ہوتیں تو آج راجپوتوں کی یہ عظیم سلطنت نہ جانے کن آفات کا شکار ہو جاتی۔“ اپنے باپ کی تعریف و ستائش سن کر راجہ رتن سنگھ گردن کچھ اور کج ہو گئی، ”سر کچھ اور بلند ہو گیا، چرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔“

پھر خفیہ اجلاس برخواست ہو گیا اور رتن سنگھ کی فوجیں اپنے اپنے مورچے مضبوط کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

منتر، بھون کے جلے ہوئے کھنڈر میں چندر سنگھ کی بے گور و کفن لاش پڑی ہوئی تھی اور ظلم کدے کے تین قیدی بڑے کرب کے عالم میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اذیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب خادمہ رامیشوری غشی کی حالت میں بار بار چندر سنگھ کو پکارتی تھی۔ رامیشوری کی یہ حالت دیکھ کر غلام آفریدی چونک اٹھا تھا۔ اس نے نرملا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا..... ”راج کماری! اس وقت رامیشوری عقل و ہوش کی تمام پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اسے ایک شخص یاد ہے۔ آخر چندر سنگھ رامیشوری کا کیا رشتہ ہے جو اس بے خبری کے عالم میں بھی نہیں ٹوٹتا؟“

نرملا کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی اس کے دونوں ہاتھ رامیشوری کی جلتی ہوئی پیشانی پر تھے اور آنکھوں میں دھواں سا ساہرا ہوا تھا۔

آفریدی، نرملا کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ایک طویل سکوت کے بعد نرملا کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ”رامیشوری کی سانسوں پر چندر سنگھ کا قبضہ ہے۔ جب تک ایک ایک سانس نہیں ڈوب جاتی اس وقت تک یہ رشتہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔“ نرملا کی آواز لرز رہی تھی۔

”چندر سنگھ کو اس رشتے کا علم ہے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے آفریدی کی زبان بھی لڑکھڑائی تھی۔

”ہاں!“ نرملا نے مختصر اکہاشرم کے بوجھ سے اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

آفریدی، چندر سنگھ اور رامیشوری کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ خادمہ کی ایک تیز چال ہوئی۔ شاید یہ رامیشوری کی آخری جج تھی۔ اس نے بڑی جگر شکاف آواز میں چندر سنگھ کو پکارا تھا۔ چہ موجوں کی آغوش میں ڈوبتا ہوا کوئی شخص ساحل پر کھڑے ہوئے اپنے کسی غمگسار کو صدا دے۔ رامیشوری کا جسم کچھ دیر تک کانپتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوتا چلا گیا۔

نرملا گہرا کر کھڑی ہوئی اور آفریدی سے کہنے لگی۔ ”سردار! اسے دیکھئے۔ یہ کیسا خون ہے؟“

نرملا قریب آیا۔ اس نے رامیشوری کا ہاتھ چھو کر دیکھا۔ اتنا تیز بخار تھا جیسے بدن نامیدہ آگ میں ڈوبا ہو۔ آفریدی کی نظریں رامیشوری کی ناک سے بہنے والے خون پر جم گئیں۔ گاڑھا گاڑھا خون بہا ہوا ہاتھوں کی نظر سے نکلا گیا تھا۔ آفریدی لرز اٹھا۔ نرملا نے کئی بار رامیشوری کے سر پر پانی سے پونٹاں سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ آفریدی لرز اٹھا۔ نرملا نے کئی بار رامیشوری کے سر پر پانی سے پونٹاں سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ پھر جب دل کی آگ بھی توجہ خود بخود سرد ہو گیا۔

آفریدی کے دماغ کی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ اس نے جذبات کی لہروں کو روکنے کیلئے دماغ کے گرد دست بند باندھا جسے مگر سرکش تمناؤں نے ہر دیوار کو توڑ دیا تھا۔

نرملا اور آفریدی اس حادثے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب رامیشوری دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے فٹ ہو گئی تو وہ دونوں بھی بہت دیر تک اس مرگ نامگان کا ماتم کرتے رہے۔ اس ماتم میں آفریدی کے لہو نال تھے اور نرملا کی ہچکیاں۔ نرملا، رامیشوری کی لاش سے پٹی رو رہی تھی۔ آفریدی نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اس طرح تو وہ اپنے باپ و کرم سنگھ کی رخصت پر بھی نہیں روئی تھی۔ آفریدی کو یہ خیال بار بار اندازہ ہوا کہ نرملا کے دل میں اپنی خادمہ کیلئے کیا مقام تھا۔

پھر جاشوں اور سسکیوں کا یہ طوفان ٹھہرا تو نرملا کے سوگوار چرے پر ایک سوال ابھر آیا۔ وہ آفریدی سے پوچھ رہی تھی۔ ”رامیشوری کی آخری رسمیں کس طرح ادا کی جائیں گی؟“

”مہا بھائی! سنو کہ سپرد خاک کروں گا۔“ آفریدی نے گلو گیرے لیجے میں کہا..... ”کاش! وہ اس نانا کو فریاد کتنی جاس کے ہم مذہب چوڑو پہنچ چکے ہوتے یا پھر اس نے دہلی میں اپنی آخری سانسیں لی نہں۔ پھر دیکھنے والے دیکھتے کہ آگ اور مٹی میں کیا فرق ہے؟“

نرملا حیرت سے آفریدی کی باتیں سن رہی تھی جب وہ خاموش ہوا تو کہنے لگی..... ”سردار! آپ رامیشوری کی قبر کھودیں گے؟ آپ کے یہ زخم.....“

”اب زخموں سے لہو جاری ہو یا دست و بازو کٹ جائیں اپنے ایک رفیق کی بے رحمی تو گوارہ نہیں کی جاتی۔“ آفریدی کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا نرملا کو اندیشہ تھا۔ آفریدی باغ کے ایک تاریک گوشے میں رامیشوری کی قبر کھودنے لگا۔ زمین چھری تھی، اس لئے آفریدی کو سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ پہلے اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہوا پھر اسی پسینے کا رنگ سرخی مائل نظر آنے لگا۔ نرملا نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چوڑو کی زمین پر پڑنے لگا۔

شام کے قریب وہ گڑھا نما قبر مکمل ہوئی۔ اب رامیشوری کے آخری غسل کا سوال تھا۔ آفریدی الجھ کر ہاتھ دھو کر دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے نرملا سے کہا کہ وہ اسی لباس میں رامیشوری کے جسم پر تین بار پانی بہائے نرملا نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی مردہ جسم کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ مضبوط اعصاب رکھنے والی ایک عورت کی ہوتے ہوئے بھی نرملا کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور اس کے جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی۔

حالات بھی بڑے عجیب تھے جب رامیشوری کے جنازے کو اٹھا کر باغ میں لایا گیا۔ آفریدی نے تمام ایک لمحہ تک نماز جنازہ پڑھائی جسے حلقہ اسلام میں داخل ہونے ابھی چند روز گزرے تھے اور جو خود نماز کے عمل کو اب سے واقف نہیں تھی۔ پھر جب رامیشوری کے جسم کو قبر میں اتارا گیا تو نرملا کی حالت غیر ہو گئی۔

بڑی جاکم اور ہنستا سکرنا چہرہ مٹی کے پردے میں روپوش ہو گیا۔ آفریدی بلند آواز سے اس آیت قرآنی تلاوت کر رہا تھا۔

”ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، مٹی میں ملا دیا اور پھر ایک دن مٹی ہی سے اسے دوبارہ اٹھائیں گے۔“

رامیشوری کے دفن کے بعد آفریدی نے دعا کیلئے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے..... ”اے قادر مطلق و
 علیم وخبیر ہے کہ ہم اپنے ایک ساتھی کو آداب شریعت کے مطابق رخصت نہ کر سکے۔“ اسے قادر مطلق
 قبرستان، نہ کسی عزیز کا کاندھا، نہ غسل نہ کفن..... پھر بھی تو اپنے بندوں کی مجبوریاں جانتے۔ تو
 کی لغزشوں سے درگزر کرتا ہے اور ان کی خطائیں بخش دیتا ہے۔ رامیشوری کو بھی معاف کر دے کہ وہ اس
 بت کدے میں تیری نام لیا تھی..... اور تو اپنے نام لیاؤں کو کسی بھی حال میں بے یار و مددگار نہیں
 چھوڑتا۔“

آفریدی کی دعا ختم ہوئی اور جیسے ہی اس نے اپنے قریب کھڑی نرملا کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ نرملا خود کلاں
 کے انداز میں بول رہی تھی..... ”یہ کیسا سفر ہے اور یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ پتاجی رخصت ہوئے،
 چندر سنگھ نے اپنا راستہ بدل لیا اور اب رامیشوری بھی چلی گئی..... نرملا! تجھے سب اکیلا چھوڑ گئے۔ کی
 نے تیری آواز نہیں سنی اور کسی کو تیری تنہائی کا خیال نہیں آیا۔ کیا تو اسے سلوک کی مستحق تھی؟“

آفریدی بے اختیار ہو گیا..... ”ابھی میں ہوں نرملا! میری طرف دیکھو۔ میں کہاں گیا ہوں؟
 اضطراری طور پر آفریدی نے نرملا کے دونوں بازو پکڑ لئے۔

”ایک دن تم بھی چلے جاؤ گے سردار!“ نرملا پر وحشت طاری تھی وہ میں جانتی ہوں، تم بھی چلے جاؤ
 گے، سب بے وفا ہیں، سب خود غرض ہیں۔ اپنے دل کو تسکین پہنچانے کیلئے کسی بے دردی سے دامن
 چھڑا لیتے ہیں۔ سب کو نیند آگئی۔ سب کو قرار مل گیا۔ دیکھتے نہیں کہ یہ سب لوگ کیسے سکون سے سو رہے
 ہیں۔ کوئی میری طرف نظر بھی نہیں کرنا کہ میں کب سے اکیلی جاگ رہی ہوں۔“

آفریدی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس طرح نرملا کو غموں کی اس بھڑکتی ہوئی آگ سے بچنے
 کا بہرا لائے۔ ”تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں؟“ آفریدی نے جوش جذبات میں نرملا کو چھوڑ کر کہہ
 دیا۔ ”تمہیں میرا چہرہ نظر نہیں آتا کہ میں اس الم کدے میں تمہارے ساتھ جاگ رہا ہوں۔ میری بات کا
 یقین کیوں نہیں کرتیں کہ میں اس وقت تک جاگتا رہوں گا جب تک تم سکون کی گہری نیند نہیں
 جاؤ گی۔“ آفریدی پوری طاقت سے چیخا تھا۔

نرملا کی وحشت کچھ دیر کیلئے ختم ہی گئی۔ اس نے آفریدی کو بہت غور سے دیکھا اور پھر افغان سردار کے
 سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

”اے وفا کے آشکار! اپنے دل میں پانی کا کوئی قطرہ باقی نہ رکھ کہ تیرے آنسو آفریدی کے خون سے بھی
 زیادہ قیمتی ہیں۔“ علی عامر چاہتا تھا کہ وہ گھٹا گھل کر برس جائے جو بچپن سے نرملا کے دل پر چھائی ہوا
 تھی..... ”اپنے آنسوؤں سے شاہی سفیر کو سرفراز کروے کہ کوئی تمہے، کوئی اعزاز اس کی برابری نہیں
 کر سکتا۔“

آفریدی اپنی زبان سے وہی الفاظ ادا کرتا رہا جو نرملا کماری کے شایان شان تھے..... اور وہ کم سن
 چوہان کی بیٹی ان ہی الفاظ کی حرارت سے پھلتی رہی۔

پھر جب دل کا غبار صاف ہوا تو گرد و پیش کے مناظر صاف نظر آنے لگے۔ ایک طرف رامیشوری کی قبر
 تھی اور دوسری طرف آفریدی کا بیچا ہوا دامن۔ نرملا کے آنسوؤں نے ایک ایسا راز فاش کر دیا تھا جس کی
 ابتداء رائی پانی بدمنی کے دربار میں اس وقت ہوئی تھی جب آفریدی پر تشدد کیا جا رہا تھا اور وہ اپنے سلطان کے
 عزت و وقار کو بچانے کیلئے زخم پر زخم کھائے جا رہا تھا۔ آفریدی کی دلکش شخصیت اور جذبہ وفائیت نے نرملا
 کے دل میں بڑی خاموشی سے عشق کی ایک چنگاری رکھ دی اور پھر یہی چنگاری آہستہ آہستہ بھڑکنے لگی۔

آفریدی نے نرملا کے مشتعل جذبات کو سرد کرنے کیلئے کہا۔ ”راج کماری! ماضی کی ان تلخ یادوں کو
 لے کر قبر سے دفن کر دو اور مستقبل کے پُر سکون جزیرے میں دلکش خواب دیکھو۔ جب کسی لاجوئی
 نندہ نے ملا جائے گا اور کوئی رامیشوری راجپوت سرداروں کی ہوس کا نشانہ نہیں بنے گی۔ میرے سلطان
 شمس قراچلی چوڑو کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ عنقریب ان سرداروں پر ان کی اپنی ہی زمین
 ہو جائے گی۔ یہ اپنے ہی خنجروں سے اپنی شہر رگیں کاٹ دیں گے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پناہ
 فوجانہ قہر کے بمبوسوں سے یہ منظر دیکھو گی جب ایک ایک ظالم زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو گا اور اس
 بے بہت جلد تم اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھو گی۔ آج اسی خدا نے اپنے عذاب کے نمائندوں کو چوڑو بھیجا
 ہے کہ وہ دامن میں موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔“ آفریدی، نرملا کے سینے میں دبی ہوئی نفرتوں کی
 لہریں اٹھانے لگی تھیں۔

جیسے ہی اس پر پانی کے چند قطرے گرے وہ کچھ اور بھڑک گئی۔

”نہیں سرور! مجھے بولنے دو۔“ نرملہ کماری ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھی۔ اس نے شدید

اضطراب میں آفریدی کے سامنے اپنا سرفراز پر رکھ دیا۔ ”آج کی رات کوئی حکم نہ دو، غصہ گستاخ و بے ادب ہو جائے دو۔ اگر آپ کے حکم کی تعمیل میں میرے لب خاموش ہو گئے تو دل نہ ملے سلطان صرف ایک فاتح ہے اسے سیم دوز کے انبار اور زمین کے طول و عرض سے دلچسپی ہے۔ فتوحات کے دفتر میں نئے اور اوراق کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ چتوڑ میں انسانوں کے ساتھ کیا وحشیانہ سلوک ہوا ہے؟ مجھ سے پوچھو کہ میں اس دھڑکی کی رازدار ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ اس سرزمین پر آدم زادوں کی تقسیم کس طرح ہوئی اور اونچی ذات والوں نے اپنے ہم شکل بچ لوگوں پر کیسے مظالم ڈھائے ہیں؟ سرور! آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ یہاں کی عورت کتنی غم زدہ ہے۔ اگر میں بھی تم لوگوں کی تو پھر کون بولے گا؟ آج اس رسم نیاں بندی کو ٹوٹ جانے دیجئے۔“

نرملہ کے آنسوؤں سے فرش بھگ گیا تھا آفریدی پہلے تو حیرت زدہ رہ گیا کہ پھر جیسے اعصاب رکھ والی دو شیرہ اس طرح ریزہ ریزہ ہو کر کیوں بکھر رہی ہے؟ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلط انداز میں سوچ رہا ہے۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ قہقروں کے ساتھ آنسو اور سکوت کے ساتھ فریادیں اس کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ نرملہ کی انک ریزی نے اس کے انسان ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔ اگر وہ اس طرح نہ رہتا تو آفریدی کو نرملہ کی ذات پر بھی کسی بے جان مجسمے کا گمان ہونے لگتا۔ ”کہہ ڈالو نرملہ! جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔“ آفریدی نے ڈرتے ڈرتے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

نرملہ کچھ دیر اسی طرح سرفراز پر سر رکھے بچوں کی مانند سستی رہی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی اور اس نے علم ہر آفریدی کی طرف دیکھا۔ نرملہ کی آنکھیں ویران تھیں مگر ان میں آنسوؤں کے سیلاب موجھتے۔ ”سرور! اسے معلوم کہ میرے دیس میں عورت کی حیثیت متاع کو چھوڑنا ہے۔ ابھی کہہ رہی کہ ایک کسان اپنی بیٹیوں، بکریوں، گایوں اور بھینسوں کی ناز برداریاں کرتا ہے مگر عورت جانور کے مقام سے بھی گرنے لگتی ہے۔ یہاں کے مرد روزانہ اپنی غرض کا قانون بناتے ہیں اور پھر اسے خود ہی توڑ دیتے ہیں۔ یہاں برہمن اور راجپوت مرد ہی برہما کی مخلوق میں شمار ہوتے ہیں۔ باقی یا تو کسی راکشس کی تخلیق ہیں یا پھر خود برہما نے انہیں پیدا کر کے اپنی مخلوق کے دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ کاش! یہ ٹھکرائے ہوئے لوگ، عمل کی کوکھ سے پیدا ہونے والے جھانڈے کاڑھی ہوتے کہ تیز بارش کے بعد زمین سے اگلے لگتے اور پھر سرفراغے ہی کسانوں کے گل انہیں پکلی دیتے یا حیوانوں کے بھوکے پیٹ انہیں اپنی خوراک بنا لیتے یا کسی آل کا ایندھن بن جاتے۔ مگر افسوس! یہ تو خس و خاشاک بھی نہیں کہ ہوائیں ہی انہیں اڑا کر لے جائیں اور اپنی ذات کے رنج و الم سے نجات پا جاتے۔“ نرملہ کے ہونٹوں سے آگ برس رہی تھی۔

”یہ انسان بھی نہیں اور حیوان بھی نہیں۔ یہ وہ جاندار ہیں جو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے انہیں موت کی تمنائیں کبھی سو برس جینا پڑتا ہے اور کبھی ساٹھ ستر سال۔ گردشِ تقدیر تو دیکھو کہ ان کی عمریں بھی طویل ہوتی ہیں۔ یہ مرنا چاہتے ہیں مگر اپنی خوشی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتے۔ انہیں زندہ کرنا جانا ہے کہ اگر یہ شمشان کی بیٹھ چڑھ جائیں تو اونچی ذات والوں کے کام کون کرے گا اور انہیں سنسار کے سکہ کون پہنچائے گا؟“

”ان باتوں پر اپنا دل مت جلاؤ نرملہ! یہ تفریق تو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔“ آفریدی نے ایک بار نرملہ کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی۔ ”چتوڑ کی تہذیب کے یہ انداز انوکھے نہیں ہیں۔ خدا کی پوری نیت

نہیں سرور! ایسا کیس نہیں ہوتا۔“ نرملہ نے آفریدی کی منطق کو جھٹلادیا تھا۔

”میری زمین کا دم بھی زالا ہے اور تہذیب بھی۔ آپ نے چتوڑ کے باسیوں کو ابھی دیکھا نہیں ہے۔ راج محل کے جھوکوں سے مظلوموں کی بیٹیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ زمین پر بچے والے یہ کڑے بھگوان کے چرنوں کو بھی نہیں چھو سکتے۔ ان کے سینوں میں بھی درد اٹھتا ہے اور مددوں سے نکل آکھوں کے دریاؤں میں بھی بانڈ آجاتی ہے۔ پھر یہ رائدہ درگاہ مخلوق دیوتاؤں کے چوں کو اپنے آنسوؤں سے دھونا چاہتی ہے مگر دیوتاؤں کے نزدیک ان کی آنکھوں سے بننے والا پانی ہلکا ہے۔ سرور! یہ تو وہ بد نصیب ہیں کہ بھگوان بھی ان پر ستم ڈھاتے ہیں اور خود ان کے ہم جنس بھی۔ اب سب بخار ہے ہیں کہ ان کی پیدائش ہی ایک گناہ گھمڑی ہے۔“ نرملہ کے دل کا غبار کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ آندھیوں کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا اور نرملہ کے ذہن کا ایک ایک گوشہ و سکھوں کی گرد سے لٹ کر رہ گیا تھا۔

”راج کماری! اپنے ذہن سے ماضی کے نقوش کھرچ ڈالو۔ گزری یادیں روح کو پگھلانے اور دل کو جلانے کے سوا کچھ نہیں کرتیں۔“ آفریدی مسلسل اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح نرملہ کو یادوں کے حصار سے باہر کھینچ لائے۔ مگر نرملہ غموں کے اسی ایک دائرے میں گردش کر رہی تھی جس کے ہاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔

”اب جلنے کو باقی بھی کیا رہ گیا ہے سرور؟“ نرملہ کے لہجے میں وہی پیش تھی۔ ”بچپن کے کچھ لمحے اس آگ سے محفوظ تھے لیکن میں نے انہیں بھرتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا۔ اب میری ہر سانس ایک شعلہ ہے اور اس شعلے کو بجھانے والا کوئی نہیں۔“

”میں بھی نہیں۔“ آفریدی شدتِ اضطراب میں ایک نازک سا سوال کر بیٹھا۔ ”ہاں سرور! تم بھی نہیں۔“ نرملہ کی باغیانہ روش توازن کی حدوں سے گزر چکی تھی۔ ”یہ شعلے نرملہ کی تمام ذات کے شعلے نہیں کہ کسی غمگین کے ہونٹوں سے نچنے والی شبنم انہیں بجھا دے۔ رائیشتی جس آگ میں جل کر راکھ ہوئی ہے اسے کون بجھائے گا سرور؟“

آفریدی لرز کر رہ گیا۔ اس کے پاس نرملہ کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ”رائیشوری کی بد قسمتی کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھتا تھا۔“ نرملہ پھر اس عورت کی طرف لوٹ گئی جو مٹی کا لباس پہنے باغ میں اپنی ہینڈ سوری تھی۔ ”سرور! اسے زندگی سے بہت محبت تھی۔ دنیا والوں کی نظر میں اس عورت کو زندہ رہنے کا حق نہیں جس کا جسم ہزار بار تقسیم ہوا ہو۔ پھر بھی وہ جینا چاہتی تھی اور جیون کی لذت اسے ہمارے گھر تک لے آئی تھی۔ پتا ہی نے اس کے نکلے سر کو آچل بھی دیا اور سانس لینے کیلئے ایک محفوظ مارتا بن بھی۔ یہاں رہ کر رائیشوری کی اجڑی ہوئی آنکھوں نے پھر خواب دیکھنے شروع کئے۔ طالع پڑھ کر ہم کب کا وجود یہ خواہش رکھتی تھی کہ کسی مرد کو اس کی پارسائی پر یقین آجائے۔ جبر و تشدد کے قہر میں ہلک جالنے والا انسان گناہ گار نہیں ہوتا۔ رائیشوری بھی اسی وجہ سے اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتی تھی کہ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے چند سنگھ نے بے گناہ سمجھ لیا۔ مگر جب شادی کا ذکر آیا تو چہرے کے خاندانی رسم و رواج نے رائیشوری کی محبت کو ڈس لیا۔ ایک بار پھر اس کے نا آسودہ بدن میں ہوائی کا زہر پھیلنے لگا۔ چند سنگھ اس گمر کی ریت سے مجبور تھا۔ ایک کم ذات عورت، ایک راجپوت نواسے کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ چند سنگھ نے ساج کے اونچے لوگوں کا فیصلہ سنا اور سر جھکا کر

”سردار! میری طرف دیکھو! میں اس دیس کی رہنے والی ہوں جہاں مردوں کی بڑائی نہیں ملے۔ عورتوں کی راکھ کے انبار اور ہڈیوں کے ڈھیر پیش کئے جاتے ہیں۔“

آزیدی نہ ملے گا اس طرزِ مخاطب کا کیا جواب دیتا؟ شرم و ندامت کے پسینے میں نہا گیا کہ آخر وہ بھی ایک دروغ۔ ”راج کمار کی ایک تہ راجپوت مردوں کی وحشیانہ روش کا انتقام مجھ سے لینا چاہتی ہو۔“ آفریدی کہہ کر اس کا کھجورہ بزمِ نرم تھا۔

”میں اور آپ سے.....“ میں نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
 ”میں! ہرگز نہیں۔“
 ”میں نے یہ خیال بھی کیوں آیا؟“
 ”میں نے اس بات سے اور کیسا بھیانک تصور ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال بھی کیوں آیا؟“
 ”میں نے اس بات سے اور کیسا بھیانک تصور ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال بھی کیوں آیا؟“
 ”میں نے اس بات سے اور کیسا بھیانک تصور ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال بھی کیوں آیا؟“

”میں ایک مرد ہوں راج کلاری! اپنے ہم جنسوں کی پیداوگری کے فسانے سن کر مجھے شرم آنے لگی ہے۔ گناہ کرنے اور سرکس کا چھکا؟ بڑی عجیب بات ہے، بہت ہی عجیب۔“ آفریدی کا لہجہ انتہائی دلیور ہو گیا تھا۔ ”میں خود بھی بہت شکستہ ہوں نہ! مجھ سے روشنی کی باتیں کرو۔ اگر تم اسی طرح مردوں کا ذکر کرتی رہیں تو میں ایک دن کسی دیوار سے ٹکرا کر مر جاؤں گا۔“

”نہیں سروا! آپ بہت دن زندہ رہیں گے۔“ یکایک نرملا کا گلاب رنگ چہرہ سرخ ہو گیا.....
 میں نے اپنی عمر بھی آپ کے نام کر دی ہے۔ چوڑکی سیاہ راتوں کے قصے اس لئے سنارہی ہوں کہ وقت
 نہ کم ہے۔ کون جانے کب میری سانسوں کی رفتار ختم جائے۔ اگر میں دنیا سے اٹھ گئی تو جاستھان کی
 بہت کامی داستان ادھوری رہ جائے گی۔ میرے بعد اس خوں چکاں حکایت کو سنانے والا کوئی نہیں آئے
 گا۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بعد مجھوں کی رونق بہت زیادہ ہوگی۔ نئے نئے راوی ہوں گے جو بڑے
 فنکارانہ ہیں نئے نئے قصے سنائیں گے۔ مگر وہ سب کے سب مردوں کی فتوحات کے فسانے ہوں گے
 نئے نئے نعرے بنگاموں میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوگی کہ وہ راکھ کے ڈھیروں کی طرف دیکھ کر ان
 راول کے بارے میں سوچے جو سوچے و تشدد کی آگ میں جل تبھیں۔“ نرملا کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور
 پھر آنکھوں کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی اداس آنکھوں میں شکایتوں کے سوا کوئی دوسرا
 لہجہ نہ ہو۔

انفردی کا احساسِ ندامت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ وہ کچھ کمنا چاہتا تھا نرملا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دیکھ دیا۔ "یہ داستانِ الم کا آخری باب ہے سردار! اسے اور سن لو کہ پھر اس کے بعد تو سکوت کا وقت ہے، خاموشی ہی خاموشی ہے۔" "ایک بار پھر نرملا کے لہجے سے دل کا درد جھلکنے لگا۔ "فہم سنا تیرے کہ ایک با اثر مرد ایک کمزور عورت کو بے آبرو کر دے اور چوڑے کے سارے قوانین منسوخ ہو جائیں کوئی مصنف، کوئی عادل اس حیا سوز منظر کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔ کسی عدالت کا فیصلہ نہ کھٹے۔ اور جب کوئی فیصلہ ہو تو عورت ہی مجرم ٹھہرے۔ پھر دریاؤں کے کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی بھڑکتی ہو، پھر تسلا گائی جائے اور پھر اس نامراد عورت کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا جائے۔" "میں نے سوچا کہ وہ مرد بھی تھا جو اس مجبور و معصوم عورت کو کوڑے کے جہانِ تنک لے گیا تھا۔ پھر اسے کسی گڑبگڑ میں دس دی؟ مقتل مرو نے سچایا، ذبح عورت کی گئی۔ دونوں گناہ گار تھے۔ مگر قانون نے ان کو کچال دیا۔ اس سیاہ بخت عورت کی بکھری ہوئی مٹھوں سے کون پوچھے کہ تیری ہی حیا کا آئینہ ٹوٹا اور تیرے

تسلیم کر لیا۔ وہ ببادر تھامر رسوں کی یلغار سے ڈر گیا پھر بھی اس نے جندوں کی آبرو کو بچالیا۔ چودہ گز
نے راجپوتوں کا فیصلہ مانا تو اپنا فیصلہ بھی ان پر نازل کر دیا کہ اس کی دلسن بنے گی تو راجپوتوں کی.....
اکیلے ہی زندگی کے دن کاٹ دے گا۔ راجپوتوں نے چند سنگھ کے تھائی کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی
اور اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر چند سنگھ غیرت مند بھی تھا اور سرکش بھی۔ اس نے راجپوتوں
سے صاف صاف کہہ دیا کہ آگے پیچھے تمام راستے بند ہیں۔ زندگی کے اسی برزخ میں ان دونوں کو گذرنا
ہو گا۔ وہ برسوں سے اسی کشش میں زیست بسر کر رہے تھے کہ سردار آپ آپچنے۔ دونوں اپنا دھرم بدل کر
ریمیں بدل جانے کی خوشی منا رہے تھے کہ انہیں موت کھا گئی۔
”راج کمار! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ چند سنگھ اس دنیا میں موجود نہیں۔“ آفریدی نے حیران
ہو کر نرمٹا سے سوال کیا۔

”رانی مشوری کی موت نے مجھ سے سرگوشیاں کی ہیں کہ چند رستگہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔“ نرملاکا آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ”اگر چند رستگہ زندہ ہوتا تو رانی مشوری کبھی نہ مرنے میں اس برفیاب عورت کو جانتی ہوں کہ اس کی محبت عجیب محبت تھی۔ چند رستگہ کے جسم پر ایک خراش لگتی تو وہ اپنے بدن پر خراشیں سچا لیتی۔ چند رستگہ بیمار پڑتا تو رانی مشوری بھی بستر دراز ہو جاتی۔ اس کا دل چند رستگہ کے ہر لمحے کا راز دار تھا۔ جب رانی مشوری کا دل بچھلے تو پھر چند رستگہ کا دل بھی بچھ گیا ہو گا۔“

عجیب داستان فراق و وصال تھی۔ بیان کرنے والا بھی رویا اور سننے والا بھی۔ کچھ دیر تک فضاؤں میں خاموشیوں کی حکمرانی رہی۔ پھر بھی اس سکوت کے عالم میں نرملاکا کے آنسوؤں کی چاپ سنائی دیتی تھی جسے صرف آفریدی ہی سن سکتا تھا۔

”اگر رامیشوری کے ساتھ انصاف ہو بھی جاتا تو ان ہزاروں عورتوں کا دوا کون کرنا جو تمہارے آٹے سے پہلے ہی مردوں کے تعمیر کردہ جہنم کا ایندھن بن گئیں۔“ ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد نرما دہارہ بولنے لگی تھی۔ آفریدی کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے سن رہا۔

”یہاں کی عورت بھی کیسی ستم رسیدہ ہے کہ اگر مرد خوش ہوا تو اسے تمام عمر کیلئے داشتہ بنایا اور ناراض ہوا تو خوں کی بازی میں ہار دیا۔ مرد زندہ ہے تو وہ بیروں کی جوتی اپنی داڑھی مٹی ہوئی کھال کے ساتھ سانس لیتی رہتی ہے۔..... اور جیسے ہی مرد رخصت ہوا عورت پر زندگی کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ راجستھان کے راجاؤں میں انہیں سب سے زیادہ عزت تک تسلیم کیا گیا ہے جن کی بیویوں کی کھال ایک ہزار کے قریب تھی۔ داسیوں اور رکھیلوں (داشٹاؤں) کا کوئی شادی نہیں۔“

”آفریدی کسی پتھر کے مجستے کی طرح سکت بیٹھا ہوا چونکی عورت کا فسانہ الم ن رہا تھا۔“

”سر دار! یہ کیسا قانون ہے کہ مرد کے ساتھ اس کی تمام ہویاں اور کینسر بھی جل جائے پر مجھ پر کیا کاوراٹ میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ان سے کوئی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ ان پر خوشی کی ہر تقریب حرام ہوتی ہے۔“ نرملے نے اس الم نگیز کہانی کا ایک اور ورق الٹ دیا تھا۔

”یہاں مرد ہی سب کچھ ہے۔ زندگی میں اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس طرح کیا جاتا کہ وہ سیکڑوں عورتوں کا مالک تھا..... اور مرنے کے بعد اس کا مقام طے کرنے کیلئے ان عورتوں کی بیٹیوں کا شمار کیا جاتا ہے جو اس کے ساتھ جل کر راکھ ہوئی تھیں۔ اگر وہ بیٹیاں تعداد میں زیادہ ہیں تو سمر نے الٹ بوا آدمی تھا۔“ یہ کہتے کہتے نرمالنے آفریدی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی اٹک رہی تھیں مگر ہونٹوں پر ایک ایک ایسی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جس کے چھچھے چھپے ہوئے نفروں اور تینوں کا کوئی حجاب

ہی جسم کو نذر آتش کر دیا گیا۔ میں جانتی ہوں سردار علی عامر آفریدی کہ وہ عورت اس طعنے کے بوجھ سے چاہتی تھی..... ”نرملہ کالجہ اچانک شربار ہو گیا تھا اور اس طویل عرصے میں اس نے پہلی بار آفریدی کو کانا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ ”میں نے ایسی کئی لڑکیوں کی چٹیں سنی ہیں جو آگ کے حوالے کیے جانے پہلے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسا اذیت ناک منظر ہوگا، جب ان معصوم لڑکیوں نے اپنی لڑکھاتی زبانوں سے یہ الفاظ ادا کئے ہوں گے۔

”ہماری جائیں بخش دو کہ ہم عزت کے لباس اور آبرو کے آنچل کے بغیر بھی جی لیں گے۔ سردار! بھیک تو کسی نے کسی سے نہیں مانگی ہوگی۔ یہ غیرت مند راجپوت جن کی جھولیاں شجاعت و مردانگی کی دلدل سے بھری ہوئی ہیں، اس وقت کیسے تمی دامن ہو جاتے تھے، کوئی نہیں جانتا۔ ”نرملہ کی آنکھوں میں ہلکے اشکوں کا سیلاب آ گیا تھا۔

”اور سردار! کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چوڑے دانتوں نے بیواؤں کو اپنے رحم و کرم سے بھی لوار ہے۔ کچھ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جلانے کے بجائے زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بدینہ حیران کن لمحات ہوتے تھے کہ بظاہر ”ستی“ کی رسم ٹوٹی نظر آتی تھی مگر ایک دن یہ بھیانک راز فاش ہو جاتا کہ ان عورتوں کو زندہ کس لئے چھوڑا گیا ہے۔ چتا کے شعلوں سے بچا کر انہیں ایک دوسری آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ پوری بستی میں ان بیوہ عورتوں سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی بھتہ نیچے سو نہیں سکتی تھیں یہاں تک کہ اپنی بھوک مٹانے کیلئے انہیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے سکھوں کو تری ہوئی عورتیں کچھ دن بھوک کا عذاب بھی جھیل لیتی تھیں کہ شاید کسی کامربان ہاتھ ان کے آگے گایوں اور بھیمنوں سے بچی ہوئی پھینک دے روٹی کے سونے ٹکڑے ڈال دے..... مگر یہ انتظار بھی کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں ہوتا تھا..... اور جب یہ خواب ٹوٹ کر بکھرتا تو دریاؤں میں ان بیوہ عورتوں کی لاشیں نوکیلے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نظر آتیں۔ اگر ان بد نصیبوں کو یہ معلوم ہوتا کہ بھوک کی آگ چٹاکی آگ سے زیادہ اذیت ناک ہے تو وہ زندگی کی بھیک بھی لے لیں کرتیں۔“

”خدا کیلئے اس فسانے کو ختم کر دو کہ اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں ہے۔“ مرنے والوں کا کردار ایسا تھا کہ اہل دل اپنے ہوش کھو بیٹھتے تھے۔ آفریدی کی قوت برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔

”انہیں بس عورت کو جلانا آتا ہے۔“ نرملہ نے آفریدی کی التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”افلاس کی وجہاں لپیٹ کر جلے یا قبائے زر نگار ہیں کر..... جلنا عورت ہی کو ہے..... چوڑے محافظوں نے عورت کو جلانے کیلئے کیسے کیسے انداز تراشے ہیں؟ کوئی راجہ یا منتری مرتابہ تو اس کی بیکار بیویوں کو دلہن کی طرح سجا جاتا ہے۔ دولت و اقتدار کا مظاہرہ کرنے کیلئے ان مظلوم عورتوں کو بہتر نل کے گھوڑوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ خوشی کے ساز و سنجے ہیں جیسے راجپوت سوراؤں نے جب جیت لیا ہوا دارماں ہی سازوں کے شور میں وہ تن بھونک دیے جاتے ہیں جو پھولوں سے بھی زیادہ کوئل ہوتے ہیں۔“ راجپوت عورت کی ہلاکتوں، محرومیوں اور رسواؤں کا فسانہ ختم ہو گیا تھا اور نرملہ، آفریدی سے معذرت طلب کر رہی تھی۔ ”مجھے معاف کرنا سردار کہ میں آپ کے سکون میں غلغلہ انداز ہوئی مگر کیا کرتی؟ آپ کے ہا میرا کوئی ہے بھی تو نہیں کہ جس کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ میں نے اپنی بھڑ جانے والی نام سہیلیوں کے رازوں سے پردہ ہٹا دیا۔ شاید میری یہ گفتگو آداب رازداری کے خلاف ہو میں نے فوب سوچ سمجھ کر یہ امانت اس شخص کو منتقل کی ہے جو میری نظر میں بہت بڑا ایمان ہے۔ صدوں سے ملنے والی

مدد عورتیں میری سہیلیاں تھیں۔ وہ شور ہوئے یا برہمن یا میری ہم نسل راجپوت۔ ان سب کا مجھ سے لگتا تھا کہ وہ میری اپنی تھیں۔ میں اقتدار میں رہنے کے باوجود ان کے کسی کام نہ آسکی۔ اب امید کی لکیر مٹ چکی ہے کہ جو رستم کے گلشن میں جتنے پھول باقی رہ گئے ہیں شاید انہیں علاء الدین خلجی کا لشکر لٹ کر مٹا دے۔ اگر سلطان نے اس وحشیانہ رسم کو بدل ڈالا تو میں اس کی عظمتوں کو سلام کروں گی۔ خود ہنگو شاہ میں حاضر ہو کر اس کی بلند یوں کا ترانہ پڑھوں گی۔ وہ میری زندگی کا سب سے دلکش اور کلا انگیز دن ہو گا جب چوڑی کنواریاں اپنے چند رما جیسے کھڑوں پر گھونگٹ ڈالیں گی، جب بستی ہوائیں مہر آگ چھیڑیں گی، جب پن گھٹوں کی ناراض ہماریں واپس لوٹ آئیں گی اور جھلکنے والی کوری مگریاں کی جاہر ہوس کار کے پھینکے ہوئے پتھر کی ضرب سے محفوظ رہیں گی۔“ نرملہ کے چہرے پر کسی بچے کی طرح حیرت و ایمان پھل اٹھے تھے۔

”ایسا ہی ہو گا سردار؟“ نرملہ اپنے معصوم خوابوں کی تعبیر جاننے کیلئے آفریدی سے ہم کلام ہوئی۔ ”ایسا ہی ہو گا راج کمار! آفریدی نے اپنے ان اشکوں کو پیتے ہوئے کہا جو دوبارہ اس کے دامن کو بڑھاپا جاتے تھے۔

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو جائے۔“ نرملہ کمار کی شہید حسرت کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے روک پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ان عذاب ناک سوجوں کا سلسلہ کہیں تو ختم ہو۔ کوئی تو اپنے دست کرم سے قبر کے ان سفاک مناظر کو قتل کر ڈالے۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی تو ہو۔“ کمرے کی فضا نرملہ کی سرد آہوں سے یکساں کدہ بن کر رہ گئی تھی۔

”خدا کی زمین بہت وسیع ہے راج کمار! وہ لوگ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نکل کر چوڑی اڑیوں میں مٹ رہے ہیں۔ عنقریب تم اپنے حسرت زدہ خوابوں کی زندہ تعبیر دیکھ سکو گی۔“ علی عامر آفریدی اس طوفان کی جاہ کاریوں کے اثرات کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے نرملہ کے دل و دماغ کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا گزرا تھا۔

نرملہ، آفریدی کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کے خیالات کہیں دور بھٹک رہے ہوں۔ ”سردار! تمہارے یہاں تو عورت کے ساتھ یہ ہیمانہ سلوک نہیں ہوتا۔“ نرملہ نے اچانک ایک عجیب حال کر ڈالا تھا۔ ”تمہارے یہاں کی عورت اتنی حقیر اور غمزدہ نہیں کہ شوہر کے برابر اس کی قبر بھی کھودی جائے اور اسے بھی فریاد و فغاں کے شور میں زندہ و گور کر دیا جاتا ہو؟“

آفریدی چند لمحوں کیلئے سہم سا گیا۔ نرملہ کے سوال پر اسے حضرت امیر خسروؒ کے وہ اشعار یاد آنے لگے جنہوں نے اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھے تھے۔

”کاش! تمہارے ہوتیں۔ اگر پیدا ہو تیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں لیکن خدا کے حکم کو کون ٹال سکتا ہے۔ آخر میرے باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوئے اور میری ماں بھی تو آخر ایک عورت ہی تھیں۔“

آفریدی کے دل میں ایک حشر سا رہ پاتا تھا اور ذہن میں امیر خسروؒ کے اشعار تلاطم پیدا کر رہے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ نے ہندوستانی عورت کی حالت زار بیان کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو نصیحت کی تھی۔

”فرماؤ! چرخہ کا تانہ چھوڑنا اور کبھی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا عافیت کے دروازے کی طرف نہ چہرہ دیوار کی طرف کر اور اپنی پشت بھرو کے سے موڑ لے۔“

آفریدی کچھ دیر کیلئے تصورات کی موجوں میں بہتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔ یکایک نرملہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”سردار آپ کی سوچ رہے ہیں؟“ نرملہ کے لہجے میں وہی غلغلہ تھی۔ ”کیا آپ کے یہاں

میرا ہوا بھی فطری امر تھا۔ ماں کی موت، پھر باپ کا زوال اور ان پر ٹوٹنے والے قہر و ستم نے مجھے یقین دلایا ہے کہ راج چوتھی ٹھیکسی کستا تھا۔ ”نرملہ کالجہ افسردہ تھا اور چہرے پر مایوسیوں کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔“

”بھئی اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔“ آفریدی نے نرملہ کے ذہن سے توہم پرستی کا غبار صاف کرنے کی کوشش کی۔

نرملہ نے آفریدی کے سوال کا جواب کوئی نہیں دیا اور اپنی گفتگو کا تسلسل برقرار رکھا۔ ”میں بچپن سے ایک خواب دیکھتی آرہی ہوں۔ یہ بڑا ہی صانک خواب ہے جو مسلسل میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اس خواب نے کبھی براہماتہ نہیں چھوڑا۔ کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے تیسرے دن۔ میں لڑکھیز منظر ضرور دیکھتی ہوں جب ایک سایہ فام شخص میرا تعاقب کر کے مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر وہ مجھے تیز خنجر سے ذبح کرتا ہے۔ میرا پلٹے ہوئے کا منظر خاموشی سے دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ بد صورت شخص میرے جسم کے ٹکڑے لڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ میری آنکھیں نکالنے کیلئے مجھ پر جھک جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کا خنجر میری آنکھوں کے قریب پہنچتا ہے میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس شخص کو پہچان لیتی ہوں۔“ اپنا خواب بیان کرتے وقت نرملہ کا جسم کسی کمزور شاخ یا زرد پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔

”نرملہ! وہ کون شخص ہے؟“ آفریدی جو شہ اضطراب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی حالت بھی نرملہ کی رائی ہوئی جا رہی تھی۔

”جسم کے ٹکڑے ہوتے وقت میں اس شخص کو نہیں پہچانتی مگر جب وہ میری آنکھیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شکل مہاراج رام دیو کے چہرے میں ڈھل جاتی ہے۔“

نرملہ نے خواب نے علی عامر آفریدی کو ایک ناقابل بیان اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت دیر تک اسے سوں ہوتا رہا جیسے اعصاب شل ہو گئے ہوں اور وہ قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہو۔ اس دوران نرملہ بھی آفریدی کی خاموشی کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر جب آفریدی کے ہونٹوں کو کسی انداز سے جنبش نہیں ہوئی تو خود اس نے غلام کر کے اس کی تکلیف وہ سکوت کو توڑا۔

”سردار! یہ میرا خواب ہے، میرے غموں کا ایک تاریک منظر، میرے انجام کا ایک دھندلا سا نقش، میرا بچپن، میرا بچپن کا ایک بھم اشارہ، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“ نرملہ نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کا ایک کامیاب کوشش کی۔

”بے شک! تمہارے خوابوں سے میرا کوئی تعلق نہیں مگر سوچتا ہوں کہ جب کوئی رشتہ ہی نہیں تو طے ہوئے مجھے اپنا خواب سنایا کیوں تھا؟“ آفریدی نے اس نظروں سے نرملہ کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ ”نرملہ! اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔“ وہ خواب اس لئے سنایا تھا کہ آپ کے سوا اب میرا کون سا دوست ہے۔ جب تک پہنچی قریب رہے انہیں اس خواب کے بارے میں بتاتی رہی۔“ نرملہ نے بڑی غلطی سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اور ایک نازک سے اشارے میں آفریدی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کی نگاہیں کیا مقام رکھتا ہے۔

”رازدار! کارہ دینے کے بعد یہ نصیحت کیوں کی جاتی ہے کہ میں پریشان ہونا چھوڑ دوں۔“

”نرملہ! ہر حرف شکایت ابھر آیا۔“ چند سنگھ کے زخم کی جھلش صرف رانی مشوری محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے زمین پر آخری عورت و مرد تھے جو وفا کی رسمیں بھا کر دنیا سے چلے گئے۔ کیا کوئی دوسرا انسان ان کے حواس میں ہو سکتا؟“ آفریدی نے بڑے عجیب انداز میں اسے جندوں کا اظہار کیا تھا۔

بھی عورت اتنی ہی مظلوم ہے؟“ نرملہ نے اپنا وہی نازک ترین سوال دہرایا تھا۔

آفریدی نے اپنے منتشر خیالات پر قابو پا لیا اور پُر اعتماد لہجے میں کہنے لگا۔ ”معاذ اللہ! مسلمان اس قدر سنگدل کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلام تو انسانی پستیوں کی ناہمواریاں دور کر کے مساوات قائم کرنے آیا ہے ہم نے عورت کو لعنت و محرومی کی پستیوں سے نکال کر اپنے برابر کھڑا کیا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ نرملہ، آفریدی کی باتیں سن کر بچوں کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کرنے لگی۔ ”کاش! میری آنکھیں یہ منظر دیکھ سکیں اور میں اپنے دل و جگر سے کہہ سکوں کہ اب تو انسانیت پر اعتبار کر لے۔“

”راج کمار! کیا تمہیں میری باتوں پر شک ہے؟“ آفریدی نے بڑے اداس لہجے میں پوچھا۔

”نہیں سردار!“ نرملہ جذباتی ہو کر رونے لگی۔ ”تم سچے، تمہارا مذہب سچا مگر میں اپنی چشم نہا کر کوکبا کروں جو عورتوں کی ذلت و بربادی کے مناظر دیکھتے دیکھتے پھرا گئی ہیں۔ اب یہ آنکھیں سکون دے دو گا دھندلا عکس دیکھنے کے بھی قابل نہیں رہیں۔ دل بے اعتبار کو کیا کروں؟ یقین ہی نہیں آتا کہ اس دنیا کے کسی خطے میں عورت محترم بھی ہو سکتی ہے۔“ نرملہ کی مایوسی ناقابل بیان تھی۔

”نرملہ! بس کچھ دن اور۔“ کشمکش انتظار ختم ہو چکا تھی۔ غم قریب میں تھیں وہ مناظر دکھاؤں گا کہ تم اہل وفا سے راضی ہو جاؤ گی۔“ آفریدی کی پکلیں پھر تم ہوئے لگی تھیں۔

”کاش! وہ دن میری زندگی میں آجائے۔“ نرملہ کے اشکوں کی روانی کچھ اور بڑھ گئی۔ ”دن تو کیا سردار! بس ایک ہی لمحہ میرا مقدر بن جائے۔ میں اسی پر قناعت کر لوں گی۔ ماہ و سال سے بے ملنے والے کئی اور ہوں گے۔ مجھے تو صرف ایک ساعت چاہئے۔ میں اسی ساعت سے مطمئن ہو جاؤں گی۔“

”راج کمار! تم اپنی زندگی کے سفر میں منزل سے اتنی مایوس کیوں ہو؟“ آفریدی، نرملہ کی ہمت شکن باتیں سن کر پریشان نظر آنے لگا تھا۔

نرملہ نے اداس نگاہوں سے آفریدی کی طرف دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔ ”ہاں سردار! میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں۔“ نرملہ کالجہ بہت تھکا ہوا کستا تھا۔ ”اگر زیادہ دیر ہو گئی تو شاید میں اپنے خوابوں کی تعبیر نہ دیکھ سکوں۔ اب آنے والوں کو آجانا چاہئے کب تک راہ دکھائیں گے۔“

”آنے والے تو آچکے مگر تم جانے کی باتیں کیوں کرتی ہو؟“ آفریدی بہت زیادہ دگر رفتہ ہو گیا تھا۔

”سردار! میں نے اپنے دل کے سارے بوجھ اتارنے میں غلت سے کام لیا ہے۔“ اچانک نرملہ کی آنکھوں میں شناسائی کا ایک عجیب سارنگ ابھر آیا تھا۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لئے وہ راز بھی سن لیں جس نے مجھے زندگی سے مایوس کر دیا ہے۔“ یہ کہتے کہتے نرملہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں میں جلنے والی محبت کی قد بلیں آہستہ آہستہ بجھنے لگیں۔

”میری پیدائش سے پہلے راج چوتھی نے پتلی کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکے کے باپ نہ بن سکیں گے۔ ایک لڑکی پیدا ہوگی جس کے دنیا میں آتے ہی ماں کا انتقال ہو جائے گا۔ راج چوتھی کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ پتلی نے میرے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا گیا کہ لڑکی مسلسل عذابوں کا شکار رہے گی۔“

”کیا تم جرمیوں کی پیش گوئیوں پر اعتبار کرتی ہو؟“ آفریدی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”ہندو مذہب کے ماننے والے تو جیوتشی کے مشورے سے پہلے کوئی کام ہی نہیں کرتے۔ اس لئے ہمارا

نرملہ کا احساس جاگا تو اس کے چہرے پر شرم و حیا کے ساتھ خجالت کا رنگ بھی ابھر آیا۔ ”میں سلیہ میرا کہا کہ رامیشوری اور چندر سنگھ محبت و وفا کا آخری پیکر تھے؟“

”پھر ساری دنیا سے یہ بے اعتباری کیوں؟“ آفریدی نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ایک ناپاکال کر دیا۔

”دنیا میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔“ نرملہ دوبارہ اپنے خول میں واپس جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دنیا نے اپنی دفا شعاری کا ثبوت فراہم نہیں کیا۔ جب بھی آزمائش کا وقت آیا اس نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ پھر کوئی کسی پر کیوں اعتبار کرتا؟“

آفریدی اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ نرملہ کے سامنے لا جواب ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے منطق کا سہارا لیا۔

”اگر کسی ایک شخص کو آنکھیں نہیں ملیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ساری دنیا تاریک اور ہر شے بے نور ہے۔“

”روشنی کا اپنا کوئی بھی اصول ہو لیکن وہ دیکھنے کی چیز ہے۔“ نرملہ بھی ایک طاقتور دلیل پیش کر رہی تھی۔

”جب آنکھوں سے محروم شخص اجالے کی کوئی کرن نہیں دیکھ سکتا تو پھر وہ روشنی کے وجود پر گواہی بھی نہیں دے سکتا۔“

”اسے گواہی دینا چاہئے۔“ آفریدی کا لہجہ پر جوش تھا۔ ”اسے یہ آواز بلند کرنا چاہئے کہ میری تاریک دنیا کے باہر سورج موجود ہے، ستارے چمک رہے ہیں اور چاند روشنی تقسیم کر رہا ہے۔“

”آخر آپ کی یہ ضد کیوں ہے کہ ایک ناپیدا انسان روشنی کے ترانے گاتا رہے؟“ نرملہ نے سوال کیا۔

”اس لئے کہ روشنی روشنی ہے۔ انسان کو اسی کے خواب دیکھنے چاہئیں۔ کیا جرب کوئی روشنی کی گہر آنکھوں پر اترے اور مقدر کے اندھیروں کو مٹاتی چلی جائے۔“ آفریدی ’نرملہ کو محرومیوں کے حصارے باہر نکالنے کیلئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔“ اعلیٰ طرفی یہ ہے کہ خود دکھی ہو محروم دوسروں کیلئے خوشیاں مانگے۔“

”آخر آپ مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ نرملہ ایک ایک بات سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”اگر میں کم ظرف ہوں تو مجھے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ میں نے کب کسی اعلیٰ ظرف سے اپنی زندگی کی ایک گلی تھی۔“ نرملہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور غصے کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

”میں ان کوئی کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ سب کے سب تقدیر کے آلہ کار ہیں۔ قسمت جو چاہتی ہے وہی کام ان سے کر لیتی ہے۔“ آفریدی کا لہجہ بھی قدرے تلخ ہو گیا تھا۔ ”اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میں خود حالات کے سمجھنے میں رقص کرنے والا ایک حقیر سا تنکا ہوں۔ میں کسی کی غم خواری یا کراہٹ ہوں؟ میں نے تو راج چیوتھی کی پیش گوئی پر اعتراض کیا تھا اور تمہیں اس کائنات کی ایک پوشیدہ جنت بتانے کی کوشش کی تھی کہ آسمانوں کی وسعت میں تیرے ہوئے ستارے انسانی مقدر پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ خود بے دست و پا ہیں، کسی کے حکم کے محتاج۔ ستاروں کی گردش ان کے اپنے اعتدال نہیں۔ پھر وہ تمہاری تقدیر کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تم پیدائش کے بعد اپنی ماں کی آغوش سے محروم ہو گئیں۔ پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی اور تمہارے باپ بھی تم سے چھوٹے بے شک! یہ بڑی آزمائش تھی مگر ستاروں کا اثر نہیں تھا۔ پھر چندر سنگھ اور رامیشوری رخصت ہوئے تو راج چیوتھی اور بھی سچا نظر آئے لگا۔ حالانکہ وہ ازلی جھوٹا ہے۔ اسے اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو وہ تمہارے مستقبل کی کیا خبر دے گا؟“ آفریدی کی آواز بلند تھی اور لہجہ تلخ تھا۔

اس دور ان نرملہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آفریدی نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ ”میں مہمانتزی ورم سنگھ دہان کی بیٹی راج کمار کی نرملہ سے گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ میرے مخاطب اس ظلم کدے کے پتھر ہیں لیکن ان ہی پتھروں کو اپنی تقریر سنارہا ہوں۔ راج چیوتھی تو یہ بھی کہتا تھا کہ چوڑا بیٹا امن و عافیت کے ملنے میں سرسبز شاداب رہے گا اور کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ مگر تم راج چیوتھی کے ہوتے ہوئے بھی محسوس کر رہی ہو کہ چوڑی کی آزادی و خوشحالی کے دن گئے جا چکے ہیں۔ چوڑے کے جس دشمن کو منتروں اور جاہلوں کی مدد سے ہلاک کر دینے کے دعوے کئے گئے تھے وہ اپنے پورے بھوجیوں کے ساتھ آپہنچا ہے۔ اسے نہ ستاروں کی چالیں روک سکیں اور نہ صدیوں سے خدائی کاروپ دھارنے والے پتھر کے جھمکے۔ وہ آیا اور اس طرح آیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تلخ زنجیر غلامی ہے اور دوسرے ہاتھ میں موت کا زہر آلود جام۔ اب دیکھیں کہ اہل چوڑا کس کا انتخاب کرتے ہیں؟ اپنے پاؤں آگے بڑھاتے ہیں یا ریزتے ہوئے ہاتھ؟“ آفریدی اس بات سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا کہ اس کے لفظوں کی کھربنی سے نرملہ کے دل و جگر کھٹکتے ہیں یا اس کی روح پر جراثیم کے نشان ابھرتے ہیں۔ ”چوڑے کے عکروں، سیاستدانوں، جادو گروں، نجومیوں اور جوگیوں نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے مگر سارے کے ملنے خواب باطل ثابت ہوئے۔ ان کا گمان ان ہی کے منہ پر لٹ دیا گیا اور ان کے خواب ان ہی کی کھلی آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ کر دیئے گئے اب بھی اگر تمہیں اپنے خوابوں کی سچائی پر یقین ہے تو انہیں سینے سے لگا کر یہاں سے نکل جاؤ اور راج چیوتھی سے پوچھو کہ تمہارا مستقبل کیا ہے؟“ یہ کہہ کر آفریدی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور نرملہ کمار کی طرف دیکھنے لگا جو دم بخود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی بیحد ترین گوشے میں بھی یہ تصور موجود نہیں تھا کہ آفریدی کا لہجہ اس قدر تلخ اور سرکش ہو سکتا ہے۔

دلوں طرف گہرا سکوت تھا۔ آفریدی کچھ دیر تک نرملہ کا اداس چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں بلانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی تنہائی کا راز وار بنایا۔“

آفریدی جاتے جاتے اچانک مڑا اور نرملہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”اگر عمر نے وفا کی اور وقت میری گرفت میں آگیا تو آپ کے اس احسان کا قرض بھی اتار دوں گا۔“ آفریدی ’نرملہ کو تنہا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

آفریدی ذہنی طور پر پریشان تھا اس کے دل و دماغ جل رہے تھے۔ نرملہ کے سلسلے میں اسے اپنے لیے کی جبریت کا احساس ہو گیا تھا اور اب شرم و ندامت نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس تنگدلی کے عکس ہرگز نہ کر دیکھیں لے رہا تھا کہ ایک اس کی پلکیں بوجھل ہوئے لگیں اور پھر اس پر گہری نیند طاری ہو گئی تھی۔

نرملہ بیدار ہوئے تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ وہ منتزی بھون کے ظلم کدے سے نکل کر ایک مندر میں آگیا۔ وہاں شہر بھر کی بچاری اپنے دیوتاؤں کی پوجا میں مصروف تھے۔ آفریدی ان سب سے دامن بچاتا ہوا قدموں کے ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ جہاں دروازے پر ایک بوڑھی عورت سفید ساڑھی میں ملبوس ہو کر عورت کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی اور ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ چیلی ہوئی تھی۔ آفریدی نے اسے دیکھا۔

”نرملہ! عورت آؤ۔ میں نے تمہیں ایک ضروری کام سے یہاں بلا لیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھی

کی بات میں، رام دیو کی عیاریاں اور رانی پد منی کا تشدد نہ ڈوسکا وہ ایک نازک مزاج اور ضدی لڑکی کے ہونے میں ذوق گیا۔

”آپ ان لوگوں کو نہیں بتائیں گے کہ وہ لڑکی کیوں روتی تھی اور اسے یہ آنسو کس نے بخشے تھے؟“

نرملے نے سستے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”نپا آنسوؤں کی خریدار نہیں۔ وہ صرف قہقروں کی تاجر ہے اور ان کا ہی مول لگاتی ہے۔“ آفریدی نے کہا۔

”ہمیں انھوں کو اپنے ہی گوشہ چشم میں قید رکھنا چاہیے جب بھی یہ آزاد ہوں گی غیب کی برکتی جاری تھی۔“

”ہمیں انھوں کو اپنے ہی گوشہ چشم میں قید رکھنا چاہیے جب بھی یہ آزاد ہوں گے اسی دن رونے والوں کو تماشا بنا ڈالیں گے۔“

”سردار! آپ سے بھی میرے آنسو برداشت نہیں ہوتے؟“ نرملے نے عجیب معصومیت سے پوچھا۔

”تم بھول رہی ہو نرملہ!“ آفریدی نے کہا۔ ”وہ میں ہی تو تھا جس نے ایک روز تم سے کہا تھا کہ اپنے بدلے آنسو بردار میں جذب کر دو مگر مجھے راجپوت مردوں کی سفالیوں کا انتقام نہ لو۔ اگر میں تمہارا حرف اعتبار نہیں تو مجھے مٹا دو لیکن انسانیت پر اتنا شک نہ کرو کہ آنے والوں کیلئے تمام راستے ہی بند ہو جائیں۔“

”یہ غلط ہے سردار! یہ غلط ہے۔“ نرملہ گہرا کر تیز لہجے میں بولی۔ ”میں نے ایک لمحے کیلئے بھی آپ کو اعتبار نہیں سمجھا۔ خدا مجھے اس دن کیلئے زندہ نہ رکھے جب میں آپ پر شک کروں۔“ ایک بار پھر نرملہ کے آنسو بہنے لگے تھے۔

فہار جذبات کی دھند چھانے لگی تو آفریدی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ نرملہ کمرے سے نکل کر باغ میں آئی۔ سر میں ہاتھ منہ دھوئے تو ٹھٹھن کم ہوئی اور تازہ ہوائے شادابی کا ہلکا سا احساس بخشا۔

کھانے کے بعد آفریدی نے اسی خواب کا ذکر دوبارہ چھیڑ دیا جس نے نرملہ کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

”اسے جانے دیجئے سردار! اب میں کبھی آپ کو اپنا خواب پریشان سنا کر آزرہ نہیں کروں گی۔“

نرملہ گریہ اختیار کر رہی تھی۔

”میں تمہیں ماضی کی اس رہ گزر پر لے جانا نہیں چاہتا جو دکھوں کے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے مگر پھر بھی اپنے خواب کی کچھ اور تفصیلات بیان کرو۔“ آفریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بچپن سے رام دیو کو جانتی ہو؟“

”میں!“ نرملہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو اسے گزشتہ سال چند ہی تقریبات میں دیکھا تھا۔ یا پھر وہ راجہ راجہ میں کسی جشن کے موقع پر نظر آتا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ رام دیو چوڑا کاسب سے بڑا گیانی ہے مجھ اس سے کسی حد تک عقیدت ہو گئی تھی مگر جب پتا چلی اور اس کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو یہ راز کھلا کہ وہ مہر کی نقاب پن کر کسی کیسی شعبہ بازیوں دکھاتا ہے۔ پھر مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔“

”اس نفرت کے بعد وہ تمہیں خوابوں میں دکھائی دیا؟“ آفریدی نے ایک اور سوال کیا۔

”اس سے بہت پہلے وہ مجھے خوابوں میں نظر آتا تھا مگر میں اسے پہچانتی نہیں تھی۔“ نرملہ نے وضاحت کی۔

”ایک دن اچانک میں نے محسوس کیا کہ مجھے قتل کرنے والے اس کریہہ النظر انسان کو ہر دم دیو سے ملتا ہے۔ میں نے صبح بیدار ہوتے ہی پتا چلی کے سامنے اپنا خواب بیان کر دیا۔ پتا ہی خاموش ہو گیا۔ راجہ جیو تھی یا کسی مذہبی پیشوا سے میرے خواب کی تعبیر دریافت نہیں کر سکے تھے۔ رام دیو، راجہ

عورت نے دروازہ کھول دیا اور آفریدی ایک سرزدہ انسان کی طرح اندر داخل ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور وہ ہندوؤں کی عبادت گاہ میں کس لئے آیا ہے؟ بوڑھی عورت نے شاید اس کی ذہنی پریشانی کا سبب جان لیا تھا، اس لئے ایک مشتقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

”میرے دو بچے ہیں۔ ایک تم اور ایک نرملہ۔ کوئی ماں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی اولاد کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے فرق آجائے۔ تم نرملہ کو نہیں جانتے۔ وہ بہت معصوم لڑکی ہے اس نے اس سنار میں ان گنت دکھ جھیلے ہیں۔ تم اسے اور دکھی نہ کرو۔ فوراً واپس جاؤ اور میری بیٹی کو مٹانے کی کوشش کرو ورنہ تمہاری ماں تم سے روٹھ جائے گی۔“

”مگر تم میری ماں تو نہیں ہو۔ میں نے تمہیں آج تک نہیں دیکھا۔“ آفریدی شدید حیرت کے عالم میں بول رہا تھا۔

”میں بھی تمہاری ماں کی طرح ہوں۔ عنقریب تم مجھے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔ جلدی کرو، وقت بہت کم ہے۔ نرملہ کو آہستہ آہستہ اندھیرے سے نکالو۔ اگر تم نے جبر اور غصے سے کام لیا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر جائے گی۔“

جیسے ہی بوڑھی عورت کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی، وہ گہرا کر اٹھ بیٹھا۔ آفریدی نے ایک عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ وہ اس عورت کو پہچاننے سے قاصر تھا جو اس کی ماں ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ آفریدی بہت دیر تک خواب کے مناظر میں الجھا رہا۔ پھر اسے نرملہ کا خیال آیا۔

”شاید نرملہ اس تلخی بیانی کی مستحق نہیں تھی۔“ آفریدی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”بالآخر وہ ایک عورت ہے۔ غیرت مند اور خودوار عورت جسے حادثات کی بارش نے دنیا کے ہر مرد کی طرف سے مشکوک بنا دیا ہے۔ اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک بتوں کی پوجا کی ہے۔ اس کی ایک ایک سانس توہم پرستی کی فضا میں گزرتی ہے۔ اس کا پورا ماحول گمراہ کن عقائد کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کبھی وہ پتیل کے درخت کی جڑوں میں انسانی سروں کو جھکا ہوا دیکھتی ہے۔ کبھی نیل کنپٹ (پرندے) کو دیوتا کے روپ میں آدم زادوں کی بستیوں پر سایہ قلعن پاتی ہے۔ کبھی ایک حقیر کچھو ادھرتی کا سارا بوجھ اٹھالیتا ہے۔ کبھی زہریلے اور خوفناک سانپ خالص دودھ پی کر آستینوں میں لپکتے ہیں۔ کبھی دریاؤں کی دیوی جوان اور کنواری لڑکیوں کی بھیئت قبول کرتی ہے۔ کہیں ایک جانور کی گندگی مشک و عطر سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ تو کہیں دلوں پر سیاہ بیوؤں کے پیرے ہیں۔ کہیں ایک دیوتا دوسرے دیوتا کی بیوی پر بری نظر رکھتا ہے تو کہیں اوتاروں کی بیویاں اپنے شوہروں سے بے وفائی کرتی ہیں۔ کہیں رقص ہے، کہیں نشہ ہے اور کہیں مری کی تائیں ہیں جن پر ہزاروں دوشیزائیں اس لئے ناچ رہی ہیں کہ کب کوئی منور آئے اور انہیں ”بند رانین“ کی ”سج گلی“ میں لے جائے۔“ علی عامر آفریدی کا ذہن چوڑی کی تمذیب کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کر رہا تھا۔

”پھر اگر نرملہ کماری بھی ستارہ پرست ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ ابھی حلقہ اسلام میں نرملہ کی حیثیت اس بچی سے زیادہ نہیں جس نے پورے اعتماد اور استقامت کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا نہیں سیکھا ہے۔ پھر وہ زندگی کے سفر میں تیز رفتاری کے ساتھ کس طرح چل سکتی ہے؟“

آفریدی کو ہوش سا آگیا اور وہ دوبارہ نرملہ کے کمرے میں داخل ہوا اور نرملہ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”مگر تم اسی طرح روتی رہیں تو ایک دن آفریدی ضرور غرق ہو جائے گا۔ پھر کہنے والے کہیں گے کہ جسے لک کا

رتن سنگھ اور رانی پدمنی کے دلوں پر حکومت کرتا تھا اس خوف سے پتائی مجھے خاموش رہنے کی تلقین کرتے رہے کہ کہیں میری زبان پر رام دیو کا نام نہ آجائے اور پھر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑے پتائی کا خیال تھا کہ میرے دل میں رام دیو کیلئے نفرت کے جذبات پوشیدہ ہیں اور وہی نفرت خوابوں میں ڈھل کر کاخیال تھا کہ ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ چہرہ بچپن سے میرا عقاب کر رہا ہے مگر وقت نے میرے باپ کو اتنی سہولت نہ دی کہ وہ اپنی بیٹی کے اس بھیانک خواب کا راز معلوم کر سکتے۔

”میرے خیال میں مہماننزدی کا اندازہ درست تھا۔“ آفریدی نے بہت غور و فکر کے بعد کہا۔ ”میں نفرتیں اور محبتیں انسانی ذہن کو اتنی مضبوطی سے گرفت کر لیتی ہیں کہ پھر وہ اس کے خوابوں کا ایک مستقل حصہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ تم رام دیو کے ناپاک تصور اور اس کے گھناؤنے وجود کو اپنے دماغ سے نکل کر بھٹک اور سمجھ لو کہ وہ آگ کا ایندھن بن گیا اور پھر اس کی غلیظ راگھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ تم بس روشنی کے خواب دیکھو۔ یہ روشنی جو آسمانوں سے اتر کر چوڑ کے تاریک زنداں میں داخل ہو رہی ہے اور صدیوں کے اندھیرے سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔“ اس کے بعد آفریدی نے نرم لہجہ میں آیات قرآنی یاد کرائیں اور پر زور لہجے میں کہا۔ ”یہ کلمات مقدسہ رام دیو کو اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ وہ تمہیں خوابوں میں آکر پریشان کر سکے۔“

☆.....☆.....☆

آفریدی اور نرملا کے دلوں میں جو طوفان اٹھا تھا وہ کسی جانی کے بغیر خاموشی سے گزر گیا۔ مگر سلطان علاء الدین خلجی کے لشکر میں جو سیلاب آیا تھا وہ ہلاکت و بربادی کے بغیر نہیں گزرا۔ اس میں کئی لاکھیں زمین پر تپیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ سلطان کے پورے لشکر پر ایک لرزہ سا طاری تھا مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ علاء الدین خلجی سے رحم و کرم کی بھیک بھی مانگ سکے۔ سلطان نے مرنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے دامن کو جھٹک دیا تھا اس اشارے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجرموں پر زندگی کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور سلطان کے دامن میں موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دردناک واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ سلطان کے چار سپاہی جاسوسی کے فرائض انجام دیتے دیتے چوڑ کی نواحی آبادی میں داخل ہو گئے۔ یہ بہت سی شورروں کی بستی تھی جہاں ہندو دھرم کے مطابق بچہ ذات کے لوگ رہتے تھے۔ جب سلطان کے سپاہی بستی میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والے ایک خاص جذبہ احترام کے ساتھ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ ساری بستی میں سلطان کے انعامات و نوازشات کی دھوم مچی ہوئی تھی اور تاجدار ہند کی اسی ادا نے چھوٹے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ سراغ رساں سپاہیوں نے کچھ دیر تک بہت سی دالوں سے رکھی باتیں کیں اور اس دوران وہ ان نوجوان لڑکیوں کو دیکھتے رہے جو شاہی سپاہیوں کو دیکھنے کے شوق میں اپنے اپنے گھروں سے نکل آئی تھیں۔ سلطان کے فوجیوں نے پہلی بار راجستھان میں حسن و شادابی کی ایک نئی لہر دیکھی تھی۔ سانوں لے چرے، چٹان جیسے جسم، میلے کپیلے لباسوں میں الزار پر شور و جاناں ندی میں آنے والی ہاڑھ کی طرح تندو تندو۔ سلطان کے سپاہیوں نے چار لڑکیوں کا انتخاب اس طرح کیا جیسے کوئی خریدار بہت دیر تک بھیڑ بکریوں کی قطاروں کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنی پسند کا جانور خرید لیتا ہے۔

”یہ کچھ دن ہماری خدمت کریں گی۔“ ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔ ”جب یہ ہماری خدمت کے تھیں نہیں رہیں گی تو ہم انہیں واپس بھیج دیں گے تم لوگ دوسری لڑکیاں تیار رکھنا جو ہماری خدمت کی اہل بیت ہو سکیں۔“

بستی والوں نے یہ جابرانہ حکم سن کر سر جھکا لئے۔ سپاہی نے غریبوں کی بستی کے ترسے ہوئے لوگوں کو

لنگر لے کر چلے گئے۔ ”ہم اس شہنشاہ کے سپاہی ہیں جو تمہاری تقدیروں کا مالک ہے۔ تم نہیں جانے کہ تمہاری زندگی کیسے نرالے ہیں۔ تم یہاں تک آسودہ ہو جاؤ گے کہ تمہارے گھر بھر جائیں گے۔“

مناہٹیں کے چروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

”میں لڑکیوں کے باپ کہاں ہیں؟“ تیسرے سپاہی نے بلند آواز میں ان بد نصیب انسانوں کو پکارا

نیا آمد کا سودا ہو رہا تھا۔

پای کے الفاظ کی گونج ختم ہوتے ہی چار آدمی آگے بڑھے جن کے جسموں پر کپڑوں کے نام پر ڈھکیلے ہوئے تھے اور زندگی کے مسائل جھریوں کی شکل میں پورے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

”اگر چہ تمہاری اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ اپنے پیروں کے نیچے دلی ہوئی کسی چیز کو مسل رہا ہو۔“ اگر مان کو خبر ہو جائے کہ تمہاری لڑکیوں نے ہماری خدمت کی ہے تو تم صرف انکار کر دینا۔“ سپاہی نے

”ہم (مالک) اس چیز کا انکار؟“ بوڑھے باپ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”سلطان سے کہہ دینا کہ ہم یہاں نہیں آئے تھے۔“

علاء الدین خلجی کے سپاہی نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”سلطان کے سامنے کھلے الفاظ میں اقرار کرنا کہ

وہ خوابی لڑکیوں کو لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔“ جبر و اقتدار نے مظلوموں سے تڑپنے

نرا دروغاں کا حق بھی چھین لیا تھا۔

”ایسا ہو گا وانا ایسا ہو گا۔“ بوڑھے نے جھک کر سپاہی کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”ہمارے

بہ گناہوں کی بات نہیں۔ ہم تو ایسا کرتے ہی آئے ہیں۔ بڑے لوگ ہماری کنیاؤں کو اسی طرح چھین کر

جاتے ہیں اور جب ہم سے کوئی پوچھتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ خود ہم نے اپنی بیٹیوں کو سجا کر ان کی سیوا

کی ہے۔“

”تمہیں اپنی ہی رسم جاری رکھنی ہوگی کہ اسی میں تمہارے لئے بھلائی اور خیر ہے۔“ چاروں سپاہیوں

بلک زبان کہا اور اپنی اپنی پسندیدہ لڑکیوں کو لے کر خیموں کی طرف چلے گئے۔

ان چار لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ایسی تھی جس نے آج سے پہلے کسی موج بلا کا سامنا نہیں کیا تھا۔ باقی

تین لڑکیاں راجپوت سرداروں کے ہوس کدے کی سمجھوتہ چڑھ چکی تھیں۔ وہ لڑکی جو اب تک ظلم کے خون کی

سپاہی نے تلوار پھینک دی اور لڑکی کا منہ بند کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ اچھوت لڑکی ابھی اپنے حواس میں تھی۔ وہ خیمے کے ایک گوشے میں سٹ گئی۔ جب بدحواس سپاہی اس کے قریب آیا تو وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے بچ کر باہر نکل گئی اور پوری طاقت سے چیخنے لگی۔ ”کیا تم سب ان ہی درد مندوں کے ساتھ ہو؟ کیا تمہیں موت کھا گئی؟ اپنے خیموں سے باہر کیوں نہیں آتے؟ کیا اتنے بڑے لشکر میں ایک بھی سپاہی ایسا نہیں جو سلطان کو ان نافرمانوں کی بدنامیوں کی خبر دے سکے۔“

اچھوت لڑکی رات کے اندھیرے میں دریائے گبیہری کے کنارے بھاگتی رہی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سپاہیوں کے خیمے دور دور ہیں وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی ایک آواز پر بہت سے سپاہی دوڑے چلے آئیں گے مگر جب اس کی چیخوں کے جواب میں کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تو اسے یقین آ گیا کہ سلطان کے سارے سپاہی ہوس کے اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ بڑے ہمت شکن لحاظ تھے مگر لڑکی نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ وہ بھاگتی رہی اور کچھ دور چل کر ایک دوسرے خیمے میں داخل ہو گئی۔ یہ خیمہ ترکی کے سردار امیر شایان کا خیمہ تھا جب لڑکی خیمے میں داخل ہوئی تو امیر شایان نماز پڑھ رہا تھا اور حالت قیام میں تھا لڑکی اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ کون شخص ہے اور اس وقت کونسا فریضہ انجام دے رہا ہے؟ اس نے قریب پہنچ کر امیر شایان کو جھنجھو کر رکھ دیا۔

”تو کس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے؟ تجھے خبر بھی ہے کہ تیرے قریب کے خیموں میں بوڑھے باپوں کی جوان لڑکیاں ذبح کی جارہی ہیں۔“

امیر شایان کی نماز مکمل نہیں ہوئی تھی مگر اس نے لڑکی کی چیخیں سن کر نیت توڑ دی۔ اس دوران وہ سپاہی بھی خیمے میں داخل ہو چکا تھا۔ سپاہی کو دیکھتے ہی لڑکی دوبارہ چیخیں۔

”یہی وہ بھیڑیا ہے جو میرا گوشت کھانا چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ میری بستی کی تین لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

امیر شایان نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور قہر آلود نظروں سے سپاہی کی طرف دیکھا۔

”امیر! آپ اس معاملے میں مداخلت نہ کیجئے۔“ سپاہی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ ہمارے متعدد علاقے کی لڑکیاں ہیں جن کے جسم و جان پر ہمیں تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے۔“ امیر شایان کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی۔ ”سلطان نے انہیں امان بخشی ہے۔ یہ ہماری شمشیروں کے سانپان میں ہیں۔“

”امیر! آپ ایک کافر لڑکی کیلئے اپنے بھائی کو جھوٹا قرار دے کر ذلیل کر رہے ہیں۔“ سپاہی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”اسلام نے تیرے اور میرے درمیان برابری کا رشتہ قائم کیا تھا۔“ امیر شایان کی آواز بلند ہوئی۔

غضب سے لرز رہی تھی۔ ”جب تو نے اس تعلق کا احترام برقرار نہیں رکھا تو پھر سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ اب میرے نزدیک تو ایک حقیر سپاہی ہے جس کی گردن میں گناہ عظیم کا طوق صاف نظر آ رہا ہے۔ تو نہ اپنی نافرمانی سے اور سلطان معظم کا بھی۔ یہ تیرا دوا پر اصرار ہے مجھے ہلاکت سے نہیں بچا سکے گا۔“ یہ کہہ کر امیر شایان نے اپنی تلوار اٹھائی۔ سپاہی ترکی سردار کی یہ حالت دیکھ کر بھاگا۔ امیر شایان نے خیمے سے باہر نکل کر پہنچے ہوئے اپنے سپاہیوں کو پکارا۔ قریب کے خیموں میں لرزہ مچا دیا۔ چند سپاہی امیر شایان کے قریب آئے اور ادب سے سر جھکائے ہوئے اپنے سردار کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد پچاس ساٹھ سپاہیوں نے ان چاروں فوجیوں کے خیموں کو گھیر لیا جو چوڑی بستی سے بڑا

سپاہیوں کے سپاہیوں نے اس سرکش فوجی کو زخموں میں لے کر زیر کرنا چاہا مگر ترکی سردار نے انہیں روک دیا۔ اور خود جھپٹ کر تلوار کا دار کیا۔ مجرم سپاہی اپنے دفاع میں پیچھے ہٹا۔ امیر شایان کی شمشیر دوبارہ لڑائی اور اپنے مقابل کے ہاتھ پر گہرا زخم چھوڑتی ہوئی زمین سے جا گئی۔ زخم کاری تھا، مجرم کے ہاتھ سے تلوار گر گئی دوسرے ہی لمحے وہ رسیوں میں جکڑا ہوا اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ لکڑی کے پل کو پار کر رہا تھا۔ چاروں لڑکیاں بھی سپاہیوں کے درمیان سسبی ہوئی چل رہی تھیں۔ امیر شایان اسی وقت رات کے اندھیرے میں تمام مجرموں کو سلطان کے سامنے پیش کر دینا چاہتا تھا۔

اور جب امیر شایان نے علاء الدین خلجی کو اس دردناک سانحے کی اطلاع دی تو سلطان سر سے پاؤں تک قہر و غضب کا زائدہ مجسمہ بن گیا۔ ”سلطان معظم! یہ غلام آپ کے آرام میں خلل اندازی کا مجرم ہے لڑکی بھوری تھی کہ مجھ سے یہ رات کاٹے نہیں کئی۔“ امیر شایان نے فرسش پر دونوں گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنا سر علاء الدین کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

”نہیں شایان! تم نے کوئی گستاخی نہیں کی۔“ جوش غضب میں سلطان کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ ”اگر تم یہ رات سو کر گزار دیتے اور صبح ہمیں اس حیا سوز واقعے کی اطلاع دیتے تو ہماری نگاہ جلال میں تم بھی مجرم بن کر رہ جاتے۔ اس وقت ان بے نسب نمک حراموں کو ہمارے سامنے لے جاؤ۔ ہم ان کی دہشت میں ان کے سیاہ چہرے کو دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔“

امیر شایان اٹلے قدموں واپس جانے لگا تو علاء الدین نے دوبارہ چیخ کر کہا۔ ”کل صبح ان بد نصیب لڑکیوں کے نامراد باپوں اور بستی کے سارے لوگوں کو بھی ہمارے سامنے حاضر کرو تاکہ تمہارا سلطان پورا برا انصاف کر سکے۔“

☆.....☆.....☆

صبح بڑی لرزہ خیز تھی۔ بستی کے تمام رہنے والے قطار در قطار سر جھکائے کھڑے تھے اور ان کے جسم فز و ہشت سے اس طرح کانپ رہے تھے کہ موت کی ہوائیں انہیں زمیں بوس کر دیں گی یا خس و خاشاک

کا اندازہ کر کہیں دور لے جائیں گی۔ چاروں لڑکیاں اگلی قطار میں تھیں۔ تینوں لڑکیاں جو چپ چاپ ہوں کاٹھانہ بن چکی تھیں، ان کی گردنیں خم تھیں مگر وہ لڑکی جو ایک طاقتور بھیڑیے کے خلاف مزاحمت کر کے امیر شایان کے خیمے تک پہنچی تھی اس کے کھڑے ہونے کا اندازہ بڑا جارحانہ تھا۔

”اٹا! مجھے انصاف دے۔ ایسا انصاف جسے چوڑی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا۔“

علاء الدین خلجی نے اس لڑکی پر نظر کی اور اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ یہ خاموش رہنے کا علامہ تھا۔ اس کے بعد سلطان کے حکم پر ان لڑکیوں کے باپ آگے بڑھے اور زمین پر سجدے کی حالت میں

”تمہیں میرے سپاہیوں سے کیا شکایت ہے؟“ علاء الدین کی پُر جلال آواز گونجی۔

”میں نہیں داتا! کچھ نہیں۔“ وہ سب کے سب زمین پر اوندھے پڑے گڑگڑا رہے تھے۔ ”ہمارے

لوگوں کی لڑکیاں ایتنا چار (ظلم) نہیں کیا۔ آپ ہمارے داتا ہیں اور داتا کا کوئی سینک (سپاہی)

دوشی (مجرم) نہیں ہو سکتا۔ یہ لڑکیاں تو جنم سے داسیاں ہیں۔ ہم تو کئی جگہ سے ممان لوگوں کی سیوا کرتے آئے ہیں۔ اگر یہ اھاگتیں دانا کی سیوانہ کر سکیں تو پوری بستی پڑی ہے۔ ہم اور داسیاں پیش کر دینا گے جو دانا کے من کو بھائے وہی حاضر ہے۔“

ایک لمحے کیلئے علاء الدین خلجی بھی کانپ اٹھا صدیوں کی غلامی نے چوڑے کے اچھوتوں سے غیرت و حیا اس طرح چھین لی تھی کہ اس کا کوئی دھندلا عکس تک موجود نہیں تھا۔ ظلم سستے سستے وہ لوگ اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ اپنی مجبور بیٹیوں کو طاقتوروں کی جائز غذا سمجھنے لگے تھے۔

”نہیں داتا! نہیں داتا! میں اپنی گندی بستی چھوڑ کر کسی ممان پرش کے گھر نہیں جاؤں گی۔ میرا ہاں جھوٹ بولتا ہے۔“ وہ اچھوت لڑکی سسک سسک کر رونے لگی جسے امیر شایان نے اپنے سپاہی کے بیڑہوں سے بچا لیا تھا۔

”لڑکی تو تمہیں نہیں جائے گی۔“ دیکھنے والوں نے علاء الدین جیسے سخت مزاج انسان کی آنکھ میں ہلکی بار نمی دیکھی۔ ”تو اپنی جھوٹی پردی کا چراغ ہے۔ ہم تیری روشنی کو خلوں کے طاق و محراب تک نہیں جانے دیں گے۔ اگر کسی بد بخت نے ہماری خواہش کا احترام نہیں کیا تو ہم اس کے بام و در پھونک ڈالیں گے۔“

پھر علاء الدین نے ان مجبور باپوں کو کھڑا ہو جانے کا حکم دیا جو اپنے آنسوؤں سے پتھریلی زمین بھگور رہے تھے۔

اس کے بعد سلطان کا قہر اپنے مجرم سپاہیوں پر ٹوٹا۔ ”تمہارے سینوں میں وہ کونسا غلیظ جذبہ موجزن تھا جس نے تمہیں اپنے سلطان کے چہرے پر سیاہی ملنے کیلئے اکسایا؟“ علاء الدین شراب لہجے میں مجرم فوجیوں سے مخاطب تھا۔

”ہم حالت جنگ میں ہیں اپنے گھروں سے دور ہیں۔“ چاروں سپاہیوں نے جھگے ہوئے سروں کے ساتھ بیک زبان کہا۔ ”ہم جسموں کی بھوک برداشت نہیں کر سکے۔ سلطان والا حشم خوب جانتے ہیں کہ دشمن سے معرکہ آرائی کے وقت ہر عمل جائز ہے۔“

”تم نے حرام کو حلال بنا ڈالا اور حلال کو حرام کا لباس پہنا دیا۔“ علاء الدین شدت غضب میں اپنی نفست پر کھڑا ہو گیا۔ ”تم سڑی ہوئی مٹی کے کیرے! اپنے خدا کے قوانین کا مذاق اڑانے والے! اپنے سلطان کے بلند نام کو خاک میں ملائے والے!“ خلجی کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ ”تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تم اپنے ہی خنجروں سے اپنی شر رگیں کاٹ دو۔ یہی تمہاری سزا ہے۔“

فرمان شای جاری ہو چکا تھا کہ اس میں جراثیم تھی کہ ایک حرف کے خلاف بھی احتجاج کر سکے۔ سلطان اس وقت تک کھڑا رہا جب تک چاروں سپاہی اپنے خنجروں سے اپنی شریانیں کاٹ کر زمین پر نہ گر پڑے۔ پھر جب ان کے جسم سرد ہو کر اترنے لگے تو سلطان اپنی نفست پر بیٹھ گیا۔

پھر وہ بستی کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ”وہ احساس جو تمہارے دلوں سے چھین لیا گیا تھا، آج ہم اسے واپس کرتے ہیں۔ تمہاری بے زبان لڑکیوں کی عزت و ناموس اور رانی پد منی کی آبروش کو کئی فرق نہیں۔ راجپوت زادیوں کی حیا اور تمہاری بچکوں کی عزت ہم رنگ ہے۔ آج کے بعد اگر کوئی فرق کا دعویٰ کرے تو اسے تباہ بنا کر یہ آسمان کا فیصلہ ہے۔ فوج عالم سلطان علاء الدین خلجی کا قاتم کردہ توازن ہے جسے بگاڑنے والوں پر زندگی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔“

بستی کے لوگ علاء الدین کی بے کار کرتے ہوئے چلے گئے تو سلطان اٹھا اور چاروں لاشوں کے قریب پہنچ کر کچھ دیر تک ان مردہ جسموں کو دیکھتا رہا پھر انتہائی نفرت و حقارت کے لہجے میں بولا۔

”افسوس! ان بد نصیبوں کے مقدر میں شہیدوں کی موت نہیں تھی۔ صد حیف! یہ اپنے وطن سے دور ہاڑی کی موت مارے گئے۔“

☆.....☆.....☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی کے جاسوس مندروں اور بستیوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے گاہری طے بھکاریوں اور حالات کے ستارے ہوئے انسانوں کی مانند تھے جو راجہ رتن سنگھ کے مظالم کا شکوہ کرتے نظر آتے تھے اور اس طرح سلطان کے لشکر کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

شوروں کی صفوں میں بھی رتن سنگھ کے جاسوس موجود تھے۔ بالآخر جب انہوں نے راجہ رتن سنگھ کو علاء الدین خلجی کے نئے اقدامات کی خبر دی تو راج محل میں سناٹا چھا گیا۔ ”سمرات! اس طے نے اپنی بیات سے بستی والوں کے دل جیت لئے ہیں۔“ ایک جاسوس نے راجہ رتن سنگھ کے سامنے اپنی حاصل کردہ معلومات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان چوڑے کے اچھوتوں کو برہمنوں اور راجپوتوں کی اقدار میں کھرا کر کے ایک نیا تہذیبی انقلاب لانا چاہتا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ شوروں کی پوری بستی اسے ”داتا“ کہہ کر پکار رہی ہے اور وہ ان کے بٹھے ہوئے دامنوں کو سونے کے تاروں سے رفو کر رہا ہے۔ یہ بڑی خوفناک سیاست ہے اور اس سے زیادہ تباہ کن عمل یہ ہے کہ اس نے اچھوت لڑکیوں کی آبر و بچانے کیلئے اپنے چار بہترین سپاہیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ بستی والوں نے سلطان کے ان اقدامات کا کھرا تاثر قبول کیا ہے۔“

جاسوس خاموش ہوئے تو راجہ رتن سنگھ نے مہامنتری کشیش سنگھ کی طرف دیکھا۔

”سمرات! کوئی انوکھی بات نہیں، سلطان اس طرح اہل چوڑے کے دل تو جیت سکتا ہے مگر ہمارے اقتدار پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم دنیا کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں بیٹھے ہیں۔“ مہامنتری کشیش سنگھ اپنی خوشامدانه باتوں سے رتن سنگھ کا دل بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوڑے کے حکمران نے کشیش سنگھ کی باتوں کو غور سے سنا اور پھر اپنی محبوب بیوی رانی پد منی کی طرف دیکھنے لگا۔

”مہامنتری درست کہتا ہے کہ چوڑے کے نشیبی علاقوں میں اپنی دولت کا مظاہرہ کرنا دیگر بات ہے اور قلعے کی بندیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا مختلف عمل ہے، دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں اگر سلطان کو نواحی بستیوں میں حیران و پریشان پھرنے کا شوق ہے تو اسے ایسا کرنے دیجئے۔ کچھ دن اسی طرح پتھروں سے سر کرنا پھرے گا اور پھر ایک روز ناکام و نامراد واپس لوٹ جائے گا۔“ چوڑی کی خوبصورت ترین عورت نے علاء الدین خلجی کو ایک بیوقوف اور بھونچا حکمران قرار دے کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”اور تم کیا کہتے ہو بھری سنگھ؟“ راجہ رتن سنگھ اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوا جسے کچھ دن پہلے اس کے محسوسے معزول کر کے حوالہ زندان کر دیا گیا تھا۔

سپہ سالار ہری سنگھ کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا اسے راجپوت سرداروں کے دباؤ کے تحت آزاد کر دیا گیا تھا مگر راجہ رتن سنگھ کے ردیے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی طرف سے چوڑے کے حکمران کا دل صاف ٹھک رہا ہے۔ ہری سنگھ بھی اس طرح منافقانہ رسم و راہ کا قائل نہیں تھا لیکن گردشِ وقت نے اسے ایک نازک مصلحت پر مجبور کیا تھا اگر وہ اپنی تحقیر کا احساس کر کے فوجی عہدے سے دستبردار ہو جاتا تو پوری قوم طعنہ زنی کرتی کہ وہی سنگھ اس وقت ایک گوشے میں روپوش ہو گیا جب ماتر بھومی (ماروٹھن) اسے اپنی حفاظت کیلئے گاہری تھی۔ یہی وہ ذخیرہ تھی جس نے ہری سنگھ جیسے شجاع اور غیرت مند انسان کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔

رتن سنگھ کے تمام درباریوں کی نظریں ہری سنگھ پر مرکوز تھیں۔ اسے خاموش پا کر رتن سنگھ دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”ہری سنگھ! تمہاری خاموشی گستاخی کی دلیل ہے۔“ رتن سنگھ کا لبہ ناخوشگوار تھا۔

”نہ میں گستاخ ہوں اور نہ بے ادب۔“ آخر ہری سنگھ کے ہونٹوں کو جیش ہوئی۔

صرف ایک سپاہی ہوں جو اپنے فرائض سے بخوبی آشنا ہے۔ جب عام لوگ جنگی امور پر بے دھڑک اپنی رائے دے سکتے ہیں تو میری خاموشی ہے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بولوں یا نہ بولوں مگر وہ لوگ تو بول رہے ہیں جن کی آنکھوں نے نہ تیرا دیکھا ہے اور نہ جن کی سماعتوں میں شمشیروں کی جھنکار گونجی ہے۔ ”ہری سنگھ کی بے باک فطرت اسے مصلحت کے تقاضوں سے بہت دور لے گئی تھی۔

”ہم تمہارے جذبوں کی قدر کرتے ہیں ہری سنگھ!“ راجہ رتن سنگھ لہجہ بدل کر بولا۔ ”اپنے دل و دماغ کا غبار دھو ڈالو غلط فہمیوں کو زیادہ دیر قائم نہیں رہنا چاہئے۔“

”سمرات! میں اپنا سینہ ہمیشہ صاف رکھتا ہوں۔“ ہری سنگھ کے لبہ میں سپاہیانہ جلال تھا۔ ”اگر دل میں غبار ہوتا تو اہل دربار راج محل میں میری پرچھائیاں تک نہ دیکھتے۔“

”تو پھر تمہارا منصوبہ کیا ہے؟“ رتن سنگھ نے پوچھا۔ ”سلطان کے بڑھتے ہوئے قدموں کو کس طرح روکا جاسکتا ہے؟“

”فی الحال ہم علماء الدین خلعی کی یلغار کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔“ ہری سنگھ نے کسی رعایت کے بغیر اپنی رائے پیش کر دی۔ ”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے فوجی جہول ہیں یا مقابلے سے جان چر رہے ہیں۔ ہمارا ایک ایک سپاہی سرفروشی کے جذبے سے سرشار ہے مگر ہمارے پاس سر کم ہیں اور سلطان کی شمشیریں تعداد میں زیادہ ہیں۔ اگر ہم نے اپنے سروں کو عقل کی گرفت سے آزاد کر دیا تو علماء الدین کی تلواروں کی پیاس کچھ اور بڑھ جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ پیاس بھرنے نہ پائے اور ہم اپنے سروں کا استعمال اس وقت کریں جب ہمیں فتح کا یقین ہو جائے۔“

”تم بڑی عجیب بات کر رہے ہو ہری سنگھ۔“ راجہ رتن سنگھ حیران ہو کر بولا۔

”سمرات! میری کوئی بات عجیب نہیں۔“ ہری سنگھ بڑے اعتماد سے بول رہا تھا۔ ”کھلے میدان میں سلطان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اسے کچھ دن اور صحرائی گرمی میں جھلنے دیجئے پھر ہم دیکھیں گے کہ اس کے حوصلوں میں کتنی توانائی باقی ہے۔ اس دوران ہمارے سامان رسد میں مسلسل اضافہ جاری رہنا چاہئے۔ بے شک! ہمارے قلعے کی دیواریں بہت مضبوط اور بلند ہیں۔ سلطان کا لشکر کسی بھی دروازے سے داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے یہ مجبورا نہ حرکت کی تو ہمارے تیر انداز ایک بھی مسلمان سپاہی کے سینے اور گلے کو محفوظ نہیں رہنے دیں گے۔ ہمیں اس جنگ میں قلتِ افواج کے باوجود یہ برتری حاصل ہے کہ بلند پناہ گاہوں میں ہیں اور سلطان کا لشکر تغیب میں رینگ رہا ہے۔ قلعے تک پہنچنے کیلئے وہ یقیناً اوپر کی جانب دنا کرے گا ہمیں اس قدر خوش گمان نہیں ہونا چاہئے کہ سلطان کے تیر انداز نا کارہ اور بے ہنر ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی کمائیں بھی چڑھیں گی ان کے تیر بھی چنگار یاں اٹکیں گے مگر پستی سے بلندی کی طرف سفر بہت سست اور بے اثر ثابت ہو گا۔“ ہری سنگھ نے اپنے بائیں جانب مڑ کر سابق سپہ سالار پھمن سنگھ کی طرف دیکھا جسے مشورے کیلئے دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ ”سردار پھمن سنگھ بھی یقیناً میری تائید کریں گے کہ وہ بہت سرد و گرم آشنا انسان ہیں۔“

راجہ رتن سنگھ نے بوڑھے سینا پتی پھمن سنگھ کی جانب پر امید نظروں سے دیکھا۔

پھمن سنگھ کرسی کا سارا لے کر کھڑا ہوا۔ اس کا جسم لاغر ہو چکا تھا مگر آواز کی گرج اب بھی باقی تھی۔

مرک! ابہری سنگھ کا مشاہدہ درست ہے۔ قلعہ بند ہو کر لڑنا پڑوڑ کی فوجوں کے حق میں ہے۔ طویل محاصرہ ہر دن سلطان کو تھکا ڈالے گا۔ راجستھان کا گرم موسم مسلمان سپاہیوں کو کسی مرض میں بھی مبتلا نہ کرے گا۔“

ابھی پھمن سنگھ کی گفتگو مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ راجہ رتن سنگھ کا جواں سال حقیقی بھانجا سوگر مال عجلہ کر اہو گیا۔ ”سردار پھمن سنگھ کا مسلمانوں کے بارے میں یہ اندازہ درست نہیں ہے۔ انہیں کوئی مہتر نہیں کرتا۔ وہ خود موسموں کو بدل دینے والے ہیں۔ گردشِ وقت ان سے بچ کر چلتی ہے اور اگر انھیں ان کی مرضی کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔“ سوگر مال دیو کے لبے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ لڑائی کی تلخ کوٹھی اور سخت جانی سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

پھمن سنگھ کی بھنویں کھینچ گئیں اور ماتھے پر کئی بل پڑ گئے بوڑھے سپاہی کو ایک نوجوان کی یہ مداخلت پسند آئی تھی۔

”فرزند! ابھی تمہاری اتنی عمر نہیں کہ راج محل کے ایک گوشے میں بیٹھ کر فوجی سیاست پر کوئی تبصرہ کرو۔“ پھمن سنگھ نے ناگوار لہجے میں سوگر مال دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے بزرگ کے تجربات و مشاہدات کا مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔“ سوگر مال کا اندازِ تکلم مودبانہ تھا۔

”میں کم عمر کسی لیکن مجھے مسلمان قوم کے مزاج کا خوب اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمد بن قاسم کیسے دار استوں پر چل کر سندھ تک پہنچا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر ہے کہ ہندوستان کے موسم نے محمود غزنوی کی میں کسی کیسی رکاوٹیں کھڑی کی تھیں اور وہ ان سب کو ایک ہی جست میں عبور کر گیا تھا۔ اور مجھے بال الدین غوری کی یلغار کا اندازہ بھی یاد ہے کہ وہ اجیر کے پتے ہوئے ریگ زار میں دوبارہ کس طرح لٹا ہوا تھا۔ بیرون ہند سے ہمارے گھروں کی طرف آنے والے سب کے سب مسلمان تھے اور والدین خلعی بھی اسی قوم کا ایک فرد ہے، ہمیں سلطان اور اس کے سپاہیوں کو نازک مزاج ثابت کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟“

پھمن سنگھ کا بوڑھا پاسوگر مال کی جوان لفظوں کی ضرب برداشت نہ کر سکا اور اس چنگاری کی طرح لو دینے لگے تیر ہوانے بھڑکا دیا ہو۔ ”راجپوتوں کا نا سمجھ بیٹے! تجھے اندازہ نہیں کہ تو کیا کر رہا ہے؟“ پھمن مالہا زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”مسلمانوں کی اس طرح تعریف کرنا میری قوم کے حق میں وہ زہر ثابت ہو گا کہ کاتریاق دنیا کے کسی وید کے پاس موجود نہیں۔ افسوس تجھے یہ راز نہیں معلوم کہ تو چوڑو کا نادان ست ہے۔“

سوگر مال دیو بھی خاموش نہ رہ سکا۔ ”میں خوب جانتا ہوں کہ وطن دوست کون ہے اور کون اپنی دھرتی دشمنی کر رہا ہے؟“ سوگر مال لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”میں مسلمانوں کی شجاعت کے راگ نہیں گارہا۔“

”مہتر! کیا مقصد ہے؟“ اب کی بار پھمن سنگھ کے بجائے راجہ رتن سنگھ اپنے بھانجے سے مخاطب ہوا۔

”آخر تو کمنا کیا چاہتا ہے سوگر مال!“ راجپوت سمرات کے لبے میں دے دے غصے کی آمیزش تھی۔

”میں چوڑو کے نمکبانوں کو تپانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں غلط اندازے قائم کر کے فریب کا شکار نہ ہوں۔ مقابلے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حریف کی قوت، عادت و مزاج، ان کی پوری تاریخ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔“ سوگر مال نے اپنے ماموں راجہ رتن سنگھ کے سوال کا جواب بیٹھائے کہا۔ ”قلعہ بند ہو کر لڑنا کوئی ایسا نظریہ جنگ نہیں جس سے سلطان ناواقف ہو۔ وہی سے کوچ

ہات کا مظاہرہ انسانوں کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے اور کبھی دماغ کا استعمال۔ ”سوگرما مال دیو نے راجہ رتن سنگھ کے قہر و غضب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہی موسم ہے جب ہمیں اپنے ذہنوں کے رنج و کھل کو نازہ ہوا کے اثرات کو اپنے جسموں میں جذب کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو مدیوں سے آکرے ہوئے سہم چٹ جائیں گے۔ ہوا بہت گرم ہے۔ اگر اس کے جھوکوں نے براہ راست جسموں کو چھو لیا تو ہڈیاں تک پھیل جائیں گی۔ ہم نے بیشاپنی بدنی توانائیوں پر غور کیا اور ایک بار بھی نہیں دیا کہ ہمارے سروں کے ڈھانچوں میں دماغ جیسی دولت کو کیوں محفوظ کیا گیا ہے۔ پہلے مجھے صرف شک و گمان ہی تھا کہ ہمارے سر خالی ہیں اور ان ہڈیوں کے درمیان الیٹور (خدا) نے دماغ نام کی کئی چیز رکھی ہے۔“

”سوگرما! راجہ رتن سنگھ جج اٹھا۔ ”تو ہمیں اب حکومت سکھا رہا ہے؟“

”نہیں سر! میں تو ہواؤں کے رخ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ کاش! اس بھرے دربار میں کوئی ایک شخص میرے اشارے کو سمجھ لے۔“ سوگرما کی آواز ذوقی جاری تھی۔

”تو چاہتا ہے کہ ہم سلطان کے سامنے سرخم کر دیں اور راجپوتوں کی عظیم روایات کو ایک ناپاک انسان کی پٹھن پر لے جا کر جھکا دیں۔ سوگرما! تو نے یہ شرمناک بات کہنے سے پہلے اپنی زبان کاٹ کر ہمارے حضور کیوں نہ پیش کر دی۔“ راجہ رتن سنگھ شدت غضب میں کانپنے لگتا تھا۔

”اگر میری زبان کٹ جانے سے چوبانوں کی مریدا (عزت و شان) بچ جائے تو شیو اور شکر کی سونگھ! میں اپنے جسم کے اس گستاخ حصے کو اسی وقت علیحدہ کر کے آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔“

سوگرما اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

”مجھے خبر ہے کہ سلطان نے تیری ماں کو دنیا کی فحش گالی دی ہے۔“ راجہ رتن سنگھ نے رانی پدمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کیسا بے غیرت چوبان ہے کہ راج ماتا کے وقار کو نیلام کر کے تخت و تاج بٹا رہا ہے۔“

”میں نے اب تک کوئی شے فروخت نہیں کی مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ عنقریب چوڑی گلی گلی مہر مشوں کا بازار بچنے والا ہے۔ بھگوان ہی جانے کہ اس بازار میں کیا کیا بیچا جائے گا اور آنے والے کیا کیا خریدیں گے۔“ سوگرما مال دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ ”کہیں ہم لوگوں نے سلطان کو سمجھنے میں تو غلطی نہیں کی کہ اس کی ایک شاہانہ ادب و آمریت کی ایک لہر ہو۔ اسے کسی نے ورغلا یا ہو یا خود اس نے چوڑی لشکر کشی کی کہ بڑا تر شاہ ہو۔ کوئی اس سے بات تو سمجھو کہ آخر وہ کیوں کسی کے عزت و ناموس سے کھینچا چاہتا ہے۔“

”لکھنؤ راج محل سے باہر نکلے اور سلطان سے پوچھو کہ حکمرانی کا یہ کیا انداز ہے؟ اس سے نرم لہجے میں مصلحت کی بات کی جائے۔ وہ بڑا آدمی ہے۔ اگر ہم نے اس کے مزاج کے مطابق بات کی تو وہ اپنے اس لہجے و شرمسار بھی ہو سکتا ہے۔“ سوگرما بڑے ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

”سلطان ایک سچ ذات سے حق رہتا ہے۔ چوڑے شورروں کی طرح۔ ہم اعلیٰ سل لوگ اس سے ٹھکر کرنے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔“ راجہ رتن سنگھ اپنے نوعمر بھانجے کی کوئی بات سننے کیلئے اٹھ کھڑا تھا۔

”سر! پر تھوئی راج چوبان نے بھی شہاب الدین غوری کیلئے ایسے ہی حقیر الفاظ استعمال کئے تھے اور میرے جسم کو ایک چمچ کی زنجیروں کے حوالے کر دیا تھا۔ آج پر تھوئی راج کا وارث بھی اسی غلطی کو دہرا رہا ہے۔“ سوگرما نے راجپوتوں کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین حوالہ پیش کر کے راجہ رتن سنگھ کو قائل کرنے کی

کرتے وقت علاء الدین نے اس امکان کو بھی پیش نظر رکھا ہو گا۔ وہ قلعے کی بلندی سے بھی آگاہ ہو گا اور اس نے محاصرے کی طوالت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہو گا۔ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ آج تک کسی مسلمان حکمران نے چوڑی تغیر کے خواب نہیں دیکھے ہیں۔ کیا اہل دربار کی نظروں میں علاء الدین کوئی مجبوظ الحواس شخص ہے جو اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر جلتے ہوئے پتھروں سے سرنگرانے چلا آیا ہے؟ ”اتو کہہ کر سوگرما چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ ”دیوتاؤں کی قسم! وہ بہت ہوشیار ہے، ہمارے اور آپ کے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہوشیار۔ میں چاہتا ہوں کہ سر! آپ اپنے دشمن کے تیوروں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آخر اسے اس قدر اطمینان کیوں حاصل ہے؟ اور وہ کونسا منصوبہ ہے جس پر عمل کر کے علاء الدین چوڑے اس کی آزادی چھین لینا چاہتا ہے؟“

”منصوبہ! ایک منصوبہ؟“ راجہ رتن سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ منصوبہ جس کی کامیابی پر سلطان کو پورا یقین ہے۔“ سوگرما بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

”اس کا شوق محرک آرائی ایک دیوانگی ہے اور دیوانوں کو ان کے کسی فعل سے روکا نہیں جاسکتا۔“

راجہ رتن سنگھ نے سلطان علاء الدین خلیجی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”سر! علاء الدین دیوانہ نہیں ہے۔“ سوگرما مزید جذباتی ہو گیا۔ ”بھگوان کیلئے اس کے جگر

منصوبے پر غور کیجئے۔ جاسوسوں کو اس کام پر متعین کیجئے کہ وہ اپنی جان دے کر بھی وہ راز حاصل کر لے

جس کی بنیاد پر سلطان آگ اور خون کا یہ کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔“

کیسا راز؟“ راجہ رتن سنگھ چونک اٹھا۔

”آخر علاء الدین کے پاس ایسا کونسا اسلحہ ہے جس کے ذریعہ وہ سیکڑوں فٹ بلندی پر واقع قلعہ چوڑا

کی تغیر کر لے گا جبکہ ایک ایک دیوار کی بنیاد میں سیدہ اور تانبا بھرا ہوا ہے اور ایک ایک دروازے کو فواید

تغیر کیا گیا ہے۔ قلعے پر نہ تیراؤ نیزے اثر کر سکتے ہیں اور نہ تلواریں۔ پھر وہ کونے آلات حرب ہیں جن

سلطان کو یقین کامل ہے کہ وہ ان کے ذریعہ اس محرکے کو سر کر لے گا۔“ سوگرما مال دیو نے کم

ہوتے ہوئے بھی اس ذہانت کا ثبوت دیا تھا جس سے چوڑے کے جماندہ بوڑھے بھی محروم تھے۔

کچھ دیر کیلئے دربار میں ساٹھا ساٹھا گیا۔

”ہم نہیں سمجھتے کہ سلطان اپنے خصوصی اسلحہ خانے کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے؟ آخر ایک مختصر وقت

سکوت کے بعد راجہ رتن سنگھ نے اسی رعوت آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ اپنی بے اندازہ فوجی قوت کے نشہ

ہوش و حواس کو بیٹھا اور اسے ہماری غفلتوں کے بلند میناروں سے ٹکرانے کا شوق چوڑی تک پہنچا

ہے۔“

سوگرما نے بڑی مایوس نگاہوں سے اپنے ناموں کی طرف دیکھا۔ ”سر! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہ

چکا۔ میں بعض حکمرانوں کی اس اداسے بھی واقف ہوں کہ طاقت کا خمار انہیں گہری نیند ملا رہا ہے۔ اگر

بربادی و زوال کے نمائندے بھی ان کے دروازے پر دستک دیں تو وہ جاگنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے

عظیم بزرگ! آپ بھی سوچتے ہیں اور آپ کو سلاتے ہیں ان خوشامدی درباریوں نے نمایاں کر دارا کیا

ہے جو اپنی پگڑیوں کی سلامتی کو چوڑی عزت و ناموس پر ترجیح دیتے ہیں۔“

دربار میں اچلی پچلی گئی۔ راجہ رتن سنگھ ”راڈی پٹی“ اور دیگر راجپوت یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ

راج گھرانے کا ایک فرد اس قدر باغیانہ روش اختیار کرے لے گا۔

”سر! میں ایک اور بات بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ اقتدار کی سیاست میں بھی

کوشش کی تھی مگر اس کی ہر دلیل رائیگاں گئی۔

”سوگرا! تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو کہ تیرے خون میں بھی وکرم سنگھ کی طرح غداری کے کیزے پرورش پا کر جوان ہو چکے ہیں۔“ راجہ رتن سنگھ غصے سے میں بے قابو ہو گیا تھا۔

”سمرات! مہمانتزی وکرم سنگھ غدار نہیں تھے۔“ کوئی بھی تینبہہ سوگرا کو اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہ رکھ سکی۔ ”میں نے ان جیسا وطن دوست نہیں دیکھا، اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً چوڑو کو تباہ ہولے بچالیتے۔“

راجہ رتن سنگھ سر سے پاؤں تک اپنے فکری آگ میں جل اٹھا۔ ”ہم تجھے بھی وکرم سنگھ کے پاس پہنچائے دیتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا ہم نے ایک غدار وطن کو اپنی آغوش محبت میں پال کر جوان کیا ہے۔“

سوگرا مال دیو کا پیمانہ سنگھ ایک جنگ میں قتل ہو گیا تھا۔ رتن سنگھ نے اپنے یتیم بھانجے کی عہدداشت کی، اسے فنون جنگ کی تربیت دی اور اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ رتن سنگھ، سوگرا سے بہت محبت کرتا تھا مگر گردشِ وقت نے سوگرا کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں اس کی پوری شخصیت مجرمانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سوگرا ذہنی طور پر وکرم سنگھ سے متاثر تھا۔ پھر زلما کماری کی محبت اسے مہمانتزی کے بہت زیادہ قریب لے آئی تھی۔ آج وہ وکرم سنگھ کے لیے میں بات کر رہا تھا اور اس کی یہی حرکت رتن سنگھ کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ سوگرا وکرم سنگھ کی طرح سیاست و تدبیر سے علاء الدین خلجی کے حملے کو روکنا چاہتا تھا وہ جب اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو بات بگڑتی چلی گئی۔

رتن سنگھ نے طیش میں آکر اپنے حقیقی بھانجے کے قتل کا حکم دے دیا۔ تمام درباری سوگرا کے خلاف تھے مگر سپہ سالار ہری سنگھ اسے مجرم ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ ہری سنگھ نے راجپوت سمرات سے درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور سوگرا کے خیالات کو غداری کا لباس نہ پہنائیں۔ اور دورانِ سوگرا کی ماں کو یہ قیامت خیز خبر ملی تو وہ راج محل سے دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی دربار میں داخل ہوئی اور اس نے اپنے بھائی کے پاؤں پکڑ لئے۔

”سمرات! یہ میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔ میں دوھوا (بڑھ) ویسے ہی اس دھرتی کا ہو ہوں۔ اس بوجھ کو اتنا نہ بوجھائیں کہ زمین بھی میرے وجود کو برواشت کرنے سے منحرف ہو جائے۔ سوگرا کو بخش دیں کہ وہ نادان ہے۔“

رتن سنگھ کسی طرح بھی سوگرا کو معاف کرنے کیلئے تیار نہیں تھا مگر جب بڑی بہن اس کے پیروں کو اپنے آنسوؤں سے مسلسل بھگوئی رہی اور سرد دربار ایک مظلوم عورت کی چیخیں گونجتی رہیں تو رتن سنگھ کا غصہ مٹ ہو گیا۔ اس نے ایک شرط پر سوگرا کی جان بخش دی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ قلعے سے نکل کر اچھوتوں کا بستی میں چلا جائے۔ اور پھر بھی راج محل کا رخ نہ کرے۔

رتن سنگھ کے فیصلے پر راجپوت سرداروں نے سخت اعتراض کیا کہ اس طرح سوگرا، علاء الدین خلجی کے لشکر میں شامل ہو کر چوڑو کے کئی اہم فوجی راز فاش کر سکتا ہے۔ راجپوت سرداروں کی اس الزام دہی سوگرا کے جسم و جان سلگ اٹھی۔

”سمرات! اس سے تو بہتر ہے کہ مجھے قتل کر دیں۔“ سوگرا بچوں کی طرح رونے لگا۔

رتن سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اس نے سوگرا کو راج محل کے ایک سنسان گوشے میں قید کر دینے کا وعدہ دیا اور تمام لوگوں پر پابندی عائد کر دی کہ وہ اس سے کوئی تعلق برقرار نہ رکھیں۔ صرف سوگرا کی ماں

بچنے سے مل سکتی ہے تاکہ وہ اس کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے۔

رتن سنگھ کی بڑھ بہن اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی اور سوگرا رو رو کر کتا جارتا رہا تھا۔ ”سمرات! میرے وطن دوست چوڑو کے سینے کو بلاؤں کے طوفان میں غرق کر دیں گے اس وقت آپ کو اپنا یہ بیٹا یاد آئے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تیرا مکان اور نیزہ اس مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ اگر ایک شمشیر بھی باہر ہو تو رتن سے ایک تیر بھی چھوٹا پورا چوڑو خون میں نہا جائے گا۔“

سوگرا کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی مگر پورے دربار میں کوئی اس کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ بس ایک عجیب فحش کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے رنگ ابھرتے تھے اور پھر دھندلے پڑ جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

راجہ رتن سنگھ نے اپنے حقیقی بھانجے سوگرا کو غدار کہہ کر قید تہائی کی سزا تو دیدی مگر وہ اور رانی پد منی بھر نہیں سکے۔ تہائی ملی تو سوگرا کے آخری الفاظ دونوں کے ذہنوں میں گونجنے لگے۔ رتن سنگھ سے ہونے انداز میں پد منی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے شوہر کو اعصابی خلقتی بنائے کیلئے اپنے ہاتھوں سے تیز ترین شراب پیش کی۔ پھر بھی رتن سنگھ کی بدحواسیاں کم نہیں ہوئیں تو پد منی نے بڑا جذباتی سا گیت جھپڑا۔ ایسا گیت جس میں دنیا کی تلخیوں کو فراموش کر دینے کی تلقین تھی۔

کے کولوں میں شاعر نے زندگی کے نشاط انگیز لہجوں کا رس بھرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ رس جو شراب ہی زیادہ نشہ آور تھا۔ پد منی گاتی رہی مگر رتن سنگھ کو قرار نہیں آیا۔ چوڑو کے حکمراں کا دل اس طرح ہلا تو پد منی نے نیک جہان خیز قص بھی پیش کیا لیکن آج کی رات ہر دعوت کیف بے اثر تھی۔

”پد منی! تمہارا حسن جانسو ذہنی وہی ہے، شراب بھی وہی ہے اور ہم بھی وہی ہیں مگر فضا میں بدل گئی۔ ہمیں تمہارے مسکے ہوئے کیسوؤں کے سائے میں کیسے نیند آئے کہ قلعے کی دیوار کے نیچے ہمارا بدترین نا جاگ رہا ہے۔“ رتن سنگھ کی آواز لڑکھڑاہی تھی مگر وہ بہت ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔ ”مہارانی! غدار جاسو گرا بھی وہی بات کہتا ہے جسے ادا کرنے کے جرم میں ہم نے آئندہ پال کی زبان کاٹ دی تھی اور اس کے جسم کو اپنی نفرت کی آگ میں جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ وہ فاحش، بھان متی بھی یہی کہتی ہے کہ ان کو ہمارے تخت تک پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ پد منی! کیا یہ بد نہاد لوگ سچ بول رہے ہیں؟ کیا ایک لیر ہمارے سر سے تاج چھین لے گا اور ہماری آبرو و شای محل کی زینت بن جائے گی؟“

مدد ہشت اور شد بد جذبات سے مغلوب ہو کر رتن سنگھ نے پد منی کی زلف پریشاں میں اپنا منہ چھپالیا۔

”پد منی! نہ رات نہ ہو کر اپنے شوہر کو جذباتی سہارا دیا۔“ ”نہیں سمرات! ملکہ کہسار صرف آپ کیلئے نکلا ہے۔ اور یہ شاہ کل آپ ہی کے ہاتھوں میں پکچھے گی اور رعنائی کے یہ پھول آپ ہی کے دوش پر لٹائے گا۔“ پد منی کی آواز سرمندی جذبات سے لبریز تھی مگر رتن سنگھ کا دھڑکتا ہوا دل کسی صورت سنبھلنے نہیں آتا تھا۔

”کاش! ہماری رعنائیں تمہارے کیف آور نعروں میں ہمیشہ کیلئے ڈوب جائیں مگر ہم کیا کریں پد منی کہ اس کا کھن مسلسل اس دردندے کے قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔“ رتن سنگھ ایک بار پھر گھبرا کر پد منی کو گایا اور اس نے اضطرابی حالت میں ادھر ادھر مٹھنا شروع کر دیا تھا۔

پد منی اپنے ذہن سے اس بھیڑیے کے تصور کو جھٹک دیتے۔ ”رانی پد منی تیری سعادقت سنگھ کے ہونے کا واسطہ ہے اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے کہنے لگی۔“ علاء الدین اور آپ کے مزاج میں کوئی کٹافٹ ہے۔ وہ ازل سے ایک مکلا اور بزدل بھیڑیا ہے اور آپ پیدائشی سنگھ (شیر) ہیں۔

فطرتاً بہادر اور تمام درندوں پر حکومت کرنے والے۔ ”پدمنی نے نئے نئے انداز سے شوہر کو ہسلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”نہیں مہارانی! وقت نے ساری بساط الٹ دی۔ شیر بھڑیئے بن گئے اور بھیڑیوں نے شیروں کو کھردہ دھار لیا۔“ رتن سنگھ ذہنی طور پر منتشر ہو گیا تھا۔ ”یہ سب لوگ ہمیں تسلیاں دے رہے ہیں! مسلسل جھوٹ بول رہے ہیں۔ آچار یہ شکر داس کہتا تھا کہ سلطان نے حملے کیلئے غلط وقت کا انتخاب ہے۔ ستاروں کی گردش اسے ذلیل و رسوا کر کے در بدر پھرائے گی مگر کیا ہوا؟ خود شکر داس درگاہ مجھنے کے نیچے دب کر مر گیا کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ دیوتا بھی ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ درگاہاں بہرہ شہتی دینے کے بجائے اپنے ہی ایک بھگت کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ سب کیا ہے؟ ستارے کہاں رو پڑے ہو اور دیوتاؤں نے آکاش کے کس گوشے میں منہ چھپا لیا۔“ یہ کہتے کہتے رتن سنگھ جج اٹھا تھا۔

پدمنی نے گھبرا کر ایک اور جام لبریز کرنے کی کوشش کی مگر رتن سنگھ نے اس کا ہاتھ جھک کر ”مہارانی! یہ مدرا (شراب) کے بھرے ہوئے پیالے ہمارے غموں کا علاج نہیں۔“

پدمنی کا گل رنگ چہرہ زرد ہو گیا۔ رتن سنگھ کچھ دیر تک اپنی ایک قد آدم تصویر کو دیکھتا رہا۔ مصور نے تصویر میں رتن سنگھ کے جاہ و جلال کا ایک عجیب منظر پیش کیا تھا۔ رتن سنگھ کی آنکھوں سے قہر و غضب شعلے نکل رہے تھے اور پس منظر میں ایک طاقتور ہاتھ تاجو آسمان کی بلند یوں سے برآمد ہونا ہوا رتن سنگھ سر پر سایہ فگن تھا۔ مصور نے اس خیال کی عکاسی کی تھی کہ راجپوت سمرات کے سر پر دیوتاؤں کا ہاتھ ہے۔ ”کیا یہ تصویر ہماری ہے؟“ رتن سنگھ نے پدمنی سے سوال کیا۔

”اس میں کیا شک ہے سمرات؟“ پدمنی نے ایک اداے تو یہ شکن کے ساتھ کہا۔ ”یہ دلوں کو والے نقش و نگار اسی رتن سنگھ کے ہو سکتے ہیں جو راجپوتوں کی آن ہے اور چوڑ کا مان ہے۔“ پدمنی ہاتھ سے شوہر کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار رہی تھی اور اس کا دوسرا ہاتھ تصویر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ”پھر علاء الدین خلجی ہمارے قدم چھونے کی اجازت کیوں نہیں مانگتا؟“ راجدرتن سنگھ نے لہجے میں کہا۔

”وہ آ رہا ہے سمرات!“ پدمنی نے پھر رتن سنگھ کو جھوٹی تسلی دی۔ ”بس وہ پہنچنے ہی والا ہے۔ ا طویل ہونے کے باعث اس کے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ وہ یقیناً آئے گا اور آپ کے پیروں پہنچا دے گا۔“

”مہارانی! کل صبح ہوتے ہی چترکار (مصور) گوتم کو بلاؤ اور اسے حکم دو کہ تصویر میں نظر والے چروں کو مٹا کر ایک نیا چہرہ بنا دے۔ سلطان علاء الدین خلجی کا چہرہ جو ہمارے قدموں پر رحم و کرم کی بھیک مانگ رہا ہو۔“ راجدرتن سنگھ اپنے نا آسودہ جذلوں اور تشنہ آرزوؤں کو عجیب انداز میں پتھار رہا تھا۔

”ایسا ہی ہو گا سمرات! ایسا ہی ہو گا۔“ پدمنی اسے کھینچ کر بستر تک لے جانا چاہتی تھی مگر اسے ایک اور عجیب سانحہ پیش آیا۔ راجدرتن سنگھ کی طویل و عریض تصویر اچانک زمین پر گر پڑی۔ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے انتہائی بدحواسی کے عالم میں پلٹ کر دیکھا۔ راجپوت سمرات کی تصویر پر الٹی پڑی تھی۔ رتن سنگھ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ رانی پدمنی کا چہرہ اس طرح ہوا گیا تھا جیسے کسی لہو آشام عفریت نے اس کے جسم کا سارا خون پی لیا ہو۔

”مہارانی! یہ بڑی بد شگونی ہے۔“ رتن سنگھ کا جسم کانپ رہا تھا اور آواز بھیجی۔ ”خوشنوں نے

دو طرف سے گھیر لیا ہے۔ پہلے درگاہاں کا مجسمہ زمین بوس ہوا اور اب ہماری تصویر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ راجدرتن سنگھ زیادہ دیر تک اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے ایک کرسی کا سارا لیا اور بیٹھ گیا۔ ”مہارانی! غور سے دیکھو۔ سونے کی زنجیریں اس قدر مضبوط تھیں کہ اسے بڑے سے بڑا پہلوان بھی نہ توڑ سکتا تھا پھر کس نے ہماری تصویر کی یہ بے حرمتی کی؟ وہ کس کا نادیدہ ہاتھ ہے جو ہمارا تاج اچھالنا چاہتا ہے؟“

رانی پدمنی بھی اس واقعے سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ وہ شوہر کی وحشت ناک باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

راجدرتن سنگھ بہت دیر تک ناقابل بیان اذیت میں مبتلا رہا پھر اس نے شراب کا ایک اور جام حلق سے اعضاء کچھ پر سکون ہوئے تو رتن سنگھ نے مہاراج رام دیو کو طلب کیا جو اس وقت آشرم میں باسیوں سے دل بہلا رہا تھا۔

”سمرات کو میری کوئی ضرورت نہیں۔“ رام دیو نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”چوڑ میں بڑے بڑے فی موجود ہیں۔ انہیں اعزاز و بخشش مالا میں پسانیں رام دیو تو محض ایک پاپی ہے اور کوئی پاپی کسی کو سنگٹ سکتا ہے؟ میں دلا سکتا۔“ رتن سنگھ نے دوبارہ التجاؤں کے ساتھ اسے محافظ خاص کو آشرم بھیجا تو رام دیو اس پر آکر وہ شراب کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ ”میرے پاس کوئی خبر نہیں ہے سمرات۔“ رام دیو بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”شکر داس کی سڑی ہوئی لاش سے پوچھنے کے اب کیا ہو گا؟“

رتن سنگھ اور پدمنی رام دیو کے قدموں میں جھک گئے۔ ”درگاہاں کے مجسمے اور ہماری تصویر کے بنانے سے کیا شگون نکلتا ہے؟“ رتن سنگھ ایک بار پھر اس سیاہ کار شعبہ باز کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اگر ہم سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو ہمیں معاف کر دیں۔ یہ چوڑ کی آمد اور ہندو دھرم کی ت کا سوال ہے۔“

رام دیو کے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”آپ نے وقت کو کھو دیا اور کھونے والوں کی باتیں سمجھ لی پوری نہیں ہوئیں ہم گزرے ہوئے وقت کو موز کر واپس لا سکتے تھے۔ مگر آپ نے ہماری بات کو ٹھیک نہیں کیا۔“ رام دیو بڑی عیاری کے ساتھ بہانے تراش رہا تھا۔

”آپ تو ہمارے ہمراہ ہیں، مہارانی! اپنی تپسیا سے ان بد شگونیوں کو مٹا سکتے ہیں۔“ رتن سنگھ کی خوشامد آواز گدا گدا کرنا ہو جا رہا تھا۔

رام دیو نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا رہا۔ ”مہارانی! بڑی سرخ آنکھیں کھول دیں۔ جن میں شیطنت کے سوا کوئی دوسرا عکس موجود نہیں تھا۔“ میں غور سے آپ کی خاطر آکاش کا دھواں گزر سفر طے کیا۔ دیوتاؤں کے چروں میں اپنا پیش (سر) جھکا دیا۔ ان سے دیا کی بھیک مانگی۔ تب کہیں جا کر دیوتاؤں نے مجھ سے سرگوشیاں کیں۔ ”سات راجپوت تھے جن کا تعلق راج گھرانے سے ہو گا وہ دریائے گمبھیری کی سمیٹ چڑھائی جائیں گی۔“ رام دیو نے ہاتھ پٹل ہونے والی مصیبت کا سفاکانہ حل پیش کر دیا تھا۔ ”وہ ساتوں دو شیرازیں سات دن تک مندر پر لٹائیں گی اور مسلسل برت رکھیں گی اس دوران وہ کوئی غذا استعمال نہیں کر سکیں گی۔ انہیں صرف پانی پینا ہو گا اور گاہے گاہے ان کے شریر اور آتما میں دیا کی آلائشوں سے پاک ہو جائیں گی تو انہیں گمبھیراں کے لوگوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ راجپوت دو شیرازوں کی یہ قربانی گمبھیری کے پانی میں پھل پھلے گا دے گی۔“

پدمنی نے ہاتھ کھول دے گا پھر ایک خوفناک سیلاب آئے گا جس میں چوڑ کی تمام نواحی بستیاں غرق ہوں گی۔

ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ سلطان کا ایک ایک سپاہی بھی ان موجوں کی خوراک بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان اور اس کے سارے خواب بھی زیر آب چلے جائیں گے۔“

مہاراج رام دیو نے سلطان علاء الدین خلجی کی تباہی کیلئے ایک خوفناک عمل تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ہندوستان اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں نوزیر لڑکیوں کو دریا کے جھینٹ چڑھانے کی رسم نہ ہی مشیت اختیار کر گئی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں گمرہ مصری بھی اسی طرح نوجوان دوشیزاؤں کو دریائے نیل کی جھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ اہل مصر کے عقیدے کے مطابق کسی کنواری لڑکی کا جسم قتل کرنے کے بعد دیوتاؤں کا قرب ختم ہو جاتا تھا اور وہ دریاؤں کو اہل پڑنے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح نیل میں طغیانی آ جاتی تھی اور یہاں زمین سیراب ہو جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا فرائض رسم کو بھروسہ کیلئے نہ کیا اور دریائے نیل کے نام ایک عجیب و غریب خط لکھا۔ پھر جب وہ خط دریائے نیل کو لایا تو ایسی طغیانی آئی کہ اہل مصر بھی کبھی خشک سالی کا شکار نہیں ہوئے۔ اسلام اپنی پوری توانائی کے ساتھ دیار ہند میں داخل ہوا تھا مگر جو علاقے اس کی دسترس سے باہر تھے وہاں ابھی کفر کی وہی وحشیانہ رسمیں جاری تھیں۔ رام دیو بھی اس قدیم رسم کا سہارا لے کر کوئی نیا شعبہ دکھانا چاہتا تھا۔ حالانکہ لڑکیوں کے جھینٹ چڑھانے کی رسم محض اس لئے تھی کہ دریاؤں میں سیلاب آجائے اور وہ علاقہ قحط آب سے محفوظ ہو جائے۔ مگر رام دیو راجپوت دوشیزاؤں کی قربانی کو کسی اور مقصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے زیر آب جاتے ہی پتھڑ میں پانی کا طوفان آجائے گا اور اسلامی لشکر غرقاب ہوتے ہی اس کی روحانی عظمتیں واپس لوٹ آئیں گی۔

راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے رام دیو کے منصوبے کو بغور سنا اور فوراً ہی اس آغاز و تکمیل کی اجازت دیدی۔ ان سات منتخب لڑکیوں میں مہمانتری سنگھ کی بیٹی بھی شامل تھی۔ مہاراجپوت سردار بہت خوش تھے کہ اس طرح سلطان کی تباہ کن یلغار سے بھی نجات مل جائے گی اور ان لڑکیوں سے بھی چھکارہ حاصل کر لیا جائے گا جو اپنے باپوں کیلئے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئی تھیں۔ راجپوت سردار اس لئے بھی خوش تھے کہ یہ سب کچھ مذہب کے پروے میں دیوتاؤں کی رضامندی کیلئے کیا جا رہا تھا۔ جب راجپوت دوشیزاؤں کو اپنے جھینٹ چڑھانے جانے کا علم ہوا تو شدت خوف سے ان کی خوبصورت آنکھیں پتھرا گئیں۔ جن آنکھوں میں جوانی کا شمار اور حسرتیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اب ان آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ وہ اپنے باپوں کے سامنے بہت دیر تک ماتم کرتی رہیں مگر ان کی چیخ رانگیاں گئیں۔ راجپوت سرداروں کے چہروں پر اپنی خواہشوں سال بیٹیوں کیلئے ہمدردی کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ لڑکیوں کی ماؤں نے شوہروں سے احتجاج کیا تو انہیں انتہائی جارحانہ انداز میں جھڑک دیا گیا۔ ”یہ دیوتاؤں کا فیصلہ ہے، اس فیصلے سے انحراف کرنے والے ناستک (منکر خدا) قرار پائے اور نافرمانوں کا ٹھکانہ نرک کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔“

مجبور عورتیں جابر و سفاک مردوں سے کیا کہیں کہ انہیں تو روزی و دوزخ کی آگ میں جلا کر پٹا تھا لڑکیوں نے ماؤں کی گود میں سر رکھ کر گریہ و زاری کے طوفان اٹھائے مگر ہندوستان کی ایک مجبور عورت دوسری مظلوم عورت کو کیا دے سکتی تھی۔ بالآخر ساتوں دوشیزاؤں کو ان کی ماؤں کی آغوش سے جین گیا۔ پھر ان کے زیورات اتارے گئے اور ریشمی کپڑوں کو سفید ملبوسات میں بدل دیا گیا۔ جیسے ”سلا“ سال کی، خوابوں کے جزیرے میں رہنے والی رنگین قبائلیاں نہ ہوں بلکہ ششانشان گھاٹ کی طرف جا

ایا غزوہ یوٹیس ہوں جنہیں سنگر سماج نے وقت سے بہت پہلے یوگی کا کفن پہنا دیا ہو۔ تمام دوشیزاؤں کو اپنی بدایت کے مطابق ماتا کے مندر بھیج دیا گیا۔ خوف و ہشت کی ماری ہوئی ساتوں لڑکیاں نیم جاتی کی بات میں زرد چروں کے ساتھ رام دیو کے بتائے ہوئے منتر پڑھنے لگیں۔ سورج ڈوبنے کے بعد انہیں دف اپنی پٹے کی اجازت ہوئی اور پھر صبح کے قریب ان کا پانی بھی بند کر دیا جاتا۔ ساری لڑکیاں راجپوت کے قلعے رکھنے کے سبب جسمانی طور پر بہت مضبوط تھیں مگر غذا کی کمی نے انہیں ایک ہی دن میں ہڈی ہڈی کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دوران سلطان علاء الدین خلجی نے حصار کا دائرہ مزید تنگ کر دیا۔ پہلے وہ دریائے گنپری اور چک کے درمیان خیمہ زن ہوا تھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سلطان اپنے بہترین فوجی دستوں کے ساتھ چوتھو نام کی ایک چھوٹی سی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ یہ پہاڑی قلعے کے بن سامنے واقع تھی۔ سلطان نے اس ناہموار جگہ کو دیکھا، پھر ایک نظر قلعے پر کی اور نیا حکم جاری کر دیا۔

”اس کی ساری ناہمواریاں دور کر کے ہمارا تخت یہاں بچھا دو۔“ علاء الدین نے اپنے سپہ سالاروں ابوحانی، ملک نصرت خان، تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے لشکر کے بیشتر سپاہی اس پہاڑی کو کاٹنے میں مصروف ہو گئے جس قدر آڑے ترچھے رہتے انہیں تراش کر پہاڑی کی سطح ہموار کر دی گئی۔ اس مشکل کام کے بعد سلطان نے اپنے سپہ سالاروں پر ہتھیار لانے کا حکم دیا۔ خواجہ حاجی جھنڈالے کر آیا تو سلطان نے دوسرا حکم دیا کہ پرچم خسروؑ کے اٹے لگایا جائے۔ خواجہ نے شاہی حکم کی تعمیل کی۔ امیر خسروؑ نے آگے بڑھ کر پرچم اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ علاء الدین خلجی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”خسروؑ! یہ پرچم ہمیں پیش کرو۔“ علاء الدین نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”ہم یہی سمجھیں گے اس پرچم کو حضرت شیخ نظام الدینؒ کی دست بوسی کا شرف حاصل ہے۔“ یہ کہتے کہتے سلطان کی آنکھوں میں غمناکی حضرت نظام الدینؒ اولیاء کیلئے ایک عقیدت خاص کا رنگ ابھرا آ رہا تھا۔

حضرت امیر خسروؑ جھنڈالے کر آگے بڑھے اور علاء الدین خلجی کو پیش کر دیا۔ سلطان کچھ دیر تک ان کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اسے ایک مضبوط لکڑی کے سارے باندھ دیا۔ اس کے بعد کئی لڑکیاں جوڑی گئیں اور جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ یہ پرچم چوتھو پہاڑی کے سب سے بلند حصے پر نصب کیا گیا تھا۔ سب سے اوپر شاہی پرچم لہرایا تو سلطان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے باری باری اپنے سپہ سالاروں کی طرف دیکھا اور پھر حضرت امیر خسروؑ سے مخاطب ہوا۔

”خسروؑ! تم ہمارے پرچم کی آہ و تاب دیکھ رہے ہو؟“ علاء الدین کا لہجہ پرچوش تھا۔

”میر خدام ہی نہیں، چشم فلک بھی اس پرچم جلال کی نگراں ہے۔“ امیر خسروؑ نے تعریفی انداز میں

لو ”دیکھو خسروؑ! اس کارخ قلعے کی جانب ہے۔“ سلطان نے پرچم کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! اسے اڑالے جانے کیلئے بے چین ہیں کہ راجپوتوں کے دلوں میں بیوست ہو جائے۔ اور پھر فوج کو اس سجدہ کرنے کیلئے زمین پر جھک جائیں۔“ احساس فخر و غرور سے علاء الدین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ نے کیا فرمایا تھا خسروؑ! ایک بار پھر ہم تمہاری زبان سے وہی الفاظ سنا چاہتے ہیں۔“

حضرت امیر خسروؑ، سلطان کی بے تابی کا مفہوم سمجھ رہے تھے اس لئے آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت

نظام الدین اولیاء کے بابرکت الفاظ کو ذہن میں تازہ کرنے لگے۔

علاء الدین پر ایک اضطراب سلطاری تھا۔ امیر خسروؒ ابھی جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ سلطان خود ہی بول اٹھا۔ ”حضرت شیخ نے فرمایا تھا کہ ہمارے اقبال کی روشنی کے سامنے اقتدار کے سارے سورج کھٹ جائیں گے، ہمارے گھوڑے کے سم پتھروں کے سینے میں شگاف ڈال دیں گے اور ہماری شیریں کمی دشمن کے کانڈھے پر اس کا سرباقی نہیں رہنے دے گی۔ کیوں خسروؒ! یہی تھے نا وہ الفاظ؟“

حضرت امیر خسروؒ نے خاموشی اختیار کر لی اور احتراماً سر جھکا دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے علاء الدین خلجی کو فتح کی بشارت دی تھی مگر آپ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ بہت مختصر تھے۔ علاء الدین نے اپنی خواہش اقتدار کے مطابق ان الفاظ کی نئی تفسیر کی تھی اور اپنے جذبہ بے اختیار کو تسکین دینے کیلئے ایک بزرگ کے کلمات کو ناز و نگ دے دیا تھا۔ امیر خسروؒ نے یہی مناسب جانا کہ سکوت اختیار کریں، اس لئے چپ چاپ اس شخص کی گفتگو سنتے رہے جو تیسرے فتح کے سوا کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

راجستھان کی ہوائیں چلتی رہیں اور پرچم شاہی لہرا تا رہا۔ علاء الدین خلجی کے اس پرچم پر تین کلمات تحریر کئے گئے تھے۔

”خدا کا سایہ..... وقت کا سورج..... محافظِ عالم.....“

☆ ☆ ☆
راجہ رتن سنگھ کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اس نے سابق سپہ سالار چھن سنگھ اور موجودہ سینا پتی کو ایک مجلس خاص میں طلب کیا۔ ہری سنگھ نے اپنے حکمران کو اشاروں میں یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ مہارانی پدمنی کو اس مجلس مشاورت سے دور رکھے۔ ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ رانی پدمنی اکیں اٹھ اٹھ کر واپس لوٹنے سے داخل ہوئی جیسے ریاست کی سرحدیں بیرونی حملے کے خطرات سے مکمل محفوظ ہیں اور چوٹوں کے دیواروں پر سکون و عافیت کی گرمی نیند سوز ہے۔ رانی پدمنی داخل ہوئی تو راجہ رتن سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہری سنگھ جیسے غیر متند سپاہی کیلئے یہ بات ناقابل برداشت تھی مگر اسے بھی جبراً اٹھ جانا پڑا۔ رانی پدمنی، راجہ رتن سنگھ کے دائیں جانب بیٹھ گئی اور پھر اس نے تمام راجپوت سرداروں کو پایا پٹنی سی نظر ڈالی کچھ دیر بعد کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ ہری سنگھ نے پوری تفصیلات کے ساتھ محاذ جنگ کی صورت حال بیان کی۔

”پھر تم کیا چاہتے ہو ہری سنگھ؟“ راجپوت سمرات نے اپنے سپہ سالار سے پوچھا۔
”اب جنگ کا فطری تقاضا یہی ہے کہ ہمارے کچھ فوجی دستے قلعے سے نکل کر اس طرح مزاحمت کریں کہ سلطان کے لشکر پر چڑو کی ہیبت قائم ہو جائے۔“ ہری سنگھ نے اپنا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔
”اور پھر تم کیا کہتے ہو؟“ راجہ رتن سنگھ نے چڑو کے بوڑھے سینا پتی سے مشورہ طلب کیا۔
”میں ہری سنگھ کی تجویز سے متفق ہوں۔“ بوڑھے نے پھر ہری سنگھ کے جسم میں ہلکا سا ریشہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر اس کی آواز میں وہی جوانوں جیسی گرج تھی..... ”مضبوط دفاع کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ عمل ہماری غیرت مندانه زندگی اور بیدار حوصلوں کا ثبوت فراہم کرے گا۔“
راجہ رتن سنگھ نے براہ راست جواب دینے کے بجائے رانی بدی منی کی طرف دیکھا۔

”ہم چوڑکی آہر کیلئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کریں گے۔“ رانی پدمنی نے شاید جی پی پاپن کی زبان استعمال کی تھی۔ اہل و بار اپنی ملک کی سوچ پر مطمئن نظر آنے لگے۔ سپہ سالار ہری سنگھ بھی پاپن کی مثبت انداز فکر پر خوش محسوس کر رہا تھا۔

”ہم سہاٹ اپنے ماہر تیر اندازوں کو حکم دیں کہ.....۔“

”ابھی ہمیں نئی
ہندو کیلئے تین چار دن کی مہلت درکار ہوگی۔ ہماری آنکھیں آسمان کی جانب لگی ہیں اور ہم دیوتاؤں
کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہر یونوں کی مدد..... آسمان؟“ ہری سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔
 ”ہائیم (وسیع و عرض) آکاش کے نیچے نہیں رہتے؟ اور کیا تم دیوتاؤں کی شستی کے منکر ہو؟“
 ہری نے ہری سنگھ سے ایک عجیب سا سوال کیا۔

میں! ابھی نہیں۔ سارا چوڑ جانتا ہے کہ میں دیوتاؤں سے کتنی عقیدت رکھتا ہوں۔“ ہری سنگھ نے زور بھری آواز میں کہا۔ ”آخر مماناری میرے دھرم کو شک کی نگاہ سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ اس نے لے کر تم اپنے بازوؤں کی قوت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہو۔“ رانی پدمنی کا دل ہری سنگھ کی بات سے ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس نازک وقت میں بھی اپنے لائق سپہ سالار کی کوٹھڑی کا دف بنانے سے باز نہیں آئی تھی۔

یہ ننگی خون کا کھونٹ پی کر رہ گیا۔ ”یہ کسی کے عقیدے کو پر کھنے کا موسم نہیں ہے۔ اس فضا میں جو ہے اسے وہیں رہنے دیجئے۔ میں اول و آخر دیوتاؤں کا پجاری ہوں۔ لیکن انسانی عمل کی حقیقت سے بند کرنا میرا شیوہ نہیں۔ ہم اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں اور دیوتاؤں کی کوان کی کچھ بچھڑاؤں۔ آکا ش اور دھرتی کو ایک دوسرے سے ملانے کی فکر نہ کریں کہ اس سے ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔“

اگر تم دیوتاؤں کے کرم پر یقین رکھتے ہو تو کچھ دن انتظار کرو۔“ رانی پد منی نے کمرے کے وسط دیوار پر ہفت رنگ فانوس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ “آکاش سے دیوتاؤں کی فون اترے والی ہے۔ مہاراج کیسے بتایا ہے کہ اس بار دیوتاؤں کی سینا پانی کی بوندوں کی شکل میں چوڑی وھرتی پر اترے گی اور پھر اس کے لشکر کو گھیرے گی اور بڑی کس لہریں کسی گرجے کی طرح ٹگل جائیں گی۔“ یہ کہہ کر رانی پد منی نے فونی مشینوں اور راجپوت سرداروں کو اس جاپ کی تفصیلات سے آگاہ کیا جس میں رام دیو سات لاکھ لاکھوں کو دریائی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں مہارانی!“ ہری سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے شدید بیچ و تاب کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں کو جکڑ لیا۔..... ”مہاراج رام دیو کو آخر پتہ چلے گا کہ کیا دشمنی ہے کہ یہاں تک نہیں اس قدر خوفناک انتقام لے رہے ہیں؟ اگر لڑکیوں کی لاشوں سے گیمبری کی کپاٹ دیا تو تم بھی کوئی سیلاب نہیں آئے گا۔ دیوتاؤں کی قسم! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ سب ان لوگوں کی سازش ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر بیٹھ گئے ہیں اور پوری قوم کو غلط عقیدے کی دلدل میں اتار دینا چاہتے ہیں۔ اگر رام دیو کو اپنے منتروں کی سچائی پر اتنا ہی یقین ہے تو وہ خود دریا کی لہروں میں کیوں نہیں نہالتا۔“ ہری سنگھ کا عجیب گستاخانہ ہو گیا تھا۔

ایک بچہ کی ہری سنگھ کی اس جارحانہ گفتگو پر اپنے غصے کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر پچھن سنگھ نے انتہائی بات کا ثبوت دیا اور ہری سنگھ کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بوڑھے سینہ پانچنے نے ایک لالہ نوہر پرست عورت کو مطمئن کرنے کیلئے کہا۔ ”رائی! ہری سنگھ ایک بے باک فوجی ہے۔ وہ کسی گمراہیوں کو زیادہ نہیں سمجھتا۔ مہاراج رام دو بوڑھے گیلیاں ہیں۔ دیوتا ان سے ہم کلام ہوتے ہیں

اور آکاش کی خبریں دیتے ہیں۔ زمین پر رہنے والے ہم گناہ گار کچھ دن اور انتظار کر لیں گے۔ ”پھر کچھ راجپوتوں کو آپس کے اختلافات سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ہری سنگھ کو تصادم کے مقام سے ہٹا کر دیہ لے گیا۔

☆ ☆ ☆

راجپوت دوشیزاؤں کا سات روزہ برت پورا ہو چکا تھا۔ مسلسل فاقہ کشی سے لڑکیاں اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ باپ کے مکمل ہو جانے کے بعد رام دیو نے رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ سے کہا کہ وہ چند سپاہیوں کے ذریعے لڑکیوں کو دریا کے کنارے پہنچا دیں اور پھر گنہگار کی لہروں کے حوالے کر دیں۔ رام دیو نے ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی لڑکی غرق ہونے سے محفوظ نہ رہے ورنہ ساری تپسیا ریگاں جائے گی۔

رانی پدمنی اور رتن سنگھ بہت خوش تھے مگر اچانک ان کے چہرے بچھے ہوئے نظر آنے لگے۔ ”ہمارے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق سلطان کا محاصرہ بہت سخت ہے۔ اس صورت میں دریاے گنہگار کی تپسیا تقریباً ناممکن ہے۔“

”سہرا! یہ میری ذمہ داری نہیں۔“ رام دیو نے بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ”رات کے اندھیرے میں آسانی سے دریا تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اگر علاء الدین کے سپاہی درمیان میں حائل ہو بھی جائیں تو ان سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑکیاں اپنی مذہبی رسم ادا کرنے کیلئے گنہگاری کے پانی میں غسل کرنا چاہتی ہیں اور پھر وہ مزاحمت کریں تو خوشامد سے کام لیں کہ یہی راجہ رتنی (سیاست) ہے۔“

رانی پدمنی اور رتن سنگھ کے چہروں پر اطمینان کا رنگ دوبارہ ابھر آیا۔ پھر وہ سیاہ رات طلوع ہوئی جس کے اندھیرے میں سات جانوں کے چراغ بجھانے کی کوششیں جاری تھیں۔ چودہ سپاہی ان لڑکیوں کو لے کر راج محل سے باہر نکلے۔ ہر لڑکی کو دو سپاہی اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے اور لاغر و نحیف دوشیزاؤں کو مردہ جانوروں کی طرح دریائے گنہگاری کی طرف کھینچ کر لے جا رہے تھے۔ سپاہیوں نے بڑی احتیاط سے راستے طے کیا تھا مگر انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ گنہگاری کے کنارے کنارے سلطان کے بے شمار سپاہی پھیلے ہوئے ہیں اور مسلسل گردش میں ہیں۔ علاء الدین کے ایک فوجی دستے نے اس وقت رتن سنگھ کے سپاہیوں کو جالیا جب وہ دریا کے قریب پہنچنے والے تھے۔

رام دیو کی ہدایت کے مطابق چوڑے سپاہیوں نے مذہبی رسم کی ادائیگی کا بہانہ تراشا مگر لڑکیوں کی محنتی گھٹی چٹنوں نے ان کے قریب کا پردہ چاک کر دیا۔

”ہم مرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں تمہارے دیوتاؤں کا واسطہ! ہمیں بچالو کہ ہم نرودش (بے قصور) ہیں۔ ہمیں جبراً اور یا کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔“ لڑکیوں نے اس طرح سلطان کے سپاہیوں سے فریاد کی کہ ان کی آوازیں دوشنی جاری تھیں اور الفاظ اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے جیسے کسی انسان پر بڑا ناگ عالم طاری ہو۔

علاء الدین کے جانباز سپاہیوں نے جب رتن سنگھ کے فوجیوں سے باز پرس کی تو وہ غصے سے بڑک اٹھے۔

”یہ ہماری حدود مملکت ہیں اور ہم اپنی ہی زمین پر کسی دوسرے کو جواہدہ نہیں ہیں۔“ راجپوت سپاہیوں کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

جس زمین کی تم بات کر رہے ہو اسے ہمارے سلطان بزرور طاقت کبھی کے خرید چکے۔ اب تم اور لڑاؤ رتن سنگھ ہمارے غلام ہیں اور غلاموں کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ آقاؤں کی مرضی کے بھی کر سکیں۔“

راجپوت خون تھا۔ شاہی سپاہیوں کے گرم الفاظ سن کر اس طرح کھول اٹھا کہ دماغ کی رگیں پھٹنے پھڑکنے لگیں۔ سپاہیوں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں کچھ دیر تک دریائے گنہگاری کے کنارے ایک حرکت جاری رہا۔ میاں تک کہ سلطان کے فوجیوں نے اپنے دشمنوں کے جسموں پر غلبہ حاصل دس راجپوت سپاہی مارے گئے اور چار شدید زخمی حالت میں قیدی بنائے گئے۔ اس تصادم میں کے تین سپاہی بھی کام آئے۔

☆ ☆ ☆

ظان کے سامنے ان ساتوں راجپوت دوشیزاؤں کو پیش کیا گیا۔ لڑکیوں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی اور پریشانی طیب کو بلا یا گیا۔ پھر کہیں جا کر صبح تک وہ لڑکیاں اس قابل ہو سکیں کہ علاء الدین کی کسی اجواب دے سکیں۔ جب لڑکیوں نے آواز داری کے ساتھ اپنی روداد غم سنائی تو سلطان کے دل جل اٹھے۔

تمہارے دیوتاؤں دریاؤں کے سینے سے طوفان اٹھائیں گے جو ہمارے جاہ و جلال کی ہیبت سے خشک جاتے ہیں۔“ سلطان نے راجپوت دوشیزاؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

عوم لڑکیاں خوف و ہشت سے کانپ رہی تھیں۔ غیرت مند دوشیزاؤں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مردوں کا جوہم دیکھا تھا۔ شرم و حیا سے جھکی ہوئی گردنیں اور لرزہ خیز انجام کے ڈر سے کانپتے ہوئے ناقابل بیان منظر پیش کر رہے تھے۔ علاء الدین نے سسمی ہوئی لڑکیوں کی جانب نگاہ کی اور پھر بہت پیش کئے گئے۔

تم اس سلطان کی امان میں ہو جو بے گناہ اور مجبور لڑکیوں پر کبھی دست درازی نہیں کرتا۔ وہ تو غرور کو اپنے قدموں میں جھکانے کا عادی ہے۔ تم ہر خوف اور خدشے سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اگر تمہیں طاقت و جبروت کے سامناں پر اعتبار نہیں تو اپنی اپنی چٹنوں کے نیچے لوٹ جاؤ۔ ہمارے سپاہی تمہیں ہر قلعے تک پہنچا دیں گے جیسے تم اپنی ماؤں کے آنکلوں کے زیر سایہ چل رہی ہو۔“ سلطان کے دیکھنے میں اچانک کسی مہربان باپ کی شفقت شامل ہو گئی تھی۔

”میں سلطان! ہمیں اپنے سامنے میں پڑا رہنے دو۔“ راجپوت دوشیزاؤں کی فریاد و فغاں سے سلطان کو گن اٹھا۔ ”وہ لوگ ہمیں پھر کسی دیوی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ سلطان! ہم اس بستی میں اٹ کر جائیں جہاں ہمارا بچپن ایک بو جھ اور جوانیاں ایک عذاب ہوں۔ ہمیں رخصت کرتے وقت اسے سوا کسی کے آنکھوں میں آنسو نہیں آئے اور کسی کے ہونٹوں سے کوئی چیخ نہیں ابھری۔ گھر کے اندر سے نکلنا، آئینہ نا آشنا، گلیاں بے رحم، کوچے قاتل، آسمان دور، زمین تنگ، کوئی بھی تو نہیں اپنا، ہم کے حصے کاٹ کر پھینک دینے والے باپ، رقص و شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے حکمران، دن رات خون سے پیاس بجھانے والے دیوتا۔ سلطان! آپ کو کیا معلوم کہ ہماری بستی کیسی بستی ہے؟ چل جائیں؟ وہاں، ہمارا کون ہے؟ ہمیں آپ ہی قتل کر ڈالیں اس طرح مرتے وقت یہ سون تو لہو بجائے گا کہ قاتل ہمارے ہم مذہب نہیں تھے غیر تھے اور بہت دور سے آئے تھے۔“

راجپوت دوشیزاؤں کی داستان الم نے کئی آنکھیں نمناک کر دیں اور کئی دامن بھگو ڈوالے۔ حضرت

بڑی عذاب ناک صورت حال ہوئی۔ ”ہری سنگھ نے مختصر میدان جنگ اور دشمن کی چالوں کا جائزہ لیا۔ قہر اجلاس کے کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔

ہوش کی ایک مختصر سے وقفے کے بعد ہری سنگھ نے دوبارہ لب کشائی کی۔ ”اب ہمیں لازم ہے کہ ہم غیر اندازوں کے ایک دستے کو آزمائیں اور مشاہدہ کریں کہ سلطان کا خیمہ ہماری دسترس سے کتنا دور ہے۔ اگر ہمارا ایک تیرہ بھی علاء الدین کی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔“

”اگلی ہری سنگھ اپنے بے جنگی منصوبے کی پوری تفصیل پیش نہیں کر سکا تھا کہ راجا رتن سنگھ کے محافظ خاص ایک چوکیدار نے والی خبر دیتے ہوئے کہا۔

”سراٹ! ہمارے چار زخمی سپاہی سلطان کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں اور وہ آپ سے فوری طور پر ملنے کی بات چاہتے ہیں۔“

یہ بڑی سنی خیر اطلاع تھی۔ جوش اضطراب میں رتن سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور پھر تیز آواز میں اسے کہنے لگا۔ ”چوڑے کے ان جانباڑوں کو فوراً ہمارے روبرو حاضر کرو۔ ہم ان سوراڑوں کے چہرے پہلے ہی جنہیں سلطان کی مضبوط زنجیریں بھی اپنی قید میں نہ رکھ سکیں۔“

رتن سنگھ رانی پدمنی اور تمام راجپوت سرداریہ اطلاع پا کر بہت خوش تھے مگر سینا پتی ہری سنگھ کے ماتھے پر ہوش کی کئی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ زخمی سپاہیوں کی واپسی کو ایک غیر معمولی واقعہ سمجھ رہا تھا۔ یہی وہ چاروں سپاہی راجا رتن سنگھ کے مخصوص کمرے میں داخل ہوئے، تمام حاضرین دم بخود ملے۔ رانی پدمنی اور دیگر راجپوت سرداروں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں اس منظر سے ہلکی ہلکی تھیں جیسے پتلیوں کی حرکت رک گئی ہو۔

”یہ سب کچھ کیا ہے؟“ راجا رتن سنگھ اپنے سپاہیوں کو دیکھ کر چچناجن کے ہاتھ پشت سے بندھے تھے۔ تین سپاہیوں کی گردنوں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے گئے تھے۔ جسے زندہ قید میں غلامی کا ناگھاجا تھا اور ایک سپاہی کے گلے میں تانبے کی ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھی ہوئی عبارت نظر نہ آئی۔

”نیش سنگھ! اس تحریر کو پڑھو۔“ شدت غضب سے رتن سنگھ کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔

ماہر تیر گنیش سنگھ لڑکھاتا ہوا اٹھا اور سپاہی کے قریب پہنچ کر تانبے کی تختی کو پڑھنے لگا۔ فوجی مجلس کے ارکان کی نظریں گنیش سنگھ پر مرکوز تھیں۔ ایک ایک تمام لوگوں نے دیکھا کہ گنیش سنگھ کا چہرہ زرد ہو گیا ہے اس کے جسم کی لرزش پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

”کیا لکھا ہے ہمیشہ سنگھ!“ راجپوت سراٹ نے چیخ کر کہا۔ ”کیا تو اس تحریر کو پڑھنے کے لائق نہیں ہو؟“

”سراٹ! جو کچھ سلطان نے لکھا ہے اسے ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔“ مہمانبری نے منہ لہجے میں کہا۔

”نیش سنگھ! ذی ہوش انسان اپنے دشمن سے شیریں کلمات کی توقع نہیں رکھ سکتا۔“ راجا رتن سنگھ نے صراحت کر کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ اس ذلیل انسان نے اس بار پھر ہمیں گالیاں لکھی ہوں۔“

”ہماری آواز بلند پڑھو کہ آج کوئی حدِ ادب قائم نہیں ہے۔“

”نیش سنگھ! اس تحریر کو پڑھنا شروع کیا جو تلواریں نوک سے تانبے کی تختی پر لکھی گئی تھی۔

”نیش سنگھ! یہ طوق غلامی ہے جسے عفریب تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے

امیر خسرو کی حالت ناقابل بیان تھی۔ ایک حساس شاعر اور دردمند صوفی کے دل پر چوٹ پڑی تو ہم کے آبشار بہہ نکلے۔ خود علاء الدین خلجی کا چہرہ بھی دھواں دھواں نظر آ رہا تھا۔ اس نے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”یہ راجپوت سرداروں کی بیٹیاں ہیں۔ ان کے ساتھ خاندان شاہی کی طرح سلوک کیا جائے۔ ہم حالت جنگ میں ہیں لیکن پھر بھی انہیں وہی آسائش و احترام دیا جائے جس کی یہ مستحق ہیں۔“

راجپوت لڑکیوں کو لشکر شاہی میں اس طرح نہاد دیدی گئی جیسے وہ اپنے گھروں میں محفوظ ہوں۔ پھر اس کے بعد جب سپہ سالاروں نے رتن سنگھ کے قیدی سپاہیوں کے بارے میں دریافت کیا تو جواب دیا گیا۔

”یہ واپس جائیں گے۔“ سلطان نے اپنے طبیب خاص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان زخموں روز میں بھر جانا چاہئے۔“

خیمے میں موجود تمام لوگوں نے سلطان کے حکم کو بڑی حیرت سے سنا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے۔

☆ ☆ ☆

راجا رتن سنگھ اور رانی پدمنی بڑی شدت سے اپنے سپاہیوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈھل گئی اور سورج نکل آیا مگر سپاہی لوٹ کر نہیں آئے۔ رام دیو کو فوری طلب کیا گیا۔ بدست شاہ لڑکھاتا ہوا آیا اور جب اس نے یہ خبر سنی کہ لڑکیوں کو لے جانے والے سپاہی ابھی تک راج محل نہیں ہیں تو وہ بھڑک اٹھا۔

”میں کب تک اپنے گیان کو بردہ ہوتا ہوا دیکھوں۔ میں نے اس دھرتی کیلئے سیکڑوں راتیں جا گزاردیں اور ہزاروں دن تپیلی آگ میں جلتے ہوئے بسر کر دیئے مگر سب کچھ رائیگاں گیا۔ دیوناؤ چاہتے کہ اس زمین کی آبرور قرار رہے۔ پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“ رام دیو بڑبڑاتا ہوا واپس جا۔

رانی پدمنی نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ ”اب دیوناؤں سے کوئی دھرتی پر آتر آئیں اور چوڑی کیا کو منجہ ہار سے نکالیں۔“ رام دیو نے نیا مہمانہ تراشا اور راج محل سے کر اپنے آشرم میں چلا گیا۔

راجا رتن سنگھ اور رانی پدمنی آسانی امداد سے باخوش ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس اس کے چارہ نہ تھا کہ وہ سابق سپہ سالار چمچن سنگھ کے توسط سے ناراض ہری سنگھ کو منانے کی کوشش کریں۔ ہر ایک وطن دوست سپاہی تھا جب چمچن سنگھ نے اس کے سامنے راجپوت سراٹ کی خواہش کا اظہار کیا تو شکایت کے بغیر اس فوجی اجلاس میں شریک ہو گیا جو چوڑ کو بچانے کیلئے منعقد کیا گیا تھا۔

”میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہم اپنے کچھ فوجی دستے قلعے سے باہر نکالیں اور سلطان کے ہوئے لشکر کو ”چوڑ پہاڑی“ سے پہلے روکنے کی کوشش کریں۔“ ہری سنگھ اپنی اس جنگی حکمت ذکر کر رہا تھا جس پر رام دیو کے متزلزل اور چالوں کی وجہ سے اب تک کوئی عمل نہیں ہو سکا تھا۔

”پہاڑی بردشمن کا جھنڈا نصب ہونے کا ایک ہی مفہوم ہے کہ حصار کا دائرہ بہت زیادہ تنگ ہو گیا ہے۔“

پشت دشمنوں سے بھری ہوئی ہے۔“ وائیں اور وائیں جانب بھی سلطان کے سپاہی ہماری نقل و حرکت کے راستے بند کر چکے ہیں اور اب قلعے کے عین مقابل، تھوڑے فاصلے پر خود علاء الدین کا نمودار ہونا کوئی علامت نہیں۔ تین ماہ کے محاصرے میں بس یہی ہماری کامیابی ہے کہ سلطان نے ہمارے رسد سے با

منقطع نہیں کیا ہے۔ شاید اسے ہماری زیر زمین سرنگوں کا علم نہیں ورنہ اب تک خوراک کا قحط بھی پہنچ

منقطع نہیں کیا ہے۔ شاید اسے ہماری زیر زمین سرنگوں کا علم نہیں ورنہ اب تک خوراک کا قحط بھی پہنچ

کرتے اور آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ اب چوڑ میں وہی شخص رہ سکتا ہے جسے جلنے، برباد ہونے اور مرنے سے موت ہے۔ جہاں جہاں تک تمہاری آواز پہنچ سکتی ہے، اہل چوڑ کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ اب موت کی نفوس کے سوا کسی کیلئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ ”راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ غضب ناک نظر آ رہا تھا۔ چوڑ کے جن لوگوں نے اپنے مجبور سپاہیوں کو بے کسی کی موت مرتے دیکھا تھا وہ خود بھی اپنی اپنی جگہ لرز رہے تھے اور چند روزہ زندگی سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ راجہ رتن سنگھ نے یہ سنگدلانہ فیصلہ اس لئے کیا کہ اہل چوڑ کے دلوں سے سلطان کی ہمت کا اثر زائل ہو جائے اور تمام راجپوت اس تلخ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ زندگی سے پیار کرنے والوں کیلئے چوڑ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر جب وقت ذوال انسان کا مقدر بنے ہیں تو پھر ہر مثبت تدبیر کا منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔

وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائے گا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائے گا

راجہ رتن سنگھ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جاں نثاروں کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، مہمانبری لرم سنگھ کا قتل، سوگرم مال دیو سنگھ کی اسیری، مائی بھان متی کی گرفتاری کیلئے بھیجنے والے سپاہیوں کی ہلاکت، اپنی ہفتک داس کے منتروں اور مہاراج رام دیو کے چاپوں کا لٹائثر، یہ تمام واقعات اس گردشِ وقت کی دہشتناکی تھیں جن کی رفتار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

رتن سنگھ نے اپنے سب سے بڑے ہمدرد سپہ سالار ہری سنگھ کی تجویز کو مسترد کر کے ایک اور حماقت کی۔ اس نے اپنے چاروں سپاہیوں کے کٹے ہوئے سروں کو ایک بڑے طشت میں سجا کر سلطان کی خدمت میں لے جایا۔ ہری سنگھ نے ایک بار پھر مدخلت کرتے ہوئے کہا۔

”سراٹ! آپ کی بساط کے مہرے بہت تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مہرے جن کے سر آپ سلطان کو پیش کر رہے ہیں، بے قصور بھی تھے اور جاں نثار بھی۔“

رتن سنگھ ہلکا اٹھا۔ ”ہری سنگھ! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم تلوار کے دھنی ہوا اور تم نے کئی بار کسی بے ہمتی سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے مگر امور مملکت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ ایک سینا پتی کو لشکر کی کٹ پر نازاں نہیں ہونا چاہئے کہ اس میں اس کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔ یہ صرف ہماری لاشیں ہیں جس کے سارے فوجیوں لڑتی ہیں اور پھر فتح سے ہسٹنا رہتی ہیں۔ تمہیں بھی یہ راز دیوسر بلندی ہماری ہی مرہانیوں سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے تمہاری تلوار کو آبِ بخشش اور پھر اسے ٹٹوں کی گرہیں کاٹنے کا ہنر سکھایا۔ اور آج تمہاری ناشکری کا یہ حال ہے کہ تم اپنے سراٹ کو جینے کے واسطے سکھاتے ہو۔“

راجہ رتن سنگھ کی یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر ہری سنگھ کا چہرہ بگڑ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے بھرے دربار میں اس کے کھم سے فوجی لباس اتار کر اسے کسی اچھوت کے کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں۔ ہری سنگھ چاہتا تھا وہ اس کا اختیار کرے مگر وطن دوستی نے اس کے غیور جذبوں کو مجبور یوں کی زنجیریں پہنا دی تھیں۔

مگر وہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا جب دس راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ قلعے کے صدر دروازے سے باہر اسی کار چوڑ پناہ کی طرف تھا جہاں سلطان علاء الدین خلجی نے پرچم لہرانے کے ساتھ ساتھ ہزار ہا بھی آراستہ کیا تھا۔ دس سپاہیوں کے درمیان ایک سبک رفتار گھوڑا تھا جس کی پشت پر سروں والی ایک لڑکی تھی جو موجود تھا۔ طشت پر سرخ رنگ کا کپڑا ڈال دیا گیا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ایک لڑکی کی طرف سے دوسرے فرمانروا کو کوئی قیمتی تحفہ بھیجا جا رہا ہے۔ جب راجہ رتن سنگھ کے سپاہیوں نے

دو تارے جان پتھروں کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے ساکت مجتہدوں کو غور سے دیکھ کر وہ تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ تو معصوم لڑکیوں کو ہلاک کر کے اپنے دریاؤں میں سیلاب لانا چاہتا ہے کہ اس طرح ہمارا جاہ و جلال چوڑ کے ندی نالوں میں غرق ہو جائے۔ اگر تیرے گھر سے رسم مردانگی نہیں اٹھ گئی ہے تو ہمارا ایک بار قلعے سے نکل کر دیکھ کر ہماری آتشِ قہر نے تیرے دریاؤں کے جگر خشک کر دیئے ہیں۔ رتن سنگھ ہماری بات پر یقین کر کہ ہم بھی بلند باند و عموں نہیں کرتے۔ اپنی دستار کہیں چھپا دے کہ غریب ہمارا دست دراز کسی غفلت کی قربانی طرح اسے تار تار کر دے گا اور اپنے تاج زر نگار کو کسی گوشے میں دفن کر دے کہ ہمارے آہنی قدم اسے پامال کر ڈالیں گے اور اپنے قلعے کی دیواروں کو مزید اونچا اٹھائے کہ ہمارے لالہ ہوئے خونی سیلاب کی موجیں تیرے میناروں سے بلند تر ہوں گی۔“

سلطان علاء الدین خلجی کی تحریر کردہ عبارت ختم ہو گئی تھی۔ مہمانبری گنیش سنگھ کا پورا بدن پر میں تر ہو گیا تھا اور چاروں سپاہی مجرموں کی مانند سر جھکائے کھڑے تھے۔

راجہ رتن سنگھ اپنے سپاہیوں کی یہ حالت دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب سلطان علاء الدین خلجی نے اسے عجیب انداز میں ذلیل و سوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ”ہم نہیں جانتے کہ بے غیرتی اور بے تمیزی کی کوئی منزل ہے؟ ایک راجپوت اپنی آزادی فردخت کر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ منظر ہم نے آج ہی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

قیدی سپاہیوں کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ ”سراٹ! ہم پر اور طعنہ زنی نہ کریں، بس حکم دیں کہ ہم اس شرمناک زندگی سے نجات دلائی جائے۔ کاش! ہمارے ہاتھ کھلے ہوتے تو ہم خود ہی اپنے سراٹ کا آپ کے قدموں پر رکھ دیتے۔ ہم نے غلامی کے یہ طوق اپنی خوشی سے نہیں بڑے عالم جبریں قبول کیے ہیں۔“ شدت جذبات سے سپاہی رونے لگے تھے۔

”اپنے ہاتھوں کو دشمن کے حوالے کرنے اور غلامی کا طوق پہننے میں بڑا وقفہ ہے، بڑا فاصلہ ہے۔“ نے اپنی نامراد زندگی میں یہ منزل آنے ہی کیوں دی؟ تمہارے جسم کے ٹکڑے سلطان تک کیوں نہیں پہنچے؟“

”نہیں جب تک ہوش رہا ہم اپنے سراٹ کا نام اونچا رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔“ بے دست سپاہی کسی مجرم کی مانند اپنی صفائی پیش کر رہے تھے۔ ”بے ہوش ہونے تک ہم راجپوتوں کی آزادی و سر بلندی کے ترانے گاتے رہے مگر جب زخموں نے ہم سے ہمارے حواس چھین لئے تو پھر ہم کرتے؟ مجبور یوں نے ہمارے ہاتھ جکڑ دیئے اور گردشِ وقت نے ہماری گردنیں جھکا دیں۔“

راجہ رتن سنگھ نے سپاہیوں کی مجبور یوں کو دیکھ کر نظر انداز کرتے ہوئے انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ سپہ سالار ہری سنگھ نے راجپوت سراٹ کو سمجھانا چاہا کہ یہ سپاہی میدان کے مفروز نہیں، ایک حادثے کا شکار ہیں اور یہ حادثہ بڑے بڑے سوراخوں کی زندگی میں بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس لئے انہیں معاف کر دیا جائے۔ اور چوڑ کی افرادی قوت کو خود اپنے ہاتھوں برباد نہ کیا جائے۔ یہ ایک ہوشمندانہ مشورہ تھا مگر راجہ رتن اس قدر مشتعل ہو گیا تھا کہ اس نے سپاہیوں کے قتل کا حکم واپس نہیں لیا اور اس طرح چار جاں نثار فوجی ایک حکمران کی بددماغی کا شکار ہو گئے۔

سپاہیوں کو قلعے کے کھلے میدان میں قتل کیا گیا جب ان بد نصیبوں کے جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گئے راجہ رتن سنگھ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جن کے چہرے ہماری جانب تھے اور جن کی پشت میدان کی طرف تھی، انہیں ایسی ہی سزا دے کر تھی ہم فرار کی ہمت اٹھانے والوں کو معاف نہیں

ہنگ نہرت! اور ملک ظفر! تم سب وحشت کا مظاہرہ نہ کرو۔ تمہارے سلطان نے یہ کھیل بہت دیکھے

”سلطان والا حشم! یہ آپ کے جاہ و جلال کی توہین ہے۔“ سپہ سالار تاج الدین عراقی نے ادب سے خم
ہے ہوئے کہا۔ ”ہمیں حکم دیجئے کہ ہم اس سے زیادہ خوں رنگ تحائف رتن سنگھ کو
مال کریں۔ یہ چار سرور باقی دس سپاہیوں کے سر، ہم رتن سنگھ کے دربار میں پھینک کر آئیں گے۔“
”نہیں عراقی! اتنے جذباتی نہ بنو۔ عقل و ہوش سے کام لو۔۔۔۔۔۔“ سلطان علاء الدین خلجی نے
ہلکا پر سکون لہجے میں کہا۔ ”حافظ تمہارا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ عراقی! تمہیں یاد نہیں رہا کہ ہم دوبارہ
رنگ تحائف رتن سنگھ کو بھیج چکے ہیں۔“

عراقی سیدھا ہوا گیا مگر اس کا چہرہ غصے سے تہمتا رہا تھا۔

”ہم تمہارے راجہ کا یہ تحفہ ٹھکر بھیج سکتے ہیں۔“ علاء الدین خلجی بڑے سرد لہجے میں بول رہا تھا
”اپنی شمشیر سے آہستہ آہستہ رتن سنگھ کے سپاہیوں کی شہر گیس کاٹ رہا ہوں۔“ ہماری ایک ہلکی سی
راں بد نصیب سپاہیوں کو مزید رسوا کر سکتی ہے مگر ہم سلطان ہیں۔ مرنے والوں کو اپنے جذبہ انتقام کا
نہیں ہانتے۔۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر علاء الدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور راجپوت سپاہیوں کی
غور سے دیکھنے لگا۔ جن کے ماتھوں پر نخوت کے بل ابھی تک نمایاں تھے اور جن کی گردنیں بدستور
نظر آ رہی تھیں۔ ”تمہارے راجہ نے ہمیں تحفہ ضرور بھیجا مگر وہ ہمارے مرتبے کو نہ پہچان سکا اور
اس میں اپنی حیثیت بھی بھول گیا۔“ سلطان دوبارہ راجپوت سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”آخر وہ ایک
ہلکا جاگیردار ہے۔ اسے کیا معلوم کہ شہنشاہ کے حضور کیا نذر پیش کی جاتی ہے۔ ہم اسے احمق سمجھتے تھے
اب تک نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ
پتہ ہی وفاداروں کی گردنیں کاٹ کر ہمیں پیش کر دے گا۔“

”یہ دیوانگی نہیں۔“ ایک راجپوت سپاہی نے جواباً کہا۔ ”ہمارے سمرات نے جو کچھ کیا ہے پورے
دعویٰ کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے دشمن کے نام ان کا پیغام ہے کہ راجپوت شکست کی ذلت
شک کرنے سے پہلے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔“

ایک سپاہی خاموش ہوا تو دوسرا کہنے لگا۔ ”سمرات نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں آگ اور خون کا کوئی کھیل
نہ نہیں کر سکتا۔“

”تمہارا سمرات جھوٹ بولتا ہے۔“ سلطان کے ہونٹوں پر بڑی تحقیر آمیز مسکراہٹ رقصاں
”اگر موت کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط نہیں ہوتا تو وہ اپنے ہی جاں نثروں کو زندگی
مذہب نہ کرتا۔ یہ وحشیانہ حرکت اس کی بزدلی کی دلیل ہے۔ ہمیں خدا نے دو اضافی آنکھیں عطا کی
انہیں انہوں نے تمہارے سمرات کو پر اسرار تہہ خانوں اور خفیہ سرگلوں میں چھپا دیکھا ہے ہیں۔
اس لئے کہ انہوں نے سپاہیوں کے سر قطع کئے ہیں مگر ہماری آنکھیں تو اس وقت کا بھی مشاہدہ کر رہی ہیں
مذہب گردان کاٹ کر ہمارے قدموں پر رکھ دے گا۔ تم واپس جاؤ اور اس سے کہہ دینا کہ ہم نے اس
کو قتل کر ڈالا۔ اگرچہ ہمارے شوق تغیر کے شعلوں کو تمام اہالیان چوڑے کے خون کی بارش بھی سرد
ہو گئی لیکن کیا کریں کہ ہمارا حریف بہت مفلح اور مجبور و ناتواں انسان ہے۔ ایک بھکاری ہماری
نیشہ لاد کیا بھیج سکتا تھا؟“

نصف راستہ طے کر لیا تو ان کے دھندلے چہرے واضح نظر آنے لگے۔ سلطان کے خیمے پر پہرہ دینے والے
سپاہی چونک اٹھے ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ پچاس ساٹھ شہسوار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے
آنے والے دشمن سپاہیوں کے قریب پہنچ گئے اور انہیں گھیرے میں لے لیا پھر تلاشی کے بعد سلطان کے خیمے
میں جانے کی اجازت دیدی۔

علاء الدین خلجی اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ اس طرح جلوہ افروز تھا کہ حضرت امیر خسرو اس کے
دائیں جانب کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے، بائیں طرف سپہ سالار خواجہ حاجی، تاج الدین عراقی، ملک نہرت خان اور
ملک ظفر خان دست بستہ بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے نائب فوجی افسر کھڑے ہوئے تھے۔ عارضی طور پر جو تخت
بنایا گیا تھا اس کے نیچے مسلح سپاہیوں کی دو دروہ قطاریں تھیں۔ جیسے ہی رتن سنگھ کے سپاہی ٹٹلتے لے کر اندر
داخل ہوئے ان کی نظر سلطان علاء الدین خلجی کے سرخ و سفید چہرے پر بڑی راجپوت فوجیوں نے پہلی
نگاہ میں سلطان کی شخصیت سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا مگر جب ان کی آنکھیں والٹی ہند کی آنکھوں سے چار
ہوئیں تو ایک لمحے کیلئے انہیں اپنے جسموں میں سنسنی محسوس ہوئی۔ علاء الدین خلجی کی آنکھوں میں
ایک تیز چمک سی تھی جیسے چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں اور یہی بلند اقبالی کی وہ روشنی تھی جسے عام انسان
برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ راجپوت سپاہیوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس طرح سیدھے کھڑے ہوئے
کہ ان کے ماتھوں پر غرور کی لکیریں تھیں اور گردنیں احساسِ فخر سے اکڑ گئی تھیں۔

راجپوت سپاہیوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ کر سلطان علاء الدین خلجی زیر لب مسکرایا۔
رتن سنگھ کے فوجیوں سے سلطان کی یہ مسکراہٹ برداشت نہ ہو سکی۔ وہ سپاہی جو ٹٹلتا اٹھا ہے ہوئے
تھا، آگے بڑھا اور اس نے سرخ خوان پوش علاء الدین کے آگے رکھ دیا۔

”آخر رتن سنگھ کو احساس ہو گیا کہ ہمارے حضور نذر پیش کرنے ہی میں اس کیلئے امن اور سلامتی ہے۔“
جیسے ہی وہ سپاہی ٹٹلتا رکھ کر سیدھا ہوا علاء الدین نے دوسرے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”اس میں کیا ہے؟“ سلطان نے ٹٹلت کی طرف اشارہ کیا۔ ”رتن سنگھ کو معلوم بھی ہے کہ ہر چیز ہمارے
شایان شان نہیں ہوتی۔“

”یہ تحفہ بڑا اگر انقدر ہے سلطان۔“ ایک راجپوت سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے سمرات
کی پیش کی ہوئی نذر یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔“

علاء الدین خلجی نے ایک بار پھر ٹٹلت کو غور سے دیکھا اور چونک اٹھا۔ ”ہمارے یہاں سرخ
رنگ قتل و غارت اور جنگ کی علامت ہے۔ نذر ایسی تو نہیں ہوتی کہ اس سے خون چسکتا نظر آئے۔“
”ہمارے یہاں کی یہی ریت ہے۔“ راجہ رتن سنگھ کے دوسرے سپاہی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔
”ہم راجپوت جب کسی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو ہمارے تحائف کارنگ خون کی طرح
سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے اپنے جینے کی اداسی۔ محبت کا انداز ہے۔“

علاء الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”پھر اپنے ہاتھ سے اس کپڑے کو الٹ دو۔ ہم دیکھنا
چاہتے ہیں کہ راجپوتوں کی رسوں کا رنگ زیادہ سرخ ہے یا ہمارے جلال کا؟“

خیمے میں موجود سپہ سالاروں کی نظریں ٹٹلت پر مرکوز تھیں۔ راجپوت سپاہی نے آگے بڑھ کر
خوان پوش الٹ دیا۔ خیمے کی فضا میں چند لمحے کیلئے ساکت ہو گئیں۔ تمام سپہ سالار گھبرا کر کھڑے ہوئے اور
اپنی اپنی کھوار کے دستوں پر ان کے ماتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

”بیٹھ جاؤ عراقی!“ سلطان اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ہوا۔ ”سکون رہو حاجی! اشتعال مٹا۔“

جیسے ہی راجپوت سپاہی اپنے دلوں میں نفرتوں کا طوفان چھپائے مڑے، علاء الدین نے پیچ کر اپنے سپاہیوں سے کہا..... ”ان بے ادبوں کو دربار شہابی کے آداب سکھاؤ۔“

راجپوت سپاہیوں کے مڑتے ہی ان کی پشت سلطان کی طرف ہو گئی تھی۔ علاء الدین یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا۔ اپنے سلطان کی آواز سنتے ہی سپاہیوں کی شمشیریں بے نیام ہو گئیں اور ان کی نوکیں راجپوت فوجیوں کے سینوں میں چبھنے لگیں۔ رتن سنگھ کے نمائندے کچھ دیر تو فولا دی سوزش برداشت کرتے رہے مگر جب شہابی تلواریں گوشت کی دیواروں کو کاٹی ہوئی ہڈیوں میں اترنے لگیں تو پلٹ پڑے اب ان کے چہرے علاء الدین کی طرف تھے۔

”تمہارے جاہل سمرات نے تمہیں دربار شہابی میں داخلے اور واپسی کے آداب نہیں سکھائے۔“

علاء الدین کا بھرپور تھکان ہو گیا تھا..... ”اب اگلے قدموں واپس جاؤ اور اس وقت تک چلے رہو جب تک تمہارے مکروہ چہرے ہماری نظروں کے سامنے سے اوجھل نہ ہو جائیں۔“

راجہ کے سپاہی کچھ دیر تک ساکت کھڑے رہے مگر جب انہیں اپنی پشت پر تلواروں کا دباؤ محسوس ہوا تو وہ اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ سلطان اپنی بات تسلیم کرائے بغیر واپس جانے نہیں دے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی راجپوت سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کی گردنیں تپتی ہوئی تھیں اور سینوں پر خون کے ہلکے ہلکے نشانات نظر آرہے تھے۔

رتن سنگھ کے سپاہی ابھی چند قدم ہی پیچھے ہٹے ہوں گے کہ سلطان کی گرجدار آواز ابھری.....

”ٹھہرو۔“ علاء الدین کی تیز آواز سن کر وہ رک گئے۔

”ہماری بارگاہ میں تحفہ لانے والے غلام خالی ہاتھ واپس نہیں جاتے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”ان کے دامن اشرفیوں سے بھر دو۔“

سلطان کے حکم کی گونج فتم ہوتے ہی سونے کے سکوں سے بھرے ہوئے طشت لائے گئے شہابی لشکر کے ایک سپاہی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اپنے اپنے دامن پھیلاؤ تاکہ تمہیں سلطان عالی مقام کی بخشش و عطا کا اندازہ ہو سکے۔“

ایک آزاد قوم کے افراد کیلئے یہ تحقیر ناقابل برداشت تھی نفرت و غضب کی شدت سے راجپوت سپاہیوں کے چہرے جلنے لگے۔ پھر بیک وقت ان سب کی نفرت آمیز صدائیں خیمے میں گونجنے لگیں۔

”آج تک ہمارے دامن کسی کے سامنے نہیں پھیلے۔ اس طرح تو ہم اپنے سمرات کے دیئے ہوئے انعام و اکرام بھی قبول نہیں کرتے۔“

”تمہیں اپنی رسمیں اور عاداتیں بدلنا ہوں گی۔“ علاء الدین پوری طاقت سے چیخا۔ ”یہ کسی جاگیردار کی سرائے نہیں، فاطمہ عالم سلطان علاء الدین خلیجی کا دربار ہے۔“

علاء الدین اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرتا رہا مگر راجپوت سپاہیوں کے ہاتھوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ نہ ان کی گردنوں کا تکانہ ختم ہوا اور نہ چروں کی آگ۔

سلطان کی سماعت نے آج تک حرفِ انکار نہیں سنا تھا۔ راجپوت سپاہیوں کی سرکشی نے اسے بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔ علاء الدین کے سپاہیوں نے راجپوت فوجیوں کی گردنوں پر اپنی شمشیریں رکھ دیں

مگر انہوں نے بہت کر کے اس حقیقت کو جھٹلایا کہ ان کی شرگوں پر دست قضا کے خنجروں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

اور پھر جب چوڑ کے سپاہی کسی طرح بھی شہابی عطیات قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو سلطان نے

ہے قابو ہو گیا۔

”ان کے چروں پر لعنتوں کی سپاہی مل دو۔“ سلطان کے لبوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

مگر ہم قانونِ سفارت کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم ان پہاڑی کتوں کی زبانیں کاٹ کر رتن سنگھ کو بھیج دیتے اور ان کے دیواروں کی اوٹ سے جھانکنے والی اس لومڑی کو بتا دیتے کہ شیروں کو چھیڑنے کا انجام کس قدر بیک ہو جائے؟“

عقلمندی کو کون ٹال سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجپوت سپاہیوں کے چروں پر گہری کالک مل دی گئی۔

راجپوت سپاہی چیختے رہے۔ ”اس کے علاوہ تیرے اختیار میں کیا ہے کہ تو ہمارے چروں کو کالا کر دے

ان غیرت مند لوگوں کا کیا کرے گا جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔“

”ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔“ علاء الدین نے ایک شان بے نیازی بڑھا رکھا۔ ”تمہیں اپنے جن آزاد جندوں اور روشن دلوں پر ناز ہے، ہماری ہیبت سے ایک دن وہ بھی

ہٹ جائیں گے۔“

جب راجپوت سپاہیوں کے چہرے سیاہ کر کے انہیں خیمے سے رخصت کیا گیا تو جوشِ جذبات میں خود علاء الدین خلیجی بھی باہر نکل آیا۔ رتن سنگھ کے فوجی، ذلتوں کے پسینے میں نمائے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے قلعے کی طرف جاتے رہے۔

”بازاری عورتوں کے بجوم میں گھرے ہوئے اس نامرد سے کہہ دینا کہ جس غلیظ کھیل کی ابتداء تو نے کی ہے اس کی انتہا ہم کریں گے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ہم تیرے ساتھ شاہوں کی طرح پیش آئیں مگر تو اپنی سطح نہ کر گیا۔ خدائے ذوالجلال کی قسم! اہل دنیا نے ہمارے نفرت و غضب کو حقیقی لباس میں نہیں دیکھا۔

ہم نے عالم کا ہر چوڑ کے درو دیوار پر اس طرح بر سے گا کہ آنے والی صدیاں بھی اسے فراموش نہ کر سکیں

☆.....☆.....☆

پھر جب راجپوت سپاہی اپنے سیاہ چروں کے ساتھ رتن سنگھ کے دربار میں داخل ہوئے تو ایک کرام سا

مٹا پٹی ہری سنگھ نے سپاہیوں کو دیکھتے ہی کہا۔ ”سمرات! یہ کالک دس چروں پر نہیں ملی گئی ہے بلکہ

طمان نے چوڑ کی پوری تاریخ کو سیاہی میں ڈبو دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ علاء الدین ایسا ہی کرے گا۔

انہوں کی سوگند ہے یہ بے مقصد چھیڑ چھاڑ ہمیں بہت منگنی پڑے گی۔“

اس تجربے کے بعد راجہ رتن سنگھ کے غرور کا شہ نوٹنے لگا تھا اور رانی پدمنی کے تنکیر کا شمار اتنا جا رہا

نہ وہاں کی بجائے بوش و خرد سے کام لیا گیا اور تمام راجپوت سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ چوڑ کو موت

مانفیہ بچوں کی گرفت سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سب سے پہلے سامانِ رسد کا جائزہ لیا گیا۔

مگر تزیل کا کام اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھا لیکن مسلسل تین ماہ کی ذخیرہ اندوزی نے راجپوتوں کو اس

ٹٹا کر دیا تھا کہ وہ چھ ماہ تک ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز رہ کر جنگ کر سکتے تھے۔ یہ ایک اطمینان بخش

نوٹ جس نے راجہ رتن سنگھ اور چوڑ کے سپاہیوں کو نئے حوصلے بخشے تھے مگر سلطان کی پیش قدمی نے

انہیں کافی پریشان کیا۔ ایسے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا جن کا نظائر کوئی علاج ممکن نہیں تھا۔ فوجی امور کے

نظم و انتظام کی حیثیت سے بری سنگھ اور پھمن سنگھ، علاء الدین خلیجی کی منصوبہ بندی کو چوڑ کی سلامتی کیلئے

مہم قرار دے رہے تھے۔ ان کے خیال میں شہابی فوجوں کا قلعے کے مقابل پہاڑی تک پہنچ جانا کوئی

اچھی علامت نہیں تھی بہت غور و فکر کے بعد آخر ہری سنگھ نے لب کشائی کی۔

شعلوں کا کفن ○ 349

تارگڑھ کے مقابلے میں چوڑ کو ترجیح دے رہے تھے۔ چوڑ کے قلعے میں ایک خوبی اور تھی جو تارگڑھ کا مقدر نہیں بن سکی تھی۔ اس قلعے میں تالاب کنڈ، پاؤیاں اور جھرنے بیشہ پانی سے بھرے رہتے تھے۔ یہاں ہی کہ قلعہ کے زمانے میں بھی قلعے کے اندر پانی کی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کثرت آب کی وجہ سے قلعے کی مدد میں تاج کی فصلیں بھی اگائی جاسکتی تھیں۔ یہاں کے حکمرانوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی حملہ آور ٹیپو علاقے کا محاصرہ بھی کر لے تو قلعے کے باسیوں کو کھانے پینے کی چیزوں کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔ یہی وہ ہدایتی حالات تھے جن کے زیر اثر راجپوت سردار بد متوں کے انداز میں سوچ رہے تھے اور ہری سنگھ جیسے لائق ترین سپہ سالار کی مثبت سوچ کو نہایت جاہلانہ طریق سے ٹھکرایا جا رہا تھا۔

ہری سنگھ کو کیا حکمتا کرتا، اکثریت کی بے عقلی کا مرثیہ پڑھتا ہوا اٹھ گیا۔ ”میں نے یہ بحث ذاتی نو رو نمائش کیلئے نہیں چھیڑی تھی۔ اس سے میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہم اپنی اور دشمن کی صحیح طاقت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ جنگ تو سب لوگوں کو مل کر لڑنا ہے۔ پھر بھی میں سمرات سے اتنی التجا کروں گا کہ وہ سوگرا لالہ ہو سکے گی باتوں کو صرف جوش جوانی کا مظاہرہ نہ سمجھیں۔ ہمارے جاسوس اس راز کی تمہ تک پہنچنے کی کوشش کریں کہ علاء الدین خلجی اس قدر اطمینان کے ساتھ آگے کیوں بڑھ رہا ہے اور اس کے پاس وہ کونسا طوطا ہے جو قلعے کی تسخیر کیلئے استعمال کیا جائے گا۔“

ہری سنگھ کے اس سوال کے جواب میں رتن سنگھ نے کہا۔ ”ہمارے جاسوس اطلاع دے چکے ہیں کہ سلطان کے پاس تیروں، نیزوں، شمشیروں اور بھاری گرزوں کے علاوہ ایسا کوئی اسلحہ نہیں جو قلعہ ٹھننی کے کام آسکے۔“

ہری سنگھ مایوس ہو چکا تھا لیکن اس نے مضبوط ہوش سے کام لیتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔ ”میں ان دربار کے جاسوسوں کی تحقیق پر شک نہیں کرتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ میرے اندر کی آواز چوڑ کے دوسرے بال ٹانگوں کی آواز سے مختلف ہے۔“

راج رتن سنگھ، رانی پدی میں اور دوسرے راجپوت سرداروں نے ہری سنگھ کے زاویہ نظر کو جاننے کی کوشش کی اور وہ فوجی اجلاس یہ کہہ کر ختم کر دیا گیا کہ سلطان کے اسلحے اقدام کا انتظار کیا جائے اور پھر جنگی ضرورت کے مطابق چوڑ کے لشکروں کو حرکت دی جائے۔

☆ ☆ ☆

راج رتن سنگھ کی اس حرکت سے سلطان بہت زیادہ برہم ہو گیا تھا اور اس نے شاہی جاسوسوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”رتن سنگھ کی یہ گستاخی بے سبب نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو ہماری یلغار سے محفوظ سمجھتا ہے اور اس نے یقین کر لیا ہے کہ ہمارے ہاتھ بہت مختصر ہیں۔“

”تمہارے جتنے ہوئے سر ہمارے سوال کا جواب نہیں ہیں۔“ علاء الدین کا لہجہ بہت تند و تیز تھا۔ ایک ایک ٹیکہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ قلعے میں سامان رسد کا ذخیرہ پہلے سے موجود ہے یا کسی خفیہ راستے سے مل کر ترسیل ابھی تک جاری ہے؟ ہم نے بظاہر رتن سنگھ کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں اور وہ بیرونی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہے مگر ہمیں ہماری عقل خبر دیتی ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ آج بھی باہر کی فضاؤں حاصل کرنا رابطہ برقرار ہے۔ ہم تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی تعلق موجود ہے تو اسے کاٹ دیا جائے۔“

”سمرات! میں سوگرا کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ سلطان کا بے خوف و خطر آگے بڑھنا مکروہ و حشمت یا اضطراب کی دلیل نہیں۔“ دشمن مکمل آسودگی اور اطمینان سے جہاں چاہتا ہے اپنی فوجوں کی حرکت دیتا ہے۔ ہم چاروں طرف سے محصور ہو چکے ہیں۔ بے شک! ہمارے ہر کھوں کا بنایا ہوا یہ مضبوط قلعہ ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔ مگر ہم پتھر کی دیواروں پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے ہاتھ سے سبق لینا چاہیے۔ تارگڑھ قلعے کے بارے میں بھی یہی روایتیں مشہور تھیں کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور دشمن کے ناپاک قدم اسے چھوئے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب شہاب الدین غوری کی فوجیں قلعے سے سیکڑوں فٹ نیچے وادی میں گردش کر رہی تھیں تو ان کے اس عمل کی کیرے کوزوں کی حرکت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ بلند ترین پناہ گاہوں میں بیٹھے ہوئے راجپوت سپاہی غوری کے اس اقدام کا مذاق اڑاتے ہوئے مسلمان حکمران کو پاگل کہتے تھے ان کے خیال میں شہاب الدین آٹھ فٹ کی بلندی پر چڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر اس کی فوجیں اس دیوانگی کا مظاہرہ کرتیں تو اوپر بیٹھے ہوئے راجپوت سپاہی صرف پتھر مار کر ہی اپنے دشمن کو ہلاک کر ڈالتے۔ یہ ہماری قوم کا ایک گمراہ کن خواب تھا جسے بالادہ شہاب الدین غوری نے پارہ پارہ کر دیا خیالوں کے ظلم میں گرفتار رہنے والے یہی کہتے رہے کہ تارگڑھ کا قلعہ سمندر کی سطح سے دو ہزار آٹھ سو پچیس فٹ بلند ہے، اس کی اونچائی تک کوئی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ غوری کے لمبے ہاتھوں نے تارگڑھ کی آخری چوٹی کو چھو لیا اور پھر بلندیوں کی اس دستار کو دھجیاں کر کے ہوا میں کھیر دیا گیا۔“

ماضی کی اس تلخ روداد کو سن کر راج رتن سنگھ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے اور اس نے اپنے سینا پتی کی بات کو کاتے ہوئے کہا۔ ”ہری سنگھ! یہ کونسا موقع ہے کہ ہم اپنے سڑے ہوئے زخموں کی کیریں اور ان کی بو سے اپنے دماغوں کو منتشر کر ڈالیں۔“

”قوموں کیلئے سمرات! اپنی شکست و ناکامی کی تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔“ ہری سنگھ نے اپنے حکمران کی ناراضگی کا احساس کئے بغیر کہا۔ ”اس طرح ہمیں یہاں تک سکتا ہے کہ ہم نے کہاں غلطی کی تھی اور ہمارے ایک لغزش کے کیا نتائج برآمد ہوئے تھے؟ چوڑ کا فوجی ٹھکانہ یقیناً تارگڑھ سے زیادہ مضبوط ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج تک کسی مسلم حکمران نے اسے تسخیر کرنے کا خواب نہیں دیکھا مگر علاء الدین مسلسل یہ خواب دیکھ رہا ہے اور اپنے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کیلئے چٹانوں سے سرگرم ٹکرا رہا ہے۔ میں اہل مجلس سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سلطان کا یہ عمل محض دیوانہ پن ہے؟“

”تارگڑھ اور چوڑ میں فرق ہے۔“ ایک سردار نے انتہائی تفصیلی آمیز لہجے میں ہری سنگھ کو مخاطبہ کیا۔ ”ہمارے سینا پتی اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ تارگڑھ کا محاذ پر تھوڑی ران چوہان تھا اور چوڑ کے گنبدان اور حیرانج (شہنشاہ عظم) رتن سنگھ ہیں۔“ یہ خوشامد اور مصابحت کی ایک خوفناک ایفین جوت رتن سنگھ کو پلادیا گئی اور وہ عورت پرست حکمران اس نشے سے بہت زیادہ سرشار نظر آنے لگا۔

راجپوت سرداروں کو غور و قوی نے اندھا کر دیا تھا اور ان کی عقل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ چوڑ قلعے کو تارگڑھ سے زیادہ مضبوط و مستحکم اور بلند سمجھ رہے تھے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ تارگڑھ اپنی اونچائی اور استحکام میں چوڑ سے بڑھ کر تھا۔ چوڑ سطح زمین سے پانچ سو فٹ بلند تھا اور سطح سمندر سے اٹھارہ سو فٹ۔ اس کی لمبائی تقریباً تین میل تھی اور چوڑائی نصف میل۔ شاید اسی طول و عرض کی بنیاد پر راجپوت سرد

ملے رہا۔ راجہ رتن سنگھ مایوس ہو گیا۔ سینا بقی ہری سنگھ نے یہ کہہ کر اسے آس دلائی کہ سلطان کو ہراساں کرنے کے لیے بڑے ہدف کا انتخاب کیا جائے گا۔ قلعے کی فسیل سے علاء الدین کے خیمے پر تیروں کی بارش ممکن نہ تھی۔ نتیجاً ہری سنگھ نے اپنے تیر انداز دستے کو قلعے کے صدر دروازے سے باہر نکالا اور بی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
”تم لوگ آہستہ روی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے رہو اور جب سلطان کا خیمہ تہہ سے نشانے پر ملے تو بے دروغ تیروں کی بارش کر دو۔“

راجہ تیر انداز اپنے سینا بقی کی ہدایت کے مطابق بہت محتاط انداز میں آگے بڑھے سلطان کے گھراں سے جو خیمے کے چاروں طرف دور دور تک گشت کر رہے تھے چوڑے سپاہیوں کی نقل و حرکت دیکھ کر چند ن کیلئے حیرت زدہ ہوئے اور ان پر بچھنے کیلئے پرتولنے لگے ساتھ ہی اس صورت حال سے سلطان کو بھی آگاہ کیا۔

علاء الدین خلجی جو بہت پہلے جنگ کی منصوبہ بندی کر چکا تھا اس صورت حال سے ذرا بھی متاثر نہیں اس نے ایک لمحہ ضائع کے بغیر اپنے تیر انداز دستوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمنوں کے سینے چاک بالیں۔ یہ ایک عجیب جنگی چال تھی جسے چوڑے سپاہی سمجھنے سے عاجز رہے۔ سلطان نے اپنے اندازوں کو اس طرح روانہ کیا تھا کہ اگلی قطار میں پیدل سپاہیوں کا ایک دستہ تھا جس کے ہر سپاہی کے ہاتھ میں چمکدار نیزہ اور بائیں ہاتھ میں معمول سے زیادہ چوڑی ڈھال تھی۔ بظاہر یہ سپاہی کاندھے سے دھلا کر چل رہے تھے مگر حقیقتہً ایسا نہیں تھا اور سے دیکھنے والوں کو سپاہیوں کی قطاریں کوئی شکاف نہیں آتا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ سلطان نے ہر سپاہی کے درمیان چھانچ کا فاصلہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا اس ہاف جوں کی نیزہ بردار صف میں شروع سے آخر تک ایک محفہ سا خلاء موجود تھا جو چوڑے سپاہیوں کو ہر بھی نظر نہیں آسکتا تھا اس خلاء سے کام لینے کیلئے علاء الدین خلجی نے اپنے تیر اندازوں کو بچھلی دشمن متعین کیا تھا اور جنگ کا طریقہ کار اس طرح طے کر دیا تھا کہ راجہ تیر انداز سپاہیوں کے جو تیر اندازوں کے خیمے طرف آئیں گے انہیں فواید کی چوڑی ڈھالوں پر روکا جائے گا اور پھر اس سے پہلے کہ دشمن دوبارہ اپنی فوج کو سیدھا کرے علاء الدین کے تیر انداز درمیانی خلاء سے اپنے جوہر دکھائیں گے۔

راجہ تیر انداز شاہی نیزہ برداروں کی ایک طویل قطار دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کے خیال میں سلطان نے راجہ تیر اندازوں کے بھوکے شیروں کیلئے ایک لقمہ ترسج دیا تھا۔ چوڑے کے تیر انداز بے خوف و خطر گھومے اور اپنے ہدف کے قریب پہنچ کر انہوں نے شاہی نیزہ بردار دستے پر تیروں کی بارش کر دی۔ ان کے تجربہ کار سپاہی دشمن کے آنے والے تیر انداز کو اپنی مضبوط ڈھالوں پر روکے اور پھر فوایدی درمیانی فوجیوں کی قیادت میں حملہ کرتے۔ راجہ تیر انداز سپاہیوں کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہ تیر انداز کھڑے آئے اور ان کے کئی فوجیوں کا کام تمام کر گئے۔

سلطان کا نیزہ بردار دستہ اپنے تیر اندازوں کو عقب میں لئے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ راجہ تیر اندازوں نے پورے جوش کے ساتھ اپنے فوجی تیر اندازی کا مظاہرہ کیا مگر ان کا سراسر اہم رائیگاں گیا۔ سلطان کے تیر اندازوں نے دوسرے حملے میں کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اب راجہ تیر اندازوں پر یہ بھیانک فوجیوں کی ہوجی تھی کہ میدان جنگ میں سلطان کے فوجیوں کی دو قطاریں گردش کر رہی ہیں۔ نیزہ بردار فوجیوں کا ایک فریب ہے اور سلطان کی اصل طاقت تیر اندازوں کا وہ دستہ ہے جسے کوئی ضرر نہیں پہنچایا

اس حکم کے بعد سلطان کے جاسوسی دستے میں ہلچل مچ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ سلطان ناکامی کی تفصیلات سننے کا مادی نہیں ہے۔ وہ صرف جشن فتح منانا چاہتا ہے۔ اس نے شکست کی کسی تقریب کا نام نہیں دیکھا، اس لئے وہ جاسوسوں کی جھکی ہوئی گردنوں اور لڑکھرائی ہوئی زبانوں کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس تصور نے جاسوسوں کے خون کی گردش تیز کر دی تھی اور اسی گرم خون کا اثر تھا کہ سلطان کے خیر نمائندوں نے تین دن کے اندر اس سرنگ کا راستہ دریافت کر لیا جس سے گزر کر انانج کی بھری ہوئی بیل گاڑیاں قلعے تک پہنچتی تھیں۔ یہ چوڑے کے مضامین کا ایک جنگلی علاقہ تھا جہاں گھنے درختوں کی اتنی کثرت تھی کہ دن کے وقت بھی رات کا لگنا ہوتا تھا جب شاہی جاسوس دور دور تک چاروں طرف پھیل گئے تو ایک روز انہیں ایک ایسی بیل گاڑی نظر آئی جو انتہائی ویران علاقے کی طرف جا رہی تھی مختلف بیچ دار راستوں سے گزر کر اس کا تعاقب کیا گیا تو یہ راز فاش ہوا کہ گھنے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹ کر سرنگ کے دہانے تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ بیل گاڑی گیسوں، چاول سے بھری ہوئی تھی۔ اناج کا یہ ذخیرہ دور دراز کے دیہاتوں سے جمع کر کے اس سنانا جگہ لایا جاتا تھا اور پھر بڑی ہوشیاری کے ساتھ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ شاہی جاسوسوں نے بیڑوں کی اوٹ سے بیل گاڑی کو دیکھا اور خاموشی کے ساتھ جانے دیا۔ سراغ مل گیا تھا۔ دوسرے ہی دن شاہی فوج کے ایک دستے نے ان باربر داروں کو روک لیا۔ جب ان پر سختی کی گئی تو وہ اپنی زبانیں بند نہ رکھ سکے۔ سلطان کو اس کا ملبانی کی خبر دی تو وہ جوش مسرت سے مسکرایا اور اپنی فوج کا ایک طاقتور دستہ سرنگ کے دہانے پر متعین کرتے ہوئے نیا حکم جاری کر دیا۔

”ہمارے کسی سپاہی کو اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمام فوجی رات دن سرنگ کے دہانے پر مستعد کھڑے رہیں جب اناج کی ترسیل منقطع ہو جائے گی تو خبر گیری کیلئے رتن سنگھ کے آدمی یقیناً باہر آئیں گے اس وقت انہیں بے دریغ بل کر دیا جائے۔“

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ رتن سنگھ کے جس قدر سپاہی بدلی ہوئی صورت حال کا جائزہ لینے کیلئے سرنگ کے باہر آئے انہیں دوبارہ لوٹ کر جانا نصیب نہیں ہوا۔

راجہ دربار میں طوفان سا اُٹھ گیا۔ علاء الدین خلجی نے ایک بہت اہم محاذ پر راجہ رتن سنگھ کو شکست دیدی تھی۔ اگرچہ قلعے میں تین چار ماہ کا ذخیرہ موجود تھا لیکن محاصرہ مزید طویل ہونے کی صورت میں فوجیوں کے سامنے فائدہ کشی کا بھوت اپنی ماتم تر ہونا کیوں کے ساتھ رقص کرنے لگتا تھا۔

مجبوراً راجہ رتن سنگھ کو اپنی فوجی قوت کا پسلا مظاہرہ کرنا پڑا۔ طویل غور و فکر کے بعد ہری سنگھ اور بچھن سنگھ کے مشوروں سے ریاست کے بہترین تیر اندازوں کا انتخاب کیا گیا۔ یہ سارے تیر انداز انتہائی باہر نشاندہ تھے اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے پورے راجہ تیر اندازوں میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ تیر اندازوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قلعے کی فسیل کے آخری کنارے پر پہنچ کر اپنے نشانے آزمائیں۔ اگر سلطان کا خیمہ تیر اندازوں میں آگیا تو یہ چوڑے کیلئے بہت زیادہ خوش قسمتی کی بات ہوگی۔

تیر اندازوں نے علاء الدین کے خیمے پر نگاہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان کی پناہ گاہ زہرے تیر اندازوں کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ اسی لئے راجہ تیر انداز ناقابل بیان حد تک جوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار اپنی کانٹوں کو دیکھا۔ طاقتور بازوؤں پر نظر ڈالی اور بہت تیزی سے کانٹیں چھالیں۔ سانسوں کا توازن برقرار رکھنے کیلئے اپنے سینوں کو ابھارا اور ”مسابھارت“ کے قاف مار جن کا نام کرتے ہوئے نشانے کی طرف چھوڑ دیئے۔ زہر میں چھپے ہوئے لوہے کے یہ ٹکڑے کچھ دیر تک ہوا میں تیرتے رہے اور ہم زمیں پر گر گئے۔ تیر اندازوں کی ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ سلطان کا خیمہ تیر اندازوں کی پہنچ سے تقریباً چار ماہ

تھکا ہوا صحرے روز بہ روز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ سلطان کو چٹوڑ کی پہاڑی پر خیمہ زن ہوئے پانچ ماہ گزر چکے اس دوران راجہ رتن سنگھ کے ایماء پر ہری سنگھ نے راجپوت سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر غلامی شمشیر کی کاٹ کو آزمائے کی کوشش کی تھی مگر یہ ایک احمقانہ فیصلہ تھا۔ علاء الدین کی تلواروں میں ہی آپ شامل تھی اور موت کسی جاندار کو نہیں چھوڑتی۔ رتن سنگھ کے سپاہی ایک بار قلعے سے نکلے تو پھر گز نہیں آئے۔ سلطان کے فوجیوں نے انہیں فرار کا بھی موقع نہیں دیا۔ قلعے کی فسیل سے ان کے رہنے نہ ہی دیکھ گئے۔ رتن سنگھ کو میدان سے اٹھتا ہوا دھواں ہی نظر آیا جو چٹوڑ کے افق پر تیزی سے جا رہا تھا۔

علاء الدین نے راجہ رتن سنگھ کو اعصابی طور پر شکست دے دی تھی۔ بس چٹوڑ کے قلعے پر عملاً قبضہ باقی ایک تاریخی فتح کا آغا۔ بھونکا تھا لیکن محاصرے کی طوالت نے سلطان کو ایک عجیب سی انجمن میں مبتلا کیا۔

”اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔“ ایک دن علاء الدین نے تمام سپہ سالاروں کو جمع کر کے کہا۔ اسی گفتگو کا یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ ہم جلد باز ہیں اور غلبت میں کوئی فیصلہ کر کے پورے کھیل کو درہم کردینا چاہتے ہیں۔“ علاء الدین کے ایک ایک لفظ سے جلال شاہی ٹپک رہا تھا۔ ”اور یہ بھی نہ سمجھا کہ محاصرے کا دھوپ نے ہمارا چہرہ جھلسا دیا ہے اور پتھروں کی چھینے والی نوکوں نے ہمارے بستر کو بے آرام بنا دیا اور رتن سنگھ کی محفوظ قلعہ بندی نے ہمارے سر بلند ارادوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ سچ تو یہ ہے اگر حکومت سے اتنا طویل فاصلہ آئین سیاست کے منافی ہے۔ ہم اپنے جاں نثاروں پر شک نہیں نہ کر رہے ہیں اس لئے تن و دور رہنا دشمنی کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ رتن سنگھ جلد از جلد آگے گھٹنے ٹیک دے اور اس کا ٹھکانا ہمارے قدموں سے مس ہو جائے۔“

تمام سپہ سالاروں نے اجازت مانگنے پر سرجھکا دیئے اور ایک ایسا عجیب فیصلہ کیا گیا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ملتی۔

اس کے بعد سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اچھوتوں کی بستی سے چند بوڑھے اور ذی ہوش لوگوں کو لا کر ہمارے حضور پیش کیا جائے پھر جب وہ جماندیدہ اچھوت بوڑھے سلطان کے سامنے لائے گئے تو انہوں نے ان سے عجیب عجیب سوالات شروع کر دیئے۔

”راجپوتوں کا طریقہ جنگ کیا ہے؟ یہ لوگ دشمن کے محاصرے کو کتنے دن تک برداشت کر سکتے ہیں؟ ان کے بعد ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ اور اگر شاہی فوجیں واپس چلی جائیں تو اچھوت بستیوں کے لوگوں کا کیا سلوک ہوگا؟“

انہوں نے اچھوت، سلطان کے اکثر سوالات کا جواب دینے سے عاجز رہے مگر پھر بھی ان حوادث آشنا کو انہوں نے ضرور بتایا کہ راجپوت فیصلہ کن جنگ لڑنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو بھڑکتی ہوئی آگ کے کنارے دیتے ہیں پھر اپنے گھر اور مال و اسباب پھونک کر اس طرح میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں کہ انہیں کوئی نقص نہ پہنچے۔

انہوں نے انہوں کو آگ میں جلانے جانے کا ذکر سن کر کچھ دیر کیلئے علاء الدین پر ایک اداسی کی سی نظر پڑی۔

سلطان نے آگ کے اس خوفناک کھیل کی تفصیلات پوچھیں تو بوڑھے اچھوتوں نے بتایا۔

”اچھوتوں کے میاں غلامی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ جب وہ لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ ان

جاسکتا۔ ان خیال نے راجپوت سپاہیوں پر وحشت سی طاری کر دی۔ اب ان کی ساری کوششیں کار فرما نہیں اور زہریلے تیر فلولادی ڈھالوں سے فکرا فکرا کر زمین پر گر رہے تھے بساط الٹ گئی تھی۔ راجپوت تیر اندازوں نے اپنے حصار میں واپس جانا چاہا مگر سلطان کے جاں نثاروں نے واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے۔ چٹوڑ کے بہترین تیر اندازوں کی لاشیں قلعے سے کچھ فاصلے پر پڑی ملیں۔ بمشکل چند تیر انداز فرار کی ذلت برداشت کر کے اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے۔

سلطان نے یہ محاذ بھی آسانی سے جیت لیا تھا۔ فاتح دستے شاہی خیمے کی جانب لوٹنے ہی والے تھے کہ انہیں علاء الدین خلعی کا دوسرا حکم موصول ہوا۔ ”دشمن سپاہیوں کی لاشوں کو ان کی مذہبی رسم کے مطابق آگ کے حوالے کر دو۔“

اور پھر سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی اور دیگر راجپوت سرداروں نے قلعے کی فسیل سے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھے۔ چٹوڑ کے ماہر تیر اندازوں کی لاشیں جل رہی تھیں اور ہر طرف ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تیز ہوا کا کوئی جھونکا رتن سنگھ اور پدمنی کے چہروں کو بھی چھو لیا کرتا تھا اور چٹوڑ کے دونوں حکمران محسوس کر رہے تھے جیسے علاء الدین کے ہاتھوں میں ایک جلتی ہوئی مشعل ہے اور وہ پورے قلعے کو آگ لگا دینے کیلئے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا آ رہا ہے۔

چٹوڑ کے تیر انداز دستوں کی تباہی اور پھر سپاہیوں کی لاشیں جلادینے کے سلطانی عمل نے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں پھل پھلائی۔ سپہ سالار ہری سنگھ اور پھمن سنگھ بھی اداس بیٹھے تھے کہ ان دونوں کی ہدایت پر ریاست کا بہترین تیر انداز دستہ قلعے سے نکالا گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے علاء الدین خلعی کے جانناڑوں نے اسے اپنی خوراک بنا لیا تھا۔ ہری سنگھ اور دیگر راجپوت سرداروں کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت کا غم اس لئے نہیں تھا کہ وہ بوند خاک ہو گئے۔ موت کے کھیل میں توجہ نازے ہی اٹھتے ہیں۔ ہری سنگھ اس لئے ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا کہ سلطان نے میدان جنگ میں ایک بڑی چال چلی تھی جسے چٹوڑ کے فوجی ماہرین آخری لمحے تک سمجھ ہی نہیں سکے اور بڑے بھونڈے انداز میں مات کھا گئے۔ ہری سنگھ بت بے قرار تھا اور بار بار اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، مہامنتری گنیش سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے اپنے سینے پتی کی بے قرار یوں کو دیکھا اور پہلی بار صحیح حکمت عملی سے کام لینے ہوئے ہری سنگھ کو تسلیاں دینے لگے۔

”تم کیوں اس ہوتے ہو ہری سنگھ کہ یہ تباہی توجنگ کے کھیل کا ایک حصہ ہے ابھی چٹوڑ کے جسم میں خون کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ چند قطروں کے بہہ جانے پر یہ ماتم کس لئے؟ ابھی اور محاذ کھلیں گے، ابھی موت کا رقص نئے زاویے تبدیل کرے گا۔ پھر دیکھیں گے کہ کس میں کتنی طاقت ہے؟“ ان تسکین آمیز کلمات سے ہری سنگھ کی وحشت کسی قدر کم ہو گئی تھی اور اس کے بچے ہوئے چہرے پر ایک ایسا رنگ ابھر آیا تھا جس میں دشمن سے انتقام کی گہری بھلک موجود تھی۔

”میں سمرات رتن سنگھ، رانی پدمنی اور تمام راجپوت سرداروں کا شکر گزار ہوں کہ آج کوئی شخص میری شکست پر طعنہ زن نہیں۔ دشمن میرے اندازوں سے کہیں ہوشیار ثابت ہوا۔ اس بات کا مجھے شدید قلق ہے مگر میں اپنے فرمانروا اور اپنی قوم کے معزز اراکین کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ چٹوڑ کے چہرین سے شکست کے اس بد نماذاغ کو بہت جلد دھو ڈالوں گا۔ سلطان کی یہ چال مجھ پر قرض ہے۔ علاء الدین کو کبھی معلوم مگر سا راجپوت چٹوڑ جانتا ہے کہ ہری سنگھ اپنے سر پر قرض کے اس بوجھ کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔ سپہ سالار ہری سنگھ کے اس انتقامی عہد بیان سے راج دربار میں زندگی کی ایک نئی لہر دو گئی۔

”سلطان ذی جلال! آپ اہل چٹوڑ پر نہیں ہم عاجزوں پر رحم فرمائیں ساری دنیا سے زیادہ ہم آپ کے کرم کے محتاج ہیں۔“ سپہ سالاروں کے لہجے میں بڑی رقت تھی، بڑا گداز تھا ان کی زبانیں لڑکھاری میں اور خوف و ہشت سے جسم کانپ رہے تھے ”خدا انخواستہ اگر آپ دشمن کی عیاروں کا نشانہ بن گئے تو ہمارے چھٹے مردانگی پر قیامت تک آسمان سے لعنتیں برستی رہیں گی۔ سلطان والا ختم! ہمیں آپ کے رت کی قسم! اگر یہ حادثہ رونما ہو گیا تو ہم اپنے چہروں پر سیاسی مل کر ہندوستان کے دور دراز جنگوں میں ل جائیں گے۔ اس کے بعد ہم نامرادوں میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ ہم اہل دہلی کا سامنا کر سکیں۔ ہم نصر پورستان کے درو دیوار کو کیا بتائیں گے کہ ہمارا سردار، ہمارا حکمران کہاں کھو گیا؟ نہیں آقا! اہل زندگی میں یہ نہیں ہو سکتا۔ غلاموں کو حکم دیتے کہ وہ اپنے سر لے کر رتن سنگھ کے دربار میں حاضر جائیں۔ اگر سلطان ہمارے اس فیصلے کو نافرمانی تصور کرتے ہیں تو پہلے غلاموں کے جسموں کے ٹکڑے اپنے جائیں پھر والی ہند کو اختیار ہے کہ ہمارے بعد جو چاہیں کریں۔“

علاء الدین زیر لب مسکرایا۔ ”کھڑے ہو جاؤ عراقی اور ملک نصرت تم اپنے قدموں کا سہارا لو۔ اور بی! تم ہماری طرف دیکھو اور ملک ظفر! تم بھی اپنا سر اٹھا لو۔“

سلطان کا حکم پاتے ہی چاروں سپہ سالار کھڑے ہو گئے علاء الدین نے اپنے سرفروشوں کی طرف بلایا۔ جانباڑوں کے جسم پیسے میں نہا گئے تھے۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سلطان اس قدر پرخطر اور ناک دم اٹھائے گا۔ علاء الدین نے شاہی سفیری حیثیت سے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں جانے کا فیصلہ کیا اور جب اس نے اپنے سپہ سالاروں کو اس ناقابل یقین فیصلے سے آگاہ کیا تو ان بلند حوصلہ لوگوں کی نینس اکڑنے لگیں۔ موت کو ایک دلچسپ کھیل سمجھنے والے اس طرح کھڑے لرز رہے تھے جیسے کسی سیاہ تیش کوئی تھامے بھی تاکہ خواب دیکھ کر ڈر گیا ہو۔ سب کے سب بے دست و پا تھے اور کسی میں سلطان کو نکلنے کی ہمت نہیں تھی۔

پھر علاء الدین نے امیر خسرو کو حکم دیا کہ وہ راجہ رتن سنگھ کے نام شاہی فرمان تحریر کریں۔ امیر خسرو کو بت کی گئی کہ سفیر علی عامر آفریدی کی گمشدگی سے لے کر اب تک کی تمام نافرمانیوں اور توہین آمیز رویوں کے الفاظ میں ذکر کیا جائے۔ شاہی فرمان کی تفصیلات سمجھانے کے بعد علاء الدین نے اپنا دایاں ہاتھ رکھا جس کا واضح مفہوم تھا کہ سلطان اب تحلیلہ چاہتا ہے۔

امیر خسرو ساری رات عبارت آرائی کرتے رہے۔ سپہ سالاروں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ وہ کبھی بے اندہ ٹھٹھانے لگتے اور کبھی حالت اضطراب میں باہر نکل کر سلطان کی آرام گاہ کو دیکھنے لگتے جہاں گہرا نیت ملاتی تھا۔

علاء الدین اپنے بستر پر دراز تھا اور تصورات کی دنیا میں اس منظر کا جائزہ لے رہا تھا جب راجپوت عورتیں نرے نجات حاصل کرنے کیلئے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے حصار میں داخل ہوتی ہیں۔ سلطان نے انسانی ظلم کو یہ خوفناک ترین فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ چٹوڑ کی شکست سے پہلے بہت سی چیزیں قریب سے دیکھ کر بڑھوئے اچھوتوں کی شاہی دستانوں کے مطابق راجہ رتن سنگھ کے بار جانے کے بعد رانی پدمنی کا ہاتھ بھی ایک یقینی امر تھا۔ سلطان کے ذہن میں کئی اندیشے سر ابھارنے لگے اور پھر وہ ایسے راستے پر گھبراہٹ میں موت نئے نئے زاویوں سے رقص کر رہی تھی۔

شعلوں کے پچھلے پھر علاء الدین اپنے خیمے سے باہر آیا اور امیر خسرو کے خیمے میں جھانک کر دیکھا خسرو شمع لکھنؤ میں قمر طاس پر وہ عبارت منتقل کر رہے تھے جس کا ایک ایک حرف علاء الدین کے جاہ و جلال کا منظر

کے آزاد جسموں کو زنجیریں پہنا دی جائیں گی تو پھر زندگی سے ساری محبت ختم ہو جاتی ہے اور وہ موت کو اپنی پری میکا (محبوبہ) سمجھنے لگتے ہیں۔ اس صورت میں راجپوت عورتیں ہنسی خوشی اپنے تمام زیورات پسین کر چھوٹے بچوں کے ہمراہ بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑتی ہیں اور جب تک جل نہیں جاتیں اس وقت تک راجپوت مرد جنگ کیلئے باہر نہیں نکلتے پھر جیسے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے بیوی بچوں کی راکھ اڑنے لگے ہے وہ بے ماتا کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن کے مقابل چلے جاتے ہیں۔“

علاء الدین خلجی نے جمالت کے ظلم و تشدد کی یہ دردناک داستان بہت غور سے سنی اور پھر اچھوتہ بوڑھوں سے ایک نیا سوال کیا۔ ”اس وحشیانہ کھیل سے راجپوت مردوں کو کیا حاصل ہوتا ہے؟“ ایک بوڑھے اچھوتہ نے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ کہا ”سلطان! اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں جانے، پر کھوں سے یہی سنا ہے کہ راجپوت بہت غیر متند ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میدان جنگ میں مارے جانے کے بعد دشمن ان کے ناموس پر لپچائی ہوئی ہوسناک نظریں ڈالے۔ اس لئے وہ عورتوں کو آنکھوں کے سامنے آگ کا ایندھن بنا دیتے ہیں۔“

”اور وہ معصوم بچے؟ ان کے نذر آتش کرنے کا سبب؟“ ایک ایک علاء الدین خلجی کا لہجہ قہرا ہو گیا تھا۔

”بچوں کو اس لئے آگ میں جھونکا جاتا ہے کہ راجپوت نسل محفوظ رہ سکے۔“ بوڑھے اچھوتہ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے قید کر لئے جائیں اور پھر غلامانہ ماحول میں ان پرورش ہو۔“

”یہ شیطانی رسم ہے۔“ سلطان شدت غضب سے چیخ اٹھا۔ ”ہم اس رسم کو بدل ڈالیں گے۔“ ”نہیں حضور! آپ اس رسم کو نہیں بدل سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے اچھوتہ نے سلطان

سامنے زمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”وہ بہت وحشی ہیں آپ کے انداز سے بھی زیادہ وحشی۔“ ”ہمارے نفرت و غضب کا جال بہت مضبوط اور وسیع ہے۔“ علاء الدین کا غصہ عروں پر تھا۔ ”اپنی وحشیتیں نہیں چھوڑتی ان کے جسموں اور دماغوں کو ہمارا یہ آہنی جال اپنے پھندوں میں پکڑ لیتا۔ ہمارے قہر کی بارش ان کے ہیمنہ جذبوں کو دوڑا لے گی ہم ایسے وحشیوں کو رام کرنا خوب جانتے ہیں پھر جب بستی کے بوڑھے اچھوتہ واپس چلے گئے تو سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو حکم نصرت

خواجہ حاجی، تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو خلوت میں طلب کیا۔ حضرت امیر خسرو پہلے ہی سے موجود تھے۔ سپہ سالاروں کے خیمے میں داخل ہوتے ہی علاء الدین نے انہیں مخاطب کیا اور اچھوتہ بوڑھوں سے اپنی ملاقات کا حال سنائے ہوئے کہا۔ ”دنیا کا ہر غیر مسلم فاتح جب کسی زمین کو فتح کرنا وہاں اپنے بے پناہ ظلم کی نشانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ مگر ہم اول و آخر مسلمان ہیں ہماری خواہش ہے کہ ہمارے تاناک چہروں کا رخ دہلی کی جانب ہو تو چٹوڑ کے گلی کوچوں میں جاہ و جلال کے ساتھ ہمارے رحم و کرم کے ترانے بھی گائے جائیں ہم اس علاقے کے مجبور و مقہور باشندوں کو ایک پرسکون اور با زندگی عطا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ ہماری موجودگی میں یہاں کی بے گناہ عورتوں معصوم بچوں کو آگ کی خوراک بنا دیا جائے۔“

اس کے بعد سلطان نے تمام سپہ سالاروں کو اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا جسے سن کر ملک نصرت خواجہ حاجی، تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان نے اپنے سر زمین پر رکھ دیئے اور سوالیوں کے انداز میں گڑ گڑانے لگے۔

تھا۔ سلطان 'امیر خسرو' کو ہمہ تن مصروف پا کر مسکرایا اور وہ بے قدموں واپس لوٹا۔ چاروں سپہ سالار ہم اپنے اپنے خیموں کے دروازوں پر سر جھکائے کھڑے تھے۔ علاء الدین چند لمحوں کیلئے ان کے پاس ٹھہرا اور پر جوش لہجے میں کہنے لگا۔

”ہمیں فخر ہے کہ ہمارے جاں نثار وقت کے اشاروں کو پہچانتے ہیں کہ یہ سونے کا موسم نہیں۔ مگر انہیں جان لینا چاہئے کہ ان کا سلطان بھی خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتا۔“

☆ ☆ ☆

سلطان کے فوجیوں کیلئے وہ صبح ایک عام صبح تھی مگر کسی لشکر نے اپنے سپہ سالاروں کے اترے ہوئے چروں اور سرخ آنکھوں کی طرف نہیں دیکھا وہ اپنے اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف تھے اور انہیں خبر نہ ہو سکی کہ امیران لشکر کے دلوں میں رات بھر کیسے کیسے طوفان اٹھتے رہے ہیں۔

علاء الدین نے اپنی قبائے شاہانہ تبدیل کی اور ایک عام سفیر کا لباس پہنا اس وقت سلطان کے خیمے پر چاروں سپہ سالاروں کے علاوہ حضرت امیر خسرو بھی موجود تھے۔ علاء الدین نے ملک نصرت کی طرف دیکھا۔

”نصرت! تم ہمارے ساتھ رتن سنگھ کے دربار میں جاؤ گے۔“ سلطان نے اپنے سپہ سالار کو حکم دے ہوئے کہا۔ ”وہاں تمہاری حیثیت ہمارے سفیر خاص کی ہوگی اور ہم تمہاری معاونت کیلئے موجود ہو گے۔“

ملک نصرت نے سر جھکا دیا اس کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔

”نہیں ملک! ہمیں تمہارا یہ انداز پسند نہیں آیا۔“ علاء الدین کا لہجہ تند و تیز تھا۔ ”اگر تم رتن سنگھ کے دربار میں بھی اس طرح کا پختہ رہے تو راز فاش ہو جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ راجپوت حکمران کے سامہواری شخصیت ایک سپاہی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہ ہو۔ تم کچھ دیر کیلئے اپنے سلطان کے جاوہر جلال نظر انداز کر دینا۔ اس وقت یہی ہمارا حکم اور یہی تمہارا فرض منصبی ہے۔“

ملک نصرت خان نے اپنے کانپتے ہوئے جسم پر قابو پایا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سلطان یکایک مڑا اور اپنے دوسرے سپہ سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”ہم دشمن کے زخموں پہنچ کر اپنی اقبال مندی کو آزمانا چاہتے ہیں اگر ہماری خوش قسمتی کا ستارہ خوش بختی کے آسمان پر طلوع ہے تو رتن سنگھ ہمیں دیکھ کر اپنی بیٹائی کھودے گا اور اس کے درباری اندھے ہو جائیں گے کسی کو یہ بھی پہلے گاہک فاتح عالم سمجھے جگہ سے آ یا اور اپنے بد نصیب حریفوں کے درمیان سے گزر کر چلا آیا۔ علاء الدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگا۔ ”اگر ناکامی اندھیرے ہمارا مقدر بن جائیں تو پھر تم لوگ اپنے سلطان کی موت کا انتقام اس طرح لینا کہ تباہی و بربادی تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہ کر سکے۔ تمہارے دست بجا کار میں جس قدر رسوائیاں ہوں وہ سب کی اہل چوڑی بر سارینا قلعے کا کوئی گوشہ تمہارے جوش انتقام سے محفوظ نہ رہے بس اڑنی ہوئی راہ کے سوا کوئی نشانی باقی نہ رہے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین مڑا۔ ”آؤ ملک! رتن سنگھ اور اس کے درباری ہمارا کر رہے ہوں گے۔“

سلطان قلعے کی جانب روانہ ہوا۔ وہ تھوڑی دور تک محافظ سپاہیوں کے زخموں میں چلتا رہا پھر نصف رات طے کرنے کے بعد اپنے فوجی دستے کو واپس کا حکم دیا۔ اس وقت علاء الدین آگے آگے چل رہا تھا۔ دستے سے الگ ہو جانے کے بعد سلطان نے ملک نصرت خان کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ ملک نصرت آ

لے کیلئے جبکہ مگر سلطان کی ہدایت کا خیال آتے ہی آگے بڑھا اور اپنے قدموں کو مضبوطی سے جماتے ہوئے چلے لگا۔

”اب تم ایک شاہی سفیر معلوم ہو رہے ہو مگر چال میں ہلکی سی لرزش ہے۔“ علاء الدین نے ملک نصرت کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”اپنی رفتار میں سرمستی اور بے نیازی پیدا کرو۔“

ملک نصرت نے اپنے دل و دماغ کو اس خوف سے آزاد کرنے کی کوشش کی کہ سلطان کی طرف اس کی ہٹ ہو رہی ہے۔

”اب ٹھیک ہے۔“ علاء الدین نے ملک نصرت کے قدموں کی استقامت سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

کچھ دیر بعد علاء الدین خلجی اور ملک نصرت خان کو رتن سنگھ نے اپنے دربار میں طلب کر لیا۔

”ملک! فرمان شاہی کو اس طرح پڑھنا کہ خسرو کے لکھے ہوئے الفاظ کا حق ادا ہو جائے۔“ رتن سنگھ کے دربار پہنچنے سے پہلے علاء الدین نے سرگوشی کی۔

ملک نصرت خان نے سر کی جنبش سے اپنے فرمانروا کے حکم کی تائید کی وہ راجپوت سپاہیوں کی دورو یہ قطار سے گزر رہا تھا۔ اس لئے اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ وہی ملک نصرت تھا جسے سلطان کے مظاہر اعتبار میں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس کی جاں نثاریاں سلطانی فتوحات کا ایک ناقابل فراموش باب تھیں اور یہ وہی ملک نصرت تھا جس نے گجرات کی فتح کے بعد ملک کافور کو اس کے آقا مندرالال سے چھین کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اب وہی نصرت خان اپنے شاہ کے ایک عجیب و غریب حکم کی تعمیل کیلئے موت کے غار میں داخل ہو رہا تھا اس ناقابل یقین مہم میں خود سلطان بھی نصرت خان کے دوش بدوش چل رہا تھا۔ تاہم اگر اتفاق سے علاء الدین موجود نہ ہوتا تب بھی نصرت خان وہ شخص تھا کہ ہٹتے ہٹتے بڑے سے بڑے غائب کو گنگے لگایا اور اس کے کشادہ ماتھے پر شکن نہ ابھرتی۔

رتن سنگھ کے پورے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چوڑے کمرات اور کھسار کی ملکہ رانی پدمنی کے چوڑے غیر معمولی بنجیدگی طاری تھی۔ ملک نصرت خان تخت کے قریب پہنچ کر قدرے خم ہوا۔ اس نے یہ حرکت شخص اس لئے کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک مکمل سفیر ثابت کر سکے۔ ملک نصرت کے عقب میں علاء الدین خلجی تھا۔ سلطان نے دربار میں رتن سنگھ کا احترام ملحوظ نہیں رکھا اور یہ بات اس کے شاہیانہ ٹھکانے میں تھی ملک نصرت کے قدم رکے تو علاء الدین بھی ٹھہر گیا۔ ملک نصرت کی نظریں رتن سنگھ پر جمی تھیں اور سلطان کی نگاہوں کا مرکز وہ کافر ادب پندہ تھی جس کا رخ روشن دیکھنے کیلئے علاء الدین نے اپنی ہاتھ بے قرار کر بلاکت میں ڈال دیا تھا۔

”تمہارا نام؟“ رتن سنگھ نے گرجدار کے لیے جس ملک نصرت خان کو مخاطب کیا۔

شاہی سفیر نے انتہائی باوقار انداز میں والٹی چوڑ کو اپنا نام بتایا۔

”تمہارا منصب؟“ رتن سنگھ نے دوسرا سوال کیا۔

”سلطان معظم کا وائی ترین خادم۔“ ملک نصرت کا انداز بڑا ادا و امان تھا اس نے سلطان سے اپنی نسبت کو اس طرح ظاہر کیا تھا کہ غیر ارادی طور پر علاء الدین کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ملک نصرت وفاداری کا ثبوت دے رہا تھا۔

”اور تمہارا نام؟“ راجہ رتن سنگھ نے انتہائی غور و تکبر کے عالم میں اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دیتے

ہوئے سلطان کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کارِ سفارت میں میری اور میرے نام کی کوئی حیثیت نہیں۔“ علاء الدین اس سوال کیلئے تیار نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے ذہن کو منتشر نہیں ہونے دیا۔ ”میں شاہی سفیر کا معاون ہوں کہ عا چوڑ کی طرف سے جو کچھ کہا جائے اسے اپنی ساعت اور دماغ میں محفوظ رکھوں۔“ علاء الدین۔ خادمانہ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی مگر فطرتِ شاہی اسے بے نیازی کے ساتھ کھڑا ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔

رتن سنگھ نے علاء الدین کو نظر انداز کر دیا مگر سپہ سالار ہری سنگھ معاون سفیر کے اس طرزِ گفتگو پر چونکا اٹھا تھا وہ بار بار سلطان کے سر پا کا جائزہ لے رہا تھا اس کی بے چین آنکھیں کبھی راجہ رتن سنگھ کو دیکھتی تھیں کبھی اس شخص کو جو غامبی اعتبار سے غیر اہم نظر آ رہا تھا۔ ہری سنگھ نے یہ بات بھی بہت شدت سے محسوس کی تھی کہ سلطان کا معاون سفیر رانی پد منی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بھرے دربار میں چوڑ کی حکمران کے کوئی دوسرا فرد موجود ہی نہ ہو۔

”میں اس تمہاری آمہ کا مقصد؟“ راجہ رتن سنگھ نے ملک نصرت خان سے ایک سوال کیا۔

”چوڑ کے حکمران تک فرمانِ شاہی کو پہنچانا، اس کا جواب حاصل کرنا اور واپس چلے جانا۔“

”اگر تمہارا سلطان مصالحت اور دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے تو اسے خود ہمارے دربار میں آنا چاہیے تھا۔“ راجہ رتن سنگھ نے فرمانِ شاہی سے آگاہی حاصل کئے بغیر کہا۔ اس کا لہجہ سخت اور کسی قدر نفرت آم تھا۔ ”ہمیں اس سے کوئی سرحدی رقابت نہیں تھی اور نہ کبھی ہم نے اس کے تحت و تاج کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھا ہم تو باہری فضاؤں سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا میں مگن تھے کہ تمہارے سلطان نے بڑے بے رحمانہ انداز میں ہمارے دروازے پر دستک دی۔ یہ مذہب انسانوں کا طریقہ کار نہیں تھا مگر جب جرم سرزد ہو گیا ہے تو پھر اسے خود ہی اس کے ازالے کیلئے یہاں تک آنا پڑے گا۔“

”ملک نصرت خان،“ راجہ رتن سنگھ کی گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ دردناک موت کا سایہ قلعے کے دروازوں پر منڈلا رہا تھا اور وہ احمق حکمران، علاء الدین خلجی کے جرائم گناہوں کے ازالے کی ترکیبیں بنا رہا تھا۔ ملک نصرت کا دل چاہا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ راجپوتوں کی نادانی پر قبضہ زن ہو مگر سفارت کا نازک ترین فرض اسے جارحانہ رویے سے روک رہا تھا۔

”والہی چوڑ کو لازم ہے کہ وہ قیاس آرائی سے گریز کریں۔“ ملک نصرت خان نے ایک ایک لفظ بڑبڑا دیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے فرمانِ شاہی کو بغور سنیں پھر اندازہ کریں کہ سلطان ذی جلال کی کیا خواہش ہے؟“

اس دوران رانی پد منی مسلسل نصرت خان کو دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر غور و غوث کی گہرائی چھائی ہوئی تھی۔ ملک نصرت خان نے قصد ایک بار بھی رانی پد منی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ جائزہ تھا کہ نگاہِ شاہ میں پد منی کا کیا مقام ہے۔ اسے اپنی غلامی کا پورا پورا احساس تھا اور وہ رسم و رفا کو اس طرح یاد کر رہا تھا جو اہل وفا کا شیوہ ہے۔ البتہ علاء الدین کی نظریں ایک لمحے کیلئے بھی پد منی کے چہرے سے نہیں ہٹتی تھیں۔ پورے دربار میں صرف ہری سنگھ ایک ایسا شخص تھا جو ملک نصرت خان اور راجہ رتن سنگھ کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہا تھا اور معاون سفیر کی حرکات و سکنات بھی دیکھ رہا تھا۔ ہری سنگھ کے نزدیک رانی پد منی کی ذات میں ایک عام سپاہی کی یہ دلچسپی بے سبب نہیں تھی اس کا ذہن بہت تیزی سے

باز کر رہا تھا اور وہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا مگر اس اثناء میں راجہ رتن سنگھ ملک نصرت خان کو ان شاہی آواز بلند پڑھنے کی اجازت دے چکا تھا۔

اہل دربار کی سانسیں رک سی گئیں۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی اپنے تمام تر غیظ و جلال کے باوجود پتھر پر جمے نظر آنے لگے۔ چھ سات ماہ پہلے بھی اسی دربار میں ایک حادثہ پیش آیا تھا اور جن لوگوں نے علی عامر زیدی کا لاپرواہی سمجھا تھا وہ پھر کسی حادثے کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں یہ متوقع حادثہ زیادہ بے اختیار کر سکتا تھا۔ دونوں بیانات میں ”وقت اور مقام“ کے پیش نظر بہت بڑا فرق نہیں ہونا چاہئے۔ سلطان نے اپنا محبت نامہ اس وقت ارسال کیا تھا جب وہ چوڑ سے بہت دور دہلی میں مقیم تھا اور دوسرا ہم اس وقت تحریر کیا گیا تھا جب سلطان پورے چوڑ کا محاصرہ کر کے راجہ رتن سنگھ کو قیدیوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر رہا تھا کچھ دیر بعد اہل دربار کے دلوں کی حرکت تیز ہو گئی اور ان کے ذہنوں میں ہٹلراندیش سرابھارنے لگے تھے۔

اچانک ہری سنگھ نے سنا۔ ملک نصرت خان کی آواز پورے دربار میں گونج رہی تھی اس کی نظریں معاون کے چہرے سے نہیں اور شاہی سفیر پر اس طرح مرکوز ہو گئیں جیسے دربار چوڑ میں ملک نصرت خان اور ہری سنگھ کے علاوہ تیسرا فرد موجود نہ ہو۔ راجپوت سینا پتی کا اٹھنا کہ راجہ رتن سنگھ سے بھی زیادہ تھا۔ وہ ایک بے حرف کو یوں سن رہا تھا جیسے سلطان علاء الدین خلجی خود اس سے مخاطب ہو۔

سلطان کا انداز مخاطب بڑا عجیب تھا اہل دربار کی محسوس تھی کہ ان کے ہاتھ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو دبائے لگے اور پیشانیوں کی گھریلوں سے بھر گئیں۔

”فرمانِ فاتح عالم سلطان علاء الدین خلجی۔ بنام رتن سنگھ چوہان۔“ ملک نصرت خان کی آواز آئی۔ سلطان کے خط میں رتن سنگھ کا کوئی عمدہ و منصب بیان نہیں کیا گیا تھا۔ چوڑ کے حکمران کو ایک عام فوجی سپہ سالار کی حاکمیت سے صریحاً انکار کر دیا گیا تھا اور فرمان کا لفظ واضح کر رہا تھا کہ چوڑ کی حکومت ملت دہلی کی تابع ہے اور اس طرح رتن سنگھ یا تو علاء الدین کا خدمت گار ہے یا پھر وہ اپنی شکست تسلیم کر کے سلطانِ فتوحات کے وسیع و عریض دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔

”رتن سنگھ! پورے ہوش و حواس میں رہ کر سنو کہ اہل دانش تمہارے جمل اور بے خبری پر ماتم کرتے ہیں۔ تم نے آج تک شکست گجرات سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا حالانکہ راجہ کرن بھی تمہاری ہی طرح راجپوتوں کے قبیلے سے تھا۔ ہم نے جنگ سے پہلے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اب وقت کی رفتار اسے ساتھ ہے اور جدھر ہمارا گھوڑا مڑتا ہے گردشِ وقت بھی اس طرف کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایک نئے حقیقت تھی۔ مگر گجرات کے توہم پرستوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور پھر میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اہل اپنی آنکھوں سے اس روایت کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے جس کی بنیاد پر راجپوت قوم کٹ مرنے کے لئے کرتی تھی۔ ہمارے جاں نثروں نے بریدہ سروں کا شمار کیا تو ان کی تعداد بہت کم تھی اور بھاگتے ہوئے قدموں کے نشان بہت زیادہ تھے۔“ یہ کہہ کر ملک نصرت خان چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور ملک نصرت نے رانی پد منی کی طرف نہیں دیکھا کہ اس کی نظروں کی حدود وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

راجہ رتن سنگھ نے تاثرات کا جائزہ لینے کیلئے علاء الدین خلجی دربار چوڑ میں موجود تھا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ پد منی کے گفتار چہرے پر بھی ہلکی ہلکی گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ علاء الدین کیلئے یہ بے ہوشی آلودگی کا سبب تھی اس کی فتوحات کا ذکر سن کر حسن بے نیاز بھی سہما سہما نظر آ رہا تھا۔

اور میں یقین دلادیا ہے کہ چوڑکی نواحی بستیاں ہمارے غضب سے محفوظ رہیں گی مگر یاد رہے کہ ہم نے ہندو اور قلعہ نشینوں کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی ہے۔ ہاں! اگر تم شکست سے پہلے قلعہ چھوڑ کر باہر نکل آؤ اور اپنی دستار ہمارے پیروں پر ڈال کر امان مانگو تو ہم تمہیں بھی بخش دیں گے۔“

راجہ رتن سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی وہ فرط غضب سے بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

علاء الدین نے پہلی بار پدمنی کے چہرے کو غصے کی آگ میں جلتے دیکھا۔ سلطان کو اپنے بت پرست محبوب کی یہ ادبست پسند آئی تھی۔

راجہ رتن سنگھ کا یہ شدید رد عمل نصرت خان کو متاثر نہ کر سکا اس نے بڑے سکون سے فرمانِ شاہی کی باقی عبارت بھی مکمل کی۔

”رتن سنگھ! اگر تمہیں ہماری یہ شرط منظور نہیں تو پھر ہمارا آخری حکم پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ چوڑکی کسی عورت اور کسی بچے کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک شیطانی رسم ہے اور ہم خدا کی زمین پر شیطاں کے نمائندوں کو محورِ قص دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ بہت قریب ہے وہ ساعت جب ہم قلعے کی بلند فصیلوں کو مسمار کر کے اندر داخل ہوں گے اگر اس وقت ہم نے ایک بھی جلی ہوئی لاش دیکھی تو ذمہ دار افراد کو بڑی دردناک سزا دیں گے۔ اس کے ساتھ ہم راجپوت سرداروں کو بھی تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے حکمران کی دیوانگی میں شریک نہ ہوں۔ جنگ کے نتائج ان کے اندازے سے بھی زیادہ بھیانک ثابت ہوں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ قلعے کے درمیان سے انسانی خون کا چشمہ پھوٹے اور دریاے گنجیر اور بڑیچ کے پانی سے جا کر مل جائے۔ ہم سلامتی اور امن طلب کرنے والوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اگر راجپوت سرداروں نے ہمارے الفاظ کی قدر و قیمت پہچان لی تو ہم انہیں ایسی ہی پر آسائش زندگی عطا کریں گے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔“

راجہ رتن سنگھ تخت پر کھڑا کانپ رہا تھا اور ملک نصرت خان کی آواز گونج رہی تھی۔

”امان ہے چوڑکے بوڑھوں کو، عورتوں کو، بچوں کو..... اور ان نوجوانوں کو بھی جن کی عمدہ شاہی مہرستیوں کا بھی آغاز ہوا ہے اور ان راجپوت سرداروں کو بھی جو اپنی دستاریں خاک و خون سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے..... اہل چوڑک گواہ رہیں کہ ہم نے اتمامِ جہت کیلئے عافیت کا راستہ اختیار کیا ہے اگر لوگوں کو مجھیں تمہارے سروں سے گزریں اور کوئی برقی غضب تمہاری جانوں پر ٹوٹے تو اس میں قاتلِ عالم کا کوئی قصور نہیں وہ تو بڑا صاحبِ دل اور بڑا صاحبِ ظرف ہے۔“

ملک نصرت خان نے فرمانِ شاہی کا آخری لفظ بھی ادا کر دیا تھا۔

راجہ رتن سنگھ کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”ایک پاگل شخص کی لکھی ہوئی تحریر ہمارے حوالے کی جائے۔ ہم اس کا جواب دیں گے۔“ رتن سنگھ نے جیتنے ہوئے کہا۔

پھر سالارہری سنگھ تیزی سے اٹھا اور اس نے ملک نصرت خان کے ہاتھ سے فرمانِ شاہی لے کر رتن سنگھ کو پیش کر دیا۔ پورے دربار پر سکوت مرگ سا طاری تھا۔ رتن سنگھ نے ایک نظر اس تحریر کو دیکھا جو گنڈو شاہی سے لکھی گئی تھی راجپوت حکمران ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رانی پدمنی کی تیز آواز اٹھی۔

”سہرات! اس جمالت نامے کو چاک کر دیا جائے اور پھر قلعے کی فصیل سے اس کے پرزوں کو ہوا میں اڑا ڈالے۔ چوڑکی آزاد ہو اُمیں خود کاغذ کی دھجیوں کو اڑا کر اس جانور کے خیمے کی طرف لے جائیں گی جو

”پھر ہمارے سرفروشنوں نے یہ بھی دیکھا کہ راجہ کرن گجرات کی آبرورانی کنولادیوی کو دشمنوں نرغے میں چھوڑ کر اپنی پشت اور چہرے پر ذلتوں کے داغ سجائے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا کنولادیوی ہوشمند تھی کہ وہ اپنے بزدل اور نکتے شوہر کو ٹھکرا کر ہمارے چاہ و جلال کے سامنے میں گئی۔“ ملک نصرت خان دوبارہ فرمانِ شاہی کی عبارت پڑھ رہا تھا۔ اب اس کا لہجہ زیادہ باوقار اور آواز بلند تھی۔

”گجرات کی مٹی کو ہمارے سپاہیوں نے اس لئے خون رنگ بنایا تھا کہ چوڑکے حکمرانوں کی آؤ کھل جائیں اور وہ اپنی زمین کو ہمارے فہر کی سرخنی سے محفوظ رکھیں۔ رتن سنگھ! ہم نے تمہیں سوچنے کیلئے زیادہ وقفہ دیا تھا اگرچہ ہمارا مزاج یہ ہے کہ ہم دشمنوں کو زیادہ مہلت نہیں دیتے لیکن چوڑکے کیلئے ہمارے میں کچھ نرم گوشے موجود تھے۔ افسوس! تم نے ہماری اس نری کا غلط فائدہ اٹھایا اور اس شاہی سفیر کو دیا جو فاحِ عالم کا راز دار بھی تھا۔“ ملک نصرت خان ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

”رتن سنگھ! ہم تم سے اپنے سفیر علی عامر آفریدی کا حساب مانگتے ہیں کہ وہ چوڑکی حدود میں داخل کہاں گم ہو گیا؟ اسے حوالہ زندان کر دیا گیا یا وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے؟ ہمیں آفریدی کے ایک لمحے کا حساب درکار ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ اس کا استقبال کس حیثیت سے کیا گیا؟“

ابھی فرمانِ شاہی اپنے اختتام تک نہیں پہنچا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ اضطراب میں بیچ اٹھا۔

”چوڑکی حدود میں دہلی کا کوئی سفیر داخل نہیں ہوا۔“

علاء الدین کی نظروں کا زاویہ پہلی بار تبدیل ہوا اور اس نے تیز نظروں سے راجہ رتن سنگھ کی طرف چند لمحوں کی بات تھی۔ سلطان نے رتن سنگھ کے دشت زدہ چہرے سے اس کے دل میں چھپا ہوا راز اور پھر حسبِ معمول رانی پدمنی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ابھی فرمانِ شاہی کی عبارت باقی ہے۔“ ملک نصرت خان نے بڑے تحمل کے ساتھ رتن سنگھ کو اضطراب کی طرف اشارہ کیا۔

رتن سنگھ اپنی نشست پر بیچ و تاب کھاتا رہا اور ملک نصرت خان ایک عجیب و بالمانہ انداز میں اپنے فرمان پڑھ کر سناتا رہا۔

”ہم نے اپنے سفیر کے ذریعے تمہیں خیرمغالی کا پیغام بھیجا تھا کہ ہمیں بے سبب انسانی خون بہا عادت نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں باخبر کیا تھا کہ ہندوستان کا ایک ایک گوشہ ہماری ملکیت میں شامل ہو چکا ہے ہماری جانب سے ایک کھلا اشارہ تھا کہ تمہارا اقتدار اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک تمہیں پناہ اور تائید حاصل نہ ہو۔ صد حیف کہ تم نے ہماری فراخ دلی کی قدر نہیں کی اور اپنی زندگی کے سب خوبصورت لمحے برباد کر دیئے۔ ہم اپنے حلقہ اثر میں احمقوں کا وجود برداشت نہیں کرتے لیکن جبر اور موقع دیا جاتا ہے کہ وقت کی رفتار کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ گجرات کے راجپوتوں کی پٹیاں اس اچھالی گئیں کہ ہم ”قصر ہزار ستون“ میں آرام فرماتے اور ہماری آتشِ جلال نے راجہ کرن کی ایک نشانی کو پھونک ڈالا تھا۔ مگر آج ہم بہ نفس نفیس تمہارے قلعے کے مقابل میدانِ کارزار میں موجود نہیں جانتے کہ جس جنگ میں ہم بذاتِ خود شریک ہوتے ہیں وہاں ہمارا قریباً شکل اختیار کر لیتا ہے؟ ہندوستانی کے لوگوں نے ہمارے قدموں پر سر رکھ کر ”فاحِ عالم“ کے رحم و کرم کو آواز دی ہے ہم مایوس نہیں کرنا چاہتے کہ خدا نے ہمیں بے پناہ طاقت بخشی ہے۔ ہم نے ان محتاجوں کی صدائیں سن

شراب کے نشے میں اپنے آپ کو فاتح عالم کہتا ہے؟

رتن سنگھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا جیسے ہی رانی پد منی کے لفظوں کی گونج مسموم راجپوت سمرات نے فرمان شہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

علاء الدین خلجی جیسے باجروت حکمران کیلئے یہ بڑے گراں لمحات تھے پہلی بار اس نے فرمان شہی تحقیر اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ سلطان کے سینے میں نفرت و قہر کے آتش فشاں نے بڑی شدت سے کروٹ لی تھی۔ اگر علاء الدین کی جگہ کوئی دوسرا حکمران ہوتا تو معاون سفیر کا لبادہ اتار پھینکتا اور سرور بے نقاب ہو جاتا مگر سلطان بڑے مضبوط اعصاب کا انسان تھا اس کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ضرور ابھرا ایک سفیر کی حیثیت سے یہ رد عمل ایک لازمی امر تھا پھر بھی اس نے اپنے جندوں کو بے نقاب نہیں ہونے دیا جب فرمان شہی کے ٹکڑے تخت پر بکھیر دیئے گئے تو ملک نصرت خان کی آواز بلند ہوئی۔ ”فاتح عالم تحریر کردہ ایک ایک لفظ اس قابل تھا کہ راجہ رتن سنگھ اسے بوسہ دیتے لیکن گروش وقت نے چوڑے حکمران سے یہ موقع بھی چھین لیا۔ ”ملک نصرت خان نے ایک نظر فرمان شہی کے ٹکڑوں کو دیکھا تو قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ہونٹ پیچھے گئے تھے اور پورے چروں پر رگوں کا ایک جال ابھر آیا تھا۔ ”بست قریب ہے وہ وقت جب تم سب کے سب فرمان شہی کے ٹکڑوں کو اپنے سرور سجائے ہوئے سلطان معظم کے دروہ حاضر ہو گے اور یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہو گا۔“ یہ کہ ملک نصرت خان واپس جانے کیلئے مڑا۔ علاء الدین نے اس نازک ترین موقع پر بھی مضبوط ہوش کا دامن نہ چھوڑا۔ اس نے ملک نصرت خان کے آگے بڑھ جانے کا انتظار کیا اور آداب سفارت کے مطابق اسے سہ سالار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

جاتے جاتے سلطان نے ان شمشیروں کی جھنکار سنی جو راجپوت سرداروں کی نیاموں سے باہر نکل تھیں اس کے ساتھ ہی کچھ قہقہے بھی گونجنے لگے تھے مگر ملک نصرت خان اور علاء الدین نے ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا۔ جب تاریخ کی یہ عجیب و غریب سفارت ختم ہوئی تو سلطان کے سپہ سالار اور دیگر سپاہی اپنے کے حضور سجدہ شکر ادا کر رہے تھے۔ سلطان کی واپسی پر اس کے جاں نثار فوجیوں نے دشمن کی سرزمین پر ایک جشن خاص کا اہتمام کیا۔ جشن شراب و رقص کے ہنگاموں سے پاک تھا۔ اس جشن میں شاہی مطرب ندیم کاشانی نے اس طے نغمہ سرائی کی کہ تمام سپہ سالار اور لشکری فرط مسرت سے جھوم اٹھے۔ ندیم کاشانی بڑے والہانہ انداز گارہا تھا۔

”ہمارے شاہ کی بلند اقبالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ وہ تہنادر دشمن نرنغے میں چلا گیا۔

اپنا فرمان جاری کیا اور اسی جاہ و جلال کے ساتھ واپس آ گیا۔

یہ حوصلہ کس انسان میں ہے؟

اور کس کا خون اتنا گرم ہے کہ خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی وہ دشمن کی بنے بنا شمشیروں کو جھٹلا دے۔

اور کس کے دل میں ایسا جذبہ ہے جو موت کے جبروں کو چیرتا

زربائے

نہیں! اس دنیا میں فاتح عالم کے سوا ایسا کوئی دوسرا جانا باز موجود نہیں ہے۔

بت پرستو! تمہیں عبرت ہو کہ تمہاری تقدیریں بھی پتھر کی ہو گئی ہیں۔

اور ایک خدا کا نام لینے والو! تمہیں یہ مثالی فتح مبارک ہو۔“

ندیم کاشانی کی نغمہ سرائی ختم ہوئی اور سلطان نے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

پھر سلطان جشن سے اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے جاتے اس نے حضرت امیر خسروؒ اور دس سالاروں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس مجلس خاص میں حضرت امیر خسروؒ بہت زیادہ ہزار نظر آ رہے تھے۔

”اگر سلطان کو کچھ ہو جاتا تو اسی لمحے ہندوستان کی تاریخ بھی بدل جاتی۔“ خسروؒ کا لہجہ بہت پرسوز تھا۔

ناموں کی مجبوری بھی کیسی مجبوری ہے کہ آقا کے حضور اپنے جذبات بھی بیان نہیں کر سکتے۔“

”خسرو! تم جانتے ہو کہ موت کی ساعت بھی نہیں ٹٹلی اور قبر کی جگہ بھی نہیں بدلتی۔“ علاء الدین

یعنی بڑے بے نیازانہ انداز میں بول رہا تھا۔ ”اگر چوتھوں کے قلعے کو ہمارا مقبرہ ہی بننا تھا تو قسمت کی اس تحریر

لوں مانا سکتا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ کاتب تقدیر نے ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ پھر ہم نے رتن سنگھ

کا قریب پیچ کر اس عبارت کو پڑھ لیا۔ راجپوت حکمران نے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے فرمان

ناگنہ کر دیئے۔ بے شک! یہ بڑی گستاخی تھی مگر ہم نے اس بے ادبی سے یہی فال نکالی ہے کہ چوتھوں بھی

سے ٹکڑے ہو گیا۔ اب راجپوتوں کو ذلت آمیز شکست سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔“

سپہ سالاروں نے احتراماً سر جھکا دیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا سردار کس قدر بہادر اور ضعی

ہے ان کے خیال میں علاء الدین کے بعض اقدامات وحشت و دیوانگی کے زمرے میں آتے تھے مگر سلطان

کا پابلیگن تاریخ کے دھارے کو موڑ دیتا تھا اور فتوحات کے نئے دروازے کھل جاتے تھے۔ اس بار بھی

ابو تھا۔ سلطان نے دشمنوں کے هجوم میں تہاد داخل ہو کر ثابت کر دیا تھا کہ ابھی اس کی تقدیر زوال

لانہ جبروں سے محفوظ ہے۔

تمام امیران لشکر اسی سوچ میں گم تھے کہ سلطان نے ملک نصرت خان، تاج الدین عراقی، خواجہ حاجی اور

مظفر خان کو ان کے ناموں کے ساتھ پکارا۔ علاء الدین کی سلطنت کے یہ طاقتور ستون ہمہ تن گوش

گئے۔

”اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ راجپوتوں کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں اور وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر

ٹٹا گالیاں بک رہے ہیں۔ جب دشمن کا دماغ بچھ جائے اور جذبات کی آگ میں اس کا دل جلنے لگے تو پھر

لشکر کا ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ اپنے مقابل پر حملے کا مناسب ترین وقت وہی ہوتا ہے

بائیں کا ذہن دل کی غلامی اختیار کر لے۔ ہم نے چند لمحوں کی ملاقات میں رتن سنگھ کی غلامی کے کئی

دائیں کیے ہیں۔ وہ نسلی غرور کا بھی غلام ہے اور ایک خوبصورت عورت کا بھی۔ نہ اس کا دل ٹھکانے ہے اور

نہ اس کا کام کر رہا ہے۔ ایسے شخص کو حکمرانی کا کوئی حق نہیں اور ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم جلد از جلد

مقتدر سے محروم کر دیں۔ ہم قلعے میں اسی لئے گئے تھے کہ اپنی آنکھوں سے دشمن کی طاقت کا جائزہ

لے لے لو گوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تمہارا دشمن اندر سے کھوٹا ہے۔ قلعے کی دیواریں یقیناً مضبوط ہیں

ملک نصرت خان کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”اس دنیا میں ایک تم ہی تو ہو جسے اپنے سلطان کے جنرلوں کا ہاتھ رہتا ہے اور باقی تو سب تماشائی ہیں، ہمارے اچھے وقت کے تماشائی۔ اگر ایک لمحے کیلئے بھی ہم پر کسی مایہ نکلن ہو جائے تو یہ سارے کے سارے اپنی آنکھیں بند کر لیں گے، چرے موزلیں گے اور ہماری فرلٹ کر کے، ہمیں تنہا چھوڑ کے بہت دور چلے جائیں گے۔“ سلطان کا چہرہ بگھ کر رہ گیا تھا اور ملک نصرت خان نے خیمے میں داخل ہوتے ہی سلطان کے چرے سے اٹھنے والے جس ہلکے ہلکے دھوئیں کو دیکھا وہی دھواں مزید گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔

”ہاں! عالم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔“ ملک نصرت خان رونے لگا۔ ”سلطان! اس غلام کی دریدہ بنی صاف کہ یہ لوجہ دنیا کو تسخیر کرنے والے کا لوجہ نہیں۔“ ملک نصرت خان اپنی باتوں کی تیز ہوا سے اس میں کو آواز دینا چاہتا تھا جس کی کثافت نے سلطان کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا۔

”ہاں! ملک! تم جی کہتے ہو کہ یہ فاتح عالم کا لوجہ نہیں مگر دنیا کی تسخیر کرنے والا بھی تو آخر ایک انسان ہوتا ہے، لوگ ہمیں آدم زادہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہمارا جسم بھی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ ہمارے دل میں بھی بہت زور دھت ہے اور آج اسی درد کی شدت نے ہمیں بے قرار کر دیا ہے۔ ملک! تم یہ راز نہیں جاننے کہ ہم کی دنیا میں ایک گداگر سے بھی بدتر ہیں۔ ہم نے آج تک کسی کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہ وہ اس لعنا الدین کو چاہتا ہے جو کبھی ایک عام انسان تھا۔ یہ تو اس لعنا الدین کی پرستش ہو رہی ہے جو بہت زیادہ افسوس ہے۔ ہمیں یاد نہیں رہا کہ رانی کنولادیوی نے ہمارے حرم میں داخل ہونے سے پہلے کیا مطالبہ کیا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ ملکہ جہاں کا خطاب چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری شریک حیات بن جائے گی۔ اس نے کہا ہوتا کہ وہ لعنا الدین کی بیوی بننا چاہتی ہے جو ایک جانناز مرد ہے۔ اور جو اپنی آبرو کو ہوس کے لہذاؤں میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوتا۔“ سلطان نے ہجرت کی رانی کنولادیوی کا ذکر چھیڑا تو اس کے اسے گدھواں کچھ اور تیز ہو گیا۔

”ملک! ہم بہت دن سے دنیا کی نیلام گاہ میں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ یہ سب کے سب تاجر ہیں۔ کوئی ان کے ہاتھوں فروخت ہو رہا ہے اور کوئی کسی کو خرید رہا ہے۔ سب اپنی اپنی قیمت چاہتے ہیں۔ بیٹے دعائیں دے رہے ہیں کہ باپ مرجائے اور پھر وہ اس کی وسیع و عریض سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ بیویاں اپنے بچوں کو راز دہانی کے لیے عمر کیلئے دعائیں مانگتی ہیں کہ اگر شوہر مر گیا تو وہ بیوہ ہو جائیں گی۔ ملک! انہیں اپنی بیوی کا احساس نہ کرنا ہے کہ وہ میری زندگی کی دعائیں مانگیں۔ اور اولاد کو وراثت کے حصول کا شوق اکساتا ہے کہ بہتر میں سو جائے۔ ایک میرے جانے کی تمنا کرتا ہے اور دوسرا میرے سونے کا منتظر ہے۔ دونوں میرے گھر سے ہیں مگر کتنے مختلف ہیں اور کیسی متضاد خواہش رکھتے ہیں۔ کبھی کسی بیٹے نے یہ تو کہا ہوتا کہ لعنا الدین ان کا باپ ہے۔ صرف باپ۔ اور کبھی کسی بیوی کے ہونٹوں نے یوں بھی جنبش کی ہوتی نظر لعنا الدین ان کا شوہر ہے، صرف شوہر۔“

ملک نصرت خان حیران بھی تھا اور سخت پریشان بھی۔ اس نے آج تک سلطان کو اس قدر جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ اگر غلام کی موت زمانے کی بے وفائیوں کی تلافی کر دے تو تجھے حکم دیجئے کہ میں اپنے خون سے تجھ کے قدموں کو بھگو دوں۔ ”ملک نصرت کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

”میں ملک! تم کیوں کسی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔“ لعنا الدین نے تیز لمبے میں کہا۔ ”تمہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا بھی اہلِ وفا سے خالی نہیں ہوتی ہے۔ اگر تم بھی ہماری محفل سے اٹھ گئے تو پھر

مگر اس کے تمکین بہت کمزور ہیں۔ تم عنقریب دیکھو گے کہ تمہارے یہ شکار بہت آسانی سے زیرِ دام آجائیں گے۔“ علاء الدین خلجی محاذِ جنگ کے اسرار کو اس طرح کھول رہا تھا کہ عام سپہ سالار حیرت زدہ تھے۔ سلطان کی قوتِ مشاہدہ اس قدر تیز تھی کہ پانچ ماہ کے طویل ترین قیام میں جو مسائل حل نہیں ہوئے تھے انہیں سلطان نے ایک مختصر سے وقت میں سلجھا دیا تھا۔

”اپنے خیمے اکھاڑ لو کہ اب یہ جگہ ٹھہرنے کیلئے مناسب نہیں۔“ سلطان نے اچانک اپنے سپہ سالاروں کو نیا حکم دیا۔

عراقی، خواجہ حاجی، ملک نصرت اور ملک ظفر خان حیران ہو کر علاء الدین خلجی کی طرف دیکھنے لگے۔ پہاڑی سے نیچے اترنا اور آگے بڑھ کر قیام کرو۔ ”سلطان نے اپنے حکم کی تفصیلات بیان کیں۔ میدان کی سطح قلعے کے برابر کر دو۔ پھر اسی مقام سے ہماری جنگ کا آغاز ہو گا۔“

اب سپہ سالاروں کے چروں پر سوچ کی پرچھائیاں بھی لرزنے لگی تھیں۔

”یہ کام دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔“ سلطان نے اپنے امیران لشکر کی بہت بندھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ خون کے بجائے ہمارے سپاہیوں کا پسینہ بہ جائے۔ اور اس کام میں تمہارا پسینہ ہی بنے گا، خون نہیں۔ ہمیں تمہارے خون کی قیمت معلوم ہے کہ یہ بہت مہنگا ہے۔ اس لئے ہم ایک ایک قطرے کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“

حکمِ شامی نافذ ہو چکا تھا اور سپہ سالار اجازت لے کر اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات آئی تو سلطان نے ملک نصرت خان کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ ملک نصرت خان تماشہ تھا۔ جو کے سینے میں سلطان کے کئی راز دفن تھے اور یہ اعزاز بھی صرف اسی کو حاصل تھا کہ علاء الدین اپنے سپہ سالار سے نازک ترین باتیں بھی کہہ دیا کرتا تھا۔ ملک نصرت خان خیمے میں داخل ہوا اور اس نے قدم پوسی کر ادائی۔

”بیٹھ جاؤ ملک! بیٹھ جاؤ۔“ سلطان نے جوشِ اضطراب میں نصرت خان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آج میں سلطانِ معظم کے روشن چہرے پر دھواں سا دیکھ رہا ہوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔“

ملک نصرت خان واقعۃً سلطان کی یہ حالت دیکھ کر اسٹپ ہو گیا تھا۔

”ہاں! ملک! جتنی عمر گزرتی جا رہی ہے ہماری اداسیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔“ سلطان کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر تھے اور آنکھیں خیمے کی چھت کو ٹھوکر رہی تھیں۔ ”آج ہم قصر ہزار ستون کے نرم ہتھوڑوں کو چھوڑ کر چٹانوں پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اپنے گھر سے بیوی بچوں سے اور تختِ تاج سے بہت دور۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا شوقِ کشور کشائی بہت جلد تکمیل پا جائے گا۔ ہم اس محاذ کو بھی سر کر لیں گے اور ہمارے قدم قلعہ چٹوڑ کے بلند ترین میناروں کو بھی پامال کر ڈالیں گے۔ پھر ہماری سلطنت اور وسیع ہو جائے گی۔ لوگ ہمیں فاتحِ عالم کہہ کر بھی پکاریں گے مگر کون جانتا ہے کہ ہمارے دل کی دنیا میں کیسا ستا ہے؟ ہم اپنے جاں نثاروں کیلئے کیسی کیسی آسائشیں فراہم کرتے ہیں اور ہمارے خدمت گاروں کو کیا کیا مراعات حاصل ہیں اس کا کسی کو احساس نہیں۔“

”نہیں! سلطان! ذی حشم! یہ غلام تو آپ کی بخشش و عطاء سے خوب واقف ہے۔“ ملک نصرت خان نے لعنا الدین کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ملک! ہم تمہاری جاں نثاری پر شک نہیں کر رہے ہیں۔“ سلطان نے اپنے قدموں کی حرکت

ملک نصرت خان، سلطان کے اس درد سے آشنا تھا۔ یہ درد شدید احساسِ محرومی کی پیداوار تھا۔ سیاست و اقتدار کی دنیا میں اس نے ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیئے تھے مگر دل کی دنیا میں اس کا مقام ایک مفلس شخص سے بھی کم تھا۔ اس کی بویاں خود غرض اور بے پرواہی اور بے سرکش دماغ پرانے محرومی تھی جو کبھی کبھی سلطان کو ساری دنیا سے بیزار کر دیتی تھی۔ آج ایک انتہائی تنگین اور نازک موڑ پر اس کا یہ احساس جاگ تھا اگر اس درد میں مزید اضافہ ہو جاتا تو سلطان کی نظریں محاذِ جنگ سے ہٹ جاتیں اور پھر چوڑے کا طویل ترین محاصرہ ایک مذاق بن کر رہ جاتا۔

”سلطان! آپ نے رانی پد منی کو دیکھا؟“ ملک نصرت خان، سلطان کے خیالات کو منتشر کر دینا چاہتا تھا۔

علاء الدین اپنے سپہ سالار کا سوال سن کر مسکرایا۔ ”ملک! تم بے شک بہت ذہین بھی ہو اور اپنے شاہ کے غم خواری بھی مگر کبھی کبھی اس حقیقت کو بھول جاتے ہو کہ ہم زیادہ دیر تک اپنے جندوں کا ماتم نہیں کرتے۔ ہاں! ہمارے سینے میں درد کی وہ تیز لہر اٹھی تھی لیکن ہم نے اسے فوراً ہی عقل و ہوش کے لائحہ عمل سمندر میں ڈوب دیا۔ اب تمہارا آقا پرسکون ہے اور راجہ رتن سنگھ کے اقتدار کو ختم کرنے کیلئے نئی منصوبہ بندی کر رہا ہے؟“

ملک نصرت خان کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ لوٹ آئی اور اس نے جوشِ جذبات میں اپنے دونوں ہاتھ علاء الدین کے پیروں پر رکھ دیئے۔ ”ہاں! میرا شاہ ایسی ہی زبردست قوتِ ارادی والا ہے۔ جس کی ایک نگاہِ کرم سے دشمنوں کے حصار جل اٹھتے ہیں۔“

”برہمن راتھو چیتن نے پد منی کی شان میں جو قصیدے پڑھے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز تھے۔“ علاء الدین نے کہا۔ ”پد منی خوبصورت ہے مگر اتنی بھی نہیں سہم اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور بہادر بھی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ رتن سنگھ کی قربت نے پد منی کی ان دونوں صفات کو تباہ کر دیا یا پھر وہی طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔“

ملک نصرت خان حیرت سے سلطان کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ملک! تم اس راز کو نہیں سمجھو گے۔“ علاء الدین غیبیہ نظر آنے لگا تھا۔ ”عورت کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ آزمائش کے طے سے گزر رہی ہو۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ رتن سنگھ فطری طور پر عورت پرست ہے اور جندوں کی اسی پادشاهی نے اسے حسنِ کاغلام بنا دیا ہے۔ غلامی عشق کے مذہب کا تو ایک انداز ہو سکتی ہے لیکن سیاست مذہب میں غلامی ایک بدترین لعنت ہے۔ ہم رتن سنگھ کو ایک لعنت زدہ انسان سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایک مرد زاد ہوتا تو پد منی کے کہنے پر ہمارے فرمان کو اس طرح سرور بار چاک نہ کرتا۔ رتن سنگھ کی ان ہی نذر داریوں نے پد منی کی ذہانت اور شجاعت کو گمراہ کر دیا ہے۔ یہ پد منی کی بد قسمتی ہے کہ اسے ایک لڑکھنوی ملا۔ وہ حکم دینے اور اپنی بات منوانے کی عادی بن چکی ہے۔ جس دن اس کے یہ اختیارات لبر ہو جائیں گے۔ وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ رتن سنگھ کے سجدوں نے اسے شیشے کی عورت بنا دیا ہے۔ وہ آلات کا ایک پتھر بردار ثابت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چٹانوں کی فوٹ میں پلنے والی عورت سر پاموم کی ہو کر رہ جائے گی۔ شکست کی آگ کہاں اسے تو دھوپ کی تیز گرمی ہی بکھلا دیں گی۔ اب ہم مطمئن ہیں کہ شکست چوڑی صورت میں پد منی خود کشی نہیں کرے گی۔

”اور راجپوتوں کی وہ رسمیں جو مذہب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں؟“ ملک نصرت خان نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”پد منی ان رسموں کو ٹھوکر مار دے گی۔“ علاء الدین نے پریقین لہجے میں کہا۔ ”وہ عورتیں اور لڑکیاں جو پورے ہوش و حواس کے ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں۔ حکمرانی کے دور کی گجری ہوئی عادتیں ان شعلوں کی تیش سے دور رکھیں گی اور یہی بات ہمارے لئے باعثِ تسکین ہے۔ ہم پد منی کو ضرور حاصل کر لیں گے۔“

ملک نصرت خان کے چہرے کی شادابی لوٹ آئی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میرے شاہ کے دل سے

”میرا راجہ رتن سنگھ نے پد منی کی شان میں جو قصیدے پڑھے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز تھے۔“ علاء الدین نے کہا۔ ”پد منی خوبصورت ہے مگر اتنی بھی نہیں سہم اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور بہادر بھی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ رتن سنگھ کی قربت نے پد منی کی ان دونوں صفات کو تباہ کر دیا یا پھر وہی طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔“

ملک نصرت خان ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگا تھا۔ سلطان نے اپنے درد کی جس لہر کو ہوش کے سمندر میں غرق کر دینے کا دعویٰ کیا تھا وہ لہر دوبارہ ایک خوفناک بھنور بننے لگی تھی۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار کے چہرے پر لکھے ہوئے کئی سوالات پڑھ لئے اور پھر انتہائی پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

”ملک! تم پریشان نہ ہو۔ جب ہم کسی محاذِ جنگ کی طرف بڑھتے ہیں تو اپنے دل سے ایک ایک جذبہ اور ایک ایک خواہش کو کھرچ ڈالتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی تمنا باقی رہ جاتی ہے تو بس یہ کہ دشمن کا ہر

نیزے پر بلند ہو یا پھر ہمارے قدموں کو بوسہ دے۔“ نصرت نے حیرت سے دیکھا۔

علاء الدین کے چہرے پر اس عظیم فاتح کے جذبات ابھر آئے تھے جو زندگی کو زندگی اور موت کو موت نہیں سمجھتا تھا۔ ملک نصرت نے اپنی پوری زندگی میں ایسا انسان نہیں دیکھا تھا جس نے دل کا ماتم کرتے کرتے اچانک تلوار اٹھالی ہو اور وہ ایک ناکام عاشق کے بجائے خونخوار سپاہی نظر آنے لگا ہو۔

اپنے سپہ سالار اور مصاحب خاص کو حیرت زدہ دیکھ کر سلطان مسکرائے لگا۔ ”تم رانی پد منی کا ذکر کر رہے تھے؟“ علاء الدین نے اس طرح گفتگو کا رخ موڑ دیا جیسے چند لمحے پہلے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے یہ خطرناک راہ کیوں اختیار کی تھی؟“

ملک نصرت خان کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”سلطان کے دل میں یہ غمخیز پیدا ہوا

”سلطان! آپ نے رانی پد منی کو دیکھا؟“ ملک نصرت خان، سلطان کے خیالات کو منتشر کر دینا چاہتا تھا۔

علاء الدین اپنے سپہ سالار کا سوال سن کر مسکرایا۔ ”ملک! تم بے شک بہت ذہین بھی ہو اور اپنے شاہ کے غم خواری بھی مگر کبھی کبھی اس حقیقت کو بھول جاتے ہو کہ ہم زیادہ دیر تک اپنے جندوں کا ماتم نہیں کرتے۔ ہاں! ہمارے سینے میں درد کی وہ تیز لہر اٹھی تھی لیکن ہم نے اسے فوراً ہی عقل و ہوش کے لائحہ عمل سمندر میں ڈوب دیا۔ اب تمہارا آقا پرسکون ہے اور راجہ رتن سنگھ کے اقتدار کو ختم کرنے کیلئے نئی منصوبہ بندی کر رہا ہے؟“

ملک نصرت خان کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ لوٹ آئی اور اس نے جوشِ جذبات میں اپنے دونوں ہاتھ علاء الدین کے پیروں پر رکھ دیئے۔ ”ہاں! میرا شاہ ایسی ہی زبردست قوتِ ارادی والا ہے۔ جس کی ایک نگاہِ کرم سے دشمنوں کے حصار جل اٹھتے ہیں۔“

”برہمن راتھو چیتن نے پد منی کی شان میں جو قصیدے پڑھے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز تھے۔“ علاء الدین نے کہا۔ ”پد منی خوبصورت ہے مگر اتنی بھی نہیں سہم اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور بہادر بھی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ رتن سنگھ کی قربت نے پد منی کی ان دونوں صفات کو تباہ کر دیا یا پھر وہی طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔“

ملک نصرت خان حیرت سے سلطان کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ملک! تم اس راز کو نہیں سمجھو گے۔“ علاء الدین غیبیہ نظر آنے لگا تھا۔ ”عورت کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ آزمائش کے طے سے گزر رہی ہو۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ رتن سنگھ فطری طور پر عورت پرست ہے اور جندوں کی اسی پادشاهی نے اسے حسنِ کاغلام بنا دیا ہے۔ غلامی عشق کے مذہب کا تو ایک انداز ہو سکتی ہے لیکن سیاست مذہب میں غلامی ایک بدترین لعنت ہے۔ ہم رتن سنگھ کو ایک لعنت زدہ انسان سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایک مرد زاد ہوتا تو پد منی کے کہنے پر ہمارے فرمان کو اس طرح سرور بار چاک نہ کرتا۔ رتن سنگھ کی ان ہی نذر داریوں نے پد منی کی ذہانت اور شجاعت کو گمراہ کر دیا ہے۔ یہ پد منی کی بد قسمتی ہے کہ اسے ایک لڑکھنوی ملا۔ وہ حکم دینے اور اپنی بات منوانے کی عادی بن چکی ہے۔ جس دن اس کے یہ اختیارات لبر ہو جائیں گے۔ وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ رتن سنگھ کے سجدوں نے اسے شیشے کی عورت بنا دیا ہے۔ وہ آلات کا ایک پتھر بردار ثابت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چٹانوں کی فوٹ میں پلنے والی عورت سر پاموم کی ہو کر رہ جائے گی۔ شکست کی آگ کہاں اسے تو دھوپ کی تیز گرمی ہی بکھلا دیں گی۔ اب ہم مطمئن ہیں کہ شکست چوڑی صورت میں پد منی خود کشی نہیں کرے گی۔

”اور راجپوتوں کی وہ رسمیں جو مذہب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں؟“ ملک نصرت خان نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”پد منی ان رسموں کو ٹھوکر مار دے گی۔“ علاء الدین نے پریقین لہجے میں کہا۔ ”وہ عورتیں اور لڑکیاں جو پورے ہوش و حواس کے ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں۔ حکمرانی کے دور کی گجری ہوئی عادتیں ان شعلوں کی تیش سے دور رکھیں گی اور یہی بات ہمارے لئے باعثِ تسکین ہے۔ ہم پد منی کو ضرور حاصل کر لیں گے۔“

ملک نصرت خان کے چہرے کی شادابی لوٹ آئی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میرے شاہ کے دل سے

”میرا راجہ رتن سنگھ نے پد منی کی شان میں جو قصیدے پڑھے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز تھے۔“ علاء الدین نے کہا۔ ”پد منی خوبصورت ہے مگر اتنی بھی نہیں سہم اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور بہادر بھی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ رتن سنگھ کی قربت نے پد منی کی ان دونوں صفات کو تباہ کر دیا یا پھر وہی طرح ابھرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔“

ملک نصرت خان ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگا تھا۔ سلطان نے اپنے درد کی جس لہر کو ہوش کے سمندر میں غرق کر دینے کا دعویٰ کیا تھا وہ لہر دوبارہ ایک خوفناک بھنور بننے لگی تھی۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار کے چہرے پر لکھے ہوئے کئی سوالات پڑھ لئے اور پھر انتہائی پرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

”ملک! تم پریشان نہ ہو۔ جب ہم کسی محاذِ جنگ کی طرف بڑھتے ہیں تو اپنے دل سے ایک ایک جذبہ اور ایک ایک خواہش کو کھرچ ڈالتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی تمنا باقی رہ جاتی ہے تو بس یہ کہ دشمن کا ہر

نیزے پر بلند ہو یا پھر ہمارے قدموں کو بوسہ دے۔“ نصرت نے حیرت سے دیکھا۔

علاء الدین کے چہرے پر اس عظیم فاتح کے جذبات ابھر آئے تھے جو زندگی کو زندگی اور موت کو موت نہیں سمجھتا تھا۔ ملک نصرت نے اپنی پوری زندگی میں ایسا انسان نہیں دیکھا تھا جس نے دل کا ماتم کرتے کرتے اچانک تلوار اٹھالی ہو اور وہ ایک ناکام عاشق کے بجائے خونخوار سپاہی نظر آنے لگا ہو۔

اپنے سپہ سالار اور مصاحب خاص کو حیرت زدہ دیکھ کر سلطان مسکرائے لگا۔ ”تم رانی پد منی کا ذکر کر رہے تھے؟“ علاء الدین نے اس طرح گفتگو کا رخ موڑ دیا جیسے چند لمحے پہلے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے یہ خطرناک راہ کیوں اختیار کی تھی؟“

ملک نصرت خان کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔ ”سلطان کے دل میں یہ غمخیز پیدا ہوا

اداسیوں کا غبار چھٹ گیا۔ ”ملک نصرت خان نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں ملک! ہمارے دل کا وہ غبار کبھی صاف نہیں ہو گا۔“ علاء الدین ایک بیک پھر اداں ہو گیا تھا۔ ”وہ ہماری ازلی محرومی ہے۔ ہمیں سب کچھ دینے کے باوجود محبت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اسی طرح اس تماشے کو جاری رکھیں۔ جس دن یہ تماشہ ختم ہو جائے گا ہم بھی فنا ہو جائیں گے اور ابھی ہم مرنا نہیں چاہتے۔ ملک! ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ سب طاقت کا کھیل ہے۔ انسان کو انسان سمجھنے والے اس زمین سے رخصت ہو چکے ہیں۔ تم بھی اپنی تلوار کو بے نیام رکھو کہ اس سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے لوگوں کو ادب کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ حسن کا شہستان ہو یا سیاست کا مقل، ہر جگہ اسی شمشیرِ آبدار کی ہنگامہ آرائی ہے۔ تمہاری شمشیریں تبھی سو تم بھی ان چراغوں کی طرح بجھا دیے جاؤ گے جو بادِ صاور نسیمِ سحر کی کوپنا محبوب سمجھتے ہیں۔ ملک! تمہیں نہیں معلوم کہ ہواؤں کے یہ نرم و گداز جھونکے کیسے قاتل ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کی لو کو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز کر لو کہ جب یہ فربہ کار ہوائیں تمہیں چھونے کی کوشش کریں تو خود ان کے ہونٹ بھی جل اٹھیں اور سینے چاک ہو جائیں۔“ علاء الدین کے لہجے کا وہی جلال لوٹ آیا تھا۔ ”بس اب تم آرام سے جا کر سو جاؤ کہ ہم جاگ رہے ہیں۔“

ملک نصرت خان بارگاہِ شاهی سے اٹھا تو اس کے دل و دماغ زیر و زبر ہو چکے تھے۔ آج اسے پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ظاہری کم علمی کے باوجود سلطانِ زندگی کے کیسے کیسے نازک پہلوؤں پر سوچتا ہے اور اس کی آنکھیں کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

شہابی خیموں پر آسودگی اور اطمینان کا گہرا سکوت طاری تھا اور چوڑے راج محل میں ہر قدم پر دھشت ناچ رہی تھی۔ رتن سنگھ بھی ایک ناقابلِ بیان اضطراب کے عالم میں جاگ رہا تھا۔ پدمنی اپنے شوہر کے سامنے لبرزدینے کے ساتھ ساتھ جھوٹی تسلیاں بھی دے رہی تھی۔ رتن سنگھ نے جلتی آنکھوں سے اپنی خوبصورت شریکِ حیات کی جانب دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا برابر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ پدمنی کی خواب گاہ سے ملحق تھا اور اپنے طول و عرض میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ اس کمرے میں چوڑے کے ساتھ حکمرانوں کے قدیم آدم جیسے نصب تھے اور دیواروں پر ان کی تلواریں آویزاں تھیں۔ رتن سنگھ آگے بڑھتے بڑھتے ایک محبت کے سامنے ٹھہر گیا۔ پدمنی بڑی حیرت اور خاموشی سے اپنے شوہر کے اس ردِ عمل کو دیکھ رہی تھی۔ رتن سنگھ جس محبت کے نزدیک جا کر رک گیا تھا وہ اس کے باپ سر سنگھ کا مجسمہ تھا۔

”مہارانی! اس شخص کو پہچانتی ہو؟“ رتن سنگھ نے اچانک ایک عجیب سے لہجے میں اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

”کیوں نہیں سراٹ! کیوں نہیں۔“ پدمنی گھبرا کر بولی۔ ”یہ پوجیہ (لائق پرستش) ہاتھی کی موتی ہے۔ سراٹ سر سنگھ کی موتی..... ایک ممان شامک عظیم حکمران کی موتی جس سے شجاعت کی ہزاروں داستانیں منسوب ہیں۔ اور جن داستانوں کو سن کر آج بھی راجپوت سوراؤں کے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔“ پدمنی نے اپنے آنجبانی خسر کیلئے بھرپور جذباتی عقیدت پیش کئے۔

”ہاں پدمنی! یہ وہی سراٹ سر سنگھ ہیں جن کی شجاعت بے مثال تھی مگر سیاست مظلوج۔“ رتن سنگھ کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ ”اسی عظیم حکمران کی ایک لغزش نے چوڑے کو یہ دن دکھائے ہیں اگر یہ شخص علاء الدین کی فوجوں کو گجرات جانے کیلئے راستہ نہ دیتا تو آج سلطان کو چوڑے کا محاصرہ کرنے کی جرات نہ

”رتن سنگھ کا لہجہ گستاخانہ ہو گیا تھا۔ ”رہنما کی ایک غلطی پوری قوم کو کس طرح رلاتی ہے، اس کا آج ہوا ہے۔ حماقت کا بیج کس نے بو۔ یا اور فصل کون کاٹ رہا ہے؟ کاش ایسا نہ ہوتا۔“

”کاش کسی وحشت زدہ انسان کی طرح مجھے کے قدموں میں جھک گیا اور پھر سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ اس کی ایک جلد بار بار گردش کر رہا تھا۔“ آپ کی نادانی سے چوڑے پر وہ عذاب نازل ہوا ہے جو ہماری جانیں لے کر جانے لگا۔ کاش! پتا جی! آپ ایسا نہ کرتے۔ کاش! کاش!“ رتن سنگھ پاگل سا ہو گیا تھا۔

اس وقت خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور خادمہ نے باہر کھڑے کھڑے اطلاع دی کہ سینا پتی عجلت سے اس وقت سراٹ سے ملنا چاہتے ہیں۔ رتن سنگھ چونک اٹھا۔

”میں خود دیکھتی ہوں کہ ہری سنگھ کیوں آیا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے پدمنی دروازے کی طرف بڑھی۔

”مہارانی! اسے نشست گاہ میں بیٹھنے کیلئے کہیں.....“ رتن سنگھ نے پدمنی کو روکتے ہوئے کہا۔

”یہ اہم کام ہو گا ورنہ ہری سنگھ اس وقت حاضر نہیں ہوتا۔“

پدمنی نے مکرر رتن سنگھ کی طرف دیکھا۔ ”اس حالت میں آپ کا سینا پتی سے ملنا مناسب نہیں۔ مانتے بڑائیں اور خون کے یہ قطرے اسے کوئی اور ہی کہانی سنا دیں گے۔“ پدمنی نے کہا اور خواب گاہ سے نکلت گاہ تک پہنچی۔ پھر دربان کے ذریعے ہری سنگھ کو اندر طلب کیا۔

ہری سنگھ بھی چرے سے پریشان نظر آ رہا تھا۔ پدمنی نے اسے بتایا کہ سراٹ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ کل سے پہلے یہ ملاقات ممکن نہیں۔ ہری سنگھ واپس جانے لگا تو پدمنی نے اس سے پوچھا۔ ”کوئی بری خبر تو ہے؟“

ہری سنگھ ضبط کر گیا۔ وہ ایک سرکش عورت کو کیا بتا کہ اس کے ناز و ادا نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔

”میں مہارانی! آپ کے نمک خوار اتنے جلد باز نہیں۔“ ہری سنگھ بمبم الفاظ میں بہت کچھ کہہ گیا تھا مگر نرا بات کے محافظ اعلیٰ کی بات پر غور کئے بغیر اپنی خواب گاہ میں واپس لوٹ آئی اور رتن سنگھ کو مطمئن نہ ہونے اسے گہری نیند سو جانے کا مشورہ دینے لگی۔

رتن سنگھ اپنے سپر سالار کی بے وقت آمد کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا مگر اتنے پر خون کی تازہ چھینٹیں اسے گٹھ کے سامنے جانے سے روک رہی تھیں۔ پدمنی نے رتن سنگھ کی اس چوٹ کو راز میں رکھنے کیلئے خود فہم کی پیشانی کا خون صاف کیا اور جلتی ہوئی شمع بجھا دی۔ خواب گاہ میں اندھیرا ہوتے ہی درباری مطربہ ایک محرم کار گیت چھیڑ دیا۔ ایسا گیت جس میں رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کیلئے دراز کی عمر اور پُر کیف ہونے کی باتیں کی گئی تھیں۔ مطربہ کی دلنشیں آواز نے تھوڑی ہی دیر میں رانی پدمنی کو گہری نیند سلا دیا مگر گٹھ جاگتہ باہر کی ہونے کے باوجود اس کے تصورات میں سر سنگھ کا مجسمہ ابھرتا ہوا وہ زیر لب ایک ہی لہجہ لہا رہا۔

”پتا جی! کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔“ شکست کے خوف نے رتن سنگھ کو بدحواس کر دیا اور اس نے بہت کم زور سے اپنے باپ پر چوڑے کی تباہی کا الزام عائد کر رہا تھا حالانکہ حقیقت کچھ اور تھی۔

”میں غیر معمولی ذہانت نے اس وقت چوڑے کو بچا لیا تھا۔ علاء الدین نے سات سال پہلے 697ھ میں اپنے لشکرِ جبار گجرات کی طرف بھیجا تھا۔ اس وقت بعض راجپوت سرداروں نے راجہ سر سنگھ کو اکسایا تھا

تخت اعتراضات کئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ سرنگھہ بڑول ہے اور وہ اپنے ہم قوم حکمرانوں کو براہ کرم کی تباہیوں کا نشانہ دیکھ رہا ہے۔ سرنگھہ جیسے جوشیلے فرمانروا نے بڑے تحمل کے ساتھ ان الزامات کو برداشت کیا اور اپنے قلعے میں خاموش بیٹھا رہا۔ گجرات کی شکست کے بعد چٹوڑ کے سیاستدانوں نے قلعہ کو لانا دھوکا دیا کہ راجہ سرنگھہ کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ راز بھی فاش ہوا کہ سلطان علاء الدین خلجی نے درمیانی راستے میں سرنگھہ کی مزاحمت کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور اسی امکان کی پیش نظر علاء الدین نے سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد گجرات کی طرف روانہ کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت علاء الدین نے اپنے سپہ سالاروں کو یہ حکم دیا کہ انہیں دو محاذوں پر جنگ کرنا ہے۔ سلطان کے اندازے کے مطابق اگر سرنگھہ قلعہ چھوڑ کر میدانوں میں نکل آئے تو سپہ سالار کا مقابلہ کیا جائے پھر اس وقت تک سلطانی لشکر آگے نہ بڑھے جب تک سرنگھہ کی فوجیں فرار نہ ہوں۔ علاء الدین ایک تیسرے دو شکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو یہ نتیجہ بھی کر دی تھی کہ اگر سرنگھہ جیسے چھانڈے کرے تو اسلامی سپاہ بھی خاموشی سے اپنے ہدف کی جانب پیش قدمی جاری رکھیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سرنگھہ جوش جذبات میں قلعے سے نکل کر کچھ دور تک آگے دوڑا اور پھر انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔ اگر سرنگھہ کسی وجہ سے یہ حماقت کر بیٹھا تو چٹوڑی مضبوط سلطنت سات سال پہلے ہی تباہ ہو چکی ہوتی۔ چٹوڑ کی فوجوں کو صرف قلعہ بند ہو کر لڑنے کی رعایت حاصل تھی ورنہ کھلے میدانوں میں سرنگھہ کی فوجوں کا سلطانی لشکر سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ اس نے ایک پر جوش قوم کا نشانہ نہ ہوتے ہوئے بھی بڑے ہوش سے کام لیا تھا اور سلطانی افواج کو گجرات جانے کا راستہ دے کر سلطنت چٹوڑ کی عمر میں سات سال کا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر سرنگھہ ایسا نہ کرتا تو چٹوڑ بہت پہلے زنجیر غلامی پہن چکا ہوتا اور رتن سنگھ حکمران ہونے کے بجائے سلطان علاء الدین خلجی کا حاشیہ بردار ہوتا یا پھر اس کی چٹا کو آگ لگائی جا چکی ہوتی۔ اسی طرح رانی پد منی بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر اپنے حسن جہاں سوز کو آگ کا ایندھن بنا چکی ہوتی یا پھر کسی مسلمان سپہ سالار کی کینر کی حیثیت سے رو رو کر زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ یہ راجہ سرنگھہ ہی کی ذہانت تھی جس کے صدقے میں اہل چٹوڑ نے سات سال تک آزادی کی سانس لیں۔ رتن سنگھ نے اپنے سر پر سنہری تاج سجایا اور پد منی نے اپنے شوہر کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ بے شمار راجپوتوں پر بھی حکومت کی۔ مگر آج وہی سرنگھہ اپنے عیش پرست بیٹے رتن سنگھ کی نظروں میں ایک معتب انسان تھا۔ رتن سنگھ شراب کے نشے میں غرق رہی۔ بستر پر پڑا ہوا اپنے باپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ سرنگھہ نے ایک مضبوط حکومت ورثے میں چھوڑی تھی جسے اس کے وارث نے پد منی کی ہوشیاراؤں اور باؤں گفلام میں غرق کر دیا تھا۔ رتن سنگھ کچھ دور تک بیچ و تاب کھاتا رہا اور پھر شراب کے اثر نے اسے گہری نیند سلا دی۔

اسی رات طلسم کدے کے دو تیرخہ تیرخہ کمرؤں میں راج کلاری نرما اور علی عامر آفریدی بڑے عجیب خواب دیکھ رہے تھے۔ آفریدی نے دیکھا کہ وہ ماستری وکرم سنگھ کے طلسم کدے سے نکل کر ہانسی پچا تھا ہے جہاں اس کی والدہ شائستہ بیگم اور بنیالیہ آفریدی مقیم ہیں۔ اچانک مکان کی دیوار میں شکاف پڑا ہوا ہے اور وہی سیاہ پوش انسان نمودار ہوتا ہے۔ جسے آفریدی کئی بار خوابوں میں دیکھ چکا ہے۔ اس اجنبی سیاہ پوش کو دیکھ کر علی عامر کی سانسیں رک سی جاتی ہیں پھر یکایک شائستہ بیگم اور عالیہ کی چیخیں گونجنے لگی ہیں۔ آفریدی گھبرا کر اس کمرے کی طرف بھاگتا ہے جس کے اندر اس کی والدہ اور بنیالیہ ایک نامعلوم اذیت کا

ہیں۔ آفریدی کمرے کے بند دروازے کو توڑ دینا چاہتا ہے مگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہتا ہے اور مسلسل ابھرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آفریدی درجہ تک پہنچنے میں نمایاں ہولناکیاں برداشت کرتا ہے۔ پھر باہر نکل آتا ہے۔ اور نرملا کے کمرے کے قریب پہنچ کر بازے پر دستک دیتا ہے۔
نرملا کا مری گری نیند سوئی ہوئی تھی اور ایک عجیب سا خواب دیکھ رہی تھی۔ آفریدی مسلسل دستک دیتا رہا۔
لانیٹ سے بیدار ہوئی اور اسی غماز کو آلود کیفیت میں بھاگتی ہوئی دروازے تک آئی اور اس نے تیزی سے ان کو آڑھ کھول دیئے۔

”خیریت تو ہے سردار؟“ نرملابے ترتیب حالت میں بستر سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔
 ”عاف کرنا راج کماری!“ آفریدی، نرملاکو دکھ کر کچھ جھجک سا گیا۔ ”میں بہت دیر سے باہر کھڑا تھا
 بیات میرے ذہن سے محو ہو گئی تھی کہ آپ سو رہی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے آرام
 ظلل انداز ہوا۔“ آفریدی کے چہرے پر نہانت کاملاً لپک رنگ ابھر آیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سردار؟“ نرملا نے دروازے میں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ ”یہ کیسی بات ہے، یہ کیسا تکلف ہے اور یہ کیسی رسم ہے؟ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔“ نرملا حیرت زدہ پریشان سی ادراہی تھی۔ ”آپ باہریوں کھڑے تھے؟ دروازہ تو کھلا ہوا تھا جن عورتوں کے محافظ زندہ ہوتے ہیں وہ آپ کو میرے بند نہیں کرتیں۔ آپ کو میرے آرام کا خیال کیوں آیا؟ آپ کی خواہش کا احترام ہی میرا دھرم ہے۔ آپ اس کا خیال نہ کریں کہ میں کس حال میں ہوں؟ آپ کسی وقت بھی پکاریں۔“

انہاںے اور میں آؤں گی۔ یہ کوئی جبر نہیں، یہ میرا عہد ہے اور ایفائے عہد میں اس وقت تک کوئی چیز حائل ہوتی ہے جب تک انسان سے اس کی سائنیں نہ چھین لی جائیں۔ جسم کو زنجیر ستم میں جکڑ دیا جائے یا اس کے ہڈیاں کاٹ دیئے جائیں تو عہد نبھانے کیلئے اس کا دل دھڑکتا ہے۔ اگر مجھ پر یہ قیامت گزر جاتی تو میرے دماغ میں آپ کی آواز پروڑھی چلی جاتیں۔ اور اگر دل بند ہو جاتا تو پھر مجبوری تھی۔“ نرملا کی آواز روکنے لگا تھا۔

”اچھا! اب راستہ دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ آفریدی نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ملازم دروازے سے ہٹ گئی اور پھر آفریدی کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ ”سرور! میں
 سب سامان دیکھ رہی تھی۔“
 آفریدی نے چونک کر راج کمار کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دل کا درد سنانے آیا تھا مگر نرملا کے خواب کا
 راز کسب کچھ بھول گیا۔

”میں نے دیکھا کہ قلعے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔“ میں نے اپنا خواب سنایا تھا۔ ”میں نے دیکھا کہ قلعے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔“ میں نے اپنا خواب سنایا تھا۔ ”میں نے دیکھا کہ قلعے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔“ میں نے اپنا خواب سنایا تھا۔

”یہ تو بہت مبارک خواب ہے۔ نرملا!“ آفریدی اس بلند حوصلہ لڑکی کو سمجھانے لگا جو حادثات کی بظاہر تمام مقابلہ کر رہی تھی۔ ”اس خواب کی تعبیر کا استقبال آنسوؤں سے نہ کرو۔“

”سردار! پہلے مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو گیا ہے کہ پتاجی اس دنیا میں نہیں رہے۔“ نرملا کے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔ مگر ہونٹوں پر کوئی فریاد نہیں تھی۔ ”میں نے انہیں جس لباس میں دیکھا ہے وہ عام انسانوں کا لباس نہیں ہوتا۔“

”راج کماری! تم سچ کہتی ہو۔ وہ روشن چہرہ اور بے داغ لباس دوسری دنیا کا انعام ہوتا ہے۔ مہاترئی ایک خدا اور اس کے آخری رسول پر ایمان لے آئے تھے اس لئے انہیں آخرت کے انعام سے نوازا گیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی بیٹی نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کا انجام بھی دیکھ لیا۔ وکرم سنگ چوہان نے پوری زندگی بت پرستی میں بسر کی مگر ان کا دل سیاسی آئندہ پال کے ساتھ تھا اور سیاسی آئندہ پال شروع ہی سے ایک موحد تھا۔ وحدانیت کی گواہی نے اسے اس کی منزل تک پہنچایا اور پھر جس نے آئندہ پال کا احترام کیا وہ بھی ہدایت پا گیا۔ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے عقیدت رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

نرملا کماری کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی وہ اپنے باپ کی دائمی جدائی سے مضطرب بھی تھی اور ان کا روشن چہرہ دیکھ کر مطمئن بھی۔

”تم نے جس بوڑھی عورت مائی بھان متی کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہے؟ اس دنیا میں موجود ہے یا سیاسی آئندہ پال کی طرح رخصت ہو گئی؟“ آفریدی نے اچانک کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

نرملا کماری نے آفریدی کو مائی بھان متی کی دردناک کہانی سنائی اور جب یہ بتایا کہ وہ کوہ آبو کے ایک مندر میں گوشہ نشین ہے اور اس نے بہت پہلے چوڑو کی تباہی کی پیش گوئی کی تھی تو آفریدی کا پورا جسم لرزنے لگا۔ علی عامر کی یہ کیفیت دیکھ کر نرملا گھبراہٹ ہو گئی۔

”تم پریشان نہ ہو راج کماری!“ آفریدی نے نرملا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس حق پرست عورت کا روحانی جلال ہے جس کے اثر سے آفریدی کی روح کاب رہی ہے۔ وہ عظیم خاتون ایک بار میرے خواب میں بھی آئی تھیں اور مجھے بتایا کہ کر پکارا تھا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ تمہاری حالت سے باخبر ہیں بلکہ مجھے حکم بھی دیا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔ چوڑو بڑا خوش نصیب تھا کہ اس کے درمیان دو ایسی ہتھیاں موجود تھیں جو ایک خدا پر ایمان رکھتی تھیں مگر افسوس! اہل چوڑو نے اپنی خوش بختی کی قدر نہ کی اور ہزاروں انسان اس طرح خاک و خون میں مل گئے کہ ان کی دنیا بھی تباہ ہو گئی اور آخرت بھی۔“

کمرے کی فضا پرست دیر تک گہرا سکوت طاری رہا پھر جب نرملا نے آفریدی سے آدھی رات کے وقت اس کے دروازے پر دستک دینے کا سبب پوچھا تو علی عامر نے لڑکی کو شش کرنے لگا۔ وہ اپنی داستان المناک نرملا کو مزید رانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر نرملا اپنی ضد پر قائم رہی۔ بالآخر آفریدی کو ملک کانور کی سازشوں سے لے کر اپنی والدہ اور بہن کی ہانسی روانگی تک کے سارے واقعات سناتا پڑے اور اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ وہ شانہ بیگم اور عالیہ کے بارے میں۔ بیر لڑہ خیر خواب کئی بار دیکھ چکا ہے۔ اپنا فائدہ درو سناتے سناتے آفریدی کی آنکھیں بھی اشکوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

”نرملا! اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں اس دنیا میں تمہارے جاؤں گا، آفریدی کے آنسو بہت تیزی سے بہنے لگے تھے۔“ دشمنوں کو مجھ سے شکایت ہے تو میرے جسم کے ٹکڑے کر دیں، مجھے آگ میں بھونک ڈالیں مگر ان بے گناہ اور معصوم خواتین نے کسی کا کیا گناہ ہے۔ مردوں کو اپنا حساب مردوں تک ہی رکھنا چاہیے۔

ایک مرد آگئی ہے کہ مجھے زنجیریں پسنادی گئیں اور میری عدم موجودگی میں میرے ناموس کے آئینوں کو توڑا۔“ آفریدی جوش اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔

”سردار! یہ تو محض ایک خواب ہے۔“ نرملا بھی بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”آپ کو خواب کی باتوں اس طرح یقین نہیں کرنا چاہیے کہ اپنی جان کو نیا روگ لگا لیں۔“

”نہیں نرملا! یہ خواب نہیں ہے۔“ آفریدی کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ”ایک ہی منظر کا تسلسل ہمارے ابھرنا خواب کی علامت نہیں۔ یہ کوئی دل بگھلا دینے والا حادثہ ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے۔“ یہ کہنے آفریدی نے اس کھڑکی سے اپنا سر ٹیک دیا جو باغ کی طرف کھلتی تھی اور جہاں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا اور اندھیرے کے قلب سے ابھرتی ہوئی جھینگروں کی آوازیں کسی عیار دشمن کی سرگوشیوں سے مشابہ لگتی تھیں۔

”نرملا! تم نہیں جانتیں کہ میری دنیا میں کتنا اندھیرا ہے؟“ آفریدی نے اعصاب کے تناؤ کو کم کرنے کے لئے دووں ہاتھوں سے لوہے کی سلاخیں پکڑ لی تھیں۔ ”فطری کہ انتہا تک اندھیرا بھیانک اور لہندہ ہے۔“ ہمت و عزم کا پہاڑ آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔

”میری طرف دیکھو آفریدی!“ نرملا نے آج پہلی بار علی عامر کو اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ شدت غم کے باوجود آفریدی نے اس طرز خطاب پر چونک کر نرملا کی جانب دیکھا۔ ”میری زندگی کے اندھیروں کا تو بال کرو کہ وہ کس قدر گہرے ہیں اور کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔“ نرملا کے لہجے میں جذباتیت نہیں لہو تھا۔ ”سردار! میرا تو کوئی بھی نہیں۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن، نہ بھائی۔ یہاں تک کہ میری زمین ہی نہیں، میرا گھر بھی نہیں۔ تصور میں بھی آسکتی نہیں مجبور یاں میری۔ مگر اس لئے زندہ ہوں کہ آپ برس برس سفر ہیں۔ اور یہی رفاقت مجھے اندھیروں سے جنگ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ میں اپنی اور آپ ہاتھوں سے اس صبح کا خواب دیکھ رہی ہوں جو بالآخر ان اندھیروں پر غالب آجائے گی۔“ یہ کہہ کر نرملا کماری نے اپنے آئینے سے آفریدی کے ہتھے ہوئے آنسو خشک کر دیئے۔

آفریدی مرد میدان تھا، جذبوں کا آتش فشاں اور ارادوں کا سرکش طوفان..... مگر جب حسن کی نیت میرا آئی تو ایک گنگنا تا ہوا آبشار بن گیا۔

☆ ☆ ☆

پہر سالار ہری سنگھ رات بھر شدید بے چینی کے عالم میں جاگتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے دوبارہ راجپوت کلاں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ شراب کا خمیر ٹوٹ جانے کے بعد رتن سنگھ بھی اپنے سینا پتی کا منتظر تھا۔ مگر جب وہ نفست گاہ میں ہری سنگھ سے ملا تو راجپوت سینا پتی کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رتن سنگھ چونک اٹھا۔ ”یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے ہری سنگھ۔“

”سمرات! چوڑو کی سرحدوں کا خیال سونے نہیں دیتا۔“ ہری سنگھ کالجہ بجا بجا سا تھا۔ اسے گزشتہ رات صاف ہی پد منشی کی مداخلت بہت گراں گزری تھی۔

”تم جانتے ہیں ہری سنگھ!“ راجپوت سمرات نے معطلانہ اپنے سینا پتی کی سرفروشانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ہری سنگھ نے رانی پد منشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔“ راجپوت سمرات کا انداز بے نیازانہ تھا۔

راجہ جتہم آسانی کے ساتھ سلطان کو قتل کر سکتے تھے۔ ”غزوہ کی ماری ہوئی عورت عقل و ہوش سے بیگانہ لڑائی تھی۔“
 ہری سنگھ احمقوں کی اس دنیا سے دور چلا جانا چاہتا تھا مگر فرض شناسی کے احساس نے اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔ ”سمرات! میں علاء الدین کے قتل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ سلطان کی موت تو چھوڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھی کہ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں ذکر کر رہا ہوں سفارت کے اس موقع کا جو قسمت نے ہمیں فراہم کیا تھا۔ ہم اپنے قزو غصب کا مظاہرہ کے بغیر سفارتی سطح پر اس مذاکرات کو طول دے سکتے تھے پھر شاید ایسا کوئی موڑ آ جاتا کہ کم سے کم خون بہا کر ہم اس مسئلے کا سیاسی حل تلاش کر لیتے۔“
 ”تمہارا مطلب ہے کہ ہم سلطان کے آگے جھک جاتے اور اپنے عزت و ناموس اس کے حوالے دیتے۔“ اب کی بار رتن سنگھ بھی چیخ اٹھا تھا۔

”میں نے سیاسی گفتگو جاری رکھنے کی بات کی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ آج ہری سنگھ بھی اپنی وکرم سنگھ کے لیے میں بات کر رہا تھا۔
 ”تم اپنے چند سپاہیوں کی لاشیں دیکھ کر ڈر گئے ہو ہری سنگھ!“ راجپوت سمرات کی آواز کچھ اور بلند تھی۔ ”تم فرار چاہتے ہو اور اپنی بزدلی کا جواز پیدا کرنے کیلئے ہمیں بھی نامردوں اور خواجہ سراؤں کی مدد کی تلاش کرنی پڑے گی۔“ رتن سنگھ جوش جذبات میں حد سے گزر گیا تھا۔

”سمرات! یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون رن بھوی سے فرار ہوا اور کون اپنی وھرتی کی جھینٹ چڑھ با۔“ ہری سنگھ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر بولا۔ ”میں تو سوراؤں کی اس زمین کو اپنے خون کا ایک ایک لوبلاؤں گا مگر چھوڑی یہ مٹی بہت پیاسی ہے۔ اب تو لو کا کوئی دریا ہی اس کی پیاس بجھا سکتا ہے۔“
 ”ہری سنگھ! ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ رتن سنگھ کی چیخ سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔
 ”دعائیوں کو تمہارے ناپاک خون کی ضرورت نہیں۔“ راجپوت سمرات نے اپنے لائق ترین سپہ سالار کو بالکل بدترین گالی سے نوازا اور ہری سنگھ کا پورا جسم نادیدہ آگ کے شعلوں میں جل اٹھا۔

”میں جا رہا ہوں سمرات! بیشک کیلئے جا رہا ہوں۔“ ہری سنگھ مڑا اور چند آگے جا کر پلٹا۔ ”بس آخری ت کہ اگر میری رگوں میں دوڑنے والا خون ناپاک ہے تو پھر کس کا لو اپنے پاک ہونے کا دعویٰ کرے۔“ یہ کہہ کر ہری سنگھ تیزی سے مڑا اور رتن سنگھ کی نشست گاہ سے نکل کر چلا گیا۔

راجپوت سمرات نے فوراً ہی اپنے کچھ جاسوس ہری سنگھ کی نگرانی کیلئے مقرر کر دیئے۔ جاسوسوں نے ان کے کو خیر کی ہری سنگھ کبھی شام کے مندر کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہی مندر تھا جہاں سنیاسی آئندہ پال لائے گا۔ ساری زندگی نظر بندی کی حالت میں گزار دی تھی۔ زبان کٹ جانے کے بعد اسی مندر کے ایک رستہ میں آئندہ پال نے ایزیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی اور اسی مندر کی ایک دیوار پر آئندہ پال نے وہ جگہ جوش گونی خمر کی تھی جس کا ایک ایک حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔

چوڑے عام سپاہیوں کو خبر نہیں تھی کہ ان کے سپہ سالار ہری سنگھ اور چوڑے حکمران راجہ رتن سنگھ کے اختلاف کس منزل میں پہنچ گئے ہیں اور انتشار کی یہ فضا ریاست کی سلامتی کیلئے کس قدر خوفناک ہے؟ وہ منہ اس انتظار میں تھے کہ کب جنگ مغلوں سے چھڑ جائے اور کب وہ اپنی جہنم بھوی کو بچانے کیلئے جانوں کے نذرانے پیش کر دیں۔ البتہ اعلیٰ سرکاری حلقے زیادہ دیر تک اس خبر کی تکلیف سے محفوظ نہ رہ سکے جب بہت سرداروں کو یہ اطلاع ملی تو ان میں پھیل سی جگمگائی۔ چوڑے پر قیامت نازل ہو رہی تھی اور حکمرانوں کی فوج میں علاء الدین خلجی کے حملے کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ رہی تھیں۔ اس تکلیف دہ خبر نے سابق

”اس کیلئے مجھے تمنائی درکار ہوگی۔“ جب رتن سنگھ اپنے سپہ سالار کا اشارہ نہیں سمجھ سکا تو ہری سنگھ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس گفتگو کے درمیان پدمنی کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔
 ”تمہیں معلوم ہے ہری سنگھ کہ ہم مہارانی کی شمولیت کے بغیر کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔“ ایسے سنگین وقت میں بھی رتن سنگھ ایک کافر اور عورت کا غلام نظر آ رہا تھا۔
 ہری سنگھ کے چہرے پر پاپوسیوں کے سائے ابھرنے لگے مگر وہ ایک جان باز سپاہی تھا۔ تنہا کی پروا کے بغیر بول اٹھا۔
 ”سمرات! یہ ایک بہت نازک بات ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے سننے کے بعد مہارانی کی ساتیں مجروح ہو جائیں۔“

رتن سنگھ نے نزاکتوں کو بھٹلادیا۔ اور وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔
 ہری سنگھ کچھ دیر تک ذہنی کشمکش کا شکار رہا اور پھر اس نے رانی پدمنی کی موجودگی میں وہ بات کہہ ڈالی جو غیرت مند خواتین کا صبر و قرار چھین لیتی ہے۔ ”سمرات! مجھے شک ہے کہ معاون سفیر کے رہنمائی میں خود علاء الدین خلجی یہاں آیا تھا اور اپنے فرمان کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھ کر واپس چلا گیا۔“
 رتن سنگھ اور رانی پدمنی جوش اضطراب میں کھڑے ہو گئے۔ ”حد سے بڑھی ہوئی ذہانت انسان کو اندھا بھی بنا دیتی ہے ہری سنگھ!“ راجپوت سمرات کا جھنجھیر آمیز تھا۔
 ”میں ذہن نہیں سمرات مگر اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔“

”تم اپنے دعوے کی کوئی دلیل بھی پیش کر سکتے ہو، ہری سنگھ یا راجپوتوں کی صفوں میں دہشت پھیلائی تمہارا کام ہے؟“ رانی پدمنی نے ایک لمحے میں اپنے جاں نثار سینا پتی کو اس کے منصب سے اتار کر زمین پر پھینک دیا تھا۔

چند لفظوں نے ہری سنگھ کے دل و جگر کاٹ کر رکھ دیئے تھے مگر وہ بڑی قوت برداشت کا انسان تھا۔ اس کی دونوں مٹھیاں اس طرح جھنجھکی تھیں جیسے وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے دل کا خون نچوڑ رہا ہو۔ پھر وہ اس خون کو بھی قطرہ قطرہ کر کے پی گیا۔ ”مہارانی! معاون سفیر ایسے نہیں ہوتے۔ آپ نے سردار اس کے کھڑے ہونے کی ادائیں دیکھی؟ سفیروں کے یہ تیور نہیں ہوتے اور ان کی رفتار بھی ایسی نہیں ہوتی اور آپ نے یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ تمام وقت اس کی آنکھیں مہارانی چوڑے کے چہرے پر جمی رہیں۔ کیا ایسے بدترین موسم میں کوئی سفیر اپنے دشمن کے یہاں اس لئے آتا ہے کہ وہ ایک نامحرم عورت کو مسلسل دیکھتا رہے اور خاموش نظروں سے راجپوتوں کے جاہ و جلال کو ٹھکراتا ہو اور واپس چلا جائے۔“

”پھر تم نے کیوں نہیں بتایا کہ وہ بھیڑیا خود چل کر ہماری تلواروں کے ہدف تک آ پہنچا ہے۔“ رانی پدمنی کسی بدحواس انسان کی طرح چیختی لگی۔

”مجھے صرف شک تھا۔ مہارانی، یقین نہیں۔“ ہری سنگھ پدمنی کی چیخ ڈرا بھی اڑاندا نہیں ہوئی تھی۔ ”میں اپنے شبہات کو یقین میں بدلنے کی کوشش کر تا مگر فرمان شناسی کے ٹکڑوں نے مجھ سے میرے ذہن کی یکسوئی چھین لی اور میں منتشر ہو گیا۔“ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ رتن سنگھ نے اس طرح زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا جیسے اسے اپنے شکار کے نکل جانے کا بہت افسوس ہو۔

”سمرات! یہ ایک اچھا موقع تھا جسے ہم نے گنوا دیا۔“ ہری سنگھ کی آواز سے بہت زیادہ محسن کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہاں! یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔“ رانی پدمنی نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اشارہ بھی

ہم!۔ ”ہاں اپنی قوم اور زمین سے یہی عہد تو ہمارے پیروں کی ذمہ داری ہے، ہم اہل غیرت اس زنجیر سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔“ چھمن سنگھ کا سر جھک گیا تھا اور سفید داڑھی آہستہ آہستہ آنسوؤں سے تر ہونے لگی تھی۔ مجرہ کمر خیمہ بوڑھا آہنی بید کے سارے اٹھا اور مکان سے نکل کر راج محل کی طرف جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

دربار آراستہ تھا اور چوڑے کے دونوں حکمران تخت پر اسٹے اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی ہنگامہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا ہو۔ چھمن سنگھ دربار میں داخل ہوا تو رتن سنگھ اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”ہم نے ہری سنگھ کو اس کے عہدے سے ہمیشہ کیلئے معزول کر دیا۔“ رتن سنگھ کا لہجہ ہنرور تھا۔ اب اگر کوئی شخص ہمیں یہ بشارت دے کہ ہری سنگھ کی قیادت راجپوت لشکر کو عظیم الشان فتح سے ہمکنار کر دے گی تو ہم اس خبر کو سننا بھی گوارہ نہیں کریں گے۔ ہم چوڑے کی شکست برداشت کر سکتے ہیں مگر ہمیں یہ منظور نہیں کہ ہری سنگھ جیسا بزدل سپہ سالار ہمارے غیرت مند سپاہیوں پر حکومت کرے۔“

پھر جیسے ہی رتن سنگھ خاموش ہوا ایک راجپوت سردار نے زانی نشت پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ ہم اپنا پائیدار نتیجہ تکب کرین، ہمیں ہری سنگھ کا جرم تفصیل کے ساتھ بتایا جائے۔ جس شخص نے تمام عمر راجپوت سپاہیوں کی قیادت کی ہو، ایسے نازک موقع پر اس کی برطرفی سے شکوک و شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم حالت مجبوری میں اس کا نعم البدل بھی تلاش کر سکتے ہیں لیکن ہری سنگھ پھر ہری سنگھ ہے جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے کسی نئے سپہ سالار کی تقرری کا اعلان کوئی دانشمند نہ فعل نہیں ہو گا۔“

راجپوت سنگھ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ راجپوت سردار کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہری سنگھ کی معزولی کے نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔ رانی پدمنی بھی کچھ پریشان سی نظر آرہی تھی۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد رتن سنگھ نے ہری سنگھ کے جرائم کی تفصیل اہل دربار کے سامنے پیش کر دی۔ ”وہ لسانی بجاوے، مغرور ہے اور چوڑے کی بہادر افواج کو کم ہمتی کا سبق دینے والا ایک بزدل سپہ سالار ہے۔“

چھمن سنگھ سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنے جسم کا بوجھ سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”سمرات! اس بوڑھے کی نظر زبان کو معاف کیا جائے۔ ہری سنگھ کی ذات میں ایسی کوئی خرابی موجود نہیں اس کی قیادت کے دوران ہماری فوج زیادہ منظم ہوئی ہے اور ہر سپاہی نے جنگ و جدل کے نئے انداز سیکھے ہیں۔“

ہری سنگھ کی حمایت میں بلند ہونے والی آوازیں سن کر راجپوت سنگھ بھڑک اٹھا اور اس نے پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ”اس سے زیادہ شرمناک فعل کیا ہو گا کہ ہم اپنی عزت و ناموس کے ساتھ چوڑے کی آزادی کی سلطان کے ہاتھوں فروخت کر ڈالیں۔“

پورے دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔ رتن سنگھ کے انکشاف نے راجپوت سرداروں کے دل دوامگ کو زبردستی کر کے رکھ دیا تھا اور ان کے چروں پر بیک وقت کئی سوالات ابھر آئے تھے۔ ”سمرات! ہری سنگھ کیسے کر سکتا۔“ چھمن سنگھ بے قرار ہو کر بولا۔ ”یقیناً آپ کے اور اس کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ہری سنگھ دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دے، ابھی تو زمین آسمان اپنی جگہ قائم تھا کہ جب یہ دونوں اپنے خور سے سرک جائیں گے تو چھمن سنگھ یقین کر لے گا کہ ہری سنگھ ملک و قوم کا تاجر خاں کی دلتوں کی دلدل میں اتر گیا ہے۔“ چھمن سنگھ کا لہجہ اس قدر یقین و اعتماد میں ڈوبا ہوا تھا کہ رتن سنگھ نے رانی پدمنی کو بھی چونک جانا پڑا۔ ابھی راجپوت سمرات کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ چھمن سنگھ دوبارہ نکل اٹھا۔ ”میں چوڑے کی سرہندی اور آزادی کے نام پر سمرات سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کروں گا کہ

میں اپنی چھمن سنگھ کو بہت زیادہ اداس کر دیتا تھا۔“ اے بھگوان! کیا تو نے اس بوڑھے سپاہی کو یہ دن دکھائے کیلئے زندہ چھوڑ دیا ہے۔“ چھمن سنگھ جوش و خشت میں اپنے بال بونج رہا تھا اور اس کے سات کزنیل جوان بیٹے اپنے باپ کی حالت زار دیکھ کر بدحواس ہو رہے تھے۔

”پتاچی! آپ تو ہوش میں رہیں۔“ ایک بیٹے نے آگے بڑھ کر چھمن سنگھ کو اس دیوانگی کی حرکت سے روکنے کی کوشش کی۔

”میں پاگل ہو جاؤں تو کیا غم ہے مگر وہ تو ہوش میں رہے جس کی وحشت مادر وطن کے سرے پہنچ کر اسے بازار سیاست میں تاپنے پر مجبور کر رہی ہے۔“ چھمن سنگھ کی آواز میں اب بجلیوں جیسی کڑک تھی۔

”اے جاکر کوئی کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی زہریلی زبان کو قابو میں رکھے اور اس طرح غیرت داروں کی پگڑیاں نہ اچھالے۔“

”کون ہے وہ؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“ چھمن سنگھ کے دوسرے بیٹے نے چونک کر اپنے باپ سے سوال کیا۔

”وہی راجپوتوں کی آن‘ رانی پدمنی۔ اور وہی سو ماؤں کے سمرات راجہ رتن سنگھ جن کی جہالت وفاداروں کو غدار کی تحفہ بانٹ رہی ہے۔“ چھمن سنگھ کے ہونٹوں سے نفرتوں کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

”پتاچی! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سمرات اپنی جگہ درست ہوں اور ہری سنگھ بہادری کے جوش میں حدود سے باہر نکل گیا ہو۔“ تیسرے بیٹے نے حالات کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہری سنگھ! پہلا بھی معقول قرار دیا جا چکا ہے یقیناً اس بار بھی اسی سے کوئی بے ادبی سرزد ہوئی ہوگی۔“

چھمن سنگھ نے غصے سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”تم جانتے بھی ہو کہ ہری سنگھ کون ہے؟ ہری سنگھ وہ ہے جس کی شجاعت کے سامنے تمہارے باپ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔“ چھمن سنگھ کا بوجھ شرابار تھا اور وہ اپنے سے کم عمر سپہ سالار کو بڑے والمانہ انداز میں خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ ”ہری سنگھ امور جنگ کا اتنا ماہر ہے کہ اس جیسا ذہین انسان آج تک خاک چوڑے نہیں اٹھا۔ وہ صاحب دل ہو گئے اور صاحب ہوش بھی۔ پچھلی بار رانی پدمنی اور راجہ رتن سنگھ کے غرور و تکبر نے اسے رسوا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہری سنگھ اہل طرف ہے اس نے اپنے وطن اور قوم کیلئے یہ ذلت بھی گوارہ کر لی تھی۔ مگر پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس مرتبہ بھی ہمارے نادان حکمرانوں نے اس کے کسی فیصلے کو غارت سے جھٹلایا ہو گا ورنہ ہری سنگھ اتنا تک نظر نہیں ہے کہ ریاست کی سرحدوں پر آگ لگی ہو اور وہ مندر کے کو گوشے میں پڑا پجاریوں کی گھنٹیاں سن رہا ہو۔“

”تو پھر آپ سمرات سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ چھمن سنگھ کے بڑے بیٹے امر سنگھ نے باپ کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کا بھی تو فرض ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کو اپنی تدبیر کے چیمٹوں سے بجھا دیں۔“

”نہیں بیٹے! اب کچھ باقی نہیں رہا۔“ چھمن سنگھ کی آواز سے اچانک ایک دردناک جھلک لگائی۔ ”شیر کی وہ ناندری دیکھی ہے کہ دل ہی جھجھ کر رہ گیا ہے اب تو دل چاہتا ہے کہ اپنے ہی گھر پر اپنی گوارہی لوں اور دنیا سے جپ چاپ گزر جاؤں۔“ خشک سمندر میں بڑا ہولناک طوفان اٹھ اٹھا وہ چھمن سنگھ کی جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کی بھی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں تھا مگر جب چوڑے آبرو کا حوالہ پیش کیا گیا تو بوڑھے راجپوت کے چہرے کی آگ سرد پڑنے لگی اور اس کی گردن کا کھڑک

ہری سنگھ کے بارے میں کئے جانے والے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں کہ یہ پوری راجپوت قوم پر آپ کا احسان ہو گا۔ ”بوڑھا سپاہی ملک و قوم کی بقاء کیلئے انتہائی عاجزی کے مقام پر اتر آیا تھا۔
رتن سنگھ بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا ”جاؤ! تم خود ہی اس سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے؟“

☆ ☆ ☆

پچھن سنگھ بہت خوش تھا اور وہ کئی راجپوت سرداروں کے ساتھ کبھ شام کے مندر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ معززین قوم اپنے دل شکستہ سپہ سالار کی خبر گیری کیلئے پہنچے تو ہری سنگھ طاقت کی دیوی اور گام قدموں پر چھکا ہوا رقت آمیز بچے میں کہہ رہا تھا۔ ”دیوی! تجھ سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ ہری سنگھ ہے اور اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل کن جذبوں کا مالک ہے اور دیوی تو یہ بھی جانتی ہے کہ تیرے اہل پرستار کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ اگر تجھے دنیا کی ٹھنڈی کاخوف نہ ہو تو تو میں اپنا سر کاٹ کر تیرے چرو میں ڈال دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ احمق اور کتے لوگ میری موت کے بعد کیا تبصرے کریں گے۔ کہیں گے کہ ہری سنگھ دشمن کی یلغار سے ڈر گیا اور پھر دہشت میں مبتلا ہو کر اس نے خود کشی کر لی۔ ہری سنگھ درگاما کے قدموں سے لپٹا ہوا پوانہ وار دروہ تھا۔ ”دیوی! آج میں تجھ سے شفیق مانگتا نہیں ہوں آج میری پرارتھا (التمنا) ہے کہ مجھ پر یہ آسمان گرا دے یا مندر کی کسی دیوار کو ڈھادے اور اس داس کو اپنے اس بھکشو (بھکاری) کو چھون بندھن سے کٹی دیدے میں تیرا حقیر پیہاری، تیرے لازوال قوتوں کو پکارتا ہوں۔ میری مدد کر دیوی! اور مجھے اس حالت میں زندہ نہ رکھ کہ میری آنکھ سامنے چوڑ کو شمشان بھومی میں بدل دیا جائے اور میری زندہ و تابدہ قوم غلامی کی زنگ آلود زنجیر پہن لے مجھے بھیک دے دیوی! اپنی اپار دیا کی بھیک! میرے کاندھوں سے میرے سر کے بوجھ کو ہٹا کر دے۔ اس میں کئی ماہ سے ایک ناکسور رس رہا ہے اور اب اس ناکسور کی غلش مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں اپنے دیار میں اجنبی ٹھہرا ہوں۔ یہ لوگ میری زبان نہیں سمجھتے اب انہیں میرے خون پر بھی شک ہو گیا ہے۔ اس زندگی کی نعمت سے نجات دے دیوی! اس زمین کے جگر کو پھاڑ دے کہ میں اس میں ساجاؤں یا مجھے اٹھالے اور آسمان کی وسعتوں میں گم کر دے۔ میرا وجود عدم سے ملا دے کہ تیرا غلام ہری سنگھ اپنی ذات کی نفی کرتا ہے۔“ مینا پتی ہری سنگھ ’دیوی کے قدموں میں پڑا ہوا اس طرح گر کر یہ وزاری کر رہا تھا کہ پچھن سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار بھی رونے لگے۔ فریاد و فغاں کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا پچھن سنگھ نے آگے بڑھ کر ہری سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چوڑ کا معتب پہ سالار چونک اٹھا حیرت سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے آتش چروں کو دیکھنے لگا۔

”تمہارا خون ناپاک نہیں ہے ہری سنگھ! اس خون کی حرارت سے تو مجھ بوڑھے کو نئی زندگی کی تڑپ ہے۔“ آج پچھن سنگھ کے لہجے میں وہ محبت شامل تھی جس کا اظہار اس نے کبھی اپنے بیٹوں سے بھی نہیں کیا تھا۔ ”واپس چلو ہری سنگھ کہ دھڑکنے والی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ اگر تم لوٹ کر نہیں آئے تو اس سارے سینے مارے جائیں گے اور ماں کی کوکھ سدا کیلئے اجڑ جائے گی۔“

ہری سنگھ کھڑا ہو گیا اور حیرت سے بوڑھے پچھن سنگھ کے بے ہوش آنسوؤں کو دیکھنے لگا۔ ”پچھن سنگھ تم کیوں روتے ہو۔“ ہری سنگھ نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ ”رونا تو انہیں چاہئے جن کی آنکھوں کا سوکھ گیا ہے۔“

”سردار! اب اس کا وقت گزر گیا۔ میں نے تو اپنا فوجی لباس بھی اتار دیا اور تلواری بھی دیوی کے قدموں

کھڑی۔ یہ جس کی امانتیں تھیں اس کو لوٹا دیں۔ اب تو میں ایک مفلوج اور شکستہ دل انسان ہوں جب تک بائیں چل رہی ہیں جسم کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اب نہ میں یہ لباس پہن سکوں گا اور نہ یہ تلواری مجھ سے ہوتی۔ میں کم ظرف نہیں کہ اپنی رسوائیوں سے گھبرا کر ملک و قوم کی بربادی کیلئے دعائیں مانگنے لگوں۔ بڑا ہتھیار کوئی فتوحات دے کہ اس کا دامن تنگ ہو جائے ایک ہری سنگھ کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ میری دھڑکنے والی خاک سے پیدا ہونے والا ہر نوجوان ہری سنگھ ہے۔ بلکہ ہری سنگھ سے بھی زیادہ دل دوست ’سرفروش اور جانا باز۔“

پچھن سنگھ جانتا تھا کہ ہری سنگھ دوبارہ راج دربار میں حاضر ہونے کی ذلت برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ غیرت مند سردار وطن کی محبت میں اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہو گیا۔ اچانک پچھن سنگھ کے پاؤں اٹھ بلند ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی پگڑی اتار کر ہری سنگھ کے قدموں میں ڈال دی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ہری سنگھ ساکت ہو گیا اور اس کی آنکھیں پتھرائی گئیں۔ پچھن سنگھ کے ہمراہ لڑنے والے راجپوت سردار سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چوڑ کا یہ معزز ترین فرد وطن کی محبت میں اپنی آن بان لٹا دے گا۔

”ہری سنگھ! اب تو لوٹ چلو کہ اس سے زیادہ تمہیں دینے کیلئے میرے پاس کچھ نہیں۔“ پچھن سنگھ نے درد سے بے قرار ہو کر رونے لگا۔ ”اس دستار کی عزت رکھ لو ہری سنگھ کہ یہ بھی تمہاری طرح ایک جہاں کی دستار ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دستار کو آج تک زمین کی مٹی نے میلا نہیں کیا ہے۔“

ہری سنگھ کچھ دیر تک کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اس نے تیزی سے جھک کر پچھن سنگھ کے قدموں کو چھوا اور دستار اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے باندھنے لگا۔ ”سردار! میں نے آج تک آپ سے اپنا دل دوست انسان نہیں دیکھا۔“ ہری سنگھ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے تھے۔ ”اس دستار عظمت پر ایک نہیں ہزاروں ہری سنگھ قربان اس کی ایک ایک ٹھکن پر میرا مان، میری مریدا سو سوار رہے۔“

☆ ☆ ☆

ہتھیار کے راج دربار میں ایک اہم ترین فوجی اجلاس ہو رہا تھا۔ ہری سنگھ کی خواہش پر عام راجپوت سردار ناگامی میں شریک ہوئے تھے اور رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے بڑے جبر کے ساتھ اپنے معتب پہ سالار بیات حلیم کی کچی کہ وہ جو کچھ کہے گا سردار بار کہے گا۔ پھر جب ہری سنگھ اپنی نشست پر کھڑا ہوا تو اجلاس شہر کا ایک سائیں رک سی گئیں وہ ایک ناراض سپاہی اور ایک مطلق العنان حکمران کی گفتگو سننے کیلئے تھے۔ ”سمرات! میں اپنے وطن اور سردار پچھن سنگھ کی خاطر دوبارہ لوٹ آیا ہوں اب نہ مجھے لی تمنا ہے اور نہ کسی سے کوئی شکایت۔“ رتن سنگھ ہر خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا۔

”انما ز فکر سے آپ کو بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور ان راجپوت سرداروں کو بھی جن کے مضبوط ہاتھ چوڑ کے اقتدار کی عمارت کھڑی ہے۔ میں پسند نہیں کرتا کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آجائیں۔ میں نے دیوانوں کی طرح ایک ایسے فعل کا مرتکب ہو جاؤں جس سے پوری قوم ہلاکت میں آجائے۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ سر بلند و آزاد قوم دشمن کے سامنے سر جھکا کر غلامی کی دستاویز پر دستخط نہیں چاہتا ہوں کہ چوڑ کے چند باہوش انسان علاء الدین خلجی کے پاس جائیں اور اسے سمجھانے ماکریں کہ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے وہ خود بھی آزاد فضاؤں میں سانس لے اور ہماری

ہواؤں کو بھی سبکد فزار رہنے دے۔ اپنے خون کو بھی خاک میں جذب نہ کرے اور ہمارے لبو کو بھی رگوں میں محفوظ رہنے دے۔ اگر اسے اپنے حرم کی آبرو عزیز ہے تو ہمارے ناموس پر بھی دست درازی کرے۔ اسے یہ بھی بتایا جائے کہ چوڑ اور دہلی کے درمیان بہت فاصلہ ہے اور اس پر یہ کتبہ بھی واضح کر جائے کہ دہلی کو چوڑ سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا اور اسے یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی جائے راجپوت سپاہی خلجی سلطنت کے دشمنوں کو کوئی رعایت نہیں دیں گے۔

”کیا یہ تمام باتیں علاء الدین سے بھیک مانگنے کے مترادف نہیں ہوں گی؟“ راجہ رتن سنگھ نے توجہ میں ٹوٹے ہوئے کہا۔

”نہیں سمرات! ہرگز نہیں۔“ ہری سنگھ نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ”اس قسم کے بے مذاکرات میں کامیابی ہونا کامی کا سارا دار و مدار انسان کے طرز تفکر پر ہوتا ہے۔ ہمارے نمائندہ آبرو مند نہ لہجے میں بات کریں گے۔ ان کے چروں سے گداگری کا نہیں برابری کا رنگ جھلکے علاء الدین کے آگے شکوک نہیں بڑھائیں گے اس سے اتمام حجت کیلئے آخری گفتگو کریں گے۔“

”ہری سنگھ! کیا تم سمجھتے ہو کہ سلطان پانچ ماہ کے طویل ترین محاصرے کے بعد اتنی آسانی سے واپس جائے گا۔“ رتن سنگھ نے نہایت بے دلی کے انداز میں کہا۔

”میں نے اس کی واپسی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔“ ہری سنگھ نے جواباً کہا۔

”پھر یہ لا حاصل دوزد دھوپ کس لئے؟“ رتن سنگھ نے اپنے سپہ سالار سے دوسرا سوال کیا۔

”سمرات! چوڑ براتناہر وقت کبھی نہیں پڑا۔ اگر کسی طرح یہ محوس ساعتیں مل جائیں تو چاہے ہری سنگھ اچانک اس نظر آنے لگا تھا۔ ”ایک سپہ سالار کی حیثیت سے میں یہ راز جانتا ہوں کہ کبھی فوج موت کے منہ میں جھونک دینا ہمارے ہی کی علامت ہوتی ہے اور کبھی سپاہیوں کو فنا کی وادی سے بچا کر۔ شجاعت کما لاتی ہے۔ لشکروں کا آگے بڑھنا ہی فتح و نصرت کی دلیل نہیں ہوتی۔ کبھی کسی بڑی کامیابی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ آج ہم کسی معرکے کو سر کرنے کی نہیں اپنے سر بچانے کی کوشش کر رہے اگر سر بچ گئے تو سردار یاں بھی برقرار ہیں گی ورنہ سب کچھ غارت ہو جائے گا۔“

راجہ رتن سنگھ اپنے سپہ سالار کے ہوشمندانہ دلائل سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ایک طویل سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”اگر علاء الدین نہیں مانتا اور اس نے ہماری سرحد خلاف جواب دیا تو.....“ رتن سنگھ نے تقدیر آگے بڑھتی بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔

”پھر ہماری تلواریں ہوں گی، مارواڑ کے صحرائی پتی ہوئی ریت ہوگی، سنگلاخ چٹانیں ہوں گی، ہمارے دشمن کے کٹے ہوئے سر ہوں گے، بھڑکتی ہوئی چٹانیں ہوں گی، تنگ و تاریک قبریں ہوں گی، ہر طرف ہوگا، بے رحم اور سفاک موت کا رقص۔“ انتہائی پرسکون نظر آنے والا ہری سنگھ اچانک مشتعل ہو کر ”درگاہی قسم! علاء الدین ہماری پشت نہیں دیکھے گا اس کی آنکھیں تو ایک ہی منظر کا مشاہدہ کریں سیاہ نیزے ہمارے سینوں کے آبر پار ہوں گے، زہریلے تیر ہمارے گردنوں میں بے ہوش ہوں گے، وحشت کا آغاز ہو گا اور فنا کے ساز پر ایک ہی نغمہ ابھر رہا ہو گا..... راجپوت عظیم ہیں اور ناقابل تغیر موت ان کے زیر و زبرہ جسموں پر قابو پا سکتی ہے مگر ان کی آزاد روحوں کو زنجیر نہیں کر سکتی۔“ ہری سنگھ کا لہجہ جاں فروشی کے جذبے سے اس قدر سرشار تھا کہ اہل دربار کے جسموں میں بھی آگ سی بھڑکتی گئی راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے بالآخر راجپوت سمرات نے علاء الدین سے گفتگو کرنے کیلئے جماندہ اور ذہین افراد پر مشتمل ایک وفد بھیجنے کی اجازت دیدی۔ اس وفد میں

ہری سنگھ بھی شامل تھا۔ ہری سنگھ نے نصف قد تک خم ہو کر اپنے فرمانروا کو سلام پیش کیا جو اس بات کی بات تھی کہ اب رتن سنگھ کی طرف سے اس کے دل میں کوئی کدورت باقی نہیں۔

☆.....☆.....☆

ایسی وفد کے دیگر ارکان کا انتخاب جاری تھا کہ دوسرے دن صبح راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی نے قلعے کی بلبل پر چڑھ کر سلطان کے جنگی مورچوں کی طرف دیکھا۔ علاء الدین کے بے شمار سپاہی اپنے خیموں سے اہل قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رتن سنگھ دشمن کی فوجوں کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھ کر چونک گیا۔ پھر فرمایا اس نے سپہ سالار ہری سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو طلب کر لیا۔ ہری سنگھ اور سردار بھی یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ علاء الدین کے ہزاروں سپاہی بے دریغ بڑھتے چلے آ رہے تھے فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب منظر صاف نہیں تھا مگر پھر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن خالی ہاتھ نہیں ہیں۔

”کیا سلطان براہ راست قلعے کے صدر دروازے پر حملہ کرنا چاہتا ہے؟“ راجپوت سمرات نے پریشان دہری سنگھ سے پوچھا۔

”نہیں سمرات! سلطان ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔“ ہری سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”علاء الدین کی فوجیں نشیب میں حرکت کر رہی ہیں اگر وہ ہمارے تیر اندازوں کے ہدف تک پہنچ گئیں تو زمین کا ایک سپاہی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

”پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”ہم اپنے تیر اندازوں اور سنگباری کرنے والے سپاہیوں کو ہوشیار بننے کا حکم دیئے دیتے ہیں، سلطان کے ارادے زیادہ سے زیادہ شام تک ظاہر ہو جائیں گے۔“ ہری سنگھ نے جواباً کہا۔

اور پھر قلعے کی تفصیل پر ایک پہل سی چمکی۔ تفصیل کے دائیں اور بائیں جانب سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور صدر دروازے کے عین اوپر بھی ماہر تیر اندازوں کے دستے متعین کر دیئے گئے۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی اپنے سرداروں کے ساتھ جلتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ سلطان کے سپاہی بڑھتے بڑھتے ایک مخصوص فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ ہری سنگھ نے اندازہ کرتے ہوئے بتایا کہ دشمن کے سپاہیوں کا موجودہ قیام ان کے خیموں سے تقریباً آدھے فاصلے پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہری سنگھ نے ہنرور ٹپکی کی کہ چند تیر اندازوں کو دشمن پر تیر برسانے کا حکم دیا جائے۔

راجہ رتن سنگھ نے اپنے کچھ تیر اندازوں کو اشارہ کیا، کمائیں چڑھیں اور پھر تیر چھوڑ دیئے گئے۔ ان کے چھوڑے ہوئے تیر اندازوں کے چھوڑے تیر ہدف پر پہنچنے سے پہلے ہی زمین پر گر گئے تھے۔ ”وہ ہوشیار ہے۔“ ہری سنگھ چپ و تاب کھانے لگا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس سے کوئی حماقت سرزد نہیں ہو سکتی۔“

راجہ رتن سنگھ گھبرا کر اپنے سپہ سالار کا منہ دیکھنے لگا۔

”سلطان جب چوڑ کی پہاڑی پر خیمہ زن ہوا تھا تو ہم لوگ سمجھے تھے کہ وہ اپنے اندازوں کی غلطی کا شکار ہوئے گا مگر بعد میں ثابت ہو گیا کہ سلطان کی جانگنے والی آنکھیں ایک ہی نظر میں فاصلوں کی پیمائش کر لیتی تھیں اس وقت علاء الدین کے خیمے ہمارے تیر اندازوں کے ہدف سے تقریباً چار گنا دور تھے اور اب یہ فاصلہ ٹپکری دسترس سے باہر ہے۔“ سپہ سالار ہری سنگھ نے سلطان کی لشکروں کی نقل و حرکت کے بارے میں اس قدر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

راجلے مورچے پر منتقل کر رہے ہیں۔ ”رتن سنگھ نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس ہندی کو روکا نہیں جاسکتا؟“ رتن سنگھ نے کسی بچے کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

پہری فضاؤں پر سلطان کا مکمل قبضہ ہے۔ اندر کے لوگ محصور ہو جائیں تو باہر کی دینا سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ”ہری سنگھ اپنے تمام تر تجربے اور تدبیر کے باوجود بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔

”اگلی ہم سے ایسی باریکی کی باتیں نہ کرو۔“ راجہ رتن سنگھ کی اعصابی خشکی اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ ”جھوٹ ہو مگر ہمیں فتح کی نوید دو۔ ہمارے کانوں میں کہہ دو کہ دشمن چوڑے کے ناقابلِ تسخیر قلعے سے

رواں چلا جائے گا۔ ہم یہ جنگ ہار کر اپنے اقتدار سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔“

راجہ بھارہری سنگھ نے اپنی آنکھوں سے غور کے آہنی جھٹکے کو کھینچ دیکھا تھا۔ تاج و تخت کیسی بلاخیز باتیں کہ آدمی آخری سانس تک ان کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہتا رتن سنگھ بھی اس بچے کی طرح

انتہائی حساسیت سے چاند کو دیکھ کر کہا تھا کہ اسے زمین پر اتار کر اس کی آغوش میں ڈال دو۔ وہ اپنے

میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے فریب خوردہ حکمرانوں کو کس طرح جھوٹی تسلیاں دے۔ وہ اپنے

میں ٹھوڑے ہی فاصلے پر دشمن کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا مگر رتن سنگھ کی بدحواسی دیکھ کر اسے

نبوت بولنا پڑا۔ ”سراٹ! میں نے صرف دشمن کی مورچہ بندی کا ذکر کیا ہے۔“ اب ہری سنگھ

بڑے میں آخر خشکی کے بجائے راجپوتوں کا رواجی جلال تھا۔ ”ابھی جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ تو بہت دور

دونوں طرف بساطیں بچھا دی گئی ہیں۔ مرے گردش کر رہے ہیں اور نتیجہ؟ وہ تو ایسے کے اختیار

ہے۔ پھر بھی آخری فتح ہماری ہوگی۔ قلعے کی فسیل تک پہنچنا آسان نہیں۔ علاء الدین بڑی گمراہ کن

ی میں جتا ہے۔ اسے اندازہ نہیں کہ یہ دیواریں کن ہاتھوں نے تراشی ہیں؟“ ہری سنگھ اپنے

مادور فوج کو ذہنی انتشار سے بچانے کیلئے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ اپنے جھوٹ پر دل میں پشیمان تھا مگر

رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو دکھانے کیلئے چہرے پر یقین کی آگ روشن کر لی تھی۔

اور تمہارے اس وفد کا کیا ہوا جسے تم علاء الدین کے پاس بھیجنا چاہتے تھے؟“ اچانک رتن سنگھ نے

سوال کر دیا۔

ی سنگھ نے چونک کر راجپوت سراٹ کی طرف دیکھا۔ راتوں رات کیسا عجیب انقلاب آ گیا تھا کہ

لہکی پیش کردہ سیاسی مذاکرات کی جس تجویز کو بڑی کی بدترین علامت قرار دیا جا رہا تھا آج رتن سنگھ

نے اس وفد کے ارکان کا انتخاب ہو گیا ہے۔ ”ہری سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اب چوڑے کے ان

دول کا بھیجنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔“

راجہ رتن سنگھ نے استغما میہ نظروں سے ہری سنگھ کی طرف دیکھا۔

”اب ہمارے نمائندوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔“ ہری سنگھ نے اپنی بات کی

مٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک طرف وہ سلطان کو سیاسی گفتگو کے بیچ و خم میں الجھائیں گے اور

دوسری طرف دشمن کے سخت اقدامات کی جاسوسی بھی کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ کل دوپہر تک یہ راز بھی

بہانے گا کہ سلطان کے سپاہی اس پہاڑی کو کس مقصد کیلئے کاٹ رہے ہیں اور نئی مورچہ بندی میں

کے کیا غور و نام پوچھ رہے ہیں۔“

رتن سنگھ کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا رنگ ابھر کر ڈوب گیا۔ ”یہ چال بہت گہری بھی ہے اور بروقت

متمنماری ذہانت کے قابل ہو گئے ہیں ہری سنگھ۔“

”آخر وہ کیا چاہتا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ پر سراسیمگی سی طاری تھی اور رانی پد منی بھی بار بار علاء الدین کے متحرک سپاہیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال میں سلطان اپنا نیا فوجی پڑاؤ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت قلعے سے تقریباً پانچ سو گز کے

فاصلے پر خیمہ زن ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“ ہری سنگھ کے لہجے میں ٹھنڈا تھا مگر چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی

جھلک رہی تھی۔

”کیا اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا؟“ راجہ رتن سنگھ کی فکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”کامیابی تو اس کا مقدر نہیں مگر اس طرح محاصرہ کچھ اور تنگ ہو جائے گا۔“ ہری سنگھ کے ذہن میں

کئی اندیشے سرا بھار رہے تھے لیکن اس نے جنگی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے سلطان کی فتح کے امکانات کو

یکسر مسترد کر دیا۔ اگر ہری سنگھ غلط انداز میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتا تو راجپوت لشکر میں انتشار پھیل جانے

کا خطرہ تھا۔ اس لئے چوڑے کے ذہن پہ سالار نے مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لیا اور سلطان کی اس

حرکت کو محض وقت کی بربادی سے تعبیر کرنے لگا۔ ”محاصرہ کتنا بھی تنگ ہو جائے مگر اس سے سلطان کو کوئی

فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہمارے قلعے کی فصیلیں اس کی دست درازیوں سے مکمل طور پر محفوظ ہیں۔“

☆ ☆ ☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی نے وہ رات بھی سکون سے سو کر گزاری مگر سیتا پتی ہری سنگھ اور بوڑھا سردار

پچھن سنگھ رات بھر جاگتے رہے امور جنگ کے دونوں ماہرین مختلف زاویوں سے بحث کر رہے تھے اور اس

نتیجے پر پہنچنے کیلئے بے چین تھے کہ سلطان نے آخر یہ اقدام کیوں کیا ہے؟

پھر صبح ہوئی اور سورج مارواڑ کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا تو قلعے کی فسیل پر کھڑے ہوئے رتن سنگھ کی

آنکھیں ایک اور عجیب منظر دیکھ رہی تھیں۔ سلطان کے سپاہی جس پہاڑی پر خیمہ زن تھے اب اسی پہاڑی کو

کانا جا رہا تھا۔ رتن سنگھ کیلئے دشمن فوجیوں کی یہ حرکت ناقابلِ فہم تھی۔ فوری طور پر ہری سنگھ اور پچھن سنگھ کو

طلب کیا گیا۔ اگرچہ پچھن سنگھ کا بڑھا پاس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا لیکن وطن پرستی کا جذبہ

اسے فسیل کی طرف کھینچنے لئے جا رہا تھا۔ وہ کئی بار راج محل کی پرچہ سیر جیوں پر گر کر اور کسی کی مدد کے بغیر اٹھ

کر فسیل تک پہنچا۔ پچھن سنگھ کی کمزور آنکھیں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر اس کا چہرہ دشمن کے

خیموں کی طرف تھا اور ساعت کی پوری قوتیں رتن سنگھ کی باتوں پر مرکوز تھیں۔

”علاء الدین کے سپاہی اس پہاڑی کو کیوں کاٹ رہے ہیں؟“ راجہ رتن سنگھ نے اپنے پہ سالار

ہری سنگھ سے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

”کچھ نہیں کہتا سراٹ کہ آخر اس کے ارادے کیا ہیں؟“ ہری سنگھ بھی خلجی حکمران کی چالوں

کو سمجھنے سے عاجز تھا۔

”کیا تم دشمن کے سپاہیوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہو ہری سنگھ؟“ راجپوت سراٹ نے دوسرا سوال

کیا۔

”آج سارے اندازے غلط ٹھہریں گے سراٹ!“ ہری سنگھ کے لہجے میں ہلکا ہلکا اضطراب شامل تھا۔

”جدھر دیکھتا ہوں دشمنوں کے سر ہی سر ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری دہلی چوڑ پر اٹھ آئی ہے۔“

”پہاڑی کے گرد سلطان کے سپاہی حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔“ راجہ رتن سنگھ شدید

بے قراری کے عالم میں ٹٹل رہا تھا۔ ”دشمن فوجیوں کی قطاریں یکنی ہوئی ہیں۔ شاید یہ لوگ پہاڑی کے پتھر

ہری سنگھ بے حس و حرکت کھڑا، سلطان کے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو ”چوڑ پہاڑی“ اور سننے اور سچ کے درمیان بہت تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

نئی صبح راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمنی کیلئے ایک پراسرار پیغام لے کر آئی تھی۔ وہ پیغام اہل چوڑ کو خوشیاں بھی فراہم کر سکتا تھا اور سننے آزار بھی پہنچا سکتا تھا۔ ہری سنگھ نے اپنے وفد سے آخری ملاقات کی اور وفد کے قائد سردار پھمن سنگھ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کے جُزبے اور قوت برداشت بہت بھروسہ ہے سردار! میری خواہش ہے کہ گفتگو کا آغاز بھی آپ کریں اور اختتام بھی۔ یہ دوسرے ارکان کی ذات پر بے اعتمادی کی بات نہیں، صرف احتیاط اور پیش بندی ہے۔ گرم خون رکھنے والی قوموں کے نمائندے اکثر جذباتی ہوجاتے ہیں اور اس روش کا انجام ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔“ یہ کہہ کر ہری سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں چوڑ کے معزز سرداروں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو نرم اور چروں کو پرسکون رکھیں۔ صورت حال کتنی ہی بگڑ جائے مگر آپ لوگ اپنی ہوشمندی سے سنوارنے کی کوشش کریں۔ ہمیں سلطان کے ذلت آمیز سلوک کی بھی توقع ہے مگر آپ اسے برداشت کر لیجئے گا۔ خاک و وطن سمجھی کبھی عجیب قربانیاں طلب کرتی ہے۔“ ہری سنگھ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔

آٹھ افراد پر مشتمل اس وفد کے سارے ارکان پورے انہماک کے ساتھ سیناچی کی باتیں سن رہے تھے۔ ہری سنگھ نے آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ قلعے سے نکل کر بے نیازانہ سلطان کے غمے کی طرف بڑھیں گے۔ دشمن سپاہیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے مگر انہیں اندازہ نہیں ہونے دیں گے کہ یہ وفد کسی قسم کی جاسوسی کیلئے روانہ کیا گیا ہے۔“

چوڑ کا سیاسی وفد اس طرح روانہ ہوا کہ راجہ رتن سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ ان معزز سرداران قوم کو رخصت کرنے قلعے کے دروازے تک آئے پھر جیسے ہی راجپوت سرداروں نے دروازے سے باہر قدم رکھے، رتن سنگھ کی تھر تھرا پی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”شیو اور دشمنو کا بے پناہ کرم تمہارے سروں پر سایہ نکلن رہے اور تمہیں دیکھتے ہی دشمنوں کی صفیں درہم برہم ہوجائیں۔ اور درگاہی لا محدود شکستیاں تمہارے جسموں میں اس طرح طلول کر جائیں کہ تمہارے قدموں کی دھمک سے چوڑ کے بدخواہوں کی سانسیں اکھڑ جائیں اور پھر ”کالی“ کے قہر کی ہوائیں ان کے خیموں کو اڑا کر دور کر دیں گے۔“ راجہ رتن سنگھ اپنے دیوتاؤں کو مدد کیلئے پکار رہا تھا اور راجپوت سردار آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رتن سنگھ کے نمائندوں اور سلطان کے سپاہیوں کا آہٹا سامنا ہوا۔ علاء الدین کے فوجی ایک لمحے کیلئے چونکے مگر راجپوت سرداروں کو خالی ہاتھ دیکھ کر مطمئن نظر آنے لگے۔ ملک نصرت خان نے آگے بڑھ کر ان کے قلعے سے نکلنے کا سبب دریافت کیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ راجہ رتن سنگھ اپنے سفیروں کے ذریعے سلطان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے تو ملک نصرت خان ان آٹھوں افراد کو لے کر علاء الدین کے خیمے تک پہنچا۔ پھر جب ملک نصرت خان نے اپنے سلطان کو رتن سنگھ کی اس خواہش سے باخبر کیا تو علاء الدین حالت غضب میں بھڑک اٹھا۔

”ان نامرادوں کو واپس لوٹا دو کہ گفتگو کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک ہی راہ بکلی ہے، قتال و جدال کی راہ۔ لاشوں اور جنازوں کی راہ۔ شمشیروں اور نیزوں کی راہ۔“

زیادہ طاقتور ہوں گے وہی اپنے حریف کے چہرے پر سیاہی مل دے گا۔ اب چوڑ کی فضاؤں میں میں ہوگی ملک! صرف دھواں پھیلے گا اور زمین کی آغوش سے اندھیرے پھوٹیں گے۔ ہم نے دوبارہ بن سکے کے سر پر اپنے کرم کا سایہ دراز کرویں اور اس کے گناہوں کو بخش دیں مگر وہ فطرۃ مجرم کی بیانی لٹ چکی ہے اور وہ اپنی بھی ہوئی آنکھوں سے ہماری شان خسروانہ دیکھ نہیں سکا۔ ہر مرتبہ ہم سے قہر و نفرت کا سودا کرنے کی کوشش کی۔ اس بد نصیب کو نہیں معلوم کہ ہم بازار کے سب سے بڑے تاجر ہیں۔ ہم صلہ پسندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے مگر جب کوئی ظلم اور نا فرمانی کر دیتا ہے تو ہم اس کی زمین، اس کا اقتدار اور اس کی سانسیں تک خرید لیتے ہیں۔“ آتش غضب والدین کی زبان بھی جل رہی تھی اور چہرہ بھی۔

نئی عالم کے دروازے پر چند گداگر کھڑے ہیں۔ ”ملک نصرت خان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ آج تک شاہ کے دروازے سے کوئی بھکاری خالی ہاتھ نہیں نکلے گا۔ کشت میں غم نمایاں ہو گیا ہے اور اس کی ٹانگیں کانپنے لگی ہیں۔ اگر سلطان چوڑ کے ہا کو اپنے رخ ثنائیاں کی ایک جھلک ہی دکھادیں تو یہ سعادت ان کیلئے کافی ہوگی۔“ ملک نصرت خان کہ سلطان رتن سنگھ کے نمائندوں کو خلوت میں طلب کر کے ان سے اپنی توہین کا انتقام لے مگر بن نے اپنے سپہ سالار کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر اسے جھڑک دیا۔

”ملک! تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہر آنکھ ہمارے دیدار کے لائق نہیں ہوتی۔“ علاء الدین کا حراج کچھ اور ہو گیا تھا۔

”یقیناً..... اے صاحب جبروت! اس میں کیا شک ہے؟“ ملک نصرت خان نصف قد تک خم ”غلام تو چاہتا تھا کہ چوڑ کے بھکاری ایک نظر میرے سلطان کا جاہ و جلال دیکھ لیں اور جب وہ لرزے لوں کے ساتھ واپس جا کر اس ملاقات کا حال بیان کریں تو ان کے چروں پر خوف کی دھند چھائی اور ان کی زبانیں دہشت سے لڑکھڑاہی ہوں۔“

والدین خلجی کے اعصاب کا کھنچاؤ کسی قدر کم ہو گیا۔ ”ملک! ہم تمہارے جذبہ شاہ پرستی کی قدر ہیں مگر رتن سنگھ اسی سلوک کا مستحق تھا۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے شرف بار پائی بخشیں تو چوڑ کے اسے کہو کہ ان کا کھراں ہمارے فرمان کے ٹکڑوں کو اپنے سر پر سجا کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا بے تک پیچھے۔ پھر یہ ممکن ہے کہ ہم ازراہ کرم اس کی درخواست قبول فرمائیں۔“

نصرت خان اگلے قدموں چلتا ہوا خیمے سے باہر آیا اور زبان شاہ سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف سفیروں کو منتقل کر دیا۔

والدین کے الفاظ کی حرارت سے راجپوت سرداروں کے دل دو داغ جھلس اٹھے تھے۔ ان کی قوت متوجہ دے گئی تھی مگر ہری سنگھ کی ہدایت نے انہیں لب کشائی سے روکا۔ تاہم سردار پھمن سنگھ ناپے قابو نہ رکھ سکا۔ ”تمہارے سلطان نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اسے معزز سفیروں کا احترام کرنا

سلطان اپنے برابر کے لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔“ ملک نصرت خان کی پیشانی پر بھی کئی بل ابھر ”تم نے اپنی پست قامت کی طرف بھی نہیں دیکھا اور اپنے گریبانوں میں بھی نہیں جھانکا، پھر اسے شاہ کے انداز تعارف کی شکایت کرتے ہو؟ کیا یہ سلطان عالی مقام کا کرم نہیں ہے کہ تم اپنی اہل بگڑیوں کی سلامتی کے ساتھ واپس جا رہے ہو؟ شاہ تو شاہ اس کے غلاموں کے ہاتھ بھی اتنے

دراز ہیں کہ وہ اونچی سی اونچی دستار کو اچھال سکتے ہیں مگر ہم نے ایسا نہیں کیا کہ آداب سفارت نے ہماری کلائیوں کو جکڑ رکھا ہے۔ ”یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے منہ پھیر لیا اور اپنے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چوڑے قاصدوں کو پوری حفاظت کے ساتھ قلعے کے دروازے تک چھوڑ آئیں۔

پچھن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے قدم زمین میں دھسنے جا رہے تھے۔ احساسِ مذامت نے ان کے پیروں کی جان سلب کر لی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جسموں کا بار گرا کر اٹھائے ہوئے قلعے میں داخل ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

راجہ رتن سنگھ، رانی پدمنی، سینا پتی ہری سنگھ اور دیگر اراکینِ سلطنت بڑی بے چینی سے اپنے سفیر کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب انہیں اطلاع دی گئی کہ چوڑے قاصد لوٹ آئے ہیں تو راجہ رتن سنگھ اور سپہ سالار ہری سنگھ چونک اٹھے۔ انہیں ایک ہی لمحے میں اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ مذاکراتِ نا کام ہو چکے ہیں ورنہ اتنی جلد واپسی کس طرح ممکن تھی؟ پچھن سنگھ کا پتہ ہونے جسم کے ساتھ پوری رودادِ سناتا رہا اور راجپوت سرداروں کے دل و دماغ میں نفرت و انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے۔

”تم نے اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا ہری سنگھ؟“ اچانک رانی پدمنی اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہیں بہت شوق تھا کہ راجپوت سوراؤں کے چروں کو خیالت کے پسینے میں ڈوبا ہوا دیکھو۔“ پدمنی کا اندازِ مخاطب انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ ہری سنگھ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی۔

پچھن سنگھ کی بروقت مداخلت نے چوڑی فوجی قوت کو منتشر ہونے سے بچالیا۔ ”نہیں مہارانی! اس میں ہری سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی ذہانت نے تو حالات کے کئی بند دروازے کھول دیے ہیں۔ جو ازیتیں ملک و قوم کی خاطر برداشت کی جاتی ہیں وہ فرزدان وطن کیلئے سب سے بڑا اعزاز ہوتی ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنی دھرتی ماں کیلئے سلطان کی گالیاں کھائیں اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے تور بھی پہچان لئے۔ ہری سنگھ کا منصوبہ کامیاب رہا۔ سلطان کے سپاہی قلعے کے عین مقابل ایک اونچا اور وسیع و عریض ٹیلہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہزاروں سپاہی پہاڑی کاٹنے پر متعین ہیں اور ہزاروں فوجی ہماری پتھروں کو نئے مورچے کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔“

ہری سنگھ جوشِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ ”جیسے اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔“ ہری سنگھ، رانی پدمنی کی طنز آمیز باتوں کو فراموش کر کے پچھن سنگھ سے پوچھنے لگا۔ ”کیا تم نے سلطان کے لشکر میں کوئی غیر معمولی اسلحہ دیکھا ہے؟“

”نہیں!“ پچھن سنگھ نے جواب کہا۔ ”اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم گہری نظروں سے دشمن کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لیتے اور پھر سلطان کے سپاہی بہت بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ بھی ممکن نہیں۔ اب تو ان لوگوں پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ پہاڑی کو جلد از جلد کاٹ کر نیا مورچہ بنالیں۔“ پچھن سنگھ کے جواب نے سینا پتی کو اداس کر دیا تھا۔ ”اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم خاموشی کے ساتھ سلطان کی نئی مورچہ بندی کے انتظامات کو دیکھتے رہیں۔ دشمن کی چال کو سمجھنے بغیر ہم کوئی پاندام نہیں اٹھا سکتے۔ بس یہ کہ چوڑی تمام فوج قلعے کی فصیلوں پر متعین کر دیں اور مسلسل جاگتے رہیں۔“

☆ ☆ ☆

راجہ رتن سنگھ اور اس کے فوجی سردار اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ علاء الدین خلجی نے دہلی سے دس ہزار تازہ دم سپاہی طلب کئے تھے اور ان سپاہیوں کے چوڑے بچتے ہی سلطان نے پہاڑی کو کاٹنے اور بنا

چہانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ علاء الدین کے سپاہیوں کو جہاں جہاں بھی پتھر دستیاب نہ تھے وہ انہیں گھوڑوں کی پٹھوں پر لا کر قلعے کے سامنے اتار دیا کرتے تھے۔ راجہ رتن سنگھ اور اپنی بیٹی اپنے سرداروں کے ہمراہ روزانہ قلعے کی فصیل پر نمودار ہوتے اور بڑی جرئت سے سلطان کے ہوں کو ایک ایسے کام میں مصروف دیکھتے جو بظاہر بے مقصد تھا مگر اس کی تہ میں دشمن کی کوئی گہری چال مدبھی۔

نچوڑن تک تو راجہ رتن سنگھ نے ہری سنگھ کی باتوں کو اہمیت نہیں دی لیکن جب پتھروں کا ہزار زمین کی سطح بند ہونے لگا تو راجپوت سرماٹ کی پریشانیاں بھی بڑھتی چلی گئیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ صبح سے ایک سلطان کے سپاہیوں کی جاں فشانیوں کا منظر دیکھتا رہتا اور رات کو شراب پی کر سونے کی کوشش کرتا اس کی آنکھوں سے نیندیں اڑ چکی تھیں۔ پدمنی کی دلفریب ادائیں اپنے شوہر کو خوابوں کے پرسکون بے میں سمیٹ کر لے جانا چاہتیں لیکن اقتدار سے محرومی کا خوف رتن سنگھ کے رگ و پے میں اتڑ چکا تھا اور پردہائی ہر آسائش کا تصور بھی حرام ہو چکا تھا۔

چوڑے باشندے کئی ماہ سے قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے اور اب یہ زندگی دشوار سے دشوار تر پہلی جا رہی تھی۔ اگرچہ قلعے میں چند ماہ کا غذائی ذخیرہ موجود تھا لیکن غیر نفیسی مستقبل کے اندیشوں نے اس سے اس کی ذہنی آزادی چھین لی تھی اور ہر فرد کے دل پر غلامی کا خوف غالب آتا جا رہا تھا۔

علاء الدین کے سپاہیوں کی مشقتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور اب وہ رات کے اندھیروں میں بھی چہندی کا کام جاری رکھتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اس شدید محنت کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس نے رتن سنگھ کو لمانہ سکون بھی چھین لیا۔ پتھروں کا وہ ٹیلہ جسے اہل چوڑے نے شروع میں کوئی اہمیت نہیں دی تھی اب وہ ہوتے ہوئے ایک پہاڑی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نئی مورچہ بندی کے بارے میں مختلف تاریخ نویسوں کی رائے ہے۔ مسلم مورخین کہتے ہیں کہ چوڑے کا محاصرہ مسلسل چھ ماہ تک قائم رہا۔ ہندو مورخوں کا خیال ہے کہ اس محاصرے کی مدت پورے آٹھ ماہ تھی۔ وقت کے تعین میں اس معمولی سے اختلاف کے دو مقام ہوشمندوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے طویل اور سخت محاصرہ تھا۔ اگر علاء الدین کی جگہ کوئی دوسرا حکمران ہوتا تو بہت پہلے محاصرہ اٹھا کر دہلی واپس جا چکا ہوتا لیکن خلجی حکمران غیر معمولی اعصاب کا انسان تھا۔ اس نے مسلسل چھ یا آٹھ ماہ تک جس سخت جانی ناشوت فراہم کیا وہ ہر کی جنگی مہمات میں ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اور سلطان کی یہی وہ قوت برداشت تھی جس کو کم کیے بار سختیوں کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ پھر اسی جوانمردی نے چوڑے اس کے ناقابلِ روئے کا اعزاز چھین لیا۔

”دونوں دروازے خیر تھاجب راجہ رتن سنگھ نے سلطان کے نئے مورچے کی طرف اشارہ کیا۔“ تم دیکھ رہے ہو ہری سنگھ؟“ راجپوت سرماٹ کی آواز میں ارتعاش تھا۔ ”ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ علاء الدین پہلی اس مختصر سے عرصے میں قلعے کے مقابل ایک مصنوعی پہاڑ کھڑا کر دیں گے۔“

ہری سنگھ خاموش تھا اور اس نظروں سے سلطان کے قائم کردہ نئے مورچے کو دیکھ رہا تھا جس کی ناقص فیصلوں کے برابر تھی۔ ”سرماٹ! یہ ممکن نہیں تھا مگر اس نے ممکن بنادیا۔“ ہری سنگھ نے ان کے کراہنے کی بات کا جواب دیا مگر وہ لہجے کی جھلک کو نہیں چھپا سکا۔

”اگر اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟“ رتن سنگھ نے گہرا کر پوچھا۔ ”کیا اس کے تیر انداز دستہ سامنے اس پر تیروں کی بارش کریں گے؟“

”نہیں!“ ہری سنگھ کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ ”جب ہمارے تیر سلطان کے مورچے کو نہیں بھروسے تو پھر اس کے تیر بھی ہماری فسیلوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

”تم ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہو ہری سنگھ۔“ راجپوت فرمانروا نے جیتنے ہوئے کہا۔

”مجھے معاف کریں سرراٹ کہ میں بھی دشمن کی اس چال کو سمجھنے سے عاجز ہوں۔“ ہری سنگھ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی مجرم کی طرح شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

”جب مجھے ملک و قوم کو منہجہ حار ہی میں چھوڑ کر جانا تھا تو پھر تو نے ان بمبارد سپاہیوں کی قیادت کیوں قبول کی تھی؟“ راجہ رتن سنگھ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔

ہری سنگھ نے اپنے حکمران کے ذلت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں مستقل پہاڑی پر جمی ہوئی تھیں جہاں دشمن کے سپاہیوں کی نقل و حرکت بہت تیز تھی۔

فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث ہری سنگھ وہ منظر نہیں دیکھ سکا جب سلطان علاء الدین خلجی نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور بلند آواز میں کہا۔ ”ساری بڑائی خدا کیلئے ہے جس نے اپنے بندے علاء الدین پر راہ کی مشکلیں آسان کیں۔“ علاء الدین اپنے چاروں سپہ سالاروں اور حضرت امیر خسروؒ کے درمیان کھڑا تھا۔ خالق کائنات کی تعریف و ستائش کے بعد سلطان نے ایک متجین پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر چند گز پیچھے ہٹ کر اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

دوسرے ہی لمحے راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں نے خوفناک دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ قلعے کی دیواروں میں ہلکے ہلکے شکاف پڑنے لگے تھے۔ ہر طرف ایک ہنگامہ سا رہا تھا۔ چوڑے فوجیوں نے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار ایسے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں جو ان کیلئے ناقابل فہم تھے۔ دشمن ان سے بہت دور تھا مگر اس کے حملے کی ضرب انہیں اپنے سروں کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دور تک تو یہ سنا جاتی بھی علاء الدین کی جنگی حکمت عملی کو سمجھنے سے عاجز رہا۔ وہ بدحواس انسانوں کی طرح ٹٹلی اور جنوبی فسیلوں پر دوڑتا رہا۔ پھر کہیں جا کر یہ راز کھلا کہ سلطان کے سپاہی قلعہ پر سنگباری کر رہے ہیں۔

علاء الدین نے اپنا تینا مورچہ مشرق کی جانب قائم کیا تھا اور پھر اس نے اپنے نشانہ بازوں کو حکم دیا تھا کہ پہلے قلعے کی جنوبی فسیل کو مسمار کر دیا جائے اس لئے شاہی منجیقوں کا ہدف قلعے کی وہ دیوار تھی جس کے ٹوٹ جانے پر راجپوتوں کی محفوظ پناہ گاہ میں داخل ہونے کا راستہ بھی کھل جاتا اور چھ ماہ تک برداشت کی جانے والی اذیتوں کا دوا بھی ہو جاتا۔ سلطان کے ماہر نشانہ باز مسلسل پتھر برسارے تھے مگر قلعے کی دیواریں ابھی تک محفوظ تھیں ان میں کیس کیس رہنے پیدا ہو رہے تھے جو راجہ رتن سنگھ کیلئے زیادہ نقصان دہ نہیں تھے۔ ہری سنگھ نے کئی دن تک اس صورت حال کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور پھر مطمئن لہجے میں راجہ رتن سنگھ سے کہا تھا۔

”سرراٹ! یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ دشمن کی سب سے زیادہ خوفناک چال بھی ناکام ہو گئی۔ سلطان کا خیال تھا کہ اس کے بھٹکے ہوئے پتھر قلعے کی دیواروں میں شکاف ڈال دیں گے مگر اسے دیواروں کی ساخت اور مضبوطی کا اندازہ نہیں تھا۔ پتھر دیواروں پر اثر انداز تو ہو رہے ہیں مگر اس طرح نہیں کہ وہ ہماری فسیلوں کو توڑ سکیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر سلطان ایک سال تک بھی اسی طرح سنگباری کرتا رہے تو چوڑے قلعے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

راجہ رتن سنگھ کے چہرے پر ہلکی ہلکی خوشی کا عکس ابھرنے لگا تھا۔ ”ہری سنگھ! میں اب تک نہیں سمجھتا کہ یہ کونسا جنگی ہتھیار ہے جس کے ذریعہ دشمن ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ کو مندم کر دیتا چاہتا ہے۔“

ہری سنگھ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے لہجے میں کہنے لگا۔ ”سرراٹ! میں نے اپنے لوگوں سے سنا ہے کہ یہ قلعہ دشمن ہتھیاروں میں سب سے زیادہ موثر اور خوفناک ہتھیار ہے اسی کے ذریعے مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم نے دیبل کا قلعہ فتح کیا تھا۔“

”جب دیبل کا قلعہ فتح ہو سکتا ہے تو پھر چوڑے.....“ راجہ رتن سنگھ کے اعصاب پر ایک بار پھر شدید دھواں طاری ہو گئی تھی۔

ہری سنگھ نے فوراً اپنا لہجہ بدل ڈالا۔ ”دیبل اور چوڑے قلعوں کی ساخت میں بڑا فرق ہے اور پھر علاء الدین کے قلعہ دشمن آلات بھی اتنے طاقتور نہیں کہ وہ ہماری فسیلوں کو مسمار کر سکیں۔“

راجہ رتن سنگھ مطمئن ہو گیا اور ہری سنگھ کی وہ بے چینی بھی ختم ہو گئی جس نے چھ مہینے سے اس کی نیندیں ادا کر رکھی تھیں۔

☆.....☆.....☆

چار پانچ دن تک سنگباری ہوتی رہی مگر علاء الدین کے نشانہ باز خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اس دوران سلطان نے قلعے کی کٹائی فسیل کو بھی ہدف بنانے کا حکم جاری کر دیا تھا لیکن یہاں بھی ورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پتھر فسیل تک پہنچتے تھے اور دیوار پر معمولی اثرات چھوڑ کر اپنی لمبی قوت سے محروم ہو جاتے تھے۔ قلعے کے دونوں جانب دیواروں کے نیچے پتھروں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا اور ابھرتے ہی پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ دشمن کو اپنی جس حکمت عملی پر باز تھا وہ بہت تیزی سے ناکامی کی رف پڑھتی جا رہی تھی۔ جب علاء الدین کو یہ خبر دی گئی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنے نشانہ بازوں کے سردار ہشام اسدی کو خیمے میں طلب کر لیا جہاں ملک نصرت خان، خواجہ حاجی، تاج الدین رائی اور ملک ظفر خان پہلے سے موجود تھے۔ ہشام اسدی رسم تعظیم بجالایا اور پھر زمین سے اٹھ کر دست نہ بکڑا ہوا گیا۔

”ہشام! کیا تیرے شاگردوں کی بینائی کم ہونے کے سبب نشانہ باز خطا کر گئے یا ان کے بازوؤں کی طاقت کم ہو گئی۔“ علاء الدین کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار تھا۔

”جب تک سلطان معظم کی بلند اقبالی کا سورج نصف النہار پر چمک رہا ہے غلاموں کے نشانے کبھی غلط نہیں ہوں گے اور ان کے بازوؤں کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔“ ہشام اسدی نے سینے پر ہاتھوں ہاتھ باندھ کر گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔ ہشام اسدی ایک طویل القامت عرب تھا جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ہندوستان آیا تھا اسے تیرا اندازے کی فن میں بے مثال مہارت حاصل تھی۔ مگر جس صلاحیت نے اسے سلطانی لشکر میں سر بلند کیا تھا وہ منجیق چلانے کا غیر معمولی ہنر تھا۔ پتھر پتھر کٹائی سے پہلے علاء الدین نے ہشام اسدی سے طویل مشورہ کیا تھا۔

”پتھر قلعے کی دیواریں ابھی تک اپنی بنیاد پر کیوں قائم ہیں؟“ علاء الدین نے قدرے ناگوار لہجے میں لہجہ سے ہمارے سامنے سجدہ ریز کیوں نہیں ہوتیں؟ یقیناً تیرا نشانہ غلط ہے یا پھر تیرے ہاتھ شل ہو گئے۔“

ہشام اسدی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

فی یام سے غلطی سرزد ہوئی ہے کہ ہم نے نامناسب جگہ پر مورچہ بندی کی۔ اس طرح منجیقوں اور پتھر دیواروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔“ علاء الدین نے ہشام کو خاموش پا کر کہا۔

”سلطان معظم کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔“ ہشام نے گردن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے

آلات جنگ اور ہدف کے درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ مناسب ہے، ہم اس سے آگے پروا ڈال بھی نہیں سکتے تھے۔“

”پھر یہ ناکامی کس لئے؟“ علاء الدین نے جھنجھلا کر کہا۔

”غلام نے روانگی سے پہلے عرض کر دیا تھا کہ چوڑے کے محاذ پر قلعہ شکنی کیلئے ہمیں ”آتش فشاں“ کی ضرورت ہوگی۔“ ہشام اسدی نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ”آتش فشاں“ علاء الدین خلیجی کے اسلحہ خانے میں سب سے بڑی اور طاقتور مینینج تھا۔ ہم اس کا مقابلہ اس مینینج سے کر سکتے ہیں جسے تاجی بن یوسف نے محمد بن قاسم کے ہمراہ سندھ پر حملے کیلئے بحری راستے سے روانہ کیا تھا۔ اس مینینج کا نام ”عروسک“ تھا جسے پانچ سو آدمی کھینچتے تھے۔ ”عروسک“ ہی کے ذریعے محمد بن قاسم نے ذہیل (سندھ) کے مضبوط ترین قلعے میں شگاف ڈال کر دشمن پر تارخ ساز برتری حاصل کی تھی۔ علاء الدین خلیجی کے پاس بھی ایک ایسی ہی مینینج تھی جسے اس نے ”آتش فشاں“ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ ”آتش فشاں“ کو بھی کم و بیش پانچ سو طاقتور سپاہی کھینچتے تھے۔ جب سلطانی لشکر دہلی سے روانہ ہوا تھا اس وقت ہشام اسدی نے تجویز پیش کی تھی کہ اس حملے میں ”آتش فشاں“ کی غیر معمولی قوت سے کام لیا جائے مگر علاء الدین نے یہ کہہ کر ہشام کی تجویز مسترد کر دی تھی۔

”ہم ایک ایسے علاقے میں جا رہے ہیں جہاں کی ہر شے ہمارے لئے اجنبی ہے۔ چوڑے کی زمین بھی پر اسراریت کے پردوں میں لپیٹی ہوئی ہے اور محاذ جنگ بھی اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر موسم نام سازگار ثابت ہوا اور قسمت نے یادری نہیں کی تو یہ طویل سفر بہت اذیت ناک ثابت ہوگا۔ ایسے ہی ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے موثر ترین ہتھیار کو کوئی نقصان پہنچے اور ہم اپنا بہترین جنگی سرمایہ برباد کر کے ناکام ونامراد واپس چلے آئیں۔“

ہشام اسدی اپنے شاہ کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا کہ علاء الدین مرد میدان تھا اور اس کی ذہانت نے بے شمار معرکے سر کئے تھے۔ پھر بھی ہشام کے دل میں ایک خلش سی تھی اور وہ سوچا کرتا تھا کہ کاش سلطان اس ہولناک جنگی مہم میں ”آتش فشاں“ کو اپنے ہمراہ لے چلیں۔ علاء الدین کے ذہن میں صرف قلعہ چوڑے کی اونچائی بنیادی اہمیت رکھتی تھی اور اس کے توڑ کیلئے اس نے قلعے کے مقابل مصنوعی پہاڑی قائم کرنے کا منصوبہ پہلے ہی تیار کر لیا تھا اور یہ وہ منصوبہ تھا جس کے ذریعے سلطان اپنے کئی دشمنوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر چکا تھا۔ اپنی اسی حکمت عملی کو وہ چوڑے میں بھی بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ علاء الدین کے خیال میں پہاڑی مورچے کی تعمیر کے بعد ”آتش فشاں“ جیسی طاقتور مینینج کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ ماضی کے تجربات کی روشنی میں چوڑے کی فصیلوں کو مسمار کرنے کیلئے ہلکی مینینجیں ہی کافی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان کے پیش نظر یہ دشواری بھی تھی کہ آتش فشاں جیسی مینینج کو ایک بلند پہاڑی پر کھینچ کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سخت مرحلے میں آتش فشاں کی سہاگت کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ان ہی نزاکتوں اور مصلحتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کئی ہلکی مینینجوں کا انتخاب کیا تھا اور پھر ہشام اسدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے لوہے کی اس طویل و عریض گاڑی پر نہیں تیرے نشانے اعتماد ہے ہشام! مینینج ہلکی ہو یا بھاری میں تیری ذہانت، تیری بینائی اور تیرے بازوؤں کی طاقت پر یقین رکھتا ہوں۔“

فرمانروائے ہند کی زبان سے اپنی تحریف سن کر ہشام اسدی بہت خوش ہوا تھا مگر پھر بھی اس نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور چلتے چلتے آتش فشاں کا فم اہل تلاش کر لیا تھا۔

”ہاں! ہشام! ہمیں یاد آیا تو نے آتش فشاں کے بارے میں کہا تھا۔“ علاء الدین کے چہرے پر اسی کی ایک تیز لہر ابھر کر ڈوب گئی۔ پھر اس نے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا۔ ”ملک! دہلی سے چوڑے کا پہلے کم سے کم کتنے وقت میں ملے کیا جاسکتا ہے؟“

”ملک نصرت خان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”ایک تھما سوار تو فاصلوں کو امکانی حد تک کم کر سکتا ہے مگر ”آتش فشاں“ کا سفر بہت سست رفتار ہوگا۔ ایک ماہ سے کم مدت میں شاید ہم اپنے اس ڈھنگ ہتھیار کو چوڑے کے محاذ تک نہ پہنچا سکیں۔“

”پھر ایک طویل عرصے تک ہمیں اپنی بیلخار کو روکنا ہوگا۔“ علاء الدین پریشان تھا۔

”نہیں! سلطان ذی وقار! آپ کی مختصر رائیگاں نہیں جائیں گی۔“ ملک نصرت خان کے بجائے ہشام اسدی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ دو دن تک سنگباری کو ملتوی کرنا ہوگا۔“

ہشام اسدی نے بڑی عجیب بات کہی تھی۔ سلطان کے ساتھ تمام سپہ سالار بھی چونک اٹھے۔ ”دو دن تک؟“

”کی؟“ تیری بات ناقابل فہم ہے ہشام۔“ علاء الدین نے کہا۔

”غلام ”آتش فشاں“ کے بغیر وہ کارکردگی تو نہیں دہرا سکتا مگر تین دن کے اندر چوڑے کی فصیلیں محفوظ نہیں رہیں گی۔“

”یہ کوئی دعویٰ ہے ہشام؟“ سلطان نے پر جلال آواز میں کہا۔

”دعویٰ نہیں، غلام کا انداز خدمت گزارا۔“ ہشام اسدی آگے بڑھ کر زمین بوس ہو گیا۔

”اٹھو ہشام! علاء الدین نے اپنے پیروں کو جنبش دی۔ ”اگر تین دن کے اندر قلعے کی فصیلیں ہمارے آگے سجدہ ریز نہیں ہوں تو پھر اپنی سزا تو خود ہی تجویز کر لے۔“

”غلام کے جسم و جاں شاہ کی امانت ہیں۔“ ہشام اسدی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر تین دن میں شاہ کے چہرے اور ہاتھوں کا رونا کھڑا ہو گیا تھا۔

”اگر تو نے ہمیں آتش فشاں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تو ہم تجھے زرو جواہر میں تول دیں گے ہشام۔“

ہشام اسدی نے ایک بار پھر سر جھکا دیا۔ ”غلام نے احتیاط کے پیش نظر آہن گر سے کچھ پرزے ڈھولائے تھے جو اپنی طاقت میں آتش فشاں کے برابر ہیں۔ میں ان آلات کو چھوٹی مینینج میں نصب کر کے اپنے شاہ کے نام پر نیا تجربہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدائے ذوالجلال سلطان کی بلند اقبالی کے مدد سے میں میری اس تدبیر کو ناکامی سے دوچار نہیں کرے گا۔“

☆ ☆ ☆

ہشام اسدی ایک مینینج میں نئے آلات نصب کر رہا تھا۔ یہ مینینج اپنی ظاہری ساخت میں ”آتش فشاں“ سے نصف تھی مگر ہشام اسدی ایک نیا تجربہ کر کے اسے آتش فشاں کے ہم پلہ بنانا چاہتا تھا۔ اس دوران سنگباری روک دی گئی۔ شاہی فوج کی مصلحت آمیز خاموشی نے براہِ رن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ سپہ سالار ہری سنگھ کے قائم کردہ اندازوں کی بہت زیادہ تحریف کی گئی۔

”یقیناً سمرات! ایشور نے میری ماتر بھومی کو بچالیا اور راجپوتوں کی آن کو آہو کی چوٹیوں کی طرح بلند رکھا۔“

دُرگاکا لازوال شہنشاہ نے علاء الدین کی ساری طاقت اسی کے منہ پر الٹ دی۔ دشمن نے بڑی عجیب

ہرے ہو کر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ غریب تمہاری آوازیں گھٹ جائیں گی اور خوشی کے یہ راگ موت کی راگینوں میں بدل جائیں گے پھر تمہیں احساس ہو گا کہ رام دیو کون تھا اور چوڑ کو اس کی کتنی ضرورت تھی۔ ”یہ کہہ کر رام دیو نے زمین پر گھٹنی ہوئی چادر کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور شدید غصے کے عالم میں آٹھریں طرف واپس جانے لگا۔

تمام لوگ خاموش تھے مگر ایک آواز اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر رہی تھی اور یہ آواز سینا پتی ہری سنگھ کی تھی جو رام دیو کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”مہاراج! اس قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کو اپنے منتر مبارک اور چوڑ کے بسنے والوں کو ان کی یہ کڑی آزمائش مبارک۔ وہ اپنے سکھ دکھ خود بن لے گی اور اسے کسی دیوتا مانا انسان کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔“

راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی کے چہروں پر بے اندازہ خوشیاں رقص کر رہی تھیں اور مہر گا کے پجاری اس خیال سے دیوانہ وار ناچ رہے تھے کہ سلطان علاء الدین خلجی کو اس کے منصوبوں میں ناکامی ہو چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

سنگ باری دوسرے دن بھی بند رہی ہشام اسدی ایک چھوٹی مہینہ میں بڑے آلات نصب کر رہا تھا اور اسے اردوں میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ علاء الدین خلجی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا ہشام کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور فکر و پریشانی کے احساس نے اس کے چوڑے ماتھے پر کئی سولہاں ڈال دی تھیں۔ سلطان نے اپنے باہر نشانہ بازوں کے سربراہ کو ایک نظر دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں کہا۔ ”ہشام! دو دن گزر چکے ہیں اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ سلطان غلاب معمول نرم آواز میں بول رہا تھا۔ اسے بھی ہشام اسدی کے ذہنی اضطراب کا اندازہ تھا۔

ہشام نے سر جھکا دیا۔ ”غلام اپنے شاہ کو ایک ایک لمحے کا حساب پیش کرے گا۔“

”اور تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے کہ ہم بھی ایک ایک ساعت کا حساب رکھتے ہیں۔“ اس بار علاء الدین نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

”سلطان والا جہنم! چوڑ اور اس کی تباہی کے درمیان بس ایک رات کا پردہ حائل ہے۔“ ہشام اسدی بڑھاپا اس کے بستے ہوئے پسینے نے شاہی خیمے کے فرش کو بھگودیا تھا۔

”کل صبح کا سورج کیاطلع ہو گا“ سلطان کا جلال نمودار ہو گا اور پھر اس کی حرارت سے یہ پردہ بھی جل جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ سلطان نے اپنا دایاں ہاتھ واز کر دیا۔

ہشام اسدی پیچھے ہٹا اور اگلے قدموں چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔

دورات ہشام اسدی نے مہینے اور سننے آلات سے لڑتے ہوئے گزار دی۔ شب کے پچھلے پہر وہ اپنے عہد میں کامیاب ہو گیا۔ ہشام نے اطمینان کی سانس لی اور قلعے کے صمدروں کی طرف دیکھا، قلعے کے صمدروں کو ایک سرخ قندیل سی روشن تھی۔ یہ ستارہ مرخ تھا جو صبح کے وقت طلوع ہوا تھا۔ اس کی سرخ لاش ایک عجیب سامنظر پیش کر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مرخ کے سینے سے شعاعیں نہیں، آگ نکل رہی ہو۔

☆ ☆ ☆

کچھ دیر بعد ہشام اسدی نے نماز فجر ادا کی اور سجدے میں سر رکھ دیا۔ ”اے لازوال قوتوں والے! اپنے

چال چلی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ چوڑ کی رکشا ہزاروں دیوتا کر رہے ہیں۔“

”کیا وہ آگے بڑھ کر نیا مورچہ قائم کر سکتا ہے؟“ راجہ رتن سنگھ کے ذہن میں اچانک نیا خیال ابھر آیا تھا۔

”اگر علاء الدین نے نیا مورچہ قائم کیا تو اس کی تکمیل میں کئی ماہ لگ جائیں گے۔“ ہری سنگھ نے بے نیازانہ کہا۔ ”دشمن کو بے گھری کے آزار اٹھاتے اٹھاتے زمانہ گزر گیا ہے۔ اگر محاصرے نے مزید طول کھینچا تو علاء الدین کے سپاہیوں میں بددی پھیل جائے گی اور پھر مہر کی بیزاری ہماری فتح کا سبب بنے گی۔“

ہری سنگھ کی یقین دہانی کے بعد راجپوت مطمئن ہو گئے اور مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی نے دُور گاکے قدموں پر سر رکھ کر اپنی دیوی کا شکریہ ادا کیا۔ خود ہری سنگھ بھی اس پوجا میں شریک تھا۔ ابھی مسرتوں کا یہ جشن جاری تھا کہ یکایک جادو گر رام دیو مندر میں داخل ہوا۔

”سنو! اے اسکان چوڑ سنو! تم نے مجھے اس طرح حنا دیا کہ جیسے میں کوئی حرف غلط تھا۔“ رام دیو کے انداز مخاطب نے درگاہ کی پوجا کرنے والے تمام لوگوں کو سسکت کر دیا۔ راجہ رتن سنگھ اور رانی پد منی نے گہرا کر سیاہ قام جادو گر کی طرف دیکھا۔ غصے کی آگ نے رام دیو کے چہرے کی سیاہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ ”سراٹ! تم نے بھی اپنے مہاراج کو نظر انداز کر دیا۔“ رام دیو، رتن سنگھ سے مخاطب ہو گیا۔

”جب سپاہی سے تلوار اور گیلی سے اس کا گلیاں چھن جاتا ہے تو پھر دونوں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔“ راجہ رتن سنگھ کا لہجہ بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی۔

رام دیو کی سرخ آنکھیں ابل پڑیں مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ پد منی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اور مہاراج! تم بھی موسم کی طرح بدل گئیں نہ تمہارے چہرے پر عقیدت کا کوئی عکس ابھر اور نہ تمہارے ہاتھ مہاراج کے قدموں کی طرف بڑھے۔ یہ کیسا انقلاب آگیا؟ اور کیا تمہارے جنموں نے کوئی نیا دیوتا تراش لیا؟“

پد منی چند لمحوں کیلئے پریشان سی نظر آئی مگر پھر اس کے تصور بھی بدل گئے۔ ”دیوتا اس وقت تک دیوتا ہے جب تک اس کی شکستیاں برقرار ہیں اور جس دن یہ شکستیاں زائل ہوئیں، وہ دیوتا نہیں، ایک بے جان پتھر بن جاتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے رانی پد منی کھڑی ہو گئی۔ جوش جذبات سے اس کا چہرہ گھٹا نظر آ رہا تھا۔ ”مہاراج! مجھے یہ کیا شکایت کرتے ہیں۔ میری عقیدتوں نے تو آپ کو چوڑ کی دھرتی سے اٹھا کر آکاش تک پہنچا دیا تھا مگر آپ ہی اس قابل نہ تھے کہ ان بلند پیوں اور عظمتوں کو برداشت کر سکتے۔“

”میں اس قابل نہ تھا؟“ رام دیو ایک عورت کی طعنہ زنی برداشت نہ کر سکا۔ ”مہاراج! وہ میں ہوں جس نے چوڑ کو چوڑ بنایا۔“

”مہاراج اب ان باتوں کا وقت گزر چکا۔“ رانی پد منی نے رام دیو کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ”جب چوڑ پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اس وقت آپ مدرا (شراب) سے دل بہلا رہے تھے۔“ رانی پد منی آپ سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ ایک سرکش اور جذباتی عورت تھی جب تک رام دیو کی ساحرانہ قوتوں کے زیر اثر ہی اسے دیوتا سمجھ کر پوجا کرتی رہی مگر جیسے ہی رام دیو کی شعبہ بازیاں بے نتیجہ ثابت ہوئیں، اس نے ایک لمحہ غائب کئے بغیر ہمہ موز لیا۔

رام دیو نے آج تک اتنی اونچی آواز اور اس قدر برہم لہجہ نہیں سنا تھا۔ وہ جوش غضب میں کانپنے لگا۔

”آج میں اس دھرتی کا تاجدار ہو جہن گیا ہوں؟ سنو! اے چوڑ کے پاسیو! سنو! تمہاری یہ خوشیاں؟ عارضی ہیں، مسرتوں کا یہ جشن بہت ناپائیدار ہے۔ تم مشغولہ (ناتوس) کی لے پڑے خواب اور

”اپنے فن پر نہیں، سلطان کی بلند اقبالی پر۔“ ہشام اسدی کی گردن خم ہو گئی۔
اس کے بعد سلطان نے ہشام سے کچھ نہیں پوچھا اپنے سپہ سالاروں کو طلب کیا اور پہاڑی کے اس حصے
پر لڑ جانے لگا جہاں نے آلات کے ساتھ جینیق نصب کی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”ہی ہے تیری ذہانت کا کارنامہ؟“ سلطان نے جینیق پر ہاتھ رکھا اور مڑ کر ہشام اسدی کی جانب
دیکھا سپہ سالاروں کے پیچھے خاموش کھڑا۔ ”ہشام! آگے بڑھ اور ثابت کر کہ سلطان کی نظریں
انہوں کے انتخاب میں کبھی دھوکا نہیں کھاتیں۔“

ہشام اسدی سر جھکائے ہوئے آگے بڑھا۔ پھر اس نے علاء الدین کے سامنے جھک کر رسم تعظیم ادا کی
اور ایک نظر حضرت امیر خسروؒ کی طرف دیکھا۔ ہشام کی آنکھوں میں التجا تھی کہ امیر اس کی کامیابی کیلئے دعا
لے۔ خسروؒ نے اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کر دیا کہ اس کا شمار بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے
لاموں میں ہوتا ہے اور حضرت شیخ کا کوئی غلام بھی حلقہٴ سعادت سے دور نہیں ہوتا چاہے وہ دنیا کے کسی بعید
زمن گوشتے میں آباد ہو۔

ہشام اسدی نے اپنے معاون نشانہ بازوں کو کچھ ہدایات دیں اور پھر جینیق کی چرخی اتنی تیزی سے گردش
رہنے لگی کہ اس کی آواز پر طوفانی ہوا کے شور کا گمان ہوتا تھا۔ علاء الدین خلیجی اور تمام سپہ سالار حیرت
میں مل کر کود کھڑے تھے۔ اچانک ہشام اسدی اپنے دائیں جانب جھکا اور جینیق کی کمائی کو پوری قوت سے
لیچا۔ دوسرے لمحے ہی سلطان نے دیکھا کہ چند بھاری پتھر دشمن کی فسیل کی جانب پرواز کر رہے تھے۔ یہ فتح
کے قصہ میں ڈوبی ہوئی بڑی خوشگوار ساعتیں تھیں مگر ان ساعتوں کا تاثر اس وقت زائل ہو گیا جب پتھر فسیل
پر پڑنے پہنچے جان ہو گئے تھے۔ پتھروں نے قلعے کی دیوار کو چھو لیا لیکن اس طرح جیسے تلواریں کا کوئی شدید
اوردشمن کے لباس کو کاٹتا ہوا گزر جائے اور اس کا جسم محفوظ رہے اپنے وار کی ناکامی پر ہشام سنائے میں
ایلا۔

”یہ کیا ہوا ہشام؟“ سلطان نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”اس سے زیادہ موثر تو پہلی سنگباری تھی۔“
ہشام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جھک کر پہاڑی کی اس سطح کا جائزہ لینے لگا جس پر جینیق نصب کی گئی
تھی۔ احساس ناکامی نے ایک بار پھر ہشام کے پورے جسم کو پسینے میں ڈبو دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک نئے آلات کو
چناتھوں سے چھو کر دیکھتا رہا پھر اس نے معاون نشانہ بازوں کو ہدایت دی کہ جینیق کا ایک پایہ کم کر کے
ان کی گردش کو تیز کر دیا جائے۔

سلطان کے جاں نثاروں کے بازو اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ حرکت کر رہے تھے مگر ہر شخص اپنی جگہ
پر جم کر کھڑا تھا۔ ہشام اسدی اپنے سلطان اور سپہ سالاروں کے احساس سے بے خبر کبھی فسیل کی جانب
دیکھ کر کبھی جینیق کی طرف۔ پھر جب چرخی کی گردش سے پیدا ہونے والی آوازیں نے فضا میں ایک عجیب
بھڑ بھڑ پکارتی ہوئی تیزی سے جھکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے کمائی کو کھینچ لیا۔ موت کا دھانہ کھلا اور
ان کے منہ پر تھروں کی شکل میں دشمن کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ سلطان بڑی حیرت سے پتھروں کی
بارش دیکھ رہا تھا۔ اسے ہشام کی کامیابیوں کی زیادہ امید نہیں تھی مگر ایک خوفناک دھماکے نے علاء الدین
کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ پھر اسی قوت کے ساتھ اپنے ہدف سے ٹکرائے تھے جسے ہشام اسدی حاصل کرنا
چاہتا تھا۔ اس تصادم سے پیدا ہونے والا دھماکہ اتنا پر شور تھا کہ اس کی آواز سلطان نے بھی سنی۔
تھمٹھمٹھ میں دوبارہ پتھر رگڑے گئے اور نشانہ باندھا گیا۔ اب کی مرتبہ بھی ہشام اسدی نے اسی طاقت سے کمائی

حقیر ترین بندے ہشام کی آبرور کہ کہ وہ تیرے کرم کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ ”پھر سورج طلوع
ہونے سے پہلے ہشام اسدی دبے پاؤں حضرت امیر خسروؒ کے خیمے میں داخل ہوا اس وقت امیر غازیؒ نے غریب
فارغ ہو چکے تھے اور دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے گریہ و زاری کر رہے تھے۔ خسروؒ کی آنکھیں بند تھیں اور
صرف ہونٹ لرز رہے تھے۔ یہ تو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ خسروؒ کی دعا مانگ رہے تھے لیکن ہشام کو یقین تھا کہ
اس عالم میں خسروؒ لشکر اسلام کی سر بلندی کے سوا کوئی دوسری دعا مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔ ہشام اسدی اپنی
سانسیں روکے، سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ اس طرح سینے پر بندھے ہوئے تھے جیسے وہ علاء الدین
خلجی کی بارگاہِ ادب میں کھڑا ہو۔

امیر خسروؒ کی دعا ختم ہوئی اور جب آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہشام اسدی کو سامنے کھڑا پایا۔
”ہشام! تم میرا؟“ حضرت امیر خسروؒ نے سلطنت خلیجی کے بے مثال جانناز کو پکارا۔
ہشام اسدی آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ پھر اس نے امیر کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے
کہا۔ ”امیر! میں آپ کی خصوصی دعاؤں کا طالب ہوں۔ وہ دعائیں جنہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے
آستانہٴ پاک سے نسبت ہے۔“

”ہشام! تم میرے حلقہٴ دعا سے دور نہیں ہوئے امیر خسروؒ نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔
”نہیں! امیر! اس طرح نہیں کہ میں عام حلقہٴ دعائیں شامل کر لیا جاؤں۔“ ہشام اچانک رونے لگا تھا۔
”یہ غلام ہمیشہ سے آپ کی دعاؤں کا طالب رہا مگر آج جس قدر محتاج ہے اس کا اندازہ صرف آپ
کر سکتے ہیں۔ امیر! اہل دنیا کو کیا خبر کہ ہشام اسدی کس آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا ہے؟“
”میں جانتا ہوں ہشام! میں جانتا ہوں۔“ امیر خسروؒ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔

”تو پھر میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ہاتھ ہے۔“
ہشام اسدی کے آنسو کچھ اور بھی تیز ہو گئے تھے۔
”نہیں ہشام! یہ ممکن نہیں۔“ امیر خسروؒ بہت زیادہ مضطرب نظر آنے لگے۔ ”ایک مجبور غلام
ہاتھ کو کسی با اختیار شہنشاہ کے دست مبارک سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔“

”ان ہاتھوں نے اس شہنشاہ کے قدم تو چھوئے ہیں میں اسی نسبت اور شرف کی بات کر رہا ہوں۔“
ہشام اسدی جیسا مرد شجاع بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ”امیر! اسی حوالے سے میرے لئے دعا کیجئے میں دنیا
نظروں سے چھپ کر آپ کی بارگاہ میں آیا ہوں۔ میرے جسم پر سلطان کی حکومت ہے مگر میرے دل اور
روح کے تاجدار آپ ہیں۔ امیر! میری مجبوریوں کی طرف نہیں، میرے دل کی جانب نگاہ کیجئے۔“
حضرت امیر خسروؒ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتے رہے۔ پھر آپ نے ہشام اسدی کے سر پر اپنا ہاتھ
رکھ دیا۔ ”خدا انجھے ہمیشہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے سامنے میں رکھے۔“

ہشام اسدی نے امیر خسروؒ کو آخری بوسہ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں مطمئن ہوں امیر! اپنی زندگانی
سے بھی مطمئن اور موت سے بھی راضی۔“

یہ کہہ کر ہشام اسدی، امیر خسروؒ کے خیمے سے باہر نکلا اور تیز رفتاری کے ساتھ علاء الدین کے خیمے
طرف ہونے لگا۔ محافظوں نے سلطان کو ہشام کی آمد سے خبردار کیا۔ علاء الدین نے فوراً اسی سے خیمہ
طلب کر لیا۔ ”غلام کی خواہش ہے کہ شاہ اپنے مبارک ہاتھوں سے قلعہ شکنی کی اس تقریب کا افتتاح
کریں۔“ ہشام اسدی کا ہجرت زیادہ پر اعتماد تھا۔
”تجھے اپنے کمال و فن پر اتنا یقین ہے ہشام؟“ سلطان نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کھینچی تھی اور چند لمحے گزرتے ہی اسی انداز کا دوسرا خوفناک دھماکہ سنائی دیا تھا۔

”آفرین! ہشام! آفرین!“ سلطان کی آواز سنائی دی مگر ہشام نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

جن نشانہ بازوں نے دوبار چرخی کو گردش دی تھی، انہیں روک دیا گیا تھا اب تازہ دم سپاہی اپنے بازوؤں کی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پھر تیسری بار پتھروں نے فسیل کو چھو اتواس میں ایک خلاء نمایاں ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہشام کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ دیوانہ وار جھک گیا ہشام اسدی سجدہ شکر ادا کر رہا تھا اور شدید اضطراب کے عالم میں ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہا تھا۔

”تیری قدرت لازوال کی قسم! تو اپنے نام لبواؤں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔“

سلطان کے لشکر میں ایک جہان خیز خوشی رقص کر رہی تھی۔ خود سلطان بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے خم ہو کر ہشام اسدی کو اٹھالیا۔ ملک نصرت خان، خواجہ حامی، ملک ظفر خان اور تاج الدین عراقی بھی ہشام کے گرد دھڑکتے آئے تھے۔ علاء الدین خلجی ہشام کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔

”ہشام! خدا ان ہاتھوں میں اور آگ بھردے کہ یہ ہاتھ تو تیرے سلطان کے ہاتھ ہیں۔ تو نے فساد کو پھرتے توڑ دیا اور مجھے ان بات پرستوں کے سامنے رسوا ہونے سے بچالیا۔ لوگ کہتے تھے کہ علاء الدین مجھوں ہے، وحشی ہے، اس کی عقل کو زنگ لگ گیا ہے اور اس کی آنکھیں پاگلوں کے سے خواب دیکھتی ہیں۔ مگر تو نے میرے خواب کی تعبیر پیش کر دی ہشام! زندہ اور روشن تعبیر جسے جھٹلانے والا کوئی نہیں۔ خدا تعالیٰ وہ قوم کی قسم! کوئی نہیں کوئی نہیں۔“

ہشام اسدی زار و قطار رو رہا تھا۔

”مرحبا ہشام! مرحبا! خدا تیری عمر دراز کرے۔“ سلطان کی پر جلال آواز گونج رہی تھی اور قلعہ چوڑا کی جنوبی فسیل کا شگاف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

دودن کی مکمل خاموشی کے بعد جو حشر اٹھا تھا اس نے کچھ دیر کیلئے راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں سے قوت گویائی چھین لی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور بیٹاپتی ہری سنگھ ان کے درمیان اپنے آپ کو ایک بڑا مجرم سمجھ رہا تھا۔ آخر رتن سنگھ نے اس تکلیف دہ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”ہری سنگھ! مسلمانوں کا یہ حملہ تمہارے تمام تر فوجی تجربات کی نفی کر رہا ہے۔“ راجپوت سرات کے لیے میں ساری دنیا کی تلخیاں گھل گئی تھیں۔ ”تمہاری ایک غلطی اہل چوڑا کو اتنی مہلت ہو نہیں دے گی کہ اپنی آرزوؤں کا کام ہی کر سکیں۔“

ہری سنگھ پشیمان تھا مگر اس قدر سنگین الزام تراشی برداشت نہ کر سکا۔ ”سرات! میں نے ایک انداز قائم کیا تھا۔ راجپوت قوم کو لوریاں نہیں سنائی تھیں کہ وہ اپنے نرم بستروں پر سوجائے اور موت کے کاغذ کو کھلا چھوڑ دے۔“

راجہ رتن سنگھ نے اس کے کسی عذر کو قبول نہیں کیا۔ ”مہاراج رام دیو درست کہتے تھے کہ یہ طوائف دوبارہ کروٹ لے گا۔“ راجپوت سرات شدید غضب میں کھڑا ہو گیا۔ ”ہری سنگھ! تو نے تو ہمیں اس قدر بھی نہیں چھوڑا کہ ہم اپنے کھیلوں بار کو پکار سکیں۔“ راجہ رتن سنگھ کا اشارہ رام دیو کی طرف تھا۔ ”آپ اس نکتے جا دو گر کو مد کیلئے آواز دیں، میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ہری سنگھ

کہہ اہوا۔ ”اب مجھے اس کی پروا نہیں کہ خود ساختہ عظمت کے گیت گانے والی قوم نے میرے جذلوں پر اسلحہ دیا؟ ہری سنگھ کے کاندھوں پر ایک سر ہے، اس کا بوجھ کہیں بھی ملکا ہو جائے گا۔“

راجہ رتن سنگھ نفرت آمیز نظروں سے اپنے سپہ سالار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور ہری سنگھ نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ چوڑا حکمران اس کی گستاخ کلامی پر کس تاثر کا اظہار کر رہا ہے۔

”ہری سنگھ کو جانے دیں سرات!“ کئی راجپوت سرداروں نے رتن سنگھ کا غصہ دور کرنے کیلئے نرم باتیں کہیں۔ ”کسی ایک شخص کی غلطیاں شمار کرنے کا وقت نہیں۔ آپ چوڑا کی سلامتی کیلئے جو مناسب ہے اس پر بلانا خیر عمل کر ڈالیں۔ بے شک! ہم نے مہاراج کے سلسلے میں سخت احسان فراموشی کا ارتکاب کیا ہے۔ ان کے گیان نے ہمیں جس حادثے کی خبر دی تھی بالآخر وہ ظاہر ہو کر رہا۔“ راجپوت سردار اپنے خواس کو پچھلے تھے اور اب انہیں تلواروں کے بجائے رام دیو کے منترؤں میں اپنی بقاء نظر آ رہی تھی۔

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک کسی زخمی درد سے کی طرح کمرے میں ٹھٹھارہا اور پھر تمام راجپوت سرداروں کے آشرم میں پہنچ گیا۔

”میں جانتا تھا کہ تمہاری مجبوریاں ایک دن تمہیں میرے دروازے تک کھینچ لائیں گی۔“ رام دیو کے تڑپ پر حقیر آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ ”اب تم لوگوں کیلئے اس آشرم کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔“

رتن سنگھ اور تمام راجپوت سرداروں کے سر نہادمت سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب بہ آواز اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہے تھے۔

”اس طرح نہیں۔“ رام دیو گرجدار آواز میں بولا۔ ”اپنے سرزمین پر رکھ دو اور اس گناہ کی معافی بکرو جسے صرف رام دیو ہی معاف کر سکتا ہے۔“

زنگی کی محبت نے رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں کو پیشانیوں رگڑنے پر مجبور کر دیا۔ پھر کہیں جا کر ایسا اس بات پر آمادہ ہوا کہ وہ علاء الدین کے لشکر میں پھوٹ ڈال کر اسے سوکھے پتوں کی طرح منتشر دے گا۔

رام دیو نے ریاست چوڑا پر آخری احسان کرنے کیلئے اپنے مکروہ ہونٹوں کو جنبش دی۔ ”اگر آج شام سبھی سات مردوں کی راہ فراہم کر دی جائے تو میں دشمن کی فوجوں کا رخ دیہلی کی طرف موڑ دوں۔“ رام دیو نے اپنے طلسم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ پیاریوں کو کوششان گھاٹ بھیج کر جلتے سنگھوں کی راہ حاصل کی جائے میں اس راہ پر رات بھر منتظر رہوں گا اور صبح ہوئے ہی خود سلطان کے لشکر کی طرف جاؤں گا۔ میرے سوا کوئی دوسرا شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ اگر وہ راہ مسلمانوں کے لشکر کو چھڑک دی گئی تو ان کے دل اچاٹ ہو جائیں گے۔ اس راہ کی کسی تاخیر ہوتی ہے کہ جہاں بھی پہنچنے لگیں اور دیکھ لیں کہ یہ راستا بستیوں اور اجڑا جاسی گئی اور شرمشٹانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔“ رام دیو نے عجیب انکشاف کیا تھا۔ جادو گروں کا یہ ایک آزمودہ اور مشہور عمل تھا جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو بھڑکال دیتے تھے اور ہتے ہتے گھر آن کی آن میں ویران ہو جاتے تھے۔

راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سرداروں کے بچتے ہوئے چہرے روشن ہو گئے۔ اس منتر کو خود ان لوگوں کی نگاہیں آزمایا تھا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کیلئے جادو کی اس تخریبی قوت کا سہارا لیا تھا۔

میں ہوئی تو رام دیواس طرح آشرم سے باہر نکلا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پجاریوں کی لائی ہوئی راکھ تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ بوسیدہ کتاب جس کے ایک ورق پر رام دیو نے کوئی عبارت تحریر کی تھی۔ راجہ رتن سنگھ نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیلئے رام دیو کے پاؤں چھوئے اور وہ سیاہ فام جادوگر قلعے سے اٹھ کر نکلا جیسے تنہا سلطان کے لشکر کو فتح کرنے جا رہا ہو۔ رام دیو نے چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی راکھ زمین پر پھینک کر شروع کر دی تھی اور جب وہ سلطان کے سپاہیوں کے قریب پہنچا تو پوری راکھ بھینک کر اس کی بھل میں صرف بوسیدہ کتاب دبی ہوئی تھی۔

”علاء الدین خلجی کا آدمی ہوں۔“ سپاہیوں کے روکنے پر رام دیو نے وضاحت کرتے ہوئے

سلطان کو اطلاع دی گئی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ علاء الدین چوڑے کسی نمائندے سے ملنا نہیں چاہتا تھا بس اسے بتایا گیا کہ آنے والا سلطان کا خدمت گزار ہے تو وہ حقیقت حال جاننے کیلئے مجبور ہو گیا۔ رام دیو کو اپنے نرنے میں لے کر آگے بڑھے اور جب چوڑے کے عظیم گیانی کو سلطان کے روپر پیش کیا تو رام دیو روتے ہوئے جسم کے ساتھ سجدے میں چلا گیا۔

”میں سلطان کے مذہب پر“ سلطان کی فتوحات پر اور سلطان کے جاہ و جلال پر ایمان لایا۔“ رام دیو نے اس حالت میں یہ آواز بلند اقرار کر رہا تھا۔ ”میں بت پرستی سے تائب ہو کر سلطان کے ہاتھ پر اسلام کرنا ہوں۔“

علاء الدین ایک اجنبی شخص کی اس حرکت پر حیران ہو رہا تھا۔ ”تو کون ہے؟“ سلطان نے رام دیو کو سنا کر کہنے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے پہچانتے ہیں اور تو ہم سے قریبی رشتے کا دعویٰ کر رہا ہے۔“ علاء الدین نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ سیاہ فام اجنبی کو اٹھا کر سیدھا کر دیں۔

سلطان کے محافظوں نے رام دیو کو کھینچ کر کھڑا کیا تو اس کی بھل میں دبی ہوئی بوسیدہ کتاب زمین پر پڑ گئی۔

”یہ کیا ہے؟“ سلطان نے اس سرخ کپڑے کے متعلق دریافت کیا جس میں کتاب لپیٹی ہوئی تھی۔

”اس بات کا ثبوت کہ میں آپ کا پجاری ہوں۔“ رام دیو نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”کچھ دیر پہلے تو جوتوں کا پجاری تھا اور اب ہماری پرستش کا اعلان کر رہا ہے۔ تیرے عقائد اس قدر ٹھسے بدلتے ہیں؟“ سلطان کا لہجہ قہر آلود تھا۔ ”کل تو تندرستوں میں گھنٹیاں بجا رہا تھا اور آج جب اسے نئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تو ہمارے سامنے جھک گیا۔ ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ واپس جا اور ان باتوں کے ساتھ اپنا حشر دیکھ جن کی شکست و بربادی کی گھڑیاں گئی جا چکی ہیں۔“

رام دیو نے جھک کر کتاب اٹھائی اور وہ صفحہ الٹ کر سلطان کے سامنے کر دیا جس پر اس نے گزشتہ چند سطریں تحریر کی تھیں۔ ”سلطان میں اپنے سینے میں حسرتوں کا غبار لے کر واپس چلا جاؤں مگر اس بات کو ایک نظر ضرور دیکھ لو جو میرے جذبات کی ترجمان ہے اور جسے زمانے کی آنکھ سے چھپائے ہائے پچاس سال ہو گئے ہیں۔“

علاء الدین نے خسرو کی طرف دیکھا۔ ”امیر! اسے پڑھیں کہ اس بدحواس انسان نے کیا لکھا ہے؟“ امیر خسرو نے اس عبارت پر نگاہ کی جو سنسکرت زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ رام دیو نے اپنے شاگردوں کو اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”ان لوگوں کے نام جو سلامتی چاہتے ہیں، میں رام دیو! اپنے ماننے والوں کو خبردار کرتا ہوں چوڑے

محاصرے کی وجہ سے شمشان گھاٹ کے تمام راستے بند تھے مگر راجہ رتن سنگھ کے حکم پر چند پجاری موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ علاء الدین کے سپاہیوں نے پجاریوں کو روکا لیکن جب سلطان کو اطلاع دی گئی کہ کچھ ہندو اپنی مذہبی رسم ادا کرنے کیلئے شمشان گھاٹ کی طرف جانا چاہتے ہیں تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ پجاری بہت خوش تھے کہ انہیں غیر متوقع طور پر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ شمشان پہنچے تو ان پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہر طرف انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں اور تیز ہوائیں ان آدم زادوں کی راکھ کو اڑائے لے جا رہی تھیں جو سرکش بھی تھے اور نافرمان بھی۔ پجاری پہلے بھی شمشان آئے تھے مگر دہشت سے ان کے دل نہیں دھڑکتے تھے۔ آج انہیں ہر سمت اپنی موت ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس لئے ان کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں اور خوف کی شدت سے آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں۔ سات مردوں کی راکھ سمیٹے سمیٹے پجاریوں کا برا حال ہو گیا تھا اور جب وہ رام دیو کے سامنے پہنچے تو بے محسوس ہوتا تھا جیسے شمشان سے کچھ مروے نکل کر مہاراجہ رام دیو کے آشرم میں داخل ہو گئے ہوں۔

راجہ رتن سنگھ اور راجپوت سردار پجاریوں کی اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ رام دیو بھی دونوں ہاتھ لہرا کر چیخ رہا تھا۔ ”علاء الدین کی آنکھوں پر پڑے پڑ گئے اور اس نے اپنی گردن میرے ہاتھوں میں دیدی۔ اب تم لوگ جاؤ۔ کل صبح تک سلطان کا لشکر بھی اس راکھ کی طرح بکھر جائے گا۔“

راتن سنگھ راجپوت سرداروں کے ساتھ راج محل میں لوٹ آیا۔ رام دیو نے منتر پڑھنے کیلئے آشرم کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ ہری سنگھ اپنے معتمد سپاہیوں کی صف بندی کر رہا تھا اور سلطان کے سپاہیوں کی سنگساری جنوبی فصیل میں نئے شگاف پیدا کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سورج کے غروب ہوتے ہی خوفناک دھماکوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں اور رام دیو نے ایک بہت بوسیدہ کتاب کھول لی تھی۔ چوڑے کاسب سے بڑا شیعہ باز آہستہ آہستہ کتاب کے اوراق پلٹتا رہا۔ پھر ایک خالی مقام پر اس نے کچھ تحریر کیا اور پجاریوں کی لائی ہوئی راکھ چھڑکنے لگا۔ عبارت دھندلی پڑ گئی۔ رام دیو نے ایک تیز بھونک سے اس راکھ کو اڑا دیا۔ حروف صاف نظر آنے لگے۔ رام دیو نے یہ عمل کئی بار کیا یہاں تک کہ اس کی کھسی ہوئی عبارت پر برسوں پرانی تحریر کا گمان ہونے لگا۔ رام دیو مسکرایا اور دیو داس کے ہاتھ سے شراب کا لیبر جام پی کر سو گیا۔

اس طویل ترین محاصرے کے دوران اہل چوڑے کیلئے وہ پہلی رات تھی جب انہوں نے اپنے دروازوں پر موت کی دستک سنی تھی۔ راجہ رتن سنگھ، رانی پدی منی اور چند راجپوت سرداروں کے سوا قلعے کے تمام کین جاگ رہے تھے۔ اگرچہ سنگساری رک گئی تھی لیکن ہر شخص کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ساری دیواریں بیٹھ گئی ہیں اور سلطان کے سپاہی ہر بلندی کو پامال کر کے قلعے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تو انہیں اپنی ہچکچاہٹوں پر بھی دشمن کے سامنے کا گمان ہوتا تھا۔

اسی رات طلسم کدے میں نرملہ کماری، علی عامر آفریدی کی طرف سوا لیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور آفریدی اس کی زلف پریشان کو سنوارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”نرملہ ہماری تاریک راتوں کا سفر تم ہو۔“ دھماکے روشنی کے نقیب ہیں جو صدیوں کے اندھیروں کا حصار توڑ کر اپنی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ نرملہ کے چہرے پر خوشی بھی رکھنا تھی اور غم کے سامنے بھی لرزاں تھی۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی خوشی اور اپنے وطن کی تباہی کا غم، آفریدی نے نرملہ کی اس جذباتی کشش کو محسوس کر لیا اور پھر صبح کے گیت گانے لگا جو اپنی تابندگی کے باعث قوم اور وطن کے رشتوں سے بالاتر تھی۔

کے پہاڑ ایک ایسے شخص کے سامنے تجھ رہے ہو جائیں گے جو دہلی سے مارواڑ کی جانب خروج کرے گا۔ وہ ایک خدا کا نامنے والا ہو گا اور جس کی شمشیر بے نیام پتھروں کے جگر تک کاٹ کر رکھ دے گی۔ میرے گمان نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پیدا کنشی فاتح ہے۔ جدھر کار خرے گا کامیابیاں اس کے قدم چوسیں گی۔ جس نے بھی اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ میں نے ستاروں سے کئی بار پوچھا ہے اور ہر مرتبہ ایک ہی جواب آتا ہے کہ اس کے ماتھے سے روشنی پھوٹ رہی ہوگی اور اس روشنی کے سامنے اقتدار کے تمام چراغ بجھ جائیں گے۔ اے میری قوم! اگر وہ شخص چوڑی حدود میں داخل ہو جائے تو بے دریغ اپنے گھروں سے نکل کر اس کی راہ میں جڑیوں کے پھول بچھادنا۔ اس سے طاقت کی زبان میں بات نہ کرنا کہ دنیا کی ساری طاقتیں اس کی غلام بنادی گئی ہیں۔ وہ سنسار کا وجیتا (فاتح عالم) ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو خود اپنے آشرم سے نکل کر اس کا استقبال کروں گا اور اگر مجھے موت آگئی تو تم لوگوں کو فرغ سے کہہ دے کہ میرا سلام پہنچاؤ اور کہہ دینا کہ رام دیو نے تیرا منت انتظار کیا وہ رام دیو جو ہندوستان کا سب سے بڑا گیانی تھا اور جس کے مقدس زمیں آنے والے کا دیدار نہیں لکھا تھا۔

تحریر ختم ہو گئی تھی۔ نیچے میں ہر طرف گر اسکوٹ طاری تھا اور سلطان کے چہرے پر عجیب سے رنگ ڈوب کر ابھر رہے تھے۔ عام سپہ سالاروں نے دیکھا کہ علاء الدین اپنی نشست پر بار بار پھل پھول رہا تھا۔ ”فاتح عالم“ کا لفظ نہ سلطان اس طرح چونک اٹھا تھا جیسے کسی کے بھرنے کے خیرے اس کی رگ رگ جاں کو چھو لیا ہو۔ ”تو جی کہتا ہے بچاری!“ سلطان نے بڑے جذباتی لہجے میں رام دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بے شک! تو بڑا گیانی ہے۔ اگر تیرا علم سچا نہیں ہوتا تو پھر تجھے کون بتاتا کہ وہ فاتح عالم ہم ہی ہیں جس کا تو برسوں سے انتظار کر رہا ہے۔“

رام دیو کی عیاروں نے سلطان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور یہ سب کچھ انجانے میں ہو گیا تھا۔ رام دیو کی پیش گوئی ستاروں کے کسی حساب کے مطابق نہیں تھی بس اس نے ایک مطلق الحان شہنشاہ کی تعریف میں نئے انداز کا قصیدہ لکھ دیا تھا۔ رام دیو کو انسانی فطرت کا اندازہ تھا کہ کوئی بھی حکمران پہلے اپنی بڑی ریاستوں پر غلبہ حاصل کرنے کے خواب دیکھتا ہے، پھر یہ خواب پورے ملک کو اپنی پیٹ میں لے لیتے ہیں اور آخر میں بڑھتے بڑھتے ساری دنیا کے گرد رقص کرنے لگتے ہیں۔ انسان کی اسی بے لگام خواہش کے پیش نظر رام دیو نے علاء الدین کو بھی ”فاتح عالم“ کہہ کر پکارا تھا۔ اب یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اس نے نادانستگی میں سلطان کے خوابوں کو بھنڈوڑ دیا تھا۔ تیرے نشانے پر بیٹھا تو رام دیو کی مکاری نے ایک اور کروٹ لی۔ ”اے سنسار کے وجیتا! میری پیاسی آنکھیں تیرے درشن سے سیراب ہو گئیں۔ اب میں اس ترک میں چلنے کیلئے واپس جا رہا ہوں۔ جہاں ہر طرف جاہل بستے ہیں اور جن وحشیوں کے درمیان پاؤں صدمی سے میرا علم رسوا ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر رام دیو جانے کیلئے مڑا۔

”نہیں بچاری! اب تو اس جنم میں نہیں چلے گا۔“ علاء الدین نے بڑے جلال لہجے میں رام دیو کو آواز دی۔ ”وہ دوزخ چوڑے کے نافرمانوں کیلئے ہے۔ ہم تیرے علم کی قدر کرتے ہیں کہ تو نے پچیس سال پہلے اس تحریر کو پڑھ لیا جو آئندہ قرطاس عالم پر لکھی جانے والی ہے۔“

رام دیو تیزی سے پلٹا اور علاء الدین کے سامنے زمین پر سر رکھ دیا۔ سلطان نے امیر خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خسرو! اسے حلقہ اسلام میں داخل کر لو کہ بڑا دیدہ ور ہے، غریب ہم اسے اپنے مشیر خاص کا درجہ عطا کریں گے۔“

رام دیو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا اور بے آواز بلند کلمہ پڑھنے لگا۔ علاء الدین کے تمام سپہ سالار

ہر ایک نے کہہ کر رام دیو نے بڑی عجیب عبارت لکھی تھی جس کا ایک ایک حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔ اب ان لکھنؤوں کو کیا معلوم کہ اس سیاہ فام شہیدہ باز نے معمولی سے رد و بدل کے ساتھ اس عبارت کو اپنی ہتھکڑی میں منتقل کر دیا تھا جو سات ماہ قبل سنیا سی آئندہ پال نے کبھی شام کے مندر کی دیوار پر تحریر کی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہشام اسدی مسلسل سنگباری کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین دن کے مختصر عرصے میں اس نے جنوبی قبل کا بالائی حصہ مسمار کر دیا پھر وہ اپنی مخفییت لے کر پہاڑی کی ٹخنی پر آگیا۔ اب اس کے پتھروں کا ہر فیصل کا درمیانی حصہ تھا الغرض آٹھ دن میں ہشام اسدی نے راجپوتوں کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں بے بے شکاف ڈال دیئے تھے۔ اب ان دراڑوں سے علاء الدین کے سپاہی آسانی کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ اپنے دعوے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے بعد ہشام نے سلطان کی طرف سوالیہ ٹکڑوں سے دیکھا۔

”نہیں ہشام! ابھی اپنے بازوؤں کو حرکت میں رہنے دے۔“ سلطان نے نیا حکم جاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ہم دشمن پر حملہ نہیں کریں گے۔ قلعے کی شمالی فصیل بھی مسمار کر دے کہ اس طرح دونوں محاذ کھل جائیں گے ہم اپنے نافرمانوں کو ہر طرف سے بے اماں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

اب شمالی فصیل پر سنگباری ہو رہی تھی اور راجہ رتن سنگھ رام دیو کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ”اب وہ نہیں آئے گا سمرات! وہ نہیں آئے گا۔“ رانی پدمنی کسی وحشت زدہ عورت کی طرح اپنے آراستہ کمرے میں مل رہی تھی۔ ”وہ فریب۔ راجادگر علاء الدین کی پناہ میں جا چکا ہے اسے تو یہاں سے نکلنے کا ہمانہ ہاتھ تھا۔ سو ہم نے فراہم کر دیا۔“ رانی پدمنی کے لہجے میں احساسِ ندامت کی جھلک بھی تھی اور زہر جیسی ٹھنکی۔

”کیا خبر تھی مسمارانی کہ دھرم کے ادھیکاری بھی جھپٹ اور کپٹ سے بھرے ہوئے ہیں۔“ رتن سنگھ کے سپاہیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ”ہمیں ہماری تقدیر نے حسرتوں کے صحرائے خنیا چھوڑ دیا جہاں نہ ابر کا کوئی ٹکڑا ہے اور نہ پانی کی کوئی بوند بس حادثات کی تیز دھوپ ہے جو ہمیں جلانے کیلئے لپک رہی ہے۔“

”اب چلنے کو کیا باقی رہ گیا ہے سمرات؟“ رانی پدمنی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس ٹکڑے (جنم) کے سب سارا ہنگامہ ہے۔“ پدمنی آگے بڑھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لکھنوی علاء الدین کو نہیں معلوم کہ تمام ہرنیاں درندوں کی خوراک نہیں بنیں۔ میں وہ غزال تہوں کہ ساری دنیا کے شیر بھی میرا تعاقب نہیں کر سکتے۔ میرے قدم ہوا کے قدم ہیں اور میری رفتار لہرِ قلب ہے مجھے میری مرضی کے بغیر کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔ ٹھاکروں کے غیرت مند خون کی قسم! سب ہل کر راکھ ہو جائے گا۔“

☆ ☆ ☆

اس کے بعد رانی پدمنی نے تمام فوجیوں اور قلعہ نشین راجپوتوں کے نام ایک حکم جاری کیا کہ وہ سب سب قلعے کے میدان میں جمع ہو جائیں پھر جب تمام لوگ ایک مرکز پر سمٹ آئے تو رانی پدمنی بڑی آنکھ کے ساتھ اپنی رعایا کے سامنے نمودار ہوئی اس وقت وہ گمرے سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئی تھی پہلی نظر بالکل محسوس ہوتا تھا جیسے پدمنی اپنے خون میں نہائی ہوئی اہل چوڑے کے سامنے کھڑی ہے۔ ”عظیم قوم کے

راجپوت معماروں نے قلعے کی حفاظت کیلئے سات دروازے تعمیر کئے تھے۔ قلعے کی مسرہ

”ان پاگلوں کا راستہ چھوڑ دو اور انہیں اندر تک آنے دو۔“ خواجہ حاجی نے چیخ کر فارسی زبان میں کہا۔
 راجہ تپ سبھی اس آواز کا مضموم سمجھنے سے عاجز تھے۔

سلطان کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے حکم پر لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے اور انتہائی احتیاط کے ساتھ دائیں بائیں دو قطاروں میں تقسیم ہو گئے۔ راجپوت سپاہیوں نے سمجھا کہ دشمن پسپا ہو رہا ہے اس لئے وہ دیوانہ وار آگے بڑھے اور پھر کچھ دیر بعد ہی محصور ہو گئے۔ تلواروں کے تصادم سے موت کے نغمے بھونکے اور آتش فشاں کی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ راجپوت تعداد میں بھی کم تھے اور اپنے حواس بھی کھو چکے تھے۔ نتیجتاً موت کے دونوں جبڑوں میں پس کر رہ گئے۔ مرنے سے پہلے وہ ”جے ماتا“ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ مگر ان کی زندگی کی سانسیں شمار کی جا چکی تھیں۔ کوئی نعرہ کام نہیں آیا اور چوڑے کے محافظوں کا ایک دستہ دیکھتے ہی دیکھتے اس موت کی خوراک بن گیا جس کے خونی ہاتھوں نے بہت پہلے ان کی دیوی کو بھی شکار کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

راجہ رتن سنگھ اور رانی پدمینی نے دل تھام کر یہ اندھناک خبر سنی کہ راجپوت سرفروشن کی ایک جماعت میدان جنگ میں اس طرح کام آگئی کہ وہ دشمن کو بہت معمولی سا جانی نقصان پہنچا سکی۔ یہ شکست کی پہلی علامت تھی جس نے تمام ہوشمند انسانوں کو چوڑے کے مستقبل سے مایوس کر دیا تھا مگر اب صلح یا فزاری کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی اس لئے راجپوت سپاہی موت کو گلے لگانے پر مجبور تھے۔

دوسرے دن ایک اور جماعت قلعے سے باہر نکل کر سلطانی لشکر کے سامنے صف آراء ہوئی۔ سپاہیوں کے اس دستے کی قیادت راجہ رتن سنگھ کا چھوٹا بھائی راج کمار آری کر رہا تھا اس جماعت نے بھی پہلا حملہ اتنی شدت سے کیا کہ مسلمان سپاہی چند لمحوں کیلئے حیرت زدہ رہ گئے۔ راج کمار آری آندھی کے کسی گوشے کی طرح اٹھا اور کچھ دور تک آگے بڑھتا چلا گیا۔ ملک نصرت خان جو ایک آزمودہ کار امیر لشکر تھا اور جس نے کچھ عرصہ پہلے گجرات کے حکمران راجہ کرن کو شکست فاش دی تھی راجپوتوں کے رجوش حملے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ راستہ چھوڑ دیں اور عقل و ہوش سے عاری راجپوتوں کو لشکر کے قلب میں داخل ہو جانے دیں۔ ملک نصرت خان کے سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ بڑی ذہانت سے کڑا کر نکل گئے اور راجپوت شہسوار فرخ کے نشے میں اتنے آگے چلے گئے کہ ان کی بحفاظت واپسی کے تمام راستے بند ہو گئے۔

راج کمار آری بار بار پیچ رہا تھا۔ ”میں عام سپاہیوں سے لڑنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ علاء الدین اگر مرد ہے تو میرے مقابل آئے۔ میں اسے ہتاؤں گا کہ فن سپاہ گری کیا ہے اور جنگ کس طرح لڑتے ہیں۔“ ملک نصرت خان نے اس راجپوت نوجوان کی لاف زنی کا جواب دینے کے بجائے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے مت چھوٹا کر یہ میرا شکار ہے۔“ یہ کہہ کر ملک نصرت خان راج کمار آری کی طرف چھپنا۔ راج کمار دیوانوں کی طرح لڑا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح سلطان علاء الدین خلجی کے قریب پہنچ جائے۔ حالانکہ سلطان اس کی دسترس سے بہت دور تھا لیکن راج کمار کی جیشیں مسلسل سالی دے رہی تھیں۔

”کہاں ہے تمہارا نامرد سلطان جو میری مبارز طلبی کا جواب نہیں دیتا۔ اس سے کہو کہ راج کمار آری اسے لٹا کر رہا ہے۔“ شیروں کی جنگ میں یہ گیدڑ کہاں سے آگئے ہیں۔“ آری کے منہ سے غلیظ کلمات سن کر مسلمان سپاہیوں کا خون کھول اٹھا تھا۔ سلطان کا ہرجاں ٹاریری چاہتا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے اور راجپوت نوجوان کو اس کی بدگلائی کی اذیت ناک سزا دے مگر علاء الدین کے تمام سپاہی اپنے سپہ سالار ملک نصرت خان کے حکم سے مجبور تھے۔ وہ ایک دیوار کی طرح راج کمار کے سامنے کھڑے

ہمے تھے اور آری کے ہر وار کو دفاعی انداز میں روک رہے تھے۔ ملک نصرت خان اپنے سپاہیوں کی قطار کو بیڑنا ہوا راج کمار آری تک پہنچ گیا اور اس کی شمشیر خارا شکاف فضا میں لہرائی۔ آری نے ملک نصرت خان کا وار روکنے کی کوشش کی مگر اس کا دایاں ہاتھ زخمی ہو گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے سلطان کے سپاہیوں نے دیکھا کہ راج کمار کی تلوار چھوٹ گئی۔ ملک نصرت خان نے اپنے ایک فوجی کو حکم دیا۔ ”اس کی تلوار اسے واپس کر دو کہ سلطان علاء الدین خلجی کے غلام خنوں پر وار نہیں کرتے۔“

مسلمان سپاہی نے گھوڑے سے اتر کر تلوار اٹھائی اور راج کمار آری کی طرف بڑھائی۔ راجپوت نوجوان نے حیرت انگیز بھرتی کے ساتھ تلوار لے کر ملک نصرت خان پر وار کیا مگر اس کا حملہ رائیگاں گیا۔ داؤد پیچ کے مختصرے مظاہرے کے بعد راج کمار آری مزید زخمی ہو گیا اور اس کی تلوار دوبارہ زمین پر گر گئی۔ ملک نصرت خان نے ایک مرتبہ پھر راج کمار کو اس کی تلوار لوٹا دی۔ مسلمان سپہ سالار کی طرف سے یہ انتہائی ذلت آمیز سلوک تھا مگر راج کمار آری لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ملک نصرت خان نے اس کے جسم پر کئی گہرے زخم بجا دیئے اور راجپوت نوجوان اپنے خون میں نہا کر چپتی ہوئی ریت پر گر گیا۔ اب اس میں اٹھنے کی نکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

”اسے لے جا کر سلطان کے قدموں میں ڈال دو۔“ ملک نصرت خان نے اپنے سپاہیوں کو نیا حکم دیا۔

راج کمار آری کو کھینچ کر سلطان کے قریب لے جایا گیا۔ راستے بھر وہ اپنی زبان سے علاء الدین خلجی کیلئے نازباکلمات ادا کرتا رہا۔ سلطان نے بڑی حقارت سے راجپوت نوجوان کی طرف دیکھا جو خاک میں لٹھڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔

”اسے نشتی تلوار فراہم کر دو کہ ہم بھی اس کے بازوؤں کی طاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔“ علاء الدین کی بہت ناک آواز گونجی اور قریب کے سپاہیوں میں ایک لرزہ سا پڑ گیا۔ سپہ سالار تاج الدین عراقی جو سلطان کے گرد ایک حصار قائم کئے ہوئے تھا آگے بڑھا اور اپنی تلوار کو نشتی کی طرف جھکاتے ہوئے بولا۔ ”سلطان معظم کا یہ عمل آداب جنگ کے خلاف ہے۔ اگر خدا نخواستہ.....“

عراقی کا جملہ مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ علاء الدین گرج اٹھا۔ ”تمہارا سلطان اپنی جنگ کے آداب خود غانا ہے۔ عراقی! اسے کسی دوسرے قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

تاج الدین عراقی نے سر جھکا دیا اور راج کمار آری کو نشتی تلوار دے دی گئی۔ راجپوت نوجوان نے شمشیر کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اٹھنے کی ہمت کوشش کی مگر زخموں نے اسے نڈھال کر دیا تھا وہ اپنی جگہ سے نہیں تکانہ کر سکا۔ پھر ایک طویل اذیت ناک کشش کے بعد اس نے علاء الدین کی دی ہوئی کورسے اپنی شرگ کاٹ دی۔ گرم لو کا نوارہ سائل پڑا۔ راج کمار کچھ دیر تک تپتا رہا اور پھر اس کا جسم موڑ پڑ گیا۔

”تم نے دیکھا عراقی! سلطان کے بدخواہوں کا انجام کس قدر عبرتناک ہوتا ہے۔“ علاء الدین نے سپہ سالار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تمام عمر افسوس رہے گا کہ یہ نوجوان فاتح عالم سے بہت بدست مقابلے کی تمنا لئے ہوئے رخصت ہو گیا۔ کاش! اسے موت اتنی سہل دیتی اور پھر وہ اندازہ کر لے کہ سلطان کے بازوؤں کی ضرب کتنی کاری ہے۔“

اس دوران باقی راجپوت سپاہی بھی لقمہ اجل بن چکے تھے اور جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے آپ کو قیدی کی حیثیت سے سلطانی لشکر کے حوالے کر دیا تھا۔
علاء الدین کے حکم پر راج کمار آرسی کی لاش قلعہ کے محافظوں کے سپرد کر دی گئی۔
جب آرسی کا خون آلود جسم قلعے میں پنچاوت ہر طرف ایک کھرام برپا ہو گیا۔ حکمران خاندان کی عورتیں ماتم کرتی ہوئی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ راجہ رتن سنگھ کا چہرہ گیندے کے پھولوں کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ وہ اپنے جواں مرگ بھائی کی لاش سے لپٹا ہوا کچھ دیر تک گریہ و زاری کرتا رہا پھر قلعہ کے میدان میں راج کمار آرسی کی چٹا کو آگ لگا دی گئی۔ یہ دوسری شکست تھی جس نے راجپوت سوراؤں کو اپنی زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ اب قلعے کی شکستہ فصیلوں اور راج محل کی دیواروں پر ایک ہی لفظ لکھا ہوا نظر آتا تھا۔
”موت..... موت..... بے کسی اور تہائی کی دردناک موت۔“

☆.....☆.....☆

راجہ رتن سنگھ نے اپنی بقائے زر نگار سے ہتے ہوئے آنسو خشک کئے اور فوری طور پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں صرف حکمران خاندان کے افراد شریک ہوئے تھے۔ ”آئے والا طوفان اتنا سرکش ہے کہ اب اسے ہماری لاشوں کی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔“ راجہ رتن سنگھ نے حکمران طبقے کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سمرات! میں ابھی چوڑی فتح سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔“ راج کمار اجیسی نے اپنی نشست پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اجیسی عمر میں مقتول راج کمار آرسی سے ایک سال چھوٹا تھا اور اس نے چند برس پہلے ہی منزل شباب میں قدم رکھا تھا۔

”مجھے تمہارے حوصلوں پر ناز ہے اجیسی!“ رتن سنگھ نے بڑی مایوس نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اپنے خون کے خالص ہونے پر پورا یقین ہے کہ اس میں بزدلی کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔“

”تو پھر میرے ہاتھوں میں تلوار دیتے کہ موت کی ولہن میرا انتظار کر رہی ہے۔“ اجیسی کا لہجہ شرابا تھا اور چہرہ خون کی حدت سے تہمتار تھا۔

”اجیسی! میں یقیناً اپنی خاندانی تلوار تیرے حوالے کروں گا مگر پرکھوں کی وہ شمشیر دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے نہیں ہوگی۔“

راجہ رتن سنگھ کی یہ بات سن کر حاضرین سنانے میں آ گئے۔ ”وہ تلوار اس عظیم خاندان کی آخری نشانی کے تحفظ کیلئے ہوگی۔“ راجہ رتن سنگھ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ”میں چاہتا ہوں کہ تو آرسی کے بیٹے ھیمیر کو لے کر اتنی دور چلا جا کہ دشمن تم دونوں کی گرد بھی نہ پاسکے۔“

”میں اس حالت میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“ راج کمار اجیسی بچوں کی طرح چل گیا۔ ”ابھی زندگی پر ہزار بار لعنت کہ بزرگ خطرات میں گھرے رہیں اور کڑیل جوان اپنی جانیں بچا کر فرار ہو جائیں۔“

”یہ میرا حکم ہے اجیسی!“ راجہ رتن سنگھ نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں اپنے چھوٹے بھائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا ”تم فرار نہیں ہو رہے ہو بلکہ چوانوں کی آخری نشانی کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم اور ھیمیر دشمنوں کی درندگی سے محفوظ رہے تو میں یہ سوچ کر مطمئن ہو جاؤں گا کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔“

اس کے بعد راجہ رتن سنگھ، راج کمار اجیسی کو لے کر مخصوص کمرے میں آ جاں اس کے خاندانی

ہوادرات موجود تھے۔ رتن سنگھ نے آگے بڑھ کر ایک تلوار اٹھائی اور اجیسی کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔
”میں مارواڑی سب سے قیمتی تلوار تیری حفاظت میں دیتا ہوں۔ یہ طلسمی تلوار وشوا کرمانے تیار کی تھی اور خود دیوی نے اپنے ہاتھوں سے تیرے مورث اعلیٰ راول کے گنگے میں ڈالی تھی۔“ رتن سنگھ نے راج کمار اجیسی کو طلسمی شمشیر کی تاریخ بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس تلوار کی کرشمہ سازی یہ ہے کہ دشمن کو ہلاک کرتی ہے اور جس کے ہاتھ میں ہوا سے تمام بلاؤں سے محفوظ رہتی ہے۔“
راج کمار اجیسی نے بڑے بھائی کے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔

☆.....☆.....☆

جنگ کے چوتھے دن راج کمار اجیسی اور دس سالہ ھیمیر راجپوت جاناڑوں کی ایک جماعت کی نگہبانی میں ”بدل پول“ سے باہر آئے۔ اس دروازے پر سلطان کے سپاہی موجود نہیں تھے۔ اجیسی اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹے ھیمیر کو لے کر آگے بڑھا مگر جب وہ لوگ ”سورج پول“ کے قریب پہنچے تو مسلمان فوجوں کو اپنا منظر پایا۔ راجپوت بڑی بہادری سے لڑے۔ راج کمار اجیسی اور ھیمیر کو رتن سنگھ کی ہدایت ملی کہ وہ مسلسل بھاگتے رہیں یہاں تک کہ دشمن کے حصار سے باہر نکل جائیں۔ یہ رتن سنگھ کی احمقانہ سوچ تھی۔ علاء الدین کے جہاندیدہ سپاہیوں نے اجیسی اور ھیمیر کو فرار ہونے نہیں دیا۔ اجیسی ایک مقابلے کے بعد مارا گیا اور نوخیز ھیمیر کو پچھڑے سمجھ کر مسلمان فوجیوں نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ راجہ رتن سنگھ صدر دروازے کے اوپر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مقدس تلوار ٹوٹ چکی تھی اور اس کے خاندان کی آخری نشانی ایک قیدی کی حیثیت سے سلطان کے خیمے میں پینچادی گئی۔

رتن سنگھ کو محسوس ہوا جیسے چوڑی تمام پہاڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں اور وہ پتھروں کے ڈھیر میں دب چکی رہا ہوں۔ ایک ایک کر کے تمام ساتھی پھنڑے تھے اور راجپوتوں کی شکست قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

سرور پھچھن سنگھ کے ساتوں بیٹے چوڑی آبرو پر قربان ہو چکے تھے اور سپہ سالار ہری سنگھ لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گیا تھا۔ اسے بس سلطان علاء الدین خلجی سے دست بدست جنگ کی آرزو تھی مگر ہری سنگھ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ غلام کا مقابلہ غلام ہی کر سکتا ہے۔ بالآخر ہری سنگھ کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

”ہری سنگھ! ہم تمہاری شجاعت و ہرمانگی کی قدر کرتے ہیں۔“ علاء الدین نے راجپوت سپہ سالار کو قلاب کرتے ہوئے کہا جس کے پورے جسم پر زخموں کی گل کاریاں تھیں مگر زبان پر بے ہودہ الفاظ نہیں تھے۔

”سلطان! اگر آپ واقعتاً مردوں کی قدر کرتے ہیں تو مجھے اپنی تلوار سے ہلاک کر دیجئے۔ میں سمجھ لوں گا کہ میری زندگی بھگائے لگ گئی۔“ ہری سنگھ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھے مرنے وقت اس بات پر ناز ہو گا کہ میری موت ایک ذہین اور بہادر شہنشاہ کے ہاتھ سے واقع ہوئی۔ سلطان! بے شک! آپ حکمرانی کے لائق ہیں۔“

”نہیں ہری سنگھ!“ سلطان نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”تم زندہ رہو گے اور تمہیں ہم تمہارے ٹھکانے میں شان یا منصب عطا کریں گے۔“

”نہیں سلطان! ہرگز نہیں۔“ ہری سنگھ اپنے خون آلود ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے لگا۔
”شکست کے بعد ہر منصب اور ہر مرتبہ غلامی کی یاد دلاتا ہے اور میں ایک غلام کی حیثیت سے زندہ رہنا نہیں

چاہتا۔
”ہم تمہیں خانیہ اس سے تک نہیں ہونے دیں گے ہری سنگھ!“ علاء الدین نے دشمن سپہ سالاری کو دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔
”نہیں شہشاہ! غلامی غلامی ہی ہوتی ہے چاہے اسے کوئی بھی قباہ پرستادی جائے۔“ نقاہت سے ہری سنگھ کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔
”ہم تمہیں کسی قیمت پر مرنے نہیں دیں گے ہری سنگھ۔“ سلطان کی آواز بہت زیادہ مہرچوش ہو گئی تھی۔

”میں نے ایک ہی کی غلامی اختیار کی ہے شہشاہ! صرف اپنے عظیم اور محبوب وطن چوڑ کی غلامی۔“
خون زیادہ بہہ جانے کے سبب ہری سنگھ کی آواز میں مزید لرزش پیدا ہو گئی تھی اور اس کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ”میں اپنی وفاداریاں..... تبدیل نہیں کرتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ شکست..... میرا مقدر بن گئی..... میں نے میدان جنگ میں..... مرنے کی..... کوشش کی..... مگر غیرت مندوں..... اور سوراخوں کی موت..... میری قسمت میں..... نہیں لکھی گئی تھی..... اگر آپ میرے قتل کا..... حکم نہیں دے سکتے تو پھر مجھے جانے دیجئے۔ میں کسی گوشہ تنہائی میں..... مرجاؤں گا..... یہ ایک راجپوت کا عہد ہے کہ دوبارہ..... اہل چوڑ کے سامنے..... نہیں آؤں گا۔“ یہ کہتے کہتے ہری سنگھ بے ہوش ہو گیا۔
سلطان نے اپنے طبیب خاص مولانا بدر الدین دمشقی کو حکم دیا کہ وہ ہری سنگھ کے زخموں کو بھرنے کیلئے موثر ترین دوائیں استعمال کریں۔ مولانا دمشقی کو علم طب میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ اگر چند جانوروں کا پیشاب ایک ہی برتن میں ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو مولانا بدر الدین فوراً تمام جانوروں کے نام بتا دیتے۔

☆.....☆.....☆

جنگ اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور راجپوت اپنے صدیوں کے اقتدار سے محروم ہونے نظر آرہے تھے۔ رانی پدمنی کے رشتے کا بھتیجا بادل سنگھ میدان جنگ میں جانے کیلئے بہت بے قرار تھا مگر رتن سنگھ محض اس خیال سے بادل سنگھ کو اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس کی محبوب بیوی کے خاندان کی آخری نشانی تھا۔ راجپوتوں کی تاریخ میں بادل سنگھ ”گورابادل“ کے نام سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ وہ تیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کے چہرے سے شانانہ وجاہت جھلکتی تھی۔

”سراٹ! جب آپ کے خاندان کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی تو پھر بادل سنگھ پر یہ پابندی کیوں لگادی گئی ہے؟“ رانی پدمنی نے اپنے شوہر سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ”جب ہزاروں ماؤں کی چھاتیوں بیٹوں کے فراق کی آگ میں جل گئیں تو پھر ہم مٹی کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کیوں؟ بادل سنگھ زندہ رہتا تو غلام بنالیا جائے گا اور دھرتی ماں ہمیشہ میرے خاندان کا نام لے کر طعنے دیا کرے گی کہ اس کے نتیجے میں موت سے ڈر کر زنجیریں پہن لیں۔“

رتن سنگھ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر مایوس نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”مہارانی! میں اچھی صہیر اور بادل سنگھ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا مگر دیوتاؤں کو شاید منظور نہیں کہ راجپوتوں کے یہ وارث اپنے دشمن سے انتقام لینے کیلئے زندہ رہیں۔ کل ہم بادل سنگھ کو لے کر علاء الدین سے آخری مقابلے کیلئے رن بھومی کا رخ کریں گے۔“ رتن سنگھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”سراٹ!“ یہ کہتے ہوئے رانی پدمنی رتن سنگھ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ”تو پھر اس کینز کو بھی تہہ تیہ کیجئے۔ اب ہم دوسری دنیا میں ملیں گے جہاں دلوں کے درمیان کوئی علاء الدین خلیجی جبر و فراق اور نہیں بچنے گا۔“

☆.....☆.....☆

رات چوڑ کیلئے بڑی دہشت ناک اور لرزہ خیز تھی قلعے پر کسی ماتم کدے کا گمان ہوتا تھا۔ بوڑھے ت کاپنی آوازوں میں گزرے ہوئے زمانے کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ شادی شدہ عورتیں سکوت اور رنج و الم کا مجسم بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کے سینوں میں زندہ رہنے کی تڑپ موجود تھی مگر باج کی رسیں انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں چپ چاپ جل جانے کیلئے مجبور کر رہی تھیں۔ نوخیز دوشیزائیں راجہ عہد شباب کے اسرار و موز بھی نہیں کھل سکتے تھے، اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی طرف سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی خوفزدہ آنکھوں میں بس ایک ہی سوال لرز رہا تھا۔
”ہیں کس جرم میں زندہ جلایا جا رہا ہے؟“

راجپوت سوراخوں صدیوں سے عورتوں کو کچی مٹی کا کھلونا سمجھتے آئے تھے، اپنی ششیریں بے نیام کئے پڑپڑش تقریریں کر رہے تھے۔ ”ہمارے بعد تمہارا بیٹا اس دھرتی کا ایک بوجھ بن جائے گا۔ دہلی آنے والے تلچے بھوکے درندوں کی طرح تمہارے اچھوتے جسموں پر ٹوٹ پڑیں گے اور تم دروہائی کا کچھ نہ شے والا نشان بن کر رہ جاؤ گی۔ اس سے پہلے کہ دشمن کے خوفی ہاتھ تمہارے دامن کو تار کر ڈالیں، تم ہماری آنکھوں کے سامنے پوڑا گئی (مقدس آگ) کے حصار میں داخل۔ اس طرح تمہیں تمام دکھوں سے کٹی بھی مل جائے گی اور تمہاری بچیں بچے روحوں کو لازوال سکون حاصل ہو جائے گا۔“

”یہ تمہارے باپ اور بھائی زندہ ہیں۔“ بہت سی راجپوت دوشیزاؤں نے بلند آواز میں احتجاج کیا۔
”اے جیتے جی، ہم کیسے مرجائیں۔“

”تمہیں ہماری زندگی میں موت کو قبول کرنا ہو گا۔“ راجپوت مردوں نے چیخے ہوئے کہا۔ ”اب ہم مات میں جنگ کر سکتے ہیں جب ہمیں یقین ہو جائے کہ ہماری عزت و ناموس کو مکمل تحفظ حاصل ہو گیا اور یہ تحفظ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہماری نظروں کے سامنے تمہارے جسموں کی راکھ ہوا میں ائے۔“

”سلطان نے یقین دلایا ہے کہ چوڑ کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو ان کی مرضی کے مطابق زندگی ملے گا حق حاصل ہو گا۔“ ایک خوبصورت دوشیزہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ یہ لڑکی حکمران خاندان نظر رکھتی تھی، بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھی اور اس نے اپنے کانوں سے علاء الدین کا آخری فرمان سنا وہ فرمان جسے ملک نصرت خان نے سردربار پڑھ کر سنا تھا اور جس میں سلطان نے راجہ رتن سنگھ کو حکم دیا کہ شکست کے بعد راجپوت اپنی وحشیانہ رسموں کو دھرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ راجپوت دوشیزہ علاء الدین خلیجی کے اسی فرمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ان قوم کی لڑکی کا یہ بیباکانہ جواب سن کر راجپوت سپاہی مشتعل ہو گئے۔ ”سلطان جھوٹا ہے۔ وہ تمہیں غلامان دینے کے بھانے ایک خوفناک کھیل کھیل رہا ہے۔ تم ابھی معصوم ہو اور تمہیں تاریخ کے مزاج داؤد نہیں کہ جب کوئی قوم شکست سے دوچار ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی عورتیں حملہ آوروں شہر کا نشانہ بنتی ہیں۔“

”ہمیں خبر ہے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتے۔“ راجپوت دوشیزہ بڑی جرأت کے ساتھ جواب دے رہی تھی۔ ”محمد بن قاسم آیا مگر اس نے کسی ہندو عورت کو چھوا تک نہیں پھر شہاب الدین غوری ایک فانیکی حیثیت سے نمودار ہوا اور اس کے سپاہیوں نے بھی کسی راجپوت لڑکی کے سر سے آنچل نہیں کھینچا۔ اب علاء الدین چیخ چیخ کر اہل چٹوڑ کو یقین دلارہا ہے کہ تمام کمزور و ناتواں مرد بچے اور عورتیں اس کی شمشیر کے سائے میں ہیں۔ سارے مقامی باشندے اس راز سے بھی باخبر ہیں کہ سلطان کے جن سپاہیوں نے ہم جھوٹ دوشیزاؤں پر دست دراز کی تھی وہ ہماری ہی سرزمین پر موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ بے شک! ہم قلعے کی چار دیواری میں قید ہیں مگر ہماری سماعتیں ملاخوں اور اچھوتوں کی بستیوں میں رہنے والوں کے وہ گیت سن رہی ہیں جن میں سلطان کی عظمت کے ترانے دن رات گائے جاتے ہیں۔“ راجپوت دوشیزہ موت کے خوف سے بے نیاز ہو چکی تھی اور اس نے اپنے چند بچوں کو اس دلیری کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ چٹوڑ کے گنبدان سنانے میں آگئے تھے۔ چند لمحوں تک قلعے کے طویل و عریض میدان پر موت کا سا سکوت طاری رہا۔ پھر ایک راجپوت سردار نے اس بے باب لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو کہ تو نے راجپوتوں کی آن مٹی میں ملادی۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ راکشس سلطان تیری راج مانا کو دربار میں نچانا ہوتا ہے؟“

”ایٹھو راج مانا کے تقدس کی حفاظت کرے۔“ راجپوت دوشیزہ اچانک اس نظر آنے لگی تھی۔ ”اس دھرتی پر وہ رات کبھی نہ اترے جس کے اندھیرے ہماری راج مانا کے روشن چہرے کو ذلت کی سیلابی سے بھردیں۔“

”تو پھر خاموشی سے اس آگ میں جل جاؤ جو کچھ دیر بعد دکھائی جائے گی۔“ راجپوت سردار نے تلخ لہجے میں کہا۔

”خاموشی سے نہیں خوشی سے سو سردار۔“ راجپوت دوشیزہ ایک بار پھر سرکش نظر آنے لگی تھی۔ ”دونوں باتوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔“ راجپوت سردار نے جھنجھلا کر کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ راجپوت دوشیزہ کی آواز یکایک بلند ہو گئی تھی۔ ”خاموشی جبر کا نام ہے اور خوشی آزادی کا۔ ان معصوم لڑکیوں کے چہرے تو دیکھیں۔ کیا کہیں خوشی کا کوئی عکس نظر آتا ہے؟ یہ سب کی سب زندہ رہنا چاہتی ہیں مگر انہیں ہمارے سماج کی ظالم رسیں جلاؤ لٹا چاہتی ہیں۔“

راجپوت سردار مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ راجہ رتن سنگھ کے حکم پر اس شوریدہ سر لڑکی کو قتل کر دیا گیا ہوا تھا جو ان آرزوؤں کے سائے میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔

”ہر وہ جسم ایسی طرح سکت کر دیا جائے جس کے اندر دیوتاؤں کے قوانین سے بغاوت کی لہریں اٹھ گئی۔ ہم اپنی آبرو کو لعنت زدہ زندگی کی تھالیوں میں سجا کر دشمن کی بھیٹ نہیں چڑھ دیں گے۔“

اس جابرانہ حکم نے راجپوت دوشیزاؤں کے تانے جیسے جسموں سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑا۔ کچھ دیر بعد ہزاروں عورتیں جن میں نوخیز دوشیزائیں بھی شامل تھیں ایک بڑے جلوس کی شکل میں مانا کے مندر کی طرف جانے لگیں۔ اس دوران زنانہ محل کے ہر کمرے میں لکڑیوں کے انبار جمع کئے جاتے رہے۔

رات کا قافلہ دبے پاؤں گزرتا ہوا صبح کی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ نصف شب کے بعد عورتوں کی پوجا مکمل ہوئی۔ پھر ان مظلوموں کے کارواں کو وادی ہلاکت کی طرف لے جایا گیا۔ تمام کمروں میں آگ لگادی گئی تھی۔ مندر کے پجاری زنانہ محل کے بڑے دروازے پر پتیل کے برتن لٹائے کھڑے تھے۔ ان برتنوں میں ”گوکھ“ کا پانی بھرا ہوا تھا یہ وہ پانی تھا جسے گائے کا منہ دھلانے کے بعد برتنوں میں

”ہمیں خبر ہے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتے۔“ راجپوت دوشیزہ بڑی جرأت کے ساتھ جواب دے رہی تھی۔ ”محمد بن قاسم آیا مگر اس نے کسی ہندو عورت کو چھوا تک نہیں پھر شہاب الدین غوری ایک فانیکی حیثیت سے نمودار ہوا اور اس کے سپاہیوں نے بھی کسی راجپوت لڑکی کے سر سے آنچل نہیں کھینچا۔ اب علاء الدین چیخ چیخ کر اہل چٹوڑ کو یقین دلارہا ہے کہ تمام کمزور و ناتواں مرد بچے اور عورتیں اس کی شمشیر کے سائے میں ہیں۔ سارے مقامی باشندے اس راز سے بھی باخبر ہیں کہ سلطان کے جن سپاہیوں نے ہم جھوٹ دوشیزاؤں پر دست دراز کی تھی وہ ہماری ہی سرزمین پر موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ بے شک! ہم قلعے کی چار دیواری میں قید ہیں مگر ہماری سماعتیں ملاخوں اور اچھوتوں کی بستیوں میں رہنے والوں کے وہ گیت سن رہی ہیں جن میں سلطان کی عظمت کے ترانے دن رات گائے جاتے ہیں۔“ راجپوت دوشیزہ موت کے خوف سے بے نیاز ہو چکی تھی اور اس نے اپنے چند بچوں کو اس دلیری کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ چٹوڑ کے گنبدان سنانے میں آگئے تھے۔ چند لمحوں تک قلعے کے طویل و عریض میدان پر موت کا سا سکوت طاری رہا۔ پھر ایک راجپوت سردار نے اس بے باب لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو کہ تو نے راجپوتوں کی آن مٹی میں ملادی۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ راکشس سلطان تیری راج مانا کو دربار میں نچانا ہوتا ہے؟“

”ایٹھو راج مانا کے تقدس کی حفاظت کرے۔“ راجپوت دوشیزہ اچانک اس نظر آنے لگی تھی۔ ”اس دھرتی پر وہ رات کبھی نہ اترے جس کے اندھیرے ہماری راج مانا کے روشن چہرے کو ذلت کی سیلابی سے بھردیں۔“

”تو پھر خاموشی سے اس آگ میں جل جاؤ جو کچھ دیر بعد دکھائی جائے گی۔“ راجپوت سردار نے تلخ لہجے میں کہا۔

”خاموشی سے نہیں خوشی سے سو سردار۔“ راجپوت دوشیزہ ایک بار پھر سرکش نظر آنے لگی تھی۔ ”دونوں باتوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔“ راجپوت سردار نے جھنجھلا کر کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ راجپوت دوشیزہ کی آواز یکایک بلند ہو گئی تھی۔ ”خاموشی جبر کا نام ہے اور خوشی آزادی کا۔ ان معصوم لڑکیوں کے چہرے تو دیکھیں۔ کیا کہیں خوشی کا کوئی عکس نظر آتا ہے؟ یہ سب کی سب زندہ رہنا چاہتی ہیں مگر انہیں ہمارے سماج کی ظالم رسیں جلاؤ لٹا چاہتی ہیں۔“

ہٹ کسی بھی صورت میں تمہارا مقدر نہیں بن سکتی۔ جیتے تو دجیتا (فلاح) کھلاؤ گے اور مر گئے تو

ہو گئے۔“
ننگہ کی اس تقریر نے راجپوتوں کے بجھتے ہوئے جذبوں کی آگ کو نئے انداز سے بھڑکادیا۔ اب ان کی اور موت کے الفاظ اپنا مسموم کھوچکے تھے۔ گھروں میں آگ لگ چکی تھی، بیوی بچے یا تو تیز آتش تھے یا پھر اس جنگم دارو گیر میں ان کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ زندہ ہیں تو کس حالت میں ہیں؟ چپوڑ کے اچھے مڑ کر دیکھتے بھی تو کس کیلئے؟ زندگی جن رشتوں سے عبارت ہے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے ہیں۔ راجپوتوں کو ہلاکت و بربادی سے اپنا ناجوڑنا پڑا۔ وہ دیوانہ وار سلطان کے بڑھتے ہوئے لشکر پر رہے تھے۔

اب صرف جذبوں سے نہیں، عقل و ہوش سے بھی لڑی جاتی ہے۔ دشمن پر فتح حاصل کرنے کیلئے ہمدرداگی ہی نہیں، بہترین منصوبہ بندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر راجپوت اس صلاحیت سے ہو چکے تھے۔ ان کی تلواریں فضا میں لہرا رہی تھیں لیکن وحشت و جنوں کے سبب اکثر وار خالی جارہے راجپوت ننگہ کو یقین ہو گیا تھا کہ ”سورج پول“ پر یہ معرکہ آرائی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکے گی۔ لہٰذا اپنے چند معتمد سرداروں کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا رہا۔ رانی پدمنی کا بھیجا گورابادل ہوائی میں بے قابو ہو گیا۔ رتن سنگھ نے اسے روکنے کی بمت کوشش کی مگر خون کی حدت گورابادل کو لے لے جارہی تھی۔ وہ برق رفتاری کے انداز میں آگے بڑھا اور راجپوت سپاہیوں کی اگلی صفوں میں ہوا۔ گورابادل کی بھی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح علاء الدین تک پہنچ جائے اور پھر پھر ان کے کمر کو دست بدست جنگ کیلئے لگا کرے۔ اسی دھن میں یہ نوخیز راجپوت زادہ قلعے سے باہر نکلا شیرازی کے بھرپور جوہر دکھاتے ہوئے کئی مسلمان سپاہیوں کو تہ تیغ کیا مگر جب موت آنی تو اس طرح علاء الدین کے ایک چنانچہ نے گورابادل کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ عہد شباب کے متوالے سوچا بھی نہ تھا کہ سلطان کے تیغ زن کس قدر جہاں نذیر ہیں اور سپہ گری کے فن میں کیسی مہارت رکھتے

تو کی تاریخ آزادی کا ایک ایک ورق بکھرتا جا رہا تھا۔ راجپوت ننگہ قربان گاہ کے احاطے کے قریب پہنچا۔ کھٹے پوری طرح بھڑک چکے تھے اور تیز ہوائ نے انہیں بہت زیادہ منتشر کر دیا تھا۔ تپش اس حد تک لائق کی پچاس پچاس گز تک کسی انسان کا ٹھہرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ لوہے کا دروازہ کھل کر دھکی ہوئی گاڑی میں چکا تھا۔ راجپوت ننگہ نے حسرت زدہ نظروں سے مندر کی بلند دیواروں کو دیکھا جو شعلوں زبانت اور دھوئیں کی کثرت سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ ”اب ہم صحن میں داخل بھی نہیں ہو سکتے۔“

”نہیں سمرات! بہت دیر ہو چکی۔“ سردار بلرام سنگھ کی آواز سے انتہائی تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”اور یہ کچھ آپ کی وجہ سے ہوا۔ ہمیں اسی وقت احاطے میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔“

”یہ تاخیر بہت ضروری تھی بلرام سنگھ۔“ راجپوت سمرات نے اپنے سردار کے لہجے کی سرکشی کو نظر انداز نہ ہوئے کہا۔ ”اگر ہم ایسا نہ کرتے تو کوئی راجپوت دشمن سے مقابلے کیلئے آمادہ نہ ہوتا۔“

”چوڑ کا انجام کچھ بھی ہو مگر یہ تاخیر ہمیں زندگی کی آخری سانس تک خون کے آنسو لائے گی۔“
انگاپنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے چیخا۔

مسلمان سپاہیوں نے حملہ کر دیا ہے اور وہ مختلف سمتوں سے قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی کچھ دیر تک تو رتن سنگھ کو یقین ہی نہیں آیا کہ سلطان کے فوجی اس طرح بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آخری جنگ دن کے اجالے اور تیز دھوپ میں لڑی جائے گی مگر جب قلعے میں ہر طرف شور بلند ہوا تو رتن سنگھ نے حکم دیا کہ بیشتر سپاہی ”سورج پول“ کی حفاظت کریں۔ اس دروازے میں داخل ہونے کے بعد قلعے کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ باقی راستے بہت زیادہ پرچے تھے۔ ان سے مسلمان فوجیوں کا گزرتا آسان نہیں تھا۔ یہی سوچ کر رتن سنگھ نے اپنی تمام ہی طاقت ”سورج پول“ کے دفاع کیلئے وقف کر دی تھی۔ راجپوت سپاہی بڑی تیزی سے سمت کر ”سورج پول“ پر جمع ہو رہے تھے اور سلطانی لشکر کے سامنے ایک آہنی دیوار بن گئے تھے ایک گھنٹے کی مختصر سی جنگ میں علاء الدین کے سیکڑوں سپاہی لقمہ اجل بن چکے تھے مگر خواجہ حاجی اپنے فوجیوں کو مسلسل پیش قدمی کا حکم دے رہا تھا۔ یہ پیش قدمی اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ مسلمان سپاہی چند قدموں کا فاصلہ طے کریں اور راجپوتوں کے زہریلے تیروں کا نشانہ بن جائیں۔

خواجہ حاجی چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کے حوصلے بلند کر رہا تھا۔ ”بس چند لمحوں کی بات ہے، سورج طلوع ہونے والا ہے اور تمہارے دوسرے بھائی عقبی راستوں سے قلعے میں داخل ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر اور موت کا بازار گرم ہونے دو۔ پھر دشمن ہر طرف سے محصور ہو جائے گا اور اس پر زندگی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔“ مسلمان سپاہی اپنے امیر لشکر کے حکم پر سر یکف ہو کر لڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ رات کے سر سے سیاہ چادر بہت گئی اور فضا میں اس قدر اجلا پھیل گیا جس سے محاذ جنگ کا صحیح اندازہ لیا جاسکتا تھا۔ خواجہ حاجی نے اس نظروں سے اپنے ان سپاہیوں کی لاشوں کو دیکھا جنہوں نے جاں نثاری کی تھی تاریخ رقم کی تھی۔

سورج کی روشنی راجپوتوں کیلئے فنا کا پیغام ثابت ہوئی۔ سلطان کے تیرا انداز سے نے ان تمام راجپوت تیرا اندازوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو مختلف جھروکوں اور کھڑکیوں سے علاء الدین کے سپاہیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ قلعے میں داخل ہونے کیلئے یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی جسے بہت جلد دور کر دیا گیا۔ اب سلطانی لشکر کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا کچھ دیر تک ”سورج پول“ پر خوفناک جنگ ہوتی رہی۔ راجپوتوں نے قلعے کے راستے میں اپنی لاشوں کی دیواریں بنادی تھیں مگر علاء الدین کے فوجیوں کا جذبہ تیغیر ایک ایسا سیلاب تھا جس سے پتروں کے جگر بھی کٹ جاتے تھے۔ انسانی گوشت کے نرم و نازک ٹکڑے ان کی راہ میں کس طرح حائل ہو سکتے تھے؟ جب ”سورج پول“ پر چپوڑ کے مخالفوں کی گرفت کمزور ہونے لگی تو کچھ سرداروں نے رتن سنگھ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ قلعے کا صدر دروازہ بند کر دیا جائے۔ راجپوت سردار اس طرح اپنی شکست کو عارضی طور پر ٹالنا چاہتے تھے مگر رتن سنگھ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔

”اگر سورج پول بند ہو گیا تو ہم دشمنوں کے زرخے میں گھر کر بے کسی کی موت مارے جائیں گے۔“
رتن سنگھ کو اندازہ تھا کہ علاء الدین کے سپاہی شمالی اور جنوبی سمتوں سے قلعے کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ انہیں ایک طویل چکر کاٹ کر سورج پول تک پہنچنا ہو گا لیکن انجام کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی خیال کے پیش نظر راجپوت رتن سنگھ سورج پول کو بند کرنے سے گریزاں تھا۔ راجپوت سمرات نے آخری بار اپنے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ ”در گا اور کالی کی قوتیں تمہارے سروں پر سایہ لگیں

”ہوش سے کام لو اور کوئی تدبیر سوچو۔“ رتن سنگھ نے مہروضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی سورج پول پر جنگ جاری ہوگی اور دشمن کو یہاں تک پہنچنے میں کئی گھنٹے درکار ہوں گے۔ وقت اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔“

ہلرام سنگھ سنبھل گیا۔ تمام سرداروں کے ذہن تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ رتن سنگھ شدید اضطراب کے عالم میں مندر کے گرد کئی چکر کاٹ چکا تھا لیکن ہلرام اس کے چرے پر پاپیسیوں کے سامنے اصرار کر ڈوب جاتے تھے۔ ہلرام سنگھ نے گھبرا کر دیوار پر کند ڈالی مگر آگ کی لپٹوں نے رتن سنگھ کی رسی کو دوسرے ہی لمحہ جلا ڈالا۔ ہلرام سنگھ بھاگ کر دوسری دیوار کی طرف گیا۔ وہاں شعلوں کی لپک کسی قدر کم نظر آ رہی تھی۔ کند آگ کے اثرات سے محفوظ رہی، ہلرام سنگھ نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔ ”جسمانی“ اور دیوار پر چڑھنے لگا۔

رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار بھی اچانک بہت زیادہ مطمئن نظر آنے لگے تھے مگر اس وقت ان کی پاپیسیوں کی انتہانہ ربی جب ہلرام سنگھ نے ایک ہانڈیو دیوار کی منڈیر کو پکڑنے کی کوشش کی۔ دیوار کے پھر لوہے کے ٹکڑوں کی طرح تپ گئے تھے۔ ہلرام سنگھ اس آفت ناک گمانی کو برداشت نہ کر سکا اور تان کو بیٹھا کند اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دیوار اور زمین کے فرش کا فاصلہ زیادہ تھا۔ اس لئے ہلرام سنگھ کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ غصہ بھار تھا، تکلیف برداشت کر گیا مگر اب وہ کسی سارے کے بغیر چلنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اپنے ایک ساتھی کا شہر دیکھ کر راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کی آخری امید بھی دھوپوں کے گرے بادلوں میں ڈوب گئی تھی۔ ابھی وہ سب کے سب شعلوں میں گھرے ہوئے مندر کے طلائی گنبد کو پاس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ چند بدحواس سپاہی رتن سنگھ کے قریب آئے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے اترے ہوئے چرے بھی دھوپوں کے ہم رنگ ہو گئے تھے۔

”خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہاری زبانوں کو فالج نے کھالیا؟“ رتن سنگھ چپ کھڑے ہوئے سپاہیوں پر برس اٹھا۔

”سمرات! آپ کے غلام ”سورج پول“ کی حفاظت نہ کر سکے۔“ ایک سپاہی نے لرزے ہوئے یہ المناک خبر سنائی۔ ”ہر قدم پر راجپوت ویروں کے شتروؤں کو روکنے کیلئے اپنے شہریروں کی ہانڈی لگا دی مگر علاء الدین کی سینا انہیں بھی پار کر گئی۔“

”بزدلو! واپس جاؤ اور ایک ایک آنچ زمین کیلئے لڑو۔“ رتن سنگھ نے غضب ناک لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیا لیکن راجپوت سردار دیکھ رہے تھے کہ ان کے فرمانروا کے قدموں کی لرزش نمایاں ہو چکی تھی۔ سپاہی گردیں جھکائے ہوئے لوٹ گئے اور رتن سنگھ اپنے سرداروں کے ہمراہ ایک خفیہ تہ خانے کی طرف بڑھا۔ ہلرام سنگھ کو دو سردار سہارا دیئے ہوئے تھے اور چوڑ کا کلہراں طبقہ اپنی جان بچانے کیلئے آخری پناہ گاہ ڈھونڈ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

26، 27 اگست 1303ء (محرم 703ھ) کا ایک یادگار دن تھا جب دوسرے کے بعد سلطان علاء الدین خدجی کا لشکر اس قلعے میں داخل ہوا جسے بڑے بڑے فوجی دانشور ناقابل تغیر قرار دیتے آئے تھے اور جس کے بارے میں خوش گمان راجپوتوں کا خیال تھا کہ آسمان کو چھو لینا ممکن ہے مگر کوئی دشمن چوڑ کی بلند دیواروں تک نہیں پہنچ سکتا۔ (مسلمان مورخوں کی روایت کے مطابق چھ ماہ اور ہندو تاریخ نویسوں کی رائے میں مسلسل آٹھ ماہ کے تھکا دینے والے محاصرے کے بعد علاء الدین نے چوڑ کا ایک ایک اعزاز جیتا

اسے اپنے قدموں تلے روند ڈالا) آج تمام بلندیاں پتلیوں میں بدل گئی تھیں اور سارے آہنی بے کسی نازک شیشے کے ٹکڑوں کی طرح ٹوٹ کر اوڑھنا ہر بکھر گئے تھے۔

علاء الدین خدجی حضرت امیر خسروؒ کے ساتھ اس مصنوعی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا جہاں ہشام اسدی نے منجیقین نصب کر کے قلعے کی سنگی دیواروں کو گھاس کے تنکوں کا ڈھیر بنادیا تھا۔ ”خسرو! ہمارے بازوں کو دیکھ رہے ہو کہ کیسی سرمستی کے عالم میں آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ آج انہیں روکنے والا نہیں اور ان سرخرو شوں کو کیسے روکا جاسکتا ہے کہ یہ سب کے سب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے غلام“ علاء الدین فتح کا یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی جھلکے لگی تھی۔ ”خسرو! حضرت شیخ کی دعاؤں نے علاء الدین کو شرم رسوائی سے بچا لیا ورنہ آج تمہارا گلان اپنے سینے پر ناکامی کے زخم سجائے کسی گوشے میں پڑا لوگوں کے طعنے سن رہا ہوتا۔ وہ کیسا اذیت ناک وقت ہوتا خسرو! جب ہمارا شوق تغیر ایک دیوانے کا خواب بن جاتا۔ ہم نے کیسے پربول صحرا ہائے لشکروں کو جھونک دیا تھا۔ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ!“ جوش اضطراب میں علاء الدین نے حضرت خسروؒ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ”خسرو! ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے حضرت شیخ کی بارگاہ میں رہی درخواست پیش کی۔“

امیر خسروؒ کی عجیب کیفیت تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آپ خاموش کھڑے اس راستے طرف دیکھ رہے تھے جس سے گزر کر سلطان کا لشکر یہاں تک پہنچا تھا۔

”خسرو! ہمارے پاس حضرت شیخ کا شکر یہ ادا کرنے کیلئے الفاظ نہیں ہیں۔ خدا نے ہمیں سیم وزر کے تہ انبار دیئے ہیں کہ دنیا کا بوسے بڑا بادشاہ بھی دولت میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر جب ہم ام الدین اولیاؒ کو کوئی نذر پیش کرنا چاہتے ہیں تو یہ سارے خزانے بڑے حقیر نظر آنے لگتے ہیں اور ہم ایک شہنشاہ سے ایک غریب مفلس انسان بن جاتے ہیں جس کا دامن وریدہ ہوتا ہے اور ہاتھ خالی نظر آتے ہیں۔“

”شیخ کے حضور یہی انکسار سب سے بڑی نذر ہے۔“ حضرت امیر خسروؒ نے انتہائی ذہانت سے طمان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جب تک آپ کے یہ جذبات برقرار رہیں گے، حضرت شیخ کی دعاؤں کی ولادت بھی حاصل رہے گی۔“

”خسرو! ایسا ہی ہو گا۔“ علاء الدین کا لہجہ اثر انگیز تھا جیسے یہ اس کے دل کی آواز ہو۔ اچانک ملک نصرت خان گھوڑے پر سوار، پہاڑی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ سلطان نے امیر خسروؒ کے تھوچھوڑ دیئے اور اپنے مصاحب خاص کی جانب دیکھا۔ نصرت خان بار بار اپنی شمشیر کو فضا میں ابرار تھا۔ وہ پہاڑی کے نیچے آکر ٹھہر گیا اور بلند آواز میں بولا مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب علاء الدین اس کی گفتگو سمجھ نہیں سکا۔

”ہم آ رہے ہیں نصرت خان.....!“ سلطان نے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے نصرت خان کو پھٹھرنے کیلئے کہا۔ حقائق دسے اپنی اپنی جگہ ہوشیار و مستعد ہو گئے اور علاء الدین اپنے جاں نثاروں کی مدد پر تقاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ ابھی سلطان کے قدم ہموار زمین کو ٹھکی نہیں سکے تھے کہ ملک نصرت خان احتیاطاً جھک گیا۔

”اٹھو نصرت خان! ہمیں اپنا چہرہ دکھاؤ کہ تم کڑی آزمائش کے میدان سے سرخرو لوٹے ہو۔“ علاء الدین نے اپنے جاننا سپہ سالار کو پر جوش آواز میں پکارا۔

ملک نصرت خان سیدھا ہوا اور اس نے اپنی شمشیر کو نیام سے نکال کر سلطان کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”سلطان کے جاہ و جلال کا سایہ پورے چوڑے چھا گیا۔ شاہ کے دست کشور کشائے غلاموں کو جو شمشیریں عنایت کی تھیں وہ سب کی سب دشمنوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ کسی سرکش و نافرمان کی گردن اس کے کاندھوں پر قائم نہیں رہی اور راجپوتوں کے جتنے سر بھی نظر آ رہے ہیں وہ سلطان کی دہشت سے جھکے ہوئے ہیں۔ انہیں امان دیدی گئی ہے کہ وہ فاتح عالم کے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔“ ملک نصرت خان نے محاذِ جنگ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”اور وہ مغرور عورت کہاں ہے ملک؟“ سلطان نے بے چین ہو کر رانی پد منی کے متعلق سوال کیا۔ ”ابھی کچھ خبر نہیں سلطان معظم!“ ملک نصرت خان نے جواباً عرض کیا۔ ”ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ شہنشاہ کے نمک خوار معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ایک لمحے کیلئے علاء الدین ادا اس نظر آنے لگا مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پایا۔ ”اور خواجہ حاجی کہاں ہے؟ عراقی اور ظفر خان کیا کر رہے ہیں؟“ سلطان نے اپنے تئیں سپہ سالاروں کے بارے میں دریافت کیا۔

”شاہ کا ہر غلام اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“ ملک نصرت خان نے اطمینان سے کہا۔ ”انہیں ہماری طرف سے اس عظیم الشان فتح پر مبارکباد دو اور ان سے کہو کہ وہ احتیاط کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اگر ان کے جسموں پر کوئی زخم آیا تو شاہ والا اسے اپنے دل پر محسوس کر سگے۔“ سلطان نے ملک نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم سب ہمارے دست و بازو ہو اور ہم کسی بھی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سگے کہ ہمارا ایک ہاتھ کٹ جائے۔ ملک! ان تئیں کو ہمارا حکم پہنچا دو کہ ان کی جائیں ہمارے لئے چڑو کی فتح سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی سلامتی کی طرف سے غفلت برتی تو سب جلد ہم ان سے ایک ایک کو تباہی کا حساب لیں گے۔“

ملک نصرت خان اپنے سلطان کی اس کرم نوازی پر بے قرار ہو گیا اس نے آگے بڑھ کر علاء الدین کے ہاتھوں کو بوسہ دیا قبائے شاہی کو کئی بار آنکھوں سے ملا اور تیزی کے ساتھ قلعے کی طرف چلا گیا۔ سلطان اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو رام دیو ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑا تھا۔ علاء الدین کو دیکھتے ہی زمین بوس ہو گیا۔ ”میرا علم سچا ہے رام دیو۔“ علاء الدین نے اس شعبہ باز کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تیری پیش گوئی پوری ہوئی۔“

”سمراتوں کے سمرات! ابھی کیا ہوا ہے۔“ رام دیو سلطان کے قدموں پر چلنے لگا۔ ”میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی تو اس زمین پر بڑے حشر اٹھیں گے، انسانی خون کے بڑے سیلاب آئیں گے اور پھر سلطان کا پرچم دوبارہ لہرا جائے گا۔“

”اسے ہمارے خیمے میں بھیج دو۔“ علاء الدین نے اپنے محافظ سپاہیوں کو حکم دیا اور خود تیزی سے اندر چلا گیا۔ رام دیو زمین سے اٹھا اور سلطان کی قربت سے شرف یاب ہونے کیلئے آگے بڑھنے لگا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اس عیار انسان کو انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکے کہ انہیں علاء الدین کے مزاج کا بخوبی اندازہ تھا۔ خوشامد ہندی سلطان کی فطرت میں شامل تھی اور رام دیو اس کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

ہمارا آفریدی بیرونی دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے سلطانی لشکر کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی مگر وہ نہ جانے بے خبر تھا۔ چندر سنگھ کے قتل ہو جانے کے بعد ایک امکانی رابطہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ شدید اس کے عالم میں روزانہ آسمان کی طرف دیکھتا اور اپنے پیدا کرنے والے کو پکارتا۔ ”اے خدا! ہمیں اس دنیا سے نکال کہ اب ان طلسمی دیواروں میں تیرے مجبور بندوں کا دم گھٹا جاتا ہے۔“

لاکھاری جو آفریدی سے زیادہ غمزدہ تھی، ان حوصلہ شکن لمحات میں اسے تسلیاں دیتی۔ ”سرور! دنیا خاندان سے بنایا جاتا ہے کہ ایک دن اس کی دیواریں گر جائیں اور قیدی آزاد فضاؤں میں سانس لے گا۔“

ہمارا آفریدی چند لمحوں کیلئے شرمسار سا نظر آئے لگتا اور پھر نرملا کے دلکش چہرے کو دیکھ کر بے اختیار کہتا۔ ”اگر تم میرے ساتھ ہو تو دنیا کی ساری آزادیاں اس قید پر قربان کر دوں مگر مجھے والدہ محترمہ کی ان کاشیاں آتا ہے کہ بیٹے کی جدائی نے ان کا کیا حال بنا دیا ہو گا؟ آخر وہ ماں ہیں۔۔۔۔۔۔ اور پھر ت یاد آتی ہے جب میں نے اسے ہانسی روانہ کیا تھا تو وہ اس طرح ردی تھی جیسے مجھ سے ہمیشہ کیلئے باہری ہو اور وہ خواب نرملا! بڑے بھیاں ک خواب ہیں جو مجھے ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں۔ میں موت ن ڈرتا کہ آبرو مندانه موت ہر مسلمان کی تمنا ہوتی ہے لیکن ملک کا نور کا تصور مجھے بین سے سونے ہا۔ کون جانے اس غیرت فروش اور بزدل دشمن نے میرے پیچھے کیا گل کھلائے ہوں؟ میں تو ہر زمینی رہتا ہوں۔ میرے غم کو کوئی نہیں سمجھ سکتا نرملا! کوئی نہیں سمجھ سکتا۔“ یہ کہتے کہتے آفریدی شہت زدہ انسان کی مانند نظر آنے لگتا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں پھوٹنے لگتیں۔

”میں ان دونوں کیلئے دعا کرتی ہوں سرور!“ نرملا رونے لگتی۔ ”دن رات اپنے خدا سے ان کیلئے مانگتی ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔ اب وہی تو میری سسکتی ہوئی تمنائی تسکین کا ایک ہیں۔“

اکی ٹمگھاری کا یہ انداز دیکھ کر آفریدی بھی اٹھکبار ہو جاتا۔ ”باں نرملا! تم ضرور دعا مانگ کر دو۔ یہ کہ ہم تو پیدا انہی مسلمان ہیں مگر تم اپنا سب کچھ چھوڑ کر حلقہٴ نام میں داخل ہوئی ہو۔ تمہارے اسے زیادہ ہے اور معصوم ہیں، اس لئے خدا تمہاری زیادہ سے گا۔“

کرناک فضا میں چھ ماہ گزر چکے تھے لیکن آج جب علی عامر آفریدی طلسم کدے کے باغ میں آکر اوت آسمان کی طرف دیکھنے لگا تو اسے ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آیا پھر اس نے بڑی وارفتگی میں چیختے ہوئے نرملا کو اطلاع دی۔ ”میرا سلطان آپہنچا اور اس نے رتن سنگھ کے غرور کو ناک میں

بلی بدھوا سوں کی طرح نرملا کو کھینچتا ہوا باغ میں لایا اور سیاہ دھویں کے بادلوں کی طرف اشارہ نے لگا۔ ”میرے سلطان کی آتش جلال نے بت پرستوں کے نشیمن کو پھونک ڈالا۔ پتھر کے پجاری اٹھیں پر اپنے آشیانے کے چار بنکے سجا کر دعوے کر رہے تھے کہ بجلیاں انہیں چھو بھی نہیں فرسوں! نادانوں کے انجام پر جنہیں کوئی تباہی والا نہیں تھا کہ برق ہمیشہ آسمان سے ٹوٹی ہے اور آگے دنیا کی ہر بلندی بج ہے۔“

آفریدی رقص کے سے انداز میں اپنے جذبہ مسرت کا اظہار کر رہا تھا اور نرملا لکھاری کی

”کیف کی شدت سے دردناک آوازوں میں چیخ رہی تھیں۔ معصوم بچوں کو بھی بچانے کی کوشش تھی مگر ان میں اکثر شوش کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے۔“

سلطان قلعے میں داخل ہونے کیلئے بے قرار تھا مگر سب سالاروں کی درخواست پر اسے رک جانا پڑا۔ ایک ایک لمحے کی خبر دے رہے تھے مگر علاء الدین کو جس اہم ترین اطلاع کا انتظار تھا وہ ابھی تک دل نہیں ہوئی تھی۔ رانی پدمنی ماتا کے مندر میں جل کر سستی ہو گئی تھی۔ سلطان کے فوجیوں نے اس کے سامنے آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگے تھے، اندھیرا پھیل جانے کے خیال سے علاء الدین کے دل نے راجپوت سمرات کی جستجو کا کام تیز تر کر دیا تھا لیکن ابھی تک رتن سنگھ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

”میں جانتا ہوں سلطان کہ وہ بزدل حکمران اس وقت کہاں ہو گا؟“ علاء الدین کی خوشنودی حاصل نے کیلئے رام دیو آگے بڑھا۔ ”اس نے راج محل کے کسی خفیہ تہ خانے میں پناہ ڈھونڈ لی ہوگی مگر وہ زیادہ تک فلاح عالم کی دسترس سے دور نہیں رہ سکتا۔“

علاء الدین نے فوراً رام دیو کو اشارہ کیا کہ وہ سپاہیوں کے ہمراہ جاکر رتن سنگھ کو تلاش کرے مگر اس شہیدہ باز نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”رات کے اندھیرے میں ہماری تمام دوڑ دھوپ باں جائے گی۔“

”اور اگر وہ اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر غائب ہو گیا؟“ علاء الدین نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے

”سلطان معظم کے جاں نثاروں کا محاصرہ اس قدر تنگ ہے کہ کوئی بلی بھی شاہ والا کے حکم کے بغیر قلعے باہر نہیں جاسکتی۔“ ملک نصرت خان اور خواجہ حاجی نے بیک زبان کہا۔

علاء الدین کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے سپہ سالاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”محاصرہ اس قدر تنگ کر دو یونٹیاں بھی اپنے سوراخوں سے باہر نہ آسکیں۔ تمام رات اس طرح جاگو کہ تمہاری پلک تک جھپکنے نہ ملے، ہر منٹ سنگھ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔“

رات اہل چٹوڑ کیلئے آہوں اور سسکیوں کی رات تھی۔ آخر جب مرنے والے مر گئے تو فریاد و فغاں ایک طوفان اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ ڈوب گیا، چھ ماہ کے محاصرے میں میراں کے باشندے روز جیتے تھے اور نہرتے تھے۔ انہیں اپنی آخری موت کا انتظار تھا اور جب وہ موت بھی آگئی تو خوف و دہشت کا عذاب ختم کیا و مومن اور اندیشوں کا ایسا عذاب جو حقیقی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

علاء الدین نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ فوجیوں کی بڑی تعداد راجپوت قیدیوں کی دلی کر رہی تھی جنہیں کئی بڑے خیموں میں محصور کر دیا گیا تھا۔ کچھ سپاہی راجپوت خواتین کی تمکیناں پر بٹھرتے۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جنہیں آگ کے شعلوں سے بچالیا گیا تھا۔ سلطان کے حکم پر کئی عورتوں اور بچوں کو طبی امداد بھی فراہم کی جا رہی تھی۔ ایک دستہ ان ماہر شہیر زونوں کا تھا جو قلعے کے بالکل اوپر طرف پیرے داروں کی حیثیت سے متعین کئے گئے تھے تاکہ راجہ رتن سنگھ اپنے سرداروں کے قتل و غارتہ نہ سکے۔

علاء الدین ایک تاریخی فتح حاصل کرنے کے باوجود بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ چٹوڑ پر فوج کشی کے ایسا ہی سبب تھے سلطان چاہتا تھا کہ پورا ہندوستان مکمل طور پر اس کے حلقہ اثر میں شامل ہو جائے۔ اسی

خوبصورت آنکھیں دھوئیں کو دیکھتے دیکھتے پتھر اکر رہ گئی تھیں اس کا سرخ و سفید پیکر ایک زرد رنگ اور بے چارے جیسے میں ڈھل گیا تھا۔ ”یہ میرا گھر جل رہا ہے سردار!“ اچانک نرملا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ”میری قوم، میرا وطن، میری گلیاں، میرے بچھٹ، میرے بچپن اور جوانی کی یادیں، میری سیلیاں، آج ہر شے کو آگ لگ گئی۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔“ یہ کہہ کر نرملا نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور سر کو ایک درخت سے ٹیک دیا۔ ”مجھے سارا دواؤں آفریدی اسٹانڈی زندگی کی آخری آزمائش سے گزر رہی ہوں۔“

آفریدی گھبرا کر آگے بڑھا اور اس نے نرملا کو اپنے توانا باز دھڑوں کی گرفت میں لے لیا۔ اب علی عام کو احساس ہو رہا تھا کہ جو لکھا اس کیلئے ناقابل بیان خوشی لے کر آیا تھا، اسی لمحے نرملا کے ہوش و حواس بچھین لئے تھے۔ آفریدی اپنی اضطراری حرکت پر بہت زیادہ پشیمان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نرملا کی دلجوئی کیلئے بے شمار تسلی آمیز کلمات کہے مگر وہ ساعت ہی بڑی جان لیوا تھی۔ بہت دیر تک نرملا پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری رہی۔

”یہ آگ سلطان کے سپاہیوں نے نہیں، خود راجپوتوں نے اپنے گھروں میں لگائی ہے۔“ نرملا آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ”یہ ان کی صدیوں پرانی رسم ہے کہ شکست سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو بھڑکائی ہوئی آگ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ان شعلوں میں وہ لوگ جل رہے ہیں جن کا کوئی قصور نہیں۔ معصوموں اور بے گناہوں کے اس جرم کی سزا ہے کہ وہ دنیا میں کیوں آئے تھے؟“

آفریدی کے ذہن میں ایک آندھی سی چلنے لگی۔ ”نرملا! مجھے اس ظلم کدے سے باہر جانا ہو گا۔ اٹھو! اور مجھے اس قید سے رہائی دو کہ ظلم کدے سے نکلے کارا صرف تم ہی جانتی ہو۔“

”کیا ہوا سردار؟“ ”نرملا، آفریدی کی بخونی کیفیت دیکھ کر سسم سی گئی۔“

”مجھے ممانعتی کے آخری الفاظ یاد آ رہے ہیں۔“ آفریدی یکایک بہت اداس نظر آنے لگا۔

”انہوں نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ اگر سلطان چٹوڑ پر غلبہ حاصل کر لے تو تم اس سے میری قوم کیلئے بہتر سلوک کی سفارش کرنا۔“

باپ کا ذکر سن کر نرملا کے جذبات کی دنیا ایک بار پھر زیر و زبر ہو گئی۔ ایک لمحے میں آنکھوں کے سامنے کئی زمانے آئے اور گزر گئے۔

”نرملا! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔“ آفریدی نے تیز آواز میں کہا۔

نرملا نے اپنے دل پر بوجہ کیا اور سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی۔ ”اس ہنگامہ خیزی میں آپ کہاں جائیں گے؟ کسی کو اپنی جان کا بھی ہوش نہیں ہو گا۔ کون جانے کہ راجپوت قلعے سے نکلنے والے ہیں یا سلطان کے سپاہی اندر داخل ہو چکے ہیں؟ اس عالم میں آپ کو کون پہچانے گا؟ پہلے آگ کو بجھ جانے دیجئے پھر پتہ چلے گا کہ کیا بچا ہے اور کیا کیا جل گیا ہے؟ میں آپ کو ان شعلوں کے درمیان سے گزر کر نہیں جانے دوں گی۔“ نرملا صدموں سے مڑا ہوا ہونے کے باوجود ابھی اور آفریدی کا دامن سختی سے پکڑ لیا۔

☆.....☆.....☆

شام تک قلعے کے ہر گوشے پر مسلمانوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ تقریباً تیس ہزار راجپوت قیدی ہٹائے گئے تھے ان میں جوان، بوڑھے اور بچے بھی شامل تھے۔ ہزاروں عورتیں جل کر خاک ہو چکی تھیں اور اتنی ہی خواتین کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حصار سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ اس کشاکش میں سلطان کے سپاہیوں کے لباس بھی جگہ جگہ سے جل گئے تھے۔ جن عورتوں کو موت کے منہ سے کھینچا گیا تھا ان کے چہرے بری طرح جھل جاتے

مقصود کے پیش نظر علاء الدین نے اپنے وفادار سپہ سالاروں کو ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں بھیجا اور یہ سلطان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے جاں نثاروں نے حق غلامی ادا کرتے ہوئے بڑی خورجین بھجوا دی تھی۔ نتیجتاً ہندوستان کے ایسے علاقوں پر بھی علاء الدین کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا جن کی تسخیر کے خواب دیکھتے کئی مسلمان حکمران دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان مقبوضہ خطوں میں بنگال، سندھ، گجرات، مالوہ، پنجاب اور کشمیر نمایاں تھے۔ جنوبی ہندوستان کی فتوحات اور شمالی علاقے پر خلعی حکومت اثرات اسی وقت قائم کر سکتے تھے جب چوڑی آزادی سلب کر کے اسے غلامی کی ناقابل شکست زنجیر بنا کر دیا جائے۔ یہاں سے گزر کر تجارتی راستے گجرات، مالوہ، وسط ہند اور سندھ کی طرف جاتے تھے۔ اس تجارتی نقطہ نظر سے بھی چوڑی غلبہ حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا اور جہاں تک چوڑی فوجی اہمیت کے حامل تھیں تو اس پر پرچم لہرائے بغیر تسخیر ہندوستان کا خواب دیکھنا محض حماقت تھی۔ اپنے اسی خواب کی تعبیر پانے پر علاء الدین خلعی نے اس دشوار گزار گھاٹی کا انتخاب کیا تھا جسے ہم ”وادی قن“ بھی کہہ سکتے ہیں علاء الدین عجیب و غریب فطرت کا انسان تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے دشمن سے الجھنے کیلئے ناقابل بیان ہمت تراشتا تھا۔ راجہ رتن سنگھ ہی نہیں خود سلطان کے سپاہی بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ علاء الدین صرف ایک عورت کیلئے انتہائی پیچیدہ بازی کھیل رہا ہے مگر یہ راز چند لوگوں کو معلوم تھا کہ علاء الدین کی نظریں کہیں تھیں، نشانہ نہیں اور۔

آج سلطان کے تمام تیر نشانے پر بیٹھ گئے تھے لیکن وہ پھر بھی بے قرار اور بجا بھانپنا کر رہا تھا۔ یہ اداسی بے چینی محض اس لئے تھی کہ وہ مکمل فتح حاصل کرنے کے باوجود رانی پد منی اور راجہ رتن سنگھ کو لڑکھڑا قدموں سے اپنی بارگاہ میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر جب سلطان کا اضطراب حد سے بڑھا تو اس رام دیو کو اپنے خیمے میں طلب کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے پچیس سال پہلے ہماری آمد اور فوجی پیش گوئی کی مگر آج ہم پوچھتے ہیں کہ پد منی اور رتن سنگھ کے بارے میں تیرا علم کیا تھا ہے؟“

رام دیو فوراً اپنی بوسیدہ کتاب لے کر حاضر ہوا۔ شکستہ اوراق میں کچھ دیکھتا رہا اور پھر کانڈ پر زانچہ کھینچ کے بعد بولا۔ ”فلاح عالم! ستاروں کی رفتار بتا رہی ہے کہ پد منی آگ کے شعلوں میں جل کر دوسری دنیا طرف جا چکی۔ رتن سنگھ اپنی ایک خفیہ پناہ گاہ میں زندہ ہے جو کل کسی وقت ایک قیدی کی حیثیت سے آہ کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔“

”پد منی چلی گئی؟ ہماری اجازت کے بغیر۔“ علاء الدین کا لہجہ قہرناک تھا مگر اس میں بوشیدہ گلستہ آثار کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ”آج تک ایسا نہیں ہوا رام دیو! کیا ستاروں کی چالیں بدلی نہیں جاسکتیں۔“ ”اے سنسار کے وجیتا! ستاروں کی چال کو پرامتا کے سوا کون بدل سکتا ہے؟“ رام دیو نے ڈر ڈرتے کہا۔

”ہاں! آسمان کے فیصلوں کو بدلا نہیں جاسکتا۔“ علاء الدین نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ”پھر بھی ہم نے اس پر زندگی کے دروازے کو بند کر دیئے۔ جو ہماری بارگاہ میں حاضر نہیں ہو سکتا اس جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔“ علاء الدین کے لہجے میں دولت و اقتدار کی بڑی خوفناک آگ تھی جس کا پلٹیں دیکھ کر رام دیو لرزے لگا۔

چند لمحوں تک سلطان خاموشی سے خیمے کی چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دوبارہ رام دیو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کیا دہلی کے سفیر نے پد منی تک ہمارا حکم نہیں پہنچایا تھا کہ وہ سلطان کے شہنشاہ میں داخل ہو کر پورے ہندوستان پر حکمرانی کرے۔“ علاء الدین نے غیر ارادی طور پر علی عامر آفریدی کا ذکر چھپوڑ دیا۔

”رتن سنگھ کتنا تھا کہ ہمارا کوئی سفیر چوڑے دربار میں داخل نہیں ہوا۔“ آفریدی کا ذکر سن کر رام دیو ایک لمحے کیلئے سناٹے میں آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا عیار ذہن اکروٹ بدل چکا تھا۔ ”رتن سنگھ جھوٹ بولتا ہے فلاح عالم!“ رام دیو کا لہجہ اتنا سے زیادہ خوشامد نہ تھا۔ وہ نوجوان سفیر چوڑا آیا تھا اور اس نے آپ کا فرمان خاص بھی چوڑے حکمرانوں تک پہنچا دیا تھا۔

علاء الدین ایک بیک مضطرب سانظر آئے لگا۔ ”آفریدی یہاں آیا تھا؟“ سلطان نے چونک کر پچھا۔ ”پھر وہ کہاں چلا گیا؟ ہم بہت دن تک دہلی میں اس کا انتظار کرتے رہے مگر جب کوئی اطلاع نہیں تو ہم نے اپنی فوجوں کو یلغار کا حکم دیا کہ جن معاملات میں تحریر اثر انداز نہیں ہوتی، ہم اس کا فیصلہ شمشیر سے کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر علاء الدین جواب طلب نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔

رام دیو کیلئے یہ ایک موقع تھا جب وہ آفریدی کی طرف سے سلطان کے دل میں نفرتوں کا غبار بھر سکتا تھا۔ ”فلاح عالم کے تمام فیصلے دانشمندانہ سہی مگر دل کی سفارت کیلئے بلند کردار انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید سلطان نے اس بے شرم نوجوان پر کچھ زیادہ ہی اعتبار کر لیا تھا۔“ رام دیو نے شک کی زمین میں ناگیزی کا پہلاںج بوتے ہوئے کہا۔

علاء الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”ہماری آنکھیں اتنا بداد ہو کا کھا سکتی ہیں؟“ سلطان زمانہ! اس حقیر غلام کی زبان حقیقت کا اظہار کرنے سے عاجز ہے۔“ رام دیو لرزے لگا۔ ”کہہ دے کہ جو کچھ تجھے کہنا ہے کہ اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔“ علاء الدین کی تیز آواز اس طرح جی کہ رات کے سناٹے بھی کانپنے لگے۔

”میں نے اپنی زندگی میں اتنا بد کردار، نمک حرام اور بے وفائے شخص نہیں دیکھا سلطان!“ رام دیو نے عامر آفریدی کے بارے میں زہر اگنا شروع کر دیا۔ ”اس نے شاہ والا کی اعلیٰ ظرفی کے قصیدے پڑھنے کے بجائے ایسی غلیظ باتیں اپنی زبان سے ادا کیں کہ خلعی حکومت کی عظمتوں کا فلک بوس محل کی غریب ایک جھونپڑی سے بھی زیادہ کمتر نظر آنے لگا۔“

علاء الدین کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ بدلنے لگا مگر اس کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ بس رنگ آنکھوں کی جنبش سے رام دیو کو بیان جاری رکھنے کا حکم دے کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

رام دیو نے سر جھکا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔ ”اس نے آپ کا خط دینے سے پہلے لی پد منی کو تنبیہ کی تھی کہ سلطان حرف انکار سننے کا عادی نہیں۔ جو عورت علاء الدین کے جذبات الاحترام نہیں کرتی اسے جبراً شہنشاہی میں داخل کر لیا جاتا ہے اور ایسی عورتوں سے دہلی کے محلات سے ہوئے ہیں۔“ رام دیو کا لہجہ اس قدر سرد تھا جیسے کوئی سانپ اپنے شکار کو ڈس رہا ہو۔

علاء الدین کے دل و دماغ جلنے لگے تھے۔ ”اور اس ناشکر گزار آفریدی نے کیا کہا تھا؟“ رام دیو کی گردن بدستور جھکی رہی۔ ”اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب سلطان اپنے حقیقی بچا کا سر کاٹ کر کھائے گا تو اس کا سر بدستور جھکی رہی۔“ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جب سلطان اپنے حقیقی بچا کا سر کاٹ کر کھائے گا تو اس کا سر بدستور جھکی رہی۔

علاء الدین کے غصے کی آگ بھڑک کر بے قابو ہو گئی تھی۔ ”احسان فراموش نے گستاخی کی انتہا

رہی۔“ رام دیو کا مقصد پورا ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے پھلے ہوئے لوہے پر آخری ضرب لگا کر اسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی کوشش کی۔ ”اگر وہ نافرمان سفیر شاہ والا پر یہ ہمت نہ تراشتا تو بہت ممکن تھا کہ پد منی

ار اہل چوڑ کو یقین کر لینا پڑا کہ دونوں ریاست کی سرحدوں سے بہت دور جا چکے ہیں۔“
 علاء الدین کی پیشانی کھیروں سے بھر گئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ایک ایک سلطان
 لہجہ کے اشارے سے رام دیو کو نکل جانے کیلئے کلام اور پھر غلط ہوتے ہی اس کے ذہن میں ملک کافور
 کے الفاظ ابھرنے لگے۔ سلطان کے محبوب غلام نے کہا تھا۔ ”آفریدی“ شاہ والا کو محسن جلال الدین
 خلجی کا قاتل کہتا ہے اور ایک قاتل کے سائبر اقتدار میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے اس نے اپنی ماں اور
 ن کو ہانسی روانہ کر دیا ہے کہ موقع ملے ہی انہیں بھی چوڑ بلا لے اور سلطان کی حدود مملکت سے دور چلا
 جائے۔“ رام دیو اور ملک کافور کے بیانات میں ایک بات مشترک تھی کہ آفریدی علاء الدین خلجی کو
 نہیں سمجھتا ہے اور اس کے اقتدار کو عاصیانہ قرار دیتا ہے۔ سلطان کو رام دیو کے بیان پر اعتبار آگیا کہ وہ
 یوں میل دور رہتے ہوئے بھی اسی بات کو دہرا رہا تھا جو ملک کافور نے ”قصر ہزار ستون“ کے شاہی
 شرت کدے میں کہی تھی۔ حالانکہ چوڑ کے منافق چادو گرنے اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا جس
 سے ہندوستان کی اکثریت باخبر تھی۔ جب علاء الدین نے اپنے بچے کے کئے ہوئے سر کو ادھ کی گلی گلی میں
 اڑا تھا تو چوڑ کے حکمران اس واقعے کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے۔ رام دیو نے علاء الدین کی سفاکی
 کی اس افسانے کو آفریدی سے منسوب کر دیا تھا تاکہ شاہی سفیر سلطان کی نظروں سے گر جائے اور اس طرح
 ان کا انتقامی جذبہ تسکین پاسکے۔ اب یہ آفریدی کی بد نصیبی تھی کہ وہ سفارت کی اعلیٰ ترین مثال قائم
 کرنے کے باوجود علاء الدین کی نفرتوں کا ہدف بن گیا۔

سلطان اپنے خیمے میں تھا تھا اور شدید عالم غضب میں بول رہا تھا۔ ”ہم نے تجھے زمین کی پستیوں سے اٹھا
 ر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا مگر تیری نمک حرام فطرت نے ہماری نوازشات کی قدر نہ کی۔ اب تو مجھ سے
 چوڑ سے فرار ہو کر ہمارے حلقہ اثر سے نکل جائے گا۔ نہیں! خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔ ہم رتن سنگھ کے
 نفعیے سے نجات حاصل کر لیں۔ پھر تجھے دیکھیں گے کہ تو کہاں تک بھاگ سکتا ہے؟ اور کچھ دن اپنی
 لڑائی ناسنس پوری کر لے۔ احسان فراموشی اور ناشکر گزاری کے مجرموں کو سلطان کے دستِ قہر سے
 ڈال دیں چاسکتا۔“

☆ ☆ ☆

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی علاء الدین نے رام دیو کو طلب کیا۔ اس دوران سلطان کے تمام
 پر سالار بھی خیمے میں حاضر ہو چکے تھے۔ ”کیا مرنے والے راجپوت سپاہیوں کے چہرے دیکھ لئے گئے؟“
 علاء الدین نے ملک نصرت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
 ”سلطان معظم کے حکم سے پہلے ہی ایک ایک لاش کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔“ ملک نصرت خان نے جواباً
 اٹھ لیا۔ ”مرنے والوں میں رتن سنگھ موجود نہیں ہے۔“

”پھر رام دیو کا خیال درست ہے۔“ سلطان نے اس غدار برہمن کی طرف دیکھا جو علاء الدین کی
 فرمودی حاصل کرنے کیلئے اپنے ملک و قوم کی آخری نشانی بھی فروخت کر دینا چاہتا تھا۔ ”ملک نصرت! تم
 کو رام دیو کے ساتھ اس خفیہ سرنگ کی تلاشی اوجھاں رتن سنگھ کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے۔ مگر اس طرح
 کہ تم کوئی گزند نہ پہنچے۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ کہ وہ پہاڑی چوہا اپنے سوراخ میں شیر بننے کی کوشش
 کرے گا۔ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال دیتا۔“

ملک نصرت خان نے گھٹنوں کے بل جھک کر سلطان کی قبائے زر نگار کو بوسہ دیا اور ماہر شمشیر زنیوں
 کا ایک دستہ لے کر قلعے کی جانب روانہ ہو گیا۔ خواجہ حاجی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ملک

سلطان کے حرم میں داخل ہونے پر آمادہ ہو جاتی لیکن ایک خاندانی عورت داشتہ کی حیثیت سے زندگی نہیں
 گزار سکتی تھی۔ یہی وہ اندیشہ تھا جس نے پدمنی کو آپ سے ہمیشہ کیلئے بد ظن کر دیا اور نہ کون ایسی خاتون
 ہے جو ملک بھند کا تاج پہننا نہیں چاہتی۔“ رام دیو علاء الدین کے سینے میں بھڑکتی ہوئی نفرتوں کی آگ کو
 عجیب عجیب انداز سے ہوا سے رہا تھا۔

”تیرا مطلب ہے کہ اس بدکار آفریدی کی غلط سفارت نے ہمارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔“
 علاء الدین کے لہجے سے انگارے برس رہے تھے۔

”یقیناً فتح عالم!“ رام دیو نے اپنا سر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اٹھ! کہ سجدہ گزاری کا وقت نہیں ہے۔“ علاء الدین نے رام دیو کے سر پر ہلکی سی ٹھوک مارتے
 ہوئے کہا۔ اپنا مذہب بچ دینے والا عیار برہمن سیدھا ہوا گیا۔ ”ہمیں بتا کہ ہمارے وقار کے کیڑے بن کو انداز
 کرنے کے بعد وہ بد نما کہاں چلا گیا؟“

”رانی پدمنی اس گستاخ و بے ادب سفیر کو قتل کر دینا چاہتی تھی مگر ریاست کا ممانعتی و کرم سنگھ ایک
 ہوشمند انسان تھا۔ اس نے سیاسی تقاضوں کے پیش نظر آفریدی کو چوڑ کے حکمرانوں کے قہر و غضب سے
 بچا لیا اور اپنے گھر لے گیا۔“ رام دیو انتہائی جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ گزرتے ہوئے واقعات سناتے
 لگا۔ ”و کرم سنگھ نے سلطان کے سفیر کو محض اس لئے بچا لیا تھا کہ وہ دہلی واپس جانا نہیں چاہتا تھا اسے آپ
 سے شدید نفرت تھی۔ اس نے کئی بار رانی پدمنی سے سیاسی پناہ حاصل کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔
 و کرم سنگھ بھی آپ کا بدترین دشمن تھا اور فاتح عالم کو سرور بار گالیاں دیا کرتا تھا۔ ممانعتی ہی نے
 رانی پدمنی اور راجا رتن سنگھ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ آفریدی کی جان بخش دیں اور اس کے صلے میں شاہی سفیر
 حکومت خلجی کے کئی اہم فوجی راز ظاہر کر دے گا۔ رانی پدمنی کا غصہ کسی حد تک زائل ہو چکا تھا اور وہ
 آفریدی کی درخواست پر ابھی غور ہی کر رہی تھی کہ ایک عبرتناک واقعے نے حالات کارخ موڑ دیا۔ آپ کا
 وہ نامہ بر صرف احسان فراموش ہی نہیں بلکہ ایک بد کردار فوجوان بھی تھا۔ اس نے و کرم سنگھ کی آوارہ مزاج
 بیٹی نرمل کو ر غلابا اور پھر ایک دن وہ دونوں رات کی تاریکی میں ”منتری بھون“ سے فرار ہو گئے۔ و کرم سنگھ
 رانی پدمنی کا حقیقی چچا تھا۔ ریاست کا ہر فرد اسے احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ مگر اس واقعے نے جوہان
 راجپوتوں کی آبرو کو مٹی میں ملا دیا۔ و کرم سنگھ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور بالآخر ایک روز اس نے
 خود کشی کر لی۔“

علاء الدین کے ذہن میں نفرت و قہر کی آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں لیکن اس نے اپنے سفیر کی
 بے راہ روی کے افسانے کو پورے تحمل کے ساتھ سنتے ہوئے کہا۔ ”کیا چوڑ کا حفاظتی نظام اس قدر ناقص
 ہے کہ دو مجرم عاشق اتنی آسانی کے ساتھ فرار ہو سکتے ہیں؟“

”ریاست کے سرحدی انتظامات تو اپنی جگہ درست تھے لیکن چوڑ کی بعض رازدار شخصیتوں کا خیال ہے
 کہ و کرم سنگھ کے محل میں کوئی خفیہ سرنگ موجود ہے اسی سرنگ کے ذریعے وہ دونوں فرار ہوئے ہیں۔“

رام دیو نے اپنی من گھڑت کہانی میں نئی رنگ آمیزی کرتے ہوئے کہا۔
 ”کیا رتن سنگھ اور پدمنی نے ان دونوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ علاء الدین نے ایک اور

سوال کیا۔
 رام دیو چونچلہوں کیلئے خاموش ہو گیا پھر اسے مجبوراً بچ بولنا پڑا۔ ”رتن سنگھ نے آفریدی اور نرمل کی جستجو
 میں ”منتری بھون“ کو آگ لگا دی مگر اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سرنگ کا کوئی سراغ نہیں ملا اس

ملک نصرت خان نے ایسا ہی کیا۔ شیر کاسر آسانی کے ساتھ گھوم گیا۔ ”اب اسے بائیں جانب گردش دیں۔“ رام دیو نے دوسری ہدایت دی۔

ملک نصرت خان نے تیزی سے اس شعبہ بازی کی ہدایت پر عمل کیا، شیر کاسر گھومتے گھومتے ایک خاص نقطہ پر ٹھہر گیا۔ اس سر کے گرد چار بڑے بڑے قیمتی پتھریا قوت، زمرد، پتھر اور نیلم جڑے ہوئے تھے۔ بائیں اور پتھر دار بڑے میں تھے اور زمرد اور نیلم دوسرے دائرے میں نصب کئے گئے تھے۔ جب شیر کاسر گردش کرتے کرتے نیلم کے قریب پہنچا تو رام دیو نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”بس سردار! اب اسے اپنی طرف کھینچ لیجئے۔“ طلسم کے تقاضے پورے ہو گئے۔

ملک نصرت خان نے رام دیو کی ہدایت کے مطابق سر کو کھینچا اور وہ آسانی کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اب وہاں چار میٹھن نظر آ رہی تھیں سوئے، چاندی، تانبے اور لوہے کی بنی ہوئی میٹھن۔

”اب ان میٹھنوں پر ترتیب کے ساتھ ضرب لگائیں۔“ رام دیو نے نئی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ملک نصرت خان نے اپنے ایک سپاہی سے دھڑی کر زلے کر پٹلے سوئے، پتھر چاندی، تانبے اور آخر میں لوہے کی میٹھن پر بھرپور ضربیں لگائیں۔ ملک نصرت خان کا خیال تھا کہ ان ضربوں کے بعد اس دیوار میں کوئی ٹکاف پیدا ہو جائے گا مگر جب اس قسم کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تو شہابی سپہ سالار نے سوالیہ نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھا۔

رام دیو بہت غور سے مختلف دھاتوں کی ان ابھری ہوئی میٹھنوں کو دیکھ رہا تھا جو ملک نصرت خان کی زوردار ضربوں کے بعد دیوار کی سطح کے برابر ہموار نظر آنے لگی تھیں۔

”آفرین ہے سردار!“ رام دیو نے ملک نصرت خان کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے بازوؤں کی طاقت بے مثال ہے۔ آپ کی ایک ہی ضرب نے ان میٹھنوں کو اس نقطے تک پہنچا دیا جو اس طلسم کی حقیقی کنجی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رتن سنگھ کے طاقتور ترین سپاہی بھی کئی میٹھنوں میں اس سطح کو ہموار کرتے تھے۔“

ملک نصرت خان حیرت زدہ سا کھڑا تھا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟“

اس کے ہونٹوں کو اس طرح جنبش ہوئی جیسے وہ خود بھی رام دیو کے طلسم کا ایک حصہ بن گیا ہو۔

رام دیو نے کوئی جواب نہیں دیا اور رتن سنگھ کے باپ سر سنگھ کی تصویر کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔ یہ تصویر اپنے طول و عرض میں اتنی بڑی تھی کہ اس کا ایک حصہ فرش پر تھا اور دوسرا حصہ کمرے کی چھت سے لگا رہا تھا۔ رام دیو نے تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ ایک طرف سے کچھ جھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ”یقیناً راجہ رتن سنگھ تمہارے خانے کے اندر موجود ہے۔“ رام دیو نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خانہ کے گہرائی میں بند کیا گیا ہے اس لئے یہ تصویر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔“

پھر رام دیو کی ہدایت پر کئی سپاہیوں نے تصویر کو کھینچ کر الگ کیا تو ملک نصرت خان کی آنکھیں حیرت سے کھلی گئیں۔ تصویر کے پیچھے دیوار میں اتنا بڑا شکاف نمایاں ہو گیا تھا جس سے ایک آدمی آسانی سے گزر کر اندر جا سکتا تھا۔ ”یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں رتن سنگھ کی آخری پناہ گاہ تک لے جائے گا۔“

ملک نصرت خان کچھ دیر تک اس طلسم کو دیکھتا رہا جو اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت مشکل اور پیچیدہ نظر آ رہا تھا۔ اگر اس سلسلے میں رام دیو ہمتا کی نہ کرے تو رتن سنگھ پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ ابھی ملک نصرت خان اپنے خیالات میں گم تھا کہ رام دیو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سردار! یہ ایک مختصر سی سرنگ ہے جسے عبور کرنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک اور آہنی دروازہ نمودار

نصرت خان کے قریب رہے۔ سلطان کی یہ پیش بندی اس لئے تھی کہ اگر رتن سنگھ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ردپوش ہو گیا تو پھر سخت مقابلے کا اندیشہ تھا اور اس نازک موقع پر ملک نصرت خان کو تازہ ملک کی ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔ تاج الدین عراقی اور ملک ظفر خان کو ہدایت دی گئی کہ وہ قلعے کے ستاروں دروازوں پر مزید فوجی دستے منتھیں کر دیں کہ رتن سنگھ کیلئے کھلے راستوں سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ آخری احکام جاری کرنے کے بعد سلطان اپنے خیمے میں واپس آکر بستر دراز ہو گیا۔ رانی پدی کی جگہ پر ہلاک ہوئے، رتن سنگھ کی ردپوشی اور علی عامر آفریدی کی غداری کے تصورات نے اسے رات بھر سوئے نہیں دیا تھا۔

رام دیو ملک نصرت خان کے ہمراہ قلعے کے مختلف بیچ و خم سے گزرتا ہوا رانی پدی کی خواب گاہ تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ملک نصرت خان کے توتا سپاہیوں نے بھاری گرزوں کی ضرب سے دروازہ توڑ دیا۔ ملک کھسار کی خواب گاہ اگرچہ بے حد قیمتی چیزوں سے آراستہ تھی لیکن ملک نصرت خان نے کمرے کے گوشے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ اسے علاء الدین خلجی جیسے شہنشاہ کی خواب گاہ دیکھنے کے مواقع میسر آتے رہے تھے اس لئے رانی پدی کی راحت کدہ خلجی سردار کو متاثر نہ کر سکا۔ بے نیازانہ آگے بڑھتا رہا۔ رام دیو پدی کی خواب گاہ سے نکل کر ایک اور آراستہ کمرے میں پہنچا۔ یہ رام رتن سنگھ کا عشرت خانہ تھا جہاں شراب نوشی کے قیمتی برتنوں کے علاوہ دلکش عورتوں کے کچے مجسمے بھی نصب تھے جنہیں ملک نصرت خان نے حیرت سے دیکھا۔ بے حیائی کے یہ چیکر آج تک خلجی سردار کی نظروں سے نہیں گزرے تھے۔ رام دیو نے تیز قدموں سے اس کمرے کو عبور کر لیا اور پھر وہ لمختہ کمرے میں پہنچا جہاں رتن سنگھ کے آباد اجداد کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔

”ابھی ہمیں اور کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑے گا؟“ ملک نصرت خان نے آکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بس سردار! ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے۔“ رام دیو نے خوشامد کے انداز میں کہا اور سامنے کی دیوار دیکھنے لگا جس پر ایک شیر کا محوط شدہ سر آویزاں تھا۔ رام دیو کچھ دیر تک اس سر کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہا۔ پھر مسرت آمیز لہجے میں چیختے ہوئے بولا۔ ”میرا اندازہ درست نکلا۔ رتن سنگھ اس راستے سے اپنے خفیہ تہ خانے میں داخل ہوا ہے۔ یہ پناہ گاہ میرے ہی مشورے پر تعمیر کی گئی تھی۔“

”اپنی لاف زنی بند کر کہ ہمارے پاس ان فضول باتوں کے سننے کیلئے وقت نہیں ہے۔“ ملک نصرت خان نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں سردار! یہ کوئی عام راستہ نہیں ہے۔“ رام دیو ملک نصرت خان کی تلخ کلامی پر جھنجھلا اٹھا۔ ”میرے مجبور یوں کا یہ زہرا اپنے حلق سے اتارنا پڑا۔“ ”میں نے یہ تہ خانہ سات ستاروں اور سات دنوں کے حساب سے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں ایک مخصوص طلسم پوشیدہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس طلسم سے واقف نہیں زندگی بھر بھٹکتا رہے گا اور راجہ رتن سنگھ کا لگا سا سراغ تک نہ پاسکے گا۔“

یہ کہہ کر رام دیو نے دیوار پر آویزاں شیر کے سر کو اتارنے کی کوشش کی مگر وہ ایک پست دندان تھا۔ اس لئے اس کے ہاتھ ہدف تک نہ پہنچ سکے۔ رام دیو پلٹا اور ملک نصرت خان سے کہنے لگا۔ ”سردار! آپ پر درگاہ طاقت سے اس درندے کے سر کو کھینچ کر الگ کر دیتے۔“

ملک نصرت خان نے اپنی دراز قامت سے قائمہ اٹھایا مگر وہ سر کو دیوار سے علیحدہ نہ کر سکا۔

”اسے دائیں جانب گھمائیں یہاں تک کہ سر الٹا ہو جائے۔“ رام دیو نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ہوگا۔ اس دروازے سے گزر کر ہم ایک طویل وعریض کمرے میں پہنچ جائیں گے جہاں رتن سنگھ تھا ہوا گیا کچھ دوسرے راجپوت سردار بھی موجود ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چوڑے کپڑے پہن کر باقی ماندہ فوجی دستے اپنی حفاظت کیلئے متعین کر دیئے ہوں، اس لئے آپ احتیاط سے آگے بڑھیں۔ اپنے سپاہیوں کو آگے چلنے کا حکم دیں اور خود ان کے پیچھے رہیں۔ ” رام دیو نے ملک نصرت خان کو طلسم کدے کے بیچوں بیچ سمجھاتے ہوئے کہا۔

ملک نصرت خان نے حقیر آمیز نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھا۔ ”سلطان کے جاں نثاروں کا یہ مزاج نہیں کہ سپاہیوں کو خطرات کی آغوش میں جھونک دیں اور خود اپنے آگے حفاظتی دیوار کھڑی کر دیں۔ یہ تو راجپوت سرداروں ہی کو زیب دیتا ہے کہ پوری قوم میں منہ لٹائی اور وہ ”طلسم کدے“ کی پناہ ڈھونڈ رہے ہیں، سلطان عالی مقام نے اپنے غلام ملک نصرت خان کو رتن سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اس لئے واوی فانی سپاہیوں کی قیادت بھی وہی کرے گا۔ ” یہ کہہ کر ملک نصرت خان نے اپنی شمشیر بھینی اور سپاہیوں کو بلند آواز میں پکارا۔ ”تم لوگ میرے عقب میں چلتے رہو اور رام دیو کو سب سے پیچھے رکھو کہ اسے موت سے ڈر لگتا ہے۔ ”

سربگ تاریک تھی۔ ملک نصرت خان کے حکم پر مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ پھر علاء الدین کا یہ وفادار مصاحب تیغ بے نیام لے کر آگے بڑھا۔ رام دیو واقف ہو کر غور سے دیکھتا تھا۔ موت کی اسی دہشت نے اسے تمام سپاہیوں سے پیچھے رکھا تھا۔ سربگ ختم ہوئی تو رام دیو کے بیان کے مطابق بائیں ہاتھ پر ایک مضبوط آہنی دروازہ موجود تھا۔ ملک نصرت خان نے طاقت آزمائی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ خلجی سردار چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ان سپاہیوں کو دروازہ توڑ دینے کا حکم دیا جو بھاری گرز اٹھائے ہوئے تھے۔ بالآخر دیو جانفشانی کے بعد راستے کی یہ رکاوٹ دور ہوئی۔ ملک نصرت خان نے دروازے میں داخل ہو کر دیکھا۔ راجہ رتن سنگھ اپنے پیچاس ساٹھ سرداروں کے ساتھ وسیع وعریض کمرے میں موجود تھا۔ دروازہ ٹوٹنے کی آواز سن کر رتن سنگھ اور اس کے ساتھی ہوشیار ہو گئے تھے مگر ان کے چہروں پر حیرت نامیدی کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ راجپوت سرٹ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان کے سپاہی تعاقب کرتے ہوئے اس خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے جس کا علم رانی پد منی اور رتن سنگھ کے سوا کسی تیسرے شخص کو نہیں تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک برقی سی لہرائی اور تصورات کے پردے پر رام دیو کا کمرہ بہرہ چرہ ابھر اکر وقت بت آگے جا چکا تھا۔ رتن سنگھ نے دیکھا۔ ملک نصرت خان تمہ خانے کے دروازے میں کھڑا ہے پکار رہا تھا۔

”رتن سنگھ! اگر تجھے معرکہ آرائی کا شوق ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا ایک سپاہی بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ یہ مقابلہ صرف تیرے اور میرے درمیان ہے۔ اگر تو مجھ پر غالب رہا تو شاہ والا کے دوسرے سہ سالار قسمت آزمائی کریں گے۔ اگرچہ میرے ایک حکم پر تیرے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن میں تجھے موقع فراہم کرتا ہوں کہ شاید اس طرح تیری ناکام حسرتوں کا غبار کچھ کم ہو جائے۔ ” راجہ رتن سنگھ نے نفرت بھری نظروں سے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا اور گرجدار آواز میں بولا۔

”میں تیرے سلطان سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو میرے درجے کا انسان نہیں ہے۔ ”

”تو ایک حقیر سا جاگیردار تھا۔ اس تمہ خانے سے نکل کر دیکھ کہ تیری وراثت راہ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ ” ملک نصرت خان نے بھی تندو تیز لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر کسی طرح تیری کیا گیا عتاب شاہی سے محفوظ رہتی تب بھی تو اس قابل نہ ہوتا کہ سلطان معظم کو مقابلے کے لئے لے آئے۔ ”

فیرو کسری اور سکندو دارا کے ہی شایان شان تھے کہ وہ میدان کارزار میں شاہ والا کو دست بدست جنگ کرنے کیلئے آواز دیتے۔ ذلت آمیز شکست نے تجھ سے تیرے حواس چھین لئے ہیں رتن سنگھ! تو میرے منصب اور درجے کی بات کرتا ہے؟ تجھے کیا خبر کہ فاتح عالم کے دربار میں بھی تجھ سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں اور قہر ہزار ستون میں رہنے والی کینرس بھی تجھ سے زیادہ شجاع اور غیرت مند ہیں۔ میں نے آج تک اتنا بے غیر حکمران نہیں دیکھا جو اپنی قوم کو ہلاکت کے منہ حار میں چھوڑ کر خود ساحل کی طرف فرار ہو جائے۔ ہجرات کا راجہ کرن تو میدان جنگ سے بھاگتا مگر تو نے خون کا ایک قطرہ ہمائے بغیر پشت دکھادی۔ اور اب موت تیرے سر پر منزل لانے لگی تو سلطان سے مقابلہ کرنے کا ہمانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ” یہ کہہ کر ملک نصرت خان آگے بڑھا۔ ”اپنی شمشیر اٹھا اور مجھ پر وار کر! پھر تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ علاء الدین کے ہاروں کی طرف جاں نثاروں کا کیا مصار قائم ہے۔ ” رتن سنگھ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا مگر اس کی تلوار نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ باقی تمام راجپوت سرداروں کا بھی یہی حال تھا۔ شدت غضب سے ان کے دل دماغ جل رہے تھے لیکن کسی میں ملک نصرت خان سے مقابلے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی آزادیاں ختم ہو چکی ہیں اور شرمناک غلامی آہنی زنجیر لٹے ہوئے ہر طرف رقص کر رہی ہے۔

ملک نصرت خان ہر خوف سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ رتن سنگھ کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ اس دوران علاء الدین کے سپاہی زیر زمین کمرے میں داخل و تے رہے اور راجپوت سرداروں کے گرد اپنا حصار قائم کرتے رہے۔ سب سے آخر میں رام دیو اندر پہنچا اسے دیکھتے ہی رتن سنگھ بدحواس ہو گیا۔

”وہ گھر کا بھیدی تو ہی تھا جس نے راجپوتوں کی لڑاکا کو ڈھکایا۔ نمک حرام بہرو پیئے! تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو۔ ” یہ کہہ کر رتن سنگھ نے رام دیو پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر نصرت خان کی تلوار نے راجپوت سرٹ کا راستہ روک لیا۔

”رتن سنگھ! وہ دن یاد کر جب تو نے میرے گیان کی توہین کی تھی، میری ریاضتوں کو جھٹلایا تھا اور چوڑے کے ذلیل بچاریوں کو مجھ پر فوقیت دی تھی۔ ” رام دیو کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور زبان سے شعلے بھوٹ رہے تھے۔ ”آج میں نے اپنی تمام رسوائیوں کا انتقام لے لیا اور رام دیو کا انتقام اتنا ہی خوفناک ہوتا ہے۔ تیرے جھوٹے اقتدار کی یہ لڑاکا سی قابل تھی کہ فاتح عالم کی ایک ہی ٹھوکرا سے ڈھا کر رکھ دے۔ یہ پتھر کی بے جان مورتیاں میرا کیا گاڑیں گی کہ میں تو بیشہ سے دیوتاؤں کا باغی تھا۔ اب میں ایک خدا کا نام لے رہا ہوں، سلطان علاء الدین خلجی کا وہی غلام۔ میں نے شاہ سے وعدہ کیا تھا کہ جس طلسم کو میں نے اپنی ذہانت سے تیار کیا تھا وہ ایک دن میرے ہی ہاتھوں پر یاد ہوگا۔ ملک نصرت خان! میرے بھائی! میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ اب تم آگے بڑھو اور چوڑیاں پہن کر تمہ خانے میں روپوش ہو جانے والی ان لوڈنیوں کو شاہ والا کے حضور کھینچتے ہوئے لے جاؤ۔ ”

”ایسا ہی ہو گا رام دیو! واقعہ تو بدایا گیا ہے۔ ” ملک نصرت خان نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔ اس کی تلوار سینے سے گزر کر راجہ رتن سنگھ کے حلقوں تک پہنچ گئی تھی۔

ذلت آمیز شکست اور رام دیو کی غداری کے احساس نے رتن سنگھ کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اسے ہر حال میں زندہ رہنے کی خواہش تھی اور اسی خواہش نے رتن سنگھ سے راجپوتوں کی روایتی شجاعت، غیرت، مرادگی، غرض سب کچھ چھین لیا تھا۔

”اگر تم لوگ اپنی شمشیروں کی آبرور قرار نہیں رکھ سکتے تو انہیں زمین پر پھینک دو کہ اسی میں تمہارے

لئے سلامتی ہے۔ ”ملک نصرت خان نے سخت لہجے میں راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

چوڑا کاٹکت خورہ حکمران چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے اپنی تلوار پھینک دی۔ راجپوت سرداروں نے بھی اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور ان شمشیروں کو فرش پر پھینک دیا جو ایک سر بلند قوم کی عظمت کی نشان تھیں۔ مگر آج گردشِ وقت نے اس نشان کو دھندلا کرتے کرتے ذلت و رسوائی کی نہ مٹنے والی یادگار میں تبدیل کر دیا تھا۔ کچ کلاہوں کے سر جھک گئے اور صدیوں کے غرور نے لمحوں کے آگے اپنی پیشانیاں ٹیک دیں۔

ملک نصرت خان نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ تمام تلواریں جمع کر لیں اور چوڑے حکمران کو زنجیریں پہنچا دیں۔ سپاہی اپنے امیر لشکر کا حکم سن کر آگے بڑھے تو رتن سنگھ بلند آواز میں ملک نصرت خان سے مخاطب ہوا۔

”بے شک! میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی مگر اس کا لحاظ رہے کہ میں ریاست کا فرمانروا ہوں۔ میرے ساتھ عام قیدیوں جیسا سلوک نہ کر کہ میں ہر حال سمرات رتن سنگھ چوہان ہوں۔“

ملک نصرت خان کے ہونٹوں پر طنز آمیز ہنسی ابھر آئی۔ ”رتن سنگھ تیری اسی گمراہ سوچ نے تجھے یہ برے دن دکھائے ہیں۔ آدمی اس وقت تک بڑا کھلتا ہے جب تک وہ آزاد رہے اور فتوحات اس کے قدم چومتی رہیں۔ اگر میں تجھے زنجیروں کے بجائے ہیروں اور جواہرات سے مرصع نگین بھی پہنا دوں تو کیا فرق پڑے گا۔ تو غلام ہے اور غلام ہی رہے گا۔ بڑائی تو وہ ہوتی کہ ہم تیرا سر کاٹ کر اپنے شمشاہ کے حضور لے جا رہے ہوتے تو پھر ساری دنیا پکار اٹھتی کہ وہ آ رہا ہے سمرات رتن سنگھ چوہان۔“

ملک نصرت خان کے الفاظ کی ضرب بہت شدید تھی مگر رتن سنگھ صرف کانپ کر رہ گیا۔ زندگی کی بھیک مانگنے والے اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ نصرت خان چاہتا تو رتن سنگھ کو زنجیروں میں جکڑ کر علاء الدین کے سامنے لے جاتا لیکن یہ شرمناک منظر دیکھ کر اس کے جسم میں بھی کچھ دیر کیلئے سنسنی سی دوڑ گئی۔ عبرت کا مقام تھا، اس لئے ملک نصرت خان نے رتن سنگھ کی خواہش کا احترام کیا اور والئی چوڑے ہاتھوں کو کھلا رہنے دیا۔ باقی تمام سرداروں کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔

پھر کچھ برق رفتار سواروں نے علاء الدین کو اس کی زندگی کی یہ ناقابل فراموش خوشخبری سنائی کہ رتن سنگھ کو ایک قیدی کی حیثیت سے سلطان کے حضور لایا جا رہا ہے۔ فرمانروائے ہند جوشِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ سپاہیوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور پھر اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ سپہ سالار ہری سنگھ کو اسی وقت شاہ کے خیمے میں لایا جائے۔

ہری سنگھ سر سے پاؤں تک زخمی تھا مگر سلطان کے خصوصی معالج مولانا بدر الدین دمشقی کی غیر معمولی توجہ کے باعث وہ دو آدمیوں کے سہارے چند قدم چل سکتا تھا جب اسے سلطان کے در و دروایا گیا تو وہ بہت ادا سا تھا۔

”ہری سنگھ! ہم نے تمہیں اس لئے طلب کیا ہے کہ اپنی آنکھوں سے اس مغرور حکمران کا شر دیکھ سکو جس نے تم جیسے سورتوں کے قیمتی خون کو بڑی ناقدری اور ازرانی کے ساتھ زمین پر بہا دیا۔“

ہری سنگھ کچھ دیر تک انتہائی تکلیف دہ سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”سلطان میں نے پہلی ہی درخواست کی تھی کہ میرے کاندھوں سے اس جھگے ہوئے سر کا بوجھ کم کر دیا جائے مگر نہ جانے کیوں آپ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں۔ یہ بہادروں کی شان نہیں ہوتی شمشاہ!

ہری سنگھ بہت عزت کرتا ہوں۔“

”میں ہری سنگھ! ہم تمہیں ذلیل نہیں کر رہے ہیں۔“ سلطان، راجپوت سپہ سالار کی بات سن کر رعب ہو گیا۔ ”ہم رتن سنگھ کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ راجپوت نسل کا نمائندہ نہیں۔ راجپوت ایسے ہوتے ہیں کہ تم ہو۔ ہم تمہیں کھانا نہیں چاہتے ہری سنگھ! تم ہمارے قریب آ کر تو دیکھو کہ ہم بہادروں کے کیسے ہاں ہیں؟ تمہارا وہی منصب رہے گا بلکہ اختیارات اور بڑھادے جائیں گے۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ تمہیں شکست خورہ یا غلام کہہ کر پکار سکے۔ تم اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہمارے مفادات کی حمایت کرو گے۔ بس یہی تمہارا فریضہ ہو گا۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے۔ ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو ہمارے ہو۔“

ہری سنگھ نے مغموں نظروں سے علاء الدین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نئی سی جھلک لگی تھی۔ سلطان! میں چوڑے سوا کسی کا نہیں لیکن آپ کا شکر گزار ضرور ہوں۔ بے شک! آپ سورتوں کے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بہادر انسان آج تک نہیں دیکھا۔ زمین و آسمان گواہ رہیں کہ میں دنیا اس مردِ شجاع کو سلام کر رہا ہوں جس کا نام سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ ”یہ کہہ کر ہری سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس حرکت سے اس کے زخم کھل گئے اور وہ بڑے کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ری تاریخ چوڑ جاتی ہے کہ ہری سنگھ نے اس انداز میں رتن سنگھ کو بھی سلام نہیں کیا۔

”اس میں کوئی شبہ نہیں ہری سنگھ! کوئی شبہ نہیں۔ ہم تمہاری اسی ادا کے عاشق ہیں۔“ علاء الدین آہنی اعصاب کا انسان بھی جذباتی نظر آنے لگا تھا۔

”بس اب مجھے جانے دیجئے سلطان!“ ہری سنگھ نے دونوں ہاتھ سیدھے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کی رسوائی کا منظر نہیں دیکھ سکوں گا۔ آخر وہ میرا سمرات ہے۔“

”تم اس حالت میں کہاں جاؤ گے ہری سنگھ؟“ علاء الدین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اگر تم ہماری ناقابل نہیں کرتے تو اتنے دن ٹھہر جاؤ کہ تمہارے یہ زخم ٹھہر جائیں۔“

”نہیں سلطان!“ ہری سنگھ نے ایک بار پھر سر جھکا لیا تھا۔ ”اگر سارا عالم بھی تیار داری کرے تو کیا؟ دریں چرچو زخم کھائے ہیں وہ کبھی نہیں ٹھہریں گے۔“

سلطان مایوس ہو گیا۔ وہ ہری سنگھ جیسے انسان کو کسی قیمت پر نہیں روک سکتا تھا۔ ”آخر تم جاؤ گے؟“ علاء الدین نے اس لہجے میں راجپوت سپہ سالار سے دریافت کیا۔

”میں فی الحال کوہِ آبو کے ایک مندر میں جانا چاہتا ہوں۔ مائی بھان متی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔“ ہری سنگھ کی آواز سے اچانک ایک نیا درد جھلکے لگا تھا۔ ”اگرچہ میں نے اس عظیم عورت کو غلام نہیں سمجھا لیکن میرا تصور یہ ہے کہ میں نے اس کی پارسائی پر گواہی نہیں دی۔ شاید دیوتاؤں نے مجھے سزا دے رکھا ہے کہ میں اپنی کوتاہیوں کا زائلہ کر سکوں۔“

”یہ مائی بھان متی کون ہے؟“ علاء الدین نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مائی کے بارے میں چوڑے کہنے والے آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔“ ہری سنگھ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ”میرے نزدیک وہ ایک پارِ سعادت ہے۔ جس پر بڑے ستم ڈھائے گئے ہیں افسوس! میں اپنے راجہ میں اس مظلوم خاتون کیلئے کچھ نہ کر سکا۔ سلطان! یہ آپ کا آخری احسان ہو گا کہ مجھے اپنا بچ کو پہنچا دیں گے۔ ذریعے اس مندر تک پہنچا دیں جہاں بھان متی رہتی ہے۔“

علاء الدین کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ راجپوت سپہ سالار کو شاہی

عراقی کی آمد سے مطلع کیا۔ ان تینوں سپہ سالاروں کو بھی باریابی کی اجازت دے دی گئی۔
پھر ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور زمین بوسی کی رسم کے بعد سلطان کو عظیم الشان فتحی مبارکباد
دیا۔

”اور تم لوگ پدمنی کے بارے میں کیا خبر لائے؟“ سلطان کی بے قرار یوں کا وہی حال تھا۔
”شاہ والا کے غلام ایک ایک گوشے کی تلاشی لے رہے ہیں۔“ خواجہ حاجی نے دو قدم آگے بڑھ کر
نہایت ”راج محل کے چپے چپے کو چھان مارا مگر رانی پدمنی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کچھ راجپوت عورتوں
نایابہ کہ پدمنی اور چوڑ کے دوسرے سرداروں کی بیویوں نے ماما کے مندر میں ”ستی“ کی رسم ادا کی
۔ مندر کے چاروں طرف ہمارے سپاہی پہرہ دے رہے ہیں لیکن ابھی آگ کی تپش اتنی تیز ہے کہ دروازہ
زائد داخل ہونا ممکن نہیں۔ شعلے سرد پڑ چکے ہیں مگر انگارے دہک رہے ہیں۔ شاید ہمیں ایک دن
انگارہ کرنا ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

دوسرے روز جب دیکھتے ہوئے انگارے سردار اکھ میں تبدیل ہو گئے تو سلطان نے رام دیو کو طلب کرتے
کہا۔ ”ہمیں تیری وفاداریوں پر اعتبار آ گیا ہے۔ رتن سنگھ ہماری شمشیر قمر کے دائرے سے زیادہ دن
نہیں رہ سکتا تھا۔ ہم راج محل کی بنیادیں کھود کر بھی اسے تلاش کر لیتے مگر تیری وجہ سے کام کچھ آسان
ہو چوڑ کے لوگ کہتے ہیں کہ پدمنی آگ میں جل کر مر گئی لیکن ہمیں یقین نہیں آتا جس طرح رتن سنگھ
جلنے کی فکر میں تھا اسی طرح پدمنی بھی فرار ہو سکتی ہے۔“ علاء الدین کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار تھا۔
نہ کے بغیر اسے اپنی فتح نامکمل نظر آ رہی تھی۔

”میں ناق عالم کو اس ذہنی کشاکش سے نجات دلا دوں گا۔“ رام دیو نے گھٹنوں کے مل جھکتے ہوئے
کہا۔ ”اگر وہ آگ میں جل کر مری ہے تو یقیناً اپنی کوئی نشانی چھوڑ گئی ہوگی۔ شاہ والا کے اس غلام کی آنکھ
کلی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی ہے تو میرا علم مجھے بتا دے گا کہ اس
نہ کہاں ہے؟“

علاء الدین کا اضطراب کسی طرح کم نہیں ہوا تو وہ خود اپنے چاروں سپہ سالاروں اور رام دیو کے ہمراہ
میں داخل ہو گیا۔ قدم قدم پر عبرت خیز تنہائی کے منظر دکھائی دے رہے تھے۔ چوڑ کا راج محل جو کچھ
کلی منامی کا بہترین نمونہ تھا، دیکھتے ہی دیکھتے کسی بولناک ویرانے میں بدل گیا تھا۔ بے رحم آگ نے
ہمو پھونک ڈالا تھا۔ قیمتی اشیاء اور انسانی جانیں موت کے منہ سے اگلا ہوا نوالہ بن چکی تھیں۔ سرخ زار
نار و دیوار کٹنے کی مانند سیاہ ہو گئے تھے اور فنکاروں کے کھینچے ہوئے دلکش نقش و نگار نے ایسی ڈراؤنی
ہمتا برپا کر لی تھیں جیسے ہر طرف بھوت پریت رقص کر رہے ہوں۔ علاء الدین کے چہرے پر خوشی کا ہلکا
نک نہیں تھا۔ سلطان نے بے شمار جنگیں لڑی تھیں مگر تہائی کا ایسا دہشت ناک منظر آج تک نہیں
دیکھا تھا۔ ایک ایسی جگہ ٹھہر گیا جہاں عورتوں اور بچوں کے نیم سوختے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔

”میں نے زبان حلقوں! تیری لاشوں پر ماتم کیلئے کون آئے گا کہ تجھے خود تیرے رکھوالوں نے اس
بہنچایا ہے۔ ہم نے تمہیں امان بخشی تھی مگر تم لوگ ازلی بد نصیب تھے۔ افسوس! تمہاری حالت زار پر
افسوس!“ یہ کہہ کر علاء الدین آگے بڑھ گیا۔ وہ اس داؤدی عذاب سے بہت جلد گزر جانا چاہتا تھا۔
”کلی پر پتھر اباریاں ملے کرنے کے بعد فرمانروائے ہند اس طویل و عریض میدان میں پہنچا جہاں چوڑ
سپاہی اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ وہاں بھی ہر طرف لاشوں کے انبار تھے۔ سلطان نے ایک نظر مردہ

رہتہ میں بٹھا کر اس مقام تک پہنچا دیں جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ ہری سنگھ نے فوجی انداز میں سر کو خم کیا اور
اپنے پیروں کو گھسیٹنا ہوا نیسے سے باہر جانے لگا۔

”شاہی رتھ میں بیٹھنے سے پہلے ہری سنگھ کو نیکاح کوئی بات یاد آ گئی اس نے گھبرا کر سپاہیوں سے کہا۔
”مجھے چند لمحوں کیلئے سلطان کے پاس لے چلو۔“ پھر جب وہ مڑا تو علاء الدین کو خیمے کے دروازے پر کھڑا
دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”ہم راجپوت سورما کو الوداع کہنے آئے ہیں ہری سنگھ!“ سلطان مسکرایا مگر اس کی
ہنسی ہری سنگھ کے جسم کی طرح زخمی تھی۔

”ایڈیور! سلطان کی فتوحات میں مزید اضافہ کرے۔“ ہری سنگھ اپنی پذیرائی کا یہ انداز دیکھ کر روئے
لگا۔ ”سلطان سے آخری التجا ہے کہ میرے بچوں کو اس ذلت آمیز فرار کی خبر نہ ہو۔ اگر وہ زندہ بچ گئے
ہوں تو انہیں یقین دلا دیجئے گا کہ ان کا باپ میدان جنگ میں مارا گیا۔“

”اور تمہاری بیوی کہاں ہے ہری سنگھ؟“ سلطان کی آواز سے ایک خلش سی ظاہر ہو رہی تھی۔
”وہ خوش نصیب تھی سلطان کے چوڑ کا زوال دیکھنے سے ایک سال پہلے مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“ یہ کہہ
کر ہری سنگھ مڑا اور سپاہیوں کا سارالے کر رتھ میں بیٹھنے لگا۔

”ہم تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے ہری سنگھ کہ چوڑ کے میدانوں میں ایک مرد سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ
مرد جسے ہم نے چند لمحوں کیلئے پایا اور پھر کھو دیا۔“

ہری سنگھ نے انگلیاں آنکھوں سے سلطان کی طرف دیکھا۔ راج محل سے اٹھتے ہوئے دھویں پر ایک نظر
ڈالی اور سر جھکا لیا۔ علاء الدین اس وقت تک شاہی رتھ کو دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوٹ نہ
نہیں ہو گیا۔

سلطان ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ ملک نصرت خان نے باریابی کی اجازت چاہی۔
علاء الدین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور گہری اداسی کی جگہ ایک ناقابل بیان مسرت جھلکے گی۔
ملک نصرت خان آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے زمین بوس ہو گیا۔

”سلطان عالی مقام کو تازہ گی یہ بے مثال فتح مبارک ہو۔“ ملک نصرت خان سجدے کی حالت میں بول
رہا تھا۔ ”چشم فلک حیران ہے کہ اس نے آج تک ایسی فتح نہیں دیکھی اور اہل زمین سر ہر گرباں ہیں کہ
شاہ والا نے تمام بلند یوں کو پایا مل کر ڈالا۔“

”انھو نصرت خان کہ تم جیسے جاں نثار بھی اس مبارکباد کے مستحق ہیں۔“ سلطان نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”رام دیو نے ہماری مکمل رہنمائی کی اور فاتح عالم کے مجرموں کو ان کے عبرت ناک انجام تک پہنچا دیا۔“
ملک نصرت خان سیدھا ہوا اور قبائے شاہی کو اپنی آنکھوں سے ملنے لگا۔ ”رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت
سردار زنجیروں میں جکڑے ہوئے خیمے کے باہر کھڑے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ان نافرمانوں کو خدمت عالیہ
میں پیش کیا جائے۔“

”ابھی نہیں۔“ سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی ہمیں پدمنی کے بارے میں آخری خبر
کا انتظار ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ جل کر ہلاک ہو گئی مگر جب تک ہمیں یقین نہیں آ جاتا اس وقت
تک ہم رتن سنگھ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اس بد نصیب حکمران کو تمام قیدیوں سے الگ
خیمے میں رکھو اور حفاظتی اقدامات سخت تر کر دو۔“

”حکم شاہی پا کر جیسے ہی ملک نصرت خان مڑا، سلطان کے ایک محافظ نے خواجہ حاجی، ملک ظفر خان اور

عجب، گاہک اچھ کر ڈوب رہے تھے۔ پھر وہ مندر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گیا اور رام دیو سے مخاطب

میں روند ڈالیں۔ ”ملک نصرت خان بڑے جذباتی انداز میں اپنے سلطان کے جاہ و جلال کا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ ”اور پھر ایسا ہی ہوا فتح عالم کہ ابو جھک گیا، اراولی نے گھٹنے ٹیک دیئے اور قلعے کی تمام فصیلیں اپنے ہتھکینوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئیں۔ چوڑا کاوالی زنجیریں پھینک کر حضور کے غلاموں میں شامل ہوا اور چوڑے سرکش راجپوتوں نے موت کے بجائے شہنشاہ کے رحم و کرم کی ہچک چاہی۔ تمام دعوے لٹ کر رہ گئے، اور اب ان چٹانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی ہے کہ مالک لوگو! قلم نے دنیا کی ہر فتح سلطان غم کی تقدیر میں لکھ دی ہے۔“

اپنے ایک جاں نثار کی باتیں سن کر علاء الدین کے چہرے پر نشاط و کیف کا ایک تیز رنگ ابھر، مگر دوسرے لمحے ہی افسردگی لوٹ آئی۔ ”نصرت خان! تم ہمارے وفادار ہو اس لئے اپنے شاہ کی دلجوئی کر رہے ہو مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں ایک زاویے سے شکست ہو گئی ہے۔“ علاء الدین نے حسرت بھری نظروں سے پدمنی کے رخسار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں شاہ والا! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ ملک نصرت خان کالجھ کچھ اور پرجوش ہو گیا تھا۔

”اہل دل خود غشی کو بامداری نہیں کہتے، وہ دنیا کی بدترین شکست ہوتی ہے۔“

علاء الدین کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور مندر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ”رام دیو! کیا تجھے یقین ہے کہ مندر کے اندر کوئی خفیہ سرگ موجود ہے؟“ سلطان نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو کچھ دن پہلے چوڑا کا ”مہاتما“ تھا مگر آج اپنا مذہب بدل کر علاء الدین کے نمک خواروں میں شامل ہو گیا تھا۔

”فتح عالم جانتے ہیں کہ رام دیو جھوٹ نہیں بولتا۔“ عیار شعبہ باز نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی ہم مندر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، یہ کہہ کر سلطان بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

تمام سپہ سالار برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنے حکمران کو شمشیروں کے سائے میں لے لیا۔ جاں نثاروں کو اندیشہ تھا کہ کہیں دشمنوں کا کوئی گروہ مندر کے اندرونی حصے میں روپوش نہ ہو اور موقع ملے ہی سلطان پر وار نہ کر بیٹھے۔ ملک نصرت خان نے بہت تیزی سے بیڑھیاں عبور کیں اور مندر کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نصرت خان کے ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دونوں پٹ کھل گئے۔

اس کے ساتھ ہی خواجہ حاجی، ملک نصرت خان اور تاج الدین عراقی مندر میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے وسط میں درگاما کا مجسمہ نصب تھا۔ سلطان کے سپہ سالاروں نے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا مگر وہاں کسی شخص کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ اس دوران علاء الدین حضرت امیر خسروؒ کے ہمراہ دروازے پر کھڑا رہا پھر جب اس کے جاں نثاروں نے تصدیق کر دی کہ مندر خالی ہے تو سلطان امیر خسروؒ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ رام دیو بیڑھیوں سے نیچے کھڑا ہوا علاء الدین کے حکم کا منتظر تھا۔ سلطان نے جاتے جاتے اسے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رام دیو کسی حقیر غلام کی طرح لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کے قریب پہنچ کر گھبر گیا۔

علاء الدین درگاما کے مجسمے کے نزدیک رک کر اس عجیب و غریب عورت کی صورت کی طرف دیکھنے لگا جس کے بدن پر چاروں طرف کئی ہاتھ نمایاں تھے۔

”یہ کون ہے؟“ علاء الدین نے رام دیو سے پوچھا۔

”سنسار کے وحیت! ہندو قوم اسے درگاما کہہ کر پکارتی ہے۔“ رام دیو نے بڑے اجنبی لہجے میں اپنی سابقہ دیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ طاقت کی دیوی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق دنیا

رام دیو لا جواب ساہو گیا مگر اس کی نظریں ابھی تک راکھ میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ”بھروسہ خود کو آگے بڑھا اور اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں سونے کے تار بڑے آبد ہوئے تھے۔“ ایک انسان جلتے وقت کی مخصوص نقطے پر ساکت نہیں رہ سکتا۔ ”آگ کی سوزش اسے ادھر ادھر حرکت کرنے پر بھی مجبور کر سکتی ہے۔“ رام دیو نے سلطان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے سپاہیوں کو مزید تلاش کا حکم دیں۔ مجھے یقین ہے کہ پدمنی کی ایک نشانی نہیں، کئی نشانیاں مل جائیں گی۔ پھر آپ بھی میری بات پر اعتبار کر لیں گے کہ چوڑی مہارانی کا مدفن اسی راکھ کے نیچے ہے۔“

سلطان نے اپنے فوجیوں کو اشارہ کیا اور پھر تھوڑے ہی وقفے کے بعد کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ایک ایسی علامتیں ظاہر ہوئیں جو رام دیو کے دعوے کی تصدیق کر رہی تھیں۔ یہ اعلیٰ نسل راجپوت خواتین کے لباسوں کے وہ باقی ماندہ تھے جسے جن پر روپیلی اور سنہری تاروں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے اس کے ساتھ کچھ پائلیں تھیں اور کچھ گلے کے ہار تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے والی عورتوں کا تعلق حکمران خاندان سے تھا۔ یہ انتہائی قیمتی اور مرصع زیورات تھے جو آگ اور دھوئیں کے اثرات سے سیاہ ہونے کے باوجود اپنے گراں بہا ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اب علاء الدین کو کسی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ رانی پدمنی اسی آگ میں جل کر ہلاک ہوئی ہے مگر پھر بھی وہ اس ثبوت کی تلاش میں تھا جسے کسی طرح جھٹایا جاسکے۔ اور کچھ دیر بعد ہی سلطان کے سپاہیوں نے یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ راکھ کے ڈھیر سے ایک ایسا ڈھانچہ برآمد ہوا تھا جس پر کسی ملکہ یا رانی کے تاج ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کپڑا جل جانے کے سبب ایک ڈھانچہ ہی رہ گیا تھا جسے سونے کے موٹے موٹے پتوں سے بنایا گیا تھا۔

رام دیو نے پرجوش لہجے میں دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی وہ تاج ہے جسے پن کر رانی پدمنی اپنے دربار میں جلوہ افروز ہوتی تھی۔“

سلطان غور سے اس تاج کو دیکھنے لگا جس کے درمیان بہت قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اب علاء الدین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پدمنی کی موت کا یقین کر لے۔ فرمانروائے ہند نے ہوئے تاج کو دیکھ کر چند لمحوں کیلئے اپنے خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔ تمام سپہ سالار اور سپاہی سلطان کے چہرے سے اندازہ کر رہے تھے کہ وہ کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہے۔ وہی کرب جو ایک فاتح کو اپنی پسندیدہ شے حاصل نہ کرنے پر ہوتا ہے۔ علاء الدین خلیجی کو بھی اپنی ناممکن فتح کا غم تھا۔ پدمنی کی موت اس کی خود پسندی اور انایت پر ایک کاری ضرب تھی۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے جذبوں کو عیاں نہ ہونے دے مگر ناکام رہا۔ پدمنی کی آخری نشانی دیکھی تو علاء الدین کو کئی کامنیاں یاد آکر رہ گئیں اور چہرے سے سانسوں کیلئے اس کا سرخ و سفید چہرہ دھواں دھواں سا نظر آنے لگا۔

”خواجہ! یقین نہیں آتا کہ ایک عورت بھی ہمیں شکست دے سکتی ہے۔“ سلطان اپنے سپہ سالاروں کی طرف مڑا۔ ”نصرت خان! آج ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم دنیا کی ہر شے کو حاصل نہیں کر سکتے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہماری دسترس سے دور ہیں۔“ سلطان کے لہجے سے محرومی کا درد جھلک رہا تھا۔ خواجہ حاجی تو اس نازک ترین موقع پر اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا مگر ملک نصرت خان نے آگے بڑھ کر اپنے آقا کی غمگساری کی۔ ”نہیں! شاہ والا! آپ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ یہ عظیم الشان فتح ہے جسے آنے والی سلیس صدیوں تک یاد رکھیں گی۔ سلطان معظم نے دہلی سے روانگی کے وقت یہی تو کہا تھا کہ اے ارض چوڑی ہم آ رہے ہیں۔ اے اراولی اور آہو کی سرکشیدہ جوتیو! ہمارے جبروت کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اور اے قلعے کے بلند مینارو! ہمارے احترام میں یہاں تک جھکو کہ ہمارے قدم

کے ہر انسان کو درگاہی طاقت بخشی ہے اگر یہ دیوی کسی شخص سے خفا ہو جائے تو پھر اسے زوال اور بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

”اور یہ اس کے جسم پر پھوٹنے والے ہاتھ کیسے ہیں؟“ علاء الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ہاتھ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دیوی کی طاقتیں لامحدود ہیں۔“ رام دیو نے وضاحت کی۔ ”یہ سرے پاؤں تک خالص سونے کی ہے اور اس کی چمک دار آنکھوں میں قیمتی ہیرے آویزاں کئے گئے ہیں۔“

علاء الدین مسکرایا۔ ”رام دیو! کیا تیری دیوی پدمنی اور رتن سنگھ سے خفا ہو گئی تھی؟“ سلطان کا لہجہ انتہائی طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

”فاتح عالم! اب اس دیوی سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔“ اپنے ماضی کا حوالہ سن کر رام دیو کے چہرے پر وحشت سی رہنے لگی تھی۔ ”میں سلطان کے دستِ کشور کشا پر ایمان لے آیا اور میں نے اپنا رخ بت خانوں کی طرف سے موڑ کر ایک کعبے کی سمت کر لیا۔“ رام دیو کسی بھرم کی مانند اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

”نہیں رام دیو ہمیں تیرے ایمان پر کوئی شک نہیں ہے۔“ علاء الدین نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”تیرے ماضی کا ذکر ہماری زبان پر اس لئے آگیا کہ آخر تو نے بھی تو اپنا بچپن اور جوانی ان ہی بتوں کی خدائی کے زیر اثر گزار ہی ہے تو پتھروں کے کاروبار سے خوب واقف ہے کہ ان کے نام پر راجپوتوں نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں؟ تیرا تعلق برہمنوں کی نسل سے ہے؟“ اچانک علاء الدین نے رام دیو سے ایک اور سوال کر دیا۔

”تو پھر تو نے بھی ان ہی مجتہدوں کی آڑ میں چوڑے سادہ دل لوگوں پر برسوں حکومت کی ہوگی۔“ علاء الدین مسکرا رہا تھا مگر اس کی ہنسی میں زہر آلود نشروں سے زیادہ تیزی تھی۔

رام دیو جو اب کچھ نہیں بولا۔ اس کا سر بارندامت سے کچھ اور جھک گیا تھا۔

علاء الدین نے بھی اسے مزید نہیں چھیڑا۔ اب وہ حضرت امیر خسروؒ سے مخاطب تھا۔ ”خسرو! دیکھ رہے ہو کہ خدا کی زمین پر کیسی کیسی مخلوق آباد ہے اور کیسے کیسے بے جان پتھروں نے خدائی کی قبا پہن لی ہے؟“

خسروؒ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”سلطان معظم! اس واقعے میں اہل ایمان کیلئے بڑی عبرت ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے مالک سے کیا ہوا عہد توڑے گا اس کا بھی حشر ہوگا۔ کل تک یہ لوگ دنیا کی خرافات میں کیسے گمن تھے اور بدستی کی گہری نیند میں کیسے کیسے خواب دیکھ رہے تھے کہ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، دستِ غیب ان کی گرفت نہیں کرے گا اور یہ شرابیوں کی طرح دیوتاؤں کے سامنے شرمناک حالت میں رقص کرتے رہیں گے اب ان کی لاشوں پر جا کر کون پکارے کہ جس عذاب کا انکار کیا جا رہا تھا وہ نازل ہو چکا۔“ امیر خسروؒ نے بڑے سلیقے سے درپردہ سلطان کو نصیحت کی۔

کچھ دیر کیلئے علاء الدین کا چہرہ بھی بچھ کر رہ گیا مگر اس نے فوراً ہی سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”ہاں خسرو! تافرانوں کا بھی حشر ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر سلطان درگاہا کے مجتہد کو چھو کر دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار مومن کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مضبوطی سے نصب کی گئی تھی۔

”اس کے نیچے تو کوئی سرنگ موجود نہیں ہے؟“ علاء الدین نے ایک بار پھر رام دیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں پر بھو (مالک)!“ رام دیو پُر یقین لہجے میں بولا۔ سلطان بہت دیر تک درگاہا کے مجتہد کا ہاتھ پکڑا۔

رام دیو نے خوشامد کا ایک اور انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہد والا! یہ مورتی کئی من سونے سے تعمیر کی ہے اور اس کی آنکھوں کے ہیرے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔“

”آخر تو کیا کنا چاہتا ہے رام دیو؟“ علاء الدین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”سلطان کے اس حقیر غلام کی خواہش ہے کہ ان بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیجئے۔“ رام دیو نے اپنے جی جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری نظر میں آپ سب سے بڑے بت شکن میرے علم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ چوڑے صنم خانے آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں اور جب الاکہ قدم یہاں پڑیں گے تو ساری مورتیاں سجدہ ریز ہو جائیں گی۔“

”نہیں رام دیو! ہم مذہب کے سلسلے میں کسی پر جبر نہیں کرتے۔“ علاء الدین نے رام دیو کی تجویز کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک سیاسی جنگ تھی جسے ہم نے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ جیت لیا مگر ہم تم کو دراکھتے تو پھر آگ میں جلنے والی عورتوں کو بچانے کا حکم نہ دیتے۔ ایک ایک بوڑھے اور بچے کو لڑائیے مگر تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہزاروں راجپوت سپاہی ہماری عنایتِ خسروانہ کے میں زندہ ہیں۔ اگر ہم اپنی شمشیر قہر کو بے نیام کر لیں تو چوڑے سرزمین پر ایک بھی ذی روح نہیں رہے گا۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد ہماری مکمل اطاعت ادا کر لیں۔ ان بت خانوں کے بارے میں تو ابلی چوڑے ہی فیصلہ کریں گے کہ وہ انہیں سمار کر کے حلقہء ام میں داخل ہوتے ہیں یا اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔“

رام دیو نے شرمسار ہو کر سر جھکا لیا اور سلطان اپنے سپہ سالاروں کے ہمراہ مندر سے باہر نکل آیا۔ چلتے چلتے بھی اس کی زبان پر ایک ہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔ ”اگرچہ پدمنی کا پر باد شدہ تاج ہمارے ہاتھوں میں اور کوئی بھی اہلی نظر اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ پدمنی جل کر ہلاک ہو گئی لیکن ہمارا شعور اس وقت بھی سے سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے کہ وہ آفتِ جان آج بھی زندہ ہے۔ راجپوت ہوتے ہوئے بھی رتن سنگھ دلوں کی طرح تمہ خانے میں روپوش ہونا اور پدمنی کا مندر کے احاطے میں جلنا عام واقعات نہیں ہیں۔ اس کا اس ڈھیر سے ہمیں انسانی گوشت کی نہیں، کسی سازشی منصوبے کی بو آ رہی ہے۔“

تمام سپہ سالاروں اور مصاحبوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے اندر سلطان کے اندیشوں دکرنے کی جرات نہیں پارہے تھے۔

☆ ☆ ☆

بھگت سلطان نے ایک نیا حکم جاری کیا کہ مصنوعی پہاڑی کو مہار کر کے پورے میدان کو ہموار کر دیا۔ علاء الدین اسی میدان میں اپنی فتح کا جشن عام منانا چاہتا تھا۔ سلطان کے ہونٹوں کی ایک جنبش کے فوری چوڑکی نواحی بستیوں کے اچھوت اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور شاہی فوج کے کارندوں کے ساتھ بھاری پتھروں کو اٹھا اٹھا کر دریائے گبیہری کے کنارے جمع کرنے لگے۔ سلطان اپنی فوجوں کی خدمت کیلئے دربار پر ایک مضبوط پل بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے مقامی لوگوں کو حکم دیا تھا کہ پل کے کم سے کم نٹیل تعمیر کر دیں۔ چوڑے اچھوت جو پہلے ہی علاء الدین کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، لیکن اور جانفشانی کے ساتھ پل تعمیر کرنے لگے۔

جواز پیدا کرنے کیلئے اس نے ”لکشمی“ نام کی دیوی کو ترناشا تاکہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو عبادت کا جہ دیا جاسکے۔ جب علاء الدین نے زرد جوہر کے ڈھیر دیکھے تو اس کے چہرے پر ایسی شادابی ابھر آئی جس کی لگ آنے سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔

”اب ہماری دولت کے سامنے محمود غزنوی کے خزانے کوئی حیثیت نہیں رکھتے“ علاء الدین نے اپنے ماحجوں اور سپہ سالاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب سا احساسِ فخر تھا اور ٹھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی جس کے اظہار کیلئے الفاظ کا تلاش کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے تمام امیران لشکر نے سلطان کو اس یادگار فتح پر مبارکباد پیش کی اور درباری مطرب ہم کاشانی نے بڑے اثر انگیز انداز میں یہ نغمہ چھیڑ دیا۔

”دنیا میں وہ شخص سلطان معظم کے سوا کون ہو سکتا ہے جس کے قدموں کو چھو کر خاک بھی اکسیر بن جاتی ہے۔“

☆ ☆ ☆

اس دوران علی عامر آفریدی نے طلسم کدے سے باہر جانے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ نرملا کماری نے اسے کہہ کر روک لیا۔ ”ابھی شکستِ فتح کے ہنگامے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ایسے سنگین لمحات میں یہاں سے ناظرینک بھی ہو سکتا ہے۔“

”اگ تو مجھ چکی ہے اور دھواں نفضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ پھر یہاں سے جانے میں کیا قباحیت ہے؟“ آفریدی نے جھنجھلا کر کہا۔

”یقیناً راج محل کی آگ بجھ چکی ہے مگر نفرتوں کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔“ نرملا نے آفریدی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تمہاری باتیں میرے لئے ناقابلِ فہم ہیں۔“ آفریدی کے لہجے سے ناخوشگوار کا اظہار ہو رہا تھا۔ تہیں دوسروں کی آگ کی فکر ہے مگر میری طرف دیکھتیں میں اپنی والدہ اور بہن کی جدائی کے لمحوں میں کب سے جل رہا ہوں؟“

نرملا کماری کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی اور پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”مجھے تو آپ کے غموں کا مقرر احساس ہے کہ اپنے غم بھی فراموش کر بیٹھی ہوں۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ اس طلسم کدے کو توڑ دیوانہ وار نکل جاؤں اور چوڑے دروازے سے پوچھتی پھروں کہ میرے پتا کی کیسے ہیں اور اتنے دن تک آپ کا کیا کرتی رہی ہے؟“

نرملا کی بات سن کر علی عامر آفریدی سنائے میں آگیا۔ ”معاف کرنا راج کماری! اہل وطن کی آمد کاس جنایات بے قابو ہو گئے۔ میں خود غرض نہیں کہ مجھے صرف اپنی ماں اور بہن کا خیال ہے۔ تم اچھی طرح تو کو کہ میں مہمانی کی آخری خواہش کے احترام میں سلطان کے دربار جانا چاہتا ہوں۔“

”اس طرح تم کیا حاصل کر سکو گے؟“ نرملا کی آنکھیں اداس تھیں اور آواز بھی بھٹی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں سلطان سے اہل چوڑ کیلئے امان طلب کروں گا۔“ آفریدی نے بے قرار ہو کر کہا۔

”کیا سلطان نے تمہارے مشورے سے چوڑ پر فوج کشی کی ہے؟“ نرملا نے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔

اس دوران ملک نصرت نے کئی بار راج رتن سنگھ کو سلطان کے حضور پیش کرنے کی اجازت طلب کی مگر علاء الدین نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ”نصرت خان! ہم اس نافرمان کا چہرہ جشنِ فتح کے دن دیکھیں گے۔“

پل کے ساتھ ساتھ علاء الدین نے میدان میں ایک بلند مینار تعمیر کرایا جس پر روشن حروف میں یہ عبارت تحریر کی گئی۔

”سلطان علاء الدین..... خلیجی..... خدا کا سایہ..... وقت کا سورج..... دنیا کا محافظ و نگہبان..... اور سکندر ثانی۔“

اس عرصے میں راج محل کی مستقل تلاشی جاری رہی۔ آگ کا طوفان تھم جانے کے بعد راج رتن سنگھ کی بیوہ بہن فریاد کرتی ہوئی سلطان کے دربار پہنچی اور اس نے اپنے بیٹے سوگر مال دیو پر ڈھائے جانے والے مظالم کی روداد بیان کی۔ علاء الدین کے حکم پر سوگر مال دیو کو بھاری زنجیروں سے آزاد کر کے سلطان کے سامنے لایا گیا۔ پھر جب رتن سنگھ کی بہن نے یہ بتایا کہ سوگر مال محض اس لئے تشدد کیا گیا کہ وہ سلطان کے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا تو علاء الدین نے اس جوان سال راجپوت زادے کے تدر اور فراست کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنے سامنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے سوگر! تو ذہین بھی ہے اور خوش نصیب بھی کہ ہماری آمد سے پہلے ہی ہمارے جاہ و جلال کے آگے جھک گیا۔“

سوگر مال دیو بزدل نہیں تھا مگر جوشِ مردانگی میں عقل کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس نے علاء الدین کے سامنے برملا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے ماموں کو مشورہ دیا تھا کہ سلطان سے آمادہ جنگ ہونے کے بجائے باوقار انداز میں صلح کی بات کی جائے۔ میں نے سمرات رتن سنگھ سے یہ بھی کہا تھا کہ دیوتاؤں نے ہندوستان کی حکمرانی کا فیصلہ سلطان کے حق میں کر دیا ہے۔ وہ اس علاقے کی سب سے بااثر شخصیت ہیں اور ان کی بروہتی ہوئی طاقت کو شمشیروں کے ذریعے نہیں روکا جاسکتا۔ میں نے آخری حد تک انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے بزدل اور کماترار دیتے رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کی حمایت کے سبب وہ ستم توڑے گئے کہ آج مجھ میں ان کے بیان کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر سوگر مال دیو نے سلطان کو اپنے جسم پر ان زخموں کے نشانات دکھائے جو رتن سنگھ کی درندگی کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر رہے تھے۔

راجپوت زادے کی اس بے پناہ جرات نے علاء الدین کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ ”سوگر! تو نے جو زخم ہمارے لئے کھائے ہیں ہم انہیں اپنی نوازش و کرم سے اس طرح دھو دیں گے کہ ان سے مشک و گلاب کی خوشبو آنے لگے گی۔“

اس کے بعد علاء الدین نے سوگر مال دیو سنگھ کو مصاحبوں کے حلقے میں شامل کر لیا۔ راج محل کی تلاشی کے دوران رانی پدمینی اور رتن سنگھ کے کمروں سے بے شمار قیمتی نوادرات سپاہیوں کے ہاتھ آئے۔ مگر ابھی تک چوڑ کے خزانے کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ علاء الدین نے نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”ملک! تم رتن سنگھ سے پوچھو کہ اس نے پناہ خزانہ کہاں چھپایا ہے؟ اگر وہ بتائے گا انکار کرے تو تم خوب جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے؟“

رتن سنگھ نے سر جھکا دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور اس نے خفیہ تہ خانے کا پتہ بتا دیا جہاں چوڑ کے سابقہ حکمرانوں کی دولت کے انبار جمع تھے۔ ہندو بنیادی طور پر ایک زر پرست قوم ہے اور اپنی اسی سرمایہ پرستی

قریب میں شرکت کیلئے پابند ہے۔

علاء الدین شای سنتے ہی دور دراز کے اچھوت بھی قلعے کے اس میدان میں جمع ہو گئے تھے جسے نئے نئے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر تاریخ ہند کا وہ عجیب لمحہ آپنچا جب راجپوت سرداروں کو زنجیروں میں سلطان علاء الدین خلجی کے سامنے لایا جا رہا تھا۔ راجرتن سنگھ آزاد تھا مگر اس طرح کہ سلطان پانی اس پر اپنی تلواروں کا سایہ کئے ہوئے تھے اور چوڑ کے حکمران کا پورا جسم شرم و ندامت کے پسینے بہا رہا تھا۔

راجرتن سنگھ نے بڑے کرب کے عالم میں اس انسانی نجوم پر نظر ڈالی جو راجپوت سمرات کے زوال اور ناکامی کا تماشا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ایک خاص منصوبے کے تحت چوڑ کے اچھوتوں کو جانب اگلی قطاروں میں کھڑا کیا تھا تاکہ مجبور رہے کہ رعایا ان سنگروں کا شردیکہ سکے جو صدیوں مل آدم کے ایک بڑے گروہ کو جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر رہے تھے۔ رتن سنگھ جیسے است میدان میں داخل ہوا اس نے اچھوتوں کی بھیڑ دیکھی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ علاء الدین کے تصور کیا رنخلجی حکمران کس انداز میں اسے ذلیل و رسوا کرے گا؟ رتن سنگھ کے قدم لڑکھڑاہے تھے مگر نے فوراً ہی اپنے اعصاب پر قابو پایا اور سر اٹھا کر چلے لگا۔ جاتے جاتے اس نے کئی بار اپنے دائیں اور بائیں ہونے راجپوتوں پر نگاہ کی اور ایک جگہ رک کر تنقیر آئینہ جیسے میں بولا۔

”یہ گردش وقت ہے جس نے مجھے اتنے بڑے دن دکھائے ہیں مگر تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ میری ت کے اس تماشے سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ تم نے اپنی وفاداریاں بدل ڈالیں مگر اس ماری تقدیر نہیں بدلے گی۔ تم کل بھی شورور (اچھوت) تھے اور آج بھی بچ ہو۔ میں آزاد رہ کر ہم راجپوتوں کی اولاد تھا اور بیڑیاں پہن کر بھی رتن سنگھ چوہان ہوں۔ سورج دیوتا کا بیٹا..... اور بی بیچر سے پیدا ہونے والے غلیظ و بد رنگ کیڑے..... اپنے آقاؤں کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے رتن سنگھ ان اچھوتوں پر برس پڑا جو سلطان کے حکم پر اس جشن میں شریک ہوئے تھے۔

میلوں سے خوف و دہشت اور محرومیوں کی فضاؤں میں پلٹنے والے شور و در کی گردیں جھک - علاء الدین نے انہیں نئے انداز سے چینی کا حوصلہ بخشا تھا مگر جب وہ راجپوتوں کے مقابل آئے تو ان ہانسیں ڈرانے لگا۔

اعلاء الدین اور رتن سنگھ کے درمیان فاصلہ تھا، اس لئے خلجی حکمران راجپوت سمرات کی گفتگو نہیں لیکن اس نے اندازے سے سمجھ لیا کہ رتن سنگھ چوڑ کے اچھوتوں کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکا سلطان نے اپنے سپاہیوں کو ہاتھ کا اشارہ کیا جس کا مفہوم تھا کہ وہ رتن سنگھ کو کھینچنے ہوئے اس جگہ مل جہاں علاء الدین شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ سلطان کا اشارہ ہاتے ہی چند ل نے اپنی تلواروں کا رخ بدل دیا اور جب رتن سنگھ کو اپنی پشت میں چپن کی محسوس ہوئی تو وہ سیدھا حاکم کے بڑے ہوئے لگا۔

اعلاء الدین کا تخت اس مینار کے نیچے سجایا گیا تھا جسے سلطان نے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ علاء الدین کے دائیں جانب حضرت امیر خسرو شریف فرماتے۔ پھر ملک نصرت خان اور خواجہ حاجی کی قس۔ بائیں جانب سلطان کا بواڑا کاخضر خان بیٹھا تھا اور اس کے بعد دونوں سپہ سالار تاج الدین ملک ظفر خان موجود تھے۔ باقی مصاحب اور فوجی سردار ایک طویل قطار بنائے ہوئے علاء الدین کے

آفریدی پریشان سا نظر آنے لگا اور پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”میں سلطنت خلجی کا ایک عام سردار ہوں اور مجھ سے زیادہ مرتبہ رکھنے والے لوگ دربار شای میں موجود ہیں۔“

”اگر آپ سلطان کے مقرب خاص ہوتے تب بھی اس کی فطرت اور مزاج پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔“ نرملہ کی سیاستدان کے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ”شاہوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہتے ہیں امان بخش دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں قہر میں سلا دیتے ہیں۔ ان کا ہر کام سیاسی ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ میرے پتہ کی ایک وطن دوست انسان ہیں اور انہیں اپنی قوم سے بے پناہ محبت ہے۔ ان ہی جذبات سے مضطرب ہو کر انہوں نے کہہ دیا ہو گا کہ آپ سلطان سے اہل چوڑ کیلئے رعایت طلب کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی رعایتیں درخواست سے نہیں شاہ کی مرضی سے ملتی ہیں۔ چوڑ کی قسمت کا فیصلہ مہمان نری و کرم سنگھ اور سردار علی عامر آفریدی کی انتہاؤں کے زیر اثر نہیں ہوگا۔ اب اس کا انحصار علاء الدین خلجی کی سوچ پر ہے کہ وہ غلاموں اور محکموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟“

علی عامر آفریدی حیرت سے نرملہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ منتری بھون کی پُر آسائش فضا میں پرورش پانے والی ایک نوخیز دھندلہ زندگی کے اس قدر تلخ حقائق کا بھی علم رکھتی ہوگی۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو نرملہ مگر اس کے ساتھ ہی میں اپنی والدہ اور بہن کی خیریت بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“

”ان کی خیریت کس سے معلوم کریں گے؟“ نرملہ نے ایک اور سوال کرتے ہوئے کہا۔

آفریدی اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

”کیا ان لوگوں کو ہانسی روانہ کرنے سے پہلے آپ نے سلطان کو مطلع کیا تھا؟“ نرملہ نے آفریدی کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”میں یہ راز کسی دوسرے شخص پر کس طرح فاش کر سکتا تھا؟“ آفریدی نے گہرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جب ان کی روانگی ایک راز ہے تو پھر کون بتائے گا کہ وہ کس حال میں ہیں؟“ نرملہ مسلسل سوال کر رہی تھی۔ ”کیا آپ خود اس راز سے پردہ ہٹانا چاہتے ہیں کہ ملک کافور کے خوف سے آپ نے اپنی بہن اور والدہ کو دہلی سے ہانسی منتقل کر دیا ہے؟“

آفریدی حیرت زدہ نگاہوں سے نرملہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”سردار! بہتر یہی ہے کہ آپ کچھ دن اور صبر و ضبط سے کام لیں۔“ نرملہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے اس معاملے میں ایک بار بھی اپنی زبان کو جنبش دی تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس طوفان کو خاموشی سے گزر جانے دیجئے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ اس قدر جاں نثاری کے باوجود سلطان سے دور ہیں اور آپ کے دشمن قریب تر۔“

آفریدی کی اداسیوں میں اضافہ ہو گیا مگر وہ اس بات سے خوش تھا کہ اسے زندگی کے خارزار میں ایک ایسے رفیق کی قربت حاصل تھی جو ہوشمند بھی تھا اور وفادار بھی۔

☆ ☆ ☆
چوڑ کے ہر گوشے پر مکمل غلبہ حاصل کر لینے کے بعد علاء الدین نے جشن عام کی تقریب منعقد کرنے کا حکم دیا۔ چوڑ کی نواحی بستیوں میں منادی کرا دی گئی کہ بیماروں کے علاوہ مقامی آبادی کا ایک ایک باشندہ

عقب میں کھڑے تھے۔ زمین کی سطح سے تخت کا فاصلہ تقریباً چار ہاتھ تھا۔

جب سپاہی رتن سنگھ کو لے کر تخت کے قریب پہنچے تو سلطان نے اپنے ایک سپاہی سے اس واقعہ کی تفصیلات دریافت کیں۔ جب راجپوت سمرات اچھوتوں کے سامنے اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سلطان کے جاں نثار فوجی نے آگے بڑھ کر تخت نشانی کو بوسہ دیا اور پھر راجہ رتن سنگھ کی زبان سے ادا ہوئے والا ایک ایک حرف بیان کر دیا۔

علاء الدین نے تحقیر آمیز نظروں سے رتن سنگھ کی طرف دیکھا جسے اس کے رو بہ چوڑ کا حکمران نہیں کوئی رہزن و فراق ہو۔ ”رتن سنگھ! یہ کمزور ناتواں مخلوق جسے تو اور تیری قوم کے لوگ اچھوت کہہ کر پکارتے ہیں اسے ہم نے انسانوں کا درجہ بخشا ہے۔ تو نے اور تیرے جابر و سفاک باپ دادا نے ان کیلئے خوف و دہشت کا جو بیج بٹایا تھا آج اس کا دروازہ ہم نے کھول دیا۔ آزادی کی ایک ایک سانس کو صدیوں سے ترستے ہوئے یہ لوگ اب ہریا بندی اور زنجیر سے بے نیاز ہیں۔ ہمارے رحم و کرم نے انہیں قوت و انداز دیا ہے۔ اب یہ خدا کی بنائی ہوئی آزاد فضاؤں میں اڑیں گے اور جو رو جفا کے موسم کی سختیاں ان کے بازوؤں کو چھو بھی نہیں سکیں گی۔ اب یہ بولیں گے اور پوری توانائی کے ساتھ بولیں گے کہ ہم نے انہیں زبان بخش دی ہے۔ اب یہ اپنے گھروں میں، چوڑے میدانوں اور کھیتوں میں رقص کریں گے۔ گہیری اور بونچ کا مہو جوں کے ساز پر آزادی کے نغمے گائیں گے۔ وہ آزادی جو فلاح عالم کا عطیہ خاص ہے۔ یہ ہمارے حکم، میاں جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا حکم جو نالا نہیں جاسکتا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ ڈرے سسے لوگ بھی اپنی آنکھوں سے تیرے جھوٹے اقتدار کی بربادی کا تماشا دیکھیں۔“ علاء الدین کا ایک ایک لفظ زہر آلود تشریح خاص۔ رتن سنگھ کے دل و دماغ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

شدتِ غضب سے رتن سنگھ کا ہنسنے لگا۔ ”علاء الدین! تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ جھگڑا تیرے اور میرے درمیان تھا تو فلاح قرار پایا اور میں شکست کھا گیا۔ یہ تو مقدمات کے کھیل ہیں مگر اعلیٰ طرف لوگ اپنے حریفوں سے ایسا ذلت آمیز سلوک نہیں کرتے۔“ رتن سنگھ کی رگوں میں راجپوتی خون کی گردش ہو گئی تھی اور غلامی کے حصار میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ اپنی برباد شدہ شخصیت کا بھر م رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”رتن سنگھ! کیا تجھے جیسا بزدل اور پست فطرت انسان بھی اعلیٰ طرفی کا مفہوم سمجھتا ہے؟“ اپنے دشمن بدترین اذیت میں مبتلا دیکھ کر علاء الدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”بند نصیب! تو ہم اعلیٰ طرفی کا سبق دیتا ہے جبکہ ہمارے غلام بھی اپنے سینوں میں تجھ سے زیادہ بڑا دل رکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا۔ سلطان کی جنبش چشم کے ساتھ ہی نصرت خان اٹھ کر کہہ ہو گیا اور اس نے اپنی گردن خم کر دی۔ ”یہ ہمارا مزاج آشنا ہے سالار نصرت خان ہے۔“ علاء الدین دوبارہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”اس نے ہمارے حکم کے بغیر تجھ سے صاحبِ طرف انسانوں کی طرح سلوک کیا۔ آخر یہ ہمارا سفیر ہے، ہمارا نمائندہ ہے، اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ اگر ہم اعلیٰ طرف ہوتے تو نصرت خان تجھے زنجیریں پنا دیتا اور پھر تیرے سر کے بال پکڑ کر مجرموں کی طرح کھینچتا ہوا ہمارے رو بہ حاضر کرتا۔ یہ ہماری اعلیٰ طرفی ہی کا صدقہ ہے کہ شکست کھانے کے بعد بھی تیری پہچان باقی ہے۔ تیری اس پہچان کو مانا بھی سکتے تھے۔ پھر تجھے بدترین حالت میں ہمارے حضور پیش کیا جاتا۔ ہم نے تجھ سے کام لیا۔ شاہانہ تواضع اور رواداری کو برقرار رکھا۔“ علاء الدین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کا چہرہ آتش غضب سے جلنے لگا تھا۔

”علاء الدین یہ تیری تواضع اور رواداری ہے کہ تو میرے ہی غلاموں کو میرے ڈوبتے ہوئے چاہ و جلال پہنچا دیا ہے؟“ رتن سنگھ کے لہجے میں ساری دنیا کی نفرتیں اور تنہا سٹ آئی تھیں۔ ”تجھے اس بات پر قدرت حاصل تھی کہ تو مجھے تنہائی میں طلب کر تا اور میری تحقیر و سوائی پر گہرا پردہ ڈال دیتا۔“

”ہم ایسا ہی کرتے رتن سنگھ مگر تیری بد بختی نے تجھے یہ شرمناک دن دکھائے۔“ علاء الدین کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ ”وہ وقت یاد کر جب تو نے ہماری نظروں کے سامنے ہمارے فرمان کی دجیاں اڑا دی تھیں۔ تو نے کاغذ کے ٹکڑے نہیں کہے تھے، ہمارے وقار کو چاک کر ڈالا تھا۔ تجھے نہیں معلوم کہ وہ منظر دیکھ کر ہمارے دل پر کیا گزری تھی؟ تو نہیں جانتا کہ علاء الدین کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اور اس کے دل میں ابھرنے والے جذبات کی کیا قیمت ہے؟ تجھے لازم تھا کہ ہمارے فرمان کو بوسہ دیتا، آنکھوں سے لگاتا اور پھر اسے اپنے سامنے رکھ کر سجدہ ریز ہو جاتا لیکن تو نے ایسا نہیں کیا کہ۔ ذلتوں کے اندھے تیرے دل و دماغ کا احاطہ کر چکے تھے۔ روشنی کی کوئی کرن آتی تو کہاں سے آتی؟ پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تجھے ایسی عبرتناک سزا دیں گے جسے سر زمین چوڑ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ تو نے ہمارے زبان کے ٹکڑے کئے تھے اور ہم نے تیری سلطنت کو اس طرح تھیں ڈالا کہ اس کے ذرے تک ہوا میں بکھر گئے۔ آج صرف تیرے اقتدار کی جلی ہوئی راگھ ہے جو ہر طرف اڑتی پھر رہی ہے اور اپنے اس حکمران کا شریہ بڑھ رہی ہے جس کے سینے پر تلوار کا کوئی زخم نہیں آیا۔ اگر تو زخموں سے چور ہو کر ہمارے سامنے لایا جاتا تو تیری گردن شانوں سے کٹ کر الگ ہو گئی ہوتی تو پھر ہم تیری لاش کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ تیرے جنازے کو شانہ اعزاز کے ساتھ نذر آتش کر دیتے اور ساری دنیا کو بتاتے کہ رتن سنگھ ایک مرد شجاع تھا اور ہم سوراہوں کی بوی قدر کرتے ہیں۔ ہماری آنکھ نے تیری ریاست میں بس ایک ہی بہادر دیکھا، سپہ سالار ہری سنگھ۔ تو نہیں جانتا کہ ہم نے اس کی کیسی عزت افزائی کی تھی مگر وہ مرد خود دار تھا، منہ چمپا کر چلا گیا۔ تو تو چہانوں کی نسل پر کبھی نہ شے والا لایک داغ ہے، بزدلی، کم ہمتی، بے غیرتی اور نامردی کا گہرا داغ..... ہم نے اچھوتوں کے جہوم کو اس لئے جمع کیا ہے کہ وہ اس حکمران کا سیاہ چہرہ اور جھکا ہوا سر دیکھ سکیں جو کمزور بکریوں اور ناتواں ہرنوں کے غول میں شیر کی طرح دباؤ تھا مگر جب حقیقت یہ ہندوستان کا سب سے طاقتور شیر اس کے جنگل میں نمودار ہوا تو وہ کسی لومڑی اور گیدڑ کی مانند فرار ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شیر کے نو آموز بچوں نے اسے کسی خرگوش یا گھری کی طرح اپنے خونخوار پنجوں میں جکڑ لیا۔ اب وہی لومڑی ایک ضعیف دشت سے اس کی رواداری اور تواضع کا قانون دریافت کر رہی ہے۔ رتن سنگھ! ہم نے تجھ سے زیادہ لعنت زدہ انسان آج تک نہیں دیکھا۔“

علاء الدین نے رتن سنگھ کی نام نہاد شجاعت و مردانگی کے بت کو اپنے الفاظ کی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ راجپوت سمرات کے جسم کی لرزش اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ جوش و غضب میں بہت دیر تک کچھ بول ہی نہ سکا بس خوں نظروں سے علاء الدین کی طرف دیکھتا رہا۔ سلطان کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی تحقیر آمیز مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ فاتح چوڑ اپنے شکار کی بے کسی سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رتن سنگھ کے جسمِ لغت کی جھجکتی ہوئی چنگاریاں دوبارہ بھڑک اٹھیں تھیں۔ اگرچہ اب جھوٹی شان و شوکت کا مظاہرہ سبوت تھا لیکن پھر بھی رتن سنگھ اندرونی کرب سے بے قرار ہو کر کچھ اٹھا۔

”علاء الدین! تیری رواداری کا قانون یہ ہے کہ تو دوسروں کی عزت و ناموس پر دست درازی کرے اور لوگ تیری اس شیطانی خواہش کے آگے سر جھکا دیں؟ تیرا فرمان اس قابل تھا کہ اسے جوتوں سے

بجھ سے لڑکھڑاہے ہوتے..... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ تیری دستار ہمارے گھوڑوں کے سموں سے رگڑ کر دھوئیں میں بدل جاتی..... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ تیرا چہرہ سیاہ کر ادیتے اور تو چوڑکی لبوں میں پالگوں کی طرح گھوم رہا ہوتا۔ پھر ان ہی ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے ہاتھ کھلے ہوتے اور تیرے ہم پر چھروں کی بارش ہو رہی ہوتی..... اور ہم اس پر بھی قادر تھے کہ ریاست کے اچھوتوں کو اشارہ اردیتے۔ پھر یہ حقیر مخلوق تجھ پر تھوک رہی ہوتی اور تیرا خوشبوؤں میں بسا ہوا صاف و شفاف بدن ان ناپاک ناناؤں کے لعاب دہن میں نہا جاتا۔ آخر بدسلوکی کا وہ کونسا انداز ہے جو آج ہمارے بقعہ قدرت سے باہر ہے؟ بخدا! ذلت و رسوائی کا ایسا کوئی زاویہ موجود نہیں جو ہم تجھ پر مسلط نہ کر سکیں۔ آج دنیا کے تمام بدقسمت ہمارے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جسے بھی حکم دیں گے وہ پوری طاقت سے تجھ پر نازل ہو جائے مگر ہم ایسا نہیں کریں گے کہ آدابِ شہاشی ہمیں قہر و غضب کے مظاہرے سے روکتے ہیں تو شکست خوردہ سی لیکن کل تک اسی زمین پر حکمران رہ چکے ہیں اپنے اصولوں کے احترام میں تیری بدکلامی کو نظر انداز کرتے ہیں۔

راجہ رتن سنگھ کچھ دیر تک سنانے کے عالم میں کھڑا ہاں گھر پھر اپنے دل کا غبار کم کرنے کیلئے تندو تیز لہجے میں بول اٹھا۔ ”تو کچھ بھی کہہ لے علاء الدین لیکن تجھے تیرے ارادوں میں شکست ہو گئی تو جیت کر بھی ہار لیا کہ پد منی تیری پہنچ سے بہت دور دیوتاؤں کے سامنے میں جا چکی ہے۔ بے شک! تجھے فتح حاصل ہوئی مگر یہ فتح ایک پانچ انسان کی زندگی کی طرح بے رنگ اور ادھوری ہے۔“ راجپوت سرماٹے علاء الدین کا مذاق اڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

”لعلت زندہ رتن سنگھ! ہماری کوئی فتح نامکمل اور مفلوج نہیں ہوتی۔“ سلطان کے ہونٹوں سے ایک بار ہر شرارے پھوٹنے لگے۔ ”تو پد منی کی بات کرتا ہے کہ وہ دیوتاؤں کی پناہ میں چلی گئی! یہ کیسا بے سرو پا جھوٹ ہے۔ اس نے آگ میں جل کر خود کشی کر لی۔ یہ اس کی بدترین شکست تھی۔ جس سے ہم روٹھ جاتے ہیں اس پر زندگی اپنے دروازے بند کر دیتی ہے۔ پد منی کے ساتھ بھی قسمت نے یہی خوفناک کھیل لپیٹا ہے۔ یقیناً وہ ہم سے بہت دور جا چکی ہے لیکن جاتے جاتے وہ اپنا وقار ہمارے حوالے کر گئی ہے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے اپنی قبائلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پد منی کا وہ تاج نکال لیا جو راکھ کے ڈھیر سے برآمد ہوا تھا۔ سلطان کے خدمت گاروں نے تاج کی ساری کثافت دور کر دی تھی جس کے نتیجے میں تمام ہیرے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگے تھے۔ راجہ رتن سنگھ نے چونک کر اس تاج کو دیکھا جو اس کی محبوب بیوی کی آخری یاد گار تھا۔

علاء الدین نے اچانک پد منی کا تاج اس زاویے سے نیچے پھینکا کہ وہ اس کے پیروں میں جا گرا۔ ”خیالوں کی دنیا میں رہنا ہماری عادت نہیں لیکن آج ہم یہ تصور کئے لیتے ہیں کہ پد منی کا سر ہمارے قدموں پر جھک گیا ہے۔“ سلطان کے لہجے میں ایک بار پھر ساری دنیا کی حقارت سمٹ آئی تھی اور وہ رتن سنگھ کو بڑے عجیب انداز سے ذلیل کر رہا تھا۔

خود فہمشت کی اس فضا میں راجپوت سرماٹ پہلی مرتبہ مسکرایا اور پھر اس دہی دہی مسکراہٹ نے تیز نغمے کی شکل اختیار کر لی۔ ”علاء الدین! یہ کوئی انوکھا کھیل نہیں ہے۔ ناکام لوگ اسی طرح کھلونوں سے لپکتے ہیں۔ تو خوب جانتا ہے کہ حکمرانوں کے نزدیک تاج و تخت کی قیمت کھلونوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک بے جان کھلونا ہے جو اس وقت تیرے جوتوں میں پڑا ہوا ہے تو اسے تو اسے توڑ بھی سکتا ہے مگر اس سے پد منی کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

مسل دیا جائے۔ ہم نے پھر بھی اتنا لحاظ رکھا کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو چاک کرنے کیلئے اپنے ہاتھوں کا استعمال کیا۔ ”رتن سنگھ بھی شرربار لہجے میں بول رہا تھا۔“ یہ تیری تواضع ہے کہ تو ناخرم خواتین پر ہوس آمیز نظریں ڈالے اور جب کوئی شخص تیرے اس ذلت آمیز سلوک پر احتجاج کرے تو تیرے وحشیانہ جذبے بیدار ہو جائیں اور تو بے تصور انسانوں کی پوری ہستی کو آگ لگا دے۔“

رتن سنگھ نے علاء الدین پر بڑی خوفناک تھمت تراشی تھی۔ خلیجی حکمران اس غلیظ الزام کو برداشت نہ کر سکا اور شدید حالتِ اضطراب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ کی یہ کیفیت دیکھ کر تمام مصاحب اور سپہ سالار بھی اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ ملک نصرت خان اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ وہ آدابِ شہاشی کا بھی خیال نہ رکھ سکا اور اس نے تلوار کھینچ لی۔ ”سلطان معظم! غلام اس سے زیادہ برداشت کی قوت نہیں رکھتے۔ حکم دیجئے کہ اس احسان فراموش کی وہ زبان کاٹ کر پھینک دی جائے جس سے ناشکر گزار یوں کا غلیظ چشمہ پھوٹ رہا ہے۔“

”میں نصرت خان!.....“ علاء الدین نے اپنے سپہ سالار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”کسی کی زبان قطع کر دینا بہت آسان فعل ہے مگر تمہارے شاہ کا یہ مزاج نہیں۔ علاء الدین تو وہ ہے جو انسانی زبانوں کے زاویے بدل ڈالتا ہے اور ان کے رخ موز دیتا ہے۔ جس زبان نے تمہارے سلطان کو گالیاں دی ہیں وہی زبان کچھ دیر بعد فحاش عالم کی عظمتوں کا کلکہ پڑھے گی۔ خدا نے بزرگ و برتر کی قسم! ہم اس سے کم پر راضی نہیں ہوں گے۔“

یہ کہہ کر علاء الدین راجہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ”نسل چوانا کے ذلیل ترین نمائندے! تو جھوٹ بولتا ہے۔ ہم تیری بیوی پد منی کے نام تک سے واقف نہ تھے اپنے اس درباری برہمن راگھوجین کو یاد کر جسے تو نے ٹھکرا دیا تھا اور جو آج کل دہلی میں ہمارے گھروں پر چل رہا ہے۔ اسی منافق پنڈت نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک عورت چوڑے کے راجپوتوں پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ سن کر ہم نے چاہا کہ تجھ سے تیرا اقتدار چھیننے کیلئے کوئی بہانہ تراش لیں اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔ تو پیدا انکی احمق ہے کہ ہمارے انداز سیاست کو سمجھ نہ سکا۔ اگر تو ہم سے ہمارے رحم کی بھیک مانگتا تو ہم تجھے تیری ریاست بھی بخش دیتے اور پد منی بھی..... تو کہتا ہے کہ ہم دوسروں کی عورتوں کو ہوس آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا تجھے رانی کنولادیوی یاد نہیں جو تیری ہی ہم قوم ہے جس اس کا شوہر راجہ کرنا اپنی آبرو کو چھوڑ کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا تو کنولادیوی نے ہماری پناہ میں آنے کی درخواست کی۔ ہم اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ کنولادیوی کو ہمیشہ کیلئے داشتہ بنا دیئے مگر وہ ایک اعلیٰ خاندان کی عورت تھی۔ ہم نے اس کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا اور کنولادیوی کو ”ملکہ جہاں“ کا خطاب عطا کیا کہ ہم شرفاء کی اسی طرح قدر کرتے ہیں۔ ہمارے معیارِ کرم کو اپنے سامنے کھڑے ہوئے اچھوتوں سے پوچھ کہ ہم نے ان کی بنیوں کا بھی دامن عصمت چاک نہیں ہونے دیا۔ ہمارے جن سپاہیوں کی نظریں ہم نے ان کی شرر کیوں کاٹ دیں۔ ہماری عظیم الشان سلطنت میں لاکھوں ہندو خواتین آباد ہیں۔ ان سے دریافت کر کہ ہم نے انہیں کس طرح تحفظ دیا ہے۔ تم رندوں کا مزاج ہے کہ بے کس عورتوں کو اپنی فطری غذا سمجھ کر استعمال کرتے ہو۔ ہمیں تیرے ہی علاقے کی خواتین نے اپنی بر باد یوں کے وہ دردناک افسانے سنائے ہیں کہ انہیں دہراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ذلیل رتن سنگھ! یہ تیرا گناہ تھا مگر اس کا ذکر کرتے ہوئے ہماری گردن اس لئے جھک جاتی ہے کہ ہم ایک عالی نسب اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں اعلیٰ ظرف نہ بنایا ہوتا تو آج آسمان کی آنکھ بڑا عجیب تماشا دیکھتی۔ ہم اس پر قادر تھے کہ تیری گردن میں طوق غلامی ہوتا اور تیرے پاؤں ہماری زنجیروں کے

”نہیں رتن سنگھ! تو اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے۔“ حیرت انگیز طور پر علاء الدین کالجہ نرم ہو گیا تھا۔ مگر لفظوں میں وہی نشتروں جیسی کاٹ تھی۔ ”حکمران! تو اپنے تخت تاج ہی سے بچانے جاتے ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں تیرے قبضے میں ہوتیں تو آج تیری صورت پھنکار یوں جیسی پھنکار نہ برس رہی ہوگی۔ تو واقعہ بے غیرت ہے کہ سر کی عزت چھن جانے کے بعد بھی مطمئن نظر آتا ہے۔ خیر! یہ تیرا اپنا مسئلہ ہے کہ ہم تجھے شرم و حیا کا درس دینے نہیں آئے ہیں۔ تیری نظر میں پدمنی کا تاج ایک کھلونا سی مگر ہم اس سے کھیلیں گے نہیں۔ یہ تو ہماری طاقت کا دانی ترین مظاہرہ تھا کہ ہم نے تجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ کھیل تو اب شروع ہو گا۔ رتن سنگھ! بس چند لمحوں کی بات ہے پھر تو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ علاء الدین کس انداز کا کھلاڑی ہے؟“ یہ کہہ کر علاء الدین تخت سے نیچے اتر آیا۔ ملک نصرت خان، تاج الدین عراقی، خواجہ حاجی، ملک ظفر خان اور حضرت امیر خسرو بھی سلطان کے پیچھے بہت تیزی سے اترے۔ چاروں سپہ سالاروں کی شمشیریں بے نیام تھیں۔ ان کی روشن آنکھیں کسی عقاب کی طرح اپنے شکار پر بھی ہوئی تھیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی راجپوت سردار مشتعل ہو کر شاہ والا کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھے اور رتن سنگھ تو مکمل طور پر آزاد تھا۔ موت کے منہ میں پہنچ کر یہ بات قمرن قیاس تھی کہ راجپوت سمرات سلطان پر ناکام حملے کی کوشش بھی کر سکتا تھا ان ہی خطرات کے پیش نظر تمام امیران لشکر حد سے زیادہ محتاط اور مستعد ہو گئے تھے۔ ان کی شمشیروں کے زادیوں میں اس قدر تہیابی آگئی تھی کہ اگر راجپوت قیدیوں میں سے کوئی سردار ذرا بھی جنبش کرتا تو اس کی گردن اور جسم میں ایک دھماکے کا بھی رشتہ باقی نہ رہتا۔ علاء الدین چند قدم آگے بڑھ کر راجپوت سرداروں کے سامنے ٹھہر گیا۔ جنبش عام کے تمام شرکاء اس طرح کھڑے تھے کہ انہیں اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”دن رات ڈنٹے والے زنداں کے بھیانک اندھیرے یا سلطان کے بے مثال کرم کی روشنی؟ ہڈیوں میں ناسور پیدا کر دینے والی زنجیر غلامی یا ہمارے بخشے ہوئے نرم و نازک ریشمی لباس؟“ علاء الدین نے ایک راجپوت سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس سردار نے بہت کوشش کی کہ وہ سلطان سے نظریں ملا کر بات کر سکے مگر علاء الدین جیسے حکمران کی چنگاریاں اگلتی ہوئی آنکھوں کی تاب لانا آسان کام نہیں تھا۔ راجپوت سرداروں کی نگاہیں جھک گئیں۔

”ہم اپنے سوال کے جواب میں لمحوں کی بھی تاخیر برداشت نہیں کرتے۔“ علاء الدین کالجہ اچانک سخت ہو گیا تھا۔ ”تم پر کوئی جبر نہیں۔ یہ محض ایک سیاسی تجارت ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر سکتے ہو۔“

راجپوت سردار نے ایک نظر سلطان کی طرف دیکھا اور اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اس نے موت کی سختیاں بچ کر زندگی کے بیش و نشاط خرید لئے تھے۔

”اس کی زنجیریں کھول دو۔“ علاء الدین نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ اس کے بعد سلطان نے دوسرے راجپوت سرداروں کو بھی پیشکش کی جسے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر قبول کر لیا گیا۔

”اب ہماری وفاداریوں کا بے آواز بلند اعلان کرو۔“ علاء الدین نے راجپوت سرداروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ قلعہ چوڑے کے آخری ستون بھی سلطان کی طاقت کے دباؤ سے کانپنے لگے تھے۔ پھر نضاؤں میں ایک شور بلند ہوا۔ راجپوت سردار اونچی آوازوں میں علاء الدین خلعی کو اپنا فرمانروا تسلیم کر رہے تھے۔

”ہمیں تمہاری زبان پر پورا اعتبار ہے کہ شکست کھانے کے باوجود تم راجپوت ہو۔“ علاء الدین نے کہا۔ ”اب تم سب لوگ اپنے شاہ کی وفاداری کا عملی ثبوت پیش کرتے ہوئے رتن سنگھ کے منہ پر ٹھوک

راجپوت سردار سلطان کا حکم سن کر سناٹے میں آ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علاء الدین نہیں کھول کر انہیں اذیت و کرب کے نئے جال میں جکڑ لے گا۔

ابھی چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ علاء الدین نے گر جدار آواز میں کہا۔ ”تمہارے اعلان وفاداری پر کے سامنے بڑے لگے ہیں اور ہم مشتہر لوگوں کا جو ایک لمحے کیلئے بھی گوارہ نہیں کرتے۔“

بالآخر چوڑے سرداروں نے اپنی جائیں بچالیں اور رتن سنگھ کے منہ پر ٹھوک دیا۔ راجپوت سمرات کی زلت و سوائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک سردار نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو علاء الدین نے ملک نصرت کو راہ۔ ”اس پر زندگی حرام کر دو۔ اس نے ہماری نوازشات کی قدر نہیں کی۔“

دوسرے ہی لمحے ملک نصرت خان کی شمشیر بلند ہوئی اور ایک ہی وار میں راجپوت سردار کی گردن کٹ کر ان پر گر پڑی۔ شدت خوف سے حاضرین کے دل کانپ رہے تھے مگر علاء الدین انتہائی سکون کی حالت رتن سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”رتن سنگھ تو نے ان جاں نثاروں کو چوڑی تکسائی کے فرائض سوئے تھے۔ یہ تو اپنے تنہا جسم کی بھی ہمت نہ کر سکے۔“ علاء الدین کالجہ تحقیر آمیز تھا۔ ”ہماری فتح کا یہی راز ہے کہ ہمارے سپاہی زندگی کے ل میں سرخ دیتے ہیں۔ مگر اپنے شاہ کے جسم پر کوئی خراش نہیں آنے دیتے۔“

راجہ رتن سنگھ غصے سے پاگل ہو گیا تھا اور اس غلیظ عمل سے بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر سلطان سپاہی اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑے ہوئے تھے۔ ”علاء الدین! تو مرد ہو تا تو ایک بے نقص پر یہ نسوانی حربے استعمال نہ کرتا۔“

علاء الدین خلاف توقع مسکرایا۔ ”مردانہ حربے کیا ہوتے ہیں؟“ سلطان نے رتن سنگھ سے پوچھا۔ ”تو بھی شمشیر بکف ہوتا اور میں بھی۔ پھر دنیا دیکھتی کہ کون کس معیار کا مرد ہے؟“ رتن سنگھ نے والدین کو دوست بدست جنگ پر اسکاٹے کی کوشش کی۔

علاء الدین نے رتن سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا جو اپنے ہی سرداروں کے ٹھوک میں نہا چکا تھا۔ بڑی عجب بات ہے کہ شکست کھانے والے آخری سانسوں تک نئے نئے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ دشمن کی گالیاں سن کر بھی جذباتی نہیں ہوتے مگر آج تجھے قسمت آزمائی کا ایک موقع ضرور فراہم کریں۔

”اس کے ساتھ ہی سلطان نے اپنے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی تلوار رتن سنگھ کو دیدے۔

بلا عجب حکم تھا جسے سن کر علاء الدین کے جاں نثاروں میں لرزہ سا پڑ گیا۔ ملک نصرت خان تیزی سے کھڑا ہوا۔

”میں سلطان معظم! غلام کا مقابلہ ایک غلام ہی کرے گا۔“

”نصرت خان! ہم کئی دن سے دیکھ رہے ہیں کہ تو بار بار بھٹکتے لگتا ہے۔“ علاء الدین کالجہ قہرناک تھا۔ ”تو نہیں معلوم کہ تیرا سلطان اپنا حکم واپس نہیں لیتا۔ زندگی کا کیا ہے کہ ریشمی بستر بھی روٹھ سکتی ہے۔ ملے الفاظ ہم سے بے وفائی نہیں کرتے۔ جب یہ زبان سے ادا ہوتے ہیں تو زمین پر اپنا مکمل نفاذ دیتے ہیں۔“

ملک نصرت خان سلطان کے تیور دیکھ کر لرز گیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور حضرت امیر خسرو سے اشاروں کے لگا لگا کر آپ ہی شاہ والا کو سمجھائیں۔ نصرت خان کو یقین تھا کہ اس کی یہ تدبیر کارگر رہے گی۔ عام ایوان کا بھی یہی تاثر تھا کہ حضرت نظام الدین اولیا سے عقیدت خاص کے سبب علاء الدین امیر خسرو کی

بات نہیں مالتا تھا۔ یہی سوچ کر ملک نصرت خان نے خسروؒ سے خاموش التجا کی تھی کہ وہ سلطان کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھیں۔ نصرت خان کی جنبش چشم کے ساتھ ہی نصرت امیر خسروؒ بڑھے۔

”سلطان معظم اس راز سے خوب واقف ہیں کہ یہ عیار لومڑی طعنہ زنی کر کے جنگل کے شمشادہ کو ایسے عمل پر اکسار رہی ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔ خاکم بدہن! اگر وقت کی چال الٹی ہو گئی تو وارنٹ ہندوستان کے اعصاب میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے۔“ امیر خسروؒ کو اندیشہ تھا کہ اس دست بدست مقابلے میں کہیں راج رتن سنگھؒ علاء الدین پر غالب نہ آجائے۔

”نہیں خسرو! ہرگز نہیں۔“ علاء الدین نے جوش غضب میں امیر کی بات کو بھی رد کر دیا۔ ”تم صوفی ہو، اس لئے ہم سے بہتر جانتے ہو کہ قبر کی رات قبری میں کئے گی۔ اگر چوڑے کے پتروں کے مقدس میں ہمارے خون سے رنگین ہونا لکھا ہے تو پھر اسے کون ٹال سکتا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے سلطان نے اپنے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تلوار لے کر رتن سنگھ کی طرف اچھال دی پھر عقب کی طرف مڑے بغیر اس نے نصرت خان کی تلوار طلب کی۔ اگرچہ علاء الدین کی ذاتی شمشیر اس کے پاس موجود تھی لیکن وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”اس کے بعد تو تیرے دل میں کوئی حسرت باقی نہیں رہے گی؟“ علاء الدین نے رتن سنگھ سے پوچھا۔ رتن سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے جھپٹ کر سلطان پر ایک بھر پور وار کیا۔ علاء الدین اپنے دائیں جانب خم ہوا اور رتن سنگھ کا وار خالی گیا پھر برق کی سی تیزی کے ساتھ سلطان کی شمشیر لہرائی اور راجپوت سمرات کی آستین کا پتی ہوئی گزر گئی۔ علاء الدین کا وار مکمل تھا لیکن زاویہ بدل جانے سے رتن سنگھ کی گلائی پر ابھرنے والا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پھر بھی خون کی ایک پتلی سی دھار دشمن کے لباس کو رنگین بن رہی تھی۔

عام سپاہی تو علاء الدین کی زندگی کے بعض اہم رازوں سے نا آشنا تھے مگر تمام مصاحب اور بہ سالار جانتے تھے کہ ان کا سلطان کس قدر شجاع، جنگجو اور بلند حوصلہ انسان ہے؟ رتن سنگھ سے لڑائی کے دوران باخبر لوگوں کو وہ حادثہ یاد آگیا جب الماس بیگ ”رنتختنبور“ کی مم میں ناکام ہو چکا تھا اور پھر علاء الدین انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں ایک مختصر سا لشکر لے کر راجپوتوں کی سرکوبی کیلئے دہلی سے نکلا۔ سلطان کو شکار کا بہت شوق تھا۔

”فلپت“ کے مقام پر ٹھہر کر اس نے چند روز کیلئے اپنی اس پسندیدہ تفریح کو جاری رکھنے کا منصوبہ بنایا ایک دن شکار کھیلنے نکلا مگر معمول کے مطابق رات کو اپنی خیمہ گاہ پر واپس نہ آیا۔ دوسرے دن علاء الدین نے حکم دیا کہ سورج نکلنے سے پہلے ”قرغہ“ کا انتظام کیا جائے۔ ”قرغہ“ ایک مخصوص شکار گاہ کہتے ہیں جس کے طویل و عریض احاطے میں چیتل اور ہرن کھلے چھوڑ دیئے جاتے تھے اور پھر بادشاہ اور دیگر امراء ان جانوروں کا شکار کرتے خدمت گار ”قرغہ“ کا انتظام کرنے میں مصروف تھے اور سلطان کچھ فاصلے پر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اسی دوران علاء الدین کا کھینچا سلیمان شاہ اپنے حامی سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا اور حکومت کے خلاف سازش کرنے والے ان فوجیوں نے سلطان پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے علاء الدین کے تمام محافظ ہلاک ہو گئے۔ سلطان نے ایسی جاگنداز ساتوں میں بھی بڑی جوانمردی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ وہ بہت دیر تک تیروں کی یلغار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بالآخر اس کے دونوں بازو شدید زخمی ہو گئے۔ اس نازک ترین موقع پر علاء الدین کے ہر وقت بیدار رہنے والے ذہن نے ایک عجیب بمانہ تراشا اور وہ مردوں کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اپنے چچا کا یہ حال دیکھ کر سلیمان شاہ آگے بڑھا اور گھوڑے سے اتر کر علاء الدین کے

رہب پھچاؤہ چاہتا تھا کہ سلطان کا سراپی طرح قطع کر دے جیسے علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کا سر کاٹا تھا۔ مگر جب سلیمان شاہ نے علاء الدین کو غور سے دیکھا تو وہ مرجھکا تھا۔ ویسے حقیقت یہ تھی کہ سلطان نے بڑی ہوشیاری سے اپنی سانسیں روک لی تھیں جس کے نتیجے میں دشمن فریب کھا گئے۔ پھر سلیمان شاہ اپنے ہم لڑیا ہوئے کو لے کر ”قصر ہزار ستون“ میں داخل ہوا اور تخت شاہی پر بیٹھ کر اعلان کر دیا کہ علاء الدین کو قتل کیا جا چکا ہے اور اب وہ ہندوستان کا خود مختار حکمران ہے۔ علاء الدین کے بیشتر فوجی ”رنتختنبور“ کی مم پر جا چکے تھے، باقی لشکر نے سلیمان شاہ کی باتوں پر یقین کر کے اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور پھر ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق دربار میں حاضر ہوا اور نئے بادشاہ کو اس کی کامیابی کی مبارکباد پیش کرنے لگا۔ ادھر محل میں نشاط انگیز جشن کا ساں تھا اور ادھر علاء الدین خلجی دہلی سے اٹھارہ میل دور انتہائی زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ پھر جب سلطان کو ہوش آیا تو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے خون بہتے ہوئے زخموں پر پٹیاں باندھیں اور لڑکھڑاتا ہوا خیمہ گاہ تک پہنچا۔ علاء الدین اس غیر متوقع بغاوت کے سبب ”رنتختنبور“ جانا چاہتا تھا کہ اپنے لشکروں کو سمیٹ کر پوری طاقت سے دہلی پر حملہ آور ہو مگر سلطان کے مقرب خاص ملک حمید الدین نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ سلیمان شاہ ابھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوا ہے اگر سلطان اسی وقت دہلی لوٹ جاتے ہیں تو پرانے نمک خوار شاہ والا کو دیکھتے ہی اپنے رکن کی طرف پلٹ آئیں گے۔ علاء الدین نے ایسا ہی کیا۔ وہ اسی منتشر فضا میں بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ اراکھوت پہنچا اور یہ مثال جراثیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلعے میں داخل ہوا۔ راستے میں جس سپاہی کی غریبھی سلطان پر پڑتی تھی وہ اپنے سر کو اطاعت میں خم کر کے اسی کے ہمراہ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سلیمان شاہ کا عارضی دربار درہم برہم ہو گیا اور وہ باغی فرار ہو کر افغان پور پہنچا مگر سلطان کے سپاہی اس کے نائب میں تھے بالآخر سلیمان شاہ کا سر کاٹ کر علاء الدین کے حضور پیش کیا گیا۔

رتن سنگھ سے لڑتے وقت امرائے دربار کے ذہنوں میں اس واقعے کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ علاء الدین راجپوت سمرات پر حملہ کرتے وقت بہت زیادہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ رتن سنگھ کھاتھوں سے تلوار چھوٹ گئی۔ سلطان نے اپنے بلند ہوتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا اور حکم دیا کہ چوڑے کے ٹکڑوں کو دوسری تلوار فراہم کی جائے۔ سپاہی اپنے شمشادہ کا حکم ماننے کیلئے مجبور تھے۔ رتن سنگھ کو جنگی مولوں کے خلاف رعایت بخشی گئی مگر وہ سلطان کے مقابلے کا اہل نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں زخمی ہو کر میں پر گر پڑا۔

علاء الدین نے آگے بڑھ کر اپنی شمشیر اس کے حلق پر رکھ دی۔ ”رتن سنگھ! ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ تجھے کسی بیٹھریا بکری کی طرح ذبح کر ڈالیں مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیں تجھ جیسے بزدلوں کو زندہ رکھ کر زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے تلوار کی نوک سے رتن سنگھ کی پوری قبا چاک کر دی۔ ”اب تجھے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم نے یہ عظیم الشان سلطنت اسی شمشیر کے ذریعے حاصل کی ہے جس کی پیاس سرکشوں اور نافرمانوں کے خون سے بجھتی ہے۔“

رتن سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے لڑکھڑا کر گر گیا۔ علاء الدین نے ملک نصرت خان کو اس کی تلوار واپس کی اور امیر خسروؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”خسرو! ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہاری درخواست کو بھلا دیا مگر یہ تو چند لمحوں کا تماشا تھا اور تم ان ہی لمحات سے خائف نظر آ رہے تھے۔ ہم تمہارے جہذوں کی قدر کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی موت اور زندگی کے مقررہ وقت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر علاء الدین دوبارہ تخت تک پہنچا اور ایک

عجیب شان بے نیازی سے اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

ملک نصرت خان نے نیچے کھڑے ہو کر خون آلود شمشیر کو بوسہ دیا۔ ”شاہ والا کے ہاتھوں کو چھو کر لوہے کا یہ ٹکڑا شامت کی تاریخ میں معتبر ہو گیا۔“

علاء الدین اپنے جاں نثار کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”نصرت خان! تم بھی ہمارا حریف اعتبار ہو۔“ مسلمان سپاہیوں کے بچھے ہوئے چہروں پر شادابی لوٹ آئی تھی۔ پھر چند فوجیوں نے قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے سلطان سے التجا کی کہ آج ان لوگوں کو اپنے ولی جذبات کا مظاہرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ علاء الدین نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس جشن فتح میں مسرتوں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ سلطان کی جنبش لب کے ساتھ ہی شاہی فوجیوں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ ان سب کی شمشیریں بے نیام تھیں۔ وہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ آگے بڑھے اور تلواریں کو اس طرح فضا میں لہرانے لگے کہ جیسے رزم گاہ اچانک محفل طرب بن گئی ہو اور پانپڑوں کی جگہ شمشیروں کی جھنکار گونجنے لگی ہو۔ یہ ایک مخصوص رقص تھا جس کے ذریعے سلطان کے سپاہی جشن فتح منا رہے تھے۔

پرنایک چوڑ کی فضا میں پر شور آوازوں سے بھر گئیں۔

”وقت کا سورج..... خدا کا سایہ..... دنیا کا نگہبان.....“ یہ وہ الفاظ تھے جو چوڑ میں تعمیر شدہ مینار پر کندہ کئے گئے تھے اور اسی مینار کے نیچے علاء الدین نے اپنے تخت کو آراستہ کیا تھا۔ بت دیر تک ایسے ہی نعروں سے فضا میں لرزتی رہیں۔ سلطان کے سپاہی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک حصے سے آوازیں بلند ہوتیں تو دوسرے حصے کے لوگ ان کی تقلید کرتے نتیجتاً چوڑ کا پورا علاقہ ان نعروں سے گونجنے لگا جن میں سلطان علاء الدین خلجی کی صفات بیان کی گئی تھیں۔

اس اثناء میں شاہی طبیب مولانا بدر الدین دمشقی نے سلطان کے ان ہلکے زخموں کو صاف کیا جو رتن سنگھ سے لڑائی کے دوران کلائیوں اور بازوؤں پر ابھر آئے تھے۔ رتن سنگھ ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ نعروں کا شور سن کر کبھی وہ آنکھیں کھول دیتا اور کبھی سختی سے پلکیں بند کر لیتا۔ اس کا چہرہ خون اور مٹی کی آمیزش سے بہت ہمایاں ہو گیا تھا۔ علاء الدین کی شان میں یہ تعریفی کلمات سن کر اس کی حالت کچھ اور بگڑ جاتی تھی۔ جڑوں کی ہڈیاں ابھر آتی تھیں اور دونوں ہونٹ آپس میں پیوست ہو جاتے تھے۔ چہرے کے ساتھ اس کی روح پر شکست کے گہرے زخم تھے جن کی سوزش نے اسے ناقابل بیان اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

اچانک علاء الدین کا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ نعرہ زنی ختم کی جائے اور شمشیروں کا رقص روک دیا جائے۔ دوسرے ہی لمحے فضا پر سکون نظر آنے لگی۔ پھر سلطان نے ملک نصرت خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”رتن سنگھ کو اٹھا کر ہمارے دربار لایا جائے تاکہ ہم اسے جلالِ شاہی کا مفہوم سمجھا سکیں“ علاء الدین کے لمحے سے قہر تھک رہا تھا۔

ملک نصرت خان تیزی سے نیچے اترا اور رتن سنگھ کو کھینچ کر اٹھایا۔ اس کے سارے جسم پر لباس کی دھجیاں بھول رہی تھیں۔ راجپوت سمرات اپنے قدموں کے سارے چل نہیں سکتا تھا۔ نصرت خان نے دوسرے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ پھر رتن سنگھ کو اس طرح علاء الدین کے سامنے لے جایا گیا کہ وہاں اس سے زیادہ کمزور اور ناتواں شخص کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔ جب سپاہیوں نے چوڑ کے حکمران کو چھوڑا تو وہ لہرا کر تخت کے قریب گر گیا۔ ملک نصرت خان نے اسے دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی تو سلطان نے منع

رہا۔

”اسے ہمارے قدموں میں پڑا رہنے دو کہ اس کا صحیح مقام یہی ہے۔“

رتن سنگھ کے دل پر علاء الدین کے الفاظ کا آذیانہ پڑا تو وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا۔ ”اس سے بہتر ہے کہ مجھے قتل کر دے۔“

”نہیں رتن سنگھ! تو نے ہم سے زندگی کی طلب کی تھی مگر تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ محکموں اور غلاموں کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟“ سلطان کے نفرت آمیز لہجے کی کاٹ کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ ”آج ہمارے اہل جلال کے صدفے میں تو اس زندگی کا مزہ چکھ لے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے ملک نصرت خان کو اشارہ کیا کہ وہ رتن سنگھ کو کھینچ کر اس کا سر شاہ کے پیروں پر رکھ دے۔ نصرت خان نے اپنے فرمانروا کے حکم پر لیا مگر رتن سنگھ تڑپ کر الگ ہو گیا۔ ایک بار پھر اس نے کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کی تھی مگر لڑکھڑا کر پڑا۔

”رتن سنگھ! آج تیرے لئے ہمارے قدموں کے سوا کوئی جائے امان نہیں ہے۔“ علاء الدین چیخ کر لہا۔ ”ہمارے قہر کی گرفت سے تجھے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ اب اسی میں سلامتی ہے کہ تو کھلے دل سے ہمیں مدد کر لے ورنہ ہمارے جبر و تشدد کی تیرے اندازے سے بھی زیادہ تیز ہو جائے گی۔ بخدا! ہم نہیں ہتے تھے کہ تیرے ساتھ یہ سلوک روا رکھیں مگر تو نے ہمیں مقابلے کیلئے پکارا۔ یہ ہماری توہین تھی لیکن ہم نے اسے گوارہ کیا۔ اب تجھے ہر زاویے سے شکست ہو چکی ہے اس لئے ہوشمندی سے کام لے اور ہمارے قبر اُگ کر بجھانے کی کوشش کر۔“ نہیں تو یہ شعلے بھڑک بھڑک کر تجھے اس طرح جلاتے رہیں گے کہ نہ تو کوئلہ اس کے گاؤں نہ راکھ۔“

علاء الدین کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”ہم جسمانی اذیتوں کا سلسلہ ایک شرط پر ختم کر سکتے ہیں کہ تو ہماری رعایا کے سامنے چیخ کر کہے۔“

”رتن سنگھ! بن سر سنگھ کا اقتدار سلطان علاء الدین کے جوتوں کے نیچے۔“

راجپوت سمرات کچھ دیر تک انکار کرتا رہا مگر جب اس کے زخموں پر نمک چھڑکا گیا تو وہ چیخ اٹھا۔

”میرا اقتدار سلطان کے جوتوں کے نیچے۔“

علاء الدین خلجی پہلی بار قہقہہ زن ہوا۔ ”رتن سنگھ! تو بہت ذہین ہے کہ تو نے اپنے آپ کو بے قہر سے بچالیا ورنہ ہم تجھ پر وہ ستم ڈھاتے کہ جن کی خیتوں سے آہو اور اراولی کے سینے بھی شق ہاتے۔“

اس کے بعد سلطان نے اپنے طبیب خاص مولانا بدر الدین دمشقی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”رتن سنگھ زخموں پر مرہم رکھ دیا جائے کہ اس نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے۔ اسے پہننے کیلئے وہ پوشاک دو کہ اسے جس کا تصور بھی نہ کیا ہو اور اسے کھانے میں وہ نعمتیں پیش کی جائیں جن کے ذائقے سے اس کی ناک آٹھن ہو۔“

سلطان کا حکم سننے ہی چند سپاہی رتن سنگھ کو سہارا دے کر ان خیموں کی طرف لے گئے جو امراء کیلئے تھے۔

علاء الدین کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی رقص کر رہی تھی۔ جشن فتح کو یاد گار بنانے کے بعد وہ اپنے عزیز خضر خان کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے بائیں جانب ادب و احترام کے باعث خاموش بیٹھا تھا۔ ان نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ ”تاج سرخ“ حاضر کریں۔ انسانی جہوم دم بخود تھا اور کوئی

نہیں جانتا تھا کہ علاء الدین آنے والے لمحات میں کیا فیصلہ کرے گا؟

جب خدمت گار ”تاج سرخ“ لے کر آگئے تو سلطان اپنے فرزند خضر خان سے مخاطب ہوا۔
”جان پدرا! اب تم بڑے ہو گئے ہو اس لئے ہم تمہارے کاہنوں پر غنی ذمہ داریوں کا بار ڈال رہے ہیں۔ یہ ذمہ داریاں حقیقت میں پہاڑوں سے بھی زیادہ گراں ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ تم اس بوجھ کو اٹھا لو گے اور اپنے بزرگوں کی روح کو شرمندہ نہیں ہونے دو گے۔“

خضر خان سر جھکا کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ علاء الدین تخت سے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے ”تاج سرخ“ خضر خان کے سر پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں لگنے لگا۔

”ہمارے تمام جاں نثار گواہ رہیں کہ ہم نے خضر خان کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ یہ فاتح عالم کے خوابوں کی تعبیر اور نسلِ خلجی کا وارث و جانشین ہے۔ اس کے حضور غم ہو جاؤ کہ ہمارے بعد ہی تمہارا شہنشاہ ہو گا۔“

تمام سپہ سالار اور مصاحب خضر خان کے سامنے جھک گئے پھر بہت دیر تک میدانِ مبارکبادوں کے شور سے گونجتا رہا۔ اس جشنِ مسرت میں پوری اچھوت قوم شریک تھی اور وہ راجپوت عورتیں اور مرد بھی جو سلطان کی فتح کو دل سے تسلیم کر چکے تھے۔ اس ہنگامہ نشاط میں رام دیو پیش پیش تھا جو بار بار خضر خان کو سجدے کر رہا تھا۔

پھر فضائیں ساکت ہوئیں تو علاء الدین نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ایک اہم اعلان باقی ہے جسے ہم رتن نگار کے زخمی ہونے کی وجہ سے ملتوی کر رہے ہیں۔ اب یہ اعلان جشنِ فتح کے تیسرے دن کیا جائے گا۔ جس میں چوڑے کے ایک ایک باشندے کی شرکت لازمی ہوگی۔“

علاء الدین خاموش ہوا تو انسانی جوم اٹھنے لگے قدموں چلتا ہوا منتشر ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

تیسرے دن بھی جشن کی ہنگامہ خیزوں کا ہی عالم تھا۔ سلطان نے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد راجہ رتن نگار کو اپنے دربار پر پیش کرنے کا حکم دیا۔ دروازے کی تیار داری کے بعد رتن نگار اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے منہ تک پہنچ سکے۔ آج کی تقریب میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ راجپوت سردار بھی سلطان کے عقب میں قطار در قطار کھڑے تھے۔ رتن نگار کو علاء الدین کے بائیں جانب سب سے آخر میں جگہ دی گئی تھی۔ جب راجپوت سمرات اپنی نشست پر بیٹھ گیا تو سلطان کھڑا ہوا تمام لوگ اس اہم ترین اعلان کے منتظر تھے جس کیلئے آج خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

سلطان نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہیں قلعے کے میناروں پر جم گئیں۔ حاضرین پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص دھڑکنے والے دل کے ساتھ اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ کب علاء الدین کے ہونٹوں کو جنبش ہو اور کب وہ چین کی سانس لے سکے اچانک دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان قلعے کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ ”اے ارض چوڑا! ہم نے تیرا غرور خاک میں ملا دیا، تیری آزادیاں سلب کر لیں اور بھرترا نام تک بدل ڈالا۔“ یہ کہہ کر علاء الدین پلٹا اور اس نے راجہ رتن نگار کی طرف دیکھا جو کرسی پر بیٹھا ہوا کانپ رہا تھا۔ ”اب یہ چوڑ نہیں“ ”خضر آباد“ ہے۔ ”سلطان کی آواز دوبارہ گونجی۔ ”ہم اس علاقے کا انتظام اپنے بیٹے خضر خان کے سپرد کرتے ہیں۔ جو شخص خضر خان کا وفادار رہے گا وہ سلطان کو اپنے قریب پائے گا اور جس نے خضر خان سے سرکشی اختیار کی اس پر یہ زمین تنگ ہو جائے گی۔“

ایک بار پھر مہار کبادوں کا شور بلند ہوا۔ جب سلطان کے سپاہی اور مقامی باشندے خضر خان کو درازنی عمر

بارہا میں دے چکے تو علاء الدین نے ملک نصرت خان کو حکم دینے ہوئے کہا۔ ”رتن نگار کو اس کے خیمے میں بچاؤ۔ جب تک ہم ”خضر آباد“ کے مستقبل سے مطمئن نہیں ہو جاتے اس وقت تک اس کی حیثیت یک جہتی قیدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔“

رتن نگار لڑتے ہوئے جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اذیت و کرب کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ ابھی انسانی جوم چوڑے کے کھراں کی ذلتوں کا تماشا بنی تھا کہ ایک نقیب نے پکار کر کہا۔

”سردار آفریدی! بارگاہِ سلطانی میں شرفیابی کی اجازت چاہتے ہیں۔“

علاء الدین کے ساتھ تمام امیران لشکر اور راجپوت سردار چونک اٹھے۔ علی عامر آفریدی، راج کمار ی رملہ کے ساتھ خیمہ گاہ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

”اس بد نصیب کو بھی حاضر کرو کہ اس کے بغیر ہماری فتح کا جشن نامکمل تھا۔“ علاء الدین نے چیخ کر کہا۔

فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب علی عامر آفریدی اپنے سلطان کے الفاظ نہیں سن سکا۔ جب سپاہیوں نے اسے دروازے میں داخل ہونے کی اجازت دی تو غرورِ مسرت سے آفریدی کے قدم کانپ رہے تھے۔ وہ فتح کے جذبوں سے سرشار آہستہ آہستہ سلطان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

علی عامر آفریدی کا چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اگرچہ اپنی مجبوریوں کے سبب اس نے عملی طور پر جنگ میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اس کا دل، اس کا ایک ایک جذبہ مسلسل آٹھ ماہ تک دشمن سے روبرو رہا تھا۔ پھر آج جب ظلم کدے سے نکلنے کے بعد اس نے اپنے شاہ کا دربار عام آراستہ دیکھا تو مادحتی خوشی پا کر دافہ سا ہو گیا۔ خیمہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے غمی بار اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے اور نرملا نے اسے نبھانے کی کوشش کی تھی۔

”میں کیا کروں نرملا؟ مجھ سے یہ خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“ علی عامر آفریدی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور اس کی حرکات و سکنات سے بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔ ”تم نے دیکھا کہ میرا شاہ میدانِ کارزار میں نمودار ہوا اور اس نے دشمن کے غرور کا نشانہ بن کر مٹا ڈالا۔ میں نے رتن نگار کے دربار میں بھی تو لڑا کہ مجھے سلامتی کے ساتھ واپس جانے دو۔ اگر میرے جسم پر ہلکی سی بھی خراش آئی تو میرا سلطان پورے ہونڈ کا چہرہ بگاڑ دے گا۔ وہ برا سخت حساب لینے والا ہے۔ اگر اس کے جاں نثاروں کے لوہے کا ایک قطرہ زمین پر ٹپکے تو وہ خون کے دریا بہا دیتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو نرملا کہ یہ دلکش عکاسات کیسے سوئے پڑے ہیں؟ غلاب گاہیں قبریں بن گئیں اور پھولوں کی سیجیں شیشان کی چٹانوں میں ڈھل گئیں۔ سب کچھ بدل گیا۔“

”میں تمہاری خوشی میں برابر کی شریک ہوں سردار! نرملا نے بڑے عجیب سے لمحے میں کہا تھا۔ وہ آفریدی کی جذباتی باتیں سن کر جبراً مسکرا رہی تھی مگر اس کا دل درور رہا تھا۔ ظلم کدے سے نکل کر جب نرملا نے ”مستری بھون“ کی شکستہ حالت دیکھی تھی تو کچھ دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھایا رہا تھا۔ لہو دھلے ہوئے کھنڈر کی دیواروں سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ آفریدی کو نرملا کے غم کا شدید احساس تھا لیکن وہ ماضی کا ماتم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے راستے میں نرملا کو یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ تعبیر کے تبدیلی کے ساتھ انسان کے تمام معاشرتی رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ آفریدی نے بہت پر جوش لہجے میں یہ بھی کہا تھا۔

”علاء الدین کی فتحِ مسلم قوم کی فتح ہے اور ایک مسلمان لڑکی کی حیثیت سے اس فتح میں تمہارا بھی حصہ ہے۔“

رہا۔ "علاء الدین کی برہمی کا انداز اس قدر خوفناک تھا جیسے وہ اپنے معتد سپہ سالار کے بجائے کسی بکا دشمن سے مخاطب ہو۔

سلطان کی طرف سے علی عامر آفریدی کو ایک اور گالی دی گئی تھی جو اپنے اثرات میں پہلی سے زیادہ شدید تھا۔ علاء الدین نے اسے احسان فراموش اور نمک حرام قرار دیا تھا۔ وہ اس کلمہ بد کو کسی طرح برداشت کر لیا مگر جب یہ کہا گیا کہ وہ غلام زادہ ہے تو آفریدی کو محسوس ہوا جیسے سلطان نے اس کے پورے نسب نامے باہی پھیر دیے ہو۔ افغان سپہ سالار اس الزام تراشی پر چیخا چاہتا تھا مگر اس نے شرط وفا نبھاتے ہوئے زہر کا یہ بھی حلق سے اتار لیا۔ آفریدی کے دل و جگر کٹ رہے تھے مگر اس کے ہونٹوں پر شور فغاں نہیں تھا۔ بچھلے بچھلے بہت دیر لگ گئی۔ علی عامر کے قدم ڈمگ رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی غیر معمولی قوت ارادی کے ذریعے جلتے ہوئے جذبات پر قابو پایا۔ سینے میں درد آگ آگ اب بھی روشن تھی مگر آفریدی نہیں چاہتا تھا کہ ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں وہ اپنے شاہ سے الگ کرے اور دیکھنے والے ایک نیا تماشا دیکھیں۔ اسی مجبوری نے آفریدی کو روکا اور وہ اپنی روح کے رکن کو فراموش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"شاہ! آخر میرا تصور کیا ہے کہ میں درجہ اعتبار سے گر کر احسان فراموشوں کی صف میں شامل پاؤں؟" آفریدی کا بچہ دل کی جراثیموں سے زخمی تھا۔

"ہم کہاں تک تیرے جرائم شمار کریں۔" علاء الدین کے قہر و غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "تیرا ایک گناہ تھے رائے اندہ روگہ گاہ کرنے کیلئے کافی ہے کہ تو ہمیں غاصب اور محسن کش قرار دیتا ہے۔" یہ کہہ کر علاء الدین نے رام دیو کی پوری گفتگو دہرا دی۔

آفریدی کی سماعتوں میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور پھر سازش کی ان گرم و تیز ہواؤں نے اس کے دماغ کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ آفریدی کو ہر طرف ایک عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔ جیسے ساری دنیا رچی رہی ہو کہ علی عامر، شاہ کاغدا رہے اور ملک و ملت کا بدترین دشمن ہے، عہد شکن ہے اور اس نے لوں کے ہاتھوں اپنا خمیر بیچ دیا ہے۔

"اے خدا! یہ کیسی قیامت ہے جو وقت سے پہلے صرف ایک شخص پر نازل کر دی گئی ہے؟" علی عامر کی شدت سے چیخ اٹھا وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہر مجرم اسی طرح خدا کو پکارتا ہے۔" علاء الدین کے غصے کی آگ کچھ اور بھڑک گئی تھی۔ آفریدی نے ایک بار پھر اپنی کھتی ہوئی شخصیت کو سینے کی کوشش کی۔ "سلطان! ذی وقار! میرا جرم بگڑ گیا ہے درخواست کرتا ہوں کہ یہ گفتگو سرور بار نہ کی جائے میں نہیں چاہتا کہ میرے شاہ کا راز بے خاص سے نکل کر کم ظرفوں کی انجمن میں چلا جائے۔"

"جو خود کم ظرفی کی انتہائی پستیوں میں اترا گیا آج وہ دوسروں کے طرف پر اعتراض کر رہا ہے۔ آخر میری کیا ہے؟ کوئی منزل ہے؟" علاء الدین کے ایک ایک لفظ سے اپنے سپہ سالار کیلئے تحقیر کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آفریدی! کیا تجھے وہ وقت یاد نہیں جب تو نے ہمارے جاہ و جلال کو رتن سنگھ کے دربار میں نیلام کر دیا ایک ایسے شخص سے سیاسی پناہ طلب کی تھی جو ہمارا معتوب تھا۔ پھر تو کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہمارا رفق تیرے سینے کی گراہیوں میں محفوظ ہے؟"

"میں نے شاہ کے وقار کو ان اذیت ناک لمحوں میں بھی داغدار نہیں ہونے دیا جب اس غلام کی جان لگی تھی۔" آفریدی کی آواز لرز رہی تھی۔ "وہ رتن سنگھ ہو یا چوڑے کے دوسرے سردار، ہر شخص کو

نرمل ایک باد پھر مسکرائی تھی مگر اس کے تبسم میں دل کی خمش نمایاں تھی۔ زمین اور نسل کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ برسوں ان کی یادیں ستاتی ہیں، تب کہیں جا کر انسان کا ماضی ایک بھولا بھلا خواب بنتا ہے لیکن کبھی کبھی وہی خواب اس طرح گردش لینے ہیں کہ انسان حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی بھی پرستش کرتا رہتا ہے۔ نرمل نے بتوں کی خدائی سے انکار کر دیا تھا مگر وطن اور دوسرے رشتوں کی محبت ابھی اس کے خون میں موجزن تھی۔ انقلاب تو بڑے بڑے جوانمردوں کو انشکریزی پر مجبور کر دیتا ہے اور نرمل تو محض ایک نو عمر و شیرازہ تھی جس نے کم سن ہی میں اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ اگر آج وہ پر شور آواز میں بھی ماتم کرتی تو یہ کوئی تعجب چیز عمل نہ ہوتا لیکن نرمل نے بے مثال ضبط کا مظاہر کیا تھا۔ بس چند لمحے تھے جب وہ ماضی سے لپٹ کر روئی تھی اور پھر اس نے ایک ایک یاد کو اپنے بازوؤں کے حلقے سے الگ کر دیا تھا۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہی تھی۔ ایسی دنیا جو اس کیلئے قطعاً اجنبی تھی۔ نرمل نے راج رتن سنگھ کو دیکھا جو زخمی حالت میں کچھ سپاہیوں کا سہارا لے مسند پر کھڑا تھا۔ پھر جیسے ہی آفریدی تخت کے قریب پہنچا، سلطان نے راجپوت سمرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جا رتن سنگھ کہ آج ایک اہم ترین مسئلہ پر ہمیں تیری گواہی درکار ہوگی۔"

علاء الدین کا حکم سن کر رتن سنگھ نے ایک نظر علی عامر آفریدی اور نرمل کی طرف دیکھا پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آفریدی شدید حالت اضطراب کا شکار تھا۔ رتن سنگھ کے بیٹھنے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور تخت کے نیچے چار ہاتھ کے فاصلے پر نصف حد تک جھک گیا۔ پھر سیدھا ہوا اور دونوں بازو پھیلا دیئے۔ یہ شاہ کے احترام کا ایک مخصوص انداز تھا۔

"سلطان! ذی حشم کو یہ عظیم الشان فتح مبارک ہو۔" آفریدی کی آواز بلند تھی اور لہجہ دلی جذبات سے سرشار تھا۔ "بے شمار طالع آزمائوں نے دیار ہند کا رخ کیا مگر ایسی فتح کسی کو میسر نہیں آئی۔ آج ساری اقبال منڈیاں میرے امیر کے قدم بہ قدم چل رہی ہیں۔ غلاموں کی زبانیں عاجز ہیں کہ وہ کن الفاظ میں شاہ والا کو خراج تحسین پیش کریں۔"

ابھی علی عامر آفریدی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ علاء الدین کی پرہیزگار آواز گونجی۔ "آفریدی! ہم نمک حراموں اور احسان فراموشوں کی مبارکباد قبول نہیں کرتے۔"

علی عامر سنائے میں آگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند لمحوں میں اعتبار کی پوری بساط الٹ جائے گی۔ آفریدی کو جس انداز سے گالیاں دی گئی تھیں وہ ایک حساس اور وفادار نوجوان کو ہلاک کر دینے کیلئے کافی تھا۔ آفریدی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بدترین ذلت کے کیڑوں میں ہو۔ ذہن پر بیک وقت کئی پہاڑ ٹوٹ کر گرے گئے ہوں اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر کھڑ گیا ہو۔ آفریدی نے سلطان کی بارگاہ میں پھیلے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو سمیٹا اور پھر ان ہی لرزتے ہاتھوں سے دل کو پکڑ لیا۔ آفریدی کو ایسا لگا جیسے علاء الدین نے خود آگے بڑھ کر اس کے سینے میں زہر آلود شہتر تار دیا ہو۔

"شاہ! کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟" علی عامر آفریدی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کیا سازش کی تیز آندھی نے چراغ و فاجیادیا اور کیا یہ غلام درجہ اعتبار سے گر گیا؟" اذیت و کرب کی شدت سے آفریدی کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا اور خمش دل نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

"تو معتبری کب تھا آفریدی؟" علاء الدین کے لہجے میں نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔ "ہم نے تجھے زندگی کی پستیوں سے اٹھا کر اعتبار کے بلند ترین درجے پر فائز کیا مگر تو ایک غلام زادہ تھا، شاہوں کے احسانات کی قدر

”تو نے ہمیں بھی رسوا کیا اور بے چارے و کرم سنگھ کو بھی جس نے تجھے پناہ دی۔“ ایک مختصر سے بیسکوت کے بعد سلطان کی گرجدار آواز دوبارہ ابھری۔ ”تو نے ہمارے اعتبار کا بھی خون کیا اور اس شخص بھی خودکشی پر مجبور کر دیا جو اسحق ہوتے ہوئے بھی تیرا احسن تھا۔“

”شاہ والا! میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ ان نازک باتوں کو سرعام نہ چھیڑا جائے۔“ آفریدی نے ردِ عمرے لیے میں کہا۔ ”غلام کی عزت تو خاک میں مل چکی مگر میں اس عظیم فلاح کے دامنِ جلال کو ہر آلودہ دیکھنا نہیں چاہتا جس کی منزل ہندوستان کی سرحدوں سے بہت آگے ہے۔ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ ہر شاہ اپنے جاں نثاروں سے بدگمان ہو کر دوسووں کے جال میں الجھتا چلا جائے اور دنیا کی تسخیر کا خواب بغیر سے پہلے ہی آنکھوں میں دم توڑ دے۔“

”کیا تو جھٹتا ہے کہ ہماری فتوحات تجھ جیسے ناشکر گزار غلاموں کی محتاج ہیں؟“ علاء الدین کا غصہ بے عروج کو پہنچ چکا تھا اور اب شبث دلائل بھی منفی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جب دلوں میں نفرتیں لپکتی ہیں تو سورج کی تیز روشنی بھی رات کا اندھیرا معلوم ہونے لگتی ہے۔ علاء الدین کی بھی یہی کیفیت تھی۔

”نہیں شاہ! آپ کی اقبال مندی ہم جیسے خدمت گاروں کی محتاج نہیں مگر یہی تو وہ ہاتھ ہیں جو اپنے امیر اپہم کے روادہی قنائیں داخل ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے کہتے علی عامر آفریدی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ ”فلاح عالم نے اپنے ایک ادنیٰ غلام سے یہ تو پوچھا ہوتا کہ آفریدی تیرے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے؟ بد فلوں سے کیسے ہیں؟ اور تیرے چہرے پر یہ زخم کس نے سجائے ہیں؟ اور تیرے جسم پر تشدد کی یہ علامتیں ماں سے آئی ہیں؟“

”ہم نے تیری چرب زبانی کا یہ انداز آج تک نہیں دیکھا تھا آفریدی!“ علاء الدین کے تھری وہی حالت بارہ لوٹ آئی۔ ”تو محض ایک مسخرہ شاعر ہے جسے خوشامد کے آداب بھی نہیں آتے۔“

”اے صاحبِ جاہ و جلال! میں نہ شاعر ہوں اور نہ زمانہ ساز سیاستداں!“ سوزشِ دل نے آفریدی کے الفاظ میں آگ بھردی تھی۔ ”میں صرف ایک جاں نثار ہوں، ہمیشہ سرکف رہنے والا۔ شاہ کا ایک نذرانہ ہوا اور میں اپنی متاعِ جاں لٹا دوں۔ اس سے زیادہ مجھے وفاداری کا دعویٰ نہیں۔“

علاء الدین چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور بہت غور سے آفریدی کو دیکھنے لگا۔ ”اگر تو سچا ہے تو ان اردو انسانوں کے جہوم میں سے کوئی ایک گواہ پیش کر دے۔ پھر ہم سمجھ لیں گے کہ لوگوں نے اپنی اہموانہ فطرت سے مجبور ہو کر تیرے خلاف سازش کی ہے۔“

آفریدی اس طرح مطمئن نظر آنے لگا جیسے کسی نے اپنا کاسے موت کے منجد حار میں ساحلِ حیات کی زنجیری سناپی ہو۔ ”خود را بہ رتن سنگھ گواہ ہیں کہ میں نے بدترین حالات میں شادی کی سفارت کے فرائض کی طرح انجام دیئے تھے؟“ آفریدی نے استہناکی پر جوش انداز میں راجپوت سمرات کی طرف اشارہ کیا جو ان کے جتنے کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔

آفریدی کا اشارہ دیکھتے ہی رتن سنگھ کے چہرے پر نفرت کے کئی رنگ نمایاں ہو گئے اور اس کی آنکھوں پر اٹھ ہا پہلے کا وہ منظر ابھر آیا جب ایک مسلم نوجوان اپنے سلطان کی وکالت کرتے ہوئے راجپوتوں کے غریبی نوئی کر رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی رتن سنگھ کا ذہن سگنے لگا اور اب وہ اپنی شکست کا انتقام لے لیا تھا۔

چاہتا تھا کہ میں آپ کی مذمت کروں۔ پھر جب میں نے ان سنگروں کے ہاتھوں سفارت کے تقدس کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو پتھروں کے پجاریوں نے مجھ پر وہ سنگباری کی کہ ”آبو“ اور ”ارادلی“ بھی چیخ اٹھے۔ کاش! آپ دیکھتے کہ میرے غم پر نا آشنا چائیں بھی خون کے آنسو رو رہی تھیں۔“

”تو جھوٹا ہے آفریدی!“ علاء الدین کی آواز سے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ ”ہم نے تجھے بچانے میں غلطی کی۔ تو اولاً آخر ایک زہر بلا سانپ ہے۔ تیری فطرت میں زہر شامل ہے۔ تو انہیں بھی ڈس لینا ہے جو تجھے دودھ پلاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر علاء الدین نے رام دیو کو پکارا وہ شعبہ باز لڑتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کے در پر پہنچ کر سجودے میں گر پڑا۔ ”رام دیو! اٹھ اور اس کے جرم کی مکمل روداد بیان کر۔“

علاء الدین نے چوڑے جادوگر کو اپنی ٹھوک سے سیدھا کیا۔

اسلام کی قابضین کر بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ رقص کرنے والے اس عیار انسان نے آفریدی کو ایک ایسے گناہ میں ملوث کر دیا جو سلطان کے نزدیک ناقابلِ معافی تھا۔ رام دیو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ جھوٹی داستان سناتا رہا جسے اس کے شیطان دماغ نے نہایت ہوشیاری سے تراشا تھا۔ سلطان جلال الدین غلجی کے قتل سے لے کر زلملا کساری کے فرار اور وکرم سنگھ کی خودکشی تک اس نے بے پورے لرزہ خیز افسانے سنا ڈالے۔ ایسے افسانے جن میں آفریدی کے سوا کسی دوسرے مجرم کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

جب رام دیو خاموش ہوا تو علاء الدین نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا..... ”تیری رواں گی کے بعد لوگوں نے بتایا کہ تو ہمیں غاصب، جابر اور احسان فراموش سمجھتا ہے۔ ہم نے اس خوفناک انکشاف کو ایک قسمت سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور یہ سوچ کر نظر پجالی کہ شاید دوسرے درباری تجھ سے حسد رکھتے ہیں مگر جب چوڑے کے در و دیوار سے بھی یہی آوازیں ابھرنے لگیں تو ہمیں یقین کر لینا پڑا کہ کئے والے سچ کہتے تھے۔ افسوس! ہم نے تجھ پر کیسا اعتبار کیا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے یہ حقیر و ناتواں لوگ بھی ہمارا مذاق اڑانے لگے۔“

”شاہ والا! اگر میں آپ کا وفادار نہیں تھا تو لوگ اس وقت کیوں خاموش رہے؟“ آفریدی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ایک مضبوط دلیل کا سہارا لیا۔ ”مجھ پر الزامات کی یہ بارش رواں گی کے بعد کیوں کی گئی؟“

”اس لئے کہ لوگ ہمارے قہر سے ڈرتے تھے۔“ علاء الدین نے آفریدی کی دلیل کو جھٹلادیا۔ ”انہیں معلوم تھا کہ جب ہم کسی کو پسند کرتے ہیں تو اس کے خلاف کوئی کمزور بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطنتِ خلجی کے جاں نثاروں نے وقتی طور پر ہمارے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا تھا مگر جب انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔“

آفریدی کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کیلئے امید کی جو کرن جھلکائی تھی وہ فوراً ہی بجھ گئی۔ اپنے چچا سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد علاء الدین ہر وقت احساسِ جرم میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی اسی کمزوری سے ملک کا غور نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب یہ آفریدی کی بد نصیبی تھی کہ رام دیو نے بھی اپنی جان بچانے کیلئے اسی جھوٹ کا سہارا لیا اور علاء الدین کے دل میں علی عامر کی طرف سے ایسی گرہ پڑ گئی جسے کسی طرح بھی کھولا نہیں جاسکتا تھا۔ علاء الدین بڑا فخر خد خد کر رہا تھا مگر جب ایک بار کسی کی طرف سے بدگمان ہو جاتا تو پھر اس کیلئے معافی کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ آفریدی کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا کہ دشمنوں نے اس کے حوالے سے سلطان کے ایک ایسے زخم کو کھرچ ڈالا جس کی سوزش علاء الدین کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔

پھر جب علاء الدین نے اسے پکارا تو وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے اسے اپنے گرد و پیش کی خبری نہیں تھی ”رتن سنگھ! تو اس شخص کو یقیناً پہچانتا ہو گا۔ یہ ہمارا سفیر علی عامر آفریدی ہے۔ رام دیو کے بقول اس ہماری شان میں نازیبا کلمات ادا کرنے کے بعد تجھ سے سیاسی پناہ طلب کی تھی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اپنی زبان سے پوری تفصیلات بیان کر کہ ہمارے نزدیک حیرت انگیز گواہی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہم نے سنا ہے کہ راجپوت جھوٹ نہیں بولتے۔“

علاء الدین نے آفریدی کے مقدمے میں بڑی خوفناک شہادت طلب کی تھی۔ رتن سنگھ اپنی نفست کھڑا ہونے لگا تو سلطان نے اس کو ٹوکا۔ ”زنجیوں کیلئے ضروری نہیں کہ وہ کھڑے ہو کر احرام شاہ کا مظاہر کریں۔“

رتن سنگھ دوبارہ بیٹھ گیا اور علی عامر آفریدی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ نوجوان تو اس قابل ہی نہ تھا کہ سفارت کا فریضہ انجام دے سکے۔ میرے معمولی درباریوں کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ آخر سلطان سے اتنی بڑی غلطی کس طرح سرزد ہو گئی؟“ راجہ رتن سنگھ بڑی عیاری سے آفریدی کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ ”اس نادان نے اپنے فرمانروا کی شان جلائی ظاہر کرنے کیلئے کہا تھا کہ علاء الدین ایک ایسا بیٹھا ہے جو اپنے خوشی رشتوں کو بھی نگاہ کر م سے نہیں دیکھتا اسے انسانی لہو پینے کی عادت ہے چاہے یہ لہو سلطان جلال الدین خلجی کا ہو یا خود اس کے اپنے کسی بیٹے کا۔ وہ ہر حال میں قہر کا دیوتا ہے۔“ یہ کہہ کر راجہ رتن سنگھ خاموش ہو گیا اور سلطان کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے ایک بھیانک حقیقت کا انکشاف کر کے علاء الدین کی نسلوں پر احسان کیا ہے۔

”تو نے سنا آفریدی؟“ سلطان کسی شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔ ”رام دیو نے تو بہت شائستہ الفاظ میں تیرا غلیظ جرم بیان کیا تھا مگر رتن سنگھ نے سب کچھ کہہ ڈالا۔“

ابھی آفریدی کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ رتن سنگھ بلند آواز میں کہنے لگا۔ ”اگر یہ بے ہودہ شخص درمیان میں نہ ہوتا تو یقیناً کچھ اور نتائج برآمد ہوتے۔“ راجہ رتن سنگھ نے انتہائی شرمناک جھوٹ کا سہارا لے کر آفریدی کے جرائم کی فہرست مکمل کر دی تھی۔

علاء الدین نے کچھ کے بغیر اپنے سفیر کی طرف دیکھا جسے رام دیو اور رتن سنگھ کی جھوٹی گواہیوں نے سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا گناہ گار ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

”سمرات! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک راجپوت اپنی قومی روایت کو اس طرح پامال کر ڈالے گا۔“ آفریدی نے رتن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہمارا رام دیو سے تو کوئی شکایت نہیں کہ ان کا مذہب ہی منافقت ہے مگر آپ تو ایک شمشیر زن تھے۔ پھر آپ نے سو رماؤں کی رسم کو اتنے سستے داموں کیوں فروخت کر ڈالا۔“

”سلطان! آپ اس کی بدگمانی کا انداز دیکھ رہے ہیں؟“ رتن سنگھ شدت غضب سے کانپنے لگا تھا۔ ”اس نے آپ کی شان میں کچھ اور بھی نازیبا کلمات ادا کئے تھے۔ اب میں کیا عرض کروں کہ آپ خود ہی تمام حقائق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔“

”آخر ان لوگوں کو تجھ سے کیا عداوت ہے آفریدی؟“ علاء الدین مزید غضب ناک ہو گیا تھا۔ ”اگر تو سچا ہوتا تو تیرے حق میں کوئی نہ کوئی گواہی ضرور پیش کی جاتی۔ تو پورے چوتھوے سے صرف ایک شہادت ڈھونڈنا جو تیری بے گناہی کا اظہار کر سکے۔“

آفریدی نے گہرا کر راجپوت سرداروں کی طرف دیکھا جو تخت شاہی پر سلطان کے عقب میں صف بستہ

ہے تھے۔ ”اے مردان شجاع! کیا تم بھی یہی کہتے ہو کہ میں نے راجہ رتن سنگھ کے دربار میں اپنے ان کی مذمت کرتے ہوئے راجپوت سمرات سے سیاسی پناہ طلب کی تھی؟“ مگر وہ سب کے سب علی عامر ہی پر متفق ہو چکے تھے۔ یہ انتقام کا ایک سنہری موقع تھا جسے کوئی شخص بھی گنوا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر فضا پر خاموش طاری رہی پھر تمام راجپوت سرداروں نے یک زبان راجہ رتن سنگھ کے الفاظ کی برکت ہوئے آفریدی کی بد قسمتی پر مرثیت کر دی۔

”کیا تیرے خیال میں یہ بھی جھوٹے ہیں؟“ علاء الدین نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اگر ساری بستی جھوٹی دیکھیں تیری بے گناہی کیلئے آسمان سے فرشتے طلب کروں؟“

اس کے بعد علی عامر آفریدی نے وہ اشعار پڑھے جو سندھ سے رخصت ہوتے وقت محمد بن قاسم کی ہان تھے۔

”لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جو انمرد کو ضائع کر دیا جو رخنہ بندی اور جنگ کے دن کام

مارے دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آفریدی نے تمام حاضرین پر اپہنتی ہوئی نظر ڈالی اور بڑے کرہ ناک لہجے ہ شعر پڑھا جو محمد بن قاسم واسطہ کے قید خانے میں اس وقت پڑھا کرتے تھے جب اسلام کے عظیم فرزند پر نانداز میں تشدد کیا جاتا تھا۔

”اے زمانے! تجھ پر افسوس کہ تو شرفاء کے حق میں بڑا ہی بد دیانت ہے۔“

آفریدی نے کئی بار اس شعر کی گردان کی اور پھر علاء الدین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاہ والا! ارا عالم بھی میرے خلاف گواہی دینے لگے تو میری وفاداری اور سچائی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ میں ٹالک اولاد ہوں۔ میرے بزرگ سچ پر زندہ رہے اور سچ کی خاطر اپنی جانیں لٹا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لی عذریہ اپنے انجام کو پہنچنے والا ہوں۔ سلطان ذی حشم ایہ سب کے سب اس لئے میرے دشمن ہیں کہ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ جھوٹوں اور منافقوں کا وہ گروہ ہے جو میرے بچے آپ کی رسوائی چاہتا تھا میں چوتھوے کا تہرا ازار دار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کون آپ کیلئے کیا جذبات ہے؟ یہ مجھے مردہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ شاہ والا کی سماعت تک ان کے غلیظ کلمات پہنچانے والا میں دریا مگر جس میں واپس لوٹ آیا تو یہ خوفزدہ نظر آنے لگے“ اس سے پہلے کہ میں ان کے راز فاش کرتا ہے خلاف متحد ہو گئے۔ ہدی سے ہدی کا اور جھوٹ سے جھوٹ کا بڑا قوی رشتہ ہوتا ہے۔“ آفریدی ناکہ سلطان کے دل کا غبار صاف نہیں ہو گا مگر پھر بھی وہ اپنے دل کا بوجھ اتار دینا چاہتا تھا۔

علاء الدین گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے علی عامر کو کبھی اتنا جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ آفریدی کا عجز اور جرے کا رنگ ثابت کر رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے لیکن علاء الدین کے ذہن میں ملک کانور کے لڑکش کر رہے تھے اور ان ہی الفاظ کی گونج رام دیو راجہ رتن سنگھ اور دوسرے راجپوت سرداروں اہت میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ گواہیوں کے اسی تسلسل نے علاء الدین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ لی کی رہایت کو بھٹا دے۔ سلطان اپنے سفیر کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کر سکتا تھا لیکن سلطان الدین خلجی کے قتل کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ حساس تھا۔ اپنے اس جرم کی پردہ پوشی کیلئے میں نے ان لوگوں کو کبھی قتل کر دیا تھا جو مرحوم سلطان کیلئے اپنے دل میں ذرا بھی نرم گوشہ رکھتے لیکن وہ جرحی کہ وہ آفریدی کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اتمام حجت کے طور پر راجہ

رتن سنگھ کے بھانجے سوگر مال دیو کو پچھلی صف سے نکل کر آگے آنے کا حکم دیا۔

سوگر اچھو قدم کا قابضہ طے کر کے سلطان کے سامنے خم ہو گیا۔

”آفریدی! تو اسے پہچانتا ہے؟“ سلطان نے انتہائی ناخوشوار لہجے میں علی عامر کو مخاطب کیا۔

”نہیں سلطان معظم! میں اس نوجوان سے واقف نہیں۔“ آفریدی نے حیرت سے سوگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سوگر مال دیو ہے، پورے چوتھ میں ہمارا اتحاد وادار۔ اس نے ہماری خاطر بڑی ایذا نہیں برداشت کی ہیں کیا تو اس جو انور دی گواہی سے مطمئن ہو جائے گا؟“

آفریدی خاموش رہا۔ وہ کیا جواب دیتا کہ چوتھی فضا میں تک اس کی دشمن ہو گئی تھیں۔

”جو شخص اظہار حقیقت کیلئے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

علاء الدین کی پر جلال آواز دوبارہ گونجی۔ ”سوگر ایک ایسا ہی نوجوان ہے جسے ہم معتبر سمجھتے ہیں۔ اگر یہ تیرے حق میں گواہی دیدے تو ہم تجھے معاف کر دیں گے آفریدی!“

”کل تک میں بھی آپ کا حرف اعتبار تھا شاہ والا!“ علی عامر کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل گئی۔

علاء الدین نے آفریدی کی شکایت کو نظر انداز کر دیا اور سوگر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

سوگر ابڑی عجیب کنگش میں جلتا تھا۔ اس نے اداس نظروں سے زملا کماری کی طرف دیکھا جس کے حسن

تانیاک کو گردش روز و شب نے بھگا کر رکھ دیا تھا۔ سوگر کے دل میں جذبات کی ایک تیز لہر اٹھی اور پھر اس کے ہوش و حواس پر چھائی چلی گئی۔ سوگر، زملا سے شدید محبت کرتا تھا لیکن زملا اس حقیقت سے بے خبر تھی

کہ ایک راجپوت زادہ اس کا خاموش پرستار ہے۔ سوگر نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ اپنی بے چین تمنائوں کا اظہار کر سکے مگر زملا کی شاہانہ بے نیازی اور غیر معمولی سنجیدگی نے اسے لب کشائی کا موقع نہیں دیا۔ سوگر

کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا کہ آفریدی کی آمد نے سب کچھ بدل ڈالا۔ وکرم سنگھ کو قتل کر دیا گیا مگر

سوگر ایہ نہیں سمجھتا تھا کہ وکرم سنگھ کے ساتھ اس کی محبت بھی ایک اندوہناک حادثے کا شکار ہو جائے گی۔

پھر آج جب ایک طویل عرصے کے بعد سوگر نے زملا کو آفریدی کے ساتھ دیکھا تو یہ راز فاش ہو گیا کہ اس کی

محبوبہ کسی غیر کے دامن سے وابستہ ہو چکی ہے۔ سوگر کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور دل

کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی۔ آخر سوگر کے ہونٹوں کو جنش ہوئی اور اس نے علی عامر آفریدی کے خلاف

شہادت پیش کر دی۔ ایک بے گناہ انسان پر الزام تراشی کرتے ہوئے سوگر کی زبان میں ہلکی سی لرزش پیدا

ہوئی تھی مگر جھوٹ اور ففاق کے ہنگامے میں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس نقطہ پر غور کرتا۔

”بد نصیب آفریدی! اپنی قسمت پر ماتم کر کہ یہ آخری گواہ بھی تیرے کام نہیں آیا۔“ علاء الدین کی

پُرہیت آواز گونجی ”کیا اب بھی تو منکر ہے کہ تجھ سے یہ گناہ عظیم سرزد نہیں ہوا؟“

”ہاں سلطان! سردار آفریدی ان تمام الزاموں سے بری ہیں جو ان پر انتہائی بے شری کے ساتھ

لگائے گئے ہیں۔“ ابھی علاء الدین کے قرب تک لہجے کی گونج باقی تھی کہ زملا نے چند قدم آگے بڑھ کر بلند

آواز میں کہا۔ ”سوگر مال دیو پر شہادت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آخری گواہ تو میں خود ہوں، ”زملا کماری“

مہمانتزی وکرم سنگھ جو ان کی بیٹی۔“

فضایک بار پھر ساکت ہو گئی۔ علاء الدین نے حیرت سے اس خوبصورت و دیشہ کو دیکھا جس پر

جلال شاہی اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ راج رتن سنگھ بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا اور غبی صف میں

لڑتے ہوئے رام دیو کے چہرے پر زردی پھیلنے لگی۔

”اے میری چچا زاد بہن کے شوہر سمرات رتن سنگھ! اور اے راجپوت قوم کے معزز سردارو! مجھے یہ کہتے

دے شرم آتی ہے کہ دھرتی کی کوکھ سے اتنے بے ضمیر انسان آج تک پیدا نہیں ہوئے تم نے بزرگوں کی

ہوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا اور ان کے روشن چہروں پر کبھی نہ مٹنے والی کالک مل دی۔“

ابھی زملا کماری کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رام دیو بدحواس ہو کر پچھلی قطار سے نکلا اور سلطان کے

لمنے آکر گڑ گڑانے لگا۔ ”فاتح عالم! یہی ہے وکرم سنگھ کی آوارہ بیٹی زملا کماری جو شاہی سفیر کے

ہاتھ فرار ہو گئی تھی اور جس کے شرمناک فعل نے ایک غیرت مند باپ کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔“

”جو محبت ہوتا ہے رام دیو! میرے باپ نے خودکشی نہیں کی۔ انہیں قبول اسلام کے جرم میں رتن سنگھ

نے قتل کیا ہے۔“ زملا نے جوش جذبات میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ وہ علاء الدین جیسے

چریت شنشہ کے سامنے حاضر ہے اور جہاں اونچی آواز میں بولنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔

راجپوت سمرات گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ”سلطان! یہ لڑکی اپنے باپ کی موت کے صدمے سے پاگل ہو گئی

ہے۔ کون ذی ہوش اس کی باتوں پر یقین کرے گا کہ وکرم سنگھ نے مرنے سے پہلے اپنا مذہب بدل ڈالا

نا۔“

”میں اپنے مرحوم باپ کے ایمان پر گواہی دوں گی۔“ وکرم سنگھ کی موت کا یقین آ جانے کے بعد

زملا کماری سوگوار ہو گئی تھی اور اس کے کچے سے دل کا درد جھلکنے لگا تھا۔ ”سردار آفریدی بتائیں گے کہ ان

ہو وجودگی میں مہمانتزی نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا تھا اور پیغمبر اسلام کی رسالت پر گواہی دی تھی۔

برے باپ کا یہی جرم تھا کہ جس کی سزا میں ان سے زندگی چھین لی گئی۔“

علاء الدین شدید حیرانی کے عالم میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے اعترافات نے صورت حال یکسر بدل

الی تھی۔

”سلطان! میں انصاف چاہتی ہوں۔“ زملا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ اسلام میں

ان کا بدلہ جان ہے۔ اس لئے رتن سنگھ کو میرے حوالے کیا جائے۔“

”یہ ریاست چوڑ کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔“ علاء الدین واقعات کے

چٹو خم میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

”یہ ریاست کا اندرونی معاملہ نہیں سلطان! یہ ایک مسلمان کے خون ناحق کا حساب ہے۔“ زملا

ت زیادہ پرجوش ہو گئی تھی۔ ”مہمانتزی کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ ایمان لایچکے تھے۔“

علاء الدین خاموشی سے اس بیباک لڑکی کی گفتگو سنتا رہا۔

”رتن سنگھ کا دامن ایک اور عظیم انسان نسیاں آندھ پال کے خون میں ڈوبا ہوا ہے۔“ زملا کوئی بات

شہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ”سیاسی اس طرح ایمان لانے تھے کہ ایک ایک راجپوت ان کی تبدیلی مذہب

سے واقف ہے۔ چوڑ کے تمام باسی جانتے ہیں کہ اس جرم میں آندھ پال کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور پھر

سب انہیں مرنے کے بعد آگ میں جلایا گیا تو چوڑ کو سیاہ آندھ نے گھیر لیا تھا۔ وہ عذاب بھی سردار آفریدی

کے سبب ٹل گیا کہ سیاسی نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس کی گواہی یہ اچھوت بھی دیں گے جو سلطان کے حکم پر

ٹاہوئے ہیں۔“

علاء الدین نے ریاست کے اچھوتوں کی طرف دیکھا مگر راجپوتوں کے خوف سے کسی نے آندھ پال کے

قتل اور سیاہ آندھی کا اعتراف نہیں کیا۔

”لڑکی! تجھے تیرے باپ کی موت نے بدحواس کر دیا ہے۔“ علاء الدین نے بیزار لہجے میں کہا۔ ”اگر تو راجپوتوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے تو پھر یہ اچھوت کیوں خاموش ہیں؟ تیرے حق میں کوئی بول سکتا ہے؟“ ”کیا میری شہادت کافی نہیں ہے؟“ شدت جذبات سے نرملا کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں ایک مسلمان لڑکی ہوں جس نے سردار آفریدی کے کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔“

”آفریدی کا کوئی کردار نہیں کہ وہ اپنا اعتبار کھو چکا ہے۔“ علاء الدین کے ہونٹوں سے نفرت کی وی آگ برس رہی تھی۔

نرملا، سلطان کی اس جارحیت پر احتجاج کرنا چاہتی تھی کہ حضرت امیر خسروؒ کھڑے ہو گئے اور سلطان سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”شاہ والا! جب ایک شخص یہ آواز بلند کلمہ پڑھ لے تو پھر اس کے ایمان پر کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“ امیر خسروؒ نے نرملا کی حمایت کی وہ آفریدی کو بے قصور سمجھتے تھے مگر چوڑی آنے والے واقعات سے بے خبر ہونے کے سبب بھرپور کالت نہ کر سکے۔

”موت کے ڈر سے ایمان لانے والا مسلمان نہیں ہوتا خسرو۔“ علاء الدین کو یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔

”یہ لڑکی! اس وقت ایمان لائی جب ہر طرف کافروں کا جھوم تھا۔“ امیر خسروؒ نے سلطان کی ناراضگی کے باوجود اسلامی عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”حالات بتاتے ہیں کہ اس نے موت کے نرغے میں اسلام قبول کیا پھر موت کا خوف کہاں باقی رہتا ہے؟“

خسروؒ کی دلیل سن کر علاء الدین کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ابھر آیا۔ ”کیا اس طرح تم اس شخص کی طرف داری کر رہے ہو جو تمہارے سلطان کے وقار کا قاتل ہے۔“

”نہیں شاہ والا! میں تو سارے معاملات سے بے خبر ہوں۔“ امیر خسروؒ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی اتنا عرض کروں گا کہ آفریدی کو تنہائی میں ایک موقع فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنے موقف کی وضاحت کر سکے۔ میرے خیال میں حالات وہ نہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں یقیناً یہاں کچھ ایسے حادثات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل جانا سلطان کیلئے بے حد ضروری ہے۔“

علاء الدین حضرت نظام الدین اولیاؒ سے نسبت رکھنے کے باعث امیر خسروؒ کا بہت لحاظ کرتا تھا اور اس نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں نالی تھی اس وقت بھی جب خسروؒ نے آفریدی کی سفارش کی تو سلطان چب داب کھا کر رہ گیا۔

”ہم تمہاری درخواست پر غور کریں گے خسرو! یہ کہہ کر علاء الدین اپنے محافظ دستے کے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”جب تک ہم کوئی فیصلہ صادر نہ کر دیں اس وقت تک آفریدی کو نظر بندی کی حالت میں رکھا جائے۔“ پھر ایک مختصر سے سکوت کے بعد سلطان نے دوسرا حکم دیا۔ ”اور اس لڑکی کو شامی حرم سرا میں داخل کرو یا جائے۔“

نرملا تڑپ اٹھی۔ ”سلطان میں کوئی لوٹا ہوا مال نہیں کہ کسی کینیز یا لونڈی کی طرح شامی عشرت کدے کی زینت بنادی جاؤں۔ میں ایک مسلمہ دوشیزہ ہوں اور میری زندگی سردار آفریدی سے وابستہ ہے۔ اس لئے مجھے بھی ان کے ساتھ حوالہ زندان کر دیا جائے۔“

علاء الدین کیلئے ایک کمزور سی لڑکی کا یہ تلخ جانا قابل برداشت تھا۔ ابھی وہ اپنے رد عمل کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ اسے خیمہ گاہ کے دروازے پر بالچل سی نظر آئی۔ علاء الدین نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت

اڑے میں داخل ہو چکی تھی۔ پہرے دار سپاہی اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ عورت بے نیازانہ ہل چلی آ رہی تھی۔

”یہ کون ہے رتن سنگھ؟“ علاء الدین نے گھبرا کر راجپوت سمرات سے پوچھا۔ ”رتن سنگھ پر بھی بدھشت سی طاری ہو گئی تھی وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔“ سلطان! یہ بھان متی ہے ف زادی چوڑی ٹھکرائی ہوئی ویشیا۔“ رتن سنگھ کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

مائی بھان متی تیزی سے علاء الدین خلیجی کی طرف بڑھتی رہی۔ دروازے پر پہرے دار سپاہیوں نے سے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور سلطان سے کس لئے ملنا چاہتی ہے؟ جواب میں بھان متی نے خاموشی رکھی تھی اور کسی اجازت کے بغیر دروازے میں داخل ہو گئی تھی۔ سپاہیوں نے بہت کوشش کی کہ وہ وڑھی عورت کو جبراً روک لیں مگر بھان متی نے جب بھی ان کی طرف دیکھا، وہ سم کر اپنی جگہ رک۔ سپاہیوں کو محسوس ہوا جیسے ان کے جسموں کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ پھر جب بھان متی تخت کے پہنچ گئی تو علاء الدین نے چیخ کر اپنے محافظ سپاہیوں سے کہا۔

”اس ناپاک عورت کو کس نے اندر آنے دیا؟“ علاء الدین، رتن سنگھ کی وضاحت کے بعد بھان متی نف زادی سمجھنے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے بوڑھی عورت کو ناپاک کہہ کر پکارا تھا۔

”علاء الدین! یہ تیرے پارسا سپاہی مجھ گناہ گار کو روکنے کی صلاحیت نہیں۔“

”مان متی کا انداز مخاطب بداعامیانہ تھا۔ جیسے اس کے سامنے سلطان علاء الدین خلیجی کے بجائے معمولی انسان ہو۔ فرمانروائے ہند پہلے ہی بھان متی سے خفا تھا کہ وہ اجازت کے بغیر اندر چلی آئی تھی پھر اس نے شہنشاہ کو اس کے نام سے پکارا تو علاء الدین مزید غضب ناک ہو گیا۔

”بد نصیب عورت! تجھے خبر نہیں کہ یہ فاتح عالم کا دربار ہے۔“ علاء الدین نے قہر آلود لہجے میں متی کو مخاطب کیا۔ ”یہاں حاضری کی پہلی رسم سجدہ گزاری ہے۔ کوئی انسان اس وقت تک شرفیاب ہو سکتا جب تک وہ ہمارے سامنے جھک نہ جائے۔“

”یہ تیرے دربار کے آداب ہیں جنہیں تو خوب جانتا ہے۔“ مائی بھان متی کا وہی لہجہ تھا جس سے لدین کیلئے انتہائی تحقیر کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”اور جن لوگوں نے تیرے لئے سجدہ روار کھادہ خود اپنے اعمال داہدہ ہیں۔ میں ایک ذات کے سوا کسی کے آگے خم نہیں ہوتی۔ رتن سنگھ گواہ ہے کہ میں جو کچھ کہہ

وں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔“ مائی بھان متی نے راجپوت سمرات کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک ی کے عالم میں اپنی نشست پر کھڑا تھا۔ ”اور رام دیو بھی مجھ سے بخوبی واقف ہے کہ میں نے کسی بت کی کو تسلیم نہیں کیا۔ ساری بستی جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میرے لئے تمام موسم یکساں ہیں۔

گھمراہ گھمراہ (تحت شامی) پر بیٹھے یا منہ کے بل اونڈھا کر پڑے، کوئی سمرات کا لقب اختیار نہ کیا کوئی شہنشاہیت کی قبا پہن لے، میرے نزدیک سب کے سب بھکاری ہیں۔ یہ زمین راجپوتوں کی زمینوں کی۔ زمین کا مالک جو ازل میں تھا وہی آج بھی ہے۔ تم سارے کے سارے کرایہ دار ہو۔

والا تو کوئی اور ہے۔ وہ جب چاہے گا تمہیں اپنے گھر سے نکال باہر کرے گا۔“ علاء الدین نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی عورت کو دیکھا تھا جو آداب شامی سے قطعاً بے نیاز تھی۔ کی سماعت ایسے گستاخانہ لہجے کی عادی نہیں اور ہماری آنکھیں بے ادبی کے اس منظر کو کبھی برداشت

نہیں کرتیں۔" یہ کہتے کہتے سلطان کھڑا ہو گیا تھا حاضرین دیکھ رہے تھے کہ شدتِ غضب کی وجہ سے علاء الدین کے جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

"اپنا اور میرا وقت برباد نہ کر علاء الدین۔" مائی بھان متی نے اسی جارحانہ انداز میں فرمانروائے ہند کو مخاطب کیا۔ "میں تیرے جاہ و جلال کا مظاہرہ دیکھنے کیلئے یہاں نہیں آئی ہوں۔ مجھے بہت سے ضروری کام ہیں۔ میں شاید زندگی بھر ظلم کی اس تماشا گاہ کا رخ نہ کرتی مگر مجھے اپنے بچوں کی خاطر اس جگہ بھی آنا پڑا جسے دنیا کا سب سے زیادہ لعنت زدہ مقام سمجھتی ہوں۔" بھان متی نے دریا کے اس خوفناک و صرا سے کی شکل اختیار کر لی تھی جو اچانک پتھروں کا بند ٹوٹ جانے سے آزاد ہو گیا ہو۔ جشنِ فتح میں شریک ہونے والے ایک ایک فرو پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ ہر شخص حیران و پریشان نظروں سے بھان متی کو دیکھ رہا تھا۔ مقامی آبادی کے جو لوگ بھان متی سے واقف تھے وہ بھی حیرت کی موجوں میں ڈوب گئے تھے کہ آج تک انہوں نے اس بوڑھی عورت کو اتنا برہم نہیں دیکھا تھا..... اور سلطان کے مصاحب، سپہ سالار اور فوجی جو بھان متی سے نا آشنا تھے ان پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شاہ کے وفاداروں نے تو آج تک ایک ہی منظر دیکھا تھا کہ جو بھی علاء الدین کے سامنے آتا میں بوس ہو جاتا۔ پھر یہ عورت کون تھی جس نے سلطان کے جروت کو چند لمحوں میں کسی بھکاری کی شخصیت سے بھی زیادہ بے اثر بنا دیا تھا۔

سلطان کی نازک مزاجیاں بھلا اس بے ادبی کو کس طرح برداشت کرتیں؟ علاء الدین اپنی جس سنگدلی اور سفاکی کیلئے مشہور تھا اس کی وہی حالت قہر لوٹ آئی۔ "اس طوائفِ زادی کی زبان کاٹ کر اپنے شاہ کے قدموں میں رکھ دو۔" علاء الدین نے ان سپاہیوں کو حکم دیا جو اچھوتوں کی اگلی قطاروں کے قریب کھڑے تھے۔

سپاہیوں نے سلطان کا حکم سنا اور مائی بھان متی کو دردناک سزا دینے کیلئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکے۔ سپاہیوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے جسم منجمد ہو گئے ہوں۔ علاء الدین دوبارہ چیخا۔ "کیا تم دربارِ سلطانی کی روایت کو بھول گئے کہ تمہارا شاہ اپنے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر برداشت نہیں کرتا۔"

سپاہیوں کی بے کسی قابلِ دید تھی۔ وہ اپنی تلواریں بے نیام کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے ہاتھ کسی فوج زدہ انسان کے ہاتھ ہو کر رہ گئے تھے پھر جب غلاموں سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی تو وہ درود کر کے کہنے لگے۔ "شاہ والا! ہمارے جسم پھرا گئے ہیں ہم اپنی مرضی کے مطابق جہش بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہیں ایک فاحشہ عورت کی بدکلامیوں نے خوفزدہ کر دیا ہے۔" علاء الدین کی آواز میں کسی زخمی درد سے جیسی غراہٹ تھی۔

"سلطانِ معظم! ہم تو کبھی موت سے بھی نہیں ڈرے۔ پھر یہ کمزور سی عورت ہمیں کس طرح دہشت میں مبتلا کر سکتی ہے؟" سپاہیوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم شہنشاہ کو کیسے بتائیں کہ ہماری قوتِ ارادی فنا ہو گئی ہے اور ہم اپنے آپ کو ایک بے جان مجسمہ سمجھ رہے ہیں۔"

علاء الدین نے بڑی حیرت سے اپنے سپاہیوں کا جواب سنا اور پھر ملک نصرت خان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "آخر تجھے ہمارے حکم کا انتظار کیوں ہے نصرت خان؟ تو نے آج سے پہلے تو اس قدر بے حسی کا مظاہرہ نہیں کیا کہ ایک غلیظ عورت تیرے آقا کی شان میں مسلسل گستاخیاں کرتی رہے اور تیری تلوار بے نیام نہ ہو۔"

ملک نصرت خان سلطان کی اس طعنہ زنی سے بدحواس ہو گیا۔ اس نے شدید سراپسیگی کی کیفیت میں

ہشیر کھینچی مگر بھان متی پر وار نہ کر سکا۔ وہ بھی کسی ناقابلِ فہم خوف کا شکار ہو گیا تھا۔ علاء الدین اپنے جاں نثار امیر لشکر کو برا بھلا کہتا رہا اور پھر اس نے چاہا کہ وہ خود آگے بڑھ کر بھان متی کو اس کی گستاخیوں کی سزا دے۔

سلطان کو مشتعل دیکھ کر حضرت امیر خسروؒ نے درمیان میں یہ اغلت کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان مائی مقام! ایک بوڑھی عورت کی بدحواسیوں کو درگزر فرمائیں۔ یہ بات منصبِ شاہی کے خلاف ہے کہ ہندوستان کا ایک با اثر حکمران عام انسانوں کی طرزِ کلام میں الجھ جائے۔ یہ درباری آداب سے واقف نہیں۔ اس لئے سلطان کے شایانِ شان الفاظ استعمال نہیں کر سکتی۔ اس کی لغزش زبان پر نہ جائے اور اس سے پوچھئے کہ اسے اس کی کوئی ضرورت یہاں تک پہنچ لائی ہے۔" حضرت امیر خسروؒ بھان متی سے ذاتی طور پر توافقی نہیں تھے مگر اس کے چہرے کا جلال اور آواز کی پیش دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔ ملک نصرت خان اور دیگر سپاہیوں کا مفلوج ہو جانا بھی کوئی عام واقعہ نہیں تھا۔ خسروؒ کی رازقانہ بصیرت نے اس راز کو جان لیا تھا کہ بھان متی بھی کوئی صاحبِ دل خاتون ہے جس نے خدا کی محبت میں نیکی ہر طاقت کو ٹھکرا دیا ہے۔

بھان متی نے چونک کر امیر خسروؒ کی طرف دیکھا پھر علاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں دلی۔ "کیا میں نے اپنے خدا کی پرستش اس دن کیلئے کی تھی کہ دنیا کے ہوس پرست میرے جسم پر قابو پالیں اور میری ذات کو ایک تماشا بنالیں۔ اسے تو اس لئے پوچھا تھا کہ وہ آفات و مصائب کے وقت اپنی لازوال دتوں کے ساتھ میری مدد کو آئے اور مایا جال کے تمام پھندے کاٹ کر آتما کو مومہ کے خونی پنجوں سے پالے۔"

ابھی مائی بھان متی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رام دیو بول اٹھا۔ "سلطان! خدا کیلئے اس کی عہدہ بازوں سے کوئی تاثر نہ لیجئے گا کہ یہ چوڑی جاودہ کرنی ہے۔ اس نے غیبتِ طاقتوں کے بل پر اس گہری کے بایوں کو بہت ستایا ہے آج جبکہ بہت پرستوں کی بساط الٹ گئی ہے تو یہ عیار عورت بھی خدا کا نام لے رہی ہے۔ اسے اپنا حشر معلوم ہے اس لئے اپنے لرزہ خیز انجام سے بچنے کیلئے خدا کی پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اس افسوس ناک مسلمانوں کے خدا سے ہے اور نہ ہندوؤں کے دیوتاؤں سے، یہ محض شیطانی قوتوں کی پجاری ہے۔" رام دیو اپنی ناکامیوں کا انتقام لینے کیلئے مائی بھان متی پر ہمتیں تراش رہا تھا۔

بھان متی رام دیو کی بدحواسیاں دیکھ کر مسکرائی۔ "بے شک! میرا خدا وہ نہیں ہے جو تیرا ہے۔ میں اس نادیدہ قوت کی عبادت کرتی ہوں وہ تیری سمجھ میں آ سکتی۔" یہ کہہ کر بھان متی علاء الدین سے مخاطب ہوئی۔ "اے دنیا کی فتح کے خواب دیکھنے والے! اس مناقق کو درمیان سے ہٹا دے کہ میرے کرایا کاروں کی باتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔"

علاء الدین بھی کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا اپنے متاثر شاہانہ جاہ و جلال کے باوجود اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک بوڑھی عورت کو اپنے سامنے جھکانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آخر سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے رام دیو کو بیٹھ جانے کیلئے کہا اور بھان متی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اے عورت! تو کون ہے اور ہماری بارگاہ میں کس لئے حاضر ہوئی ہے؟ ہمارے روبرو اپنی ضرورت ان کرنا کہ ہم تجھے اپنی بخشش و عطا سے نوازیں۔ اگر تیرے ساتھ اہل چوڑے کوئی ظلم کیا ہے تو ہمیں بتا کہ انجرم کون ہے؟ ہم تیرے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔"

"تو میرا مشکل کشا نہیں ہو سکتا علاء الدین کہ میں کوئی حاجت ہی نہیں رکھتی۔" بھان متی کا انداز گفتگو

برائے نیازانہ تھا۔ ”اگر تو میری ضرورت پوری کرنے پر قادر ہوتا تب بھی میں تیرے سامنے اپنا دامن نہیں پھیلاتی۔ چوڑکی ہستی والوں نے نہیں، ظلم تو تو نے مجھ پر کیا ہے کیسا ظلم کہ میں اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ تجھے کیا خبر کہ آبو کے مندر میں بیٹھ کر میں کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے پوچھ جو آنے والوں کا راستہ دیکھتے دیکھتے بجھ گئیں۔ اور میرے ہونٹوں سے پوچھ جو ایک خدا کے نام لیاؤں کیلئے دعائیں کرتے کرتے پھرا گئے۔ اور میرے قلب سوزاں سے پوچھ جو اس تمنائیں جل رہا تھا کہ جب اہل ایمان کے روشن چہرے دیکھوں گی تو جان حزیں کو قرار آجائے گا۔۔۔۔۔۔ مگر علاء الدین! تو نے مجھے بہت مایوس کیا۔ تو وہ نہیں ہے جس کے شوق دید میں منیاسی آندیاں ہلاک ہو گیا اور جس کی خاک پریشاں چوڑکی فضاؤں میں چیتی پھر رہی ہے اور تو وہ بھی نہیں ہے جسے دیکھنے کی آرزو میں مہمانی و کرم سنگھ نے موت کو گلے لگالیا۔ تو تو شخص ایک دنیا پرست ہے جس کے اقتدار کی بھوک نہ انسانی لاشوں سے مٹی ہے اور نہ جلے ہوئے مکانات کے ڈھیر سے۔۔۔۔۔۔ تیرے دربار میں رام دیو جیسے ضحیر فروش اعزاز پاتے ہیں اور آفریدی جیسے جاں نثار مجرم بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ خوشامدی تیرے لکے چاٹ کر زر نگار کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور غیرت مند صرف اس لئے زنداں کے اندھیروں میں پھینک دیئے جاتے ہیں کہ وہ تیرے جوتوں کو بوسہ نہیں دے سکتے۔ جس کی بیانی اتنی کمزور ہو کہ وہ اپنے قریب رہنے والے جانناڑوں کے چہرے نہیں دیکھ سکتا وہ بھان متی کے ساتھ کیا انصاف کرے گا؟“

”اے عاقبت نااندیش عورت! آخر تو کتنا کیا جانتی ہے؟“ بھان متی کے الفاظ کی گرمی سے علاء الدین کے دل و دماغ جل اٹھے تھے۔ ”میں نے تیرے بڑھاپے پر ترس کھا کر بہت دیر تک برداشت کیا مگر تیری وحشت یہی سمجھتی رہی کہ علاء الدین ان شعبہ بازیوں سے خوفزدہ ہے۔ تو نہیں جانتی کہ میں نے اپنی زندگی میں کیسے کیسے مداری اور کیسے کیسے جاوگر دیکھے ہیں۔ تو اول و آخر ایک ضعیف و ناتواں عورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیری زباں بندی کیلئے مجھے جبر سے کام لینا پڑے اور پھر تاریخ ہند میری طرف یہ کہہ کر انگلی اٹھائے کہ علاء الدین کمزوروں اور بے کسوں کے گناہوں کو معاف نہیں کر سکا۔“

”مجھے تیرے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی۔“ بھان متی کی آواز سے وہی جلال نمایاں تھا۔ ”میرے دم کو غنیمت جان علاء الدین کہ میں اپنے بچوں کی وجہ سے تجھ تک پہنچی اور تجھے آنے والے زمانوں سے خبردار کیا۔ میں جانتی ہوں کہ تو نے اپنی آنکھوں اور کانوں پر بے خبری کے پہرے بٹھائے ہیں اور یہ پہرے اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک تجھے دو گزر زمین کے اندر اینٹوں اور پتھروں کے پیچے نہیں وبادیا جائے گا۔“

بھان متی کے لہجے کی نشتریت اس قدر خوفناک تھی کہ علاء الدین اس کی سوزش سے کانپنے لگا۔ ”ہماری بارگاہ جلال کو اس فاحشہ عورت کے وجود سے خالی کر دو۔“ سلطان نے وحشت زدہ ہو کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

پوری خیمہ گاہ پر ایک تکلیف دہ سناٹا چھا ہوا تھا۔ بھان متی ایک بار پھر مڑی اور آفریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے! یہ ظلم کے خالق، یہ تشدد کے بندے اور حرص و ہوس کے غلام، تیری بے گناہی پر شہادت نہیں دیں گے۔ اگر یہ مظلوموں کی وادہ سی کرتے اور حق کو حق سمجھتے تو ان پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ قہر تو تو انہی اس لئے ہے کہ یہ سچ کو چھپاتے تھے اور جھوٹ کی پردہ پوش کرتے تھے۔ تیرے کردار پر منیاسی آندیاں کی گواہی کافی ہے کہ وہ مرد پار سا تجھے اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ تجھے وکرم سنگھ کی گواہی سے مطمئن ہو جانا چاہئے کہ وہ تیری خاطر ہلاک ہو گیا اور یہ میری معصوم بچی نرملہ، جس نے تیرے لئے اپنا سب کچھ تیاگ

سپاہی بڑی عجیب کشاکش کا شکار تھے وہ اپنے فرمانروا کے حکم پر بلاتا خیر عمل کرنا چاہتے تھے مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتے تھے۔ تمام فوجی ایک بار پھر لرز کر رہ گئے اور انہیں اپنے دست و پا مفلون سے نظر آنے لگے۔

”علاء الدین! تیرے یہ غلام کچھ نہیں کر سکتے۔ آج خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ تیری بے پناہ طاقتوں کے سامنے ایک بے سارافاش کو سر بلند رکھے۔“ اچانک بھان متی کی آواز لرزے لگی اور اس کی پلکیں اس بھاپ سے بھیگنے لگی تھیں جو دل کے جلنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ جذبوں کا سلگنا ہوا بدل

بھان متی کے رخساروں پر برس جاتا، وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی علی عامر آفریدی کے قریب پہنچی۔ جنبش فتح میں شریک ہونے والا ایک ایک فرد پوڑھی عورت کی ناقابل فہم حرکات دیکھ رہا تھا۔ بھان متی چند لمحوں تک آفریدی کو دیکھتی رہی پھر علاء الدین کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”سلطان! یہ میرا بیٹا علی عامر آفریدی ہے۔ اس عورت کا بیٹا جسے اہل چوڑو طوائف زادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ مگر یہ میرے شریک گاہہ ہے کہ اگر اسے دکھوں کا کوئی کاٹنا پھولے تو میں سر سے پاؤں تک زخمی ہو جاؤں اور میری روح خراشوں سے بھر جائے۔ ایک خدا کے پوجنے والے دھرتی کے کسی بھی کونے میں رہیں، ان کے سچے فاصلوں کی کتنی ہی دیواریں کھینچ جائیں لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ یہ آفریدی میرا بیٹا جس نے چوڑو کے بت کدے میں اپنے کردار کا چراغ روشن کیا، آج اس لئے اندھیروں میں ہلک رہا ہے کہ اس کی وفا پر کوئی گواہی دینے والا موجود نہیں۔ جن کی آنکھیں تھیں وہ اندھے بن گئے اور جو زباں رکھتے تھے انہوں نے اپنے ہونٹ سی لئے۔“ یہ کہہ کر بھان متی چند لمحوں کیلئے خاموش ہوئی اور پھر اس نے رتن سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عظیم راجپوتوں کے عظیم فرزند! تجھے خیر ہے کہ چوڑو پر یہ عذاب کیوں نازل ہوا؟ اس لئے کہ تو بدوا بن بیٹھا تھا تو نے خدا کے ان بندوں کو حیوانوں سے بدتر قرار دیا تھا جو اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے اور جن کے خون کا رنگ تیرے خون کی طرح سرخ تھا۔

تو نے انسانی حقوق غصب کر لئے اور ان لوگوں کو سچ بنا کر جانوروں کے درجے سے بھی گرا دیا جو تیری ہی طرح آدم کی اولاد تھے۔ تو نے اطلس و کم خواب پہنا اور ان کے جسم ٹاٹ کی دھیوں کو ترستے رہے۔ ان کے پیٹ بھوک کی آگ میں جل کر کوئلہ بن گئے اور تیرے گھوڑوں اور کتوں کی توانائی میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر جب وہ اپنی محرمیوں کا نام کرنے تیرے عالی شان قلعے کی طرف بڑھے تو ان کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے کہ وہ سینہ کوئی نہ کر سکیں۔ ان کے شور و فغاں سے تیری نیندوں میں خلل واقع ہوا تھا، اس لئے ان کے ہونٹوں پر کھلا ہوا سید پٹکا دیا گیا کہ اس گمراہی سے فریاد اور احتجاج کی رسم ہمیشہ کیلئے اٹھ جائے۔ ان کے دل میں آہنی پھینٹ ٹھونک کر سر راہ چھوڑ دیا گیا کہ پھر کوئی غریب زندگی کا ارمان ہی نہ کر سکے۔ تیری سفایوں نے خدا کی ہمتی کو کفن خانہ بنا ڈالا اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ چوڑو کے درندے بھی شرمناک جنگلوں میں روپوش ہو گئے وہ کوئی رسم گناہ تھی جس نے تیرے دور حکومت میں فروغ نہیں پایا اور وہ کونسا ظلم تھا جسے تیری حمایت حاصل نہیں رہی۔“ ستر سال سے جولا و ایمان متی کے سینے میں پک رہا تھا آج وہ ہونٹوں کے راستے بہ نکلا تھا۔ ”پھر جب تو اپنے جو رو بچار مطمئن ہو گیا تو آسمان نے تیری ذلت اور تباہی کے دروازے کھول دیئے۔ تو اور یہ تیرے ہمیشہ ساتھی کسی شرمناک حالت میں زندہ ہیں؟ ایسی لعنت زدہ زندگی تو کسے بھی قبول نہیں کریں گے۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ یہ ناپاک جانور بھی اس وقت تک چیختے رہتے ہیں جب تک انہیں ہلاک نہ کر دیا جائے۔ مگر تیری روح کی غلاظت نے تجھ سے چیختے کا یہ حوصلہ بھی چھین لیا ہے۔“

پوری خیمہ گاہ پر ایک تکلیف دہ سناٹا چھا ہوا تھا۔ بھان متی ایک بار پھر مڑی اور آفریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے! یہ ظلم کے خالق، یہ تشدد کے بندے اور حرص و ہوس کے غلام، تیری بے گناہی پر شہادت نہیں دیں گے۔ اگر یہ مظلوموں کی وادہ سی کرتے اور حق کو حق سمجھتے تو ان پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ قہر تو تو انہی اس لئے ہے کہ یہ سچ کو چھپاتے تھے اور جھوٹ کی پردہ پوش کرتے تھے۔ تیرے کردار پر منیاسی آندیاں کی گواہی کافی ہے کہ وہ مرد پار سا تجھے اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ تجھے وکرم سنگھ کی گواہی سے مطمئن ہو جانا چاہئے کہ وہ تیری خاطر ہلاک ہو گیا اور یہ میری معصوم بچی نرملہ، جس نے تیرے لئے اپنا سب کچھ تیاگ

دیا اس کی رفاقت کی قدر کرنا۔ بس یہ تین گواہیاں بہت ہیں۔ تجھے کیا معلوم کہ اکثر انسانوں کی پوری زندگی میں ایک گواہی بھی میسر نہیں آتی۔ تو خوش نصیب ہے میرے بچے کہ ایسے محبت کرنے والے کے ملنے ہیں؟ اگرچہ کے راستے میں کچھ لوگ تجھ سے بچھڑ جائیں تو زیادہ غم نہ کرنا کہ اس منزل تک وہی پہنچتے ہیں جن کی روحیں نگار ہوتی ہیں جن کے دلوں سے خون کے قطرے نکلتے رہتے ہیں اور جن کے سینوں سے ہر موسم میں زخموں کی فصل اگتی رہتی ہے۔ میری طرف دیکھ آفریدی! اپنی ماں کی دھندلی آنکھوں کی طرف۔“

علی عامر گھبرا یا ہوا تھا۔ اس نے مہمانی و کرم سنگھ اور نرملہ کماری کی زبانی بھان متی کے تذکرے سے سنا تھا۔ آفریدی کو وہ دردناک منظر یاد آگیا جب رتن سنگھ کے سپاہیوں کی شدید ضربات نے کچھ دن کیلئے اس کی بینائی چھین لی تھی اور وکرم سنگھ کا وفادار ملازم چند سنگھ رات کے اندھیرے میں ہمل شاہ کے مندر پہنچا تھا۔ پھر جواب میں مائی بھان متی نے کہا تھا کہ آفریدی اس کا بیٹا ہے جو بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ آفریدی نے غور سے اس پار ساعورت کی طرف دیکھا جسے رانچو توں کی جابرانہ رسوں نے طوائف زادی بنادیا تھا اور وہ ستم رسیدہ خاتون دیوتاؤں کی فوج سے بیزار ہو کر بت خانہ چٹوڑ میں ایک خدا کی پرستش کرنے لگی تھی۔ آفریدی کے ذہن کی سطح پر یادوں کا عکس ابھرا اور پھر اس نے مائی کو پہچان لیا۔ بھان متی اس وقت علی عامر کے خواب میں آئی تھی جب وہ طلسم کدے میں ایک مفروز قیدی کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ مائی نے اسے نصیحت کی تھی کہ وہ نرملہ کا خیال رکھے۔ آج جب اسی نمکسار ماں کو اتنے قریب پایا تو آفریدی بے قرار ہو کر رونے لگا۔

”بیٹے! ابھی بہت طوفان آئیں گے، بڑے حشر اٹھیں گے اور تجھ پر زمین تنگ ہو جائے گی۔ تو غیروں کی کرم فرمائیاں دیکھ چکا کہ ابھی اپنوں کی مہربانیاں باقی ہیں۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب زندگی پر سے تیرا اعتبار اٹھ جائے گا اگر مایوسیوں کے ایسے جانگداز لمحے تجھے گھیر لیں اور نجات کی کوئی راہ باقی نہ رہے تو مجھ گناہ گار کی اذیتوں کو یاد کرنا۔ آفریدی! میں وہ ہوں جس نے اس ملامت کدے میں نوے سال گزارے ہیں۔ سیاسی آئندہ پال اور وکرم سنگھ کے سوانسوں کی اتنی بڑی بستی میں میری بے گناہی پر بھی گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بڑے بڑے دھرماتماؤں کو دیکھا ہے ان کی زبانیں بھی اقتدار کے آگے گنگ ہو گئی تھیں۔ میری بجھتی ہوئی آنکھوں کے سامنے بہت سے لرزہ خیز مناظر ابھر رہے ہیں۔ میں تجھے خون کے دریاؤں سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ اہل درو کا ہر زمانے میں کیسا انجام ہوتا ہے۔ تمہیں ایسا نہ ہو کہ ہوس کا ردینا کے باز میں تو اپنی متاع درد کو نیلام کر دے۔ خبردار! میرے بیٹے! ایسا ہرگز نہ کرنا کہ یہ بڑے گھائے کا سودا ہے۔ اگر تیرا جسم آرے سے بھی چیرا جائے تو رحم کی بجائے نہ مانگنا۔ سانسوں کا شمار پورا ہو کر رہے گا۔ وقت سے پہلے ان کے تسلسل کو کوئی ٹوڑ نہیں سکتا۔“ یہ کہہ کر مائی بھان متی نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور آفریدی ایک ایسی عورت کی آغوش محبت میں سما گیا جس سے اس کا ہلکا ہوا رکتی رشتہ نہیں تھا۔ ”آخری بار اپنی ماں کے سینے پر سر رکھ کر روئے کہ عقیقہ شب شام فراق طلوع ہونے والی ہے پھر اس کے بعد اندھیرا ہے، روح کو بکھلا دینے والا قاتل اندھیرا۔“

آفریدی کے تصور میں اپنی والدہ شائستہ بیگم کا چہرہ ابھر آیا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنکھوں کے آبشار جاری ہو گئے۔ ”تو بھی آ! میری بچی نرملہ! بھان متی نے لرزے ہوئے لمحے میں وکرم سنگھ کی بیٹی کو آواز دی۔ نرملہ جو پہلے ہی اپنے باپ کی موت کا ذکر سن کر اٹھلا تھی۔ مائی کی مادرانہ شفقت پر مزید بے اختیار ہو گئی اور بچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ ”بیٹی! زندگی سے بدگمان نہ ہونا، ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے خارزار میں آچل اٹھ بھی جاتا ہے اور تار تار مٹی ہو جاتا ہے، مگر روح کو زخمی نہ ہونے دیتا۔“

علاء الدین اور دوسرے درباری ایک عجیب سے عالم حیرت و سکوت میں یہ ناقابل فہم منظر دیکھ رہے تھے۔ اہلک بھان متی نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور بڑے کرناک لمحے میں پکارنے لگی۔ ”اے خدا! تیرے دلی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں۔“ پھر اس نے نرملہ اور آفریدی کے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ”میں چہرہ اور گناہ گار اس لائق تو نہیں کہ تجھ سے اپنی مزدوری مانگوں مگر کائنات کا ہر ذرہ میرے کانوں کا ہے کہ تو بے حساب دینے والا ہے۔ اپنی اسی بے مثال بخشش کے صلے میں میرے بچوں کی تکر۔“

یہ کہہ کر بھان متی مڑی اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے تخت کے قریب پہنچی۔ پھر حضرت امیر خسروؒ سے پ ہو کر بولی۔ ”اس شہنشاہ کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنا جس کے در کے بھکاری بھی شاہ کا درجہ نہیں۔“ بھان متی کا اشارہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف تھا۔

امیر خسروؒ نے علاء الدین کی خفگی کا احساس کئے بغیر کہا۔ ”محترم خاتون! میں پیرو مرشد کے حضور تمہارا عقیدت پیش کر دوں گا۔“

خسروؒ کا جواب سن کر علاء الدین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا مگر وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ ”اور شہنشاہ سے یہ بھی کہنا کہ داسی بہت تھک گئی ہے۔ اب وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ دعا کریں کہ کا انجام بخیر ہو۔“ یہ کہتے کہتے بھان متی آبدیدہ ہو گئی۔

”ہاں! میں شیخ کے حضور سب کچھ عرض کر دوں گا۔“ بھان متی کی کیفیت دیکھ کر امیر خسروؒ بھی ہاتھ ملے تھے۔

”خداوندوں جہان میں تمہارا بھلا کرے۔“ بھان متی تیزی سے پلٹی اور چند لمحوں کیلئے آفریدی کے گھر گئی۔ ”بیٹے! میں تیرا انتظار کروں گی۔ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک تو دوبارہ نہیں پہنچ جائے گا۔ میری آنکھیں تیرے راستے میں بھی رہیں گی۔ میں تجھے اسی ہمل شاہ کے مندر میں مائی جہاں ہر طرف بت ہی بت ہیں اور جہاں بیٹھ کر میں نے پون صدی تک پتھر کے خداؤں کا انکار کیا۔ اگر تیرے آتے آتے موت میرے بدن کو چھوئے تو مجھے آبو کے کسی تارک اور ویران گوشے میں کر دیتا۔“ یہ کہہ کر بھان متی نے اپنی زرد چادر کے پلو کو ایک جھٹکے کے ساتھ کاندھے پر ڈالا اور بیچ کے میں نعرہ زن ہوئی۔

”سدا رہے نام اللہ کا۔“

آواز کیا تھی، ایک زلزلہ سا تھا۔ جشن فتح میں شریک ہونے والے لرزہ کر رہ گئے۔ علاء الدین کو محسوس ہوا کہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ بھان متی کے جاتے ہی اس نے چوک کر امیر خسروؒ سے پوچھا۔

”یہ عورت کون تھی خسرو۔“ علاء الدین کے لمحے میں تھکن بھی تھی اور جھنجھلاہٹ بھی۔

اس سے پہلے کہ امیر خسروؒ سلطان کے سوال کا جواب دیتے، رام دیوبول اٹھا۔ ”یہ بھان متی ہے، رانچوت سردار کے گناہوں کا پھل۔ روپ متی کی ناجائز اولاد جسے حرمیوں نے پاگل بنادیا ہے۔ شاہ کے مندر کے ایک کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ کمزور عقیدے کے لوگ اسے ”جادوگرئی“ کے سے بھی پکارتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صدمات کی زیادتی نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ اس کی جتنی تانہ حرکتوں پر کوئی دھیان نہ دیں۔“

”اور یہ سیاسی آئندہ پال کون تھا؟“ علاء الدین نے تلخ لمحے میں پوچھا۔ بھان متی کے طرز عمل نے

سلطان کے حراج کو برہم کر دیا تھا۔

”وہ بھی بھان متی کی طرح ایک دیوانہ تھا۔ اپنی ریاضت کے نشے میں حکومت کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن قتل کر دیا گیا۔“ رام دیو نے اس خوفناک راز کو چھپانے کی کوشش کی جس کا آفریدی کی ذات سے بہت گہرا تعلق تھا..... اور اگر وہ راز افاش ہو جاتا تو شاہی سفیر کے خلاف بھجائی جانے والی سازشوں کی بساط بھی الٹ جاتی۔

ابھی علاء الدین رام دیو سے کچھ سوالات کرنا کہ یکایک خیمہ گاہ کے دروازے پر ہلچل سی ہوئی۔ سلطان نے چونک کر ادھر دیکھا۔ چند محافظ سپاہی تیزی سے فرماؤا کی طرف آرہے تھے۔ ان کے چروں پر نظر آنے والی گھبراہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ صورت حال جاننے کیلئے ملک نصرت خان نیچے اتر آیا۔ سپاہی امیر لشکر کو دیکھ کر ٹھہر گئے۔ پھر انہوں نے سرگوشیوں میں ملک نصرت خان سے کچھ کہا جسے سن کر علاء الدین کے جاننا سپہ سالار کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

”انہیں شاہی خیمے میں اس طرح پہنچاؤ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“ ملک نصرت خان نے سپاہیوں کو حکم دیا اور خود تیزی سے پلٹ کر سلطان کے قریب پہنچا۔ علاء الدین بڑی حیرت سے ان رازدارانہ سرگرمیوں کو دیکھ رہا تھا پھر جب ملک نصرت خان نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے ایک نیا واقعہ پیش آنے کی اطلاع دی تو چند لمحوں کیلئے سلطان کے چہرے پر بھی پریشانی کے سائے پھیل گئے مگر علاء الدین ایک انتہائی مضبوط قوت ارادی کا نشانہ تھا۔ اس نے اس فکر انگیز خبر کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور حاضرین کو محسوس تک نہ ہوسکا کہ دہلی کی طرف کیسا ہولناک طوفان بڑھ رہا ہے۔

جشن فتح کے شرکاء ملک نصرت خان اور محافظ سپاہیوں کے درمیان ہونے والی پراسرار گفتگو پر چونکہ ضرور تھے لیکن علاء الدین نے اپنی باتوں سے ان کے تمام شکوک و شبہات کو زائل کر دیا تھا۔ وہ اپنے وفاداروں کیلئے مراعات کا اعلان کرتا رہا اور نافرمانوں کو بدترین عذاب کی خبر دیتا رہا۔ علاء الدین نے بڑی ذہانت سے یہ نازک وقت گزارا۔ اس نے حسب معمول انتہائی صبر و سکون کے ساتھ جشن کی قربات جاری رکھیں اور علی الاعلان کہا۔

”جو خضر خان کا اطاعت گزار ہے، وہ میرا بھی فرمانبردار ہے۔ جس نے میرے نامزد کارندوں کے احکام پر عمل کیا گویا اس نے ”قصر ہزار ستون“ سے وفاداری کا ثبوت فراہم کیا..... اور ہم ایسے وفاداروں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کیلئے ہماری طرف سے بڑے انعام و اکرام کی خوشخبری ہے..... اور جس نے خضر خان کے کسی فرمان کو بھٹلایا، اس نے گویا ہمارے احکام کی نفی کر دی۔ اور ہم ایسے سرکشوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ہمارا یہ حراج بھی نہیں کہ ہم باغیوں کو خاموشی کے ساتھ اپنا حدود مملکت سے نکل جانے دیں۔ جس نے ایک بار عہد توڑا، وہ ہمیشہ کیلئے راندہ در گاہ ٹھہرا..... اور ہمارے قانون میں کسی راندہ در گاہ کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ اس سے اس کی سانسیں چھین لی جائیں۔ ہم نہیں جاننے کہ ایسے مجرموں کیلئے ہمارے قہری آخری شکل کیا ہوگی؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نافرمانوں کی لاشوں کو چورائے پر لٹا دیں..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے بے جان جیسوں کو جنگلوں میں پھینکوا دیں کہ انسانی گوشت سے مردہ خور پر بندے بہت لذت حاصل کرتے ہیں..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ ان کی لسلوں کا بھی نام و نشان مٹاوا لیں۔ سخت تنبیہ ہے ان لوگوں کیلئے جن کے دلوں میں ہماری طرف سے کھوٹ ہے۔ وہ اپنے دامغانوں کی میٹھ کو کسی تاخیر کے بغیر درست کر لیں اور اپنے تناصر جندوں کے ساتھ صرف ہمارے ہو کر رہ جائیں کہ ہم بساط سیاست پر اپنے حریف کو برداشت نہیں

کرتے۔“

راجپوت سرداروں اور چوتھ کی عام رعایا کو اپنے حکام شانے کے بعد علاء الدین نے جشن فتح کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر علی عامر آفریدی اور نرملہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ان دونوں کے ساتھ اس وقت تک قیدی کی طرح سلوک کر دو جب تک ہمارا دل صاف نہیں ہو جاتا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ان کے دلائل سنیں گے اور پھر یہ جس چیز کے مستحق ہوں گے وہ انہیں سزا و جزا کے طور پر بخش دی جائے گی۔“ یہ کہہ کر علاء الدین اپنے سپہ سالاروں کے درمیان چلتا ہوا شاہی خیمے میں داخل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

خیمے میں سلطنت دہلی کے دو جاسوس سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ ان کے چروں پر وحشت برس رہی تھی اور پورا خیمہ گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ علاء الدین کے دریافت کرنے پر جاسوسوں نے بتایا کہ وہ دن رات سفر کی تختیاں برداشت کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

علاء الدین نے اپنے خدمت گاروں کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ وہ اپنی بے وقت آمد کا سبب بیان کریں۔

جاسوس سپاہیوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ خبر اور اہم تر تک پہنچ گئی ہے کہ سلطان معظم حاضرہ چوتھ میں مصروف ہیں۔ وہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ اب جنگی مہم کی تکمیل میں شاہ والا کو ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ وحشی مغل اپنے سردار طرغی کے جھنڈے کے پیچھے جمع ہو رہے ہیں۔ اس بار ان کے ارادے بہت خوفناک ہیں۔ وہ حضور کی غیر حاضری کے سبب دہلی کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔“

”والہذا یہ کیسے ممکن ہے؟“ علاء الدین اپنے جاسوسوں کی روداد سنتے ہی غصے سے بھڑک اٹھا۔ ”ان دشمنوں کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ہم کہیں بھی رہیں مگر ہمارا اقبال ہر گوشہ ملک پر حکمرانی کرتا ہے۔ کیا مغلوں کی شامت آئی ہے جو وہ دہلی کی طرف نظر بد سے دیکھ رہے ہیں۔ بخدا! ہم انہیں اس شورش کی بدترین سزا دیں گے۔“

اس کے بعد سلطان رات گئے تک اپنے سپہ سالاروں سے مشورے کرتا رہا۔ اس وقت علاء الدین کی فوج کا ایک برا حصہ دکن میں درنگل کے محاذ پر الجھا ہوا تھا۔ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد گجرات میں سلطانی قدار کو مستحکم کرنے کیلئے موجود تھی۔ اس صورت میں حملہ آور مغلوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر علی علاء الدین ایک نئے حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فوری طور پر درنگل اور گجرات کی طرف اپنے قاصد بھیجے کہ جس قدر بھی افزادی قوت ممکن ہو اسے دہلی کی جانب روانہ کر دیا جائے۔

پھر خضر خان کو مختلف نصیحتیں کرنے کے بعد سلطان نے علی الصبح چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ راجہ رتن سنگھ، علی عامر آفریدی اور نرملہ کماری بھی ایک قیدی کی حیثیت سے اس کے ماتھے ساتھ تھے۔ رخصت ہوتے وقت رام دیو نے سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”میں فاتح عالم کے بغیر چوتھ میں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔“ یہ کہتے کہتے عیار مار دیو رونے لگا تھا۔ بہت پرستوں کی یہ سرزمین شہنشاہ کے اس غلام کو ضمیر فروش اور غدار کہہ کر پکارتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں یہ پتھر کے پجاری مجھ سے شدید انتقام لیں۔“ رام دیو بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”شاہ کی وفاداریوں کا بھی دم بھرتا ہے اور ان پتھروں سے بھی ڈرتا ہے جو شاہ کے قدموں میں باجس و حرکت پڑے ہیں۔“ علاء الدین رام دیو کی وحشت دیکھ کر مسکرایا۔ ”اگر اہل وفا ہیں تو

پھر شاہ کے نام پر قریان ہو جا۔“
 ”فاتح عالم پر ایسی ہزار جایش صدقے۔“ یکایک رام دیو کا لہجہ پر جوش ہو گیا تھا مگر اس کے چہرے پر اب بھی بدحواسیاں لرز رہی تھیں۔ سلطان نے اپنے پاؤں کھینچ لئے اور رام دیو کا سر زمین سے ٹکرا گیا۔ ”اٹھ کہ ہم تجھے بھی اس سفر میں اپنی ہم راہی کا شرف بخشے ہیں۔“
 رام دیو خوشی سے ہاتھ پر ہر کر فکس کرنے لگا۔ قسمت قدم قدم پر اس شعبہ باز کا ساتھ دے رہی تھی۔ پھر جب سلطان کا مختصر سا لشکر چوڑی حدود سے نکلا تو زمام کاری بے قرار ہو کر روئے لگی۔ وہ اور آفریدی گھوڑوں پر سوار تھے مگر اس طرح کہ ان کے چاروں طرف مسلح شمشیرداروں کا پہرہ تھا۔ زمام کاری بار بار چوڑے کے چلے ہوئے قلعے، آہو اور ارادلی کی سر بلند چوٹیوں اور گنہری اور بڑیچ کے خفاف پانی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر زمام کے ہونٹوں سے ایک آہ سرد نکلی اور اس نے بڑے جاگنداز لہجے میں کہا۔
 ”الوداع! میرے عظیم باپ! آپ مجھ سے اس طرح رخصت ہو گئے کہ میں نہ تیار داری کا حق ادا کر سکی اور نہ آپ کی آخری رسموں میں شریک ہو سکی۔“
 ”الفرق! میرے وطن چوڑے میں نے تجھے جلتے ہوئے دیکھا مگر اپنے انھوں سے تیرے سینے کی آگ نہ بجھاسکی۔“

اور آفریدی ایک مجستے کی مانند گھوڑے کی پشت پر سوار تھا۔ وہ اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں تھی۔ ایک جانب از سپہ سالار اپنے فاتح لشکر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر اس طرح کہ جیت کر بھی اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

علاء الدین بہت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ عام سپاہی سمجھ رہے تھے کہ سلطان اپنی عظیم الشان فوج کے نشے سے سرشار ہے، اس لئے جلد از جلد دہلی کی حدود میں داخل ہونا چاہتا ہے مگر یہ راز چاروں امیران لشکر اور حضرت امیر خسروؒ کے علاوہ کسی دوسرے مصاحب کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سلطان دارالحکومت پہنچنے کیلئے اس قدر بے قرار کیوں ہے؟ وہ مسلسل سفر کر رہا تھا یہاں تک کہ آدمی آدمی رات تک ویران فضاؤں میں گھوڑوں کے سموں کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ سپاہی اس مشقت سے نڈھال ہوتے جا رہے تھے مگر ان کا سلطان پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ پھر جب گھوڑے ہی گردنیں ڈال دیتے تو علاء الدین اپنے لشکر کو ٹھہر جانے کا حکم دیدیتا۔ اس طرح سلطان نے چوڑے دہلی تک کا فاصلہ نصف مدت میں طے کیا۔

دار السلطنت پہنچنے سے پہلے چند برق رفتار سپاہی قصر ہزار ستون میں داخل ہو چکے تھے اور تمام اہالیان شہر کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ سلطان معظم ایک یادگار فتح حاصل کرنے کے بعد دہلی لوٹ رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر محلات شاہی میں جشن نشاط کا سماں پیدا ہو گیا۔ حکومت کے تمام وزراء، سردار، خدمت گار اور سپاہی قطار در قطار اس سمت میں روانہ ہو گئے جدھر سے علاء الدین کا سرخرو لشکر آنے والا تھا۔ تقریباً دہلی سے چند میل دور وفاداران سلطنت نے سلطان کا استقبال کیا۔ منزل قریب آنے سے پہلے علاء الدین نے ملک نصرت خان کو حکم دیا تھا کہ وہ راجہ رتن سنگھ کے گلے میں لوہے کا کڑا ڈال دے اور اسے ہلکی زنجیریں بٹا دے۔ حکم شاہی سن کر رتن سنگھ نے گدا گراں لہجے میں سلطان سے درخواست کی تھی۔

”شاہو! ساری دنیا جانتی ہے کہ رتن سنگھ شکست کھا گیا ہے اور اس کے تخت پر سلطان علاء الدین

نے قبضہ کر لیا پھر میرے ساتھ یہ غلامانہ سلوک کیوں؟ دیکھنے والی آنکھیں خود ہی اندازہ کر لیں گی مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے لایا جا رہا ہے۔ پھر میرے لئے نیا سامان رسوائی کیوں؟“
 علاء الدین، رتن سنگھ کی التجاس کر مسکرایا۔ ”زندگی کی جنگ میں ہار جانے والے لوگ اس کے مطالبات نہیں کرتے تیرا جرم تو بہت سنگین تھا مگر یہ ہمارا مزاج کرم ہے کہ ہم نے سخت مجاہدہ نہیں کیا، اگر ہم اپنے فطری جلال و قہر کی طرف لوٹ آتے تو ساری دنیا دیکھ رہی ہوتی کہ تجھے ہمارے بڑے باندھ دیا جاتا زنجیر ہمارے ہاتھوں میں ہوتی اور تیرا جسم پتھریلی شاہراہوں پر گھسٹ رہا ہوتا۔ یہ تو نالغائی کی کم سے کم سزا ہے جو ہم نے تجویز کی ہے۔“

رتن سنگھ مسلسل گڑگڑاتا رہا مگر علاء الدین نے اس کی ایک نہیں سنی۔ راجپوت سمرات کی گردن اپنی طرف ڈال دیا گیا اور اسے اتنی ہلکی زنجیریں پسندائی گئیں جن کا بوجھ آسانی سے اٹھایا جاسکتا تھا۔ ”رتن سنگھ! شاہی رعب و جلال برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ آقا اور غلام کے درمیان ایک نمایاں تمیز بنی جائے، ہماری رعایا سوال کر سکتی ہے کہ ہم ان کیلئے چوڑے کیا سوغات لے کر آئے؟ ہم ہاتھ پاتے کہ انہیں زبانی جواب دیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے تجھے پایہ زنجیر میں۔“

ازیتو کرب کے احساس سے رتن سنگھ کا چہرہ مسخ ہو گیا اور پھر وہ دہلی کی حدود میں اس طرح داخل ہوا کہ زنجیر ملک نصرت خان کے ہاتھ میں تھی اور ملک نصرت خان علاء الدین کے بائیں ہاتھ پر چند قدم کے لمبے چل رہا تھا۔

بڑا منزل بھی آگئی جب علاء الدین نے اس انسانی جہوم کی طرف دیکھا جو اپنے شاہ کا استقبال کرنے گھروں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اہل شہر بہت زیادہ پر جوش تھے اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ سلطان انہی غمراور بلند آوازیں کیلئے انتہائی جذباتی کلمات استعمال کر رہے تھے۔ عام رعایا کو ایک مخصوص دائرے کے نیچے بہت سخت اقدامات کئے گئے تھے اور نہ چوڑی فوج کی خبر سن کر عوام اس قدر وارفتہ ہو گئے تھے کہ اسے بہت دور جا کر اپنے حکمران کا استقبال کرنا چاہتے تھے۔ امرائے سلطنت رعایا کی اس دلی کیفیت انہیں مگر انہوں نے نظم و ضبط برقرار رکھنے کیلئے حد بندی کر دی تھی اور انہیوں کے ذریعے اعلان کیا تھا کہ تمام لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ سلطان کا دیدار کریں اور خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ۔ اسی احتیاط کے پیش نظر فوج کے سپاہی اگلی صفوں میں نمایاں تھے اور بار بار عوام کو مڑ سکون رہنے کی کہہ رہے تھے۔

سب سلطان کا گھوڑا جہوم کے قریب آکر رکا تو نعروں کا ایسا شور بلند ہوا کہ قرب و جوار کی فضاں تک گونجن لگیں۔ علاء الدین نے اپنی شمشیر بے نیام کی اور تیز آواز میں بولا۔
 ”سلطنت خلجی کے وفادارو! غور سے دیکھو کہ تمہارے شاہ کی تلوار سے سرکش راجپوتوں کا خون بہا ہے۔“

نئی قسب انسانی جہوم میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی سلطان کی زبان سے کوئی جملہ ادا ہوتا، وہ عوام تک منتقل کرنے کیلئے بلند آواز میں دہرا دیتے۔

بہاء الدین نے اپنی شمشیر بے نیام کر کے فضا میں لہرائی اور نافرمان راجپوتوں کی عبرت تک شکست کا لکھا، ”عوام بے اختیار ہو کر چیخ اٹھے۔“ ”صاحب جاہ و جلال کی شمشیر اختیار کبھی کسی مجرم کو

معاف نہیں کرتی۔“

”تمہاری سماعتوں نے ابھی تک اتنی بڑی خبر نہیں سنی ہوگی کہ چٹوڑ کا ناقابل تسخیر قلعہ اپنی پوری عاجزی کے ساتھ تمہارے شاہ کے قدموں پر جھک گیا۔“ آج کے دن علاء الدین کے جلال کا انداز بہت مختلف تھا۔

”بے شک! آپ سے پہلے ہمیں ایسی خبر سنانے والا کوئی نہیں تھا۔“ عوام نے اپنے شاہ کے دعوے کی پر زور تائید کی۔

”اور ہم نے چٹوڑ سے اس کا نام تک چھین لیا۔“ جوش جذبات سے سلطان کا چہرہ تپنے لگا تھا۔ ”اب وہ خضر آباد ہے، تمہارے محبوب شہزادے کے دقار کی زندہ علامت۔“

عوام نے شہزادہ خضر خان کی صحت و زندگی اور فتح و نصرت کیلئے دعائیں مانگیں۔

”اور یہ ہے وہ روسیہ بجرم جس نے تمہارے سلطان کا حکم نامہ چاک کر دیا تھا۔“ علاء الدین نے اپنی شمشیر کا زاویہ بدل کر راجہ رتن سنگھ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم نے اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا اور اس کے اقتدار کی دھجیاں اڑا دیں۔“ علاء الدین اپنی رعایا کے دلوں پر بہت قائم کرنے کیلئے غرور و تکبر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”سلطان معظم کا حساب بت سخت ہے۔“ عوام کی پر شور آوازیں گونجنے لگیں۔

”ہمارے قہر کی یہ آگ صرف دشمنوں کیلئے ہے جو بھڑکتی ہے تو اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک نافرمانوں کا پورا وجود خاکستر نہ ہو جائے۔“ علاء الدین کا لہجہ کچھ اور بھی تند تیز ہو گیا تھا۔ ”مگر جانے والے جانتے ہیں کہ جب ہم حلقہ پاراں سے گزرتے ہیں تو باد صبا سے زیادہ نرم اور ساووں کی گھٹاؤں سے زیادہ کیف آئے ہو جاتے ہیں۔“

تمام لوگ تعظیم النصف تک تکیہ خم ہو گئے۔

”ہم نے تمہاری وفاداریوں کو شرف قبولیت بخشا۔“ یہ کہتے ہوئے علاء الدین نے اپنی تلوار کو اس طرح سیدھا کر دیا جیسے وہ عوام کے سروں پر سایہ فگن ہو۔ ”جاؤ کہ ہم تمہیں مزید سلامتی اور خوشحالی کی نوید سناتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی سلطان نے حکومت کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے، غریب لوگوں میں کپڑے اور اناج کی تقسیم اور معمولی نوعیت کے مجرموں کی رہائی کا اعلان کیا۔ ترے ہوئے لوگوں کیلئے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت بڑی نعمت تھیں۔ وہ سلطان کیلئے نئی فتوحات کی دعائیں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

☆.....☆.....☆

امراء سلطنت اگلی قطار میں دست بستہ کھڑے تھے۔ ملک کا فور بھی ان کے درمیان موجود تھا اور بہت زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا پھر جیسے ہی فرمانوائے ہند کی مختصر تقریر ختم ہوئی، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اس نے بار بار علاء الدین کے جوتوں کو بوسہ دیا۔ تمام وزراء، اور عہدیدار ملک کا فور کی ان خوشامداندہ حرکتوں کو انتہائی سکوت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے بے جان مجسموں میں تبدیل ہو گئے تھے اور سانسیں رک رک کر محسوس ہوتی تھیں۔ کوئی امیر یا وزیر ملک کا فور سے خوش نہیں تھا۔ اس وقت بھی ان کے سینوں میں نفرتوں کے طوفان اٹھ رہے تھے مگر علاء الدین کے خوف سے ہر شخص نے مصلحت کی قبائلی پل کی تھی۔ سب کے سب گردنیں جھکائے کھڑے تھے کہ کہیں ان کے چرواہے

پہنچدگی کا کوئی عکس نہ ابھر آئے اور پھر وہ بارگاہ شہانی میں معتب قرار دیدئے جائیں۔

ایک ملک کا فور جھکا اور اس نے علاء الدین کے گھوڑے کے سوں کے نیچے کی خاک اٹھائی اور اپنے چہرے پر ملنے لگا۔ علاء الدین بھی اپنے دوسرے خدمت گاروں کی موجودگی سے بے نیاز صرف ملک کا فور کو بچے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”آقا! آپ کے جسم پر کوئی خراش تو نہیں آئی؟“ ملک کا فور نے بڑے والمانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ”فانح عالم! آٹھ ماہ تک دعائیں مانگتے مانگتے یہ ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔“

”تیری دعائیں قبول ہوئیں ملک! مگر تو بھی تو ٹھیک ہے نا؟“ علاء الدین نے ایک عجیب سی دل بستگی کے انداز میں اپنے محبوب غلام سے پوچھا۔

”شاہ والا کہ بغیر غلام کے تمام دن کرب و اضطراب کا شکار تھے اور ساری راتیں بے خواب.....

زندگی ایک عذاب کے سوا کچھ نہیں تھی۔“ ملک کا فور خوشامد کی آخری سطح پر گر کر کھلا ہوا جھوٹ بول رہا تھا۔

”تو جانتا ہے ملک! تیرے سوا ہمارے لئے بے چین رہنے والا کون ہے؟“ یہ کہہ کر علاء الدین نے اپنی تلوار ملک کا فور کو دیدی اور خود گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

”ملک کا فور نے شمشیر سلطانی کو بوسہ دیا اور دوبارہ شاہ کے قدموں پر جھک گیا۔

”بس ملک!“ علاء الدین نے اپنے محبوب غلام کو ٹوکتے ہوئے کہا..... ”یہ دوسرے اراکین سلطنت بھی ہماری چشم کرم کے منتظر ہیں۔“

ملک کا فور سیدھا ہوا تو دیگر وزراء اور خدمت گار زمین بوس ہو گئے۔ ساحل جمنائی ریت ان کے ٹاموں، چروں اور واڑھیوں کو چھو رہی تھی مگر وہ سب کے سب اپنی اس حالت سے بے نیاز علاء الدین کے سامنے جھکے ہوئے تھے اور ہر شخص کی ایک ہی تمنہ تھی کہ اس کا سجدہ رائیگاں نہ جائے۔

سلطان نے شرفائے دہلی کی تعظیمانہ رسوں کو پسندیدگی اور قبولیت کی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے محل ”قصر ہزار ستون“ روانہ ہو گیا۔

علاء الدین کی آمد کی خبر سنتے ہی اس کی تمام بیگمات قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئی تھیں۔ شہابی حرم کی عزت و توقیر کیلئے دور تک رہنشی قاتیں اور پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔ مسلسل جنگی کامیابیوں کے سبب بہت سی عورتیں اس کے حرم میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے علاء الدین کی اولاد میں بھی بکثرت اضافہ ہوا۔ آج تک کوئی مورخ بھی سلطان کی اولاد کے سلسلے میں صحیح اعداد و شمار پیش نہیں کیا۔ بعض تحقیق کرنے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ خود علاء الدین کو بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں تھا۔ آج جب سلطان اپنی زندگی کے سب سے سخت معرکے میں فتح حاصل کرنے کے بعد قصر ہزار ستون واپس لوٹا تھا تو اس کی تمام بیگمات اپنے شوہر کے استقبال کیلئے ایک مقام پر جمع ہوئی تھیں۔ وہ بہترین قابوؤں میں ملبوس تھیں، غارے کی چمک سے چہرے تابناک تھے اور مختلف خوشبوؤں کے اثرات سے جسم مہک رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں طلائی خوان تھے جو تحائف سے لبریز تھے۔ علاء الدین کی ہریزوی چاہتی تھی کہ سلطان اس کی پیش کردہ نذر کو سب سے زیادہ اہمیت دیں مگر فرمانوائے ہند کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنی ایک ایک شکر حیات کو جذباتی طور پر منظرین کر سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک لمحے کیلئے ایک بیوی کے پاس نہر تار و خان پر ہاتھ رکھ کر سر کی جنبش سے اس بات کا اظہار کر دیتا کہ نذر قبول کی گئی۔ ایک ایک بیگمات کے دیکتے ہوئے چہرے بچھ گئے۔ ایک طویل انتظار کے بعد ان کی زندگی کا ساتھی آیا بھی تو کس حال میں کہ اس

انعام ہائے اور بیگمات شاہی کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ملک کافور کی خبریں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ درم شاہی تک پہنچائیں۔ بیگمات کے دل تو پہلے ہی سلگ رہے تھے، جب اس نے بیگانہ نام کے بارے میں غبی اطلاعات ملیں تو قصر ہرارستون کا زنانہ ایک ماتم کدے میں تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ محل کا ایک ایک گوشہ فزوں اور قندیلوں سے روشن تھا لیکن علاء الدین کی تمام بیویوں کے آراستہ کمرے زندہ مقبروں میں ڈھل گئے تھے۔ جہاں مایوسیوں کے اندھیرے رقص کر رہے تھے اور ناکام حسرتیں اپنی موت پر خود مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔

اسی رات جب بڑے بڑے امراء علاء الدین کو نذر پیش کر رہے تھے اور ہنگامہ نشاط جاری تھا، سلطان کی ایک بیوی ارجمندناہید اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس عورت کا پیدائشی نام سرلا دیوی تھا جو رنقہ منیور کے ایک راجپوت سردار کی لڑکی تھی۔ شکست کے بعد سرلا دیوی مسلمان ہو کر علاء الدین کے حرم میں داخل ہو گئی تھی۔ سلطان نے ارجمندناہید سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیوی کی حیثیت سے اسے خصوصی درجہ دے گا مگر سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور غبی نئی دیکھپیوں میں گم ہوجانے کے سبب علاء الدین اپنا وعدہ وفانہ کر سکا۔ خوبصورت راجپوت زادی آتش انتظار میں جلتی رہی کئی سال کے دوران اسے ایک یاد بار شوہر سے گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو سکی۔ ارجمندناہید کی دنیا ویران ہو چکی تھی جس کی خاطر مذہب چھوڑا، گھر کو آگ لگائی، وہ قریب رہ کر بھی ہزاروں میل دور تھا، آشنا ہو کر بھی اجنبی تھا۔ ارجمند کچھ دن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ شاید سلطان کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو جائے اور پھر یہ انداز تعارف رسم التفات میں بدل جائے مگر ملک کافور کے بڑھتے ہوئے عروج نے ارجمند کو ذوال پستیوں میں دھکیل دیا تھا۔ راجپوت زادی نے ایک طویل عرصے تک یہ زہریلے فقہ فقہو کر کے پتا تھا لیکن آج جب خواجہ سراؤں نے ملک کافور کی پزیرائی کا حال بیان کیا تو ارجمند کے دل دو ماخ جل اٹھے پھر آدھی رات کے قریب وہ ایک خوفناک فیصلہ کرنے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر راداری میں کھڑی ہو گئی۔ ارجمند کو ملک کافور کا انتظار تھا کہ وہ کب سلطان کے عشرت کدے میں داخل ہوتا ہے؟

شب کے پچھلے پھر محفل کیف و نشاط سرور ہوئی اور امراء ایک ایک کر کے چلے گئے تو گجرات کا ہندو زادہ بارگاہ شاہی کی طرف بڑھا۔ ارجمندناہید ایک ستون کی اوٹ سے باہر نکلی اور اس نے ملک کافور پر خنجر کا بھرپور وار کیا مگر موت ابھی اس بے ضمیر غلام سے بہت دور تھی۔ ایک تو عورت کی جسمانی کمزوری اور دوسرے گھبراہٹ کا غلبہ ان دونوں چیزوں نے مل کر ارجمندناہید کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔ ملک کافور کے دائیں شانے پر ہلکا سا زخم آیا اس نے نپٹ کر ارجمند کی کلائی پکڑ لی اور زور زور سے چیخنے لگا۔ عشرت کدے کے محافظ سپاہی دوڑتے ہوئے ملک کافور کے قریب پہنچے۔ پر شور آوازیں سن کر سلطان بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔ علاء الدین کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام تھی اور چہرہ غصے کی آگ سے دھک رہا تھا۔

”کیا تم بے نصیبیوں کو نہیں معلوم کہ شاہ کے آرام میں خلل ڈالنے کا کیا انجام ہوتا ہے؟“ محل کی راداری میں علاء الدین کی مہمیت آواز اس طرح گونجی کہ دوسری بیگمات بھی اپنی اپنی خواب گاہوں سے باہر نکل آئیں۔ اس تصور سے کسی کو نیند نہیں آئی تھی کہ ان کا شوہر آٹھ ماہ بعد چوڑے واپس لوٹا تھا اور ابھی تک کسی بیگم کو شرف باریابی نہیں بخشا گیا تھا۔ اس کے برعکس درباری رقا صائیں شاہ کا دل بہلا رہی تھیں اور شاہ کو احساس تک نہیں تھا کہ اس کے انتظار میں وہ عورتیں زندگی کے دوزخ میں جل رہی تھیں جن کے بے شمار حقوق تھے اور وہ حقوق مسلسل غصب کئے جا رہے تھے۔

کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تک نہ تھی۔ علاء الدین کی ازدواجی زندگی بہت تلخ تھی۔ وہ اکثر اپنی بیویوں کے سلوک سے شکایت کرتا تھا کسی بیگم کو بھی اس کی دل بستگی کا خیال نہیں تھا۔ سب کی سب اپنی ذاتی آرائش اور اقرباء نوازی میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں صرف زرد جوہر کی بھوک تھی اور سلطان کی پسند و ناپسند کا خیال تک نہ تھا۔ اس کے برعکس شاہی بیگمات کو علاء الدین سے یہ گلہ تھا کہ وہ بیویوں کی شرف باریابی نہیں بخشتا تھا۔ اس عالم میں تنہا پھولوں کی بیج پر جلنا ایک عورت کیلئے قیامت سے کم نہ تھا۔ علاء الدین کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سیاسی منصوبہ بندیوں میں الجھا رہتا تھا۔ کبھی کسی بغاوت کو کچلنے کی تدبیریں کر رہا ہے اور کبھی کسی نئے علاقے کو تسخیر کرنے کیلئے فوجیں بھیج رہا ہے۔ غرض وقت کا بیشتر حصہ روز و شب کے ان ہی بیگانوں میں گزر جاتا تھا۔ جب اسے چین کی کچھ سانسیں میسر آتیں تو وہ کسی جاں نثار شریک حیات کا قرب ڈھونڈتا اور اس کی خواہش ہوتی کہ ریشمی آنچل کا سیاہ جنگ جھل اور سیاست کی جلتی ہوئی دھوپ کے اثرات کو زائل کر دے۔ مگر کوئی بھی بیوی سلطان کی مزاج آشنا نہیں تھی۔ جس کے نتیجے میں علاء الدین اپنی بیگمات سے دور ہوتا چلا گیا۔ سلطان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے حقیقی چچا اور خسر جلال الدین خلجی کو قتل کر کے مسند اقتدار تک پہنچا تھا اکثر اس کے کانوں میں مقتول حکمران کے یہ الفاظ گونجتے رہتے تھے۔

”بے وفائی ہے! وہ وقت یاد کر جب میں تجھے اپنے سینے پر سلاتا تھا۔“

اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ علاء الدین کی بدترین بے وفائی اور شرمناک بد عمدی تھی۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ علاء الدین نے اپنے محسن کے اعتبار کا خون کر کے تاج و تخت حاصل کئے تھے۔ وہ انسانیت کی نظروں میں وفا کا قاتل اور عمد شکنی کا سنگین مجرم تھا۔ اسی احساس گناہ کے سبب علاء الدین کے ذہن میں یہ خیال پوری طرح بڑھ چکا تھا کہ دنیا کا ہر شخص خود غرض اور بے وفا ہے۔ سلطان کے نزدیک وہی شخص لائق اعتبار ہو تا جو مسلسل اس کے قدموں پر چھک کر رحم و کرم کی ہیک لگتا رہتا۔ ملک کافور چونکہ بچپن ہی سے بے غمیری کی آخری منزل کو چھو چکا تھا اس لئے وہ سلطان کے معیار پر پورا اترتا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ علاء الدین کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ بیگمات شاہی اس غرور میں مبتلا تھیں کہ وہ فرمانروائے ہند کی بیویاں ہیں اور معاشرتی طور پر بلند ترین درجہ رکھتی ہیں۔ اسی ناز بے جانے انہیں اپنے شوہر کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ یہاں تک کہ علاء الدین اور اس کی حرم سرا کے درمیان بڑے فاصلے حاصل ہو گئے۔ تنہائیوں کی ایک خلیج تھی جو بدھتی چلی گئی۔ سلطنت خلجی کے دشمنوں نے علاء الدین کی اس فطری کمزوری کا فائدہ مشاہدہ کیا اور سیاست کے پردے میں ایک ہندو زادے کو آزمانے کی کوشش کی۔ اسلامی حکومت کے بدخواہوں کا منصوبہ کامیاب رہا اور ملک کافور، سلطان کے ہوش و حواس پر چھاتا چلا گیا۔

کننے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر سلطان اپنی خدائی کا اعلان کرتا تو ملک کافور پہلا شخص ہوتا جو سجدے میں گر کر اقرار کرتا کہ میں علاء الدین کا بندہ ہوں۔ جب خوشامد کا یہ انداز ہو تو ایک دنیا پرست حکمران کے ہب جانے کو حیرت انگیز عمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ طویل جدائی کے بعد بھی دہلی لوٹنے پر سلطان نے کسی کی مزاج پر سی نہیں کی، کسی بیگم کو منہ لگایا اور نہ کسی بچے کو قریب بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اگر علاء الدین کو کوئی یاد آیا تو بس ملک کافور جو بڑے بڑے مردانہ شجاع کی گڑیاں اچھالنے کیلئے بے قرار رہتا تھا۔

اس موقع پر خواجہ سراؤں نے بھی اپنا لگائی بھائی کا ہنر خوب دکھایا۔ ناکارہ انسانوں کی اس جماعت نے

ہیات لرزے قدموں کے ساتھ سلطان کے عشرت کدے میں داخل ہوئیں۔ سمجرات کی رانی نے جہاں کنولادپوی سب سے آگے تھی۔

”ہمارے آنے کا سبب؟“ علاء الدین کی آواز میں نرمی کا شائبہ تک نہ تھا۔

”ہم شاہ والا سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ سرلادپوی بے قصور ہے۔“

علاء الدین نے قہر آلود نظروں سے اپنی بیویوں کی طرف دیکھا اور پھر ارجمندناہید سے مخاطب ہوا۔

”ہم نے تو تمہارے جاری کردہ حکم کا مذاق کیوں اڑایا؟“

”میں شاہ کے حکم کے خلاف سرکشی کا تصور بھی گناہ سمجھتی ہوں۔“ ارجمندناہید بادقار لہجے میں بول رہی تھی۔

”کیا سلطنت خلیجی میں بسنے والوں کے کانوں تک ہمارا یہ حکم نہیں پہنچا کہ جسے ہم محترم قرار دیدیں

بڑھ خیر نہیں ہو سکتا۔“ غصے کی شدت سے علاء الدین کے الفاظ بھی جلنے لگے تھے۔

”سلطان معظم کارشاد بجا ہے۔“ ارجمند نے روایتی ادب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”پھر تو نے اس شخص پر خنجر آزمائی کیوں کی جس کے خون کو ہم نے حرام قرار دیدیا ہے۔“ علاء الدین

نملک کافور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے مذہب میں اس کا خون اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ ایک درندے یا موذی جانور کا۔“ یکایک

ارجمند جہانپن ہو گئی تھی۔ ”شاہ والا! میں نے کسی انسان پر خنجر نہیں اٹھایا، میرا ہدف ایک زہریلا کیرا تھا جو

اپنے حرم سرکونہ جانے کب سے ڈس رہا ہے۔“ یہ کہتے کہتے ارجمند کی آنکھیں پھینکے لگی تھیں۔

علاء الدین سناٹے میں آگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت کا لہجہ اس قدر جارحانہ بھی ہو سکتا

ہے۔ ”یہ تو کہہ رہی ہے ارجمند! جسے ہم نے رتہ پر عظیم بخشا اور جس پر ہم نے اپنی بے مثال عنایت کی بارش

کردی؟“

”فاتح عالم! اس سے بڑی عنایت کیا ہوگی کہ آپ کے بیوی بچے ایک محبت بھری نظر اور ایک دلنواز

مکراہت کیلئے مینوں سے ترس رہے ہیں اور یہ بے شرم خواجہ سرا اس طرح شاہ کے قدموں سے لپٹا ہوا ہے

کہ جیسے اس کے سوا کسی دوسرے رشتے کا وجود ہی نہیں ہے۔ عدل و مساوات کا دعویٰ کرنے والے عظیم

نہاڑا! ایک بار تو مڑ کر دیکھا ہوتا کہ جن قدموں کی دھکم سے ”آبو“ اور ”اراولی“ کی چٹنائیں دہل رہی

تھیں، ان ہی قدموں کے نیچے دب کر بند گان خدا کے کتنے حقوق ریہہ ریہہ ہو گئے ہیں۔ ایک فتنے کو پرورش

کر کے اس کا خون حرام قرار دیدیا مگر اس کا احساس تک نہیں کہ آپ کی بے اعتنائی رُوز و شب کتنے خون

گرا رہی ہے۔ وہ خون جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔“

”شاید تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں ارجمند!“ علاء الدین شعلے کی طرف بڑک اٹھا۔

”ہاں! میں ایسی زندگی سے انکار کرتی ہوں۔“ ارجمند ہر شے سے بے نیاز ہو کر بول رہی تھی۔

”آپ سے بہتر تو کہہ دو اگر آپ ہیں جو دن بھر بھیک مانگتے ہیں اور شام کو بیوی بچوں کے سامنے اپنی جھولی کھول

اسیتے ہیں۔“

علاء الدین کیلئے اس سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ آندھی کے کسی تیز جھونکے کی طرح برہم

ہو گیا۔ ”کیا اس طرح تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی؟“

”آج نہیں تو کل سہی..... مجھے جب بھی موقع ملے گا میں اس بد نہاد کو قتل کر دوں گی۔“ یہ کہہ

”کون ہے ادب ہمارے سرہانے کھڑے ہو کر چیخا تھا؟“ علاء الدین نے اپنے محافظ سپاہیوں سے انتہائی قہرناک لہجے میں پوچھا..... چونکہ ملک کافور کی چھپیں عشرت کدے کے قریب گونجی تھیں اس لئے علاء الدین نے جرم کی شدت ثابت کرنے کیلئے اپنی خواب گاہ اور سرہانے کی تشبیہ استعمال کی تھی۔

”سرمدار ملک کافور زخمی ہو گئے۔“ ایک محافظ سپاہی نے ڈرتے ڈرتے کہا اسے خود اپنی زندگی بھی خطرے

میں نظر آنے لگی تھی۔ ملک کافور کے متعلق یہ حکم شاہی بہت پہلے نافذ کر دیا گیا تھا کہ اگر ملک کو جسمانی طور پر

کوئی تکلیف پہنچی تو یہ وحشیانہ عمل خود سلطان پر حملے کے مترادف ہو گا۔ علاء الدین نے یہ احتیاطی تدبیر اس

لئے اختیار کی تھی کہ محلات شاہی میں ملک کافور کے بے شمار دشمن موجود تھے اور کئی بار اس کی جان لینے کے

منصوبے بنائے گئے تھے پھر جب ہر طرف اعلان شاہی کی گونج سنائی دینے لگی تو ملک کافور کے خلاف کی جانے

والی سازشوں نے دم توڑ دیا تھا اور بڑے سے بڑا طاقتور وزیر بھی اس خواجہ سرا غلام سے خائف نظر آنے لگا

تھا..... مگر آج ایک انہونی بات ہو گئی تھی۔

”سرمدار کافور پر ایک عورت نے حملہ کیا ہے۔“ محافظ سپاہی نے کانپتی ہوئی آواز میں وضاحت کی۔

ملک کانام سن کر علاء الدین بدحواس ہو گیا اور تیز قدموں سے اس طرف بڑھا جہاں سپاہیوں کا جہوم

ساتھا۔ سلطان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر قصر نواز ستون کے ٹکھیاں اوہرا دھر منتشر ہو گئے۔ علاء الدین نے

دیکھا کہ ملک کافور کے بائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ابھی تک ایک نقاب پوش عورت کی گلائی کو

نہایت سختی سے پکڑے ہوئے تھا۔

علاء الدین عورت کو پہچان نہیں سکا..... اس نے گھبرا کر ملک کافور کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

غلام کے خون سے آقا کے ہاتھ رنگین ہو گئے۔ ”ملک! زخم گہرا تو نہیں ہے؟“ سلطان نے شدید کرب

کے عالم میں دریافت کیا۔

”نہیں! شاہ والا! کاسایہ کرم نہ ہوتا تو آج یہ خنجر غلام کی شہ رگ میں اتر چکا ہوتا۔“ اگرچہ موت ٹل گئی

تھی لیکن پھر بھی موت کے احساس سے ملک کافور بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”تو یہ عورت تیرے شاہ کا خون بہانا چاہتی تھی۔“ سلطان نے انتہائی نفرت آمیز نظروں سے

نقاب پوش خاتون کی طرف دیکھا اور محافظ سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے اسی وقت ہماری بارگاہ میں

حاضر کرو..... ہمارا انتظام انصاف کسی تاخیر کو برداشت نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر علاء الدین مڑا اور

دوبارہ اپنے عشرت کدے میں داخل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

جب وہ عورت مجرم کی حیثیت سے علاء الدین کے سامنے لائی گئی اور اس نے اپنے چہرے کا نقاب ہٹایا تو

لرزہ سا پڑ گیا۔ علاء الدین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خوبصورت بیوی ارجمندناہید ہو سکتی ہے۔ سلطان

نے تمام سپاہیوں کو اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ صرف ملک کافور، علاء الدین کے روبرو کھڑا

رہا۔

”تو نے ایسا کیوں کیا ارجمند؟“ سلطان کا لہجہ غضبناک تھا۔

ارجمندناہید ابھی کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ عشرت کدے کے دروازے پر ہانپل ہی ہوئی محافظ سپاہی

نے دوبارہ حاضر ہو کر بتایا کہ بیگمات شاہی اندر آنے کیلئے اجازت کی طلب گار ہیں۔

”انہیں آنے دو کہ وہ بھی اپنی ایک ہم جنس کے انجام سے سبق حاصل کر لیں۔“ علاء الدین سر سے

پاؤں تک ایک مجسمہ قہر بن گیا تھا۔

”بے شک! بے شک! گنوار نے جھک کر رخصتی سلام کیا اور ہانسی جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔
 نور کے ذریعے ملک کافور کو ایک راجپوت لڑکی نرملا کے بارے میں بھی معلوم ہوا تھا جو آفریدی کے
 تھشاشی محل میں لائی گئی تھی۔ ملک کافور نے نرملا سے ملنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ اپنے ارادوں میں

☆ ☆ ☆

آفریدی کے حق میں دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ عالیہ آفریدی اپنی نو عمری کے سب گھبرا کر کبھی کبھی رونے لگی تھی۔ اس موقع پر شائستہ بیگم اپنی بیٹی کو گریہ و زاری سے باز رہنے کی تلقین کرتیں۔
”تو اس قوم کی وارث ہے جس نے موت کا استقبال بھی مسکراہٹوں کے ساتھ کیا ہے، تیرے بزرگوں نے اپنے خدا سے بے آبروئی کی زندگی کبھی طلب نہیں کی، تو بھی دعا کر کہ سانسوں کا یہ سلسلہ منزل ایمان پر جا کر ٹھہر جائے۔“

عالیہ خاموش ہو جاتی اور دل ہی دل میں آفریدی کی سلامتی کیلئے دعائیں کرنے لگتی۔ وہ بڑی جاں نثار اور محبت کرنے والی بن گئی۔ اپنی تکلیفوں سے زیادہ بھائی کے مصائب کا خیال کرتی اور پھر یہی احساس اسے آٹھوہانے پر مجبور کر دیتا۔

نور الدین نور اہانی پہنچ چکا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب مغلوں کی آمد کا غلطہ بلند ہو اور کب وہ ملک کافر کے شرمناک منصوبے پر عمل کرے۔ تقریباً پندرہ دن بعد ایسی خبریں ملنے لگیں کہ مغل وحشی اپنی تہمت سفاکیوں کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نور اکو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ پھر جب آدھی رات کے قریب شائستہ بیگم، عالیہ آفریدی اور دوسرے بڑوسی سوئے ہوئے تھے، ملک کافر کے سپاہیوں نے بیک وقت کئی مکانوں پر نغض (مٹی کا تیل) چھڑک کر آگ لگا دی۔ تیل اس قدر زیادہ مقدار میں استعمال کیا گیا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں نے تقریباً پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف ایک کھرام سا برپا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اس ناگہانی حادثے نے لوگوں کے حواس چھین لئے تھے۔ ملک کافر کے سپاہیوں نے آفراتفری اور انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برتنوں میں تیل بھر بھر کر آفریدی کے مکان کے اندر پھینکا۔ پہلے تو کسی کو ہوش ہی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اگر کسی نے سپاہیوں کو مصروف عمل دیکھا تو وہ یہی سمجھا کہ سلطان کے فوجی بھی آگ بجھانے میں مدد کر رہے ہیں۔ اب کسی کو کیا پتہ کہ سپاہیوں کے برتنوں میں پانی نہیں آگ بھری ہوئی تھی۔ شعلے اتنی تیزی سے بھڑکے کہ شائستہ بیگم اور عالیہ آفریدی کمرے سے نکل کر صحن تک بھی نہیں پہنچ سکیں۔ سپاہیوں نے عقبی دیوار پر چڑھ کر بہت سا تیل مکان کے آگن میں بھی پھینک دیا تھا نتیجتاً چند لمحوں میں دونوں ماں بیٹی کے گرد آگ کا ایک حصار کھینچ گیا۔

عالیہ بے اختیار ہو کر مدد کیلئے چیختی نکلی مگر شائستہ بیگم نے ایسی لرزہ خیز ساعتوں میں بھی صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ صرف ان ہی کامکان نہیں، بڑوسیوں کے گھر بھی جل رہے تھے۔ جب پوری فضا ہی شعلوں میں گرہن ہو تو مدد کیلئے کون آتا۔ شائستہ بیگم نے عالیہ کو اپنی چادر میں جھپالیا۔ ان کی یہ تدبیر ایک جذباتی حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنی مامتا سے مجبور تھیں اس لئے بیٹی کو آگ کی لپٹوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جان بچانے کی جدوجہد کے یہ لمحات بھی بہت مختصر تھے۔ شائستہ بیگم، عالیہ کو لے کر اس امید پر صحن کی طرف بڑھیں کہ شاید کچھ آگے پہنچنے کے بعد بھڑکتے ہوئے شعلوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا مگر یہ ان کی خوش گمانی تھی۔ ملک کافر کے سپاہیوں نے مکان میں ہر طرف آگ کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ وہ ایک دیوار کو عبور کرتیں تو دوسری مزامم ہو جاتی۔ بمشکل نصف صحن تک ہی پہنچی ہوں گی کہ شائستہ بیگم اور عالیہ کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ عالیہ جسم کی سوزش سے گھبرا کر علیحدہ ہونا چاہتی تھی مگر شائستہ بیگم نے اسے الگ نہیں ہونے دیا۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لئے آگے بڑھتی رہیں۔ دھوئیں اور شعلوں کی کثرت نے عقبی دروازے کا راستہ بھی گم کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد شائستہ بیگم کی قوت برداشت جواب دے گئی

ناکام رہا تھا۔ حرم سرا میں اس کا داخلہ بند تھا۔ ورنہ وہ براہ راست نرملا سے ملاقات کر کے اس حقیقت کو بھی جان لیتا کہ ایک راجپوت زادی سلطنت خلیجی کے افغان سردار سے کس قدر والہانہ محبت کرتی ہے، تاہم نور نے ملک کافر کو یہ بتا دیا تھا کہ چوڑے کے مہماننزی کی بیٹی دنیا کی ہر آسائش کو ٹھکرا چکی ہے اور آفریدی کے ہمراہ رہ کر عسکین سزا بھگتے کیلئے آمادہ ہے۔ ملک کافر نے یہ خبر بڑی حیرت سے سنی تھی۔ پھر اس نے دیگر امراء سے یہ بات بھی معلوم کر لی کہ سلطان نے آفریدی کے مقدمے کا فیصلہ اس وقت تک کیلئے ملتوی کر دیا ہے جب تک سیاسی فضا پر سکون نہیں ہو جاتی ملک کافر یہ سن کر مطمئن ہو گیا کہ ابھی اس کی ریشہ وانیوں کیلئے کافی وقت تھا۔

پھر اس نے رام دیو سے ملاقات کی۔ رام دیو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا کہ آنے والا کون ہے؟ ملک کافر نے فوری طور پر اس سے آفریدی کا ذکر نہیں کیا بلکہ علم نجوم پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آپ زمین و آسمان دونوں کی خبر رکھتے ہیں۔“

تعریف اور خوشامد انسان کی خوفناک کمزوریاں ہیں۔ رام دیو بھی اپنے بارے میں ستائشی الفاظ سن کر بدست ہو گیا۔ پھر ملک کافر نے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو رام دیو کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچنے لگا۔ یہ علاء الدین کے غلام کی قسمت کا زائچہ تھا۔ رام دیو ستاروں کی رفتار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے ملک کافر کو بتایا کہ وہ عروج حاصل کرتے کرتے ایک دن اپنے سر پر تاج شاہی سجائے گا۔ یہ سن کر ملک کافر کی آنکھوں میں اقتدار کے پر کیف خواب کروٹیں لینے لگے مگر اس نے رام دیو کو منع کر دیا کہ وہ اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کرے اور اپنی پیش گوئی کو ہونٹوں کی قیدی میں رہنے دے۔ اگر اس نے مذاق میں بھی یہ بات کسی سے کہہ دی تو وہ سلطان کے عتاب کا نشانہ بن جائے گا۔ رام دیو نے چند لمحوں میں ملک کافر کی شخصیت کا جائزہ لے لیا تھا اور اسے اس با اثر غلام کے چہرے میں اپنی ذاتی کامیابیوں کے روشن امکانات نظر آرہے تھے۔ ملک کافر یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ آئندہ بھی رام دیو سے ملاقاتیں کرے گا اور اس کے روحانی علوم کی روشنی میں مناسب قدم اٹھائے گا۔ اس طرح ملک کافر اور رام دیو کے درمیان ایک خصوصی تعلق قائم ہو چکا تھا اور دونوں چال باز اپنے اپنے مفادات کیلئے ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

نور الدین نور، ملک کافر کے خوفناک منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے دہلی سے ہانسی روانہ ہو چکا تھا۔ آفریدی کی والدہ شائستہ بیگم اور بن عالیہ اپنے آبائی مکان میں ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی تھیں۔ ملک کافر کے سپاہی ہر وقت مکان کے باہر پرہہ دیتے رہتے تھے۔ اس دوران شائستہ بیگم نے حضرت بابا فرید کے غلیفہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسی کے حزار مبارک پر حاضری دینے کی بھی درخواست کی تھی مگر سپاہیوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ شائستہ بیگم نے سپاہیوں سے اپنے بیٹے کے متعلق دریافت کیا تو جواب دیا کہ وہ کسی آفریدی کو نہیں جانتے۔ پھر شائستہ بیگم نے اپنی نظر بندی کا سبب پوچھا تو کہا گیا کہ وہ لوگ دربار شاہی کے معتب ہیں۔ اس لئے ان کی آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں، شائستہ بیگم ایک حادثہ آشنا عورت تھیں۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں انہوں نے بے شمار خوشی انقلابات دیکھے تھے۔ آفریدی کی طویل غیر حاضری اور اپنی نظر بندی کے بعد شائستہ بیگم نے سمجھ لیا تھا کہ پھر کوئی جائگداز حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے وہ شب و روز اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز رہتی تھیں اور

اور وہ زمین پر گر پڑیں۔ آگ کے عفریت اپنی سرخ زبانوں سے ماں اور بیٹی کے جسموں کو ڈستے رہے۔
”اے خدا! میں تیرے فیصلے سے راضی ہوں مگر آفریدی کو دونوں جہان میں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔“ یہ شائستہ بیگم کے آخری الفاظ تھے اس کے بعد وہ اور عالیہ راگہ کا ڈھیر بن گئیں۔

☆.....☆.....☆

ایک لاکھ بیس ہزار مغلوں کا لشکر اپنے سردار طرغی کی قیادت میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور علاء الدین کے دوسرے سپہ سالار اپنی اپنی فوجوں کو لے کر مرکز تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ طرغی دریائے جمنا کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ سلطان اپنے سپاہیوں کی قلت اور مغلوں کی کثرت سے ہراساں نظر آنے لگا۔ پھر بھی وہ نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ دہلی سے نکلا اور سیری میں مقیم ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف گہری خندقیں کھدوائیں اور اپنی لشکر گاہ کے آس پاس خار بندی کر کے مغلوں کے فوری حملے کو روکنے کی کوشش کی۔ اس طرح علاء الدین کچھ دن کیلئے اپنی عسکری قوت کو بچانے میں کامیاب ہو گیا مگر مغلوں نے دہلی کے تمام نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مغل سردار طرغی روزانہ نئے احکام جاری کرتا اور اس کے سپاہی لوٹ مار اور قتل و غارت کا طوفان کھڑا کر دیتے۔ مغلوں نے کئی بار خاص شہر دہلی پر حملہ کر کے اناج کے ذخائر لوٹ لئے لیکن رعایا کو پریشان نہ کیا۔ یہ بڑی مایوس کن صورت حال تھی جس نے علاء الدین جیسے آہنی اعصاب رکھنے والے انسان کی بھی نیندیں اڑا دی تھیں۔ حالات اس وقت اور بھی خراب ہو گئے جب مغلوں نے خندقیں عبور کیں اور خاددار راستوں سے گزر کر علاء الدین کے لشکر پر کئی حملے کئے۔ بہت سے سپاہیوں کو ہلاک کر ڈالا اور بے شمار فوجیوں کو زخمی کیا۔

مغلوں کی یہ تخریب کاریاں مسلسل ڈیڑھ ماہ سے جاری تھیں اور علاء الدین کا اقتدار اس مریض کی مانند نظر آ رہا تھا جو اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔

ایک طرف سلطان کی فوجی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی اور دوسری جانب مغلوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ علاء الدین بار بار ان راستوں پر نظر ڈالتا جن سے گزر کر تازہ دم لشکر آنے والے تھے۔ پھر اس کی ہلکی ہوئی نگاہیں واپس لوٹ آئیں۔ راہیں سنسان پڑی تھیں اور علاء الدین لکھنؤ، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ، جہان پور، شکار ہوتا جا رہا تھا۔ وحشی مغلوں کے محاصرے کو دو ماہ گزر چکے تھے اب علاء الدین کی وہی کیفیت تھی جس سے کچھ دن پہلے راجپوت سمرات دوجار ہونے لگا تھا۔ کیا عجیب انقلاب تھا کہ دیکھتے دیکھتے دہلی چوتھین مٹی تھی اور خود علاء الدین، راج رتن سنگھ کی طرح بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ ایک دن سلطان نے اپنے امیرانہ لشکر ملک نصرت خان، خواجہ جامی اور تاج الدین عراقی سے انتہائی شکستہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا تم نے کسی راستے سے غبار اٹھتے ہوئے دیکھا ہے؟“ علاء الدین کی مراد اپنے ان شہسواروں سے تھی جن کے انتظار میں اس کی آنکھیں پتھر اچکی تھیں۔

سپہ سالاروں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔

”کیا تمہارے کانوں میں ہمارے گھوڑوں کے سموں کی وہ آوازیں نہیں گونجتیں جنہیں سن کر دشمنوں کے سینے شق ہو جاتے تھے؟“ علاء الدین گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ پھر ملک نصرت خان نے سر اٹھایا اور اس لہجے میں کہنے لگا۔ ”سلطان عالی قدر! آپ کے غلام بہت مجبور ہیں۔ وہ شاہ والا کی قدم پوسی کیلئے کس طرح آئیں کہ مغل

درندے ان کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔“

”آنے والے واقعات مجبور ہیں یا موت کے خوف نے ان کے قدموں کو جھڑلایا ہے؟“ علاء الدین کا لہجہ ایک غضب ناک ہو گیا تھا۔

”نہیں فاتح عالم! آپ کے جاں نثاروں نے کبھی موت کی پروا نہیں کی۔“ ملک نصرت خان نے بڑبڑا کر کہا۔ وہ سلطان کو بدگمانی سے بچانا چاہتا تھا۔ ”مغل سردار طرغی نے آپ تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ دہلی کی طرف آنے والے ہر شاہراہ پر دشمنوں کا جھوم ہے۔ آپ کے نمک خوار یقیناً کسی مناسب موقع کے منتظر ہوں گے اگر انہیں ایک سوراخ کی جگہ بھی مل گئی تو وہ اسے کھود کر کشادہ کر دیں گے۔ اور کسی نہ کسی طرح اپنے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔“

”کیا وہ اس وقت پہنچیں گے جب ان کے شاہ کا تاج درندوں کی ٹھوکروں میں ہو گا؟“ علاء الدین بہت زیادہ پرہم نظر آ رہا تھا۔ ”کیا وہ اس وقت غلامی کا حق ادا کریں گے جب قبائلی شاہی کی دھجیاں اڑ چکی ہوں اور خلیجوں کا عظیم وارث اپنے خون میں نہایا ہوا فرش خاک پر ترپ رہا ہو گا؟“ سپہ سالاروں نے اپنی زندگی میں پہلی بار علاء الدین کو اس قدر پریشان دیکھا تھا۔

”نہیں شامل! غلاموں کی زندگی میں وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔“ ملک نصرت خان نے اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آنے والے آتے رہیں گے مگر جو غلام اس وقت موجود ہیں انہیں حکم دیجئے کہ وہ آگے بڑھ کر موت کا زایہ تبدیل کر دیں یا خود اس کے منہ کا قلعہ بن جائیں۔“

”نصرت خان!“ علاء الدین نے پہنچنے کے سے انداز میں کہا۔ ”کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے دست و بازو بھی موت کے منہ میں ڈے کر ایک احق تماشا بن جاؤں؟“

”اس طرح شاہ کو یقین تو آجائے گا کہ ابھی دنیا میں رسم و رواج باقی ہے اور گردش کے وقت نمک خواروں نے اپنے آقا کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔“ ملک نصرت خان اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کی پلکیں بھیٹکنے لگی تھیں۔

”میں تمہاری وفاؤں پر شک نہیں کرتا۔“ علاء الدین نے تحسین آمیز نظروں سے پہلے ملک نصرت خان کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے امیرانہ لشکر پر نگاہ کی۔ ”میری خوش بختی میں تمہاری سرفروشاں بھی شامل ہیں۔ اب کسی حکمران کو ایسے جانباز سپاہی شاید ہی میسر آئیں۔ تم میرے احکام کو نافذ کرنے والے، میرے منصوبوں میں حقیقت کارنگ بھرنے والے اور میرے ایک اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینے والے وہ اطاعت شعار ہو کہ جس پر تاریخ و فائیدہ ناز کرے گی۔ تم میرا وہ اعتبار ہو کہ جس کے بغیر فتح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ علاء الدین نے ان سنگین لمحات میں اپنے آپ کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا اور ان سپاہیوں کو بھی جو مغلوں کے پے در پے حملوں سے ہراساں نظر آ رہے تھے۔

علاء الدین صرف اپنی قوت ارادی سے دشمنوں کا سامنا کر رہا تھا ورنہ جنگی نقطہ نظر سے وہ شکست کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ داخلی اعتبار سے اس کی مملکت میں بڑا انتشار تھا۔ مغلوں نے پُر امن شہروں کا قتل عام تو نہیں کیا تھا مگر جہاں تک ان کی شرانگیزیوں کا تعلق تھا تو وہ عام رعایا کا مال و اسباب لوٹ چکے تھے اور مقامی املاک کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ مغلوں کو اپنی اس حکمت عملی سے دو بڑے فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ ایک یہ کہ اناج کے ساتھ دیگر اشیائے ضرورت کے ذخائر پران کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے یہ کہ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ عوام چیخ رہے تھے اور اپنی حکومت پر سے ان کا اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔

خارجی طور پر کوئی سلطنت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو مگر داخلی انتشار اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیتا ہے۔ علاء الدین دونوں محاذوں پر بری طرح پسا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

آنے والی رات بڑی قیامت خیز تھی۔ سرشام ہی مغلوں نے علاء الدین کے لشکر پر ایک اور حملہ کیا تھا۔ سلطان کے فوجیوں نے بڑی ہمت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اس تازہ یورش میں مغلوں کا بھی نقصان ہوا مگر علاء الدین کے سپاہیوں کی تعداد مختصر تھی۔ اس لئے ایک فوجی کی ہلاکت بھی سلطان کو بہت کراں گزرتی تھی۔ علاء الدین اپنے طاقتور حریف طغرلی کی منصوبہ بندی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ شرمیں لوٹنا نہ چاہنے کے بعد اب مغل ایک مرکز پر سمٹ رہے تھے اور وہ مرکز تھا سلطان کی لشکر گاہ۔ طغرلی مسلسل اپنا دباؤ تنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس کے تیور بہت خطرناک نظر آرہے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے ہی اس نے مغل سپہ سالاروں کو اپنے خیمے میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

”کیا حکم ہے سردار؟“ مغل سپہ سالار انتہائی تند و تیز لہجے میں بول رہے تھے۔ ”کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالیں؟“

”بے شک! وہ وقت آپہنچا ہے۔ جس کا ہم برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔“ طغرلی اپنے سپاہیوں کا جوش دیکھ کر مسکرایا۔

”پھر حکم دیجئے کہ ہم ان کے جوانوں اور بچوں کو تہ تیغ کر ڈالیں اور ان کی عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آئیں۔“ ایک مغل فوجی اپنے سردار طغرلی سے اس طرح مخاطب ہوا کہ اس کے لہجے نے آگ برس رہی تھی۔

”نہیں! ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔“ طغرلی نے بلند آواز میں کہا۔ ”جو قوم اس طرح قتل و غارت میں مصروف ہو جاتی ہیں انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا نشانہ دہلی کے بے دست و پا عوام نہیں۔ وہ تو محض بھیڑ بکریاں ہیں۔ انہیں جب چاہیں گے ہانک کر لے جائیں گے۔“

”پھر؟“ دوسرے مغل سپہ سالار کی بھنوں کھینچ گئیں وہ سوالیہ انداز میں طغرلی کی جانب دیکھنے لگا۔

”ہمارا اصل ہدف سلطان علاء الدین ہے۔“ طغرلی کے ہونٹوں پر زہر آلود تبسم رقص کر رہا تھا۔

”اگر تمہارے تیر اس کے گلے کو چھو لیں اور تمہاری شمشیریں اس کے سر تک پہنچ جائیں تو پھر پورا ہندوستان ہمارے قدموں کی دھول بن جائے گا۔ علاء الدین ہی ہمارے راستے کا سب سے بڑا کاٹنا ہے جب تک وہ زندہ ہے ہمارے خواب تعبیر کیلئے ترستے رہیں گے۔“

مغل فوجی اپنے سردار کی باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔

طغرلی نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور اس طرح گردش دی جیسے وہ علاء الدین کو قتل کر رہا ہو۔

”اس زہریلے کانٹے کی نوک توڑ دو پھر یہ گرز گاہیں ہمیشہ کیلئے صاف ہو جائیں گی۔“

مغل سپاہیوں نے چونک کر طغرلی کی جانب دیکھا۔

سردار طغرلی متوقع کامیابی کے نشے سے سرشار تھا اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک عام سی لکڑی کے تخت پر بیٹھا جھوم رہا تھا۔ خیمے کی فضا میں ساکت تھیں۔

”سردار! کیا ہم علاء الدین کا سر کاٹ کر تیری خدمت میں پیش کر دیں؟“ ایک مغل سردار نے اس سکوت کو توڑا۔

طغرلی نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔ ”علاء الدین کا سر کاٹنا اتنا آسان نہیں ہے وہ اس وقت بھی اپنے بہترین فوجیوں کے حصار میں موجود ہو گا۔ پہلے تم اس کی عسکری قوت کو تباہ کر دو پھر علاء الدین کا سر تو خود بخود نشانوں سے الگ ہو کر زمین پر گر جائے گا۔“

مغل فوجی اپنے سردار کا اشارہ سمجھ چکے تھے پھر بھی ایک سپہ سالار نے اس نئے حکم کی وضاحت چاہی۔

”میرا خیال ہے کہ علاء الدین کے پاس اتنی فوج نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر حملہ آور ہو سکے۔ اگر یہ ممکن ہو تا تو وہ اب تک خادروں کے حصار سے باہر آچکا ہوتا۔ ہمارے سپاہیوں نے وہ راستے بھی بند کر دیئے ہیں جن سے تازہ فوجی ملک پہنچنے کا امکان تھا۔ علاء الدین کی طاقت منتشر ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت تنہا ہے اور اس کی بی تہائی ہمیں ہماری منزل تک پہنچانے کا سبب بن جائے گی۔ اگر علاء الدین کے باقی لشکر بھی اس سے آگے تو پھر شاید ہم کبھی اس پر غلبہ حاصل نہ کر سکیں۔ آسمان نے ہمیں یہ بڑا عجیب موقع فراہم کیا ہے۔ تم آخری بار اپنی جانوں پر کھیل جاؤ اور صبح ہوتے ہی سلطان کی لشکر گاہ کو روند ڈالو اگر علاء الدین گرفتار ہو گیا یا جنگ کرتے ہوئے مارا گیا تو اس کی بے پناہ فوج قوت نیکوں کی طرح نکھر جائے گی۔ پھر ہم بڑی آسانی کے ساتھ اس زرخیز ملک کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکیں گے۔“

مغل فوجیوں نے اپنے سردار سے عہدیدان کئے، کٹ مرنے کی قسمیں کھائیں اور صبح ہوتے ہی علاء الدین کی صفیں الٹ دینے کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

اسی رات علاء الدین اپنی خواب گاہ میں تھا تھا۔ تمام امراء اور فوجی سردار پریشان تھے۔ کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا کہ آنے والے لمحات کیسی جانگداز خبر لے کر آئیں گے۔ بظاہر سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور چوڑی فتح کے نشے کو دوشی مغلوں نے اس طرح زائل کر دیا تھا جیسے تیر اندھ تار درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ اسی وحشت کے عالم میں ملک کا فخر خواب گاہ سلطانی کی طرف بڑھا اور دبے قدموں کمرے میں داخل ہو گیا۔ علاء الدین پشت پر دونوں ہاتھ باندھے ٹٹل رہا تھا۔ ملک کا فخر تیزی سے جھکا اور سلطان کے پیروں پر سر رکھ کر بے آواز بلند کئے لگا۔

”شاہ والا کا قبال بلند ہو۔“

علاء الدین نے اپنے پاؤں کھینچ لئے ملک کا فخر کا سر فرش سے ٹکرایا اور سلطان دیوار پر آویزاں ہندوستان کے نقشے کو دیکھنے لگا۔ علاء الدین کی نظریں ملتان اور دیپال پور کے علاقے پر مرکوز تھیں۔ جہاں سے گزر کر مغل سپاہیوں کا ٹڈی دل ہندوستان کے سرسبز شاداب کھیتوں کو چاٹ لیا کرتا تھا آج علاء الدین کو بڑی شدت سے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوش تعبیر میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر لشکر کشی کرتا ہا مگر اس نے بیرونی خطرات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اب ہوش آیا تو وقت بہت آگے جا چکا تھا۔ علاء الدین بہت دیر تک کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اچانک پلٹا تو اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست تھے اور ہونٹ سختی کے ساتھ پیچھے ہوتے تھے۔ ملک کا فخر دست بستہ کھڑا تھا، سلطان کی یہ کیفیت دیکھ کر لرزے لگا۔ علاء الدین نے اپنے محبوب غلام پر اچھتی سی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا درپے کے قریب پہنچا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ رات بہت تاریک تھی گرد و پیش کی ہر چیز اندھیرے کا کفن اوڑھے سنائے کی قبر میں لیٹی ہوئی تھی کبھی کبھی ہوا کے رخ پر دریائے جہنا کے سینے سے اٹھنے والی پرشور موجوں کی

کامیاب نہ ہو سکا علاء الدین کو اطلاع دی گئی کہ امیر خسرو لشکر گاہ میں موجود نہیں ہیں سلطان انتہائی فکر مند نظر آ رہا تھا اس نے دوسرا حکم جاری کیا کہ بیک وقت کئی خدمت گار امیر خسرو کی تلاش جاری رکھیں آخر بہت دیر دوپہ کے بعد امیر خسرو سپاہیوں کو نظر آئے وہ لشکر گاہ کے ایک انتہائی سنان گوشے میں دریا کے کنارے عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے روزانہ کے وظائف میں مشغول تھے۔

حکم شاہی سننے ہی امیر خسرو نے دعا کے واسطے ہاتھ بلند کئے کچھ دیر تک اپنے رب سے مسلمانان ہند کیلئے عافیت طلب کرتے رہے اور پھر علاء الدین کے در و در پہنچ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

”خسرو! تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کیوں یاد کیا ہے؟“ علاء الدین کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔

”شاہ والا خود ہی بہتر جانتے ہیں۔“ امیر خسرو نے مبہم سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”مغلوں کے محاصرے کو دو ماہ گزر چکے ہیں۔“ علاء الدین چہرے سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”مخلوق خدا ان لیروں کے ہاتھوں سخت آزمیتیں برواشت کر رہی ہے۔ عوام نظاہر اپنی زبانوں سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کے سینوں میں دہی بات دہی ہوئی ہے جو ہونٹوں تک آجائے تو خسرو تمہاری سماعت بھی جل اٹھے۔ اگرچہ رعایا سے ہمارا رابطہ ٹوٹ چکا ہے مگر اتنے فاصلے کے باوجود ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے جاہ و جلال کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں خدا کی طرف سے عوام کا نگہبان ٹھہرایا گیا تھا لیکن جب ان پر یہ آفت ناگمانی نازل ہوئی تو ہم ان کے حقوق کی حفاظت نہ کر سکے۔“ یہ کہہ کر علاء الدین خلجی چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور اس نظروں سے امیر خسرو کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ہمارے دور حکومت میں کل تک وہ اپنے دروازے کھلے چھوڑ کر چین کی نیند سو جاتے تھے مگر آج یہ حال ہے کہ ان کے جان و مال محفوظ ہیں اور نہ عزت و ناموس۔ کیسی گردش وقت ہے کہ ہم نے اپنا اعتبار کھو دیا خسرو! چوڑا ہاری قبریں بن گیا ہم جیت کر بھی ہار گئے وہ جشن فتح نہیں ہمارا جتازہ تھا جس پر اہل شہر ماتم کر رہے تھے۔“

علاء الدین اس قدر شکستہ نظر آ رہا تھا کہ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”نہیں رعایا پرور! ابھی تو آپ کے دعا گو زندہ ہیں۔“ امیر خسرو نے اس عالم کے کسی میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

”خسرو! کیسی دعا۔“ علاء الدین کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹ بہت آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ ”لوگ تو ہمارے مرنے کی دعائیں کر رہے ہوں گے۔ اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہم نے بھی تو انہیں موت کے منہ میں تھما چھوڑ دیا ہے۔“ علاء الدین کی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

”نہیں شاہ! آپ کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگنے والا تو کوئی اور ہے۔“ امیر خسرو نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں حضرت شیخ کا ذکر کر رہا ہوں۔“

علاء الدین نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”ہم نے تمہیں اسی لئے یاد کیا تھا خسرو“

مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کب تک اپنے ناپاک دامن کو حضرت شیخ کے سامنے پھیلائیں۔

”آپ کا خادم تو درمیان میں موجود ہے۔“ امیر خسرو نے علاء الدین کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ ”میں پیرو مرشد کے قدموں سے لپٹ جاؤں گا اور اس وقت تک دامن نہیں چھوڑوں گا

آواز سنائی دیتی تھی سننے والوں کو محسوس ہوتا تھا جیسے موت دے پاؤں ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ایک علاء الدین کی صدا گونجنے لگی۔ وہ بہت پر سوز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”اے خدا! تو نے علاء الدین کی تقدیر روشن کر دے لکھی ہے پھر یہ کیسا اندھیرا ہے جو اسے نکلنے کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے ایک موقع اور دیدے کہ میں سنبھل سکوں مغل درندوں نے مجھ پر عقب سے وار کیا ہے کاش! یہ میرے سامنے نمودار ہوتے پھر میں دیکھتا کہ ان کے دانت کس فولاد سے بنے ہیں اور ان کے پنجے کتنے تیز ہیں؟ اے خدا! شیروں کے وارث کو گیدڑوں اور لومڑیوں کے حوالے نہ کر۔ میرے پیچھے ہوئے سپاہیوں کو مجھ تک پہنچنے کا راستہ دے کہ میں ان قزاقوں کو کھلے میدان میں لٹاکر سکوں۔“ مادی سہارے ناکام ہو گئے تو علاء الدین آسمانی طاقت کو پکارنے لگا۔

”ایسا ہی ہو گا۔“ ملک کافور بولا۔

سلطان نے لپٹ کر دیکھا اور کہا۔ ”کیا تو اپنے شاہ کے مزاج کو نہیں جانتا کہ وہ اپنی جنگ خود لڑتا ہے۔“ علاء الدین کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔ ”تجھے خبر نہیں کہ تیرا شاہ مصیبت کے وقت کتوں کی پاسبانی قبول نہیں کرتا۔“

”میں جانتا ہوں فاتح عالم! میں جانتا ہوں۔“ ملک کافور ایک بار پھر سجدے میں گر کر سر گرڑنے لگا تھا۔ ”آپ حکم دیں تو میں رام دیو کو حضور کی خدمت میں حاضر کروں کہ وہ ستاروں کا حساب خوب جانتا ہے۔“

علاء الدین رام دیو کا ذکر سن کر چونک اٹھا۔ ”ستاروں کا حساب؟“ سلطان نے تیز آواز میں کہا۔

”ملک کافور اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔“ رام دیو جسے آپ نے چوڑی میں غلامی کا اعزاز بخشا تھا وہ بہت برا ماہر نجوم ہے اس کا دعویٰ ہے کہ ایک روز آپ ساری دنیا پر حکومت کریں گے۔“

علاء الدین کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ وہ اچانک گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

”ملک کافور رام دیو کی تقریریں کرنے لگا۔“ وہ چند لمحوں میں بتا دے گا کہ ستاروں کی یہ گردش کب ختم ہوگی؟“

ملک کافور ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ علاء الدین نے اسے جھڑک دیا۔ ”راجپوتوں کی بھیک کے کھلنے والے واہوہ برہمن ہمارے مستقبل کے بارے میں بتائے گا؟“ سلطان کے لہجے سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

”خود جس کی زندگی ہمارے رحم و کرم کی محتاج ہو وہ ہماری تقدیر کی خبر دے گا؟“

ملک کافور کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ شاہ کے رعب و جلال سے لرزے لگا۔

”امیر خسرو کہاں ہیں؟“ اچانک علاء الدین نے اپنے غلام سے پوچھا۔

”شاید وہ اپنے کمرے میں موجود ہوں۔“ ملک کافور نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا وہ سلطان ذہن کو پڑھنے سے قاصر تھا۔

”تو جا اور کسی محافظ سپاہی کو اندر بھیج دے۔“ یہ کہہ کر سلطان نے منہ پھیر لیا۔ ملک کافور سمجھ گیا اب اس کی موجودگی ناقابل برداشت ہے وہ بے جان قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد سلطان نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ امیر خسرو تک یہ پیغام شاہی نھل کر دے علاء الدین ان سے ملاقات کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ محافظ نے امیر خسرو کو بہت تلاش کیا مگر اپنی جستجو

امیر خسرو پہلے خاروں کے حصار سے نکلے اور پھر خندق کو پار کر کے ہموار راستے پر چلنے لگے، خسرو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چپے چپے پر مغل سپاہی موجود تھے اور رات کی تاریکی کے باوجود حرکت میں نظر آرہے تھے۔ خسرو کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حملہ آوروں کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ کسی خاص منصوبہ بندی پر عمل کر رہے ہیں اس صورت میں خسرو کا خاموشی سے گزر جانا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا پھر بھی وہ اپنے خدا کے بھروسے پر آگے بڑھتے رہے ابھی امیر خسرو نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کچھ مغل سپاہیوں کی نظر ایک سائے پر پڑی وہ بے اختیار چیخ اٹھے۔

”دشمن آ رہا ہے اپنی اپنی جگہ ہوشیار ہو جاؤ۔“

رات کے سانے میں مغلوں کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں امیر خسرو ایک لمحے کیلئے گھبرا سائے گئے مگر پھر فوراً یہ سورہ یسین کی اس آیت کا ورد کرنے لگے جسے پیغمبر اسلام نے ایک جنگ کے موقع پر پڑھا تھا اور جس کے اثرات سے کفار کا لشکر مسلمانوں کو ایذا پہنچانے سے قاصر رہا تھا۔

”اے پیغمبر! یہ تمہاری طرف دیکھ ہی نہیں سکتے کہ ہم نے ان کی آنکھوں کے آگے دیوار کھینچ دی ہے۔“

امیر خسرو اس آیت مقدسہ کو زیر لب پڑھتے رہے چند لمحوں کی بات تھی مغلوں کی آنکھوں پر بھی پردہ سا بڑ گیا پھر ان کا اضطراب ختم ہو گیا اور وہ پرسکون نظر آنے لگے۔

”کوئی نہیں ہے کوئی نہیں ہے۔ وہ ہماری نگاہ کا فریب تھا۔“ مغل سپاہی ایک دوسرے سے کہنے لگے اور امیر خسرو انتہائی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کا یہ چہیتا مرید آدمی رات کے بعد پسینے میں نمایا ہوا خانقاہ پہنچا تو ایک بالکل سی ٹیج گئی۔ طویل مسافت کے سبب امیر خسرو کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے کا رنگ متغیر نظر آ رہا تھا۔ حضرت شیخ کے تمام خدمت گار امیر خسرو کو اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گئے کئی درویشوں نے وحشت و اضطراب کا سبب پوچھا مگر خسرو کسی کو کیا بتاتے؟ وہ تو ایک راز تھا جسے حضور شیخ ہی بیان کیا جاسکتا تھا۔ خسرو کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے جرجڑ مبارک کی طرف بڑھنے لگے۔

حضرت شیخ کا معمول تھا کہ نماز عشاء کے بعد اپنے مخصوص کمرے میں تشریف لے جاتے اور پھر کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی مگر امیر خسرو اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا حکم تھا کہ خسرو جب چاہیں جرجڑ مبارک میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں تھا۔ خسرو خانقاہ میں موجود ہوتے تو ساری رات حضرت شیخ کے قدموں میں بسر کر دیتے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے۔

”غریب خسرو اس تمنائیں کئی راتوں سے جاگ رہا ہے کہ اسے حضور کے تلوے میسر آجائیں اور پھر وہ ان پر اپنی آنکھیں رکھ کر سو جائے۔“

اسی عقیدے نے امیر خسرو کو بارگاہ شیخ میں محبوبیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ ان کی کسی درخواست کو مستز نہیں کرتے تھے بعض مواقع پر امیر خسرو نے بے جا ضدیں بھی کیں مگر حضرت شیخ نے ان کا ہمہ رکھا آج اسی نسبت خاص کے پیش نظر امیر خسرو نصف شب کے بعد خدمت شیخ میں حاضر ہو رہے تھے۔

جب تک یہ سیاہ رات ختم نہیں ہو جائے گی۔“

”ہمیں یقین ہے خسرو کہ تم ایسا ہی کرو گے۔“ علاء الدین کے چہرے پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ”حضرت شیخ کی وعائیں ہی اس خون آشام بلا کو ٹال سکتی ہیں۔ ابھی تک ہم نے اپنے کسی پہ سالار پر یہ راز ظاہر نہیں کیا ہے کہ ہمارے اقتدار کی گھڑیاں گنتی جاچکی ہیں۔ امیران لشکر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ایک طویل عرصے تک کامیابی کے ساتھ دفاع کرتے رہیں گے انہیں کیا خبر کہ مغلوں کے ہاتھ ہمارے سینے اور گردن تک آ پہنچے ہیں علاء الدین نے صحیح صورت حال کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے یہاں باپوسی کفر کا درجہ رکھتی ہے۔“ امیر خسرو کا لہجہ پر جوش تھا۔

علاء الدین نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ امیر خسرو نے دیکھا کہ سلطان کی پیشانی پر کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ”مگر تم جاؤ گے کس طرح؟ تمام راستے تو بند ہیں۔“

”جس کا بندہ ہوں وہی میرا محافظ ہے۔“ یہ کہتے کہتے امیر خسرو کو اپنا وہ زمانہ یاد آ گیا جب سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا تھا اس جنگ میں بلبن کلائی ترین فرزند شہزادہ سلطان محمد قتل ہو گیا تھا اور امیر خسرو قیدی بنائے گئے تھے پھر قید و بند کی سختیاں جھیلنے کے بعد آزاد کئے گئے اور راستے کی بے شمار تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے دہلی پہنچے آج وہی مغل ملتان کی حدود سے گزر کر دارا گلو مت تک آ گئے تھے اور ان کی چیرہ دستیوں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ شاہی لشکر بھی بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے امیر خسرو کی نگاہوں کے سامنے کئی اذیت ناک منظر متحرک ہو گئے تھے۔

علاء الدین، خسرو کا جواب سن کر خاموش رہا مگر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی افسردگی تیار ہی تھی کہ وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہے۔ سلطان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جہاں قدم قدم پر مغل سپاہی موجود ہوں وہاں سے ایک تھک شخص مسلامتی کے ساتھ کس طرح گزر سکتا ہے۔

امیر خسرو نے سلطان کے چہرے پر لکھے ہوئے پریشان خیالات کو پڑھ لیا۔ ”شاہ والا! آپ میرے بارے میں ذرا بھی فکر مند نہ ہوں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا غلام ہوں۔ مغل مجھے رات دینے کیلئے مجبور ہیں انہیں ایسا کرنا ہی ہو گا۔“ امیر خسرو یقین کی آخری منزل سے بول رہے تھے۔

کچھ دیر علاء الدین ساکت کھڑا رہا پھر اس نے اپنے چند محافظ سپاہیوں کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

”خسرو! تم ان کے ہمراہ چلے جاؤ۔“

”نہیں سلطان معظم! ایسا ممکن نہیں ہے۔“ امیر خسرو نے اوب و احترام کے لہجے میں انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت حضرت شیخ کو کیا جواب دوں گا جب پیر و مرشد مجھ سے فرمائیں گے خسرو! کیا تجھے اپنے خدا کی حفاظت و نمکبانی پر اعتبار نہیں تھا؟“

علاء الدین کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا پھر بھی اس نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ اس وقت واپس لوٹ آنا جب خسرو خندق کو عبور کر لیں پھر یہ اپنے اللہ کی نمکبانی میں ہول گے۔“

امیر خسرو نے اس سے اتفاق کیا اور اجازت لے کر اس راستے کی طرف بڑھنے لگے جو غیاث پور سے قریب تر تھا غیاث پور دہلی کے مضافات میں وہی مقام خاص ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنا خانقاہ تعمیر کیا تھی۔

حجۂ مبارک کا دروازہ بہت آہستگی کے ساتھ کھولا گیا امیر خسروؒ نے دیکھا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ شدید استغراق کے عالم میں چٹائی پر تشریف فرما تھے، ہر طرف ایک نور پھیلا ہوا تھا۔ امیر خسروؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور پھر اسی کیفیت میں آگے بڑھے اور حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ خسروؒ کے اس عمل سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی یکسوئی متاثر ہوئی آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”خسرو! تم اس وقت؟“ حضرت شیخ نے غیب سے فرمایا۔

”ہاں سیدی میں بچا رہا خسرو۔“ امیر خسروؒ کی آواز رفت آمیز تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم رورہے ہو؟“ حضرت نظام الدین اولیاؒ بے چین نظر آنے لگے۔

”سیدی! یہ درد فراق ہے جو اس غلام کو لارہا ہے۔“ امیر خسروؒ نے عرض کیا اور شیخ کی خدمت میں دست بستہ ہو کر بیٹھ گئے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ظاہری حالت بہت زیادہ گھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”تم ہم سے دور کب ہو خسرو!“ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بے قرار مرید کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔
”اگر درمیان میں ہزاروں میل کا فاصلہ بھی حائل ہو تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے ہو۔“
”سیدی! خادم اس اعزاز کے لائق نہیں تھا مگر یہ توشیح کا کرم ہے کہ دوریاں بھی قربتوں میں ڈھل گئیں۔“ امیر خسروؒ نے روتے ہوئے عرض کیا اور اپنی بے وقت آمد کا سبب بیان کرنے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے تمام واقعات سننے کے بعد فرمایا۔ ”خسرو! تم ایسے شخص کی سفارش کرتے ہو جسے فتح حاصل کرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔“

”سیدی! آپ کے غلام نے سلطان سے وعدہ کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے امیر خسروؒ زار و قطار رونے لگے۔ ”مخلوق خدا ایک جان لیوا عذاب میں مبتلا ہے۔ مغل وحشی رقص کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس وقت بھی جاگ رہے ہیں۔ شاید دہلی پر اسلامی اقتدار کی یہ آخری رات ہو۔ اگر مغلوں نے علاء الدین کے تخت و تاج کو روند ڈالا تو مسلمان منتشر ہو جائیں گے۔“

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے امیر خسروؒ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اتنے بے قرار نہ ہو خسرو! تمہارے آنسو تو ہمیں بھی رلا دیتے ہیں۔ مخلوق خدا کا خیال ہی تو ہمیں دست و مداراز کرنے کیلئے مجبور کر دیتا ہے۔ ہم اس امید پر جی رہے ہیں کہ شاید علاء الدین بدل جائے مگر آثار بہت مایوس کن ہیں۔ ہم نے تمہاری جدائی بھی محض اس لئے برداشت کی ہے کہ تم سلطان کے قریب رہ کر اسے مناسب الفاظ میں نصیحت کرتے رہو۔ ممکن ہے کہ خدا اس کے دل کو پھیر دے۔“

”شیخ! آپ کا یہ حقیر خادم کبھی اپنے فرض سے غافل نہیں رہا مگر سلطان پر بدکردار مشیروں کا بہت غلبہ ہے۔“

”ہم جاننے ہیں خسرو!“ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔

”پھر اسے سنبھلنے کا ایک اور موقع عنایت کر دیجئے۔“ امیر خسروؒ نے درخواست کی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ خاموش رہے۔

”یہ سلطنت علاء الدین خلجی کی نہیں ہے۔ اس مملکت کے تاجدار آپ ہیں۔“ امیر خسروؒ کی التجا کا انداز بدل گیا تھا۔ ”یہ آپ کی رعایا ہے جو اپنے شاہ کو مدد کیلئے پکار رہی ہے۔“
”نہیں خسرو! زمین بھی خدا کی، اقتدار بھی خدا کا اور رعایا بھی خدا کی۔“ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی

آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی اور آپ نے انتہائی پرسوز لہجے میں فرمایا۔ ”ہم تو ایک فقیر پوریا نشین ہیں، اللہ کے بندوں کے خدمت گار داتا کی جو کھٹ پر سر رکھ کر جھولی پھیلا دیتے ہیں۔ اب یہ اس کی شانِ بندہ نوازی ہے کہ وہ ہمارے دامن کو خالی نہیں رہنے دیتا۔“

”سیدی! پھر علاء الدین کے حق میں دعائے خیر فرما دیجئے۔“ امیر خسروؒ کے بستے ہوئے آنسوؤں میں شدت آگئی تھی۔ ”مغل سردار طرغی، سلطان کی بے کسی پر خندہ زن ہے اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ علاء الدین کو تباہ کئے بغیر اپنے وطن واپس نہیں جائے گا۔“

”طرغی کس شمار میں ہے؟ ایک دن بھی کچھ آجانا ہے۔“ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہرہ مبارک پر جلال روحانی نمایاں ہو گیا تھا۔ ”طرغی بھی جائے گا، حکم خدا سے جانا ہی ہوگا۔“

امیر خسروؒ ایک بار پھر حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے مرید خاص کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”خسرو! اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ بہت تھک گئے ہو۔“

امیر خسروؒ اٹھے، حضرت شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اٹلے قدموں حجۂ مبارک سے نکل کر خانقاہ کے من میں چلے آئے۔

☆ ☆ ☆

علاء الدین ساری رات جاگتا رہا۔ ایک لمحے کیلئے بھی اس کی آنکھ نہیں چپکی تھی۔ وہ بار بار اپنے محافظ سپاہیوں سے پوچھتا کہ ان لوگوں نے خسروؒ کو کس حال میں چھوڑا تھا۔ سپاہی اس کے سوا کیا بتا سکتے تھے کہ امیر خسروؒ خندق عبور کر کے رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے تھے اور مغل سپاہی غیر معمولی انداز میں چاروں طرف گردش کر رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خسروؒ مغلوں کے زرخے سے نکل کر سلامتی کے ساتھ خانقاہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔ علاء الدین حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کشف و کرامات کا قائل تھا مگر امیر خسروؒ کے عارفانہ مقام سے بے خبر تھا۔ اسے یہی خدشات گھیرے ہوئے تھے کہ کہیں یہ نابغہ روزگار شاعر مغلوں کی تلواروں کا فذ نہ بن گیا ہو۔ اسی دوران علاء الدین کے چاسوس مسلسل یہ خبریں بھی دیتے رہے کہ خندق کے قریب دشمن کے سپاہی جمع ہو رہے ہیں۔ سلطان نے مغلوں کی اس نقل و حرکت کو دیکھ کر اندازہ کیا تھا کہ آنے والی صبح اور دنوں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوگی۔ علاء الدین بہت دیر سے محل کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں باہر کی فضا کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں مگر گہری تاریکی نے ہر شے کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ سلطان پلٹ کر آیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے تمام سپہ سالاروں کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ امیران لشکر نے علاء الدین کو بتایا کہ شاہی فوج کے دستے پوری طرح چاق و چوبند ہیں اور قصر سلطانی کی حفاظت کر رہے ہیں۔

علاء الدین پر ایک عجیب سا اضطراب طاری تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے سپہ سالاروں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ ”کاروانِ شب گزرنے والا ہے ہمیں ڈر ہے کہیں سرد ہوا کے جھوکے تمہیں گہری نیند نہ ملا دیں۔ اس لئے جاگتے رہو کہ یہ رات بڑی قیامت خیز ہے۔“

امیران لشکر گردنیں جھکائے ہوئے بارگاہِ شاہی سے نکل کر اپنے محافظوں پر چلے گئے اور علاء الدین نے ملک کا فوراً سے شراب لانے کیلئے کہا۔ ”ہماری خواہش تو یہی ہے کہ ہم مغلوں کے جسموں سے خون نشید کریں اور اپنے لبریز ساغر کو منہ لگا دیں مگر کیا کریں کہ وقت بہت بے وفا ہے۔ کاش! ہمارے تمام سپاہی ہم سے آگے۔ پھر معرکہ آرائی ہوتی۔ پھر ہم ساری دنیا کو دکھائے کہ ہماری شوریہ سری اور

وحشت کا کیا معیار ہے؟“ علاء الدین خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ ملک کا فوراً سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

جب سلطان کے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ٹہلنے ٹہلنے علاء الدین کو شدید تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ملک کا فوراً آگے بڑھ کر شمعیں گل کر دیں اور پھر دیے قدموں والیں چلا گیا۔ سلطان سونا نہیں چاہتا تھا مگر تیز شراب اور پچھلے پیر کی تھنڈی ہوائے اس کی پلکوں کو بو جھل کر دیا۔ کچھ دیر کیلئے آنکھ لگی تو علاء الدین نے خواب میں ایک پرہیزگار منظر دیکھا۔

سلطان جلال الدین خلجی کا کتا ہوا سر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ علاء الدین نے وحشت زدہ ہو کر اپنے چچا کی طرف دیکھا۔ جلال الدین خلجی کے چہرے پر ناقابل بیان کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ بتے ہوئے آنسو اس کی سفید داڑھی کو بھگور رہے تھے۔ علاء الدین بدحواس ہو گیا۔ جلال الدین خلجی کا آگے بڑھتا ہوا سراچا ملک ٹھہر گیا پھر مقتول سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ایک ماتمی آواز فضاؤں میں گونجنے لگی۔

”بے وفا جیتے! تو نے یہ کیا کیا؟“

ابھی اس فریاد کی بازگشت جاری تھی کہ علاء الدین کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں تر تھا اور خوف کی ایک لہر رگ و پے میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا دیکھ کر وہ پوری قوت سے چیخا۔

”یہ شمعیں کس نے بجھائی ہیں؟ روشنی کرو۔“

ملک کا فوراً سلطان کی چیخ سن کر تیزی سے بھاگا اور خواب گاہ شامی کے فانوس دوبارہ جل اٹھے۔ روشنی ہوئی تو ملک کا فوراً نے دیکھا کہ سلطان بستر سے اتر کر فرش پر کھڑا ہے اور اس کی بے چین نظریں کمرے میں کسی شے کو تلاش کر رہی ہیں۔ جب علاء الدین نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ وہ ایک خواب تھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملک کا فوراً کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ تنہائی ملتے ہی علاء الدین دوبارہ وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ آج اس نے پہلی مرتبہ سلطان جلال الدین خلجی کو خواب میں دیکھا تھا۔

”آخر اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟“ علاء الدین اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔ اس موقع پر سلطان کو قاضی صدر الدین عارف یاد آگئے جو دیگر علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ خواب کی تعبیر کا علم بھی رکھتے تھے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو علاء الدین انہیں اسی وقت طلب کر کے اپنے بھیاک خواب کی تعبیر دریافت کرتا لیکن قاضی صدر الدین سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ علاء الدین بہت دیر تک کسی بدحواس انسان کی مانند کمرے میں ٹھہرتا رہا۔ اس خواب نے اسے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ مغلوں کی یورش کا خیال آتے ہی سلطان کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ خواب اس کے عبرتناک انجام کی پیش گوئی نہ ہو۔ جس طرح علاء الدین نے اپنے چچا کا سر کاٹ کر اودھ کی گلیوں میں پھرایا تھا اسی طرح طرغی بھی اس کی گردن جدا کر کے عوام کو ایک خون رنگ تماشا دکھا سکتا ہے۔ یہ تصور بڑا اذیت ناک تھا۔ علاء الدین کا ذہن اندیشوں سے بھر گیا اور وہ سوچنے لگا کہ ایسے عین لمحات میں یہ خواب بے معنی نہیں ہے۔ ضرور کسی آفت نامہ نگار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسووں نے دماغ میں اس طرح جگہ بنائی کہ علاء الدین شکست کے ساتھ اپنی موت کو بھی یقینی سمجھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

پھر جب ایک ایک کر کے تمام ستارے قتل ہو گئے، رات کا قافلہ لٹ گیا اور سورج نے اپنی زندگی کا

سایا دلا تو سلطان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر ابھر رہا تھا جس پر اہل دل کے سوا کسی کو یقین نہیں آئے۔ علاء الدین کے تمام سپہ سالار اور فوجی کچھ دیر کیلئے پھر کے بے جان مجسمے بن کر رہ گئے تھے۔ انہیں ایسا دوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی دل فریب خواب دیکھ رہے ہیں۔

آخر ملک نصرت خان نے علاء الدین کو یہ جاں فزاع خبر سنائی۔ ”سلطان کی بلند اقبالی نے طرغی کو مجبور دیا کہ وہ محاصرہ توڑ دے اور ناکام دنا مردا واپس لوٹ جائے۔“

علاء الدین کو اپنے سپہ سالار کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ ”نصرت خان! مسلسل شب بیداری نے مجھے حواس میں غلط ڈال دیا ہے۔“

”کسی غلام میں یہ جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ آقا کے سامنے کوئی مہمل بات اپنے ہونٹوں پر لائے۔“ رت خان نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”مغل اپنے خیمے اکھاڑ کر واپس جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“

علاء الدین یہ خبر سن کر کچھ دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین تھا اور نہ ملک نصرت خان فراہم کردہ اطلاع پر۔

”سلطان خود محض ذہن کا معائنہ فرما سکتے ہیں۔“ نصرت خان نے علاء الدین کو بے یقینی کی کیفیت سے نکالنے کیلئے رجوش لہجے میں کہا۔ ”مغل اپنے گھوڑوں پر مال و اسباب لا رہے ہیں۔ شاہ والا! انداز سفر کے سوا کسی اور بات کی نشاندہی نہیں کرتا۔“

علاء الدین شدید حیرت و سکون کے عالم میں محل سے نکلا اور پھر درمیانی فاصلے سے مغلوں کی روانگی کا نظریہ لگنے لگا۔ ”ناقابل یقین۔ انتہائی ناقابل یقین۔“ سلطان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”کون اس خبر اعتبار کرے گا کہ ہمارے دشمن نے اس وقت محاصرہ اٹھا لیا جب وہ فتح کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ سب خرت شیخی و دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ ہماری بچھائی ہوئی بساط تو الٹ چکی تھی۔“

ادھر مسلمان سپاہیوں کے دل غائبانہ طور پر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بارگاہ میں خم تھے اور ادھر رادر طرغی اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔ ”جلدی کرو۔ ہمارا سفر بہت طویل ہے۔“

مغل فوجی اپنے سردار سے پوچھ رہے تھے۔ ”کیا سب کچھ رائیگاں گیا؟ یہ راستے کی دشواریاں؟ یہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں، ہمیں کیا حاصل ہوا سردار؟“

”اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لو اور دہلی کی طرف پیٹھ کر لو کہ اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ طرغی نے اگر کہا اور مغل فوجیوں نے اپنے سر جھکا دیئے۔

☆ ☆ ☆

سردار طرغی کا چاکل محاصرہ اٹھا لینا اور مغل سپاہیوں کا اپنے وطن واپس لوٹ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ جب اہل شہر کو اس کا علم ہوا کہ وہ دو ماہ کی بدترین قید سے آزاد ہو چکے ہیں تو ہر شخص کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ ”دہلی نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے سائے میں ہے۔ اگر حضرت شیخ یہاں کے شندوں کیلئے خدا سے اس کی رحمت طلب نہ کرتے تو یہ دلکش اور باوقوف شراب تک کسی مغل میں تبدیل نہ ہوتا۔“

خود علاء الدین کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعاؤں کے بغیر وحشتوں ایہ آمدھی کسی طرح حرا کرنے والی نہیں تھی۔ اس نے مغلوں کے چلے جانے کے بعد انتہائی رجوش انداز میں

امیر خسرو کا شکریہ ادا کیا تھا مگر جب مبارکبادوں کا ہنگامہ برپا ہوا تو اس شور میں سلطان نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ ایک بار پھر محفل کیف و نشاط آراستی گئی اور ایسے ہی خمار انگیز لحاظ میں رام دیو نے اپنا ہنر دکھایا۔ وہ عمار شعبدہ باز بہت دن سے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

ایک روز ملک کافر نے رام دیو کو علاء الدین کے حضور پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان عالی مقام! اب جبکہ وہ سنگین وقت گزر چکا ہے، یہ غلام ایک ایسے راز کا انکشاف کرنا چاہتا ہے جس سے شاہ کی نئی غفلتوں کا سراغ ملتا ہے۔“

علاء الدین نے حیرت سے ملک کافر کی طرف دیکھا۔

”جب سلطان معظم مغلوں کے خلاف صف آرائی میں مشغول تھے اس وقت گیبانی رام دیو نے مجھ سے کہا تھا کہ دشمن کسی حملے کے بغیر فرار ہو جائے گا، ملک کافر، علاء الدین کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”آخر تو کیا کنا چاہتا ہے گیبانی؟“ سلطان، رام دیو سے مخاطب ہوا۔

”میں کہ میں نے آج تک ایسا بھاگ شالی (خوش نصیب) انسان نہیں دیکھا۔“ رام دیو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”چوڑ سے لے کر دہلی تک آپ کا یہ داس ریکھائیں ہی کھینچتا رہا پڑیہ لیکرس روزانہ مجھ سے سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کیا کتنی رہی ہیں۔“

”کیا کتنی ہیں یہ لیکرس؟“ علاء الدین نے رام دیو کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ سلطان کے دربار میں ہندوستان کے سب سے بڑے نجومی موجود تھے مگر وہ ستارہ شناسوں سے کوئی رغبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس نے رام دیو کی گفتگو کو جیسے سنی تھی۔

”سمرانوں کے سمرات! ہر ریکھا مجھ سے یہی کہتی ہے کہ آپ سنسار کے وجہ ہیں۔“ ”ایک رام دیو، سلطان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ”میں علم قیافہ بھی جانتا ہوں فاتح عالم۔“ رام دیو نے خوشامد کا نیا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ماتھے کی لیکرس بھی یہی کہتی ہیں کہ زمین کا ایک ایک ذرہ شہنشاہ کو سجدہ کرنے کیلئے بے قرار ہے۔“

”تیرا علم اور کیا کہتا ہے؟“ علاء الدین رام دیو کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

”سلطان کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوں گے۔“ رام دیو کی عیاریوں نے ایک اور کروٹ لی۔ ”یہ سلطان کا اقبال ہی تھا جس نے چوڑ کی تاریخ سے آزادی کا لفظ کھرچ ڈالا۔ بہترینوں کے بھجن پنڈتوں کے کیرتن اور جوگیوں کے ہاتھ سب رائیگاں گئے۔ کیا یہ اس قدر آسان تھا جیسا کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ نہیں سلطان! ہر گز نہیں۔“ رام دیو بہت زیادہ پر جوش نظر آنے لگا تھا۔ ”شاہ کاٹھنے والا ہر قدم فتح کرے۔ فاتح عالم خوابیدہ ہوں یا جاگ رہے ہوں، اقتدار ہر حالت میں آپ کی پاسپانی کرے گا۔ سلطان کس کی طرف بڑھیں یا کوئی سلطان کی طرف بڑھے، دونوں صورتوں میں مقابل کی خرابی ہے۔ شاہ جسے پسند کریں گے وہ برقرار رہے گا اور جس سے نظر پھیر لیں گے اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ مغلوں نے بھی اس وقت حملہ کیا تھا جب شہنشاہ جو خواب تھے مگر جلال شاہی نے ان کے دلوں میں خوف ڈال دیا اور وہ ناکام و نامراد لوٹ گئے۔“

”نہیں رام دیو! وہ ہماری اقبال مندی نہیں، حضرت نظام الدین اولیا کی دعا سے خاص تھی جس نے ہمارے دشمنوں کو جنگ کے بغیر پسپا کر دیا۔“ علاء الدین نے رام دیو کے خوشامد انداز کو جھٹلاتے ہوئے

کہا۔ رام دیو اس عرصے میں ملک کافر کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا اور اسے اس بات کا بھی پتا چل گیا تھا کہ علاء الدین خلیجی ایک مسلمان بزرگ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا ہے۔ ”میں شیخی بزرگی سے انکار نہیں کرتا مگر سلطان کی بلند اقبالی کسی کی دعاؤں کا نتیجہ نہیں ہے۔“ رام دیو نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”رتن سنگھ بھی میکڑوں سا دھوؤں، رشیموں، سنتوں اور مہنتوں کی دعاؤں کے سامنے میں تھا مگر کوئی اس کے اقتدار کو نہیں بچا سکا۔ اس لئے کہ وہ پیدائشی بد نصیب تھا۔ اس کی سیاہ بختی کو کسی جوگی یا پنڈت کا آشریہ واد زائل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ وہ شاہ کے قید خانے میں کسی مجرم کی طرح تازیایاں رگڑ رہا ہے۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے رام دیو! مگر شیخ نظام الدین اولیا اور ایک بت پرست جوگی کی دعاؤں میں بڑا فرق ہے۔“ علاء الدین نے ایک بار پھر رام دیو کی دلیل مسترد کر دی تھی۔

”میں ایمان اور کفر کے اس فرق کو خوب سمجھتا ہوں فاتح عالم!“ رام دیو نے اپنے چہرے پر بغیر معمولی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر انسان ذاتی طور پر خوش نصیب نہیں ہے تو پھر اسے کسی کی دعا میں گردش سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ آپ کا زانچہ پیدائش بتاتا ہے کہ دنیا میں نزول فرماتے وقت شاہ کے تمام ستارے انتہائی طاقتور تھے۔ صدیوں کے بعد ستاروں کے یہ زاویے قائم ہوئے ہیں۔ شاید آج آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے مگر آنے والا وقت ثابت کر دے گا کہ یہ زمین صرف آپ کے قدموں سے پال ہوئے کیلئے بنائی گئی ہے۔ میری گناہ گار آنکھیں آپ کی ذات میں فرشتوں اور دیوتاؤں جیسی صفات دیکھ رہی ہیں۔ بے شک! آپ آدمی ہیں مگر دنیا کے سارے انسانوں سے مختلف۔“ یہ کہہ کر رام دیو نے گردن جھکا لی۔

”تو بڑی عجیب باتیں کرتا ہے گیبانی!“ علاء الدین اچانک کچھ بے قرار سا نظر آنے لگا تھا۔ ”ملک! اعلان کر دے کہ ہم نے آج سے رام دیو کو اپنا صاحب خاص بنا لیا ہے۔“ سلطان، ملک کافر سے مخاطب ہوا۔ ”اور اسے ساری دنیا کی آسائشیں فراہم کر دے کہ یہ سلطان علاء الدین خلیجی کی عظیم الشان مملکت ہے، کسی زمیندار کی دیہاتی جاگیر نہیں۔“ رام دیو کی خوشامد رنگ لائی تھی اور علاء الدین بہت زیادہ سرشار نظر آ رہا تھا۔

رام دیو آگے بڑھ کر سلطان کے آگے سجدہ کر رہا ہو گیا۔ ”نہیں شہنشاہ! مجھے آپ کی محبت کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ میں تو دریائے جہنم کے کنارے ایک سنسان سا گوشہ چاہتا ہوں۔ جہاں بیٹھ کر ستاروں کی روشنی میں اپنے سلطان کا چہرہ دیکھتا ہوں۔“ رام دیو کی چالیں بہت گہری تھیں جنہیں اگر سلطان سمجھنا بھی چاہتا تو خوشامد کا یہ غلامانہ انداز اس کے دماغ اور آنکھوں پر سیاہ پردہ ڈال دیتا۔

علاء الدین نے رام دیو کی درخواست قبول کر لی اور ملک کافر کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”گیبانی کی اس خواہش کو پورا کیا جائے۔“

رام دیو رخصتی سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھا مگر جاتے جاتے اچانک مڑا اور سلطان سے عرض کرنے لگا۔ ”ایک اور اہم بات لیکروں نے مجھے بتائی ہے کہ آپ کے دشمن کبھی کامیاب نہیں ہوں گے لیکن وہ قبلے سلطانی کو داغدار کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثل ایک بار پھر حملہ آور ہوں گے مگر بتائی ان کا مقدر بن چکی ہے۔“ یہ کہہ کر رام دیو چلا گیا۔

فی جس کے تیز جھوکوں نے اسے زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ سلطان، علی عامر آفریدی کے خلاف ایک دناک فیصلہ کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب دربار آراستہ ہوا تو علاء الدین نے علی عامر آفریدی اور نرمل کماری کو طلب کر لیا۔ راجہ رتن سنگھ اور ام دیو بھی گواہوں کے طور پر بلائے گئے تھے۔ آفریدی کے پیروں میں زنجیریں تھیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا تخت کے نیچے تک پہنچا تھا۔ رتن سنگھ زنجیروں سے آزاد تھا مگر اس کی حیثیت بھی ایک مجرم سے زیادہ نہیں تھی۔

”آفریدی! یہ کام ہمارے لئے بہت آسان تھا کہ ہم ایک اشارہ کر دیتے اور گھوڑوں کے سم تیرے سم کو روند ڈالتے۔ ہمیں اس پر بھی قدرت تھی کہ ہم اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتے اور شمشیر فاتحی راہِ شہرگ بن اتر جاتی مگر ہماری غیرتِ شاہانہ کو یہ گوارہ نہیں کہ تجھے صفائی کا ایک اور موقع دیے بغیر موت کی نیند سلا دیا جائے۔ آخر تو ہمارا راز دار رہ چکا ہے۔“ علاء الدین نے آفریدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ تو نے ہمارے اعتبار کو کیوں فروخت کیا؟ اور دینا میں وہ کونسا خریدار ہے جو ہم سے زیادہ بت ادا کر سکتا ہے؟ بد نصیب آفریدی! تجھے کس شے کی طلب تھی؟ ہمارے دستِ اختیار میں کیا کچھ نہیں فائدہ مانگ کر تو دیکھا ہوتا۔ ہم اپنے کرم کی اتنی بارش کر دیتے کہ تیرا دامن چھلک اٹھتا۔“

”میں نے شاہ والا کے اعتبار کو کسی بازار میں نیلام نہیں کیا۔“ آفریدی کا لہجہ پر جوش تھا۔ ”والد مرحوم نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں آخری سانس تک شاہانہ خلیجی کا وفادار رہوں۔ میرے بزرگوں کو آپ کی ذات کے آئینے میں ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل نظر آتا تھا۔ اسی لئے میں جی، ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ میرے آپاؤ اجداد انعام و اکرام کے بھوکے تھے اور نہ میرے دل میں کوئی جذبہ حرص موجود ہے۔ میں اول و آخر ایک سپاہی ہوں جو اپنے امیر کے حکم پر سر فروشی کی تمنا کرتا ہے۔ مجھے جس عاذ پر بھیجا گیا تھا ہاں موت بھی تھی، تشدد تھا اور لا محدود سوائیاں تھیں۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا مگر آپ کے پرچمِ جاہ و جلال کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اگر دیارِ دشمنان میں مجھے موت بھی آئی تو اس طرح کہ میری منھیاں بند ہوتیں اور پرچمِ شاہی کو الگ کرنے کیلئے میرے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔“ یہ کہتے کہتے آفریدی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

”ہم پہلے بھی تیری لفاظی سن چکے ہیں۔“ علاء الدین غضب ناک نظر آنے لگا۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ ہم لمبی زبان رکھنے والوں کو برداشت نہیں کرتے؟“

علی عامر آفریدی حیرت زدہ رہ گیا۔ عجیب عدالت تھی کہ منصف اس کی کوئی دلیل سننے کیلئے تیار ہی نہیں تھا۔

”کیا تو اپنی نامِ نداد جاں فروشی کا ذکر کر کے ہماری ذات پر احسان کرنا چاہتا ہے؟“ علاء الدین کا لہجہ مزید قہر ناک ہو گیا تھا۔

”میں سلطان عالی مقام! میں تو اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ چند لمحوں کیلئے آفریدی کی زبان لڑکھڑاسی گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ ”مجبوراً میں نے یہ راہ اختیار کی ہے اگر منزلِ وقاسازشوں کے غبار میں گم نہ ہوتی تو میں گمراہ ہوئے زمانے کا کوئی حوالہ پیش نہ کرتا۔“

”کیا تو نے رتن سنگھ کے بھروسے دربار میں ہمیں قاتل، جابر، غاصب اور احسان فراموش نہیں کیا؟“ علاء الدین کے چہرے سے شدید نفرت و قہر کا اظہار ہو رہا تھا۔

علاء الدین تمنا تھا لیکن رام دیو کی باتیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ سلطان بچپن ہی سے سکندر بننے کا خواب دیکھتا تھا، اس کی شدید آرزو تھی کہ وہ یونانی حکمران کی طرح دہلی سے نکل جائے اور پھر ساری دنیا کو تغیر کر کے فاتحِ عالم کی حیثیت سے اپنے مرکز کی طرف لوٹے۔ اسی جذبے کی تسکین کیلئے کبھی کبھی وہ مصاحبوں کے حلقے میں اپنے آپ کو ”سکندر ثانی“ کے لقب سے پکارا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ علاء الدین نے چوتھوں میں ایک مینار تعمیر کرائی تو اس پر ”سکندر ثانی“ کے الفاظ بھی کندہ کرائے گئے۔ ”تغیر دنیا“ کی خواہش علاء الدین کے سینے کی گہرائیوں میں خوابیدہ تھی مگر رام دیو نے اسی تمنا کو جھجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ علاء الدین بستر پر لیٹے لیٹے اپنے ماضی کو یاد کرنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عام سپاہی سے سردار اور پھر ”سپہ سالار“ سے ”سلطان“ تک کا یہ طویل سفر اس طرح طے ہو جائے گا کہ کامیابیاں ہر موز پر اس کے قدم چومیں گی۔ علاء الدین کو رام دیو کی باتوں میں حقیقت نظر آنے لگی اور وہ نے انداز سے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسی دوران سلطان کی آنکھ لگ گئی اور اس نے وہی خواب دوبارہ دیکھا جو مغلوں کی روانگی سے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ مقتول حکمران جلال الدین خلیجی کا کٹا ہوا سر علاء الدین کے کمرے میں داخل ہوا اور پھر ہر طرف پر شور آوازیں گونجنے لگیں۔

”بے وفائی ہے! تو نے یہ کیا کیا کہ اسی سر کو کٹ کر کوچہ در کوچہ بھرا یا جس نے تجھے زمانے میں سربلند کیا۔ میرے بھائی کے خود غرض بیٹے! ان ہونٹوں کو دیکھ جو تیری پیشانی کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ خاندانِ خلجی کے سنگدل وارث! میری آنکھوں کو دیکھ جن میں تیرے لئے محبتوں کے کیسے کیسے دیامیوجن تھے۔ اور اب نمک حرام علاء الدین! اس سینے پر ایک نظر ڈال جسے تو نے خاک کے ڈھیر میں دبا دیا ہے۔ یہ وہ سینہ ہے جس پر تو ساری ساری رات سویا کرتا تھا۔ بد کاروں اور خوشامدیوں کے ہجوم سے بھلنے والے! کیا تو سمجھتا ہے کہ اہل ہند نے میرے قتل کو فراموش کر دیا ہے؟ اپنے عشرت کدے سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے مخلوق خدا کیا کہتی ہے؟“

اس فریاد و فغاں کے بعد جلال الدین خلیجی کا خون آلود سر غائب ہو گیا اور علاء الدین بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر تجھے تجھے قدموں سے درتے تک آیا اور باہر کی فضا کو دیکھنے لگا۔ صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس مختصر سے عرصے میں علاء الدین نے دو بار اپنے چچا سلطان جلال الدین خلیجی کو خواب میں دیکھا تھا۔ مقتول فرمانروا کے یہ الفاظ اس کے ذہن پر جم کر رہ گئے تھے۔

”اپنے عشرت کدے سے باہر نکل کر دیکھ کہ مخلوق خدا تجھے کیا کہتی ہے؟“

علاء الدین کو محسوس ہوا کہ محل کے ایک ایک درتے، ایک ایک دیوار اور ایک ایک در سے یہی آواز ابھر رہی ہے۔ اچانک اسے چوتھو کا وہ جشنِ فحیاد آگیا جب رام دیو نے کہا تھا کہ علی عامر آفریدی کی وجہ سے تمام راجپوت اسے ایک احسان فراموش اور غاصب حکمران سمجھتے ہیں۔ اپنے سفیر کا خیال آتی ہی شدید غضب سے علاء الدین کا پورا اجسم کانپنے لگا۔ مغلوں کے ہنگامے میں وہ آفریدی کو بھول ہی گیا تھا۔ آج کے خواب نے کئی تیغ یا دوں کو زندہ کر دیا۔ مائی بھان متی کا چہرہ بھی علاء الدین کی نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ پھر اسے اپنی بے کسی بھی یاد آگئی کہ وہ ایک ضعیف دانتاؤں عورت کو اس کی زہر فشانیوں کی سزا تک نہیں دے سکتا تھا۔ ہزاروں اچھوتوں کے سامنے ایک بے سہارا بوہیا اس کے جلالِ شاہی کو لٹاکر چلی گئی تھی اور وہ رعایا کے درمیان بیٹھا ہوا اپنا ہی خون پیتا رہا تھا۔ علاء الدین کے ذہن میں نفرت و غضب کی سرخ آندھی

”شاہ والا! میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ مجھ پر ایک سنگین تہمت ہے اور میرے خلاف ایک غلیظ سازش۔“

”کیا رتن سنگھ اور راجپوت سردار تیرے خلاف سازش کر رہے ہیں؟“ علاء الدین نے سوال کیا۔

”تیری ذات کب سے اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ تو سازشوں کا مرکز بن گیا۔“

”جب سے آپ نے اپنے معاملاتِ دل میں مجھے رازداری کا شرف بخشا۔“ علی عامر آفریدی اب اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔

علاء الدین کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

”رتن سنگھ مجھ سے اس لئے خفا ہے کہ میں نے رانی پد منی تک آپ کا ایک ذاتی پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی۔“ آفریدی کے صبر کا پیمانہ چمک اٹھا۔ ”راجپوت سردار مجھ سے اس لئے ناخوش ہیں کہ میں نے بھرے دربار میں آپ کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر رانی پد منی زندہ ہوتی تو شاید اس بات کا اعتراف کر لیتی کہ میرے انکار کے بعد مجھے کس طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔“ آفریدی اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا۔ ”اور مہاراج رام دیو مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ ان کے تمام جادوئی حربے ناکام ہو چکے تھے۔ یہ وہی ستارہ شناس برہمن ہے جو کل تک اپنے طلسمات کے ذریعے آپ کے اقتدار کو جلا کر خاک کر دینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ مگر آج وہ شاہ کے اتنے قریب ہے کہ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ خدا یا! یہ کیسا انقلاب ہے۔“ آفریدی نے بڑے باورسندہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں پتھر کی پھٹ اور شیشے کے فانوس حائل تھے۔

کچھ ساعتوں کیلئے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ ”آفریدی! تیرا یہ دعویٰ ابھی تشویش دہک ہے کہ تو نے ہماری خاطر دشمنوں کے مظالم پر وراثت کئے۔“ علاء الدین کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ اپنے سفیر سے مخاطب ہوا۔ ”پھر بھی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ توجہ بول رہا ہے۔“

”تو میرے میرے امیر! مجھے اس سچائی کا صلہ دیجئے۔“ آفریدی کا لہجہ انتہائی پرسوز تھا۔

”ابھی ہماری بات مکمل نہیں ہوئی آفریدی!“ علاء الدین کا انداز گفتگو تحقیر آمیز تھا۔ ”اگر غیروں کا تشدد سستے سستے مجھے موت بھی آجاتی تو یہ ایک حقیر قربانی ہوتی۔ کیا تو نے کبھی اپنی آنکھوں سے یہ منظر نہیں دیکھا کہ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو بے شمار ستارے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہم وقت کا سورج ہیں اور تو ہماری اقبال مندی کے دائرے میں تیرا تاہوا ایک کمزور اور حقیر ستارہ۔ ایک تیرے بچھ جانے سے کیا فرق پڑتا؟ تجھ سے پہلے نہ جانے کتنے ستارے گردش کرتے کرتے ختم ہو گئے، اپنے مرکز سے ٹوٹے اور ہمارے اقتدار کی لامحدود فضاؤں میں تحلیل ہو گئے۔“ آفریدی فرط حیرت سے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ آج اس نے پہلی بار مزاج شاہی کی ایک ایسی جھلک دیکھی تھی جس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

”سلطان ذی حشم! یہ تو خدائی کا انداز بھی نہیں ہوتا۔“ علی عامر آفریدی اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ”خدا نے بھی ماتمہر بنے نیاؤں کے ساتھ ایک دن ایسا مقرر کیا ہے جب وہ اپنے بندوں سے پوچھے گا کہ آج تمہاری مرضی کیا ہے؟“ علی عامر آفریدی کی گفتگو سن کر تمام اہل دربار لرز گئے۔ اب انہیں یقین آ گیا تھا کہ افغان سپہ سالار کو سلطان کے قہر و غضب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

علاء الدین کو محسوس ہوا کہ جیسے تخت شاہی اچانک جل اٹھا ہے اور جس کی گرمی سے اس کے دل و دماغ جھلس گئے ہیں۔ سلطان کی ساعت ایسے بیدار اور نازک الفاظ سے آشنا نہیں تھی۔ وہ جنگل کی آگ، پانگل

والد برق بے اماں کی طرح برہم ہو جانا چاہتا تھا مگر اس نے خلافِ عادت مبروضیہ سے کام لیا۔ دربار میں میر خسرو جیسے صوفی اور دیگر علماء بھی موجود تھے۔ علاء الدین آفریدی کی اس دلیل کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے زاویہ بدل کر علی عامر سے مخاطب ہوا۔

”ہمیں تجھ سے اس بے ادبی کی شکایت نہیں کہ تو مرضی شاہ کو سمجھنے سے عاجز رہا۔“ علاء الدین کا لہجہ بدستور غضبناک تھا۔ ”تجھ پر بنیادی الزام یہ ہے کہ تو نے دشمنوں کے درمیان اپنے فرمانروا کا مذاق اڑایا اور اس کے اقتدار کو ناجائز قرار دیا ہے۔ صریحاً بغاوت ہے اور ایک باغی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر رتن سنگھ، گیانی رام دیو اور دوسرے راجپوت سردار جھوٹے ہیں تو پھر ان گواہوں کا کیا ہو گا جو دہلی میں موجود ہیں اور تجھ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ہم شاید چوتھوئی سن جانے والی آوازوں کو فراموش کر دیے مگر جب ہر طرف ان ہی آوازوں کی بازگشت سنائی دے تو پھر یہ الزام تراشی نہیں، ایک سنگین حقیقت ہے۔“

”شاہ والا! میں اب اپنی جاں نثاریوں کا کوئی حوالہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔“ آفریدی ہواؤں کے رخ کو پہچان چکا تھا۔ ”گردشِ وقت میرے تعاقب میں ہے اور میں فرار کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی میں ان گواہوں کے روشن چہرے دیکھنا چاہتا ہوں جو دوستی کی قہاں کو نفرتوں کی تجارت کر رہے ہیں۔“

علاء الدین نے مڑ کر ملک کا فوری طرف دیکھا جو سلطان کے بائیں ہاتھ پر اگلی قطار میں کھڑا تھا۔ شہنشاہ کی بنفش چشم کے ساتھ ہی ملک کا فورا آگے بڑھا۔ تخت کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر اس جگہ کو بوسہ دیا جو سلطان کی گزر گاہ تھی۔

”فتح عالم! سردار آفریدی کے جرائم کا ایک گواہ یہ غلام بھی ہے۔“ ملک کا فورا سر جھکائے دست بستہ کھڑا تھا۔

”میں اس ہندو زوے کی شہادت تسلیم نہیں کرتا۔“ آفریدی بے اختیار ہو گیا وہ جانتا تھا کہ ملک کا فورا سلطان کی بارگاہ میں کس قدر قربت رکھتا ہے مگر آفریدی انصاف سے یاس ہو چکا تھا اور یہی شکستگی اسے ایک ایسی منزل کی طرف کھینچنے لگے جاری تھی جو تباہی اور بربادی کی منزل تھی۔

”یہ بزدل خواجہ سرا کسی مرد میدان کے کردار کی کیا گواہی دے گا؟ سلطان ذی وقار! اس سے بہتر ہے کہ کسی ثبوت کے بغیر میرے قتل کا حکم جاری کر دیں۔ میں صبر کر لوں گا کہ ایک سپاہی اپنے شاہ کی بے جا خواہشوں پر قربان ہو گیا۔“ آفریدی جذبات کی انتہائی حدوں تک پہنچ گیا تھا اور مسلسل ایسی باتیں کر رہا تھا جو اس کی موت کا سبب بنتی جا رہی تھیں۔

سلطان کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا تھا اس نے دوبارہ ملک کا فوری طرف دیکھا۔

”میں ذاتی طور پر کتنا ہی پست و ذلیل سہی مگر فتح عالم کے کرم کا ایک حوالہ ہوں۔“ ملک کا فورا بے حیائی کے ساتھ جھک گیا۔ ”اگر سردار آفریدی مجھے بے اعتبار سمجھتے ہیں تو میں ان کے قریبی دوستوں کو بھی شہنشاہ کی عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔“

”کہاں ہیں وہ گواہ؟“ علاء الدین بہت زیادہ مشتعل ہو گیا تھا۔

”اگر غلام کو معلوم ہوتا کہ فوری طور پر ان گواہوں کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ ہندو دست بہمت پہلے ہو چکا ہوتا۔“ ملک کا فورا نے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہا۔ ”سردار آفریدی نے صرف سلطان معظم کی ذات گرامی ہی کو داندھار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے کچھ بے کس و مجبور لوگوں پر بھی مظالم ڈھائے ہیں اگر شاہ والا اجازت دیں تو ان ستم رسیدہ انسانوں کو بھی عدالت میں پیش کر دیا جائے جو انصاف کیلئے ترس رہے ہیں اور سردار آفریدی کے خوف سے دربار عالیہ تک پہنچنے

سے قاصر ہیں۔ ”ملک کا فوراً اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ دس گیارہ ماہ کی طویل منصوبہ بندی پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

علاء الدین نے سر کی جنبش سے ملک کا فوراً کو اجازت دی اور علی عامر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”احسان فراموش آفریدی! تجھے چوڑی اس بوڑھی جادوگر نے ہلاک کر ڈالا۔“ سلطان کا اشارہ مافی بھان متی کی طرف تھا۔ ”ہم تیری زبان کاٹ کر پھینک سکتے تھے مگر اہل دنیا کیا کہتے کہ سلطان نے جبر و اختیار سے کام لیا اور ایک مجرم کو صفائی پیش کرنے کی مہلت نہیں دی۔ تیری زندگی کے ڈوبتے ہوئے سینے کو آج کی رات ہم اور امان دیتے ہیں۔ کل تیرے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا۔ اگر کسی ایک شخص نے بھی تیری بے گناہی پر شہادت دی تو ہم تجھے معاف کر دیں گے۔“

☆ ☆ ☆

سلطان کے اس حکم کے ساتھ ہی دربار برخواست ہو گیا۔ وہ رات علی عامر آفریدی کے ساتھ دہلی کے تمام امراء کیلئے بڑی برہول تھی۔ ایک جوان سپہ سالار کی بیباکی نے انہیں ملک کا فوراً کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا جو شرفاء کیلئے ایک سنگین خطرے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

نرملہ کاری کل سرا کے ایک تنہا کمرے میں بہت اداس تھی۔ شاہی بیگمات اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں کوئی جاسوس کنیز سلطان تک یہ خبر نہ پہنچا دے۔ اسی مجبوری نے بیگمات کے قدموں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ایک ہم جنس کو بیچ کی طرح پھلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ مگر اس کے آنسو خشک کرنے کیلئے اپنے دامن کو آگے نہیں بڑھا سکتی تھیں۔

آفریدی بھی کمرے کے فرش پر بے حس و حرکت لیٹا تھا مگر اس کا ذہن مسلسل سفر میں تھا۔ کبھی نظروں کے سامنے شائستہ بیگم کا اداس چہرہ ابھر آتا، کبھی محسوس ہوتا کہ عالیہ اس سے سرگوشیاں کر رہی ہے، کبھی یوں لگتا جیسے مافی بھان متی اسے پکار رہی ہے، کبھی نرملہ کی آواز سنائی دینے لگتی کہ سردار مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ کئی تلخ یادیں تھیں جو بہت دنوں سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ کسی کو کیا جواب دیتا؟ وقت نے تو اس کی قوت گفتاری چھین لی تھی۔ آفریدی اپنی اس مجبوری پر تڑپ کر کرٹ لیتا تو زنجیریں بڑھتی اور علی عامر کو احساس ہوتا کہ موت اس کے بہت قریب رقص کر رہی ہے۔

اسی رات ملک کا فوراً، علاء الدین کے قدموں پر سر رکھے رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا آفریدی نے چوڑا روانہ ہوتے وقت مجھے شاہ کے حوالے سے دنیا کی غلیظ ترین گالی دی تھی۔ ملک کا فوراً کے بستے ہوئے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔ ”میں اس کی طعنہ زنی کو برداشت کر گیا تھا کہ وہ رانی بدمنی کے معاملے میں آپ کے رازدار قاصد کا فریضہ انجام دے رہا تھا مگر کل دربار عام میں اس نے جس لقب سے مجھے یاد کیا ہے، میں اسے کس طرح بھول جاؤں؟“ ملک کا فوراً کی عیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔

”کیا تجھے سر لادوی کا حشر یاد نہیں؟“ علاء الدین کی ایک کسی شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔ ”سر لادوی تو آخر ہماری بیوی تھی مگر تیری خاطر ہم نے اسے بھی معاف نہیں کیا۔ پھر آفریدی سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟ ہم اسے کس طرح معاف کریں گے؟ ہرگز نہیں۔“

ملک کا فوراً کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی پہلے اس نے ساقی مری کے فرائض انجام دینے اور پھر خود بھی اپنی فتح کے نشے میں لڑکھڑاتہا تو اعرش کدے سے باہر چلا گیا۔

ملک کا فوراً کے جانے کے بعد علاء الدین، آفریدی کے بارے میں سوچنے لگا۔ سلطان کو اپنے سفیر کی

جاں نثار یوں کا خیال آ گیا مگر اس خیال کو ملک کا فوراً کے آنسوؤں نے دھندلا کر دیا۔ علاء الدین نے چند لمحوں کیلئے آفریدی کے اس گناہ سے چشم پوشی کرنا چاہی لیکن سلطان کے ذہن میں ابھرنے والا دوسرا خیال بہت اذیت ناک تھا۔ سیاسی اعتبار سے آفریدی کا قتل ضروری ہو گیا تھا۔ اگر علاء الدین اسے معاف کر دیتا تو دوسرے درباریوں کے دلوں میں غلط فہم کے جذبے پرورش پانے لگتے۔ علاء الدین نے آفریدی کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ علی عامر کی سزائے موت کے پردے میں وہ اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی علاء الدین کی خواہش تھی کہ اس کا دامن آفریدی کے خون سے پاک رہے۔

☆ ☆ ☆

دوسرا دن آفریدی کے فیصلے کا دن تھا۔ علی عامر اپنے کئی قریبی دوستوں کو دربار میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ سب کے سب اس کے خلاف گواہی دینے آئے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا جن پر نکتی تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ آفریدی کا ایک دوست سلیم، ذیشان جسے وہ اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھتا تھا، بڑے پر جوش لہجے میں بول رہا تھا۔

”سلطان عالی مقام! ہم نے اس کے باغیانہ خیالات کو بدلنے کی بہت کوشش کی مگر وہ فطرۃً مجرم ہے۔ ہم نے اسے شاہ کے احسانات یاد دلانے مگر یہ عادت خود غرض ہے۔ اس کا کوئی کردار نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس سے ترک تعلق کر لیا تھا۔“

اہل دربار اپنی اپنی نشستوں پر ساکت بیٹھے تھے۔ پھر اس سکوت کے قلب میں علاء الدین کی پرہیزگارانہ آواز نے گہرے شکاف ڈال دیے۔ ”کیا یہ تیرے دوست نہیں؟“

اس سے پہلے کہ آفریدی کوئی جواب دیتا، سلیم، ذیشان بول اٹھا۔ ”نہیں شاہ! ہم اس کے دوست نہیں، آپ کے غلام ہیں، ازلی غلام۔“

”کیا تجھے ابھی کوئی اور گواہی درکار ہے؟“ علاء الدین نے غضب ناک ہو کر آفریدی سے پوچھا۔ ”نہیں شاہ والا!“ یکایک آفریدی کی آواز سخت ہو گئی تھی۔ ”جب میرے اعضاء ہی میرے خلاف گواہی دینے لگے تو پھر اس زمین پر مجھ سے بڑا گناہ گار کون ہے؟“

ابھی آفریدی کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک برق پوش عورت دربار میں داخل ہوئی اور تخت کے نیچے فرش پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”یہ کون ہے؟“ علاء الدین نے چونک کر پردہ دار خاتون کی طرف دیکھا۔ عورت سجدے کی حالت سے اٹھ کر میدھی ہوئی اور فریاد کرنے لگی۔ ”شہنشاہ! مجھے بھی انصاف چاہئے۔ میرا بڑا مجرم اس وقت آپ کی عدالت میں کھڑا ہے۔“ عورت نے علی عامر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سردار آفریدی میری حقیقی خالہ اور ان کے تین بچوں کا قاتل ہے۔“ ”اتنا کہہ کر عورت نے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا اور آگے بڑھ کر سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔ ”یہ کیا ہے؟“ علاء الدین حیران تھا۔

”آفریدی کے جرائم کی دستاویز۔“ برق پوش خاتون نے لرزتے ہوئے کہا۔ سلطان کے حکم پر اس کاغذ کو کھول کر سردار بڑھا گیا۔ یہ وہی خط تھا جو ملک کا فوراً کے سپاہیوں نے درباری رقاہ زہرہ جمال سے جبراً تحریر کرایا تھا۔

ملکت کے اس غدار پر پانچ موتیں بیک وقت نازل ہونی چاہئے تھیں مگر ہم اس کی گزشتہ خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے چار موتیں معاف کرتے ہیں۔ اسے صرف ایک موت دی جائے۔ پھر اس کی لاش کو گلی گلی پھرایا جائے کہ سلطان کے اقتدار کو ناجائز کئے والے کی سزا جتنی ہی دردناک ہوتی ہے۔“

سلطان کا فیصلہ سن کر اہل دربار لرز اٹھے۔

نرملہ جس نے مصائب کے کئی طوفان دیکھے تھے، غموں کے آخری سیلاب کو برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر کسی کمزور دیوار کی طرح گر گئی۔

”اسے اٹھا کر حرم سرا میں پہنچادو۔“ علاء الدین نے سخت لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

آفریدی، نرملہ کی حالت دیکھ کر ناقابل بیان اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے علاء الدین سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان! مجھے نرملہ سے ملنے کی اجازت دی جائے کہ میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

علاء الدین نے بڑی بے رحمی سے آفریدی کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ محبت کے معاملے میں وہ خود محرومی کا شکار تھا اس لئے دوسروں کے احساسات سے بھی بے خبر تھا۔

”میری والدہ اور بہن ہانسی میں مقیم ہیں انہیں دہلی طلب کر لیا جائے تاکہ میں آخری بار انہیں دیکھ سکوں۔“ علی عامر آفریدی نے لرزتی ہوئی آواز میں دوسری درخواست کی۔

علاء الدین کچھ سوچنے لگا۔ اس کے چہرے کی سختی کسی قدر کم ہو گئی تھی وہ اس سلسلے میں کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ ملک کا فخر کا خادم خاص نور الدین نور افروز ابول اٹھا۔

”مغلوں کی روانگی کے بعد میں اپنے کچھ عزیزوں سے ملنے کیلئے ہانسی گیا تھا۔ وہاں حملہ آور وحشیوں نے وہ تباہی مچائی تھی کہ محلے کے محلے نذر آتش کر دیئے تھے۔ جہاں سردار آفریدی کا مکان تھا وہ پورا علاقہ جلے ہوئے کوئلے کی کان معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص زندہ بچا ہو۔ پھر بھی حضور والا سپاہیوں کو بھیج کر تحقیقات کرائیں۔“

علی عامر آفریدی کی نظروں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی وہ لڑکھڑاکر فریادیں مچا رہا تھا۔ زنجیریں بجا رہیں۔ عجیب تماشا تھا۔ تمام درباری سانس روکے ہوئے اس جاننا سپہ سالار کو دیکھتے رہے جو کل تک سلطان کا راز دار تھا آج اس پر مسلسل عذاب نازل ہو رہے تھے۔

آفریدی سنبھل کر اٹھا اور اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرنے کی کوشش کی۔ زنجیروں کی جھنکار سے دربار شاہی گونج اٹھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے حق میں دعائے خیر کر رہا تھا۔ لوگوں نے صرف اس کے ہونٹ لرزتے ہوئے دیکھے۔

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی وہ اسے قید خانے میں واپس لے جانا چاہتے تھے۔ علاء الدین کے حکم کے مطابق آفریدی کو صبح سورج نکلنے سے پہلے قتل ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ سپاہی اسے پکڑ کر کھینچتے وہ سنبھل گیا۔

”سلطان! یہ بھی رسم دنیا ہے کہ مرنے والے سے اس کی آخری خواہش معلوم کی جاتی ہے۔“ آفریدی کا لہجہ بے نیازانہ تھا۔ موت کو اتنے قریب پا کر اس نے سارے تکلفات اٹھا دیئے تھے۔

”رحم کی درخواست کے سوا اپنی ہر خواہش بیان کر۔“ علاء الدین نے بڑا جارحانہ جواب دیا۔

”کاش! میں اپنے خدا کا وفادار ہوتا تو اس قدر رسوائی کی موت نہ مرتا۔“ آفریدی کے لہجے میں کرب

”شاہ والا کو خبر ہو کہ سلطنت خلجی کے ایک معتمد سردار علی عامر آفریدی نے میری بے آبروئی کی۔ میں اس جارحیت کی داستان سنا کر سلطان معظم سے انصاف چاہتی تھی مگر وہ اتنا با اثر تھا کہ عدالت عالیہ تک میری رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آفریدی مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر کے جائز حقوق دیدے لیکن وہ سنگدل اور بے کردار انسان ہے۔ آخر تمام راستے بند پا کر میں اور میرے گھر والے ایسے راستے پر جا رہے ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد میں، میری اندھی ماں، چھوٹی بہن اور بھائی ٹالانوں کی اس ہستی سے بہت دور چلے جائیں گے۔ پھر سر محشر میرے ہاتھ میں سلطان معظم کا گریبان ہو گا۔ میں انصاف طلب کروں گی اور میرا خدا ان سب لوگوں سے ایک ایک ذرے کا حساب لے لے گا جو اس ظلم میں شریک رہے ہیں۔“ سلطان علاء الدین خلجی کے دربار کی ایک ادنیٰ رقاہ زہرہ جمال۔“

خط کیا تھا! الفاظ کا ایک آتش فشاں تھا جس کے اثر سے پورے دربار پر لرزہ ساٹاری ہو گیا تھا۔

”کیا زہرہ اور اس کے گھر والے قتل کر دیئے گئے۔“ آفریدی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار اس کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہو گئے جو علاء الدین اور دوسرے درباریوں کو شہادت میں مبتلا کرنے کیلئے کافی تھے۔

نرملہ کماری نے بھی آفریدی کے یہ الفاظ بڑی حیرت سے سنے تھے اور پہلی بار اس کے ذہن میں بدگمانیوں نے گروٹ لی تھی۔

”ہم تجھے حکومت کے غدار کی حیثیت سے سزا دیں یا چار انسانوں کے قاتل کی حیثیت سے؟“ بالآخر علاء الدین کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”تو کیسا فریب کار تھا آفریدی؟ ہماری نگاہیں بھی دھوکا کھا گئیں۔“

علی عامر نے نرملہ کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے کو مایوسیوں کے غبار نے گھیر لیا تھا۔ آفریدی کی تھکی ہوئی نظریں واپس لوٹ آئیں۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر اہل دربار پر نگاہ کی۔

”کیا موت کے احساس نے تجھ سے تیرے حواس چھین لئے ہیں؟“ آفریدی کی یہ اضطرابی حرکت دیکھ کر علاء الدین نے پوچھا۔

”نہیں شاہ والا! آپ کے جاں نثار موت سے نہیں گھبراتے۔“ آفریدی کے لہجے میں وہی اہل وفا کے لفظوں کی خوشبو تھی۔ ”میں قویہ دیکھ رہا ہوں کہ میری جان ناتواں پر اور کس کس کا قرض باقی ہے؟ بظاہر تو سب نے اپنے اپنے حسابات طلب کر لئے۔ پھر بھی سوچتا ہوں کہ شاید کسی کا ہاتھ میرے گریبان تک پہنچے سے رہ گیا ہو۔“

علاء الدین نے آفریدی کی اس جذباتی گفتگو پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب وہ نرملہ کماری سے مخاطب تھا۔

”تو اسی منافق کے کردار سے متاثر ہو کر ایمان لائی تھی؟“ سلطان اس راجحیت زادی کو ذلیل کر رہا تھا جس نے چوڑے جشن فتح میں انتہائی بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

نرملہ خاموش کھڑی رہی۔ شدت غم سے اس کا چہرہ سیاہی مائل نظر آ رہا تھا اور آنکھوں سے ایک ناقابل بیان ویرانی برس رہی تھی۔

علاء الدین کی نظروں کا زاویہ تبدیل ہوا۔ پھر اس نے آفریدی کی سزائے موت کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”اعتبار کے رہزن کی سزا موت۔ چار انسانوں کے قتل کی سزا موت۔ ہمارے قانون کے مطابق

پہلے کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ اس کیلئے سلطنت کے ایک معتد سردار کی موت کا حکم کسی کیڑے کی موت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ہندوستان کے حکمران کو یہ احساس تک نہ ہوسکا کہ اقتدار کی ضرب سے ٹوٹ کر بکھر جانے والا کون تھا؟

علی عامر آفریدی کو اسی تاریک کمرے کے حوالے کر دیا گیا جہاں وہ دو ماہ سے ایک لعنت زدہ مجرم کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا اب حیات و موت کے درمیان صرف ایک رات کا وقفہ تھا۔

☆ ☆ ☆

سورج بجھ گیا اور اندھیرے طلوع ہو گئے۔ ملک کافور کی خوش ناقابل بیان تھی وہ شراب کے نشے میں بدست رام دیو کے سامنے بیٹھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا۔ ”گیانی! میں جسے ڈس لوں وہ پانی بھی نہیں مانگتا۔“ ملک کافور کی آواز نشے کے اثر سے لڑکھڑاہی تھی۔

”بے شک! مستقبل کے شہنشاہ کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہونی چاہئے۔“ رام دیو نے اپنی گردن میں پڑی ہوئی یا قوت کی مالا سے پھیتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی شراب کے نشے میں بدست تھا۔

”میرے کانے کانے کوئی تریاق ہے اور نہ کوئی منتر۔“ ملک کافور بدستی کے عالم میں کھلتا جا رہا تھا۔

”گیانی! میرے دکھ کو کوئی نہیں جانتا۔ مجھے اپنا اتیت (ماضی) یاد آتا ہے۔ ہائے کیسے سترے زمانے تھے؟ کیسا خوبناک بچپن تھا؟ بے خبری کے چکیلے دن تھے اور سکھ کی لمبی راتیں تھیں۔ پھر میرے گھر پر آکاش سے دکھوں کی درشا (بارش) ہونے لگی۔ ماں باپ بھوک کا شکار ہو گئے۔ پیٹ کی آگ نے انہیں

مجبور کر دیا کہ وہ میرا بیویا پار کریں اور مجھے کسی دھنوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔“ شراب اپنا رنگ لاری تھی اور ملک کافور ہستتا جا رہا تھا۔ ”آخر میرا سودا ہو گیا اور گجرات کے ایک ساہو کار منڈلال نے مجھے خرید لیا۔

منڈلال بڑا اوباش انسان تھا۔ اس نے اپنی دولت کا سہارے کر گھر کے گھر برباد کر ڈالے تھے مگر جس طرح مجھے برباد کیا گیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی گیانی!“ ملک کافور، رام دیو کو اپنی تباہیوں کی داستان سنا رہا تھا۔

”منڈلال کی بستی بیویاں تھیں جو ہر وقت جدائی کی آگ میں جلتی رہتی تھیں۔ اس ظالم ساہو کار نے ان سب کو مختلف چار دیواریوں میں اس طرح قید کر رکھا تھا جیسے وہ احساسات و جذبات رکھنے والی زندہ عورتیں نہ

ہوں، بے زبان گائیں ہوں۔ منڈلال کو میرے بے پناہ حسن اور چڑھتی ہوئی جوانی سے خطرہ تھا اس کی کئی بیویاں میری طرف نظر التفات سے دیکھتی تھیں اور پھر اسی لغزش نگاہ نے مجھے بدترین مخلوق بنا دیا۔ میں زندہ

در گور ہو گیا اور جیتے جی قتل کر دیا گیا۔ منڈلال نے مجھ سے میری مردانگی چھین لی میں ایک کمزور اور بے سہارا لڑکا تھا جسے اقتدار اور ظلم کی ہوائیں کوچہ بہ کوچہ اڑائے پھرتی تھیں۔ اچانک انقلاب کی سیاہ آندھی نے مجھے

گجرات سے اٹھا کر ”قصر ہزار ستون“ کے دروازے پر پھینک دیا۔ میں سلطان معظم کا احسان مند ہوں کہ شاہ نے ایک خواجہ سر غلام کو مخصوص اعزاز بخشا اور راستے کے پتھر کو اٹھا کر بلند ترین مقام پر نصب کر دیا۔

آج مجھے دنیا کی ہر نعمت میسر ہے لیکن میرا مذہب سیاست کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کل میں غریب گوبی رام تھا لیکن دنیا والے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آج میرا نام ملک کافور ہے مگر دہلی کے سردار مجھے ایک کتے سے

بھی زیادہ حقیر سمجھتے ہیں۔ بیگمات شانی میری جان کی دشمن ہیں۔ کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اگر انہیں موقع میسر آجائے تو وہ میرے جسم کا گوشت کوچ کر جانوروں کو کھلا دیں۔“ یہ کہتے ہی ملک کافور چونک اٹھا اور اس نے گہرا کر چاروں طرف دیکھا۔

”کوئی نہیں ہے سہرا! ہمارے سوا اس کمرے میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔“ رام دیو نے ملک کافور کو

بھی تھا اور نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ بھی۔

”یہ رسوائیاں تو نے خود خریدی ہیں۔“ علاء الدین کی آواز سے وہی غرور جھلک رہا تھا جو ایک آمر کی خاص پہچان ہے۔

”نہیں شاہ! میرا کوئی ذکر نہیں کہ میں تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔“ آفریدی ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

”مجھے اس وقت سے ڈر لگتا ہے جب گجرات کا یہ ہندو زادہ بڑے بڑے شرفاء کی پگڑیاں اچھالے گا۔ میں نے شاہ والا کو اتنا کمزور کبھی نہیں دیکھا ہے۔ میری لاش پر ماتم کرنے والے تو اٹھ گئے مگر میں اس حکمران کا

مرثیہ پڑھتا ہوں جو ایک بے حیاء غلام کی آنکھوں سے دیکھے اسی کے کانوں سے سنے اور اسی کے دماغ سے سوچے۔ میرے مردہ جسم کی تشہیر کرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سلطان ذی وقار! اس کو دریائے جمن میں غرق کر دیجئے کہ یہ بڑا فتنہ ہے۔“ آفریدی نے ملک کافور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور رام دیو کو

بھی کہ یہ اپنے دور کا عبداللہ بن ابی ہے۔“ (عبداللہ بن ابی عمر رسالت میں منافقوں کا سردار تھا۔ علی عامر آفریدی نے رام دیو کے متعلق اسی مناسبت سے یہ تشبیہ استعمال کی تھی)

”اسے ہمارے سامنے سے لے جاؤ کہ موت کے تصور نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں؟“ علاء الدین نے چیخ کر کہا اور سپاہی حکومت کے معتب کو کھینچنے لگے۔

علی عامر آفریدی نے اپنے قدموں کو جمانے کی کوشش کی اور بلند آواز میں حضرت امیر خسروؒ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”امیر! آپ کے سوا یہاں اہل دل کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں

کہ میری آواز اس تک پہنچ نہیں سکی۔ اگر آپ کو موقع مل جائے تو تڑپا سے کہہ دیجئے گا کہ وہ چوڑی طرف واپس لوٹ جائے۔ میں شرمسار ہوں کہ میں نے بحیثیت مسلمان اسے بہت مایوس کیا۔“ آفریدی کی آواز

گوں جری تھی پھر یہ آواز زنجیروں کے شور میں ڈوب گئی۔

سپاہی اسے بڑی بے دردی کے ساتھ کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے اور آفریدی جاتے جاتے ایک بار پھر چیخ اٹھا اس کے ہونٹوں پر محمد بن قاسم کا وہی شعر تھا جسے وہ عظیم سپہ سالار واسطہ کے قید خانے میں پڑھا کرتا تھا۔

”اے زمانے تجھ پر افسوس کہ تو شرفاء کے حق میں بڑا ہی بددیانت ہے۔“

سپاہی علی عامر آفریدی کو کھینچتے ہوئے دربار سے لے گئے مگر دیر تک حاضرین کی سماعتوں میں اس کی بارعب آواز گونجتی رہی۔ ایک فرمانبردار بیٹے اور عسکرا بھائی کی حیثیت سے آفریدی کی حالت اس وقت

گھوم گئی تھی جب نور الدین نورائے شانت بیگم اور عالیہ کے جل جانے کی المناک خبر سنائی تھی۔ یہ انتہائی نازک اور جذباتی رشتے تھے وہ اپنی ماں بہن کے ساتھ اس وحشیانہ سلوک پر سردار پر ماتم کرنا چاہتا تھا مگر خاندانی

غیرت و شجاعت نے اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ سینے میں ایک حشر سا رہا تھا، شکایتوں کے سیکڑوں طوفان اٹھ رہے تھے مگر کسی کے سامنے زبان کھولنا۔ کچھ دیر سر ٹکراتا رہا کہ شاید کسی کے دل میں

گداز پیدا ہو جائے مگر فطرت نہیں بدلتی۔ علی عامر کو شکست ہوئی۔ وقت کے اندھیروں سے اتنے ہاتھ پر آمد ہوئے کہ وہ کسی کو پہچان بھی نہ سکا۔ ہر ہاتھ میں زہر آلود خنجر تھا اور تمام وارپٹ سے کئے گئے تھے یہاں تک کہ سارے نشترے رگ رگ میں اتر گئے یا دل میں پیوست ہو گئے۔ موت اس کا مقدر بن چکی تھی آفریدی نے

مردانہ وار موت کو گلے سے لگایا اور پھر علاء الدین سے وہ باتیں بھی کہہ گیا جسے کوئی شہنشاہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دربار پر خاست ہو تو سلطان اس طرح بے نیازانہ اٹھ کر اپنے عشرت کدے کی طرف چلا گیا جیسے کچھ دیم

خت سزا دی جائے گی۔ علاء الدین کا یہ بوجہ جرات مندانہ اقدام تھا۔ اس نے ہندوستان کے کوپے کوپے میں پائی جانے والی کیف و نشاط کی محفلوں کو برباد کر دیا اور خصوصاً مسلمان قوم کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ تمام متبذخہ علاقوں میں ”شراب بندی“ کے احکام بھیجے گئے۔ شاہی فرمان کے الفاظ اتنے سخت تھے کہ کوئی شخص بھی انکار کی جرات نہ کر سکا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے شراب نکال کر اس طرح گلی کوچوں میں بہائی کہ برسات کے موسم کی مانند ہر طرف کچھری کچھری نظر آتی تھی۔ شراب پینے والے بڑی حسرت سے اس منظر کو دیکھتے اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتے۔

”کاش! ہم مٹی ہوتے۔ کاش ہم مٹی ہوتے۔“

چوکیدار بڑی سختی کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ شراب کا کوئی برتن شہری حدود میں داخل نہ ہونے پائے اگر کبھی کوئی شخص گھاس، نکڑیوں اور دیگر سامان کے اندر شراب چھپا کر شہر میں لے جانے کی کوشش کرنا تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ چوکیدار ایسے مجرموں کو فوراً تازہ لینے اور شراب چھین کر ترقی سرکار ضبط کر لیتے۔ یہ ساری شراب شاہی قیل خانے میں بھیج کر ہاتھیوں کو پلائی جاتی۔ ان تماشہ خانگی تدابیر کے باوجود بھی کچھ لوگ کسی نہ کسی بہانے شراب لے آتے تھے اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر ساغر و میناسے دل بہلاتے تھے۔ ان بد مستوں کو قید و بند کی سختیوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا اور نہ وہ اپنی ذلت و رسوائی سے ڈرتے تھے۔ جب علاء الدین کو ان لوگوں کی ایسی دلیرانہ حرکتوں کا علم ہوا تو اس نے نیا حکم جاری کیا کہ ”بدایوں دروازے“ کے قریب جو شاہراہ عام پر واقع ہے، ایک کنواں کھودا جائے اور تمام تافرانوں کو اس کنویں میں قید کر دیا جائے۔ سلطان کے اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ قانون توڑنے والے شرابی اس عجیب و غریب قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ کنویں کے اکثر قیدی تو سیری کے دوران ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے اور جو لوگ اس قید سے رہائی حاصل کر لیتے تھے ان کی صحت اس قدر خراب ہو جاتی تھی کہ وہ برسوں اپنا علاج کراتے۔ تب کہیں چلنے پھرنے کے قابل ہوتے۔ جب علاء الدین نے دیکھا کہ ملک سے شراب نوشی کی لعنت تقریباً ختم ہو چکی ہے اور اس سلسلے کے احکامات پر سختی کے ساتھ عمل کیا جانے لگا ہے تو اس نے اتنی نرمی برتتے ہوئے یہ اجازت دیدی کہ اگر امراء اور وزراء اپنے گھروں میں شراب پینا چاہیں تو پی سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ دہرا قانون تھا لیکن پھر بھی تاریخ غلاء الدین کے اس کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتی کہ اس نے عیش و عشرت کی عام محفلیں تباہ کر ڈالیں اور اپنی رعایا کو بربادی کے تاریک غاروں سے نکال کر ایک صحت مند معاشرے کو جنم دیا۔ ملک کا فوراً اور رام دیو ایسی دہرے قانون کی وجہ سے آزادانہ طور پر شراب پی رہے تھے۔ یہ رات ان تمام خوشامدی امراء کیلئے جشن کی رات تھی جو علی عامر آفریدی سے اس کی بچائی اور بیباکی کے سبب نفرت کرتے تھے۔ آج ان پر انکی اٹھانے والا موت کے قریب کھڑا تھا۔

”کیسا حق نوجوان تھا؟“ ملک نصرت خان نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں علی عامر کے انجام سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ نصرت خان!“ ایک امیر نے کیف و مستی کے باوجود چونکتے ہوئے کہا۔ ”آفریدی کی موت بہر حال ایک سچے انسان کی موت ہے۔ وہ جاتے جاتے بھی ہمیں خبردار کر گیا ہے۔“

”جئے اپنی خبر نہ ہووہ دوسروں کو کیا خبردار کر سکتا ہے؟“ ملک نصرت خان نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ”سرداری کے منصب پر پہنچ کر وہی لوگ ہوش و حواس میں رہ سکتے ہیں جن کے دل سمندر کی مانند ہوتے ہیں۔“ ملک نصرت خان، علاء الدین کا مصاحب خاص تھا، اس لئے حقیقت سے منہ موڑ کر سلطان کی

مکمل طور پر پیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور اس خواجہ سرا غلام کو شہنشاہ کہہ کر پکارنے لگا۔

”آہستہ بول گیانی! آہستہ بول۔“ ملک کا فوراً بد حواس ہو گیا۔ ”ایک داس کو سر اسٹا کہتا ہے۔ اگر کسی نے سن لیا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ تیری لاش بھی شاہراہوں پر پھینچی جا رہی ہوگی اور میں بھی سولی پر لٹکا ہوا نظر آؤں گا۔“

”تو گویا رام ہے اور میں رام دیو۔“ عیار شعبہ باز مسکرایا۔ ”دونوں بھارت ورتش (ہندوستان) کے اتھاس (تاریخ) میں امر ہو جائیں گے۔ تجھے ہجرات یاد آتا ہے اور مجھے چوڑ۔“ دونوں کا دلی سے کوئی سبب نہ تھیں۔ تیرا بھی ایمان ہوا ہے اور میرا بھی۔ تجھے بھی بدلہ لینا ہے اور مجھے بھی۔ آنے والے دن کا انتظار کرو وہ دن بہت قریب ہے۔“ یہ کہہ کر رام دیو شراب کا پیالہ بھرنے لگا۔

”میرا ایک دشمن تو ٹھکانے لگ گیا گیانی!“ جو شہزادہ میں ملک کا فوراً کچھ اور سرخ ہو گیا تھا۔ ”کل صبح ہوتے ہی اس کا سر نیزے پر بلند ہو گا اور لاوارث جسم پر مردہ خور پرندے منڈلا رہے ہوں گے۔“ علاء الدین کا خواجہ سرا غلام مستی میں بھوم رہا تھا۔ ”اس کی ماں اور بہن کی تورا کہ بھی منتشر ہو چکی ہوگی۔ وہ اسلام کے بہت دعوے کرتے تھے میں نے ان پر آگ کا عذاب نازل کیا۔ وہ آگ جو ہمارا مقدس نشان ہے۔“

”آگ ہی غالب رہے گی گویا رام!“ تکلفات کے پردے ہٹ چکے تھے اور دونوں منافق شاہی محل کے ایک کمرے میں اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔

”اگر دیوتا مجھے شہتی دیتے تو میں آفریدی کے جسم کو بھی آگ لگا دیتا۔“ ملک کا فوراً چانک بہت زیادہ غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔

”دھیرج گویا رام! دھیرج!“ رام دیو نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

بار بار گویا رام کا لفظ سن کر ملک کا فوراً کے تصور میں ساہو کار مندرال کا چہرہ ابھرنے لگا جو مرنے سے قبل ایک بار دہلی آیا تھا اور رخصت ہوتے وقت اس نے ملک کا فوراً سے کہا تھا۔ ”تو گویا رام ہے اور گویا رام ہی رہے گا۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے گیانی! میں اول و آخر گویا رام ہوں اور اسی گویا رام نے علی عامر آفریدی کا نام و نشان تک مٹا دیا۔“ ملک کا فوراً اس طرح کہہ رہا تھا جیسے اس نے کسی خونریز جنگ کے بعد عظیم الشان فتح حاصل کر لی ہو۔

”آفریدی کا ذکر کیوں کرتا ہے کہ وہ تو ریت کی ایک دیوار تھی، تیز ہوا چلی، بیٹھ گئی۔ ان پہاڑوں کی طرف دیکھ جو تیرے راستے میں سر اٹھائے کھڑے ہیں۔“

”دیکھ رہا ہوں۔ گیانی! بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔“ ملک کا فوراً نے ایک اور جام لبریز کرتے ہوئے کہا۔ ”تو آگے بڑھ اور ان پہاڑوں کی گردیں تراش دے۔“ رام دیو کیف و مستی کی تیر لہریں ڈھٹا جا رہا تھا۔ اس نے شراب کی ایک صراحی اٹھا کر ملک کا فوراً کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے تیشہ بنالے گویا رام اور پہاڑوں کے جگر کاٹ دے۔“ رام دیو کے ہوش و حواس گم ہوتے جا رہے تھے۔

سرکاری طور پر شراب نوشی حرام قرار دے دی گئی تھی۔ علاء الدین نے اقتدار حاصل کرنے کے کچھ دن بعد ہی اس غلیظ رسم پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ایک مجمع عام میں اعلان کیا گیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ (حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی) اس حکم کے بعد اب اگر کوئی شخص شراب پیچے گا یا پیسے کا تو اسے

طرفداری کر رہا تھا۔

”میاں شاہ کا ذکر نہیں۔“ دوسرے امیر نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”بات اس ہندو زادے کی ہو رہی ہے جس نے ایک بہادر سپہ سالار کے خلاف سازش کی اور کامیاب ہو گیا۔“

”کوئی سازش نہیں۔“ آفریدی جھوٹا ہے۔“ نصرت خان نے برم ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس قابل ہی کہاں ہے کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جاسکے۔“ ملک نصرت خان علاء الدین کی زبان میں بول رہا تھا۔ ”کچھ بھی کہو نصرت خان!“ تیسرے امیر نے محفل طرب سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج یا کل ہماری باری ہے۔“

ملک نصرت خان نے جواب میں قہقہہ مارا اور پھر جام ہلکنے لگے۔

علاء الدین کے دوسرے امراء کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے نزدیک آفریدی کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ سیاست کے میدان میں کم و بیش روزانہ ہی ایسے کھیل کھیلے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں تو افغان سپہ سالار کی زبان سے ادا ہونے والے وہ الفاظ پریشان کر رہے تھے جو ملک کا فورے بارے میں سرد رہا کر کے گئے تھے۔

”میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں سلطان جب یہ ہندو زادہ بڑے بڑے شرفاء کی پگڑیاں اچھالے گا۔“

☆.....☆.....☆

شاہی حرم سرا میں بہت زیادہ بے چینی پائی جاتی تھی۔ علاء الدین کی بیگمات علی عامر آفریدی کے انجام سے غمزدہ نظر آرہی تھیں مگر ان کے تاثرات بھی بڑے عجیب تھے وہ اس لئے اداس نہیں تھیں کہ ایک بہادر سپہ سالار ناکرہ دہ گناہی کے صلے میں مارا جا رہا تھا۔ بیگمات کی افسردگی کا سبب یہ تھا کہ ان کا رقب ملک کا فورے ایک بار پھر سرخرو ہو کر ابھر رہا تھا۔ سر لادپوی کی موت کے بعد یہ دوسرا واقعہ تھا جب سلطان نے ملک کا فورے کی وجہ سے اپنے ایک اور جاں نثار کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

ہر شخص کو اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی فکر تھی مگر کچھ لوگ مکمل طور پر بے حس نہیں ہوئے تھے ان کے سینوں میں دل دھڑک رہے تھے اور دلوں میں یہ احساس باقی تھا کہ ایک بے گناہ شخص حملاتی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی موت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ لوگ آفریدی کے انجام پر خلش محسوس کر رہے تھے مگر اس کے غم کو بانٹنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے دلوں میں درد کی لہریں اٹھتی تھیں مگر زبانیں اس نا انصافی کا ماتم نہیں کر سکتی تھیں۔ علاء الدین کے درباریوں میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو علی عامر آفریدی کے قتل کا حکم سن کر رونے لگا پھر اس نے فوراً ہی اپنے آنسو رومال سے خشک کر لئے تھے کہ کہیں علاء الدین کے جاسوس بتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لیں اور اس کیلئے کوئی نئی مشکل کھڑی ہو جائے۔ یہ شخص سلطان کا ہم نام ملک علاء الدین کو قاتل شہر تھا۔ عرف عام میں اسے علاء الملک کہتے تھے۔ بہت زیادہ موٹا ہونے کے سبب وہ آسانی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے سینے میں ایک دوبار ہی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دہلی کی یہ مخصوص رسم تھی کہ نیا چاند دیکھ کر تمام امراء، وزراء اور علماء پہلی تاریخ کو سلطان کے سلام کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ علاء الملک بھی پابندی سے پہلی تاریخ کو دربار میں حاضر ہوتا اور آداب شاہی بجالاتا۔

جس روز علی عامر آفریدی کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا، اس دن علاء الملک خاص طور پر دربار شاہی میں حاضر ہوا تھا۔ اس نرم دل کو قاتل کو علی عامر آفریدی سے اپنے بیٹوں۔ ن طرح محبت تھی وہ

افغان سپہ سالار کی شجاعت اور بلند کرداری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علاء الملک دل ہی دل میں آفریدی کی کامیابیوں کیلئے دعائیں کرتا تھا مگر جب چانک وقت کے بے رحم ہاتھوں نے زندگی کی بساط الٹ دی تو دہلی کا کو قاتل اپنے سینے میں درد کا ایک طوفان چھپائے اٹھ کھڑا ہوا۔ راستے بھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ گھر پہنچا تو علاء الملک کی یہ حالت دیکھ کر بیوی بچے پریشان ہو گئے۔ اہل خانہ کے بار بار پوچھنے پر بھی علاء الملک نے انہیں اپنی اشک ریزی کی وجہ نہیں بتائی۔ وہ رات گئے تک تنہا کمرے میں اداس بیٹھا رہا۔ علاء الملک کی بیوی شمسہ تاجدار بیگم ہمت کر کے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

آخر ہمت اصرار کے بعد علاء الملک نے اپنی بیوی کو آفریدی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”تاجدار! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے میرا ایک بیٹا قتل کر دیا جائے گا۔“

شمسہ تاجدار بیگم بھی افسردہ نظر آنے لگی۔

”تم آفریدی کو نہیں جانتیں تاجدار!“ علاء الملک کی آواز کانپ رہی تھی اور اس بد نما انسان کا خوبصورت دل پھٹتا جا رہا تھا۔ ”وہ تمہارے بیٹوں سے بھی زیادہ لائق ہے۔“

”مجھے آپ کی باتوں پر پورا اعتبار ہے۔ یقیناً آفریدی ایسا ہی ہو گا۔“ علاء الملک کی بیوی نے سمجھ ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا سلطان کی بارگاہ میں آفریدی کی جاں بخشی کیلئے سفارش کرنے والا کوئی نہیں؟“

”نہیں کوئی نہیں۔“ علاء الملک شدید بے چارگی کے عالم میں اٹھ کر ٹھلنے لگا۔ ”دشمنوں نے چچ ہی وہ ڈالا ہے کہ کوئی تدبیر کام نہیں کر سکتی۔ اگر کسی طرح اس گرہ کو کھول بھی دیا جائے تو سلطان کی عادت ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتا۔ اپنے حکم کو آسانی حکم سمجھتا ہے کسی کی طرف سے ایک بار بدل میلا ہو جائے تو پھر اس غبار کو کوئی صاف نہیں کر سکتا۔“

شمسہ تاجدار بیگم کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر چونک کر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ”کیا سلطان پر حضرت نظام الدین ادلیا کے بے شمار احسانات نہیں ہیں؟“

علاء الملک حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”حضرت شیخ کے احسانات کا شمار کون کر سکتا ہے؟ فچ پوڑو کس کی دعاؤں کا نتیجہ ہے؟ اور مغلوں کی ناکام واپسی کس کی روشن کرامت ہے؟ سلطان کی تو ایک ایک سانس حضرت شیخ کے بار احسان سے دہلی ہوئی ہے اگر وہ سرکشی اختیار کر لے تو اور بات ہے۔ ویسے ساری دنیا جانتی ہے کہ علاء الدین کے اقتدار کی تجدید غیاث پور کی خانقاہ سے ہوتی ہے۔“

”تو پھر آپ حضرت شیخ کی جناب میں آفریدی کیلئے رحم کی درخواست کیوں نہیں کرتے؟“ شمسہ تاجدار بیگم نے اندھروں میں بھٹکتے ہوئے شوہر کو تیز روشنی کا راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”کیا سلطان، حضرت شیخ کے حکم کو نالائقی کی غشی غشی کر سکتا ہے؟“

علاء الملک کا چہرہ یکایک زرد نظر آنے لگا۔ ”سلطان اس قدر نادان نہیں کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے۔“

”پھر آپ غیاث پور کیوں نہیں چلے جاتے؟ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔“ شمسہ تاجدار بیگم نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

”میں گناہ گار؟“ علاء الملک کا ہنسنے لگا۔ ”میں سیاہ کار اس مرد پتکباڑ کے آستانے پر کیسے جاسکتا ہوں جہاں سلطان علاء الدین خلجی بھی ایک بھکاری نظر آتا ہے؟“ علاء الملک زار و قطار رونے لگا اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ”کاش! میں اس قابل ہوتا تو حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ جاتا اور اس

وقت تک دامن نہیں چھوڑتا جب تک محبوب الٹی (نظام الدین اولیا) آفریدی کی زندگی کیلئے اپنا دست و بال بند نہیں فرما دیتے۔

”تو کیا آفریدی قتل ہو جائے گا؟“ شمسہ تاجدار بیگم نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”شاید نہیں!“ علاء الملک کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور اس کے مردہ چہرے پر نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ ”میں امیر خسروؒ سے التجا کروں گا سلطان بھی ان ہی کے حوالے سے حضرت شہنشاہی بارگاہ میں اپنی درخواست پیش کرتا ہے۔ امیر خسروؒ بھی ایک ایسے شخص ہیں جن کی بات ٹالی نہیں جاسکتی۔ میں آفریدی کیلئے امیر کے آگے دامن پھیلا دوں گا۔“ یہ کہہ کر علاء الملک نے اپنے کوچوان کو آواز دی اور پھر قہقہوں سے دیر بعد اس کی سواری ”قصر نزار ستون“ کی طرف جاری تھی۔

☆.....☆.....☆

نرملہ کو ہوش آچکا تھا۔ مگر ابھی تک اس پر سکتے ہی کیفیت طاری تھی۔ حرم سرا کی کینروں نے اس کے سامنے کھانا رکھا مگر نرملہ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کینروں نے رانی کنولادوی کو خبر دی اگرچہ کنولادوی مسلمان ہو کر علاء الدین کی بیوی بھی بن چکی تھی اور اسے ”ملکہ جہاں“ کا خطاب حاصل ہو چکا تھا لیکن ایک راجپوت عورت کی حیثیت سے وہ نرملہ کمار کی کو نظر انداز نہ کر سکی۔ ماضی کے رشتوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ نرملہ کمار کی دلجوئی کرے اور ایک معزز خاندان کی لڑکی کو سسک سسک کر مرنے سے بچائے۔ کینروں کی زبانی نرملہ کمار کی حالت زار کا ذکر سن کر کنولادوی خود اس کمرے میں آئی جہاں ایک راجپوت زادی تصویر در دینی دنیا و مافیاسے بے خبر بیٹھی تھی۔

ملکہ جہاں نے کینروں کی طرف دیکھا۔ ایک جنبش چشم کے ساتھ ہی تمام خاموش کمرے سے باہر نکل گئیں۔ تنہائی ہوتے ہی ملکہ جہاں نرملہ کمار سے مخاطب ہوئی۔ ”لڑکی! تم مجھے جانتی ہو کہ میں گجرات کی مہارانی کنولادوی ہوں۔“

نرملہ کمار نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔

”اور کیا تم اس حقیقت سے بھی باخبر ہو کہ اب میں سلطان علاء الدین خلجی کی بیوی ”ملکہ جہاں“ ہوں۔ رانی کنولادوی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔

نرملہ کمار نے دوبارہ سر کو جنبش دی۔

”پھر تم میرے استقبال کیلئے کھڑی کیوں نہیں ہوئیں؟“ رانی کنولادوی کی آواز تلخ تھی۔

”ملکہ جہاں کو احساس ہونا چاہئے کہ جو انسان موت کے قریب کھڑا ہو اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے؟“ نرملہ کمار نے باوقار لہجے میں کہا مگر اس کے ایک ایک لفظ سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

”میں تمہیں ایک عورت کی حیثیت سے یہی بات سمجھانے آئی ہوں کہ عین عالم شباب میں موت کی تمنا نہیں کرتے۔“ رانی کنولادوی اچانک بہت زیادہ مہربان نظر آنے لگی تھی۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا پہلا شوہر راجہ کرن مجھے دشمنوں کے زہرے میں چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا اس نے آزمائش کے وقت بڑی بے شری کے ساتھ پیٹھ دکھادی۔ تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے کس طرح حادثات کی یلغار سے اپنے آپ کو بچایا؟ وہ دقتی ہوئی کشتی کی پتوڑا اس شخص کے ہاتھ میں دیدی جو بڑا زور آور ملازم تھا۔ طاقتور بازوؤں والا بڑا بے جگر ناخدا تھا۔ میں دوسری شادی کر کے رانی کنولادوی سے ملکہ جہاں بن گئی۔ یہ وہ اعزاز ہے جس کی تمنائیں بے شمار عورتیں زیر زمین چلی گئیں یا پھر شمشان گھاٹ میں جل تھیں۔ میں نے اس اعزاز کو حاصل

کر لیا مگر یہ راز کے بتاؤں کہ ملکہ جہاں ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی قربت کو ترستی ہوں۔“ رانی کنولادوی بہت زیادہ اداس نظر آنے لگی تھی۔

”آخر آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں؟“ نرملہ کمار نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہارے معزز و محترم خاندان سے بخوبی واقف ہوں اس لئے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ رانی کنولادوی نے نرملہ کمار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شہرت جذبات میں ایک ایسے مرد کا انتخاب کر لیا جو تمہارے برابر کھڑا نہیں ہو سکتا وہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر! اب تو وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا بالفرض اگر زندہ بھی رہ جاتا تو کیا تم اس کی بدکرداریوں کو فراموش کر دیتیں؟“

نرملہ کمار بڑے تعجب سے رانی کنولادوی کو دیکھنے لگی۔

”میں اس بات کو پسند نہیں کروں گی کہ تم کسی شیعہ محفل کی طرح قطرہ قطرہ گھل گھل کر فنا ہو جاؤ اور اوباش مردوں کا جو ہم تمہارا تماشا دیکھتا رہے۔“ رانی کنولادوی کا انداز گفتگو تحکم آمیز تھا۔ ”میری خواہش ہے کہ تم اس بے وفادار کے منہ پر حقوک دواؤں کسی ایسے معزز شخص کا دامن تمام لو جو روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو۔ اپنے آپ کو اس طرح نہ جلاؤ کہ راکھ تک باقی نہ رہے۔“

نرملہ کمار کی دوبارہ سکتہ ساہو گیا۔ رانی کنولادوی بڑے عجیب راستے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

”میرے مشورے کو جذبات کی آنکھ نہیں ہوش کی نظر سے دیکھو۔“ نرملہ کمار کی خاموش پاکر رانی کنولادوی دوبارہ بولی۔ ”یہ سفاک مردوں کی قتل گاہ ہے جہاں روزانہ ان گنت عورتیں بیھٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ رسم عاشقی، وفا کے دعوے، عہد و پیمان، پر جوش قسمیں، میں نے ان آنکھوں سے سب کا شر دیکھ لیا۔“

رانی کنولادوی اپنی زندگی کے تلخ ترین تجربات بیان کر رہی تھی اور نرملہ کمار کی چہرے پر انتہائی ناگواری کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ”ملکہ جہاں! یہ اپنے اپنے جینے کی ادا ہے۔ کوئی ایک کشتی میں پاؤں رکھ کر ڈوب جاتا ہے اور کوئی ہواؤں کا رخ دیکھتے ہوئے دس کشتیوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے مگر ساحل اسے بھی نہیں ملتا۔ اس کا انجام بھی تندو تیز موجوں میں غرق ہو جانا ہے۔“ نرملہ کمار نے بڑے شائستہ لہجے میں رانی کنولادوی کے مشورے پر اعتراض کیا تھا۔ ”زندگی مضبوط سہارے ڈھونڈنے کا نام نہیں۔ انسان کو خود پہاڑ کی طرح اٹل ہونا چاہئے۔“

رانی کنولادوی ایک شکستہ عورت تھی۔ پہلے شوہر کی بے وفائی نے اسے دنیا کے تمام مردوں سے بدظن کر دیا تھا۔ علاء الدین کی بیوی بن جانے کے بعد اسے دنیا کی ساری آسائشیں حاصل ہو چکی تھیں مگر پھر بھی ایک احساس کانٹنے کی طرح اس کے دل میں ٹھکتا تھا۔ کتنے والوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر آنکھوں میں سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ رانی کنولادوی اس تحریر کو پڑھ کر لرز جاتی تھی۔ اکثر لوگوں کی نظر میں راجہ کرن مجرم نہیں تھا۔ اس نے سیاسی مفاد پر شکست کھائی تھی اور جان بچانے کیلئے فرار ہو گیا تھا۔ اقتدار کی کشمکش میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی تخت و تاج کے ہنگامے اور کبھی مقتل و زنداں کے خوفناک سنائے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی اکثریت راجہ کرن کو بے قصور سمجھتی تھی۔ اس کے برعکس عام انسانوں کی نگاہ میں رانی کنولادوی ایک گناہ گار عورت تھی جس نے اپنا مذہب بھی بدل ڈالا تھا اور اپنے جذبات بھی علاء الدین کے عشرت کدے میں فروخت کر دیے تھے اگرچہ علاء الدین نے اس موقع پر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن رانی کنولادوی اپنے نسلی معیار سے گر چکی تھی کتنے والے یہی کہتے تھے کہ وہ ایک تاجر عورت ہے اس نے بازار

کارنگ بدلتے دیکھ کر ہی راجہ کرن کو ٹھکرا دیا اور علاء الدین سے سودا کر لیا۔ رانی کنولادیوی کو بھی اکثر تھائی میں ان الزام تراشیوں کا شور سنا دیتا تھا وہ بظاہر ”ملکہ جہاں“ تھی مگر رعایا کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا کہ ”گجرات کی مہارانی ایک بے وفا عورت ہے۔“ زندگی کے ایسے خوفناک انقلاب نے رانی کنولادیوی کو نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ علیٰ ملان دنیا کے سارے مردوں کو مجرم قرار دیتی تھی مگر درپردہ اس کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی عورت ”وفا“ کا نام نہ لے۔ نرملاکاری کے جذبہ ایثار کو دیکھ کر کنولادیوی اندر ہی اندر سلگ اٹھی تھی اور پھر اس نے کوشش کی تھی کہ یہ راجپوت زادی بھی کسی دوسرے بااثر سردار کا دامن تھام کر اپنی شخصیت کو داغدار بنالے اس طرح کنولادیوی کے مجرم جذبات تسکین پاتے تھے مگر جب نرملاکاری نے بے وفائی اور عہد شکنی کی راہ پر چلنے سے انکار کر دیا تو ملکہ جہاں چیخ و تاب کھانے لگی اور ایک بار پھر اس کا احساس جرم پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا۔

”آفریدی کتنا ہی بدکردار سہی اول و آخر میرا ہے۔“ نرملاکاری کے لہجہ سے عجیب کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”آفریدی وہ ہے جسے میں نے اپنے دل کے راستے سے گزرنے کی اجازت دی اس پر پہلی بار ایک غیرت مند دوشیزہ کی آرزوئیں بے نقاب ہوئیں اور ان سانسوں کے راز کھلے جنہیں لالہ و گل کے سوا کسی انسان نے محسوس نہیں کیا تھا۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنے دل کو گزر گاہ عام بناؤں۔“ آفریدی نہیں تو کوئی اور سردار سہی۔ آپ نے اس طرح میری نمکساری کیوں نہیں کی کہ آفریدی کی لاش کے ساتھ میں بھی قبر میں سو جاؤں۔“ اچانک نرملاکاری کا لہجہ مست تلخ ہو گیا تھا۔

”یہاں کے لوگ تجھے اتنی آسانی سے قبر میں سونے نہیں دیں گے۔“ ملکہ جہاں کو ایک کمزور لڑکی کے سامنے اپنی ذلت کا احساس ہو گیا تھا اس لئے وہ غضب ناک نظر آنے لگی۔

”میں دربار شاهی سے اپنے لئے دو گز جگہ مانگ لوں گی سلطان علاء الدین خلجی کی سلطنت بہت وسیع ہے۔“ نرملاکاری کے ہونٹوں پر خلاف موسم ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی مگر اس مسکراہٹ میں نہ جانے کتنی تلخیاں پوشیدہ تھیں۔ ”اگر سلطان کا دامن اتنا تنگ ہوا کہ مجھے قبر کی بھی جگہ نہ مل سکی تو خود اپنی زندگی کو قبر بنا لوں گی۔“

رانی کنولادیوی جھنجھلا کر کھڑی ہو گئی اسے نرملاکاری سے اظہار ہمدردی کر کے بڑی ندامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ”نادان لڑکی! تو نے مجھے میرے احسان کا بڑا عجیب صلہ دیا ہے پھر بھی میں تیرے لئے اپنے دروازے کھلے رکھوں گی جب تجھ پر ہندوستان کی زمین کا ایک ایک گوشہ تنگ ہو جائے تو تجھے پکار لیتا میں تیری فریاد کا جواب دوں گی۔“ یہ کہہ کر ملکہ جہاں چلی گئی۔ ایک ستم رسیدہ اور بے گھر لڑکی نے قصر ہزار ستون میں رہنے والی با اختیار عورت کے غرور کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

نرملاکاری کو علیٰ عامر آفریدی سے بڑی شکایت تھی درباری راقصہ زہرہ جمال کے واقعے نے نرملاکاریے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آفریدی اس قدر ہستی میں اتز سکتا ہے۔ نرملاکاری جب بھی علیٰ عامر کو دیکھا تھا وہ اسے کوہِ آبو کی بلند ترین چوٹی سے بھی زیادہ اونچا نظر آتا تھا اور اسی اونچائی کو چھونے کیلئے اس نے آفریدی کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ پھر خوش گمانی کا یہ طلسم ٹوٹا تو علیٰ عامر اسے ایک گڑھے میں بیٹھا ہوا نظر آیا وہ گڑھا جو غلط کچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ نرملاکاری بار آفریدی سے ملنا چاہتی تھی مگر سلطان نے اس کی درخواست کو بڑی بے رحمی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا وہ اپنی زندگی کے شریک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ جن کے چہرے دیکھ کر لوگ اپنا مذہب تک بدل ڈالتے ہیں ان کی

”اے خدا! اے خدا! آفریدی کو زندگی دے اور میری جان کا صدقہ قبول کر لے۔ اب میں جاگتے جاگتے تھک گئی ہوں۔ مجھے ابدی نیند بخش دے کہ تیرے لازوال خزانوں میں کوئی کی نہیں ہے۔“

☆ ☆ ☆

کو قاتل علاء الملک دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ امیر خسروؒ سے شاهی محل میں ملاقات ہو جائے اس بات کا بھی امکان تھا کہ کہیں خسروؒ اپنے پیرو مشد کے نیاز حاصل کرنے کیلئے غیاث پور تشریف نہ لے گئے ہوں۔ علاء الملک اس خیال سے ہی کانپ اٹھتا تھا۔ غرض ایک شدید ذہنی کشش میں گرفتار علاء الملک قصر ہزار ستون پہنچا۔ خاصی رات ہو چکی تھی۔ محل کے محافظ کو قاتل شہر کو دیکھ کر چونک اٹھے مگر علاء الملک نے پہلے داروں کے احساسات سے بے نیاز ہو کر امیر خسروؒ کے بارے میں پوچھا پھر جب اسے معلوم ہوا کہ امیر خسروؒ موجود ہیں تو علاء الملک کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے بے ہنگم جسم کے ساتھ بھاگتا ہوا امیر خسروؒ کی قیام گاہ تک پہنچا۔ محافظ نے بتایا کہ امیر اس وقت اپنے شہینہ و طائف میں مشغول ہیں۔ علاء الملک بدحواس ہو گیا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں اندیشہ تھا کہ کہیں علاء الدین کی خواب گاہ کے دروازے بند نہ ہو جائیں اور رحم کی درخواست کرنے سے پہلے ہی آفریدی قتل نہ کر دیا جائے۔ علاء الملک کچھ دیر تک امیر خسروؒ کے کمرے کے سامنے ٹھکتا رہا اور پھر دربان سے یہ کہتا ہوا اندر داخل ہو گیا کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ امیر خسروؒ اس قدر گمراہے مراقبے میں تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے اور علاء الملک کے بھاری قدموں سے چلنے کی آواز تک سنائی نہیں دی۔

”امیر! میرے اس گناہ کو معاف کریں کہ میں آپ کی ریاضت میں خلل انداز ہوا۔“ علاء الملک نے امیر خسروؒ کے قریب پہنچ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

امیر خسروؒ نے آنکھیں کھول کر علاء الملک کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر وحشت کے سوا کوئی دوسرا رنگ موجود نہیں تھا۔ ”تم؟ اس وقت؟ خیر تو ہے علاء الملک؟“ امیر خسروؒ نے شفیق و مہربان لہجے میں پوچھا۔

”میں آفریدی کیلئے بہت پریشان ہوں۔“ علاء الملک ہاتھ باندھ کر امیر خسروؒ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”ہم بھی اس طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“ امیر خسروؒ نے فرمایا۔ ”شام ہی سے بارگاہِ ذوالجلال میں اس کی عافیت کیلئے دعا کر رہے ہیں۔ آفریدی پر عجیب وقت آپڑا ہے۔ آزمائش کا ایک طویل دور ہے“

بست طویل..... ہم وہاں گھٹلا دینے والا۔ تم نہیں سمجھ سکتے علاء الملک کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ خدایا اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے۔“

”سلطان کا مزاج ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتے مگر ایک آپ ہی کی ذات ہے جو ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔“ کو تو آل علاء الملک بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ”امیر خدا کیلئے کچھ کیجئے کہ آفریدی اور اس کی موت کے درمیان بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ یہ کہتے کہتے علاء الملک کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”خدا کا شکر ہے کہ ابھی دربار شامی میں تم جیسے دردمند انسان موجود ہیں۔“ امیر خسروؒ نے تحسین آمیز نظروں سے علاء الملک کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”جو ہوتا ہے وہ تو ہو کر رہے گا مگر تمہیں بھی خدا اس غمگساری کا صلہ ضرور عطا کرے گا۔“

امیر خسروؒ اپنے کمرے سے باہر تشریف لے آئے اور آہستہ آہستہ خواب گاہ سلطانی کی طرف بڑھنے لگے۔ علاء الملک بھی امیر کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔ اس میں علاء الدین کا سامنا کرنے کی توہمت نہیں تھی مگر وہ آج کی رات گھر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر امیر خسروؒ سلطان کی خواب گاہ تک پہنچے۔ محافظ خاص نے بتایا کہ آج سلطان خلاف معمول وقت سے پہلے سو گئے ہیں۔ علاء الملک کو محسوس ہوا کہ جیسے جلا دوں نے آفریدی کے بجائے خود اس کی گردن پر تلوار چلا دی ہو۔

”امیر! مجھے ایسا بات کا خوف تھا۔“ علاء الملک روئے لگا۔

امیر خسروؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک خواب گاہ کے دروازے کے سامنے کھڑے سوچتے رہے اور پھر دربان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”سلطان تک یہ اطلاع پہنچا دو کہ خسروؒ آیا ہے۔“

دربان نے انکار کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

”تو پھر مجھے اندر جانے دو کہ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ امیر خسروؒ کا جلال روحانی ابھر آیا۔

دربان نے انہیں روکنا چاہا مگر امیر خسروؒ کی نگاہ گرم کی تاب نہ لاسکا۔ اس پر خوف و ہشت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی اور امیر خسروؒ خواب گاہ شامی میں داخل ہو گئے۔ کمرے کے اندر ہلکی روشنی تھی۔ علاء الدین ابھی سویا نہیں تھا۔ وہ نیم خوابی کی کیفیت سے دوچار تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر چونک اٹھا۔

”کون؟ ملک؟“ بے وقت مداخلت نے علاء الدین کو غضب ناک کر دیا تھا۔

”نہیں شاہ والا! میں امیر خسروؒ!“

سلطان گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور خسروؒ سے نصف شب کے قریب غیر متوقع آمد کا سبب دریافت کرنے لگا۔

”اگر میں نے شاہ والا کی کوئی خدمت انجام دی ہے تو اس کے صلے میں آفریدی کی جان بخش دی جائے۔“ امیر خسروؒ نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔

علاء الدین بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر بڑے شکستہ لہجے میں بولا۔ ”خسروؒ! ہم تمہاری درخواست کو نظر انداز نہیں کر سکتے مگر تمہیں بھی اپنے شاہ کے قانون کا احترام کرنا چاہئے۔“

امیر خسروؒ سلطان کی گفتگو کا مضمون نہیں سمجھ سکے اور سوالیہ نظروں سے اس شخص کی جانب دیکھنے لگے جو اپنے فیصلے میں ترمیم کرنے کا عادی نہیں تھا۔

”ہم تمہاری خاطر آفریدی کی جان بخش دیتے ہیں مگر وہ اس وقت تک قیدی کی زندگی بسر کرے گا جب

تک ہم دنیا سے گزر نہیں جاتے۔“ علاء الدین نے فوراً ہی نیا حکم جاری کر دیا جس کے مطابق علی عامر آفریدی، سلطان کی زندگی میں آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑی عجیب سزا تھی۔ امیر خسروؒ علاء الدین کا شکر یہ ادا کر کے باہر نکل آئے۔ کو تو آل علاء الملک اداس تھا مگر اس اداسی کے عقب میں ایک خوشی بھی رقصاں تھی۔

قصر نزار ستون آدھی رات کے وقت دوبارہ جاگ اٹھا۔ اس خبر پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان نے آفریدی کے قتل کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔

☆.....☆.....☆

صبح ہوتے ہی آفریدی کو محل کے کمرے سے نکال کر زمین دوز قید خانے کی طرف لے جایا جانے لگا۔ جب سپاہی قصر نزار ستون کی حدود سے باہر آئے تو دہلی کے مشہور بزرگ بشیر مجذوب نعرہ زنی کر رہے تھے۔

”آسمان زمین پر جھک گیا اور زمین انسانوں کے خون سے بھر گئی۔“

بشیر مجذوب اسی قسم کی پراسرار باتیں کرتے تھے۔ آفریدی قریب سے گزرا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر بشیر مجذوب کو سلام کرنے کی کوشش کی۔ زنجیریں بن انھیں اور سید بشیر چیخنے لگے۔

”کیسا شور ہے؟ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ!“

سپاہی آفریدی کو بے رحمی سے کھینچ رہے تھے۔ اس نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ ”سید! میں جا رہا ہوں۔“

”تجھ سے پہلے یہ سب چلے جائیں گے۔“ بشیر مجذوب نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

سپاہی ہنسنے لگے۔ ”عجیب پاگل ہے۔“

آفریدی نے سپاہیوں کو تپا پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور سر جھکا کر چلنے لگا۔

ملک کانور کی ساری خوشیاں فنا ہو گئی تھیں۔ اس کا بدترین دشمن اچانک موت کے خونی پنجوں سے نکل آیا تھا۔

”صبر کر گوپی رام! صبر کر۔“ رام دیو، ملک کانور کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ”جیت ہماری ہوئی ہے۔“

آفریدی کو قیدی کی حالت میں زہر بھی دیا جاسکتا ہے۔

ملک کانور کی بگڑتی ہوئی حالت سن بھل گئی۔ ”ہاں! یہ ممکن ہے۔“ وہ جوشِ مسرت سے چیخ اٹھا۔

”کہاں تک بھاگے گا آفریدی! میرے ہاتھ بہت دراز ہیں۔“

☆.....☆.....☆

علی عامر آفریدی کو ایک زیر زمین قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ سنگین جراثیم کا ارتکاب کرنے والوں کو اس قسم کے قید خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ یہ قید خانے طویل اور کشادہ قبروں سے مشابہہ ہوتے تھے۔ اگر کوئی کمزور اعصاب کا انسان ایسے قید خانوں میں کچھ سال گزار لیتا تو آزاد ہونے کے بعد بھی وہ ایک ناکارہ اور بیمار شخص نظر آتا تھا۔ آفریدی کو بھی اسی لئے زمین دوز قید خانے میں بھیجا گیا تھا کہ چند سالوں کی قید اسے تھکا ڈالے گی اور اگر بعد میں وہ چھوٹ بھی گیا تو زندہ در گور ہو جائے گا۔ علی عامر آفریدی جھوٹی شہادتوں کی وجہ سے اصولی طور پر بغاوت کا مجرم تھا اور ایسے مجرموں کیلئے علاء الدین خلجی نے بہت سخت قوانین بنائے تھے۔ وہ باغیوں کو بلا در تعلیق قتل کر دیا کرتا تھا ان میں سے اکثری لاشیں شہر میں کوچہ در کوچہ پھرائی جاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی باغی خاندان کو بھی دردناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ آفریدی کے ساتھ بھی یہی سب

کچھ پیش آتا مگر امیر خسروؒ کی مداخلت کے سبب اس کے قتل کی سزا معاف کر دی گئی۔ اگرچہ آفریدی کی والدہ اور بہن جل کر خاک ہو چکی تھیں لیکن ابھی اس کے کچھ رشتے دار باقی تھے۔ انہیں بھی یقینی طور پر سنگین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا لیکن خطرہ اس وقت ٹل گیا جب آفریدی کی سزائیں تبدیل ہو گئی۔ علاء الدین کے دور حکومت میں یہ پہلا واقعہ تھا جب ایک باغی کو قتل کے بجائے قید کی سزا دی گئی اور وہ سزا بھی مشروط تھی۔ اگر علاء الدین دوسرے دن ہی انتقال کر جاتا تو آفریدی زنداں کی تاریکیوں سے باہر نکل آتا اور اس کی باقی سزا معاف ہو جاتی اس کے برعکس اگر علاء الدین مزید پچاس سال تک زندہ رہتا تو آفریدی کو بھی اپنی پوری جوانی قید و بند کے اندھیروں میں گزارنی پڑتی۔ سلطان کے اس فیصلے سے وہ درباری امراء کسی قدر مطمئن نظر آنے لگے تھے جن کے سینوں میں ابھی احساس زندہ تھا۔ ان کے خیال میں امیر خسروؒ کی سفارش سے ملک کافور جیسے بے حیاء غلام کو شکست ہو گئی تھی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا طوفان ایک مقام پھر سر گیا تھا۔

ملک کافور اور رام دیو کو اس اچانک انقلاب سے سخت اذیت پہنچی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا شکار اس طرح موت کے منہ سے بحفاظت نکل آئے گا۔ ملک کافور سب سے زیادہ امیر خسروؒ کو ناپسند کرتا تھا کہ ان کے سامنے سلطان بھی کسی حد تک باادب نظر آتا تھا۔

”اس درباری شاعر نے ہماری بساط الٹ کر رکھ دی۔“ ملک کافور نے بہت تندو تیز لہجے میں کہا۔
”بساط کہاں الٹی ہے گوپی رام؟ ابھی تو سرے گردش کر رہے ہیں۔“ رام دیو کی آواز سے گہرا سکون جھلک رہا تھا۔ ”صرف محاذ بدل گیا ہے۔ اب ہمیں نئے محاذ پر جنگ کرنی ہوگی۔ میں نے بہت غور سے ستاروں کی چال کا مشاہدہ کیا ہے۔ بالآخر آفریدی مارا جائے گا اور اس کی موت زہر خورانی سے واقع ہوگی۔“

”تیرے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے گیانی؟“ ملک کافور نے بیزارگی کے عالم میں کہا۔
”قید خانے کے محافظ کو بڑی آسانی سے ورغلا یا جاسکتا ہے“ رام دیو کی سرخ آنکھوں میں شیطان رقص کر رہا تھا۔ ”ایک بڑی رشوت! ایک گراں بہا انعام محافظ سے اس کا ایمان خرید سکتا ہے۔ زہر کے چند قطرے آفریدی کے دل و جگر کو کاٹ دیں گے اور پھر وہ خون تھوکتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔“ رام دیو نے بڑی عیاری کے ساتھ سنگدلانہ منصوبہ پیش کیا۔

”گیانی! تیری تجویز معقول ضرور ہے مگر اس رات ہی آسانی سے عمل نہیں کیا جاسکتا۔“ ملک کافور جھجھکیا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”آفریدی کی غیر فطری موت پر لوگ چونک بھی سکتے ہیں اور پھر سلطان کی بارگاہ میں احتجاج بھی کر سکتے ہیں۔“

”یہ تیرا خیال ہے گوپی رام! اس بد نصیب کی لاش پر ماتم کرنے کیلئے کون آئے گا؟“ رام دیو انتہائی بے شرمی کے ساتھ ہنسا۔

”وہی بوڑھا شاعر جس نے آفریدی کو موت کے پنجوں سے نکال لیا۔“ ملک کافور نے امیر خسروؒ کا ذکر بڑے ناپسندیدہ انداز میں کیا۔ ”وہی اس کی لاش اٹھا کر سلطان کے سامنے لے جائے گا اور پھر انصاف طلب کرے گا۔ داروغہ زنداں سے باز پرس ہوگی کہ آفریدی کو زہر آلود کھانا کس نے پہنچایا؟ کس میں اتنی ہمت ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس رازداری کا کھرم رکھ سکے۔“

رام دیو حیرت سے ملک کافور کی طرف دیکھنے لگا۔ نوعمری کے باوجود اس کا ذہن بوئے بڑے جمائدیہ

انسانوں کے انداز میں سوچتا تھا۔ ”اب تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے گوپی رام!“
”میری ہوشیاری پر لعنت بھیج گیانی!“ ملک کافور کا ایک غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔ ”آج سلطان نے آفریدی کی سزائے موت معاف کی ہے۔ کل قید کی سزا بھی معاف کی جاسکتی ہے پھر اگر آفریدی باہر آ گیا تو میرے لئے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ اس کی موت کی تدبیر سوچ! ایسی تدبیر کہ میرا دامن بے داغ رہے۔“

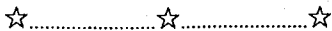
رام دیو نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے عیار ذہن کو گردش دینے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے ملک کافور سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے یہاں ایسے مجرم نہیں ہوتے جنہیں زہر دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔“
”سلطان کے قانون میں زہر دے کر مارنے کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے۔“ ملک کافور نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! کبھی کبھی ایسے مجرم بھی سامنے آئے ہیں جن کی موت کا الزام سلطان اپنے سر نہیں لینا چاہتے۔ انہیں آہستہ آہستہ قتل کیا جاتا ہے۔“
”وہ کس طرح؟“ رام دیو نے چونک کر پوچھا۔

”ایسے مجرموں کو قید کے دوران انیم کے پوست کا پانی دیا جاتا ہے۔ اس پانی سے مجرم فوری طور پر نہیں مرتے۔ آہستہ آہستہ وہ نشے کے عادی ہو جاتے ہیں پھر یہی پانی ان کے جسموں کو کھوکھلا اور دماغوں کو شل کر دیتا ہے۔ مجرموں کی ہلک بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اتنے لاغر ہو جاتے ہیں کہ ٹانگیں بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن انہیں موت آ جاتی ہے۔ عام رعا یا سمجھتی ہے کہ وہ اپنی طبعی موت مرے ہوں گے مگر حقیقتہً انیم کا قاتل پانی انہیں چاٹ لیتا ہے۔ بالقرض کوئی سخت جان مجرم قید سے چھوٹ بھی جائے تو اس کی زندگی ایک عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ ابا جوں کی طرح اپنے گھر میں منہ چھپائے پزار ہوتا ہے اور اس کا عادی جسم ہمہ وقت انیم جیسی نشہ آور شے مانگتا رہتا ہے۔ اس طرح دونوں حالتوں میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور حکومت پر کوئی الزام نہیں آتا۔“ ملک کافور نے سیاست کے ایک اہم ترین راز کو فاش کرتے ہوئے کہا۔

رام دیو کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی کا عکس ابھر آیا۔ ”علی عامر آفریدی کو بھی اسی طرح مارا جائے گا۔ سلطان کی زندگی تک تو وہ قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ طویل عرصہ ہمارے منصوبے کی کامیابی کیلئے بہت زیادہ ہے گوپی رام۔“

ملک کافور داروغہ زنداں کے بارے میں غور کرنے لگا تو ایک تری سردار سلیمان بن یوسف تھا۔ یہ سردار اپنے اصولوں کا بہت سخت اور ایک باکردار انسان تھا۔ ”سلیمان بن یوسف کو اتنی آسانی سے نہیں خرید جاسکتا۔“ ملک کافور نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”انیم کے پانی کو آفریدی کے جسم پر آزمایا جاسکتا ہے مگر یہ پانی اس کے حلق میں کون پکائے گا۔“

”اگر داروغہ زنداں سخت گیر ہے تو اس کے نائب بزدل ہوں گے۔“ رام دیو نے اطمینان سے خیال کرتے ہوئے کہا۔ ”سلیمان بن یوسف تو قید خانے پر پہرہ نہیں دیتا۔ ہمیں ان سپاہیوں سے کام لینا ہو گا جو قیدیوں کو کھانا فراہم کرتے ہیں۔“ ملک کافور نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”ہاں! یہ ممکن ہے۔“ اس کے ساتھ ہی علی عامر آفریدی کے خلاف ایک نئی سازش کا آغاز ہو گیا



دوسری طرف کو قاتل علاء الملک بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک زمانہ آشنا انسان تھا۔ اپنے

کے سر جائے گا۔ پھر اس کی سزا صرف تمہاری ذات تک محدود نہیں ہوگی پہلے تم اپنے اہل خانہ کو اپنی آنکھوں سے زہری کر مرتے ہوئے دیکھو گے اور اس کے بعد تمہاری دنیا خراب کر دی جائے گی۔ آخرت کی خبر خدا جانے کہ وہ بڑی سخت جگہ ہے۔" سلیمان بن یوسف نے تمام سپاہیوں کو اس طرح تنبیہ کی تھی کہ ہر شخص اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب قصر ہزار ستون کی ایک کینز نے نرملاکماری کی علی عامر آفریدی کی جاں بخشی کی خبر سنائی تو کچھ دیر کیلئے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اچانک خوشی سے اس پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ پھر اس کی کشادہ اور علانی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نرملاکا وہی کیفیت تھی جو پہلی بارش کے چھینٹوں سے دھوپ میں چلتی ہوئی زمین کی ہو جاتی ہے۔ سنناہٹ کی سی آوازیں ابھرتی ہیں، پانی اور مٹی کے ملاپ سے بخارات اٹھتے ہیں اور پھر ہر طرف ایک عجیب سی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ نرملاکماری بھی اسی جلتی ہوئی مٹی کی مانند تھی جسے پانی کی تیز پھوار نے ناقابل بیان لذت کا احساس بخشا تھا۔ پھر جب شاہی کینز نے اسے یہ بتایا کہ سلطان کی زندگی تک آفریدی زنداں کے اندھیروں میں گم رہے گا تو نرملاکا مایوسیاں دوبارہ لوٹ آئیں۔ پانی کے چند قطرے جلتی ہوئی مٹی کی پیاس نہ بجاسکے اور خود ہی غبار بن کر اڑ گئے۔ نرملاکماری کی آنکھوں سے کینز کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ مقدور ستم ظریفیوں کا گلہ کر رہی ہو۔

تقابل سے جو باز آیا، جفا کی
تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی

بعد میں کینز نے نرملاکا کو یہ بھی بتا دیا کہ اگر امیر خسرو مدخلت نہ کرتے تو اب تک آفریدی قتل ہو چکا ہوتا۔ اس عرصے میں نرملاکماری بھی گئی تھی اس نے باوقار انداز میں کینز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اگر امیر بھی ایسا نہ کرتے تو پھر کون کرتا؟ وہ بڑے انسان ہیں۔ شاید ان ہی کی دعاؤں سے سلطان کا اقتدار قائم ہے ورنہ اس کی سلطنت کا بھی وہی حشر ہوتا جو رتن سنگھ کے راج پاٹ کا ہوا ہے۔ یہاں بھی ظلم کا وہی انداز ہے جسے میں نے چوڑی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مقامات بدل گئے مگر ظلم کی فطرت نہیں بدلی، نرملاکماری اپنے دل کا غبار دھو ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وہ کینز کو خود مسلا ہوا پھول ہے، اسے لکڑیوں کی شادابی سے کیا دلچسپی ہوگی۔ غلامی انسان کا ضمیر تک بدل دیتی ہے پھر اس کے سینے میں کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔

شاہی کینز واپس جانے لگی تو نرملاکماری نے پکار کر کہا۔ "اپنے سلطان تک میرا پیغام پہنچا دو کہ مہمانتزی و کرم سنگھ کی بیٹی ان کے سامنے حاضر ہو کر کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔"

کینز رک گئی اور آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی نرملاکماری کے قریب آگئی اس سے پہلے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ "میں آپ کی ہمدرد ہوں۔ میری بات پر اعتبار کیجئے کہ یہاں کی فضا آپ کے حق میں نہیں ہے۔" شاہی کینز کا لہجہ اس قدر نرمگسار نہ تھا کہ نرملاکماری کو چونک جانا پڑا۔ "سلطان کو سیاسی ہنگاموں کے سبب اتنی فرصت نہیں کہ وہ اتنی معمولی معمولی باتوں پر دھیان دے سکیں اگر آپ....."

نرملاکماری ایک بار پھر کھڑ گئی۔ "یہ معمولی باتیں ہیں؟ ان کی رعایا کا ایک فرد موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اور حاکم کو خبر بھی نہیں کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا وہ میری فریاد اس وقت سنیں گے جب میں تباہ کر دی جاؤں گی؟" نرملاکماری تیرے لیے میں کہا۔ اس کی آواز بہت زیادہ بلند ہو گئی تھی۔

تجربات کی روشنی میں اسے یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ جاں بخشی کے باوجود علی عامر آفریدی خطرات سے محفوظ نہیں تھا۔ ملک کا فور کے بڑھتے ہوئے اثرات کسی وقت بھی رنگ لاسکتے تھے۔ ان ہی اندیشوں کے پیش نظر علماء الملک نے امیر خسرو سے ملاقات کی۔

"امیر! خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ کی کوششوں سے ایک بے گناہ انسان کو نئی زندگی مل گئی۔" علماء الملک اس طرح امیر خسرو کا شکریہ ادا کر رہا تھا جیسے علی عامر آفریدی خود اسی کا بیٹا ہو۔

"نہیں علماء الملک! کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو آفات و مصائب سے نہیں بچا سکتا۔" امیر خسرو کا لہجہ بہت عاجزانہ تھا۔ "خدا کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ ابھی آفریدی کی موت نہیں آئی تھی اس لئے دست قضا اس کی روح تک نہیں پہنچ سکا۔"

"مگر مجھے اب بھی محسوس ہو رہا ہے کہ دشمنوں کے سائے آفریدی کے تعاقب میں ہیں۔" علماء الملک نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی آفریدی کو آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔"

پھر ایک طویل گفتگو کے بعد امیر خسرو نے علماء الملک کو یقین دلایا کہ وہ اس امکانی سازش کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ کوئٹا شہر رخصت ہوا تو امیر خسرو داروغہ زنداں سلیمان بن یوسف سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔

ترکی سردار امیر خسرو کی آمد پر حیران رہ گیا۔ سلیمان بن یوسف حضرت نظام الدین اولیا کا بے حد عقیدت مند تھا اور اسی حوالے سے وہ امیر خسرو کا بھی بہت احترام کرتا تھا۔

"امیر! آپ نے کس لئے زحمت کی؟ کسی بھی خدمت گار کے ذریعے مجھ تک پیغام پہنچا دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔" سلیمان بن یوسف شرمسار نظر آ رہا تھا۔

امیر خسرو نے ترکی سردار کی نیاز مندی سے متاثر ہوتے ہوئے فرمایا۔ "غرض تو میری ہی تھی، پھر تم ہیوں آتے؟" یہ کہہ کر امیر خسرو نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

سلیمان بن یوسف کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ "امیر! آپ کی سفارش کے بعد آفریدی بھی میرے لئے محترم ہو گیا ہے۔ اگر سلطان ہی کی طرف سے کوئی دوسرا حکم جاری ہو جائے تو مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔ ورنہ جہاں تک قید خانے کے اندر کسی سازش کا سوال ہے تو میں اس کے امکان کو بھی باقی نہیں رہنے دوں گا۔ میری موجودگی میں اس بد ذات ملک کا فور کا ہاتھ آفریدی کے دامن کو بھی نہیں چھو سکتا۔"

"مگر تم ہر وقت موجود نہیں رہو گے۔" امیر خسرو نے اپنا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"آج کے بعد میری موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہوگی۔" سلیمان بن یوسف نے پر جوش لہجے میں کہا۔ "میں قید خانے کے ایک ایک محافظ سپاہی کو تنبیہ کر دوں گا۔"

امیر خسرو نے داروغہ زنداں کے حق میں دعائے خیر کی اور واپس تشریف لے گئے۔

حیران کے ساتھ ہی سلیمان بن یوسف نے تمام متعلقہ سپاہیوں کو طلب کر لیا۔ "اگر آفریدی کو ذرا بھی تکلیف پہنچے تو تم سب اس کے ذمے دار ہو گے۔" سلیمان کا لہجہ غضب ناک تھا۔ "میں اس سلسلے میں کوئی معذرت نہیں سنوں گا۔ اگر آفریدی کے جسم پر ایک خراش آئی تو میں تمہارے بدن پر بے شمار زخم ابھار دوں گا۔" قید خانے کے نگراں سپاہی لرزنے لگے۔ انہوں نے اپنے افسر کو آج تک اس قدر غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ "اور اگر کسی نے چند سکوں کے لالچ میں آفریدی کو زہر دیا تو یہ جرم تم سب

”میں پہلے ہی راج کماری سے معافی کی درخواست کر چکی ہوں۔“ مرخام نے ایک اور زاویہ بدلا۔
’آپ کی تمنائیں دیکھ کر دل بھرا آتا تھا۔ نہ میں نے تو اتنے ہولناک مناظر دیکھے ہیں کہ سر سے پاؤں تک پتھر کی
وکر رہ گئی ہوں۔ اب اگر کوئی لڑکی خون بھی روئے تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ کی بات کچھ اور سچی
اج کماری! بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اچھے دن دیکھے تھے، ایک بہادر قوم پر عکسراتی تھی، اس
لئے کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالیں۔ آئندہ ہونوں کو جنہیں تک نہیں دوں گی‘ کینیز مرخام بہت زیادہ جذباتی

نرملہ کے کمرے سے جانے کے بعد کنیز مرخانم ملک کا فورے پاس پہنچی اور اسے تمام باتیں تفصیل سے بتا دیں۔ دراصل مرخانم ملک کا فورہ ہی کی جاسوس تھی جو بیگم شاہی کی خبری کر کے ساری اطلاعات سلطان کے خواجہ سرانعام کو فراہم کرتی تھی۔ مرخانم کا تعلق گجرات کے ایک بچہ ہندو خاندان سے تھا۔ علاء الدین کے قتلے کے بعد جہاں اور قیدی گجرات سے دہلی آئے تھے وہاں مرخانم بھی مسلمانوں کے وارالحکومت چلی آئی تھی اور بہتر مستقبل کی تلاش میں اس نے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ مسلمان ہونے سے پہلے اس کا نام کوشنبیا تھا پھر اس نے وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک خوبصورت نام ”مرخانم“ تراش لیا۔ اگرچہ رانی کوتلا دیوی بھی قصر نزار ستون میں ملکہ جہاں کی حیثیت سے موجود تھیں لیکن مرخانم کو اپنی سابقہ مہارانی سے شدید نفرت تھی۔ گجرات کے راجپوتوں نے مقامی اچھوتوں پر جو ستم ڈھائے تھے ان کی تلخ یادیں ابھی تک مرخانم کے دل و دماغ میں محفوظ تھیں اور اسی فطری نفرت نے اچھوت عورت کو ملک کا فورہ کے حلقے تک پہنچا دیا تھا۔ اب مرخانم محض اس لئے سکون کی زندگی گزار رہی تھی کہ وہ شاہی

حرم سرا کے بعض راز ملک کا نور تک پہنچا دیا کرتی تھی جس کے صلے میں اسے خفیہ انعام و اکرام سے نوازا دیا جاتا تھا۔

آج مرخانم بہت اہم خبر لے کر آئی تھی۔ ملک کا نور ہر سطح پر علی عامر آفریدی کو اذیت میں مبتلا رکھتا چاہتا تھا۔ شائستہ بیگم اور عالیہ کو زندہ جلا دینے کے بعد اب نرملہ کماری اس کے انتقام کا ہدف تھی وہ بہت دن سے آفریدی کی محبوبہ کے بارے میں منصوبے بنا رہا تھا مگر اب تک کوئی موقع اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مرخانم کی فراہم کردہ نئی اطلاع کے بعد ملک کا نور کو اپنی کامیابی کا دھندلا سا مکان نظر آنے لگا۔ وہ اس بیباک راجپوت زادی کی گستاخانہ گفتگو کو بنیاد بنا کر سلطان کو نرملہ کماری کی طرف سے بدگمان کر سکتا تھا اور پھر یہی بدگمانی کوئی بھیاں تک بھی اختیار کر سکتی تھی۔ اسی امید کے پیش نظر ملک کا نور، رام دیو سے مشورہ کرنے کیلئے اس کے کمرے میں پہنچا۔

تمام واقعہ سننے کے بعد رام دیو خوشی سے رقص کرنے لگا اور پھر وحشیانہ انداز میں ملک کا نور سے بولا۔ ”گوپی رام! تو جانتا ہے کہ اس لڑکی کے باپ مہامنتری و کرم سنگھ نے مجھے کتنے آزار پہنچائے ہیں؟“

ملک کا نور سوالیہ نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگا۔

”گوپی رام! میں نے دیوتاؤں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اس خاندان کا نام و نشان تک مٹا دوں گا۔“ رام دیو حالت غضب میں بول رہا تھا۔ ”اس کا باپ و کرم سنگھ میرے عتاب کا نشانہ بنا..... میں نے راجہ رتن سنگھ کے ذریعے اسے ایسی دردناک سزا دلوائی..... پھر میرے قہری آگ نے ”منتزی بھون“ کو جلا کر راکھ کر دیا..... میری ہی وجہ سے رانی پد منی شعلوں کی خوراک بن گئی اور راجہ رتن سنگھ قہر ہزار ستون کے ایک ویران گوشے میں غلاموں کی طرح لعنت زدہ زندگی بسر کر رہا ہے..... اس کے خاندان کی بس ایک نشانی باقی رہ گئی تھی..... آج دیوتاؤں نے اسے بھی میری گرفت میں دیدیا..... مجھے کچھ نہیں چاہئے گوپی رام! اس لڑکی کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔“

”میں تیری بات نہیں سمجھا گیانی!“ ملک کا نور نے چونک کر کہا۔

”فاتح عالم سے کہہ کر نرملہ کو میری کینروں کے حلقے میں داخل کرادے۔“ رام دیو، ملک کا نور کے سامنے کسی بھکاری کی مانند گڑگڑانے لگا۔ ”و کرم سنگھ تو زندہ نہیں رہا مگر میں اس کی بھکتی ہوئی روح کو یہ منظر دکھانا چاہتا ہوں کہ مہامنتری کی بیٹی کے جسم پر مجھے مکمل قابو حاصل ہے۔“ رام دیو نے کسی جھجک کے بغیر اپنی غلیظ ترین خواہش کا اظہار کر دیا۔

ملک کا نور قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”کیا تو نرملہ سے شادی کرنا چاہتا ہے بوڑھے گیانی؟“

”نہیں! گوپی رام! ہرگز نہیں۔“ رام دیو بیانی انداز میں بولا۔ ”شادی تو ایک مقدس رشتہ ہے، میں و کرم سنگھ کی بیٹی کیلئے اپنے دل میں تقدس کا شائبہ تک نہیں پاتا..... وہ انتقام کی آگ میں اس وقت تک جلے گی جب تک خود میرے سینے کی تپش ختم نہیں ہو جاتی۔“ رام دیو کی روح میں پوشیدہ متمرکز خباثتیں عود کر آئی تھیں۔

”یہ کیسے ممکن ہو گا گیانی؟“ ملک کا نور سوچنے لگا۔

”گوپی رام! تجھے بڑی قربت حاصل ہے۔ سلطان کو نرملہ سے بدظن کر دے۔“ رام دیو نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”وہ کس طرح گیانی! اپنے منصوبے کی وضاحت کر، ملک کا نور، رام دیو کی باتیں سمجھنے سے عاجز تھا۔

”تو نہیں جانتا گوپی رام کہ اس بے ہودہ لڑکی نے جشن فتح کے موقع پر کس قدر گستاخانہ لہجے میں سلطان سے گفتگو کی تھی۔“ رام دیو نے ماضی کی داستان کا ایک ورق پلٹتے ہوئے کہا۔ ”سلطان نے اس وقت درگزر سے کام لیا تھا لیکن مرخانم کی اس اطلاع کے بعد فاتح عالم نرملہ کو معاف نہیں کریں گے تو سلطان سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ پارسا راجپوت زادی قہر ہزار ستون کو دنیا کی بدترین ہوس گاہ سمجھتی ہے اور سلطان سے یہ بھی کہہ دے کہ نرملہ، سلطان کے نظام انصاف کا مذاق اڑاتی ہے اور یہ بھی کہہ دے کہ اسے سلطان کے تختے ہونے تحفظ پر اعتبار نہیں ہے۔“

ملک کا نور کی آنکھوں میں ناقابل بیان خوشی کی چمک ابھر آئی۔

”سلطان کی سماعتوں میں زہر بھرنے کے بعد تجویز پیش کر دینا کہ و کرم سنگھ کی بیٹی، رانی پد منی کا نعم البدل ہے۔“ رام دیو کاشیطانی دماغ مختلف ستوں میں گردش کر رہا تھا۔

ملک کا نور بوڑھے شعبہ باز کو ایک بار پھر حیرت سے دیکھنے لگا۔

”سلطان کی دلی خواہش تھی کہ رانی پد منی ان کے حرم میں داخل ہو جائے مگر قسمت نے یادری نہیں لی۔“ رام دیو بڑی ذہانت سے ملک کا نور کو اکسارہا تھا۔ ”نرملہ کماری بھی پد منی کی حقیقی چچا زاد بہن ہے۔ دونوں ایک وادائی اولاد ہیں۔ پد منی نہ سہی نرملہ کماری سہی۔ اس طرح فاتح عالم کے ان زعموں کا مداوا ہو جائے گا جو ناکامی کی صورت میں شاہ کے دل پر ابھر آئے ہیں۔ سلطان نے غور سے نہیں دیکھا، نرملہ بھی پد منی ہی کی طرح توجہ شکن حسن رکھتی ہے۔“

ملک کا نور کو رام دیو کی یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ وہ ایک زمانہ میں پد منی کو اپنی رقیب سمجھ کر مہارانی چوڑ سے نفرت کرنے لگا تھا پھر پد منی جل کر خاک ہو گئی تو ملک کا نور نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب رام دیو، نرملہ کی شکل میں ایک اور رقیب پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”نہیں گیانی! یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا۔“ ملک کا نور نے اپنے جذبہ حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ سلطان انکار کر دیں گے۔“ رام دیو نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”شاہ کے انکار کے بعد ہی ہماری کامیابیوں کا آغاز ہو جائے گا اور نرملہ میری لونڈی بن جائے گی تو فاتح عالم سے اس راجپوت زادی کو مانگ لینا۔“

”میں؟“ ملک کا نور کا چہرہ مخ ہو گیا اور بارندامت سے گردن جھک گئی۔

رام دیو کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس نے نادانستگی میں ملک کا نور کو ایک ایسی گالی دے دی تھی جو شاہی خواجہ سرا کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ چوڑ کے شعبہ باز نے بگڑی ہوئی بات کو سنبھالنے ہوئے کہا۔ ”نرملہ“ آفریدی کی محبوبہ ہے اور آفریدی تیرا بدترین دشمن۔ کیا تو نہیں چاہتا کہ تیرے دشمن کی قبائے آبرو چاک ہو جائے پھر یہ خبریں قید خانے میں پہنچیں اور وہ افغان سردار شدت ختم سے گھبرا کر خود کشی کر لے۔“ رام دیو نے اچانک لہجہ بدل کر ملک کا نور کے جذبات پر ایک اور کاری ضرب لگائی تھی۔ ”یہ آفریدی کیلئے کتنی دردناک سزا ہوگی کہ نرملہ تیری کینز بن جائے، تیرے جوتوں کو صاف کرے اور تیرے لئے شراب کے جام بھرے..... گوپی رام! ان مناظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کہ ایسے مناظر تو انسانی تاریخ میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔“

ملک کا نور تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”پھر میرا ہاتھ آسانی کے ساتھ نرملہ کے گریبان تک پہنچ جائے گا!“ رام دیو نے اپنے شرمناک منصوبے

وقت آنے پر تمام باشندگان ہند اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔“ علاء الدین نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”یہ بات آئین سیاست کے خلاف ہے کہ ہم اپنے دل کا راز کسی سے کہہ ڈالیں۔ لیکن ملک! تو ہمارے فیصلے سے مطمئن ہو جائے گا۔ وہ تاریخ کا بڑا فیصلہ ہے بہت بڑا اور ہم اپنے جاں نثاروں کے حق میں ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔“

”اور آفریدی کی اس گالی کا کیا ہو گا جو مجھے سلطان کے حوالے سے دی گئی ہے۔“ ملک کانور نے سلطان کی اس وقتی سرشاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تیری خوش نصیبی ہے ملک کہ تجھے علاء الدین کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سعادت تو آج تک کسی کو نہیں ملی تھی ہماری نسبت پر ناز کرنا چاہئے۔“

ملک کانور نے دوبارہ علاء الدین کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ”اسی نسبت سے تو گجرات کا گوبلرام، دہلی کا ملک کانور ہے مگر پھر بھی آفریدی کا تصور مجھے سونے نہیں دیتا۔“

وہ تیرا کیا کر سکتا ہے ملک؟ ہم نے اسے زنداں کے اندھیروں میں گم کر دیا ہے۔“ علاء الدین نے اپنے غلام کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو انسانی تاریخ کا ایک شکستہ ورق ہے جسے انقلاب کی ہوائیں اڑائے لے پھر رہی ہیں۔ عقرب اس طرح بکھر جائے گا کہ اس کی پہچان تک باقی نہیں رہے گی۔“

”اگر آپ آفریدی کو میرے حوالے نہیں کر سکتے تو پھر اسے زہر دلو اور تھوڑے۔ اس کانٹے کی خلش مجھے چین سے جیسے نہیں دیتی۔“ آخر ملک کانور نے اپنے گھٹاؤ نے ارادوں کو ظاہر کر دیا۔

”نہیں ملک! ہم امیر خسروؒ سے بد عہدی نہیں کر سکتے۔“ علاء الدین نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اپنی افتخار سوچ سے باز آکر آفریدی تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔“

”فاتح عالم کی اسی نرم دلی نے حرم سرا کی کنیزوں کو بھی گستاخ بنا دیا ہے۔“ ملک کانور کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور اس نے مرخانم کی تمام باتیں سلطان کے گوش گزار کر دیں۔ ”وہ راجپوت زادی نہ ملا اپنے آپ کو قصر نزار ستون میں غیر محفوظ سمجھتی ہے اور شاہی لونڈیوں کے سامنے بر ملا کہتی ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ہوس گاہ ہے۔“ ملک کانور کے الفاظ کا زہر سلطان کی سماعت سے گزر کر دل تک پہنچ گیا۔

علاء الدین، نہ ملا کی گستاخ کلامی کے سبب پہلے ہی اس سے خفاء تھا پھر مائی بھان متی کی تلخ ترین گفتگو نے اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ آفریدی کے حوالے سے بھی نہ ملا کماری اس کے نزدیک ایک انتہائی ناپسندیدہ عورت تھی اب مرخانم نے شاہی حملات کے بارے میں راجپوت زادی کے خیالات بیان کئے تو علاء الدین غضب ناک ہو گیا۔ اسی وقت کنیز مرخانم کو طلب کر کے باز پرس کی گئی۔ مرخانم، ملک کانور کی حمایت کے سبب مطمئن تھی اس لئے نہ ملا کماری کی باتوں کو بوھا چڑھا کر بیان کرنے لگی پھر بھی اس نے ملک کانور کی ہدایت پر درمیان سے امیر خسروؒ کا ذکر حذف کر دیا۔

سلطان نے جلتے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ پورا واقعہ سننا اور مرخانم کو ہاتھ کے اشارے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تمنائی بات ہی ملک کانور نے ڈرتے ڈرتے رام دیو کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

”تخت و تاج لٹ گئے، گھروں میں آگ لگ گئی، کوچہ در کوچہ رسوائیاں ہوئیں مگر اس راجپوت لڑکی کا غرور نہیں گیا۔“

”نہیں ملک!“ علاء الدین چیخ اٹھا جلال شاہی کے سامنے کسی کا غرور برقرار نہیں رہتا۔ خدا کی قسم، ہم عاجز و ناتواں نہیں ہیں۔ ہم نے اسے ایک مجبور لڑکی سمجھ کر چشم پوشی سے کام لیا تھا۔“

کا آخری گوشہ بھی بے نقاب کر دیا۔ ”اگر نہ ملا بوڑھے شاعر کے یساں چلی گئی تو پھر تمام عمر کف افسوس ملتا رہے گا۔ آگے بڑھ اور اپنے دشمن کے چہرے پر ذلتوں کی ایسی سیلابی مل دے کہ اس کی موت بھی ان دھبوں کو دور نہ کر سکے۔“

ملک کانور بہت دیر تک ذہنی کشمکش سے دوچار رہا۔ وہ نہ ملا کو کینہز بنانے سے گریزاں نہیں تھا۔ یہ تو اس کی دلی تمنائی تھی کہ وہ آفریدی کو برصِ پر سوار کرے اور اذیتیں پہنچائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ڈرتا تھا کہ کہیں سلطان، نہ ملا کو شاہی حرم میں داخل نہ کر لیں اور پھر اس کی شہرگ کے قریب ایک نیا خطرہ پرورش پانے لگے۔ ملک کانور اس بات سے بھی ہراساں تھا کہ اگر نہ ملا امیر خسروؒ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر انتقام کا یہ موقع ہمیشہ کیلئے اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ملک کانور ہر پہلو پر غور کر رہا تھا اور اس دوران رام دیو اسے بار بار ایک ہی ترغیب دے رہا تھا یساں تک کہ شاہی خواجہ سرانے یہ خوفناک بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

نصف شب کے قریب ملک کانور علاء الدین کی خدمت میں حاضر تھا اور سلطان کے قدموں سے پلٹا ہوا گریہ و زاری کر رہا تھا۔ ”شاہ! میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں کہ حضور کے جوتوں سے لپٹی ہوئی دھول ہوں۔ مگر اہل دربار نے آپ کے اس اقدام کا اچھا تاثر قبول نہیں کیا ہے۔“

علاء الدین خلیجی بھڑک اٹھا۔ ”کیا ہمارے احکام رعایا کی خواہشات کے پابند ہیں؟“

”نہیں فاتح عالم!“ پہلی بار ملک کانور نے رام دیو کا کج اختیار کرتے ہوئے کہا۔

علاء الدین نے چونک کر اپنے محبوب غلام کی طرف دیکھا۔

”ساری دنیا آپ کے جذبات کی غلام ہے۔“ ملک کانور نے خوشامد کا آہن تیز تر کر دیا۔ ”میں تو شاہ کے اس رعب و جلال کی بات کر رہا ہوں جسے آفریدی کی بے ادبی نے مجروح کر دیا ہے۔ بڑے بڑے امراء کی زبانیں حضور والا کے روپر و لڑکھڑائے لگتی ہیں مگر دربار کی اس رسم کو آفریدی نے پامال کر ڈالا۔“

”ہم مجبور تھے ملک؟“ علاء الدین نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”امیر خسروؒ نے اس احسان فراموش کی سفارش کی تھی نتیجہ ہمیں اپنے حکم کو بدل دینا پڑا۔ ہم آفریدی کو بڑی عبرتناک سزا دیے مگر خسروؒ درمیان میں تھے اور خسروؒ کی ناراضگی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔“

”اور اس غلام کا کیا ہو گا جس کی پوری ذات رعایا کی نظروں میں ایک گالی بن کر رہ گئی ہے۔“

ملک کانور نے علاء الدین کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاہ والا! یہ بے پناہ نوازشات کے سبب تمام درباری پہلے ہی مجھ سے خفا تھے۔ آفریدی کی الزام تراشی کے بعد ہر شخص کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت و انتقام کا ایک دریا موجزن ہے۔“

پھر سلطان نے دیکھا کہ ملک کانور رو رہا تھا۔ خلیجی حکمران بے قرار ہو گیا۔ ”ملک! اگر ساری دنیا بھی تیرے خلاف گواہی دے تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں۔ تجھ سے زیادہ ”سلطنت“ خلیجی “ کا وفادار کوئی نہیں۔ ہم تیرے خلاف کھلنے والی زبانیں تو کاٹ سکتے ہیں مگر دلوں پر ہمیں اختیار نہیں۔ ہم لوگوں کے جذبات کو کس طرح چلیں کہ ہمارے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ پھر بھی ہم تجھے سر بلند رکھنے کیلئے عقرب بڑا فیصلہ کرنے والے ہیں۔“

”کیا فیصلہ؟ حضور والا!“ ملک کانور خوشی سے وارفتہ ہو گیا۔

ساتھ ریاضت کرنا چاہتا ہے۔ شور و غل سے دور رہ کر اسے ستاروں کی چالیں سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور وہ سلطان کے اس خواب کی تعبیر بھی تلاش کر سکے گا جس کے تحت علاء الدین ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ خلجی حکمران کو علم نجوم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن جب سے رام دیو نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن سلطان سارے عالم کو فتح کر لے گا اسی روز سے چوتڑ کا شعبہ باز، علاء الدین کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا تھا پھر اسی تاثر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رام دیو نے وہ کمرہ حاصل کر لیا جس کی دیواریں ملک کافر کے کمرے سے ملتی تھیں اس منافی برہمن کا یہی منصوبہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ملک کافر کے قریب رہ سکے اور اس خواجہ سرا غلام کے ذریعے خلجی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر تارے جو علاء الدین کی کمزوری بن چکا تھا۔

مرخانم اس معصوم لڑکی کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی جس کیلئے قصر ہزار ستون کا ہر راستہ اجنبی تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت نرملہ کماری کی وہی کیفیت تھی جو برسوں کی قید کے بعد قفس سے چھوٹنے والے ایک پرندے کی ہوتی ہے۔ آج وہ اس شخص کی پناہ میں پہنچ گئی تھی جسے مانی بھان متی جیسی پار ساعورت نے بھی سلام عقیدت پیش کیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے نرملہ کے ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی ملک کافر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

نرملہ کماری نے حیرت زدہ نظروں سے ملک کافر کی طرف دیکھا۔ مگر پھر فوراً ہی پلٹ کر مرخانم سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ تو مجھے کہاں لے آئی تمک حرام کنیز۔“

”راج کماری! آپ نے مجھے غلط الزام دیا۔ میں تو جس کی خدمت گزار ہوں اسی کے تمک کا حق ادا کر رہی ہوں۔“ مرخانم نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”خوفزدہ نہ ہوں کہ آپ صحیح مقام پر پہنچی ہیں۔“

”لعنت زدہ عورت! تیری وہ ہمدردیاں اور غمگساریاں کیا ہوئیں؟“ نرملہ کماری سخت عالم طیش میں نظر آ رہی تھی۔

”وہ سب ایک فریب تھا۔“ کنیز مرخانم نے شرمناک لہجے میں کہا۔ جیسے وہ قصر ہزار ستون کی خادمہ نہ ہو، کسی بالا خانے کی عیار نائیک ہو۔ ”کیا اعلیٰ نسل لوگوں کو وہ دن یاد نہیں رہے جب انہوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی ایک بڑی جماعت کو حیوانوں کی قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔ سانپوں کی پوجا ہوتی رہی اور بے ضرر معصوم لڑکیاں تمہارے بنائے ہوئے قانون کے قتل میں ذبح کی جاتی رہیں، میں ان ہی بد نصیب دو شیواؤں کے قافلے سے بچھڑی ہوئی ایک لڑکی ہوں جسے گجرات میں اتنی بار لوٹا گیا کہ اب زخموں کا شمار بھی یاد نہیں۔“

”تو راجپوتوں سے اپنے پرانے قرض چکا رہی ہے؟“ نرملہ کماری کا لہجہ بدل گیا اور راجپوتی خون کی گرمی نے اس کے الفاظ میں بھی ایک آگ سی بھردی۔

”یقیناً۔“ مرخانم کی آواز اس طرح بلند ہو گئی تھی جیسے آج وہ خود کسی با اختیار ریاست کی راج کماری ہو اور نرملہ کو وقت کے انقلاب نے قصر ہزار ستون کی بدترین لونڈی بنا دیا ہو۔ ”بے غیرت ہے وہ عورت جو اپنی رسوائیوں کے زمانے کو فراموش کر دے۔“

ملک کافر انتہائی بے حیائی کے ساتھ کمرے کے وسط میں کھڑا اس منظر سے لطف اندوز رہا تھا۔

مرخانم کی گفتگو سن کر نرملہ کماری کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے اذیت ناک موڑ پر تنہا کھڑی تھی اور اس کے گرد کم ظرف

”پھر کم ظرفوں نے شاہ کی ایسی رعایت کو کمزوری کیوں سمجھ لیا۔“ ملک کافر، علاء الدین کی آتش غضب کو ہوا دے رہا تھا۔ ”ایسی ناشکر گزار ہڈ زبان عورتوں کا یہی حشر ہونا چاہئے کہ وہ آخری سانس تک حضور والا کی غلامی کریں۔“ ملک کافر نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی مگر وہ دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ کہیں سلطان حقیقتہً نرملہ کو اپنی کنیزوں کے حلقے میں شامل نہ کر لے۔

”نہیں ملک اب یہ ممکن نہیں۔“ علاء الدین نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہم عورتوں پر جبر نہیں کرتے۔ نرملہ فوج کے ایک ادنیٰ سردار سے وابستہ رہ چکی ہے، اس لئے تیرے شاہ کے لائق نہیں۔“

ملک کافر کو اسی لمحے کا انتظار تھا بے قرار ہو کر بول اٹھا۔ ”تو پھر غلام کے زخموں کا مداوا کر دیجئے۔“

علاء الدین زیر لب مسکرایا۔ ”دنیا تجھ پر ہنسے گی ملک۔“

”مگر میں آفریدی سے انتقام لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“ ملک کافر، علاء الدین کے ٹکڑوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگا۔ ”شاہ کی بلند اقبالی کا صدقہ غلام کو مایوس نہ کیجئے۔“

”جانو بھی اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ چوتڑ کی بوڑھی جادوگر نے اپنی بیٹی کو کس طرح بچاتی ہے؟“ علاء الدین کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے وہ منظر دوبارہ ابھر آیا تھا جب مانی بھان متی نے جشن فتح میں سلطان کو ذلیل کیا تھا اور ہندوستان کا باجبروت شہنشاہ انتہائی کوشش کے باوجود ایک نحیف و لاغر عورت کو اس کی گستاخیوں کی سزا نہیں دے سکا تھا۔ ”ملک اس سرکش لڑکی کو بتادے جو شخص ہمارے محافظ ہونے پر یقین نہیں رکھتا ہم بھی اس کی تکبانی سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔“

ملک کافر نے علاء الدین کے قدموں کو بوسہ دیا اور جانے کیلئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مگر یاد رکھنا ملک کہ اسے کوئی جسمانی آزار نہ پہنچے۔ ہم نے یہ فیصلہ تیری خواہش کے زیر اثر نہیں کیا ہے۔ ہم تو اسے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ہماری نظر کرم پھر جاتی ہے تو اعلیٰ خاندان کے لوگ بھی بیچ بن جاتے ہیں۔ انہیں غلاموں کی غلامی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ اس کے جرم کی عارضی سزا ہے۔ جب وہ اپنے گناہ سے تائب ہو جائے گی تو ہم بھی اسے فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دیں گے۔“

ملک کافر نے رات کا آخری سجدہ ادا کیا اور علاء الدین کے عشرت کدے سے نکل کر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن سرشام کنیز مرخانم نے نرملہ کماری کو اطلاع دی کہ سلطان نے اس کی درخواست قبول کر لی ہے اور وہ آج رات ہی امیر خسرو کے مکان پر منتقل ہو جائے گی۔ نرملہ کماری کو گہری طمانیت کا احساس ہوا۔ اب وہ اپنے آپ کو ایک آزاد شہری سمجھنے لگی تھی۔ پھر اندھیرا پھیلنے ہی مرخانم نے نرملہ کو چلنے کو کہا۔ راجپوت زادی اٹھی اور اپنی ایک ہم جنس پر اعتبار کر کے شاہی حرم سرا کی طویل راہداریاں طے کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ مرخانم اسے کئی پرہیز راستوں سے گزارنے کے بعد قصر ہزار ستون کے مردانہ حصے میں لے آئی۔ یہ فریب کار لونڈی بڑی رازداری کے ساتھ ملک کافر کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

ملک کافر کا کمرہ محل کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اس سے ملحقہ کمرے میں رام دیو رہتا تھا اور اس کے بعد محل کی حدود ختم ہو جاتی تھی یہ نہایت پر فضا مقام تھا کمروں کے عقبی درتچے دریائے جمن کی طرف کھلتے تھے۔

رام دیو نے خاص طور پر سلطان سے اس جگہ کی درخواست کی تھی۔ وہ دن میں سب کے سامنے نماز ادا کیا کرتا تھا مگر سورج نکلنے ہی کمرے کے پچھلے حصے سے باہر آکر سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا اور دل ہی دل میں ”سورج دیوتا“ کی پوجا کرتا تھا۔ رام دیو نے یہ کمرہ طلب کرتے وقت سلطان سے یہی کہا تھا کہ وہ یکسوئی کے

دشمنوں کی اٹھائی ہوئی آہنی دیواریں تھیں جن سے ٹکرا کر خود کو ہلاک تو کیا جاسکتا تھا مگر ربانی کسی طرح بھی ممکن نہیں تھی۔

”اب مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں مرخانم!“ نرملہ کماری نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے شکستہ اعصاب پر قابو پایا اور نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”راج کماری! تمہیں کوئی شکایت ہونی بھی نہیں چاہئے کہ تم اس خون آشام قوم کی سردار رہ چکی ہو۔“ مرخانم کا لہجہ مزید نفرت آمیز ہو گیا تھا۔ ”تمہاری سزا عام راجپوتوں سے زیادہ سنگین ہوگی..... اور تمہارے حق میں وقت کا انتقام شدید تر ہوگا۔“ ابھی مرخانم کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ ملک کا فوراً اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کا حکم دیا۔

مرخانم مسکرائی اور نرملہ کماری پر ایک حقارت کی نظر ڈالتی ہوئی واپس جانے لگی۔

نرملہ کماری نے شاہی کنیر کو جاتے ہوئے غور سے دیکھا۔ مرخانم کی رفتار میں ساری دنیا کی بے حیائیاں سمٹ آئی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ ملک کافور کا خیال تھا کہ نرملہ کماری وحشت زدہ ہو کر پیچھے لگے گی یا پھر خود دروازہ کھولنے کیلئے بھاگے گی مگر راجپوت زادی نہایت اطمینان سے اپنی جگہ کھڑی رہی پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ مرخانم بہت دور جا چکی ہے تو وہ ملک کافور سے مخاطب ہوئی۔

”مجھے یہاں کس لئے لایا گیا ہے؟“ نرملہ کے لہجے میں دیہاکمانہ وقار تھا۔ ”اس کنیر نے کہا تھا کہ مجھے امیر خسروؒ کے مکان پر لے جایا جا رہا ہے۔ میں دہلی کے راستوں سے نا آشنا ہوں ورنہ اس طرح فریب نہ کھاتی اور مجھے میری مرضی کے بغیر اس ناپاک جگہ پر پہنچایا نہیں جاسکتا تھا۔“ نرملہ نے چند الفاظ میں ملک کافور کے ذلت آمیز اور سیاہ اقتدار کی نفی کر دی تھی۔

شاہی خواجہ سرائیک مجبور لڑکی کا یہ طرز تخاطب دیکھ کر لبرز اٹھا۔ ”بد نصیب لڑکی! وقت تجھے در بدر پھرا رہا ہے مگر تیری عادات نہیں بدلتی۔“

نرملہ کماری خاموشی سے سستی رہی۔

”کیا تو سمجھتی ہے کہ تجھے وہ بوڑھا شاعر میرے پیڑھے ستم سے بچالے گا۔“ ملک کافور نے حضرت امیر خسروؒ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی حیثیت ہی کیا ہے یہاں؟ کیا وہ تجھے پناہ دے سکتا ہے؟“

ملک کافور کے دل کی ساری کدورتیں زبان پر آگئی تھیں اور وہ اپنی غلیظ روح کا کثیف غبار ایک بند کمرے میں نکال رہا تھا۔ سرد بارہو امیر خسروؒ کی طرف غلط نگاہ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا مگر آج تنہائی میں اسے بے حیاء غلام کے ہونٹوں سے نفرتوں کا زہر پیک رہا تھا۔

”میں خدا کے سوا کسی دوسرے کی مدد پر یقین نہیں رکھتی مگر خسروؒ ایک عظیم انسان ہیں۔ جب مائی پھان متی ان کے آگے احترام سے سر جھکا سکتی ہیں تو پھر میری کیا حیثیت ہے؟“ نرملہ کماری کے لہجے میں غیرت مند اور شجاع عورتوں کا فطری جلال تھا۔ ”انہیں دیکھ کر انسانیت پر اعتبار آجاتا ہے۔ شاید ان ہی کی دعاؤں سے قصر ہزار ستون اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ ورنہ اب تک اس کے مکین بقعہ اجل ہو چکے ہوتے۔“

”تو پھر اسی بوڑھے شاعر کو پکار کہ وہ تیرا مقدر بدل ڈالے۔“ ملک کافور مشتعل ہو گیا۔

”میری تقدیر تو وہی ہے جو لکھ دی گئی ہے..... اور میں اسے ہی پکاروں گی جو پیکارنے کے لائق ہے۔“ خطرات کے بجوم میں بھی نرملہ کماری کی بے خوفی برقرار تھی۔

”تیری تقدیر تو میں لکھوں گا نرملہ کماری!“ ملک کافور غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ ”وہ تقدیر جس سے دنیا کی مفلس ترین عورت بھی مایہ ناکے گی۔“

”اپنا مقصد بیان کر اور مجھے باہر جانے دے کہ میں تیرے سلطان کے عالی شان محلات کو آخری سلام کر سکوں۔“ نرملہ کماری کچھ اور بیباک نظر آنے لگی تھی۔

”قصر ہزار ستون میں داخل ہونے کے بعد واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔“ ملک کافور اپنی تمام تر خباثتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنسا۔ ”سلطان کے بعد ملک کافور ہی دوسری طاقت ہے جس کے اشارے پر موت و زیت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اگر تو چاہتی ہے کہ یہ دروازہ دوبارہ کھل جائے تو مجھ سے میرے رحم کی بھیک مانگ۔“

”اور اگر میں انکار کر دوں؟“ اچانک نرملہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا مسیم ابھر آیا تھا۔

”تو پھر میں تجھے جینے نہیں دوں گا نرملہ!“ ملک کافور کا معیار گفتگو بہت پست تھا اور وہ ایک راج کماری سے بڑا عامیانه سلوک کر رہا تھا۔ ”پھر نہ زندگی تیری ہوگی اور نہ موت۔ دنیا کے سارے غم اور سوائیاں تیرے مقدر میں لکھ دوں گا۔ تو مجھے نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟ اگر آفریدی میرے آگے جھک گیا ہوتا تو آج اس طرح زنداں کے اندھیروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتا۔ میں اس پر دولت و اقتدار کی بارش کر دیتا کہ میرے سوا یہاں کوئی تقدیر ساز نہیں۔“

”میں تجھے خوب جانتی ہوں۔“ نرملہ کماری کے لہجے میں وہی بے نیازی تھی۔ ”تو ملک کافور ہے۔ انسانی تاریخ کے اوراق پر غلاظت کا ایک ڈھیر جسے صاف کرنے کیلئے آفریدی جیسے مردوں کو نذر اٹھا جان پیش کرنا ہی پڑتا ہے۔“

ابھی کمرے میں نرملہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اس گونج میں ایک اور آواز شامل ہو گئی یہ آواز ملک کافور کے اس تھپڑ کی تھی جو نرملہ کے سرخ و سفید رخساروں پر ایک گراٹھن چھوڑ گیا تھا۔

راجپوت زادی سانے میں آگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک کافور اس جارحیت پر اتر آئے گا۔ ”ذلیل خواجہ سرا! تو مجھے نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟“ یکایک نرملہ کی آواز غصہ ناک ہو گئی۔

”اگر تجھے اتنا ہی شوق ستم ہے تو شمشیر اٹھا اور میرے ہاتھ میں بھی تلوار دے۔ پھر تیرا سلطان ہی نہیں، تمام اہل دربار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس کمرے کا فرش کس کے خون سے رنگین ہوا ہے۔“

ملک کافور کچھ دیر کیلئے سہم سا گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مہمانسزئی و کرم سنگھ کی بیٹی بھی فنون سیاہ گری سے واقف ہوگی۔ وہ نرملہ کو عیش و نشاط کی خواب آور فضا میں پلنے والی ایک نرم و نازک سی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ پھر جب راجپوت زادی کے تیور بدل گئے تو ملک کافور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تو ایک ستم رسیدہ عورت ہے نرملہ! میں تجھ سے الجھنا نہیں چاہتا۔“ ملک کافور نے اپنی ندامت منانے کیلئے چیخ کر کہا۔

نرملہ کماری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ملک کافور کو مسلسل قہر آلود نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

”آج کے بعد سے اپنی حیثیت پہچان لے کہ سلطان معظم نے تجھے میری کنیروں کے حلقے میں داخل کر دیا ہے۔“ بالآخر ملک کافور نے اپنی سفلی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ”اگر تجھے زندگی عزیز ہے تو میری خدمت گزاری کو اپنا مذہب سمجھ ورنہ سارے جہاں کی لعنتیں تیرا مقدر بن جائیں گی۔ میں تجھے صرف ایک رات کی مہلت دیتا ہوں۔ یہ رات تیرے فیصلے کی رات ہوگی۔ محفوظ اور آسودہ زندگی یا اذیتوں سے

بھری ہوئی موت؟

”سوچنے کی مہلت تو وہ مانگتے ہیں جنہیں زندگی سے محبت ہوتی ہے۔“ نرملا کالجہ شرفشاں تھا۔
”موت جس کی ہمد ہو رنج و الم جس کے چارہ ساز ہوں اور رسوائیاں جس کی دوست ہوں وہ ایک لمحے
کیلئے بھی نہیں سوچتا۔ اپنے سلطان کو میرے فیصلے سے باخبر کر دے کہ اس کا یہ وحشیانہ حکم میرے لئے اتنا بھی
لائق توجہ نہیں جتنی کہ ایک بھکاری کی لرزتی ہوئی صدا۔“
ملک کافور کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

شاہی خواجہ سرا کے جانے کے بعد نرملا کماری نے نئی صورت حال پر غور کیا۔ اب اس کی داستانِ حیات
کا ایک اور اذیت ناک باب شروع ہو گیا تھا۔

ملک کافور اپنے کمرے سے نکل کر رام دیو کے کمرے میں پہنچا۔ عیارِ شعیبہ باز عقبی درستیج میں کھڑا ہوا
ان ہواؤں کا لطف لے رہا تھا جو دریائے جمنہ کے سردیانی کو چھو کر قصر ہزار ستون میں داخل ہوئی تھیں۔ آج
کل دریائے جمنہ میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور سرکش موجوں کا شور رات کے سنانے میں عجیب سی آوازیں پیدا
کر رہا تھا۔ ملک کافور کے داخل ہوتے ہی رام دیو پلٹ آیا۔ اس کے غلیظ ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ
رقصاں تھی اور آنکھوں میں کئی سوال لرز رہے تھے۔

”میں اس محاذ پر بھی جیت گیا۔“ ملک کافور نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”میری فتوحات کا دائرہ بڑھتا
جا رہا ہے گیانی! آج مجھے اندازہ ہو گیا کہ سلطان میری کسی خواہش کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“
”تو بھوش (مستقبل) کا سراٹ ہے گوپی رام۔“ منافق رام دیو مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے
پہلی بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ رام دیو کے دونوں ہاتھ ملک کافور کے کاندھوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ
شاہی خواجہ سرا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ”یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو رہا ہے۔ تیری کامیابیوں میں
ہندوستان کے سب سے بڑے گیانی کا آئینہ واد بھی شامل ہے۔“

ملک کافور نے خاموشی سے اپنے سر کو جنبش دی۔ ”گیانی! تیرے دہلی آ جانے سے مجھے بڑی تقویت
حاصل ہوئی ہے۔ میں کئی سال سے اکیلا ہی اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ اب تو آگیا ہے تو میں
اپنے اندر نیا حوصلہ پارہا ہوں۔“

”یہ کامیابیاں کچھ نہیں گوپی رام! میں تجھے راج سنگھاسن پر برا جہان دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کیا
عجیب وقت ہو گا جب پورا بھارت درش تیرے قدموں پر جھک جائے گا۔ میں نے کل رات بھی تیرے
زائچے پر غور کیا ہے۔ ستارے اسی انداز میں سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ ایک دن کٹ (تاج) تیرے سر
پر سجایا جائے گا۔“

”تیرا گیانی سچا ہے، رام دیو! مگر نرملا کے تصورِ بہت خوفناک ہیں۔“ ملک کافور نے اچانک گفتگو کا
موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اگر کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھ میں خنجر ہوتا تو تجھے میرے کاندھوں پر سر نظر
نہیں آتا یا پھر وہ وحشی لڑکی میرا سینہ چاک کر چکی ہوتی۔“ ملک کافور نے نرملا کماری کے بارے میں ساری
تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

”مت گھبرا گوپی رام! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ رام دیو کی ہوس کار آنکھوں میں کئی خواب
کردنیں لینے لگے تھے۔“

”مجھے یقین نہیں گیانی کہ وہ میری بات مان جائے گی۔“ ملک کافور گھبرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”عورتوں
کا تو ذکر ہی کیا، میں نے بغاوت کے ایسے خوفناک شعلے تو کسی مرد کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھے۔ آخر تو
کس بنیاد پر کہتا ہے کہ نرملا میری خواہشات کے آگے سر جھکا دے گی؟ اس نے مجھے آفریدی سے بھی زیادہ
غلیظ گالی دی ہے۔ میں اس کے نزدیک صرف ایک خواجہ سرا ہوں۔“ ملک کافور کا چہرہ احساس
ندامت و محرومی سے دھواں ہو رہا تھا۔ ”خدا کی لعنت ہو ہندو لال پر کہ اس نے مجھے کہیں کانٹیں چھوڑا۔“
ملک کافور اپنے ماضی کو یاد کر کے ایک ایسی آگ میں جلنے لگا تھا جسے ساری دنیا کی دولت اور اقتدار مل کر بھی
نہیں بجھا سکتے تھے۔

”گزرنا زمانہ واپس تو نہیں آ سکتا گوپی رام! مگر تو اپنی بہت سے وقت کی باگ موڑ سکتا ہے۔“ رام دیو نے
ملک کافور کو ٹوٹے ہوئے دیکھا تو لہجہ بدل کر تسلیاں دینے لگا۔ ”مجھے ان سب کے ہاتھ کاٹنا ہوں گے جن
کی انگلیاں تیری طرف اٹھتی ہیں۔ آفریدی کی بدترین سزایہ ہوگی کہ نرملا، نرملانہ رہے۔ راج دربار کی دیشیا
بن جائے۔ پھر اگر وہ زندہ بھی رہے تو کیا ہے؟ اس سے اس کا مان چھین لے۔“

”میں نرملا کی طرف سے بہت مایوس ہوں۔ گیانی!“ ملک کافور کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ”میں
تو اسے زیادہ دیر تک اپنے کمرے میں بھی نہیں رکھ سکتا۔ پتہ نہیں، وہ کب مجھ پر بے خبری کے عالم میں وار
کر دے۔ جو عورت ایک شاہی سپہ سالار کو مقابلے کیلئے لاکار سکتی ہے اس پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے۔“
ملک کافور کی گھبراہٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ”کیا وہ شمشیر زنی کے فن سے واقف ہے؟“
اچانک ملک کافور کو کچھ یاد آگیا اور وہ رام دیو سے سوال کرنے لگا۔

”شاید!“ رام دیو نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وکر م سنگھ کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس
لئے اس نے اپنی لڑکی کو بھی مردوں کی طرح تربیت دی تھی۔“ رام دیو کے حافظے میں ماضی کی کچھ یادیں
تازہ ہو گئی تھیں۔ ”وہ کئی بار شہسواری کے مقابلے میں سرفہرست رہ چکی ہے۔ ریاست چوڑ کے جانباڑ
نوجوان بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے تھے۔“ رام دیو نے حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

یہ سن کر ملک کافور کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ”پھر ایسی لڑکی پر کون قابو پاسکتا ہے؟“
ملک کافور کے لہجے سے شدید مایوسی جھلک رہی تھی۔

”کیسی بزدلانہ باتیں کرتا ہے گوپی رام؟ تیرے پاس طاقت ہے۔“ رام دیو کی آواز تیز ہو گئی تھی۔
”تو بات اختیار ہے؟ پھر اس گنبد میں اس بد نصیب لڑکی کی چیخیں سننے والا کون ہے؟“
”سلطان کا حکم ہے کہ میں اسے کوئی جسمانی آزار نہ پہنچاؤں۔“ ملک کافور نے علاء الدین کے الفاظ
دہراتے ہوئے کہا۔ ”پھر جب اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور وہ اپنے گناہ سے تائب ہو جائے گی تو
سلطان اسے معاف کر دیں گے۔“

”نرملا کی معافی تیری موت ہے گوپی رام! ایک بار شکست کھا لی تو پھر ہارنا ہی چلا جائے گا۔“ رام دیو نے
ملک کافور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”راجہ جی کا پہلا اصول ہے کہ دشمن کو سانس لینے کا موقع بھی فراہم نہ کیا
جائے۔“

”میں پریشان ہوں گیانی! بہت زیادہ پریشان۔“ ملک کافور کے چہرے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔
”اگر سلطان یہ شرط عائد نہ کر دیتے تو میں اس راجپوت زادی کو بھی وہی سزا دیتا جو قاصد زہرہ جمال کا مقدر
بنی شاید اس سے بھی زیادہ لرزہ خیز اور عبرتناک۔“

”اپنے اقتدار کا مظاہرہ کر گوبی رام کہ تجھے بہر حال ہندوستان کا شمنشاہ بننا ہے۔“ رام دیو نے ملک کافور کو ہراساں کر دیکھ کر ایک اور زاویہ بدلا۔ ”سلطان سیاست کے ہنگاموں میں الجھا ہوا ہے۔ اسے اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ تجھ سے نرملا کے روز و شب کا حساب طلب کرے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ تیرا سلطان پدمینی جیسی عورت کو بھلا بیٹھا۔ شمنشاہیت کی یہی ادائے خاص ہوتی ہے کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کا شمار نہیں کرتی۔“

رام دیو کی تقریر کا طلسم رنگ لارہا تھا اور ملک کافور کی وحشت کم ہوتی جا رہی تھی۔

شہابی خواجہ سرا کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر رام دیو نے اسے مشورہ دیا۔ ”شکار تیری طاقت کے حصار میں موجود ہے اس سے پوری لذت حاصل کر۔ نئے نئے انداز سے آزار پہنچا پہلے اسے دولت کی چمک دکھا کر فریب دے۔ آفریدی کو اسی کی محبوبہ کے ہاتھوں ذلیل کرانے کی کوشش کر۔ پھر اگر وہ آمادہ نہ ہو تو بھرپور تشدد سے کام لے، میں تیرے ساتھ ہوں۔ مجھے بھی تو کرم نگہ کی آوارہ روح سے اپنا حساب چکانا ہے۔“ رام دیو خواجہ سرا ملک کافور کے پردے میں کچھ اور ہی کھیل کھیلنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ملک کافور، سلطان کے عشرت کدے میں حاضری دینے کے بعد آدھی رات کے قریب واپس پہنچا۔ اس وقت نرملا کماری، ملک کافور کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں موجود تھی۔ مہر خانم اور دوسری کنیزیں اس کام کیلئے مامور کی گئی تھیں کہ کہیں نرملا کماری کمرے سے باہر نہ نکل جائے اور پھر ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔ جب ملک کافور کمرے میں داخل ہوا تو نرملا کماری کنیزوں کے درمیان فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کا انداز بے نیازانہ تھا جیسے وہ کسی محفوظ مقام پر ہو۔ ملک کافور اس پر ایک اچھتی سی نظر ڈالتا ہوا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ مہر خانم بھی شہابی خواجہ سرا کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں پہنچی جسے انتہائی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔

”حضور!“ مہر خانم ملک کافور کے سامنے جھک گئی۔ ”یہ خود سر لڑکی کسی طرح بھی آپ کی خدمت گزاری کیلئے آمادہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔“ ملک کافور ایک بار پریشان نظر آنے لگا مگر فوراً ہی اسے رام دیو کا مشورہ یاد آگیا کہ نرملا کا انکار و بارِ شہابی میں اس کے اثرات کو زائل بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جابرانہ اقدام کرے اور نرملا کماری کا ہاتھ اسرا اپنے پیروں میں جھکا دے۔

”تو جابر خانم! میں اس راجپوت زاوی کے حوصلے آزمائوں گا۔ وہ نہیں جانتی کہ چوڑا اور وہلی کے دربار میں کتنا فرق ہے؟“

مہر خانم بظاہر مسلمان تھی مگر اس نے ابھی تک ہندوانہ رسمیں ترک نہیں کی تھیں۔ رخصت ہوتے وقت وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ملک کافور کے قدموں میں جھک کر رات کا آخری سلام کیا۔ ملک کافور نے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہر خانم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ عیار کنیز خواجہ سرا کی خواب گاہ سے نکل کر چلی گئی۔ دوسری کنیزیں بھی مہر خانم کے ساتھ تھیں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور نرملا کماری تنہا رہ گئی۔

مہر خانم کے جاتے ہی ملک کافور ان تمام خنجر وں اور تلواروں کو اتار کر الماریوں میں بند کرنے لگا جو کمرے کی زیناباش کیلئے دیواروں پر آویزاں کئے گئے تھے۔ یہ اس خوف کا رد عمل تھا جو نرملا کماری کی طرف

سے اس کے دل کی گھرائیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ اس بہادر لڑکی کے مہیا کا نہ سلوک سے خائف تھا جو کسی وقت بھی اس کی موت کا سبب بن سکتی تھی، پھر اس کے بعد ملک کافور نے شراب کا ایک لبریز جام ہونٹوں سے لگایا۔ بادہ نشی کے دوران وہ نرملا کماری کو زیر کرنے کے مختلف طریقے سوچتا رہا اور کچھ دیر بعد ایک خفیہ دروازے سے نکل کر اس کمرے میں آگیا جہاں نرملا کماری اپنے خیالات میں غرق سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ملک کافور کے قدموں کی چاپ سن کر نرملا نے سر اٹھایا اور پھر دوسرے ہی لمحے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ملک کافور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور بڑے زہر آلود لہجے میں نرملا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”و کرم نگہ کی خود دار بیٹی! یہ میری مملکت ہے یہاں اسی شخص کی غیرت برقرار رہ سکتی ہے جس سے ملک کافور خود راضی ہو۔“

نرملا کماری نے اس بے حیاء خواجہ سرا کی جانب دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

”یہ میرے اقتدار کا تقیر کیا ہوا زنداں ہے۔“ ملک کافور نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”یہاں کوئی بھوکا رہے یا پیاسا! میں اپنے نافرمان کو اتنی آسانی سے مرنے نہیں دیتا۔ مجھے تیری زندگی پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ تو اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک میں تیری موت کے حکم نامے پر مہر شہابی ثبت نہیں کر دیتا۔“ نرملا کماری نے ایک نگاہ غلط انداز سے ملک کافور کی طرف دیکھا۔ ”میں نے اپنی گمراہی کے دور میں بھی دیوتاؤں سے آبرو مندانہ زندگی کی پراگتھنا کی تھی پھر جب میں ایک خدا پر ایمان لائی تو میرے دامن پھیلانے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اب میں زندگی کی کوئی تمنا نہیں رکھتی۔ میں اپنے پیدا کرنے والے سے دن رات ایک ہی دعا کرتی ہوں کہ مجھے موت آجائے۔ ایسی موت جو غیرت مندوں کا مقدر ہوتی ہے۔“

”نرملا! تیری زندگی اور موت ہمارے ہونٹوں کی جنبش سے مشروط ہے۔ تیری پرسکون زندگی کیلئے اب صرف دورا سے باقی ہیں۔ ایک یہ کہ تجھے دل و جان سے میری خدمت گزار کی کافر فیضہ انجام دینا ہو گا۔ جب میں امور سلطنت کی تکمیل کے بعد تھک کر چور ہو جاؤں تو تیرے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھے تازہ دم کر دے، تیرے نازک ہاتھ جام سرخ پیش کریں اور مخروطی انگلیاں رباب کے تاروں کو چھیڑ دیں۔ یہاں تک کہ میں نغمہ و شراب کے اثر سے مسحور ہو کر خوابوں کے جزیرے میں چلا جاؤں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو آج تک کسی عورت کو نہیں بخشا گیا۔ مگر میں تجھے سرفراز کرنا چاہتا ہوں کہ تو میرے دشمن علی عامر آفریدی کی محبوبہ ہے۔“ ملک کافور شراب کے نشے سے سرشار تھا اور بڑی ہلکی ہلکی باتیں کر رہا تھا۔ ”اگر تو آفریدی کو میرے سامنے ایک بار ذلیل کر دے تو میں تجھے ان عظمتوں کا تاج پہناؤں گا جس کے بارے میں تو نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔“

نرملا کماری اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر اس نے شہابی خواجہ سرا کی اس شرمناک پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ملک کافور کی بزدلی اور بے حیائی نے اس خاموشی کا یہی مفہوم لیا کہ نرملا اس کی باتوں سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔ ”اور اگر تو نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا تو میں تجھے طویل اذیت رسانی کے بعد اس قدر بھیانک موت سے دوچار کروں گا جو زندگی میں اپنی مثال آپ ہوگی۔“

نرملا بدستور خاموش رہی وہ بڑے حوصلے کے ساتھ شہابی خواجہ سرا کی دھمکیوں کو برداشت کر رہی تھی۔ ”موت سے پہلے ہم تجھے بہت رسوا کریں گے نرملا۔“ ملک کافور نے ایک مجبور لڑکی کو دہشت زدہ کرنے کیلئے مزید جارحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے جسم پر لباس کا کوئی تار باقی نہ

سے محبت کرنے والے کہاں جاسکتے ہیں؟ لوگ توڑنا بھی چاہیں تو یہ رشتے نہیں ٹوٹ سکتے۔ وہ چپ چاپ مجبور یوں کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کے دکھ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ سچے ہیں۔

”اگر تو میری ہمدردی ہے تو اپنی بیٹی کو عذاب کے اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی؟“ نرملا نے سانس کھینچ کر کہا۔ ”یہ لوگ میرے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں؟“

”میں تیرے پاس ہوں نرملا!“ بھان متی خلش دل سے بے قرار نظر آ رہی تھی۔ ”ہر لمحہ تیرے قریب رہتی ہوں۔ تجھ پر گزرنے والی ایک ایک قیامت کو دیکھ رہی ہوں۔“

”پھر مجھے قہر کے اس زنداں سے نکال کر کہیں دور کیوں نہیں لے جاتی؟“ نرملا نے کسی معصوم بچے کی طرح چلنے ہوئے کہا۔ ”آپو کی چوٹیوں سے بلند، تاروں کے پار، بہت دور..... بہت دور۔“

”تو اپنی ماں کی طرف کیوں نہیں دیکھتی بیٹی؟“ مائی بھان متی نے نرملا کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری جانب دیکھ کہ دنیا والے مجھے تمام عمر طواف زادی کہہ کر پکارتے رہے۔ تو اندازہ کر سکتی ہے کہ میرے سینے پر محرومیوں اور غموں کا کتنا بوجھ ہے؟ پھر بھی میں زندہ ہوں، پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ۔ الزاموں اور تہمتوں کی اس بارش نے میری روح کو نئی تازگی بخشی۔ میرے دل کی بجز زمین سے ایمان کی فصل پھوٹی۔ اگر یہ پتھر کے پجاری مجھے اتنے آزار نہ پہنچاتے تو میں ایک خدا کی تلاش میں گھر سے کس طرح نکلتی؟ اپنے پیدا کرنے والے کو کیسے پکارتی؟ درد کا طوفان اٹھاتو میں نے سچ کر اسے پکارا۔ اس نے میری پکار کا جواب دیا، میری مدد کو آیا اور مجھے توہمات کے منہ ہار سے نکال کر یقین کے کنارے تک لے گیا۔ آفات و مصائب کی بلخار سے پریشان نہ ہو میری بیٹی! اس کے نام لیواؤں کو آزمائش کے اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا ہے لوگ تو پتھروں کی خاطر ہنستے ہنستے اپنی جانوں کی بھیٹ چڑھا دیتے ہیں۔ پھر تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ بے صبری اور بے اختیاری کیوں؟ کسی سے عہد کیا ہے تو نبھادے..... ورنہ تجھ میں اور رام دیویوں کی تفریق رہ جائے گا؟ بس میں تجھ سے یہی کہنے آئی تھی کہ اگر کوئی عورت ماں ہے تو وہ اپنی بیٹی سے دور نہیں رہ سکتی۔ یہ کہہ کر مائی بھان متی نے دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

خواب بکھر گیا اور نرملا گہرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ظلم اور نا انصافی کے حصار میں پائی جانے والی ہر شے اپنی جگہ موجود تھی۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ بس ایک مائی بھان متی ہی نہ تھی۔ نرملا نے بار بار اپنے اطراف پر نظر ڈالی۔ جانے والی جا چکی تھی اور اس کے قدموں کا عکس تک باقی نہ تھا۔ نرملا، بھان متی کو یاد کر کے رونے لگی۔ اب تک وہ غمگین چہرہ آنکھوں سے روپوش تھا۔ خواب میں آیا تو ماضی کی یادیں ابھر آئیں۔ یادوں کی لے تیز ہوئی تو پلکیں جھپکنے لگیں۔ نرملا دوبارہ اٹھی اور آہنی سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ جہان کی موجیں اسی طرح بے چین تھیں اور قصر ہزار ستون کے پتھروں سے اپنا سر نکرا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اگرچہ داروغہ زنداں سلیمان بن یوسف، آفریدی پر بہت مہربان تھا مگر زنجیریں پھر زنجیریں تھیں اور اسیری پھر اسیری تھی۔ تنہائی اور قید کے اندھیروں میں اس کا دم گھٹنے لگتا تھا اور ساری ساری رات جاگتے ہوئے گزر جاتی تھی یادوں کا ایک سیلاب تھا جو زنداں کی دیواریں توڑ کر اندر داخل ہو جاتا تھا اور پھر آفریدی کی خاموش دنیا تہہ و بالا ہو کر رہ جاتی تھی۔

کبھی مرحوم باپ کا چہرہ اس طرح روشن ہو جاتا کہ وہ اپنے بیٹے کو فرمانروائے وقت سے وفاداری کی تلقین

رہنے دیں۔ ”شاہی خواجہ سرانیک شریف زادی کے ساتھ بدترین سلوک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تجھے سرور بار قص کرنے پر مجبور کر دیں۔“ ملک کا فورہ وحشیانہ انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا۔ ”اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم تجھے بہت سچ لوگوں کی داشتہ بنا ڈالیں۔“

نرملا کماری نے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ ملک کا فورہ کی دھمکیاں سنیں اور مڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ دریائے جہان میں تلاطم برپا ہوا تھا۔ طغیانی کے سبب پانی کی موجیں شدید تپ و تاب میں مبتلا تھیں۔ اس وقت کوئی اہل دل موجود نہیں تھا ورنہ وکرم نگہ کی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر اسے اندازہ ہو جانا کہ دریائے جہان سے زیادہ خوفناک طوفان خود نرملا کے سینے میں اٹھ رہا ہے۔

نرملا نے لوہے کی سلاخوں سے باہر کی سمت دیکھا جہاں ہر شے اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ کمرے کا عقبی دروازہ تھا جسے ایک بھاری قفل کے ذریعہ بند کر دیا گیا تھا۔ نرملا نے آہنی سلاخوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی اور گہری تاریکی میں روشنی کی اس کرن کو تلاش کرنے لگی جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔

ملک کا فورہ قہقہہ زن ہوا۔ ”جہان بھی ہمارے حکم سے ہستی ہے نرملا! تجھے پانی کی تہہ میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ یقیناً تیرا انجام خود کشی ہے..... مگر ابھی نہیں۔ رسوائیوں کا منظر دیکھ لے، پھر بھوک اور پیاس کے راستے سے گزر کر خود کو ہلاک کر ڈالنا، آگ لگا لینا یا بستے ہوئے پانی میں اتر جانا۔ آج کی رات..... فقط آج کی رات..... یہ بھی بڑی مہلت ہے۔ کل ہم کوئی عذر نہیں سنیں گے۔“ ملک کا فورہ نے اس طرح نرملا کماری کے سامنے مختلف احکامات جاری کئے جیسے وہ مملکت ہند کا با اختیار حکمران ہے اور نرملا اس کے سایہ کرم میں پرورش پانے والی کمزور ترین مخلوق۔

نرملا نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور ملک کا فورہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

نرملا کچھ دیر آہنی سلاخوں سے سر ٹیکے کھڑی رہی۔ پھر اسے کسی قدر کمزوری کا احساس ہوا۔ آج نرملا نے شدید غصے کے سبب کھانا نہیں کھا یا تھا۔ وہ اپنی ذات پر قصر ہزار ستون کا ہر عیش و سکون حرام کر چکی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ یا تو عزت مندانہ طور پر محلات شاہی کی حدود سے نکل کر کہیں اور چلی جائے گی یا پھر اسی طرح بھوک اور پیاسی مرجائے گی۔ نرملا جانتی تھی کہ اس کا یہ احتجاج رائیگاں جائے گا مگر موت کے سوانحیات کا کوئی دوسرا راستہ بھی باقی نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر اسے کمزوری محسوس ہوئی تو وہ کمرے کے اسی عقبی دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ ایسی سنگین فضا میں نیند کہاں آتی ہے مگر جہان کے پانی کو چھو کر آنے والی سرد ہواؤں نے اسے کچھ دیر کیلئے سلا دیا۔

اچانک نرملا کماری نے مائی بھان متی کو دیکھا جو کمرے کے دروازے سے داخل ہوئی اور بڑے والہانہ انداز میں نرملا کی طرف بڑھنے لگی۔ نرملا دیوانہ وار اٹھی اور بھان متی کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

”مجھے سب چھوڑ کر چلے گئے ماں!“ نرملا، بھان متی سے اہل دنیا کی بے وفائی اور وقت کے جوہر و ستم کا شکوہ کر رہی تھی۔

”بیٹی! تجھے کسی نے نہیں چھوڑا ہے۔“ بھان متی، نرملا کو ایک شفیق و مہربان ماں کے لہجے میں تسلیاں دے رہی تھی۔ ”جو اپنوں کے ہمیش میں پرانے تھے وہ یقیناً چلے گئے۔ اور ان کا چلا جانا ہی بہتر تھا۔ مگر تجھ

اور کسی کو نرملا کا راز معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ غمزدہ لڑکی ملک کافور کی بدترین قید میں اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی۔ نرملا نے دوسرے دن بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کی ثقاہت غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ ملک کافور دربار سے اٹھ کر سیدھا اس کمرے میں پہنچا جہاں نرملا ایک قیدی کی طرح فرش پر دراز تھی۔ شاہی خواجہ سرا کو محل کی کنیزوں نے بتایا کہ نرملا کسی طرح بھی غذا کے استعمال کیلئے آمادہ نہیں ہے۔ ملک کافور کے قدموں کی آہٹ سن کر نرملا اٹھ بیٹھی اور اسی انداز میں منہ پھیرے ہوئے کمرے کے عقبی دروازے تک چلی گئی جہاں سے دریائے جمن کا تیز رفتار پانی صاف نظر آتا تھا۔

”رات گزر چکی نرملا اور تجھے دی ہوئی مہلت بھی ختم ہو گئی۔“ ملک کافور نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ نرملا کوئی جواب تو کیا دیتی، اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ملک کافور نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ پھر فوراً ہی شراب کی ایک لبریز صراحی اور بلوریں جام لے کر واپس آیا۔ ”ساقی گری کی رسم ادا کر کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ یہ کہتا ہوا ملک کافور نرملا کے قریب پہنچا۔

راجپوت زادی غیر متوقع انداز میں مڑی اور اس نے ملک کافور کے ہاتھ سے صراحی و جام لے لئے۔ خواجہ سرا کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی رقص کرنے لگی۔ مگر یہ خوشی اس وقت فنا ہو گئی جب کمرے کے فرش پر ہر طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور شراب قالین میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

”آئندہ بھی تیری ہر پیشکش کا یہی حشر ہو گا۔“ نرملا نے کہا اور بے نیازانہ چلتی ہوئی درے پچے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ملک کافور نے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ لی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں پہنچا پھر کچھ دیر بعد ہی اس کا ملازم خاص نور الدین نور چند سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا اور نرملا کو کھینچا ہوا اس جگہ لے گیا جہاں ملک کافور ایک آنسو کی سی پر بیٹھا ہوا شغل مئے کر رہا تھا۔

”اے ستون سے باندھ دے نور! اور باہری فضا پر گری نظر رکھ!“ ملک کافور کے ارادے غیر ہو گئے تھے۔

نور نے اپنے آقا کے حکم پر عمل کیا اور نرملا کے چاروں طرف ریشمی رسیوں کا حصار کھینچ کر چلا گیا۔ ملک کافور اپنی نشست سے اٹھا۔ ”تیری طرح آفریدی نے بھی یہی کہا تھا کہ میں صرف ایک خواجہ سرا ہوں۔“ ملک کافور نرملا کے قریب آیا اور شراب کا بھر ہوا جام اس کے چہرے پر الٹ دیا۔ نرملا خاموش کھڑی رہی مگر ملک کافور کی اس حرکت پر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”تجھے میری غلامی منظور ہے؟“ ملک کافور کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ نرملا سے آخری سوال کر رہا ہو۔ ”اگر تیرا سلطان مجھ سے یہ بات پوچھتا تو میں اسے جواب دیتی۔“ بالآخر نرملا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ”تو غلامی کے قابل بھی نہیں بے حیا!“ ملک کافور کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر کچھ دیر بعد نرملا کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہونے لگی۔ ملک کافور کے سینے میں چھپی ہوئی نفرتوں نے بزدلانہ تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ فطرتاً ببادر ہونا اور بات ہے مگر نرملا اول و آخر ایک شاخ گل تھی۔ قہر کی آندھی اسے جھکا تو نہیں سکی لیکن ٹوٹ جانا اس کا مقدر تھا۔ اس نے نئی تازیانوں کی ضربیں برداشت کیں۔ پھر دردی شدت سے چیخی اور بے ہوش ہو گئی۔ کئی جگہ سے اس کا لباس بھی دریدہ ہو گیا تھا۔

کرتے ہوئے نظر آتے۔ آفریدی انتہائی ضبط کے باوجود چیخ اٹھتا۔

”بابا! آپ کا بیٹا رسم وفا نبھاتے نبھاتے یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت کے سربراہ نے اس کے گلے میں ”غدار“ کا طوق ڈال دیا۔ اب آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟“

باپ کا چہرہ اوجھل ہو جاتا تو شائستہ بیگم کی نورانی شکل ابھر آتی۔ مسکراتے ہونٹوں سے شفقتوں کے پھول بکھرنے لگتے۔

”آفریدی! تو اہل وفا کی اولاد ہے۔“

ماں کی یہ دل نہیں آواز ساعتوں میں گونجی تو آفریدی کے زخم خون دینے لگتے۔

پھر بیک وقت کسی گوشے سے عالیہ نمودار ہوتی اور شکایت کرنے لگتی۔ ”بھائی! آپ اتنے دن تو گھر سے کبھی دور نہیں رہے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اب آکیوں نہیں جاتے؟“

اس کے ساتھ ہی آفریدی کو وہ بھیاںک خواب یاد آ جاتا جسے وہ ایک تسلسل کے ساتھ چوتھ کے طلسم کدے میں دیکھتا رہا تھا۔ اس خواب کی یاد تازہ ہوتے ہی آفریدی کو محسوس ہوتا جیسے کائنات میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے اور سرخ شعلوں کے درمیان اس کی ماں اور بہن چیخ رہی ہیں۔

آفریدی بے اختیار ہو کر زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگتا۔ ”اے خدا! اے خدا! میرے ساتھ انصاف کر! میں بہت کمزور ہوں۔ تو ان سے میرا بدلہ لے۔ ظالموں کو اس طرح زمین پر کھانا چھوڑ۔ جس طرح میں جلا ہوں، ان کے گھروں پر بھی ایسی ہی آگ برسا دے کہ تیرے سوا میرا کوئی کفیل نہیں۔“

کبھی کبھی آفریدی اپنی نفرتوں کے اظہار کیلئے اتنی طاقت سے چیخا کہ قید خانے کے محافظ بھی لرز اٹھتے۔ پھر دروغ زنداں سلیمان بن یوسف کو اس کی تسلی کیلئے خود آنا پڑتا۔ آفریدی قید خانے کے گمراہ کو دیکھ کر سنبھل جاتا۔ علی عامر پر یہ راز تو پسلی ہی فاش ہو چکا تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کی مداخلت کے سبب سلطان نے اس کی جاں بخشی کی ہے پھر ایک دن سلیمان بن یوسف نے آفریدی کو یہ بھی بتا دیا کہ امیر خسروؒ اس کی خبر گیری کیلئے قید خانے کی دیواروں تک آئے ہیں۔

سلیمان بن یوسف خود بھی ایک باکردار انسان تھا، اس لئے آفریدی سے بہت محبت کرنے لگا تھا۔ پھر جب علی عامر اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا ذکر کرتا تو سلیمان بن یوسف اس غیر متداور مظلوم نوجوان کی بہت بڑھاتے ہوئے کہتا۔

”میرے بچے! ظلم کی یہ ادبست قدیم ہے کوئی زمانہ تشدد اور نا انصافی سے خالی نہیں رہا ہے۔ پھر بھی ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانی گئی ہے اور تو بھی ان ہی جاننازوں میں شامل ہے جن کے سینے فگڑ ہوئے مگر آسمان کی آنکھ نے ان کی پیٹھ نہیں دیکھی۔ اپنے اشکوں کو پی لے کہ یہ آنسو خدا کی عدالت میں تیرے مقدمے کو کمزور کر دیں گے۔ اس سے انصاف چاہتا ہے تو پھر سب کچھ اسی پر چھوڑ دے۔ تو اس غم خانے میں تھما نہیں۔ تیرے سوا یہاں کچھ اور بھی شب گزیدہ ہیں جو بہت دن سے اجالے کی ایک کرن کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ تو بس بے داغ اور روشن صبح کا انتظار کر۔“

سلیمان بن یوسف کی ہمدردیاں اسے پرسکون کر دیتیں اور وہ دوبارہ جی اٹھتا۔ پھر آفریدی نرملا کی کار کا حال جاننے کیلئے بے چین ہو جاتا تو دروغ زنداں یہ کہہ کر معذرت طلب کر لیتا۔

”قصر ہزار ستون میں اس کا گزر نہیں۔ وہ محلات شاہی کے راز جاننے سے قاصر ہے۔“

اس نے ایک غیر مرد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا اور انتہائی ضعف و ناتوانی کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”کون ہے تو؟“ نرم لانے ڈانٹ کر پوچھا اور لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ بستر سے اترنے لگی۔
 رام دیو خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب نرم لاکھ دھندلی آنکھیں صاف ہوئیں تو وہ جوشِ غضب سے چیخ اٹھی۔
 ”رام دیو!“

”رام دیو نہیں، مہاراج رام دیو تیرا آقا۔“

”میرے بزرگوں کی بھیک پر پلنے والا منافق برہمن۔“ نرملا اتنی زور سے چیخی کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لہرا کر فرش پر گر پڑی۔ ”تو یہاں کس لئے آیا ہے؟“

”اس خواجہ سرا کی تو شخص ایک آڑ ہے۔ دراصل سلطان نے تجھے میری خدمت گزاری کیلئے وقف کر دیا ہے۔“ رام دیو بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ شراب اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ ”آج میں تجھے دغاوار کر کے تیرے باپ کی آوارہ روہ سے اپنا سارا حساب چکادوں گا اور تیری ماں، بھانجھائی کو بھی بتادوں گا کہ رام دیو کے منتروں کا کوئی توفر نہیں۔“

نرملانے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر رام دیو کا سیاہ ہاتھ بلند ہوا اور راجپوت زاوی کے چہرے پر گہرے زخم کا نشان چھوڑ گیا۔ رام دیو کے دونوں ہاتھ لوہے کے کڑوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان ہی کڑوں کی ضرب سے نرملادوبارہ فرش پر گر گئی تھی۔ یہ چوٹ اتنی شدید تھی کہ نرملاراجستھنہ کر سکی اب اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر جسم نے مدافعت سے انکار کر دیا تھا۔ رام دیو کی دست درازیاں بڑھتی چلی گئیں اور شیطان کے ایک پجاری نے اس پاکباز دوشیزہ کو بے لباس کر دیا جسے ہواؤں نے بھی بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔ نرملاکا آواز بیٹھ بچکی تھی مگر پھر بھی وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ رام دیو کا آہنی ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور نرملاکے چہرے کی دوسری جانب نیازم ابھرا آیا۔

نرملہ کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔
 کمرے میں رام دیو کا شیطانی قہقہہ گونجنے لگا..... ”آپو کی چوٹیوں پر رہنے والی جادوگرنی! تو اپنی بیٹی
 کا حشر دیکھ رہی ہے؟ اور اے چوڑے کے عظیم سیاستداں! تو نے دیکھا کہ فوج کس کی ہوئی؟“ رام دیو کسی
 درد مند کی طرح رقص کر رہا تھا۔ ”بس چند لمحوں کی بات ہے تیری غیرت و ناموس کی کتاب ورق در ورق ہوا
 میں اڑتی پھرتی ہے گی۔“

پھر کایک رام دیو کے بذیانی قہقہے بند ہو گئے۔ وہ وحشیانہ انداز میں نرملا کی طرف بڑھا۔ راجپوت زادی کے آنسو اس کے چہرے کے زخموں کو دھو رہے تھے اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے رام دیو کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چوڑا کاشعبدہ باز نرملا کے نزدیک پہنچ کر آخری بار ہنسنا اور پھر دفعۃً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا جسم پتھر کا ہو گیا ہے۔ رام دیو پیچھے کی طرف پلٹا۔ اس کے دست و پا چانک حرکت کرنے لگے۔ رام دیو دوبارہ نرملا کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر اس کی وہی حالت ہو گئی۔ خوف و دہشت کی تیز لہر اور فاج زوہ جسم۔ منافق برہمن نے کئی بار یہ عمل دہرایا۔ جب وہ نرملا سے دور ہو جاتا تو اس کی جسمانی طاقت لوٹ آتی تھی اور پھر جیسے ہی وہ نرملا کو چھوئے کی کوشش کرتا تو اس پر ناقابلِ بیان خوف طاری ہو جاتا اور وہ اپنے آپ کو پتھر کا ایک بے جان جسم سمجھنے لگتا۔

آخر اس کشمکش میں بہت دیر ہو گئی۔ رام دیو کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ اپنے بال نوچنے لگا۔ کسی نادیدہ طاقت نے سارا گیان اور سارے مंत्र اس کے منہ پر الٹ مارے تھے۔ رام دیو پاگل ہو کر چیخنے

ملک کافور، نرملا کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بے سہارا لڑکی تازیانے کی شکل دیکھ کر ہی اپنا ایمان بدل ڈالے گی مگر شاہی خواجہ سرا کی تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ ملک کافور، نرملا کی گجری ہوئی حالت پر دھیان بھی نہ دیتا لیکن اسے سلطان کی نینہ بیاہ آ رہی تھی اور اسی وجہ سے وہ خوفزدہ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے ہی لمحے شاہی خواجہ سرار ام دیو کو ساری صورت حال بتا رہا تھا۔ ”دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا ہے بھوک اور زخموں کی شدت اس کی جان لے لے گی رام دیو!“ ملک کا فور کے لمحوں سے وحشت چمک رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہو گا گوبی رام! مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔“ رام دیو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اے میرے کمرے میں پہنچا دے میں نرملا سے تیری توہین کا انتقام بھی لے لوں گا اور اپنا قرض بھی اتار دوں گا۔“

ملک کانور پلانا اور پھر نور الدین نور اکے ساتھ کئی سپاہی بے ہوش نرلا کو ایک خفیہ دروازے سے نکال کر رام دبو کے کمرے کی طرف لئے جارے تھے۔ ملک کانور نے کنیز مر خانم کو بھی طلب کر لیا تھا جو مختلف خوشبوئیں اور دوائیں لے کر حاضر ہو چکی تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ بھیلیتی جا رہی تھی۔ مہر خان نے قیمتی خوشبوؤں اور دواؤں کو نرلا کے جسم پر آزمایا۔ زخم بہت گہرے نہیں تھے۔ بھوک سے پیدا ہونے والی نفاہت اور تازیا نے کی ضربوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر جب شربت نیلوفر اور شمد کے چند بچے اس کے منہ میں ڈالے گئے تو وہ ہوش میں آنے لگی۔ ملک کا نذر مطمئن ہو گیا۔

میرخام کو کمرے سے رخصت کر کے وہ رام دیو سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ ”سلطان کی خدمت میں حاضری کے بعد نصف شب کے قریب واپس لوٹوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔“ نرملہ کی حالت زار دیکھ کر ملک کا فورا کا جوش انتقام سرد ہوتا جا رہا تھا۔ ”اگر یہ مرگئی تو تینا بگمہ اٹھ کھڑا ہو گا۔“

”گوپی رام! تو پورے اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔“ رام دیو کے ہونٹوں پر وہی عیار مسکرا ہٹ پھل رہی تھی۔ ”تیرے آنے تک اس کام داغ درست ہو چکا ہو گا۔ میرا منتظر اس کی غیرت و حیاء کا عظیم ٹوڑ بے گا۔ پھر تیرے پیروں میں ایک داسی کی طرح جھک جائے گی۔“

ملک کانور مصیبت ہو کر چلا گیا اور رام دیو، نرملا کے قریب بستر بیٹھ گیا جو آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی تھی۔ شیطان اپنے ایک پیروکار کے جسم میں پوری طرح حلول کر چکا تھا۔ رام دیو نے بڑی ہوس کار نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کے سامنے رانی پد منی کا حسن بھی بیچ تھا۔ وہ تو رانی ہونے کے سبب شہرت پا گئی تھی ورنہ جہاں تک دلکشی کا تعلق تھا تو نرملا کماری، پد منی سے زیادہ جاذبِ نظر عورت تھی۔ رام دیو کچھ دیر تک وکرم سنگھ کی بیٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے دل دو ماغ آتشِ انتقام میں جلنے لگے۔ وہ سنیا سی آئندہ پال اور مسامحتی سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

رام دیونے جی بھر کے شراب پی اور نرملا کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بار بار اس کے
 بڑے پر عرق گلاب چمڑک رہا تھا۔ میاں تک کہ نرملا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت رام دیو اپنے ہاتھ
 سے طاقت بخشے والی دوا کی ایک خوراک پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرملا فوری طور پر رام دیو کو نہ پہچان سکی مگر

لگا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ بوڑھی جادوگرنی میرے راستے کی دیوار بن گئی ہے..... مگر میں بھی اپنی قسم پوری کر کے رہوں گا۔“ یہ کہہ کر رام دیو نے جلتی ہوئی شمع اٹھالی اور بڑے خوفناک ارادوں کے ساتھ نرملا کی طرف بڑھا۔ ”میں تجھے اس انداز سے داغدار کروں گا کہ تو دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ جس خوبصورت چہرے کو رام دیو نہیں چھو سکتا، اسے پھر کوئی آئینہ بھی قبول نہیں کرتا۔“ کمرے میں نرملا کی گھٹی گھٹی چپچپ گونجنے لگیں۔ رام دیو کے ہاتھ تیزی سے گردش کر رہے تھے..... اور وہ بدکار جادوگر شمع کی دھیمی دھیمی آگ سے نرملا کے دلکش چہرے کو جلا رہا تھا۔ چند لمحوں میں رام دیو نے راجپوت زادی کے جسم پر اتنے داغ بھار دیئے تھے کہ ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ مرمس بدن اب کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا..... اور نرملا کماری زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

رام دیو مسلسل شراب پی رہا تھا اور خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ ”انتقام کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو چیز حاصل نہ ہو سکے اسے تباہ کر ڈالو۔“

جب آدھی رات کے قریب ملک کافور واپس آیا تو رام دیو شراب کے نشے میں بیٹھا جھوم رہا تھا اور نرملا کماری قریب ہی کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

”یہ سب کچھ کیا ہے گیانی؟“ ملک کافور، نرملا کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا تو نے اسے مار ڈالا؟“ رام دیو نے لڑکھرائی ہوئی زبان کے ساتھ اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ”گوپی رام! میں تیرے دشمن کو بے آبرو تو نہ کر سکا مگر میں نے اس کی دنیا خراب کر دی۔“

”اگر کسی دن سلطان نے اسے طلب کر لیا تو.....“ شدت خوف سے ملک کافور کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کہہ دینا کہ رسوائی کے خوف سے اس نے خودکشی کر لی۔“ رام دیو انتہائی سفاک مگر مطمئن لہجے میں بول رہا تھا۔ ”اس کامر جانا ہی تیرے حق میں بہتر ہے۔ جو سانسیں بچ گئی ہیں انہیں جتنا کا پانی نکل لے گا۔ یہ پانی شریہ اس قابل تو نہیں کہ اسے پو تر جل کی بھیٹ چڑھایا جائے لیکن کیا کریں گوپی رام! مجبوری ہے۔“

پھر رات کے سنانے میں ملک کافور اور رام دیو، نرملا کے بے ہوش جسم کو اٹھائے ہوئے عقبی دروازے سے نکل کر باہر آئے اور سیڑھیاں اتر کر جہنم کے کنارے پہنچ گئے۔ سرکش موہیں اس طرح آپس میں متصادم تھیں کہ ہر طرف ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ یکایک چار طاقتور ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور نرملا کا بے لباس جسم دریا میں پھینک دیا گیا۔

رام دیو کا خوفناک قہقہہ گونجا۔ ”گوپی رام! تجھے یہ شاندار فتح مبارک ہو۔ تیرے دونوں دشمن اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ایک مچھلیوں کی غذا بن جائے گا اور دوسرے کو زنداں کے اندھیرے آہستہ آہستہ چاٹ لیں گے۔“ رام دیو لڑکھڑایا لیکن اس نے فوراً ہی ملک کافور کے کاندھے کا سہارا لے لیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھ میرے مستقبل کے شہنشاہ! غور سے دیکھ! تیرے اقتدار کا ستارہ مریخ کیسی آب و تاب سے چمک رہا ہے؟ آج اس کا رنگ کتنا سرخ ہے؟“